خصوصی گوشہ: محمد حسن عسکری

مکالمہ

کراچی

اکادمی بازیافت

ترتیب : مُبین مرزا

یکے از مطبوعات : اکادمی بازیافت

مکالمہ ۵

نومبر ۱۹۹۹ء ------ مئی ۲۰۰۰ء

کمپوزنگ : محمد عبدالوحید

سرورق : میر اکبر علی

طباعت : ابنِ حسن، کراچی

قیمت فی شمارہ :

۱۵۰/روپے (پاکستان میں)

۱۰/امریکی ڈالر (بیرونِ ملک)

ڈرافٹ/ پے آرڈر/ چیک بنام ''مکالمہ'' ارسال کریں۔

رابطہ : آر۔۲۰، بلاک ۱۸، فیڈرل بی ایریا، کراچی، پاکستان

فون : ۶۳۳۹۸۳۵

ترتیب

حرفِ آغاز 9

نعتیں

ماجد خلیل

بس وہیں دیکھا ہے ممکن غیر ممکن ساتھ ساتھ 15

رئیس باغی

لے تو جائے گی سرِ دربارِ آقا جستجو 16

نقد و نظر

قرۃ العین حیدر

"جاڑے کی چاندنی" 19

پروفیسر محمد حسن

حیات اللہ انصاری کی افسانوی یاترا 23

ڈاکٹر اسلم فرخی

نظام شناسی اور پروفیسر خلیق احمد نظامی ۲۹

خصوصی مطالعہ

زاہدہ حنا

برصغیر کی تین اولین ادیب عورتیں اور تعلیمِ نسواں ۴۷

رشندری دیوی/ فینانہ فرنام کامران

میرا جیون ۷۸

رقیہ سخاوت حسین/ حیدر جعفری سیّد

سلطانہ کا خواب ۸۳

وحید احمد

"اصلاح النساء" ۹۴

"اُردو کا ابتدائی زمانہ"

(مبصرین) انتظار حسین ۹۶

خلیق ابراہیم خلیق ۹۸

وحید احمد ۹۹

"زمین کا نوحہ"

(مبصرین) انور جمال ۱۰۲

صابر وسیم ۱۰۳

رؤف نظامانی ۱۰۶

ناول/ ناولٹ

قرۃ العین حیدر

کوچوان کا بگل ۱۱۳

کاٹھ کا عبدل ۱۲۰
مسز جوڈا کی کوٹھی ۱۲۹
مرزا رُسوا کا بنگلہ ۱۳۷
عمر شیخ مرزا
آفتاب زمیں ۱۴۵

سفرنامہ

مسعود اشعر
میڈونا سے ملاقات ۲۳۱

غزلیں

ظفر اقبال
جہاں نہیں کوئی اس خاکداں کے چاروں طرف ۲۵۳
دھوئیں میں لتھڑی ہوئی گفتگو زیادہ ہے اب کے ۲۵۵
افتخار عارف
ملے گی دادِ فغاں کیا، ہمیں نہیں معلوم ۲۵۷
محسن احسان
مصرعِ زلف مسلسل میں گرفتار ہے دل ۲۵۸
جمال پانی پتی
پھر ہر اک موج ہوا پر ہے گماں زنجیر کا ۲۵۹
وہ لہو روئی ہیں آنکھیں کہ بتانا مشکل ۲۶۰
سحر انصاری
مرحلے زیست کے دشوار ابھی ہو جائیں ۲۶۱

خواجہ رضی حیدر

جب ذہن میں تصویر ہوں ایّام پُرانے ۲۶۲

صابر وسیم

اک پھول سا کھلتا کسی محراب میں دیکھا ۲۶۳

شوکت عابد

یہ مت پوچھو کدھر جاتی ہے دُنیا ۲۶۵

اجمل سراج

سخت مشکل ہے زندگی کرنا ۲۶۶

عرفان ستار

میری کم مائگی کو ترے ذوق نے دولتِ حرفِ تازہ بیاں سونپ دی ۲۶۷

خاکے/یادیں

ابوالفضل صدّیقی

پاؤں کی دھول ۲۷۱

اسد محمد خاں

اپنے لکھنے والے... ۴۷ء سے اب تک ۳۰۵

نذرالحسن صدّیقی

ضیائے محبت ۳۲۴

یونس جاوید

دردالولڑا سائیں ۳۳۴

محمد حسن عسکری ایک مطالعہ

محمد حسن عسکری

ازمنۂ وسطیٰ کا تصور ۳۵۵

شودر لو دلاکلو / محمد حسن عسکری

مخدوش رابطے ۳۶۵

محمد حسن عسکری / مظفر علی سیّد

کبھی اے حقیقتِ منتظر ۴۱۷

انٹرویو

شفیع عقیل

محمد حسن عسکری صاحب سے ایک گفتگو ۴۲۴

شخص و عکس

انتظار حسین

تھوڑا ذکر عسکری صاحب کا ۴۳۱

محمد حسن مثنیٰ

ایک خط ... ایک تعارف ۴۳۳

ضمیر علی بدایونی

محمد حسن عسکری : ایک تاثر، ایک سوال ۴۴۷

ثناء الحق صدیقی

پروفیسر اظہار الحق المعروف بہ حسن عسکری ۴۵۳

فکر و نظر

مظفر علی سیّد

عسکری کا ناتمام ترجمہ ۴۵۸

جمال پانی پتی

محمد حسن عسکری: نفی سے اثبات تک ۴۶۴

احمد علی سیّد

عسکری کا تصور روایت اور رنگِ ثبات ۴۹۴

ادیب سہیل

"وقت کی راگنی" کے حوالے سے چند باتیں ۵۰۳

عبّاس رضوی

محمد حسن عسکری کے افسانے: ایک مطالعہ ۵۱۲

اجمل کمال

نقاد کی خدائی (منٹو کی غلط تعبیر) ۵۳۴

☆☆☆

حرفِ آغاز

(ادیب، اقدار اور سماج)

ایک زمانہ تھا کہ اہلِ ادب کو ہمارے معاشرے میں بے حد اعتبار و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور معاشرے کے افراد پر ان کے اثرات مرتب ہوتے تھے۔ لوگ ان کے اسلوب حیات سے متاثر ہوتے، ان کے رویّوں کو اپناتے اور چال ڈھال کو اختیار کرتے تھے۔ میں یہ بات فرانس اور سارتر، انگلینڈ اور آسکر وائلڈ، برنارڈ شا یا روس اور ٹالسٹائی، دوستووسکی کے حوالے سے نہیں کر رہا ہوں۔ ادیب شاعر کے اثرات ہمارے معاشرے میں بھی قبول کیے جاتے تھے اور خاصے وسیع پیمانے پر کیے جاتے تھے۔ یہ کوئی بہت پرانی بات بھی نہیں ہے، یہ سلسلہ ماضیِ قریب تک جاری رہا ہے۔ قابلِ توجہ پیمانے پر اس سلسلے کا آخری مظاہرہ ترقی پسندوں کی تحریک کے حوالے سے ہوا ہے۔ یہ اثرات تادیر رہے یا جلد زائل ہوگئے اور ان کے مضمرات مثبت رہے یا منفی، یہ ایک الگ بحث ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عوام الناس نے اس تحریک کے نظریاتی اثرات قبول کیے اور اس تحریک کے لگائے ہوئے نعروں کو زندگی کی آواز گردانا۔ یہ تحریک ہی جلد دم توڑ گئی ورنہ معاشرہ تو اس کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

آگے چل کر ادیب کا معاشرے پر اثر بڑھ سکتا تھا... اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ ادیب معاشرے کی ایک نئی قلبِ ماہیت کرنے والے لوگوں میں شامل ہو جاتے لیکن ایک تاریخی حادثہ ہوگیا اور تاریخی حادثوں کی اپنی ایک منطق ہوتی ہے۔ ہوا یہ کہ خود ادیب کی توجہ اپنے کام اور مقام سے ہٹ گئی۔ کوئی بڑا کام لگن اور جستجو کے بغیر نہیں ہوسکتا اور سچی لگن آدمی سے سب سے پہلے ایثار کا مطالبہ کرتی ہے۔ ادیب کو جس شے کا ایثار کرنا تھا وہ تھی دنیا، لیکن اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اسے کسی قسم کا ایثار نہ کرنا پڑے۔ دنیا ادیب کے لیے ایک حیرت افزا نظارہ تھا۔ ایک ایسا نظارہ جو اس کے اندر کبھی تعجب اور کبھی اضطراب کے جذبات جگاتا تھا۔ تاہم اس کے اندر اپنے کام کی بڑائی اور اپنے مقام کی بلندی کا احساس ہمیشہ کارفرما رہتا تھا۔ لیکن اب یہ ہوا کہ صورتِ حال یکسر بدل گئی۔ ادیب خود کو چھوٹا اور دنیا کو بڑا

محسوس کرنے لگا۔ وہ دنیا جو اس کے لیے مقامِ حیرت تھی، جائے حسرت بن گئی۔ دنیا کے لطائف، رنگینیاں اور مناصب اس کے دل کا دامن اپنی طرف کھینچنے لگے۔ اس کے اپنے اندر جو ایک بلند اور ارفع دنیا تھی وہ نابود ہوگئی اور پھر یہی باہر کی دنیا سب کچھ ٹھہری۔ سمرسٹ ماہم کے لفظوں میں نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا بڑی ہوگئی اور اس کا فن چھوٹا پڑ گیا۔

تو صاحب! یہ تو ٹھیک ہے کہ حقیقت یہی کچھ نقشہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے لیکن اب اس کا کیا کیجیے کہ ہر آدمی کو اپنی برادری، اپنا کنبہ بہرحال عزیز ہوتے ہیں۔ میری ادبی حیثیت کچھ بھی سہی لیکن میں ہوں تو اسی برادری کا ایک رکن، اسی کنبے کا ایک فرد۔ یہ سب شکایتیں اور رنج ہائے گراں مایہ اپنی جگہ لیکن ہمیں کچھ یوں بھی تو سوچنا چاہیے کہ اہلِ علم و ادب اس بڑی اور روحانی مسرت کو چھوڑ کر ان چھوٹی چھوٹی اور مادّی خوشیوں کے چکر میں آخر کیوں پڑ گئے؟ یہ تصویر کا دوسرا رخ ہے۔ افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ روشن یہ رخ بھی نہیں ہے۔

دیکھیے، ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ادیب بھی گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے، پیکرِ خاکی ہے۔ اس میں اگر ایک طرف معاشرے کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہے تو دوسری طرف وہ معاشرے کے رویّوں سے متاثر ہونے کا امکان بھی رکھتا ہے۔ اس کی پلکوں پر بڑے بڑے خواب ضرور اترتے ہیں لیکن اس کے جسم و جاں اپنے اطراف کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں سے گھائل بھی ہوتے ہیں۔ اس کا دل اپنی ایک دنیا ضرور تراش رکھتا ہے لیکن اس کا دماغ اپنے اردگرد کی دنیا کو آخر کب تک مسترد کر سکتا ہے؟ وہ ایک خیال، ایک ارمان کے لیے کب تک اپنے اطراف کی دنیا کے واقعات اور حقائق سے نبرد آزما رہے؟! ایک اہم سوال یہ ہے کہ ادیب جس دنیا کا فرد ہے، اگر وہ بدل رہی ہے، بدلتی چلی جارہی ہے تو اُس سے اصحابِ کہف والی زندگی اختیار کرنے کا مطالبہ آخر کس حد تک درست ہے؟

اس سوال کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا ہمیشہ سے بدلتی چلی آئی ہے۔ بات یہ ہے کہ پہلے دنیا کی بیش تر تبدیلیاں اس کے ظاہر میں ہوتی تھیں، باطن میں بہت کچھ بچا رہتا تھا، لیکن اب ماجرا یہ ہے کہ ظاہر باطن سب کچھ بدل گیا ہے۔ زمانے اور معاشرے اپنے اہلِ علم اور اہلِ دانش سے متاثر ہوا کرتے تھے، ان کے فکر و خیال اور آرا کو اہمیت دی جاتی تھی... لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اب دنیا کی ساری باگ ڈور اہلِ سیاست کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ اہلِ سیاست کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو تہذیبی اور انسانی اخلاقیات کی کسی شق میں یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی اسے قابلِ عمل جانتے ہیں۔ یہ کسی اصولِ حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک کُل حقیقت آج کی زندگی اور موجود و میسّر دنیا ہے۔ اہلِ سیاست چوں کہ اہلِ اختیار ہیں اس لیے عوام النّاس نے براہِ راست ان سے متاثر ہوکر ان کی راہ اختیار کی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہمارے زمانے کا اختصاص اور شناخت ایک نہ ختم ہونے والی مادّی دوڑ بن گئی

ہے۔ اب کامیابی کا نشان یہ ہے کہ جو اس دوڑ میں جتنا آگے ہوگا، اتنا ہی بڑا، قابلِ تعظیم اور کامیاب قرار پائے گا۔

ادیب نے اس صورتِ حال کو دیکھ کر اوّل اوّل تو مزاحمت ضرور کی ہوگی، اس کو مسترد کیا ہوگا... لیکن سوال وہی ہے کہ تا کہے...؟! وہ اکتفا اور قناعت کے تجربے سے گزرا ہوگا لیکن جب آگے صورتِ حال امید افزا نظر نہیں آئی ہوگی تو پھر رفتہ رفتہ اس نے پسپائی قبول کی ہوگی۔ اس نے دیکھا ہوگا کہ جس طرح مولوی کو پندرہ سو روپے میں مسجد کی امامت سونپ کر اہلِ سیاست اور ان کا معاشرہ یہ چاہتا ہے کہ وہ صرف ان کے دین کی پاسداری ایسا بڑا فریضہ خاموشی سے انجام دیتا رہے، اسی طرح اس سے بھی مشاعرے پڑھوا کر اور اسے مضامین اور افسانوں کی داد دے کر یہ خواہش کی جارہی ہے کہ ادیب معاشرے کی اخلاقی اقدار اور تہذیبی شناخت کے محاذ پر پوری تن دہی کے ساتھ ڈٹا رہے۔ خیر، یوں بھی کچھ دن گاڑی چل سکتی تھی لیکن غضب یہ ہوا کہ ادیب کو اس سرخوشی تک سے محروم کر دیا گیا کہ وہ معاشرے کی تہذیب و تاریخ کی تعمیر میں حصہ لے رہا ہے۔ اس کے برعکس اسے باور کرایا گیا ہے کہ وہ محض زندگی کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ ہم نے مولوی اور ادیب دونوں ہی کے ساتھ بدسلوکی کی... دونوں کو خیالی اور غیر حقیقی بڑائی کا منصب دے کر ان سے پیغمبرانہ صبر اور استقامت کا مطالبہ کیا گیا۔ وہ امتحان اور ایثار جو پورے معاشرے کا حصہ تھا، اسے معاشرے کا فرضِ کفایہ بنا کر انھیں اس کی ادائیگی پر لگا دیا گیا۔ ادیب نے جلد ہی بھانپ لیا کہ معاشرہ اسے احترام و تحسین کی نظر سے دیکھ کر اس کا حوصلہ نہیں بڑھا رہا بلکہ اسے الّو سمجھ رہا ہے... ایسا الّو کہ جس کی ایک کل دبا دی جائے تو وہ کرتب دکھاتا ہے۔ چناں چہ اس کے اندر ایک احساسِ شکست اور احساسِ محرومی پیدا ہوا اور آج ہم ادیب کو جو کچھ کرتا ہوا دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے ہیں، وہ اسی کا ردِعمل ہے۔ آپ خود اللہ لگتی کہیے، ایسے میں کیا ہم سارا الزام ادیب کو دے سکتے ہیں؟!

دل صاحبِ انصاف سے انصاف طلب ہے!

☆☆

اس شمارے میں ایک گوشہ محمد حسن عسکری کے لیے ترتیب دیا گیا ہے۔ محمد حسن عسکری اردو تنقید کے اہم ترین حوالوں میں سے ہیں۔ سراج منیر مرحوم نے ان کی بابت بالکل درست کہا ہے کہ وہ ہماری تنقید کا قطبی ستارہ ہیں۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف اور مابعد کا کوئی نقاد ان کی رو میں چلے یا معکوس راستے پر، یہ طے ہے کہ وہ اپنی سمت کا تعین اسی قطبی ستارے کے ذریعے کرتا ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ ہم عسکری صاحب کو پیغمبر نہیں مانتے کہ ان کی ہر بات الہام اور وحی باور کی جائے۔ اس خیال کا عملی اظہار اس گوشے سے بھی ہوتا ہے جس میں ایسے مضامین شامل ہیں جن

میں عسکری صاحب سے اختلافِ رائے تردید اور استرداد تک کے لب ولہجہ میں کیا گیا ہے۔ اس گوشے کی ترتیب کا مقصود اردو کے ایک بڑے نقاد کی عظمت کا اعتراف ہے اور ساتھ ہی ہماری یہ خواہش بھی ہے کہ اس حوالے سے ہم عصر نقد و نظر کے سامنے زندہ تنقید کی اہم تر مثال تازہ کی جائے... خون میں تحلیل ہونے والی اسی زندہ تنقید کی مثال جس کا ایک بلیغ ترین حوالہ محمد حسن عسکری ہیں...!

☆☆☆

نعتیں

ماجد خلیل

نعتِ رسولؐ

بس وہیں دیکھا ہے ممکن غیر ممکن ساتھ ساتھ
جالیوں کے سامنے تھے رات اور دن ساتھ ساتھ

اس جہاں میں بھی بہ ہر لحمہ مرے ہادی ہیں وہؐ
اُس عدالت میں بھی ہوں گے بن کے ضامن ساتھ ساتھ

راہ طیبہ میں اکیلا ہوں مگر تنہا نہیں
ہر قدم پر ہے مرے اندر کا مومن ساتھ ساتھ

کیوں نہ ہو مجھ بے خبر کی بھی خبر گیری کہ ہیں
میرے آقاؐ، میرے مولاؐ، میرے محسنؐ ساتھ ساتھ

اس صفت میں اور ہو کامل کوئی ممکن نہیں
ہیں مرے آقاؐ کے ظاہر اور باطن ساتھ ساتھ

کاش یہ میری جبیں اور نقش پائے مصطفےٰؐ
صرف روز حشر تک ہو جائیں ساکن ساتھ ساتھ

گونجتا ہے ذہن میں ماجد یہ مصرع بار بار
میں ہمیشہ دُور اُن سے، وہؐ ہیں لیکن ساتھ ساتھ

رئیس باغی

نعت شریف

لے تو جائے گی سرِ دربار آقا جستجو
چاہتی ہے دوستو! لیکن سلیقہ جستجو

مجھ کو مل جائیں گے محبوب خدائے دوجہاں
دیکھنا! پلٹے گی اک دن میری کایا جستجو

لڑکھڑاتا ہوں، نہ گرتا ہوں، خدا کے فضل سے
دے رہی ہے راہ طیبہ میں سہارا جستجو

جستجو کا لطف آجائے اگر قسمت سے میں
جستجو میں اُن کی بن جاؤں سراپا جستجو

منزل عرفان آقاؐ مل ہی جائے گی مجھے
بن ہی جائے گی مرے غم کا مداوا جستجو

یوں چلا ہوں اضطراب شوق میں طیبہ نگر
جیسے کرتا ہے کسی دریا کی پیاسا جستجو

نسبت سرکارؐ نے باغی دیا ہے حوصلہ
ورنہ مجھ میں تھی یہ ہمّت اور میں کرتا جستجو!

نقد و نظر

قرۃ العین حیدر

جاڑے کی چاندنی☆

> ای ایم فارسٹر نے سنکلیر لوئیس کے متعلق لکھتے ہوئے اسی مصنف کا ایک حوالہ دیا ہے:
> "میں گوفر پریری دیکھنا چاہتی ہوں۔" مین اسٹریٹ کی ہیروئن نے کہا اور اس کے شوہر نے جواب دیا، "مجھ پر اعتماد رکھو، یہ رہی تمھاری گوفر پریری۔ اس کے چند اسنیپ شاٹ تم کو دکھلانے کے لیے آیا ہوں۔" اور یہی کام مسٹر لوئس نے خود کیا ہے۔ انھوں نے ہمیں آنے والی نسلوں کو چند اسنیپ شاٹ دکھلائے ہیں... اور یہ کہنا غلط ہے کہ ہر کوئی کیمرا استعمال کر سکتا ہے۔

یہ بات جو فارسٹر نے سنکلیر لوئیس کے لیے لکھی، ہر افسانہ نگار کے لیے کہی جا سکتی ہے۔ کہانی ایک تصویر ہے جو مختلف زاویوں سے کھینچی جاتی ہے۔ اس کے میڈیم مختلف النوع ہیں۔ الگ الگ روشنیوں میں یہ تصویریں اتاری جاتی ہیں۔ بعضوں کے یہاں چلچلاتی دھوپ ہے، بعضوں کے یہاں شفق کی خواب ناکی۔ کرشن چندر قوس قزح کے رنگوں اور موسیقی کے موقلم سے تصویریں کھینچتا ہے (اس کے باوجود وہ ہماری اپنی دنیا کی بے حد حقیقی کہانیاں ہیں)۔ بعض نے بڑے مبہم تاثراتی کینوس رنگے ہیں۔ عصمت برش کی جگہ چھریاں چلا کر اس طرح کینوس ہی کے پرخچے اڑا دیتی ہیں کہ اس کے ساتھ دیکھنے والا بھی زخمی ہو جاتا ہے۔ اگر یہ استعارہ آگے لے جایا جائے تو یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ عباس نے "جاڑے کی چاندنی" کی کیفیت کو پوری طرح اپنی تصاویر میں ڈھال لیا ہے۔ کیوں کہ مصوری اور افسانہ نگاری میں گہرا تعلق ہے۔ آرٹ فارم کے لحاظ سے موسیقی، مصوری اور لکھا ہوا لفظ تینوں ایک سمفنی کے مختلف لیکن متوازن ایلیمنٹ ہیں۔ اچھے ادیب کا کمال یہ ہے کہ وہ ان تینوں میں discord نہ پیدا

☆۔ غلام عباس کے افسانوں کے مجموعے پر یہ تبصرہ نما مضمون پندرہ سترہ برس قبل ادبی جریدے "تخلیقی ادب" (مرتب: مشفق خواجہ) کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس جریدے میں غلام عباس پر خصوصی گوشہ ترتیب دیا جا رہا تھا لیکن پھر "تخلیقی ادب" بند ہو گیا اور یہ مضمون شائع نہ ہو سکا۔ (ادارہ)

ہونے دے۔ اردو کے بہت کم ادیبوں کو یہ کمال نصیب ہوا ہے۔ بہت سے لکھنے والے زود نویسی کا شکار ہوگئے۔ عباس نے سمجھ داری کی بات یہ کی ہے کہ وہ کم لکھتے ہیں اور محنت سے لکھتے ہیں۔ حالاں کہ وہ بہت عرصے سے لکھ رہے ہیں۔ ان کا ''الحمرا کے افسانے'' غالباً ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس لحاظ سے ان کا ہمارے ''بزرگوں'' میں شمار ہونا چاہیے تھا مگر ان کے فن کی تر و تازگی اور جواں سالی نے ان کو ۱۹۶۰ء کے ادب کی صف اوّل میں جگہ دلوا رکھی ہے۔

عباس جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے، محنت سے لکھتے ہیں اور ایک کہانی کی نوک پلک درست کر کے اسے بار بار سنوارتے ہیں۔ ان کی ایک ٹریجڈی یہ ہے کہ انھیں ''آنندی والے غلام عباس'' کہا جاتا ہے حالاں کہ انھوں نے ''آنندی'' کے علاوہ اور بھی کئی بہت اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کا انداز بیاں اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ بہت رسان سے، دھیمے لہجے میں قصہ سناتے ہیں اور بڑے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ سناتے ہیں اور قاری کو متوجہ کرنے کے لیے حیران کن یا انوکھے تجربوں کا سہارا نہیں لیتے۔

ہر افسانہ نگار کا ایک لینڈ اسکیپ ہوتا ہے۔ وہ اس میں خوش رہتا ہے اس سے باہر نکل کر اگر اسے کوئی نئی بات کہنی ہو تو اس کے لیے اسے بڑی شعوری کوشش کرنا پڑتی ہے۔ شاید اسی لیے ہم نے بھی غیر ارادی طور پر ہر قصہ گو کے لیے ایک خانہ تلاش کر لیا ہے۔ ہم پہلے ہی سے سوچنے لگتے ہیں... انتظار حسین...؟ بلند شہر کے کسی امام باڑے کا رونا پیٹنا ہوگا۔ اے حمید...؟ امرتسر کی گلیاں اور سماوار کی بھاپ اور زرد گلاب!! شوکت صدیقی...؟ غنڈے، دہشت، اسرار۔ جمیلہ ہاشمی...؟ سکھوں کی میلوڈرامٹک داستان۔ قرۃ العین حیدر...؟ وہی لکھنؤ اور مسوری کی ریں ریں۔ اب تو جیلانی بانو اور واجدہ تبسم کے لیے بھی ہم پہلے سے متوقع رہتے ہیں کہ حیدر آباد کے کسی زوال پذیر فیوڈل خاندان کے متعلق کس قسم کا قصہ سناتی ہوں گی۔

عباس کے لیے سوچیے کہ ان کے افسانے کس خانے میں رکھے جائیں تو پھر وہی ''آنندی'' ذہن میں آجاتا ہے۔ گویا ان کے سارے افسانوں کی کلید ہے۔ لیکن اس کے باوجود عباس کو کسی ایک پس منظر سے چسپاں نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے کردار مقامی ہونے کے باوجود مقامی نہیں ہیں۔ ان کا دنیا کی کسی زبان میں ترجمہ کر لیجیے، یہ لوگ ہر ملک ہر پس منظر میں ٹھیک بیٹھیں گے۔

عباس کی خاص تیکنیک بہت بتدریج ڈیولپمنٹ کی ہے۔ وہ نہایت آہستگی سے کسی ایک note سے بات شروع کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ اسے نقطۂ عروج تک لے جاتے ہیں۔ وہ بڑی نفاست سے کہانی کو پروان چڑھانا جانتے ہیں۔ ان کے بیش تر افسانوں میں کش مکش یا گھبراہٹ یا جھنجلاہٹ یا بے توجہی یا جھول کسی اسٹیج پر نہیں ملتا۔ گو ان کی نرم روی کی یہی خصوصیت کئی مرتبہ ان کی فنی کم زوری بھی بن جاتی ہے جس کا ذکر میں آگے کروں گی۔

عباس قصہ سناتے میں کہیں involve نہیں ہوتے۔ مزے سے واقعات بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ جوزف کونرڈ نے ایک جگہ لکھا تھا کہ جو لوگ مجھے پڑھتے ہیں ان کو دنیا کے متعلق میرے عقیدے کا علم ہوگا، میں سمجھتا ہوں کہ یہ temporal دنیا چند بہت سیدھے سادے تصورات پر قائم ہے اور یہ تصورات اتنے سیدھے سادے ہیں کہ یہ پہاڑیوں کے اتنے پرانے ہوں گے۔ عباس کے یہاں بھی اسی temporal دنیا کے واقعات ہیں۔ فلسفہ طرازی، مابعد الطبیعیات، رمزیت کا یہاں گزر نہیں۔ عام لوگوں کی داستانیں ہیں جو عام ہوتے ہوئے بھی انوکھی اور خیال انگیز ہیں۔ بردہ فروشوں، کلرکوں، خالی اوورکوٹ پہننے والے مفلس نوجوانوں کی داستان سناتے ہوئے عباس کی نگاہ سیدھی زندگی کی لایعنیت اور irony اور معصومیت پر پہنچ جاتی ہے۔

ایک امریکن نقاد نے ممتاز ناول نگار جیمز ٹی فیرل کے سلسلے میں کہیں پر لکھا ہے کہ:

حقیقت پسند افسانے کے ضمن میں ایمان داری ایک مشتبہ وصف ہے جس کا یہ دعویٰ بہت سے لوگ سب سے پہلے کرنا چاہتے ہیں لیکن کوئی ذہین قاری افسانے میں خالص ایمان داری کا تقاضا نہیں کرتا۔ وہ محض یہ چاہتا ہے کہ افسانہ یا داستان مصنوعی نہ ہو۔ اس میں انسانی زندگی کے نمائندے ایسی ابتدائی اور قدرتی شکلیں اختیار کریں جو مثالی طرز عمل کے تسلیم شدہ تانے بانے کو توڑتی ہوئی آگے نکل جائیں۔

عباس کے کرداروں سے ملاقات کر کے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اتنے معمولی ہونے کے باوجود کتنے پُراسرار ہیں۔ اسی سلسلے میں مصنف کی جزئیات نگاری کی مہارت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ ''اس کی بیوی'' ایک نوجوان کی کہانی ہے جس کی محبوب بیوی مرچکی ہے اور وہ ایک طوائف سے اس کی باتیں کرتا رہتا ہے (اس کے آخر کا اچانک انکشاف بھی عباس کی خصوصیت ہے)۔ اس میں جزئیات نگاری کی چند مثالوں نے خصوصیت کے ساتھ مجھے اپنی طرف متوجہ کیا:

وہ اب چوٹی کر کے جوڑا باندھ چکی تھی اور ہیرپنوں اور کلپوں کو جن سے وہ اپنے بالوں کی آرائش میں مدد لیا کرتی، فرش سے اٹھا اٹھا کر سنگھار میز کے خانے میں ڈال رہی تھی۔ اس اثنا میں نوجوان کی نظریں اس کی گوری گوری انگلیوں کی خفیف ترین حرکات کا بھی تعاقب کرتی رہی تھیں۔

دو منٹ خاموشی میں گزر گئے۔

اسی طرح ایک اور جگہ پر:

اس کے سامنے چاندنی پر مٹر کے دانے کے برابر ایک سیاہ پتنگا چت پڑا تھا جو شاید برقی قمقمے سے ٹکرا کر نیچے آرہا تھا۔ پتنگا اپنی ننھی ننھی بال سی ٹانگیں ہوا میں

ہلا ہلا کر اور سر کو فرش پر رگڑ رگڑ کر سیدھا ہونے کی کوشش کرتا مگر جہاں اسے ذرا کامیابی ہوتی نوجوان ایک بجھی ہوئی دیا سلائی کے سرے سے اسے پھر اوندھا کر دیتا۔

سادگی بیان ملاحظہ کیجیے:

اس نے ایک بکری پالی ہے۔ دودھ سی سفید۔ ایک بھی کالا بال نہیں۔ زہرہ اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے پاس ایک ندی بہتی ہے۔ وہ اسے وہاں پانی پلانے لے جاتی ہے۔ ایک دن کیا ہوا کہ وہ بکری پانی پی رہی تھی کہ ایک بڑا سا کتا آیا...

نسرین یہ سادہ سا بے رنگ واقعہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔

اور افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ یہ سادہ سا بے رنگ واقعہ ہم بھی بڑی دل چسپی سے پڑھتے ہیں اور سنیے:

نسرین نے بڑی قیمت کی کوئی ایک چیز نہیں خریدی بلکہ روزمرہ کے استعمال کی کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدیں، مثلاً ایک تو چٹلا خریدا...

''تنکے کا سہارا'' عباس کے مخصوص طرز کا اجتماعی افسانہ ہے۔ اس میں طرزِ بیاں کی سادگی کا ایک اور نمونہ دیکھیے:

دوپہر کو حاجی صاحب کے یہاں سے پرانے کپڑوں کا گٹھر سید کی بیوی کے ہاں بھیجا گیا۔ ساتھ ہی جمن بی نے کہلوایا کہ کبریٰ اور صغریٰ کو بھیج دو۔ کلامِ پاک کا سبق پڑھ جائیں اور چٹیا بھی کرالیں۔

تعجب ہے اس افسانے کا انجام مصنف نے مختلف کیوں کر دیا۔

میں سمجھتی ہوں کہ ''اس کی بیوی'' اس مجموعے کا بہترین افسانہ ہے۔ ایک اور بہت اچھا افسانہ ''غازی مرد'' ہے۔ عباس کے یہاں بدی اور معصومیت کی باہم کش مکش اور زندگی کے الم اور بے بسی کی منظر کشی بہت مدھم سُروں میں کی جاتی ہے۔ منظر کشی میں نے اس لیے کہا کیوں کہ عباس کے یہاں ذاتی اسٹیٹ منٹ کہیں نہیں ہے۔ یہ نیچے سُر bass کے ہیں جو treble کے سُروں کے ساتھ ساتھ بجتے رہتے ہیں اور کبھی اوپر اوپر آجاتے ہیں۔ موسیقی ہی کی اصطلاح میں عباس کے یہاں معصومیت کے اس تھیم کو کاؤنٹر پوائنٹ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس مجموعے کا عنوان ''جاڑے کی چاندنی'' سوچتے ہوئے ممکن ہے مصنف کو بیتھوون کے ''مون لائٹ سوناٹا'' کا دھیان رہا ہو۔

''فینسی ہیئر کٹنگ سیلون'' مصنف کے بہت چھوٹی چھوٹی اینٹیں رکھ کر عمارت کھڑی کرنے کے فن کی اچھی مثال ہے۔ اسے آپ موزیک mosaic کے فن سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں۔ عباس چند

کردار اکٹھے کرتے ہیں، ان کے مختلف پس منظر، عادات، خصوصیات، پھر ان سب کو جمع کر کے وہ ایک گھر یا ایک دکان یا ایک محلہ یا ایک پورا شہر آباد کر دیتے ہیں اور اس طرح ہمارے دیکھتے دیکھتے نہایت خاموشی سے تصویر تیار ہو جاتی ہے۔ یہ تصویر کشی کی تکنیک ہے جس میں پہلے پنسل سے خاکہ بنایا جاتا ہے، پھر رنگوں کی پہلی سطح چڑھائی جاتی ہے۔ کہیں یہ رنگ flat رکھے جاتے ہیں، کہیں ان کے مختلف ٹون بنتے ہیں۔ پھر برش سے چھوٹے اور بڑے اسٹروک لگائے جاتے ہیں اور یوں رفتہ رفتہ تصویر مکمل ہوتی ہے۔ عباس کی تکنیک گہرے اور بھاری روغنی رنگوں کے بجائے آبی رنگوں کے واش کی ہے۔ تصویر میں رنگ بھرنے کے بعد وہ اسے پانی سے ''واش'' کرتے ہیں تاکہ رنگ لطیف، متوازن اور ہم آہنگ ہو جائیں۔

''سایہ'' اور ''بھنور'' بھی مجھے بہت اچھے معلوم ہوئے۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ اس مجموعے کے سبھی افسانے اچھے ہیں۔ ''بھیے والا''، ''مکرجی بابو کی ڈائری''، ''دو تماشے'' کمزور ہیں۔ ''سرخ جلوس'' میں بھی کوئی خاص بات نہیں۔

عباس کا نرم لہجہ بعض دفعہ اتنا نرم ہو جاتا ہے کہ آخر میں افسانے کی اینٹی کلائمکس ہو جاتی ہے اور اچانک ایک پھسپھسے سے خاتمے پر پہنچ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار محض ایک واقعہ سنانا چاہتا تھا، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ بات ان کے افسانوں کے پہلے مجموعے میں نہیں تھی۔ اس مرتبہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انہوں نے اکثر افسانوں پر پہلے بہت غور و خوض کیا اور پھر بور ہو کر ان کو ادھورا چھوڑ دیا۔ عباس بہت اچھے fragments لکھ سکتے ہیں اور ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی ان کی کامیابی کی ایک وجہ ہے۔

''جاڑے کی چاندنی'' کا مقدمہ ن۔ م راشد نے لکھا ہے اور چغتائی صاحب کا بنایا ہوا گرد پوش خاصے کی چیز ہے۔

☆☆☆

پروفیسر محمد حسن

حیات اللہ انصاری کی افسانوی یاترا

دنیا کے سات عجوبے مشہور ہیں، حیات اللہ انصاری کے بھی سات عجوبے ہیں اور ہر عجوبہ ایسا ہے کہ کسی اور شخص سے انجام پائے تو حیات جاوید کا حق دار ہوجائے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ کارنامے اور کرشمے ایسے ملک اور ایسی زبان میں سرانجام پائے جہاں زندوں کی تعریف کا رواج اس لیے نہیں کہ خوشامد میں شمار ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کی خدمات کا اعتراف اس لیے نہیں کیا جاتا کہ اس سے نہ مدّاح کا فائدہ نہ ممدوح کو کوئی فیض... حیات اللہ انصاری کے ان کرشموں میں سب سے اہم ہے ان کا قاعدہ۔ دس دن میں اردو۔ دوسرا کارنامہ ہے ان کی کہانیاں..."آخری کوشش"، "موروں کا کارخانہ"، "چچا جان"، "آخور" تیسرا کارنامہ ہے ناولٹ "مدار"، "لہو کے پھول"، "ٹھکانا" اور بنجاروں کی زندگی پر ان کا ناول "گھروندا"، چوتھا کارنامہ ہے "قومی زبان" کا اجرا اور اس کے اداریوں کا جذباتی کے بجائے استدلالی انداز۔ پانچواں کارنامہ ہے ن م راشد پر ان کا کتابچہ اور 'جدیدیت کی سیر' جن میں ان کا تنقیدی شعور جلوہ گر ہوا ہے اور انوکھے ڈھنگ سے جلوہ گر ہوا ہے۔ چھٹا کارنامہ ہے اردو کے لیے اترپردیش میں بیس لاکھ دستخطوں کی مہم اور ساتواں عجوبہ ہے ان کی ہمالیہ کی کوہ پیمائی۔

مختصر افسانہ حیات اللہ انصاری کے لیے نئی بصیرت کی تلاش ہے۔ غالباً ڈی ایچ لارنس نے ناول کو عہد جدید کا نیا مذہب قرار دیا تھا، حیات اللہ کے لیے افسانے کا وہی مرتبہ تھا۔ سوال یہ نہیں ہے کہ آپ کس معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ آپ کے چاروں طرف اور آپ کے اندر مشاہدات، تجربات اور حقائق کا جو خزانہ بکھرا ہوا ہے آپ اس میں معنویت کا کوئی رشتہ پیدا کر پاتے ہیں یا نہیں۔ کیا آپ زندگی کو کوئی منطقی ربط، کوئی معنی دے سکتے ہیں؟ کیا یہ ٹوٹے ہوئے آئینے کے ٹکڑے ہیں جو ہر قدم پر بکھرے ہوئے ہیں یا ان کو ملا کر کسی ایک آئینہ خانے کی شکل دی جاسکتی ہے؟!

انسان اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہزاروں تجربوں سے گزرتا ہے۔ ان میں ہر تجربہ ایسا ہوتا ہے کہ دیکھنے والی آنکھیں ہوں اور دھڑکنے والا دل ہو تو اس آئینے میں افسانہ نگاری کا نہیں اس کی پوری

وراثت کا بلکہ پوری کائنات کا عکس دیکھا اور دکھایا جاسکتا ہے۔ حیات اللہ کا مسئلہ یہی ہے۔

اٹلی کا مشہور ڈراما نگار گزرا ہے پرانڈلو۔ اس نے اپنے سبھی ڈرامے صرف ایک موضوع پر لکھے ہیں، ایک حقیقت کے مختلف اور متضاد روپ۔ ایک ہی واقعہ مختلف کرداروں کے لیے مختلف معنی رکھتا ہے جو ایک کے لیے حقیقت ہے وہ دوسروں کے لیے فریب ہے، ایک کا سچ دوسرے کا جھوٹ ہے۔ پھر نقاط نظر کے اس ٹکراؤ میں سچ کیا ہے؟

حیات اللہ افسانے کو ضابطۂ حیات کی کھوج مانتے ہیں اسی لیے اس کا درجہ وہ کلیدی سمجھتے ہیں۔ افسانہ ان کے نزدیک محض تفریحی مشغلہ نہیں ہے، اس کا درجہ تو دور حاضر کی کلیدی بصیرت کے وسیلے کا ہے یعنی وہ دور قدیم کی اصطلاح میں عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ حیات اللہ کا مسئلہ ہے آج کے دور کی سچائیوں میں قدر کی تلاش۔ اور یہ مسئلہ کچھ آج سے نہیں ''انوکھی مصیبت'' والے مجموعے اور ''ہاں مت'' اور ''آخری کوشش'' جیسی کہانیوں سے لگاتار ان کا پیچھا کرتا رہا ہے۔

ان کی کہانی ''ہاں مت'' کو وہ اہمیت نہیں ملی جس کی وہ مستحق تھی نہی اور منکر کا مسئلہ شاید اردو افسانے میں پہلی اور آخری بار اٹھایا گیا ہے، انسان کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ اس کے عمل ہی کا نہیں خواہش کا معیار کیا ہو؟ گناہ کیا ہے اور ثواب آخر کیا چیز ہے؟ یہ مسائل ''ہاں مت'' کی بنیاد ہیں۔ سوال وہی ہے نیکی اور بدی، خیر اور شر کا معیار کیا ہو اور جسے قدر کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کا معیار کیا ہے؟

سوال زندگی کی فلسفیانہ توجیہ کا نہیں طرز زندگی کی بنیاد کا ہے، اخلاق کے سارے ضابطوں میں اور اعمال کی بکھری ہوئی اکائیوں میں توازن اور آہنگ کیوں کر پیدا ہو؟ یہی سوال بڑے کرب کے ساتھ حیات اللہ کی شاہکار کہانی ''آخری کوشش'' میں ابھرا ہے۔ حق یہ ہے کہ حیات اللہ نے اگر زندگی میں صرف یہی ایک کہانی لکھی ہوتی تو بھی انھیں زندۂ جاوید رکھنے کے لیے کافی تھی۔ شہر میں ملازمت کے لیے بھٹکنے والا ایک کسان اپنے گاؤں واپس آتا ہے تو شہر کی ساری چالاکیاں اور وہاں کا لالچ اور ترغیبات دل میں گھر کر چکی ہیں، گاؤں آکر دیکھتا ہے تو کھیت پک چکے ہیں گھر تباہ ہو چکا ہے۔ بھائی کا بُرا حال ہے، بہت محنت مشقت کر کے بھی دو وقت کی روٹی نہیں کھلا پاتا۔ ماں بہت بوڑھی ہوگئی ہے، ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے اور سوائے بھوک کو ظاہر کرنے کے لیے ہر وقت ہاتھ منہ کی طرف لے جاکر ''باب''، ''باب'' کے الفاظ ادا کرنے کے اور کچھ بول بتلا بھی نہیں سکتی۔

شہر کے لالچ اور چالاکیاں سیکھے ہوئے ذہن نے فوراً ایک منصوبہ تیار کرلیا۔ کیوں نہ ماں کو لے کر شہر چلا جائے اور وہاں اس کے ذریعے بھیک مانگی جائے، لوگ بوڑھی عورت کے ''باب''، ''باب'' کی صدا پر رحم کھا کر بھیک ضرور دیں گے اور عین اس وقت جب یہ منصوبہ کامیابی کی ابتدائی منزلوں میں تھا، بھیک کی رقم کے بٹوارے پر دونوں بھائیوں میں مار پیٹ تک نوبت پہنچتی ہے اور اسی دھینگا مشتی میں

ماں مر جاتی ہے اور منصوبہ ادھورا رہ جاتا ہے۔

یہ عمل کتنا بھیانک ہے، بوڑھی ماں کا استعمال وہ بھی بھیک کے پیالے کی طرح... مگر ذرا اس سارے قضیے پر اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالیے تو بہر حال، شہر کے تربیت یافتہ دیہاتی کے لیے یہ بھی ایک ضرورت تھی اور ضرورت ایسی جو ایجاد کو جنم دیتی ہے اور یہ ایجاد صرف نئی چیزوں ہی کی نہیں ہوتی نئی قدروں کی بھی ہوتی ہے، یعنی وہی سوال ''قدر'' کا، گناہ اور ثواب کا، ایجاد اور ضرورت کا، جسے آپ اچھا یا برا کہتے ہیں اسے آپ نے اپنے نقطۂ نظر سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ ذرا گھسیٹا کی نظر سے دیکھیے تو اس میں نیا جواز دکھائی دے گا۔

یہی سوال اور زیادہ ابھر کر حیات اللہ کی ایک اور کہانی میں سامنے آتا ہے اور یہ کہانی بھی ایسے معرکے کی کہانی ہے کہ شاید ہی اردو میں دوسری کہانی اس طرز کی لکھی گئی ہو۔ ایک نظم اختر الایمان نے ''سید ناصر حسین سے'' اس طرز کی ضرور لکھی ہے مگر کہانی اپنے طرز کی واحد کہانی ہے۔ عنوان ہے ''چچا جان''۔ بھتیجا اپنے مرحوم چچا کے اوصاف بیان کرتا ہے، کیسے زندگی کے ہر موڑ پر چچا جان نے اس کی اور دوسروں کی مدد کی، پوری زندگی ملک اور قوم کی خدمت میں لگا دی۔ لطف یہ ہے کہ جن احسانات کو وہ خوبیاں بتا کر بیان کر رہا ہے وہ سب برائیاں ہیں۔ وہ خود غرضی، رشوت خوری، اپنے مرتبے سے غلط قسم کے فائدہ اٹھانے، کنبہ پروری اور نہایت گھٹیا قسم کے جوڑ توڑ کی باتیں ہیں اور بھتیجے کو مطلق اندازہ نہیں کہ یہ ہنر نہیں عیب ہیں اور چچا جان ملک وقوم اور انسانیت کے محسن نہیں مجرم تھے۔

اس کہانی کا محور بھی بدلتی ہوئی اخلاقیات ہی ہے یعنی ''قدر'' کی تلاش۔ فرد ہر اس عمل کو نیکی سمجھ لیتا ہے جس سے اسے فائدہ پہنچتا ہو، مگر درحقیقت جو اس کے فائدے کی بات ہوتی ہے وہ دوسروں کے لیے بلکہ پورے ملک وقوم اور انسانیت کے لیے بڑی نقصان رساں ثابت ہوتی ہے۔ یہ کہانی محض ایک فرد کا مطالعہ نہیں ہے، چچا جان پر عدم اعتماد کی تجویز منظور کرنا حیات اللہ کو منظور نہیں، وہ انھیں بے نقاب کرنا بھی نہیں چاہتے، ان کا نشانہ تو وہ معاشرہ ہے جس نے مجرم چچا جان کو ہیرو کی بلندی پر کھڑا کر دیا ہے۔ اور اسی لیے جب بھتیجے کو قبرستان میں چچا جان کی قبر کے آس پاس کسی مردہ جانور کا ڈھانچا اور آخور ملتا ہے تو کہانی پڑھنے والے تو چچا جان کی اصل حقیقت جان لیتے ہیں، مگر بھتیجے کو قدرت کی اس ''بے انصافی'' پر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے ''نیک'' انسان کا انجام اس قدر دردناک ہوا!

قدروں کا یہی چوراہا (یا اسے بھٹی کہا جائے) جہاں مختلف قدریں ملتی ہیں، گلائی اور تپائی جاتی ہیں اور نئی شکل پاتی ہیں، حیات اللہ کو ناول ''گھروندا'' کی طرف لے گیا، اس میں انھوں نے جاننے کی کوشش کی کہ آخر جب انسان نے تہذیب شروع شروع میں اپنائی ہوگی اور مل جل کر رہنے کا پہلا تمدنی تجربہ کیا ہوگا تو قدروں کی تشکیل کی نوعیت کیا رہی ہوگی؟ نیکی کسے کہا ہوگا اور بدی کسے قرار دیا ہوگا؟ ''گھروندا'' کا ہیرو اپنی محبوبہ کے سہارے غاروں میں زندگی گزارتا ہے اور وہاں وہ مختلف قدروں کو بنتا

بگڑتا دیکھتا ہے، جنھیں اس نے ابھی تک مسلمات میں شامل کر رکھا تھا اور جن پر سوالیہ نشان لگانے کا کبھی اسے خیال ہی نہیں آیا تھا، مثلاً ایک عورت کی صرف ایک مرد سے وفاداری اور لگاؤ، چوری یا رقابت اور لگاوٹ۔۔۔ ''گھروندا'' قدروں کے اسی تشکیلی عمل کی داستان ہے اور گو اس کا اختتام الم ناک جدائی ہے مگر اس دوران قدروں کی تشکیل اور شکست و ریخت کا وہ سلسلہ سامنے آتا ہے جیسے ہم نے تمدنوں کے کئی یگوں کی سیر کرلی ہو۔

باتوں باتوں میں ہم تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی کہانیوں کے کوچے سے ناول کی طرف نکل آئے۔ یہاں ''لہو کے پھول'' کا ذکر نہیں ہوگا کہ وہ ذرا تفصیل طلب ہے لیکن ''مدار'' کا ذکر لازم ہے۔ یہاں پھر حیات اللہ اپنے مختصر ناولٹ کے ذریعے اپنی بنیادی تلاش کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں اس سے قطع نظر کہ حیات اللہ نے اس کے لیے اسے جس تہذیبی فضا میں رکھا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال اردو کے افسانوی ادب میں نہیں یعنی نیپال اور تبت کے پڑوس میں اجنبی تہذیبوں کی پرچھائیوں میں یہ ناولٹ نئی جگمگاہٹ حاصل کرتا ہے۔ اس سے کہیں بڑھ کر یہ کہ ہندوستان کے ایک متمدن شہری جاسوس اور اپنے قبیلے سے بچھڑی ہوئی ایک قبائلی دوشیزہ کی داستانِ محبت میں مشترک قدر کیا ابھرتی ہے یا کون سی وہ قدر ہے جو ان کو ملاپ سے روکتی ہے اور شیرازہ بندی میں حائل ہوتی ہے۔۔۔ بڑی نازک اور لطیف باتیں صرف اپنی مادری زبان ہی میں ادا ہوتی ہیں اور یہ زبان مشترک نہ ہو تو شخصیت کا اظہار ادھورا رہ جاتا ہے۔ ''مدار'' کی ہیروئن کو یہی کمی اپنے شیدائی سے چھڑا کر اپنے ہم زبانوں تک لے جاتی ہے۔

اردو افسانے نے بڑے موڑ پھیر سے اپنا سفر جاری رکھا ہے۔ کبھی محض فضا آفرینی میں کھویا رہا کبھی صرف اپنے دور کی عکاسی میں، کبھی دیہی اور شہری معاشرتوں کی مرقع سازی کرتا رہا تو کبھی نفسیات کی بھول بھلیّوں میں اتر گیا، لیکن حیات اللہ کے ہاں افسانے کو جو فکری بالیدگی اور سماجیاتی گہرائی ملی ہے وہ کہیں اور کبھی میسر نہیں آئی۔

یہ پہلو سامنے رہے تو حیات اللہ کے افسانوں کے موضوعات، نفسِ مضمون اور کردار سبھی کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ان پر مزید گفتگو کی ضرورت تو ہے مگر یہاں گنجائش نہیں، البتہ یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ حیات اللہ کے ہاں قدر سازی کے اس عمل میں جذبات کے ریلے بے قابو نہیں ہو پائے ہیں جسے حسرت موہانی کے لفظوں میں ''تہذیب رسم عاشقی'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ محبت کا یہ ایک ایسا روپ ہے جو حیات اللہ کی اختیاری پہچان بن گیا ہے، یہاں اس لطیف لگاؤ کا ذکر ضروری نہیں جو ''مدار'' کے ہیرو اور ہیروئن کے درمیان ہے یا جو والہانہ پن کے ساتھ ''گھروندا'' میں بکھرا ہوا ہے۔ شاید اس کی سب سے بھرپور مثال حیات اللہ کے افسانے ''شکرگزار آنکھیں'' ہے جو تقسیم ہندوستان کے بعد کے فرقہ وارانہ فسادات پر لکھی گئی کہانی ہے اور جس میں ایک کردار اپنے جسم پر خنجر سے شکرگزار آنکھیں بناتا جاتا ہے اور خون میں نہاتا رہتا ہے۔

انسانی زندگی کی کیسی بصیرت ہے ان کہانیوں میں... قدروں کی تربیت اور تدوین کی کیسی دل دوز تمثال... امیتھیو آرنلڈ کی اصطلاح میں اعلیٰ سنجیدگی اور ارتفاعِ فن... یہی حیات اللہ کی کہانیوں کی خصوصیات ہیں۔ حیات اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے:

> چین سے تین بودھ یاتری تلاشِ حق میں ہندوستان اس زمانے میں آئے تھے جب ایسا سفر موت کے منھ میں جانے کے برابر ہوتا تھا لیکن پھر بھی وہ چین سے چل کھڑے ہوئے تھے۔

حیات اللہ کا تعلق بھی انھی یاتریوں سے ہے اور ان کی یاترا کا سلسلہ افسانوں کے ذریعے انسانی سماج میں قدروں کی تشکیل اور شکست و ریخت کی تلاش سے جا ملتا ہے اور یہ ایک ایسی تلاش ہے جو بے شمار جمالیاتی کیفیتوں کے دھنک رنگ بکھیرتی اور دامانِ نگاہ کو ہفت رنگی پھولوں سے منور کرتی چلی جاتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر اسلم فرخی

نظامؒ شناسی اور پروفیسر خلیق احمد نظامی

نومبر ۹۷ء میں صاحب زادہ سید علیم چشتی اپنے برادر بزرگ سید رفیق چشتی کی پہلی برسی میں شرکت کرنے اجمیر سے کراچی آئے تھے۔ ملاقات ہوئی تو بتانے لگے کہ ''حضرت محبوب الٰہیؒ کے عرس میں خواجہ حسن ثانی نظامی کے یہاں پروفیسر خلیق احمد نظامی سے نیاز حاصل ہوا تھا جو سیمینار میں شرکت کرنے علی گڑھ سے دلی آئے ہوئے تھے۔ نظامی صاحب سیمینار میں بڑے انہماک سے ایک کتاب کے مطالعے میں محو تھے۔ میں نے دیکھا تو کتاب پر آپ کا نام نظر آیا۔ بڑی حیرت ہوئی کہ آپ کی یہ کون سی کتاب ہے جو میری نظر سے نہیں گزری۔ غور سے دیکھا تو کتاب کا نام 'دبستانِ نظامؒ' تھا۔ یہ کتاب آپ نے کب لکھی؟ نظامی صاحب بڑی توجہ سے یہ کتاب پڑھ رہے تھے۔'' میں نے عرض کیا کہ ''یہ کتاب سترھویں کے موقعے پر شائع ہوئی تھی اس لیے آپ تک نہیں پہنچی۔ اب حاضر کروں گا۔''

اگلی دفعہ علیم میاں سے ملاقات ہوئی تو میں نے بڑے دکھ کے ساتھ انھیں نظامی صاحب کی سناؤنی سنائی۔ پھر ہم دونوں بڑی دیر تک اُن کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ یادوں کے چراغ روشن کرتے رہے، اُن کی کتابوں اور اولیائے چشت کے حوالے سے ان کے کارناموں کا تذکرہ کرتے رہے اور بڑی دیر تک ایک مستند عالم، ممتاز مورخ حضرت سلطان جیؒ کے دیرینہ عقیدت مند اور گفتار و کردار کے اعتبار سے ایک نفیس، وضع دار اور قابل قدر انسان کو خراج تحسین پیش کرتے رہے۔

میں نظامی صاحب کے نام اور علمی کارناموں سے ایک مدت سے واقف اور ان کا مداح تھا۔ اسلامی فکر اور تاریخ کے ابلاغ میں انھوں نے جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں، ان کا دل سے معترف تھا اور علمی اعتبار سے خود کو ان کا خوشہ چین سمجھتا تھا لیکن اس روحانی نیازمندی کے باوجود ملاقات کی مسرت بہت بعد میں حاصل ہوئی۔ ذہن میں ان کی عالمانہ اور باوقار شخصیت کا ایک دل نواز تصور تھا۔ مخدومی خواجہ حسن ثانی نظامی کی تحسین اور تائید نے اس تصور کی دل نوازی میں کچھ اور اضافہ بھی کیا تھا۔ خواجہ صاحب ہی کے یہاں نظامی صاحب سے نیاز حاصل ہوا۔ میں نے انھیں دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

بلند بالا، باوقار، سر بڑا سردار کا یہ مصداق بڑا سر، جس پر سفید بالوں کے برف کی ٹھنڈک، فراخ پیشانی، ڈبڈبائی آنکھوں میں کشش جو اپنے بیگانے دونوں کو فوراً اپنی طرف کھینچ لے۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ، گول، چوڑا چہرہ۔ چہرے پر شگفتگی کے ساتھ عالمانہ وقار، شخصیت سے رکھ رکھاؤ کا بھرپور اظہار، ان جان اور ناواقف بھی انھیں دیکھ کر یہی سمجھتا کہ یہ زندگی کے جس شعبے سے بھی تعلق رکھتے ہیں اُس میں امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ اُن سے مل کر تکریم علم اور وضع داری کا احساس ہوتا تھا۔

نظامی صاحب سے میری پہلی ملاقات بڑی مختصر اور رواروی کی تھی۔ وہ حسن میاں کے یہاں سالانہ سیمینار میں آئے تھے۔ میں ایک پاکستانی زائر کی حیثیت سے شریک تھا۔ سیمینار ختم ہوا تو تعارف کی نوبت آئی۔ بڑی محبت سے پیش آئے۔ اندازہ ہوا کہ نظامی صاحب خوردی اور بزرگی کے تعلقات کو نباہنے کی روش سے پوری طرح آگاہ ہیں اور چھوٹوں سے نرمی اور ملاطفت سے پیش آتے ہیں۔ ''تاریخ مشائخ چشت'' کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ اس گفتگو کے دوران نظامی صاحب نے ہنس کر کہا، ''آپ کے یہاں ناشروں نے اس کتاب کو خوب خوب چھاپا مگر کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ ایک نسخہ مجھے بھی بھیج دیتا۔'' پھر کہنے لگے، ''دونوں ملکوں کے ناشروں کا حال ایک ہی جیسا ہے۔'' اس ملاقات کے بعد دو تین مختصر ملاقاتیں اور ہوئیں۔ آخری ملاقات تفصیلی تھی۔ صبح سے شام تک ساتھ رہا۔ وہ حسن میاں کے یہاں مقیم تھے۔ میں پہنچا تو گفتگو چھڑ گئی اور شام تک مسلسل جاری رہی۔ کھانے کے دوران بھی گفتگو ہوتی رہی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کے حوالے سے بڑی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ بڑی سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ بے شمار پہلوؤں پر گفتگو ہوئی۔ میں نے شکوہ کیا کہ آپ نے حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے سالِ ولادت اور شیخ فریدالدین مسعودؒ کے سالِ وصال کے بارے میں کماحقہ تحقیق نہیں کی۔ اب تک جو مختلف بیانات سامنے آئے ہیں وہ باہم متناقص ہیں۔ ''مخبرالواصلین'' میں باواصاحب کا سالِ وصال ۶۷۰ھ درج ہے۔ کیوں درج ہے؟ ماخذ کیا ہے؟ اس پر غور ہونا چاہیے جب کہ ''اخبارالاخیار'' میں ۶۶۴ھ ہے۔ یہ فرق کس لیے ہے؟ نظامی صاحب نے میرا شکوہ بڑے غور سے سنا اور پھر یہ طے ہوا کہ سالِ ولادت اور سالِ وصال کے بارے میں پوری مؤرخانہ دیانت سے تحقیق کی جائے گی اور کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنے کی کوشش ہوگی۔ بعض دوسرے امور پر بھی تبادلۂ خیال ہوا۔ نظامی صاحب کا علم بڑا حاضر، حافظہ غیر معمولی، یادداشت نہایت تیز اور نظر بڑی عمیق تھی۔ گفتگو میں موقعے موقعے سے اس کا اظہار ہوتا رہتا تھا۔ اپنی شگفتہ اور منفرد تحریر کی طرح تقریر میں بھی ان کا انداز بڑا نکھرا اور پُراعتماد تھا۔ بڑے وثوق سے گفتگو کرتے۔ گفتگو میں استادوں والا ہچو من دیگرے نیست کی طرح کا بے کیف خودپسندانہ انداز مطلق نہیں تھا۔ کم از کم مجھے یہ خوش فہمی ہے کہ انھوں نے میرے معروضات کو بڑی توجہ اور برابری کی علمی سطح سے سنا۔ بڑے تحمل سے سنا اور جہاں اختلاف کیا وہاں شائستگی، سلیقے اور تحمل کا مظاہرہ کیا۔ ان کا انداز بڑا ستھرا اور آج کل کے سیاسی محاورے میں بڑا شفاف تھا۔

نظامی صاحب جیسے عالم، نام ور استاد اور ماہرِ تعلیم کے بارے میں تین چار سرسری اور ایک دن کی تفصیلی ملاقات کی بنیاد پر میرا تاثر یہ ہے کہ وہ ایک بے داغ، نکھری اور علم اور وضع داری سے مزین شخصیت کے حامل تھے۔ جامہ زیب تھے۔ لباس نفیس پہنتے تھے لیکن بنیادی طور پر سادگی پسند تھے۔ ایک دسترخوان پر ساتھ کھانا کھانے سے یہ اندازہ ہوا کہ آدابِ دسترخوان اور خوردن برائے زیستن کے قائل تھے۔ ہنس مکھ تھے۔ تاریخ کے گہرے مطالعے نے ان کے ذہن وفکر میں روشنی پیدا کی تھی، ماضی پرست اور خشک مزاج نہیں بنایا تھا۔ علمی اور مؤرخانہ دیانت کے حامل تھے۔ مجھ جیسے طالب علم کے لیے یہ بات باعثِ افتخار ہے کہ انھوں نے اپنی انگریزی تالیف "The Life And Times of Sheikh Nizam uddin Auliya"R.A کی منتخب کتابیات میں میری دو تالیفات ''نظامؒ رنگ'' اور ''صاحب جی سلطان جیؒ'' کے نام بھی درج کیے ہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ہمارے دور کے اور غالباً ہر دور کے اُن صاحبانِ علم و بصیرت میں شامل ہیں جو اپنی زندگی کے لیے ایک واضح مقصد کا تعین کر لیتے ہیں اور پھر ساری زندگی اس مقصد کے حصول، اس عشق کی سرفرازی اور صداقت کی دُھن میں سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ نظامی صاحب نے اولیائے چشت کی مبارک زندگیوں، ان کے افکار و تعلیمات کو صحیح رنگ و آہنگ میں پیش کرنے اور تاریخی تناظر میں بیان کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ان کا یہ عشق زندگی بھر ان کا رفیق رہا۔ بہ قول بہادر شاہ ظفر:

غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

شعلۂ عشق ایسے ہی عاشقِ صادق کے غم میں سیاہ پوش ہوتا ہے۔ شعلۂ عشق ہی پر کیا منحصر، آج سارا زمانہ علم کی ناقدری کے غم میں سیاہ پوش ہے۔ اس حوالے سے مجھے یاد آتا ہے کہ اس آخری تفصیلی ملاقات میں، میں نے انجمن ترقی اردو کا رسالہ ''قومی زبان'' نظامی صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس شمارے میں ڈاکٹر معین الحق مرحوم کے بارے میں ایک تعزیتی مضمون بھی شامل تھا۔ نظامی صاحب نے پرچہ اِدھر اُدھر سے دیکھا تو ان کی نظر اس مضمون پر پڑی۔ ایک لمحے کے لیے سنّاٹے میں آگئے۔ کہنے لگے، ''اچھا معین الحق صاحب رخصت ہوگئے اور علی گڑھ میں کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی۔'' پھر بڑی دیر تک ڈاکٹر صاحب کی شخصیت، ان کی تالیفات اور علم کی ناقدری پر گفتگو ہوتی رہی۔ نظامی صاحب افسوس کرتے رہے کہ تاریخ کا ایک بڑا عالم ناقدریِ زمانہ کا شکار ہوکر گم نامی کی موت مر گیا۔ یہ نظامی صاحب کی شخصیت کا ایسا پہلو تھا جو آج تک میرے دل پر نقش ہے۔ کچھ اداسی، کچھ تاسف، قدرے دل گرفتگی، آواز میں ہلکا سا ارتعاش اور چہرے پر غم کی ایک واضح لہر۔ نظامی صاحب کا ایک روپ یہ بھی تھا۔ بڑا پن اس روپ میں بھی نمایاں تھا۔

(۲)

بیسویں صدی تاریخ انسانی کی بڑی اہم، پیچیدہ، دہشت ناک، انکشافات و ایجادات اور ذہنی، فکری اور سیاسی بیداری کی صدی ہے۔ یہ صدی دو عالم گیر جنگوں کی حامل ہے۔ جوہری توانائی کا حصول اسی صدی میں ممکن ہوا اور جوہری بم گرائے جانے کا مشاہدہ بھی اسی صدی نے کیا۔ ایشیا اور افریقا میں آزادی کی لہر کو ابھرتے ہوئے اسی صدی نے دیکھا۔ پاکستان کا قیام اور ہندوستان کی آزادی اسی صدی کا واقعہ ہے اور یہی صدی عالمی دہشت گردی، دھونس، دھاندلی، سیاسی اور معاشی استحصال سے بھی عبارت ہے مگر ان سب باتوں کے باوجود یہ بیسویں صدی مجھے بہت عزیز ہے۔ کیوں عزیز ہے؟ اس کا جواب ''لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید'' میں مضمر ہے۔ مجھے یہ صدی اس لیے عزیز ہے کہ یہ مطالعۂ سیرت نبویؐ اور ''نظامؒ شناسی'' کی صدی ہے۔ اس صدی میں خواجۂ راستین، امام العاشقین، سلطان المشائخ، حضرت نظام الدین اولیا، محبوبِ الٰہیؒ کے بارے میں جو علمی، تاریخی اور تحقیقی کام انجام پایا ہے وہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضرت سلطان جیؒ کے بارے میں دو مستند کتابیں ''فوائد الفواد'' (مجموعۂ ملفوظات) اور ''سیر الاولیا'' آٹھویں صدی ہجری میں مرتب ہوئیں۔ اس کے بعد حضرت کے افکار و آثار تذکروں اور تاریخوں کا حصہ بنتے رہے لیکن سیرت و سوانح پر کوئی مستقل کتاب مرتب نہیں ہوئی۔ درویش جمالیؒ کی ''سیر العارفین'' سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور مختلف تذکروں میں ذکرِ انور قلم بند ہوتا رہا۔ ادھر ضیاء الدین برنیؒ کی ''تاریخ فیروز شاہی'' سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور مختلف تاریخوں میں ''حکایاتِ لذیذ'' کے ساتھ جزوِ تاریخ بنتا رہا۔ ''سیر الاولیا'' کے بعد جو سوانحی کتاب نظر آتی ہے اس کا تعلق بارھویں صدی ہجری سے ہے۔ یہ مولانا محمد بولاق کی تالیف ''مطلوب الطالبین'' ہے جو ۱۱۱۱ھ میں مرتب ہوئی۔

''مطلوب الطالبین'' کے خطی نسخے کتب خانوں میں ملتے ہیں لیکن اس کا متن آج تک شائع نہیں ہوا۔ فارسی سے بڑھتی ہوئی ناواقفیت کی بنا پر اب بہ ظاہر اس کا کوئی امکان بھی نہیں۔ ایک اردو ترجمے کا اشتہار مولوی یٰسین علی نظامی کی کتاب ''سیرتِ نظامی'' میں میری نظر سے گزرا ہے۔ لیکن تلاش کے باوجود یہ ترجمہ مجھے دست یاب نہیں ہوا۔ کراچی کے قومی عجائب خانے میں ''مطلوب الطالبین'' کا ایک خوش خط نسخہ موجود ہے۔ میری درخواست پر محبِ مکرم پروفیسر لطیف اللہ صاحب نے اس نسخے سے اردو ترجمہ تیار کیا اور مفید حواشی کے ساتھ اسے شائع کر دیا۔ آٹھویں صدی کے بعد بارھویں صدی میں حضرت سلطان جیؒ کی دوسری سوانح شائع ہوئی اور اس کے بعد پھر ایک سناٹا طاری ہو گیا۔

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر یعنی تیرھویں صدی ہجری کے اختتام کے قریب ''نظام شناسی'' کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا یعنی دو بنیادی کتابیں ''فوائد الفواد'' اور ''سیر الاولیا'' شائع ہوئیں۔

''فوائد الفواد'' دلّی اور لکھنؤ سے شائع ہوئی اور بستی نظام الدین دلی کے رئیس چرنجی لال نے ''سیر الاولیا'' ۱۸۸۵ء میں شائع کی☆۱ اور مولانا غلام احمد بریاں نے ۱۸۹۲ء میں ''فوائد الفواد'' کا اردو ترجمہ بھی شائع کر دیا۔

''سیر الاولیا'' کا چرنجی لال ایڈیشن آہستہ آہستہ کم یاب ہوتا گیا۔ پروفیسر حبیب نے اپنی کتاب ''حضرت نظام الدین اولیاؒ: حیات و تعلیمات'' میں اس ایڈیشن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اب یہ چھپی ہوئی کتاب کہیں نہیں ملتی ہے اور اس کا کاغذ بھی اس قدر خراب ہوگیا ہے کہ موڑنے سے پھٹ جاتا ہے۔'' اور حاشیے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''سیر الاولیا'' (مطبوعہ چرنجی لال) کی ایک جلد مسلم یونی ورسٹی لائبریری میں تھی۔ میں نے اس کو تین چار دفعہ پڑھا لیکن ہر صفحہ الٹنے سے پھٹ جاتا تھا اس لیے کتاب بے کار ہوگئی۔ پروفیسر نظامی صاحب کے پاس ''سیر الاولیا'' کا نسخہ ہے اور انھوں نے یہ کتاب تیار کرنے کے لیے مجھے اپنی کتاب مستعار دی ہے لیکن میں اس کو استعمال کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔''☆۲ اس اشاعت کے ترانوے برس بعد لاہور سے ''سیر الاولیا'' کا نیا ایڈیشن شائع ہوا جو چرنجی لال ہی کے نسخے کا عکس ہے۔ مولانا غلام احمد بریاں نے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کر دیا تھا۔

یہ انیسویں صدی کی روداد تھی۔ بیسویں صدی دراصل حضرت سلطان جیؒ کی بازیافت کی صدی ہے، عرفانِ نظام کی صدی ہے۔ اس صدی میں حضرت کے حوالے سے جو کام ہوا، جتنا کام ہوا، حضرت کے سوانح، سیرت اور تعلیمات کو جس طرح عام کیا گیا وہ نہایت اہم، قابلِ قدر اور تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔ اس کام کی دو جہتیں ہیں۔ پہلی جہت یہ کہ مختلف عالموں اور بزرگوں نے اولیائے کرامؒ اور ان کے روحانی اور خانقاہی نظام کے ایک وسیع تناظر کو اپنا موضوع بنایا اور اسے پوری شرح و بسط اور تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ وسیع تناظر کے اس خصوصی مطالعے سے حضرت سلطان جیؒ کی سیرت اور کارنامے بھی بیان ہوئے ہیں اور بے شمار مضامین، مقالوں اور کتابوں میں انھیں مرکزی حیثیت بھی حاصل ہوئی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ برصغیر کے اسلامی روحانی اور خانقاہی نظام کے مطالعے اور تفہیم میں حضرت سلطان جیؒ کی ذاتِ گرامی کتنی اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں اس جہت کا ایک مختصر جائزہ نامناسب نہ ہوگا لیکن اس مختصر جائزے میں صرف اہم تحریروں ہی کی نشان دہی ممکن ہے۔

یہ جائزہ مولانا مناظر احسن گیلانی کی تالیف ''پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت'' سے شروع ہوتا ہے۔ مولانا کی اس تالیف کا دوسرا حصہ بڑی حد تک حضرت سلطان جیؒ کی تعلیمات پر مبنی

☆۱۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کے بہ قول ''سیر الاولیا'' سب سے پہلے ۱۸۶۰ء میں دلی سے چھپی تھی۔ ''نقد ملفوظات''، ص ۲۱۰، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۹ء۔

☆۲۔ ''حضرت نظام الدین اولیاؒ: حیات و تعلیمات''، پروفیسر محمد حبیب، ص ۱۲، شائع کردہ شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی، ۱۹۸۷ء۔

ہے۔ اس جائزے میں دوسرا نام شیخ محمد اکرام کا ہے۔ ان کی تالیف ''آبِ کوثر'' میں حضرت کی حیات و تعلیمات کو سیر حاصل انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی اس جائزے کا ایک اہم نام ہیں۔ مولانا کی تالیف ''تاریخ دعوت و عزیمت'' کا تیسرا حصہ بڑی حد تک حضرت ہی سے متعلق ہے۔ اس حصے کو ''سوانح حضرت محبوب الٰہیؒ'' کے نام سے علاحدہ بھی شائع کیا گیا ہے۔ مولانا صباح الدین عبدالرحمان کی ''بزمِ صوفیہ'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ محب مکرم ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی ''نقدِ ملفوظات'' اور بعض دوسرے مضامین کا تعلق بھی اسی سلسلے سے ہے اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کی تالیفات ''سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات اور تاریخ مشائخ چشت'' کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ پروفیسر صاحب کے متعدد مضامین بھی اسی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پروفیسر محمد حبیب کے بعض انگریزی مضامین اور ڈاکٹر سید معین الحق کی تالیف "Islamic Thought and Movement in The Sub Continent" بھیؒ اسی زمرے میں شامل ہے۔ یہ صرف چند بڑے نام تھے۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار مؤرخوں اور عالموں کے تالیفی کارنامے ہیں جو حضرت کے افکار و تعلیمات کو نمایاں کرتے ہیں۔

دوسری جہت یعنی وہ کام جو براہِ راست حضرت سلطان جیؒ سے متعلق ہے، بیسویں صدی کے اوائل ہی سے شروع ہوگیا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں محمد سعید احمد مارہروی نے ''حیاتِ خسروؒ'' شائع کی تو اس میں حضرتؒ کے سوانح بہ طور ضمیمہ شامل کیے۔ ۱۹۱۳ء میں مولوی لیٰسین علی نظامی نے ''سیرتِ نظامی'' شائع کی۔ یہ ایک مبسوط لیکن روایتی انداز کی سوانح ہے جس کی اشاعت میں اپنی جانشینی کے حق کا اظہار بہ درجۂ اتم نمایاں ہے۔ مولوی صاحب نے علی محمود بن جاندارؒ کے مرتب کردہ ملفوظاتِ دُررِ نظامی کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ ان ملفوظات کا فارسی متن شائع نہیں ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں مولوی بشیرالدین احمد نے ''واقعاتِ دارالحکومت دہلی'' میں پینسٹھ صفحے حضرت کے سوانح اور مزار مبارک کی تفصیل میں صرف کیے۔ خواجہ حسن نظامیؒ کی بعض اہم تحریریں حضرتؒ کے افکار و تعلیمات سے متعلق ہیں اور خواجہ صاحبؒ کی مرتبہ ''نظامی بنسری'' ایک نہایت دلچسپ اور معنی خیز روداد ہے، جس میں تخلیقی سطح پر سیرت کی بازیافت ہے۔ پروفیسر محمد حبیب کی تالیف ''حضرت نظام الدین اولیا: حیات و تعلیمات'' عالمانہ ژرف نگاہی کا مرقع ہے۔ علامہ اخلاق حسین دہلوی کی تالیف وسوانح حضرت محبوب الٰہی، اگرچہ روایتی انداز میں مرتب کی گئی ہے تاہم مؤلف نے ذاتی تحقیق اور دید و دریافت سے کام لیا ہے اور روایت پرستوں کی غیر معتبر روایتوں کی مسکت تردید کی ہے۔ نیز حضرتِ والاؒ کے سالِ ولادت کے سلسلے میں بھی سیر حاصل تحقیق سے کام لیا ہے۔ راقم الحروف کی چار کتابیں ''نظامؒ رنگ''، ''صاحب جی سلطان جیؒ''، ''فرید و فرد فرید'' اور ''دبستانِ نظامؒ'' کا تعلق بھی اسی سلسلے سے ہے۔ تاہم اس سلسلے کی اہم ترین کتابیں پروفیسر خلیق احمد نظامی کی ''شیخ نظام الدین الاولیا'' اور The Life and Times of Sheikh Nizam uuddin Auliya ہیں۔ یہ دونوں تالیفات اپنے مؤرخانہ طریقۂ کار اور عقیدت و احترام کی وجہ سے نظام شناسی میں خصوصی اہمیت کی

حامل ہیں۔ آگے چل کر ہم ان کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

''فوائد الفواد'' اور ''سیر الاولیا'' کے تراجم کی اشاعت پر بھی توجہ کی گئی۔ لاہور سے ''فوائد الفواد'' کا فارسی متن بڑے اہتمام سے شائع ہوا۔ بریاں کے ترجمے کے علاوہ ایک ترجمہ ''اللہ والے کی قومی دکان'' سے شائع ہوا۔ مسلم احمد نظامی نے ابتدا میں بریاں کا ترجمہ اپنے دارالاشاعت سے شائع کیا پھر خود ترجمہ کیا اور ''ارشاد محبوب'' کے نام سے شائع کیا۔ لاہور سے پروفیسر محمد سرور جامی کا ترجمہ شائع ہوا۔ کراچی سے شمس بریلوی کے ترجمے نے اشاعت پائی۔ لیکن سب سے نفیس اور دل کش ترجمہ خواجہ حسن ثانی نظامی کا ہے۔ خواجہ صاحب، صاحبِ طرز انشاپرداز، ادبؒ کی تابندہ روایت کے امین اور حضرت سلطان جیؒ کے خواہرزادے۔ ان سے بہتر ترجمہ اور کون کر سکتا ہے؟ وہ ''فوائد الفواد'' کی صحیح اور سچی معنویت کو اردو میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ برادرم ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے اس ترجمے کا عالمانہ اور تفصیلی دیباچہ لکھا ہے جو حضرت سلطان جیؒ کے سوانح اور تعلیمات کے حوالے سے بہ ذاتِ خود نہایت محققانہ اور عالمانہ تالیف ہے۔

پروفیسر بروس لارنس نے "Morals for the Heart" کے عنوان سے ''فوائد الفواد'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ ترجمہ راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔

''سیر الاولیا'' کا ترجمہ ''بریاں'' متعدد بار شائع ہوا۔ اسی ترجمے کو بنیاد بنا کر اعجاز الحق قدوسی نے بھی ''سیر الاولیا'' کو اردو میں منتقل کیا۔ قدوسی کا ترجمہ لاہور سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس ترجمے کی خصوصیت مفید حواشی ہیں۔

مستند، معتبر اور اہم کاموں کے ساتھ ساتھ غیر مستند، غیر معتبر اور غیر اہم کام بھی بہت ہوئے ہیں۔ عقیدت مندوں نے جوشِ عقیدت میں ایسے واقعات تراش لیے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ محبت کے بھی آداب ہوتے ہیں لیکن ''درجنوں از خود رفتن کار ہر دیوانہ نیست'' کے بہ مصداق لکھنے والوں نے ایسی حکایتیں اور روایتیں بھی لکھ دیں جو سراسر کذب و افترا کے ذیل میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر لاہور سے شائع ہونے والی ایک کتاب ''تذکرۂ حضرت نظام الدین اولیاؒ'' مرتبہ مقصود ایاز کی ابتدا یوں ہوتی ہے: ''سلطان المشائخ محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ سلسلۂ چشتیہ کے خلفا میں تھے۔ آپ کا ایک لقب شمس الملک بھی ہے جو بادشاہِ ہندوستان غیاث الدین بلبن نے دیا تھا۔''[☆☆۳] اور ملاحظہ فرمایئے، ''ایک روز نظام الدینؒ اپنے استاد مولانا کمال الدین کی محفل میں موجود تھے کہ حسن نامی قوال ان کے پاس موجود تھا۔ ان سے بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے متعلق پوچھ رہے تھے اور حسن قوال حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی علیہ الرحمۃ کی فیاضی، اخلاق اور علمی قابلیت کے متعلق بتاتا رہا۔''[☆☆۴] حقائق یہ ہیں کہ استاد تھے

☆☆۳۔ ''تذکرۂ حضرت نظام الدین اولیاؒ''، مرتبہ مقصود ایاز، ص ۵، شاعِ ادب، لاہور۔

☆☆۴۔ ایضاً، ص ۷

مولانا علاؤ الدین اصولیؒ اور قوال تھا ابوبکر خراط اور یہ واقعہ خود حضرت سلطان جیؒ نے اپنی ایک مبارک مجلس میں بیان فرمایا تھا۔

دراصل ان غیر معتبر کتابوں سے جو محض عقیدت یا تجارتی بنیادوں پر مرتب ہوئی ہیں، کردار سازی کے بجائے کردار کشی کا عمل وجود میں آتا ہے۔ غیر مصدقہ اطلاعوں اور معلومات سے صورت حال بالکل تبدیل ہو جاتی ہے، تاہم یہ موضوع اس وقت ہمارے دائرۂ فکر سے غیر متعلق ہے۔ مقصد صرف یہ دکھانا تھا کہ عقیدت و محبت اور تجارتی مقاصد کی تکمیل کے لیے ایسی کتابیں بھی مرتب ہوئی ہیں جو حقیقتاً بڑی گم راہ کن ہیں۔

راقم الحروف کی رائے میں سلسلۂ سوانح میں چار کتابیں اہمیت کی حامل ہیں۔ پروفیسر حبیب کی کتاب، علامہ اخلاق حسین کی کتاب اور پروفیسر خلیق احمد کی انگریزی اور اردو کتابیں۔ نظامی صاحب کو اپنی دونوں کتابوں کی وجہ سے اس سلسلے میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

علامہ اخلاق حسین کی کتاب جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، روایت پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ روایت شکن بھی ہے اس میں جن مقبول روایتوں کی تردید کی گئی ہے وہ حضرتؒ کے سوانح کا حصہ بنا دی گئی تھیں۔ مسکت تردید سے ان کی نفی ہوگئی۔ حضرت والاؒ کے سالِ ولادت کی تحقیق میں بھی علامہ نے بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔ یہ بحث آگے آئے گی۔

پروفیسر محمد حبیب نے اپنی کتاب مؤرخ/عقیدت مند کے نقطۂ نظر سے منسوب کی ہے۔ یہ مؤرخانہ دیانت اور ادب و احترام کی حامل ہے۔ تاہم مؤرخانہ دیانت اور احتیاط کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

حبیب صاحب نے مؤرخوں کے معیاری طریقے سے کام لیتے ہوئے سب سے پہلے حضرت والاؒ اور آپ کے سلسلے سے متعلق مستند اور غیر مستند ماخذ کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے تاکہ قاری کو ماخذ کی حقیقت اور اصلیت سے آگاہی ہو جائے۔ غیر مستند کتابوں کے ضمن میں انھوں نے دوٹوک انداز میں ملفوظات کے ان مجموعوں کو رد کیا ہے جو خواجہ غریب نوازؒ، طلب صاحبؒ، باوا صاحبؒ اور حضرت سلطان جیؒ سے منسوب ہیں۔ علما کے ایک گروہ نے حبیب صاحب کے اس فیصلے سے اختلاف کیا ہے۔ کتابوں کی تفصیل کے بعد حبیب صاحب نے حضرت کے عہد کے عام حالات، بدایوں شہر کی تاریخ اور اس کے علما و اساتذہ کا حال قلم بند کیا ہے۔ دوسرا باب حضرتؒ کے خاندان، ولادت اور زمانۂ تعلیم سے متعلق ہے لیکن حبیب صاحب نے حضرتؒ کے سالِ ولادت کے بارے میں کوئی خیال ظاہر نہیں کیا اور حضرتؒ کی والدہ ماجدہ کے ایک خواب کو جو اُن کے شوہر کی علالت سے متعلق تھا، قبول کرنے سے یکسر انکار کیا ہے۔ انھوں نے ''سیر الاولیا'' کے اس حوالے کو تسلیم نہیں کیا اور ایک محتاط مؤرخ کی حیثیت سے اسے رد کیا ہے لیکن نظامی صاحب نے اپنی اردو اور انگریزی کتابوں میں ''سیر الاولیا'' اور ''دُررِ نظامی'' کے حوالے سے یہ

خواب درج بھی کیا ہے اور اسے درست ماننے میں کوئی تامل بھی نہیں کیا۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے ایک اور مجموعہ ملفوظات ''قدام العقائد'' کے حوالے سے جو ''سیر الاولیا'' سے بھی پہلے کا ہے، اس خواب کو درست تسلیم کیا ہے۔ حبیب صاحب نے اپنے انکار کے سلسلے میں جو دلائل پیش کیے ہیں انھیں ایک متشکک مؤرخ کا اندازِ فکر سمجھنا چاہیے۔ تیسرا باب خلافت سے متعلق ہے۔ چوتھے باب میں شیخ کبیر کی جدوجہد اور فتوح کا بیان ہے۔ پانچویں باب کا تعلق حضرت والاؒ کی حیات کے آخری برسوں سے ہے۔ چھٹے باب میں مذہبی اور ساتویں باب میں اخلاقی تعلیمات قلم بند کی گئی ہیں۔ ساتواں اور آخری باب مذہبی رواداری سے متعلق ہے، اس باب کا یہ جملہ، ''یہ قصہ غلط ہے کہ سلسلۂ چشتیہ کے صوفیوں نے اسلام کی کوئی تبلیغی کوشش کی ہے۔ صوفیوں کے لیے یہ کام ناممکن تھا، چوں کہ ان کی اصطلاحیں اور ان کی روایات صرف تعلیم یافتہ مسلمان سمجھ سکتے تھے۔ مسلم صوفیوں کا کام مسلمانوں میں محدود تھا۔''☆۵ حبیب صاحب کی رائے سے اتفاق کرنا یوں ممکن نہیں کہ صاحب ''سیر الاولیا'' نے خواجہ معین الدین چشتیؒ کے تذکرے میں ان کی تبلیغی کوششوں کا ذکر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ خواجہ صاحبؒ کی مساعیِ جمیلہ سے توسیع و اشاعتِ اسلام کے کام کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ خلیق احمد نظامی صاحب نے اپنی کتاب "The Life and Times of Sheikh Fareed uddin Masud, Ganj Shaker R.A میں اجودھن کے قرب و جوار سے تعلق رکھنے والے اُن غیر مسلم قبائل کی نشان دہی کی ہے جو باوا صاحب کی تبلیغی کوششوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے، اس لیے یہ خیال درست نہیں معلوم ہوتا کہ چشتی بزرگوں نے کوئی تبلیغی فریضہ انجام نہیں دیا۔

حبیب صاحب کی کتابوں میں بعض اور تسامح بھی نظر آتے ہیں، مثلاً انھوں نے ضیاء الدین برنی کی اس روایت کو غلط قرار دیا کہ جب علاؤ الدین کی فوج ارنگل کا محاصرہ کیے ہوئے تھی تو تقریباً چالیس دن تک بادشاہ کے پاس فوج کی کوئی خبر نہیں آئی۔ علاؤ الدین نے ملک قرابک کو ایک اور افسر کے ساتھ حضرت سلطان جیؒ کی خدمت میں بھیجا تاکہ فوج کے بارے میں کوئی معلومات حاصل ہو۔ برنی کے بہ قول حضرت نے فوج کی خیریت اور فتح مندی کا اظہار فرمایا لیکن حبیب صاحب نے اس بنا پر اس واقعے کو غلط ٹھہرایا ہے کہ امیر خسرو کی ''خزائن الفتوح'' میں صاف طور سے لکھا ہوا ہے کہ قرابک اُس زمانے میں فوج کے ساتھ ارنگل میں تھے۔'' راقم الحروف نے اپنی کتاب ''صاحب جی سلطان جیؒ'' میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے۔ قرابک دو تھے۔ قرابک میسرہ اور قرابک میمنہ۔ ''خزائن الفتوح'' میں قرابک میسرہ کا ذکر ہے۔ قرابک میمنہ مقربِ سلطان اور بارگاہِ سلطانی کا حاضر باش تھا۔ وہ اس مہم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔''☆۶ مگر اس قسم کے تسامحات سے حبیب صاحب کی کتاب کی عظمت کم نہیں ہوتی۔ مؤرخ کا کام ہر روایت کی مؤرخانہ تنقیح ہے۔ اپنی تنقیح میں وہ تشکیک کا شکار بھی ہو جاتا ہے، تاہم اُس

☆۵۔ ''حضرت نظام الدین اولیاؒ: حیات و تعلیمات''، پروفیسر محمد حبیب، ص ۱۷۸

☆۶۔ ''صاحب جی سلطان جیؒ''، اسلم فرخی ص ۲۷۔۳۰، احسن مطبوعات، کراچی

کے کارنامے کا فیصلہ انفرادی رویے، دقتِ نظری، محققانہ دیانت اور مؤرخانہ دید و دریافت سے ہوتا ہے۔ حبیب صاحب اپنی کتاب میں مؤرخ/ عقیدت مند کی حیثیت سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی کتاب نظام شناسی میں ایک یادگار تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے حضرت سلطان جیؒ کی سیرت و سوانح میں دو کتابیں لکھی ہیں۔ متفرق مضامین اور سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخِ مشائخ چشت

The Life and Times of Sheikh Farid uddin Masud Ganj Shaker R.A

اور

The Life and Times of Sheikh Nasir uddin Chiragh R.A

جنھیں اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں سمجھنا چاہیے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ ، شیخ نظام الدین اولیاؒ ۱۹۸۵ء میں اور The Life and Times of Sheikh Nizam uddin Auliya ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی تھیں۔ اردو کی کتاب ۸۷ صفحات اور انگریزی کی کتاب ۲۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ حضرت سلطان جیؒ کی سیرت و سوانح قلم بند کرنے میں خلیق احمد نظامی صاحب کی طرز و روش عقیدت مند/ مؤرخ کی ہے۔ وہ پروفیسر محمد حبیب کی طرح تشکیک کا شکار نہیں۔ ان کی کتابوں میں عقیدت کو تاریخ پر فوقیت حاصل ہے۔ حضرت والاؒ کی والدہ ماجدہ کے جس خواب کو حبیب صاحب نے درست تسلیم نہیں کیا، نظامی صاحب نے اُسے ''دُررِ نظامی'' کے حوالے سے صحیح مانا ہے۔ اس طرح کے بعض اور جزوی اختلافات بھی دونوں مؤرخوں کے یہاں نظر آتے ہیں۔

خلیق احمد نظامی عقیدت مند/ مؤرخ ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد نثری اسلوب کے حامل بھی ہیں۔ ان کی تاریخوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تاریخ نویسی کو انشاپردازی کا جزو بھی سمجھتے ہیں اور تاریخ کو نثر کے منفرد اسلوب میں قلم بند کرنے کے قائل ہیں۔ اس اعتبار سے اُنھیں مولانا شبلی نعمانیؒ، محمد حسین آزاد اور عبدالحلیم شرر کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ان بزرگوں کے یہاں تاریخ خشک اور بے جان موضوع کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ان کے زورِ قلم سے ایک زندہ قوت بن کر اُبھرتی ہے۔ نظامی صاحب کے یہاں بھی ان کے استادانہ اور دل کش نثری اسلوب کی وجہ سے تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے جاذبیت اور خوب صورتی پیدا ہوگئی ہے۔

''شیخ نظام الدین اولیاؒ'' (اردو) ایک دیباچے، مقدمے اور گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ چند اہم ماخذ بھی ایک صفحے میں قلم بند کر دیے گئے ہیں۔ دیباچے میں یہ صراحت ملتی ہے کہ ''حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ'' کی سوانحِ حیات معاصر اور معتبر ماخذ کی روشنی میں تیار کی گئی ہے اور اُن کے حجم کا خیال رکھتے ہوئے مباحث کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا گیا ہے۔'' مقدمے میں نظامی صاحب نے معتبر ماخذ کا تذکرہ کیا ہے۔ ان معتبر ماخذ میں ''فوائدالفواد''، ''دُررِ نظامی''، ''سیرالاولیا''، ''خیرالمجالس''، ''احسن

الاقوال''، ''نفائس الانفاس''، ''شمائل الاتقیا'' اور ''جوامع الکلم'' شامل ہیں۔ بعد کے تذکرہ نگاروں کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ کوئی خاص معلومات فراہم نہیں کرتے۔

کتاب کا پہلا باب تاریخی پس منظر سے تعلق رکھتا ہے۔ اختصار کے باوجود اس باب میں دہلی اور سلطنتِ دہلی کا سیاسی اور ثقافتی پس منظر بڑی خوبی سے بیان ہوا ہے۔ دوسرا باب خاندان، پیدائش اور ابتدائی تعلیم سے متعلق ہے۔ تیسرے باب میں دہلی میں تعلیم کی تکمیل اور فقر کی زندگی کے آغاز کا بیان ہے۔ چوتھا باب بابا فرید کے آستانے پر حاضری اور فیض حاصل کرنے کے بارے میں ہے۔ پانچویں باب میں حضرت سلطان جیؒ سلسلۂ چشت کے سربراہ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ چھٹا باب خانقاہی نظام اور آداب و رسوم سے متعلق ہے۔ ساتویں باب کا موضوع حضرتِ والاؒ کی اخلاقی اور روحانی تعلیم ہے۔ آٹھویں باب میں سلاطین اور سیاست سے بے تعلقی کا تذکرہ ہے۔ نواں باب حضرتِ والاؒ کی شخصیت اور نظام الاوقات پر روشنی ڈالتا ہے۔ دسویں باب میں آخری علالت اور وصال کا تذکرہ ہے اور گیارھویں باب میں روحانی، اخلاقی اور تمدنی اثرات کی نشان دہی کی گئی ہے۔

ابواب کی اس تقسیم سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نظامی صاحب نے اپنی اس کتاب کو تاریخ کے سائنٹفک انداز سے مرتب کیا ہے۔ تاریخی پس منظر میں، مستند تاریخی حوالوں کی مدد سے ایک برگزیدہ شخصیت کا بھرپور مطالعہ قارئین کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس مطالعے میں مکمل تفصیل نہیں ہے، تاہم تشنگی کا احساس کہیں بھی نہیں ہوتا۔ شاید اس وجہ سے بھی نہیں ہوتا کہ یہ ایک مختصر کتاب ہے اور قاری ذہنی طور پر اس کے توسط سے تفصیلی مطالعے کی جستجو بھی نہیں کرتا۔

انگریزی کی کتاب سترہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں سلاطین اور سلطنت سے تعلقات، غیر مسلموں سے تعلقات، انسان، عالم، عارف، اعزّا و اقربا، خلفا اور سیرت کے جائزے کی تفصیل بھی ہے۔ اس طرح یہ صرف حجم ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ معنی و مطالب کے اعتبار سے بھی اردو کتاب پر بھاری ہے۔ تاہم اردو کی کتاب اپنی دل فریب اور پُراثر انشاپردازی کی وجہ سے اپنے اختصار کے باوجود زیادہ دل کش اور مؤثر معلوم ہوتی ہے۔ اس کے اجمال میں وہ تفصیل ہے جو انگریزی تفصیل میں بہ درجۂ اتم ظاہر نہیں ہوئی۔

حبیب صاحب نے اپنی کتاب میں ایک روحانی بزرگ کا مرقع پیش کیا ہے اور اس مرقع نگاری میں اُس عہد کے تاریخی تقاضوں کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ نظامی صاحب کے یہاں وہ روحانی بزرگ اپنے تمام تر تاریخی ماحول، عصری فضا، علم و عرفاں کے ماحول، سلطان اور اس کے دربار کی ریشہ دوانیوں اور خانقاہ سے اس کے تعلقات کی مستند روداد کے ساتھ عوامی روشنی میں جگمگاتے اور اجالا بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ دونوں میں نقطۂ نظر کا نمایاں فرق ہے۔ حبیب صاحب نے تاریخ مرتب کی ہے۔ نظامی صاحب نے تاریخ کو تاریخ ساز شخصیت کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ تاریخ نے اُس بزرگ

کی گفتار و کردار سے تشکیل پائی ہے۔ وہ بہ نفسِ نفیس علم و عرفان کے ساتھ ساتھ تاریخ کا ایک دبستان بھی ہے اور تاریخ اُس کے سہارے سے اپنا راستہ طے کرتی نظر آتی ہے۔

حبیب صاحب اور نظامی صاحب کی کتابوں میں ایک فرق اور بھی ہے۔ حبیب صاحب نے تاریخ کی مدد اور عقیدت کے تعاون سے سیرت مرتب کی ہے۔ نظامی صاحب کے یہاں عقیدت اور تاریخ نے علم، عرفان، آگہی، انسان دوستی اور رواداری سے مملو ایک زندہ، توانا، پُرتاثیر اور دل میں گھر کر جانے والی موہنی شخصیت کے مختلف پہلو اور نقوش اس طرح اجاگر کیے ہیں کہ وہ بزرگ شخصیت ہماری فکر اور زندگی کا جزو بن گئی ہے۔

نظامی صاحب نے اپنی دونوں کتابوں پر بڑی محنت کی ہے۔ انھوں نے ان دونوں کتابوں کی ترتیب و تدوین میں تمام معاصر ماخذ سے استفادہ کیا ہے اور سارے مواد کو بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ یہ کہہ دینا اور لکھ دینا بہت آسان ہے کہ تمام معاصر ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے مگر اس کا صحیح اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو اس خارزار سے گزرا ہو۔ ہزاروں صفحوں کا مطالعہ کر کے موزوں اور مناسب معلومات کا یک جا کرنا اور اُسے سلیقے سے مرتب کرنا مؤرخ، سوانح نگار، عالم اور محقق سب کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ نظامی صاحب چوں کہ سلسلۂ چشت کے حوالے سے نہایت وسیع مطالعے کے حامل تھے اور ان کی دسترس بعض ایسے ماخذ تک بھی تھی جو عام نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں، لہٰذا ان کی ترتیب و تدوین اور استفادے میں بڑی وسعت اور گہرائی ہے۔ ان کی مرتب کی ہوئی بزرگانِ چشت کی تینوں سوانح عمریاں (شیخ فریدالدین مسعودؒ، شیخ نظام الدین اولیاؒ اور شیخ نصیرالدین محمودؒ) اہم، وقیع اور قابلِ قدر انسانی اور تاریخی مرقعے ہیں۔

نظامی صاحب تاریخ کے بڑے عالم تھے اور سلسلۂ چشت کے بارے میں بڑی گہری نظر کے حامل تھے، تاہم ان کی دونوں کتابوں میں بعض ایسے تسامحات بھی ملتے ہیں جن کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ حضرت سلطان جیؒ کے سالِ ولادت کا ہے۔ راقم الحروف نے اس مسئلے کے حوالے سے انھیں متوجہ بھی کیا تھا مگر شاید وہ اپنی دوسری مصروفیتوں کی بنا پر اس طرف توجہ نہیں کر سکے۔

حضرت سلطان جیؒ کے سالِ ولادت کے سلسلے میں مختلف بیانات ملتے ہیں۔ ''فوائد الفواد'' اس سلسلے میں بالکل خاموش ہے۔ ''سیر الاولیا'' میں حضرت سلطان جیؒ کا ایک ارشاد نقل ہوا ہے، ''روز چہار شنبہ آخرین ماہ صفر قوی بابرکت است۔ تولّد ایں ضعیف ہم دریں روز است۔''☆☆٧ اس بیان میں سال اور تاریخ مذکور نہیں ہے۔ شاید اسی وجہ سے پروفیسر حبیب نے محتاط مؤرخ کی حیثیت سے حضرتؒ کا سالِ ولادت اپنی کتاب میں نہیں لکھا۔ نظامی صاحب نے ٢٧ر صفر ٦٣٣ھ لکھا ہے جو اس لیے صحیح نہیں معلوم ہوتا

☆☆٧۔ ''سیر الاولیا''، امیر خورد، ص ٣٩٧، موسسہ انتشارات اسلامی، لاہور، ١٩٧٨ء۔

کہ شواہد اس کے حق میں نہیں ہیں۔ بعضوں نے ۶۳۶ھ، بعضوں نے ۶۳۸ھ اور علامہ اخلاق حسین نے ۶۴۵ھ لکھا ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل امور قابلِ توجہ ہیں:

(الف) حضرت سلطان جیؒ بہ قولِ خود بیس برس کی عمر میں پہلے پہل باوا صاحبؒ کی خدمت میں اجودھن حاضر ہوئے تھے۔

(ب) حضرت سلطان جیؒ بہ قولِ خود باوا صاحب کی حیات میں تین دفعہ اجودھن حاضر ہوئے تھے۔

(ج) نظامی صاحب کے بہ قولِ باوا صاحبؒ کا سالِ وفات ۶۶۴ھ ہے۔

(د) ان شواہد کے مطابق حضرت سلطان جیؒ ۶۶۲ھ میں پہلے پہل اجودھن پہنچے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ۶۶۳ اور ۶۶۴ میں آپ نے باقی دو سفر بھی کر لیے ہوں؟ باوا صاحب کی تاریخ وفات ۵/محرم ہے اور حضرت سلطان جیؒ کے ایک ارشاد کے مطابق آپ کو شوال ہی میں دتی بھیج دیا گیا تھا۔ اس طرح صرف ۶۶۳ھ کا سال بچتا ہے جس میں دو سفر قرینِ قیاس نہیں۔ یہ بھی مدِنظر رکھنا ضروری ہے کہ آپ ہر سفر میں مہینوں اجودھن میں قیام فرما رہے تھے۔

(ہ) ''سیر الاولیا'' میں مذکور ہے کہ ۱۳/رمضان ۶۶۹ھ کو باوا صاحبؒ نے حضرت سلطان جیؒ کے لیے خلافت نامہ تحریر کیے جانے کا حکم دیا تھا۔ یہ بیان نظامی صاحب نے بھی نقل کیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خلافت نامہ رمضان ۶۶۹ھ میں لکھا گیا تھا تو اس حساب سے باوا صاحبؒ کا سالِ وصال ۶۷۰ھ میں ہونا چاہیے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ باوا صاحب کا سالِ وصال ۶۷۰ھ ہی ہے۔ اس کی توثیق حضرت سلطان جیؒ کے ایک بیان سے بھی ہوتی ہے۔ آپ نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ ''جب شیخ الاسلام فریدالدین قدس سرہ العزیز دنیا سے رخصت ہوئے تو اُسی سال کافر اس دیار میں پہنچ گئے۔''[☆۸] منگول اس علاقے میں شیر خاں کے مرنے کے بعد پہنچے تھے۔ شیر خاں جو اس علاقے کا مقطعے دار تھا، بلبن کا رشتے کا بھائی تھا۔ برنی کے بہ قول اس کی وفات بلبن کے سالِ جلوس کے پانچ چھ برس بعد ہوئی تھی۔ بلبن کا سالِ جلوس ۶۶۴ھ ہے۔ لہٰذا شیر خاں کا سالِ وفات ۶۶۹ھ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس طرح ۶۷۰ھ کے باوا صاحب کے سالِ وصال ہونے کی تائید ہوتی ہے۔ اس تجزیے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت سلطان جی کا سالِ ولادت ۶۴۵ھ ہے۔ آپ ۶۶۵ھ میں پہلی بار اجودھن تشریف لے گئے تھے اور ۶۷۰ھ تک وہاں کے دو سفر اور کیے تھے۔ بہر حال یہ مسئلہ مؤرخوں کی تحقیقِ مزید کا محتاج ہے۔

نظامی صاحب نے اپنے یہاں سنین کے اختلاف پر غور نہیں کیا اور نہ سنین کی تنقیح پر توجہ کی جو محتاط مؤرخ

☆۸۔ ''فوائد الفواد''، خواجہ حسن سنجری، ص ۳۷۳، ملک سراج الدین اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۶ء۔
برنی نے بھی یہ لکھا ہے کہ اُس کے (بلبن) کے عہد کے ابتدائی دور میں شیخ شیوخ العالم فریدالدین مسعودؒ بہ قیدِ حیات تھے۔ ملاحظہ ہو: ''تاریخ فیروز شاہی''، اردو ترجمہ ڈاکٹر معین الحق ص ۱۹۳، اردو سائنس بورڈ، لاہور

کے شایانِ شان نہیں ہے۔

نظامی صاحب نے ''سیر الاولیا'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب باوا صاحبؒ نے خلافت نامہ حضرت سلطان جیؒ کو دیا تو فرمایا کہ اسے ہانسی میں شیخ جمال الدین اور دتی میں مولانا منتخب الدینؒ کو دکھا لینا۔ شیخ جمال الدینؒ نے خلافت نامہ دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا اور یہ شعر پڑھا:

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردہ بہ گوہر شناس☆۹

لیکن سیر ہی میں یہ بھی مذکور ہے کہ شیخ جمال الدینؒ کا وصل باوا صاحب کی حیات ہی میں ہو گیا تھا۔ ان کے وصال کے بعد ان کی ایک کنیز جو ''مادرِ مومناں'' کہلاتی تھیں، ان کے صاحب زادے صدرالدین کو جو بچے تھے، ساتھ لے کر باوا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ باوا صاحب نے ان کی تعظیم وتکریم کی، بیعت سے سرفراز فرمایا، چند روز اپنے پاس رکھا اور یہ فرمایا کہ کچھ دن مولانا نظام الدینؒ کی خدمت میں رہنا۔☆۱۰

''ذرو نظامی'' میں مذکور ہے کہ حضرت سلطان جیؒ نے فرمایا کہ ''میں حضرت شیخ شیوخ العالمؒ کی زیارت کے واسطے روانہ ہوا۔ جب ہانسی پہنچا شیخ جمال الدین ہانسویؒ سے ملاقات ہوئی۔ وہ بیمار تھے۔ اس سبب سے میں چند روز ٹھہر گیا۔ آخر جب ان کا انتقال ہو گیا تو سوئم کے بعد میں روانہ ہو کر حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت شیخؒ نے جمال الدینؒ کا حال دریافت فرمایا۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت چشم پُر آب ہوئے اور ارشاد کیا کہ ان کی نماز کی کیا کیفیت تھی۔ میں نے عرض کیا کہ تین روز کی نماز فوت ہوئی۔ حضرتؒ خاموش ہو گئے۔ مولانا بدرالدین اسحاق نے کہا، یہ اچھا نہ ہوا۔ میں نے اپنے دل میں کہا، حضرت تو خاموش ہو رہے انھوں نے کیوں ایسا کہا۔ پھر جب بدرالدین اسحاق کا آخری وقت پہنچا تو آپ نے جماعت سے نماز ادا کی۔ وظیفہ ختم کیا۔ پھر اشراق پڑھی اور وظیفے میں مشغول ہوئے پھر چاشت پڑھ کر سر بہ سجدہ ہوئے اور جاں بہ حق تسلیم کی۔ اس وقت میں نے اپنے دل میں سوچا کہ بے شک ایسے شخص کو یہ بات کہنا بجا تھا۔''☆۱۱

''سیر الاولیا'' میں بھی یہ بیان مولانا جمال الدینؒ کے نام کے بغیر مختصر انداز میں ملتا ہے۔☆۱۲ مؤرخ کی حیثیت سے نظامی صاحب کو ان دونوں بیانوں یعنی مولانا جمال الدین کو خلافت نامہ دکھائے جانے اور باوا صاحب کی حیات میں ان کے انتقال فرمانے کو مؤرخانہ تحقیق سے پرکھنا چاہیے تھا۔ دونوں

☆۹۔"The Life And Times of Sheikh Nizam uddin Auliya R.A." P.50, Nizami, Idarah-i-Adabiyat-i-Dehli- Dehli, 1991.

☆۱۰۔ ''سیر الاولیا''، ص۱۹۲۔۱۹۰

☆۱۱۔ ''ذرو نظامی''، علی محمود بن جاندار، ص۲۲۸، مترجمہ محمد یٰسین علی نظامی، کتب خانہ نذیریہ، دہلی

☆۱۲۔ ''سیر الاولیا''، ص۱۸۷

بیانوں کا تضاد بالکل نمایاں ہے۔ مؤرخ مختلف واقعات اور بیانات کو جرح و تعدیل سے جانچتا اور پرکھتا ہے۔ تاریخی حقائق کی روشنی میں تنقیح کرتا ہے پھر انھیں دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ نظامی صاحب ''ذرد نظامی'' سے پوری طرح واقف تھے۔ انھوں نے اس کے بارے میں ایک مضمون بھی لکھا تھا۔[☆۱۳] لیکن انھوں نے اس واقعے کے سلسلے میں مؤرخانہ تنقیح سے کام نہیں لیا۔ اس طرح کی مؤرخانہ فروگزاشتیں بعض اور جگہ بھی ملتی ہیں اور نظامی صاحب کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں لیکن ان کی تفصیل ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے۔ دراصل نظامی صاحب نے ملفوظات اور تذکروں کی روایتوں کو درایت کی کسوٹی پر کسے بغیر من و عن قبول کرلیا ہے۔ یہ مؤرخ سے زیادہ عقیدت مند کا طریقہ کار ہے۔ راقم الحروف نے انھیں اسی بنا پر عقیدت مند/مؤرخ قرار دینے کی جسارت کی ہے۔ ملفوظات اور تذکروں میں بالعموم واقعات کے بیان میں سنین کا صحیح التزام نہیں ہوتا جس کی وجہ سے بعض اوقات بڑی الجھنیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس قسم کی الجھن کی ایک مثال یہ ہے۔

نظامی صاحب نے اپنی تالیف "Sheikh Nasir uddin Chiragh"[R.A][☆۱۴] میں خواجہ گیسو دراز کے حوالے سے شیخ نصیرالدین کا سالِ ولادت ۸۲ برس کی عمر کے حساب سے ۶۷۵ھ قرار دیا ہے۔ پھر آگے چل کر یہ لکھا ہے کہ ۴۳ برس کی عمر میں شیخ نصیرالدین کو روحانی رہ نما کی جستجو ہوئی اور وہ حضرت سلطان جی کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت سے مشرف ہوئے۔ ۴۳ برس کی عمر میں بیعت سے مشرف ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ واقعہ ۷۱۸ھ میں پیش آیا تھا جب کہ خواجہ حسن سجزی کے بہ قول وہ صفر ۷۱۴ھ کو ''نصیرالدین محمود کہ یکے از مریدانِ خوب اعتقاد است'' سے مشورہ کرکے اُن کے ساتھ حضرت سلطان جی کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔[☆۱۵] خواجہ حسن سنجری کے اس بیان کی روشنی میں ۷۱۸ھ میں بیعت ہونے کی بات درست نہیں معلوم ہوتی۔ دراصل یہ الجھن اس لیے پیدا ہوئی کہ نظامی صاحب نے ذاتی تحقیق سے کام لینے کے بجائے روایت پر اعتماد کیا۔ لیکن ان فروگزاشتوں کی نشان دہی کا مقصد خدانخواستہ نظامی صاحب کے کمال فن کی نفی نہیں ہے۔ جس عالم نے ''سلطنت دہلی کے مذہبی رجحانات''، ''تاریخ مشائخ چشت'' تالیف کی ہوں اور خیرالمجالس کی عالمانہ اور محققانہ تدوین کی ہو اور سلسلۂ چشت کے اکابر حضرت فریدالدین مسعودؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت نصیرالدین چراغؒ کے حالات اور عہد کے بارے میں قارئین کو تاریخ کے پس منظر میں تمام ضروری معلومات فراہم کی ہوں، اس کے یہاں اس قسم کی فروگزاشتوں کا ہونا تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں کہ مطالعے کی کثرت، معلومات کی فراوانی، ہر

☆۱۳۔ شائع شدہ Dr.Ishtiaq Husain Qureshi Memorial Volume-II Edited by Hilal Ahmed Zubairi, 1994

☆۱۴۔ "The Life And Times of Sheikh Nizam uddin Auliya[R.A]" P.50, Nizami, Idarah-i-Adabiyat-i-Dehli- Dehli, 1991

☆۱۵۔ ''فوائد الفواد'' ص ۲۰۵

گوشے کے تفصیلی جائزے، سیرت کی تشکیلِ نو، واقعات اور حالات کے تجزیے اور نتائج حاصل کرنے کی دھن میں بعض اوقات ہر روایت کو درایت کے اصولوں پر جانچنے اور پرکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ نظامی صاحب تاریخ کے بڑے عالم تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ معلومات حیرت انگیز تھیں۔ اولیائے چشت کے خصوصی مطالعے کو انھوں نے اپنا اہم ترین موضوع قرار دیا تھا اور ساری زندگی اسی موضوع کو نمایاں کرنے میں گزار دی تھی۔ تاریخی مطالعے کے سلسلے میں ان کا طریقۂ کار بروں بینی پر مبنی تھا۔ دروں بینی کو انھوں نے نظرانداز نہیں کیا۔ تاہم اس سے بہت زیادہ سروکار نہیں رکھا۔ ان کے علمی کاموں کی وسعت کے پیشِ نظر شاید یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ انھیں مشائخِ چشت سے غیرمعمولی عقیدت تھی اور وہ عقیدت مند/مورّخ کی حیثیت سے بیسویں صدی کے اولیائے چشت کے اہم ترین مورّخ، سوانح نگار اور تجزیہ نگار کی حیثیت سے ہمیشہ نمایاں رہیں گے۔ راقم الحروف نے بیسویں صدی کو نظام شناسی کی صدی قرار دیا ہے۔ اس صدی میں نظام شناسی کے حوالے سے اہم ترین کارنامے نظامی صاحب ہی کے ہیں۔ رہ گئیں تاریخی فروگزاشتیں تو راقم الحروف کا خیال ہے کہ ان کی تصحیح مخدومی خواجہ حسن ثانی نظامی اور محبِ مکرم ڈاکٹر نثار احمد فاروقی بہ طریقِ احسن انجام دے سکتے ہیں۔ اور کیا اچھا ہو کہ یہ دونوں بزرگ یہ کام جلد مکمل کر دیں کہ بہ قول خسروؒ:

بلبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

☆☆☆

خصوصی مطالعہ

زاہدہ حنا

برِصغیر کی تین اوّلین ادیب عورتیں اور تعلیمِ نسواں

رشندری دیوی، رشید النسا، رقیہ سخاوت حسین۔

انیسویں صدی کے بنگال اور بہار کی وہ تین اوّلین ادیب عورتیں جنھوں نے ہارے ہوئے ہندوستان کے ہندو مسلم سماج کی پستی میں پڑی اور پسی ہوئی عورت کے لیے تعلیمِ نسواں کا خواب دیکھا اور دکھلایا۔ وہ عورت جو صدیوں سے خود کو ''بابل کے کھونٹے سے بندھی ہوئی گائے'' سمجھتی تھی، پتی دیو کی داسی بننے میں جس کی مُکتی تھی اور مجازی خدا کے اشارۂ ابرو پر چلنے میں جس کی نجات۔ ان تین ادیب عورتوں نے ہندو مسلم سماج کی اس بے زبان، بے بس اور بے آسرا عورت کو یہ بتایا کہ تعلیم اس کی آزادی کی طرف پہلا قدم ہے۔ تعلیم حاصل کرکے، وہ ''کھونٹے سے بندھی ہوئی گائے'' نہیں رہتی، ''انسان'' بن سکتی ہے۔ اپنے گھر اور اپنے سماج کو سنوار سکتی ہے، اپنی زندگی کے بارے میں فیصلے کر سکتی ہے۔ مرد جو ''عقلِ کُل'' تھا، اسے مشورہ دے سکتی ہے، اس پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

بارہ بچوں کی اس ماں کا تصور کیجیے جس کے سینے میں کتابیں اور کاغذ دیکھ کر ہوک اٹھتی ہو، جس کا جی چاہتا ہو کہ وہ بھی پڑھی لکھی ہوتی، دھارمک کتابیں، اشلوک اور بھجن پڑھ سکتی۔ اپنی خود نوشت میں رشندری دیوی (۱۸۰۹۔۱۸۹۸ء) نے لکھا ہے کہ اپنی اس خواہش پر میں خود کو بُرا بھلا کہتی، سوچتی کہ شریف بہو بیٹیاں بھی کہیں پڑھتی یا لکھتی ہیں؟ لوگ پڑھی لکھی عورتوں کو بُرا سمجھتے تھے۔ بڑی بوڑھیاں کسی لڑکی یا عورت کے ہاتھ میں کاغذ کا کوئی ٹکڑا دیکھ لیتیں تو ہاہا کار مچا دیتیں، لیکن شوق نے خوف کو پسپا کر دیا۔ رشندری دیوی نے اپنے پتی کی ایک مذہبی کتاب سے ایک ورق نکالا، بیٹا تاڑ کے پتّوں پر لکھنے کی مشق کرتا، رشندری دیوی نے اس کے لکھے ہوئے تاڑ کے پتّے چرائے اور رسوئی گھر میں چھپا دیے۔ پکانے ریندھنے سے اگر کبھی فرصت ملتی تو وہ اس مذہبی کتاب کے حروف کو تاڑ کے پتّوں پر لکھے ہوئے حروف سے ملا کر پڑھنے کی کوشش کرتیں۔ کسی کے قدموں کی چاپ ابھرتی تو کتاب کا ورق اور تاڑ کا پتّا کسی مٹکی کے پیچھے، کسی پرات یا چولھے کے نیچے چھپا دیا جاتا۔

رشندری دیوی نے جس طرح پڑھنا لکھنا سیکھا وہ آج کی عورتوں کے لیے ایک ناقابل یقین بات ہے۔ بعد میں رشندری دیوی نے اپنی زندگی کی کہانی ''امارجیون'' لکھی۔ رشندری دیوی پڑھنا سیکھ لینے کے بعد کی صورت حال کے بارے میں لکھتی ہیں:

> میں تھوڑا بہت (مذہبی کتاب) پڑھ لیتی تھی لیکن اس کے لیے بھی وقت کہاں تھا؟ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ میں ہر وقت اس بات سے ڈرتی تھی کہ کوئی مجھے ڈانٹ نہ دے، جھڑک نہ دے... کچھ دنوں بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں ''چیتنا بھگت'' (ایک مذہبی کتاب) کو اس وقت پڑھوں گی جب میری تینوں نندیں اپنی صبح سویرے کی پوجا پاٹھ میں مصروف ہوا کریں گی۔ کیوں کہ اگر انھیں یہ معلوم ہوگیا تو بہت مشکل ہوجائے گی۔ چناں چہ میں گھر کے کونے کھدرے میں بیٹھ کر پڑھتی اور اس وقت بھی میرے لیے کام کرنے والی ایک ماما، دروازے پر نظر رکھتی تاکہ اگر کوئی اس طرف آرہا ہو تو وہ دوڑ کر مجھے بتادے۔

رشندری کی یہ کتاب لکھے جانے کے بہت دنوں بعد پہلی مرتبہ ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی۔ بنگلہ زبان میں کسی عورت کی لکھی ہوئی خودنوشت کا چھپنا ایک واقعہ تھا۔ یوں رشندری دیوی ہندو اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی اوّلین اور اہم ترین نثر نگار عورت ہیں۔ جس طرح اردو میں ''اصلاح النساء'' کسی عورت کا لکھا ہوا پہلا ناول ہے، اسی طرح ''امارجیون'' کسی عورت کی لکھی ہوئی پہلی بنگلہ خودنوشت ہے۔

تارا بائی شندے کی ''استری پرش تلانا'' (۱۸۸۲ء) جس میں عورت اور مرد کا موازنہ کیا گیا تھا اور جس نے اپنے زمانے میں بہت تہلکہ مچایا، پنڈتہ راما بائی سرسوتی کی انگریزی میں لکھی ہوئی The High-Caste Hindu Woman (۱۸۸۸ء) رشندری دیوی کی ''امارجیون'' کے بعد چھپنے والی کتابیں ہیں۔ اسی طرح ٹیگور خاندان کی سورن کماری دیبی بھی بعد میں بنگلہ ادب کے منظرنامے پر آتی ہیں، وہ ۱۸۸۴ء میں ایک بنگلہ رسالے کی چیف ایڈیٹر ہوتی ہیں اور ان کے ناول، کہانیوں اور مضامین کے پچیس سے زیادہ مجموعے شائع ہوتے ہیں۔ سورن کماری دیبی کے دو ناول ''چنناموکول'' اور ''پھولر مالا'' انگریزی میں ترجمہ ہوکر انگریزی حلقوں تک بھی پہنچے۔

پٹنہ میں پیدا ہونے والی رشید النساء (۱۸۵۳ء-۱۹۳۱ء) کا معاملہ رشندری دیوی سے بہت مختلف تھا۔ وہ بہار کی اشرافیہ کے ایسے خاندان میں پیدا ہوئیں جو ہندوستان کے گنے چنے عالم و فاضل گھرانوں میں سے تھا۔ وہ صدر اعلیٰ (چیف جسٹس) شمس العلما خان بہادر وحیدالدین کی بیٹی، ''کاشف الحقائق'' کے مصنف شمس العلما نواب امداد اثر کی بہن، سر علی امام اور حسن امام کی پھوپھی، صدر اعلیٰ خان بہادر نعمت علی خان کی بہو، وکیل اور عظیم آباد کے رئیس مولوی محمد یحییٰ کی بیوی اور بیرسٹر محمد سلیمان، لیڈی

عبدالرحیم اور صاحب دیوان شاعرہ نثار کبریٰ کی ماں تھیں۔ کچھ اور آگے چلیں تو ان کے خونی رشتوں میں لیڈی انیس امام ان کی نواسی، پاکستان کے سابق وزیراعظم حسین شہید سہروردی ان کے نواس داماد، پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی رکن اور اس کا منشور لکھنے والے جے اے رحیم ان کے نواسے، پاکستان میں بیگم اختر سلیمان اور ہندوستان کی راجیہ سبھا کی رکن عزیزہ امام اور کراچی کی ایک معروف سماجی کارکن بیگم ثریا قرنی ان کی پڑنواسیاں ہیں۔ ان کا رشتہ نواب سراج الدولہ، ابنِ نواب ہیبت جنگ اور اس سے اوپر نواب سیف خان سے جڑتا ہے۔ سیف خان مغل عہد میں گورنر بہار ہوا، مغل بادشاہ شاہ جہاں کے بنائے ہوئے تاج محل میں سونے والی ملکہ ممتاز محل اور سیف خان کی بیوی سگی بہنیں تھیں۔

رشید النساء نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ علمی اور ادبی محفلوں اور مشاعروں کا تھا۔ ان کے اردگرد کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ بھائی امداد امام سے عربی، فارسی، سنسکرت، اردو، انگریزی، فرانسیسی اور لاطینی ادب کے بارے میں سنا، میاں کے گھر گئیں تو انھیں فنِ موسیقی میں ماہر و یکتا پایا۔ مشاہیرِ ہندوستان ان کے میکے اور سسرال میں مہمان ہوتے، اپنے زمانے کی علمی، ادبی اور سیاسی بحثیں ان کے کان میں پڑتیں۔ اس زمانے کے ہندوستان کی گنی چنی ہندو اور مسلمان عورتوں کے حصے میں یہ ماحول آیا تھا۔

رشندری دیوی کے دل میں ہوک اس لیے اٹھتی تھی کہ وہ پڑھنا اور لکھنا چاہتی تھیں۔ رشید النساء کا کلیجہ اس لیے شق ہوتا تھا کہ ان کے اردگرد سانس لیتی ہوئی عورت تعلیم سے محروم اور اس کی لذتوں سے ناآشنا تھی۔ انیسویں صدی کے ہندوستان میں women question دراصل عورتوں کی تعلیم اور جدید زندگی سے ان کی آشنائی سے جڑا ہوا تھا۔ رشید النساء کو اس بات کا شدت سے احساس تھا۔ ہندو مسلم عورتوں کی جدید تعلیم کا چرچا بنگال میں بہت زیادہ تھا اور اس کا اثر بہار پر بھی پڑا تھا۔ یہ ڈپٹی نذیر احمد کی ''مراۃ العروس'' تھی جس نے رشید النساء کو اس جیسا قصہ لکھنے پر اکسایا۔ ''مراۃ العروس'' جیسی کئی کتابوں کے لکھے جانے کا سہرا ایک اعلیٰ برطانوی سرکاری افسر سر ولیم میور کے سر ہے۔ سر ولیم میور کو ہندوستانی عورتوں کی تعلیم سے گہری دلچسپی تھی۔ اس نے ۱۸۷۵ء میں جب مدرسۃ العلوم، علی گڑھ کے اجلاس میں شرکت کی تو اردو میں تقریر کرتے ہوئے حاضرین جلسہ سے کہا تھا کہ مصری مسلمانوں کی طرح وہ بھی لڑکیوں کی جدید تعلیم کا انتظام کریں۔ تعلیمِ نسواں کو فروغ دینے کے لیے سر ولیم کی ترغیب پر برٹش سرکار کی طرف سے ان کتابوں کو انعامات دینے کا اعلان کیا گیا جن میں مسلمان لڑکیوں کے لیے تعلیم کے فوائد بیان کیے گئے ہوں اور انھیں جدید علوم کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

اس زمانے میں ڈپٹی نذیر احمد کی ''مراۃ العروس'' اور ''بنات النعش'' کے علاوہ مولوی کریم الدین کی ''تذکرۃ النساء''، محمد حسین خان جج کی ''تہذیبِ نسواں''، محمد ظہیرالدین خان کی ''تعلیمِ نسواں'' وہ کتابیں تھیں جنھیں نقد انعامات ملے۔ مسلم اشرافیہ سے تعلق رکھنے کے باوجود یہ اس عہد کے بہار میں خواتین کو پس منظر میں رکھنے کا عمومی رویہ تھا جس کی بنا پر رشید النساء کے نہایت معتبر اور بااثر خاندان کی جانب سے

ان کی صلاحیتوں کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ "اصلاح النساء" کے پہلے ایڈیشن میں کہیں ان کا نام نظر نہیں آتا اور وہ خود کو کسی مرد کی ماں، بیٹی اور بہن بتاتی ہیں۔ ایک ایسے راویتی ماحول میں ان کے خاندان کے ولایت پلٹ اور نائٹ ہڈ کا اعزاز پانے والے مرد انعام کے لیے سرکار دربار میں ان کی کتاب تو کیا بھجواتے، انھوں نے رشید النساء کی کوششوں کو سراہنے کی زحمت بھی نہ کی۔ یہ تو ان کی موت کے دس بیس برس بعد کا قصہ ہے کہ ان کا نام اردو کی پہلی خاتون ناول نگار کے طور پر سامنے آنے لگا۔

رشید النساء جنگ آزادی سے چار برس پہلے ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے مغل زوال کو اپنے کانوں سے سنا اور برطانوی عروج کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کا خاندان برطانوی ہندوستان میں اقتدار سے جڑا ہوا رہا، کئی شمس العلماء، کئی خان بہادر اور کئی نائٹ ان کے بھائی، بھتیجے اور داماد تھے۔ جدید تہذیب کی روشنی ان کے خاندان کے زنان خانے میں تو نہیں آئی لیکن اس کا عکس زنان خانے کے اندھیرے میں پو پھٹنے کا ملگجا اُجالا ضرور پھیلاتا رہا۔ وہ علم کی جویا اور کتابوں کی عاشق تھیں، کتابوں سے رشید النساء کے عشق اور مزاج کی مہم جوئی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ پردہ نشین ہیں، شہر میں، صوبے میں، ملک بھر میں بھائی، بھتیجوں، بیٹوں اور دامادوں کا طوطی بولتا ہے، لیکن چرائی ہوئی کتابیں ادھر سے اُدھر کرتے ہوئے نہ گھبراتی ہیں، نہ پیشانی پر شکن لاتی ہیں۔

اس بارے میں ایک دلچسپ تحریر ان کے نواسے ڈاکٹر اقبال حسین کی ہے۔ ڈاکٹر اقبال حسین کا شمار بہار کے مشہور ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ساری عمر درس و تدریس سے وابستہ رہ کر گزاری، پٹنہ کالج کے پرنسپل اور بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر رہے۔ اپنی خودنوشت "داستان میری" کے صفحے رشید النساء کے تذکرے سے بھرے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> خان بہادر خدا بخش خاں، بانی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری اور میرے نانا مرحوم میں دوستانہ تعلقات کے علاوہ سالے بہنوئی کا بھی منھ بولا رشتہ تھا۔ موصوف خان بہادر میری نانی مرحومہ کو بہن کہتے تھے اور ایک بہن کی حیثیت سے ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے۔ نانی مرحومہ بھی ان سے بھائی کی طرح سلوک سے پیش آتیں۔ نانی مرحومہ یہ بھی فرماتی تھیں کہ خدا بخش لائبریری میں جتنی نادر کتابیں ہیں، اکثر و بیشتر چوری کر کے منگائی جاتی تھیں۔ خود خدا بخش خاں کا قول ہے کہ "کتابوں کے جمع کرنے کا ہنر تعزیرات ہند کے قانون سے بالاتر ہو جاتا ہے اور اس کو للکارتا ہے۔" اس قول کی روشنی میں انھوں نے کتابوں کی جمع آوری کے اپنے ذوق کی تکمیل کی۔ غرض جب بھی انھیں کسی نادر اور عمدہ کتاب کا سراغ ملتا تو پہلے اسے عاریتاً یا قیمتاً لینے کی کوشش کرتے، ناکامی کی صورت میں وہ کسی شخص سے اس کتاب کو چوری کرا کر منگا

لیتے۔ جب ایسی کتابیں دستیاب ہوتیں تو اپنے گھر پشتہ والے مکان (جہاں اب اندرا انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیولوجی ہے) سے ان کتابوں کو ٹوکری میں رکھ کر اوپر سے کچھ کھانے پینے کی چیز رکھوا کر نانی مرحومہ کے گھر سبزی باغ نوکروں سے بھجوا دیتے اور تحفظ کے خیال سے خود پالکی پر آتے۔ نانی موصوفہ اپنے نوکر کو کہتیں کہ دیکھو جو تحفے کی ٹوکری خدا بخش کے یہاں سے آئی ہے پلنگ پر رکھ دو۔ نوکر رکھ دیتا۔ فرصت اور تنہائی کے وقت نانی ان کتابوں کو چھپا کر رکھ دیا کرتی تھیں۔ خان بہادر خدا بخش کبھی کبھی تو ان کتابوں کو چار یا چھ ماہ کے بعد جب کہ گرفت کے امکانات ختم ہوجاتے، منگوا لیتے یا خود آ کر لے جاتے۔ نانی مرحومہ فرماتی تھیں کہ کبھی کبھی تو ایسی چوری کی ہوئی کتابوں کو تین تین سال کے بعد لے جایا کرتے تھے۔

رشید النساء کی شخصیت کا ذرا گہرائی میں جا کر جائزہ لیجیے تو دکھائی دیتا ہے کہ وہ متضاد رویّوں اور حالتوں کے ساتھ زندگی کر رہی ہیں۔ وہ ایک ایسے شخص کی شریکِ حیات ہیں جو قانون داں، ادب دوست اور رئیس اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ فنِ موسیقی کا ماہر ہے۔ اس کے یہاں لوگ دور دور سے موسیقی کے رموز ونکات سمجھنے آتے ہیں۔ گھر میں ایک طرف علمائے صادق پور سے نیاز مندی ہے، دوسری طرف روشن خیالی اور آزاد مشربی کا یہ عالم ہے کہ جس زمانے میں سگے باپ اور بھائیوں سے پردہ ہوتا تھا، اسی زمانے میں رشید النساء ایک نامحرم کو بھائی بناتی ہیں اور اپنے منھ بولے بھائی کی چرائی ہوئی نادر کتابیں کبھی مہینوں اور کبھی برسوں اپنے پاس رکھتی ہیں۔

انھوں نے کسی اسکول میں تعلیم نہیں پائی، اس کے باوجود انھیں زنانہ مدرسہ کھولنے کا شوق بے حد و بے حساب تھا۔ اس شوق کو انھوں نے بیسویں صدی کی ابتدا میں پورا کیا۔ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے ایک زنانہ مدرسہ ''مدرسہ اسلامیہ'' قائم کیا جس کے معائنے کے لیے گورنر بنگال کی بیگم، لیڈی فریزر آئیں۔ پٹنہ والوں کے لیے زنانہ مدرسے کا قیام اور لیڈی فریزر کا اس کے معائنے کے لیے آنا ایک بڑا واقعہ تھا، چناں چہ اس واقعے کا تذکرہ بہت دنوں تک شہر اور شہر والوں میں ہوتا رہا۔ یہ مدرسہ کئی برس تک چلتا رہا۔ اس مدرسے کو بعد میں بادشاہ نواب رضوی نے بی این آر اسکول کا نام دیا اور اپنی کچھ جائداد اس کے اخراجات کے لیے مختص کر دی۔ مہارانی بیتیا نے اس اسکول کے لیے عمارت دی، اس وجہ سے یہ اسکول ''بیتیا ہاؤس'' کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ اسکول ہندو اور مسلم اشرافیہ کی لڑکیوں میں بہت مقبول ہوا۔ یہاں مسلمان لڑکیوں کو اردو اور ہندو لڑکیوں کو ہندی میں تعلیم دی جاتی تھی۔ اس اسکول میں ایک ہوسٹل بھی تھا جس کی نگرانی رشید النساء کی بڑی بیٹی نصیب النساء کے حصے میں آئی تھی۔ ان کی نواسی اور سر علی امام کی بیگم، لیڈی انیس امام نے ابتدائی تعلیم اسی اسکول میں حاصل کی۔

میری دو پھوپھیوں زاہد النساء اور شمس النساء کے علاوہ میری ایک چچی زینت افزا حفیظ بیگم نے بھی ''بیتیا ہاؤس'' سے ہی ۳۰ اور ۴۰ کی دہائیوں میں میٹرک کیا تھا۔

۱۹۰۹ء میں قائم ہونے والا یہ وہی بیتیا ہاؤس گرلز اسکول ہے جس کے سالانہ جلسے کی صدارت لیڈی بیلی نے کی اور ہندو مسلم اشرافیہ کی خواتین اور لڑکیاں ذوق شوق سے اس جلسے میں شریک ہوئیں۔ اس جلسے میں رشید النساء کی منجھلی بیٹی اور بہار کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ نثار کبریٰ نے اس گرلز اسکول کے قیام پر ایک نظم سنائی جس میں مہارانی بیتیا اور بادشاہ نواب رضوی کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس نظم میں ہندوستانی عورت کی حالتِ زار کا ذکر نثار کبریٰ کی زبان سے سنیے:

کسی کام کے بھی نہ قابل ہیں نسواں
فقط نیم وحشی میں داخل ہیں نسواں
عزیزوں کے ہاتھوں سے گھائل ہیں نسواں
ہر اک قوم سے بڑھ کے جاہل ہیں نسواں

بُرے ایسے ہیں ان کے مقسوم دیکھو
انھیں عظمیٰ نعمت سے محروم دیکھو

نثار کبریٰ عظیم آبادی نے گیارہ برس کی عمر سے شاعری شروع کی، دیوان ۱۹۳۹ء میں بانکی پور، پٹنہ سے شائع ہوا۔ نثار کبریٰ اردو، ہندی، فارسی اور انگریزی جانتی تھیں۔ ان کی شادی جنگ آزادی کے مشہور مجاہد سیّد علی کریم کے خاندان میں ہوئی تھی جو ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کی جنگ کے دوران شاہ آباد کے راجا کنور سنگھ اور امر سنگھ کے دست راست تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے لیے جان دینے والے یہ وہ راجپوت سردار تھے جن کے بارے میں فریڈرک اینگلز نے ۱۸۵۸ء کے ''نیو یارک ڈیلی ٹریبیون'' میں لکھا تھا کہ جگدیش پور کے جنگل باغیوں کی آماج گاہ ہیں اور ان کی کمان امر سنگھ کے ہاتھ میں ہے جس نے گوریلا جنگ سے کام لیا ہے اور انگریز فوجوں کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں۔ جنگِ آزادی میں حصہ لینا ایک بات ہے اور وسیع النظری اور روشن خیالی کے معاملات دیگر ہیں۔ یہ لازم نہیں ہے کہ تحریکِ آزادی میں حصہ لینے والے اپنی عورتوں پر پدرسری سماج کی گرفت بھی کم زور ہونے دیں۔ اس حوالے جو کچھ نثار کبریٰ کے ساتھ ہوا اس کا ذکر آگے آئے گا۔

ڈپٹی نذیر احمد کی ''مراۃ العروس'' ۱۸۶۹ء میں چھپی تو رشید النساء کی عمر سولہ برس تھی اور ابھی وہ نئی نویلی دلھن تھیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اردو کا یہ پہلا ناول کب ان کے ہاتھ لگا لیکن خود ان کا کہنا ہے کہ وہ اس سے بے حد متاثر ہوئیں۔ ان کے اپنے گھر اور خاندان میں ہر طرف علم و فن اور شعر و ادب کا چرچا تھا، گھر میں بھری ہوئی سینکڑوں کتابوں تک ان کی رسائی تھی لیکن جب اپنے ارد گرد آباد دوسرے گھرانوں اور ان کی لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھتیں تو دل مسوس کر رہ جاتیں۔ یہ وہ گھر تھے جہاں کے

زنان خانوں میں جہالت کے ساتھ ساتھ توہمات کا بھی ڈیرا تھا۔ ''مراۃ العروس'' نے ان کے اندر کی لکھنے والی کو اکسایا اور خود ان کے کہنے کے مطابق انھوں نے ''اصلاح النساء'' لکھنے کا بیڑا اٹھایا تو اسے چھ مہینے میں مکمل کر کے دم لیا۔ یہ ناول ۱۸۸۱ء میں لکھا گیا اور ۱۸۹۴ء میں اس وقت شائع ہوا جب ان کا وہ بیٹا لندن سے قانون کی تعلیم حاصل کر کے آچکا تھا جس نے گیارہ برس کی عمر میں ماں کو یہ ناول تحریر کرتے دیکھا تھا۔

رشندری دیوی نے بیٹے کے بستے سے تاڑ کے پتے چُرا کر اس کی مدد سے پڑھنا سیکھا تھا، رشید النساء ان سے کہیں زیادہ خوش نصیب تھیں کہ انھیں لکھنا اور پڑھنا آتا تھا۔ رشندری دیوی نے ''امار جیون'' ودھوا ہونے کے ایک برس بعد ۱۸۶۸ء میں لکھی۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال تھی، یہ کتاب ۱۸۷۶ء میں ان کے بیٹے نے چھپوائی، یہاں بھی رشید النساء اور رشندری دیوی کی زندگی میں ایک مماثلت پائی جاتی ہے کہ دونوں کی کتابیں ان کے بیٹوں نے شائع کرائیں۔ ایک کی ''اصلاح النساء'' تیرہ برس تک لکھی رکھی رہی، دوسری کی ''امار جیون'' کو آٹھ برس تک چھاپے کی سیاہی لگنے کا انتظار کرنا پڑا۔

رشید النساء کی طرح رشندری دیوی نے بھی اپنی کتاب کا دوسرا حصہ بعد میں لکھا اور پھر پہلا اور دوسرا حصہ یک جا طور پر ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا۔ اس وقت رشندری دیوی ۸۸ برس کی ہو چکی تھیں۔ ''امار جیون'' کے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ رابندر ناتھ ٹیگور کے بڑے بھائی جیوتی ریندر ناتھ ٹیگور کا لکھا ہوا ہے جو اپنے عہد کے مشہور ادیب تھے۔ جیوتی ریندر نے لکھا کہ ''میں نے 'امار جیون' کو تجسس کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ میں نے طے کیا تھا کہ پڑھنے کے دوران اہم حصوں کو پنسل سے نشان زد کروں گا۔ پڑھنے کے دوران مجھے احساس ہوا کہ ساری کتاب ہی پنسل کے نشانات سے بھر گئی ہے۔ ان کی زندگی کے واقعات یقیناً ہمیں چونکا دیتے ہیں۔ ان کی تحریر اس قدر سچی، سادہ اور شیریں ہے کہ اسے شروع کرنے کے بعد، اسے ختم کیے بغیر رکھنا ممکن نہیں۔''

دیکھا جائے تو متوسط زمیں دار گھرانے کی رشندری دیوی، رشید النساء سے کہیں زیادہ خوش نصیب رہیں کہ ان کی زندگی ہی میں ٹیگور خاندان کا ایک نامی گرامی فرد دنیائے ادب میں ان کی پذیرائی کر رہا تھا جب کہ برصغیر اور بین الاقوامی حلقوں میں شہرت رکھنے والے خاندان کی بیٹی، بہن، پھوپھی اور ماں ہو کر بھی رشید النساء کے حصے میں وہ ناموری اور اوّلیت نہ آئی جو ان کا حق تھا اور زندگی میں ہی انھیں ملنا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر شائستہ اختر سہروردی نے اپنے تحقیقی مقالے A Critical Study of the Development of the Urdu Novel and Short Story (1945) میں محمدی بیگم کو اردو کی ''پہلی خاتون ناول نگار'' قرار دیا، حالاں کہ ''اصلاح النساء'' کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۴ء میں شائع ہو کر برصغیر کے اہم کتب خانوں میں موجود تھا۔ یہ درست ہے کہ اس کی بہت زیادہ تشہیر نہیں ہوئی تھی لیکن فصیح الدین

بلخی ''تذکرۂ نسواں'' میں اس کا ذکر کر چکے تھے اور فروری مارچ ۱۹۴۴ء کے ''معاصر'' میں محمد سلیمان صدیقی کا لکھا ہوا تفصیلی مضمون ''اصلاح النساء'' کے عنوان سے شائع ہو چکا تھا۔ غرض یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جس وقت شائستہ اکرام اللہ پی ایچ ڈی کا اپنا مقالہ مکمل کر رہی تھیں اس وقت ''اصلاح النساء'' قطعاً گم نامی میں پڑا ہوا تھا۔

''اصلاح النساء'' کو نظر انداز کرنے کے ساتھ ہی ''افسانہ نادر جہاں'' (۱۹۰۱) از نواب فخر النساء نادر جہاں بیگم، ''مشیر نسواں'' (۱۹۰۶ء) از صغرا ہمایوں مرزا ''گودڑ کا لعل'' (۱۹۰۷ء) از اکبری بیگم ''اختر النساء بیگم'' (۱۹۱۰) از نذر سجاد حیدر کو بھی نظر انداز کیا گیا اور محمدی بیگم کے ناول ''صفیہ بیگم'' (۱۹۲۰ء) کو اردو میں کسی خاتون کا لکھا ہوا پہلا ناول قرار دے دیا گیا۔ اس طرح اردو کی پہلی ناول نگار ہونے کا وہ تاج جو رشید النساء کے سر پر سجنا چاہیے تھا وہ ۲۶ برس بعد چھپنے والی محمدی بیگم کے سر پر رکھ دیا گیا۔ شائستہ سہروردی کا تحقیقی مقالہ انگریزی میں لکھا گیا تھا اور انگلستان سے چھپا تھا، چناں چہ ان ہی کی بات ''مستند'' ٹھہری۔ افسوس کہ یہ رویّہ بعد میں بھی جاری رہا۔ ایک کتاب ''اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار'' میری نظر سے گزری جو نیلم فرزانہ کا تحقیقی مقالہ ہے اور علی گڑھ سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا ہے۔ وہ کتاب کے پہلے باب میں شائستہ سہروردی کی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے ''محمدی بیگم'' کا تذکرہ کرتی ہیں، پھر ڈاکٹر سیّد مظفر اقبال کی کتاب ''بہار میں اردو نثر کا ارتقا'' کے حوالے سے یہ لکھتی ہیں کہ ڈاکٹر مظفر اقبال نے یہ ثابت کیا ہے کہ رشید النساء بیگم وہ پہلی خاتون ہیں جس نے ناول لکھنے کی ابتدا کی لیکن ۳۵۲ صفحے کی اس کتاب میں نہ محمدی بیگم پر کوئی باب ہے اور نہ رشید النساء بیگم پر۔ لطف کی بات یہ ہے کہ پہلے باب میں ''اصلاح النساء'' سے ایک صفحے کا اقتباس دیا گیا ہے اور اسے ''گھریلو سماجی رسوم کی جیتی جاگتی تصویریں'' قرار دیتے ہوئے ''مایوں کی رسم کا بیان'' نقل کیا گیا ہے لیکن بے چاری رشید النساء اس کی مستحق بھی نہیں سمجھی گئیں کہ اس اقتباس پر ان کا نام یا ان کے ناول کا حوالہ دیا جائے۔ یہ کتاب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی صدر شعبۂ اردو، پروفیسر ثریا حسین کی نگرانی میں لکھی گئی اور نیلم فرزانہ کے مطابق انھوں نے اردو کی جیّد ادیب اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی وزیٹنگ پروفیسر قرۃ العین حیدر سے بھی استفادہ کیا۔ شاید یہی ''نگرانی'' اور ''استفادہ'' اس کا سبب بنا کہ اس تحقیقی مقالے کا آغاز اکبری بیگم بنتِ سیّد نذر الباقر والدہ افضل علی سے کیا گیا ہے۔

کچھ دنوں سے ''تمثیلی قصے'' اور ''ناول'' کی بحث چل رہی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی ''مراۃ العروس'' کو تمثیلی قصہ کہا جاتا ہے اور اردو کا پہلا ناول نگار ہونے کا سہرا کسی اور کے سر باندھتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی ڈپٹی نذیر احمد کو ان کے تمثیلی قصے ''مراۃ العروس'' کی بنا پر ہمیشہ اردو کا پہلا تمثیلی قصہ نگار تسلیم کیا جائے گا۔ اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے اگر رشید النساء بیگم کو ''اردو کی پہلی خاتون ناول نگار'' تسلیم کرنے میں اصطلاحی قباحت ہے تو ادبی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں ''اردو کی پہلی تمثیلی قصہ نگار خاتون'' مان کر

ان کا حق انھیں دیا جائے۔ •

بات کہاں سے نکلی تھی اور کہاں جا پہنچی۔ ہم جب اس دور کی مسلم اشرافیہ کی خواندہ خواتین کے معمول پر نظر کرتے ہیں تو رشید النساء بھی اس کی پیروی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ رشید النساء کا معمول تھا کہ شام کو جب شمع جلائی جاتی تو اپنی بیٹیوں، بھانجیوں، بھتیجیوں، محلے کی عورتوں، گھر کی ماماؤں اور دائیوں کو قصص الانبیا کے ساتھ ساتھ دوسری کتابیں سناتیں۔ اپنی بیٹیوں پر انھوں نے کسی بھی قسم کی کتابوں کے مطالعے پر پابندی عائد نہ کی۔ ان کی بیٹی اور بہار کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ نثار کبریٰ نے گیارہ برس کی عمر میں سات اشعار کی ایک مناجات لکھی جس پر اصلاح شاد عظیم آبادی نے دی اور انھیں تاکید کی کہ وہ شعر کہتی رہیں۔ نثار کبریٰ نے ایک جگہ لکھا، ''اماں کا کہنا تھا کہ لڑکیوں کو اچھی اور بُری سب ہی طرح کی کتاب دیکھنی چاہیے تاکہ وہ اپنی عقل سے اچھے کو اچھا اور بُرے کو بُرا سمجھیں۔''

ایک طرف رشید النساء کی روشن خیالی کا یہ عالم تھا، دوسری طرف وہ پدرسری سماج کے چنگل میں جس طرح پھڑپھڑاتی تھیں اس کا اندازہ اس ایک واقعے سے لگایا جاسکتا ہے۔ ہوا یوں کہ شاد عظیم آبادی کی اصلاح اور ہمت افزائی کے بعد نثار کبریٰ کی طبیعت کچھ اور رواں ہوئی۔ مزاج کی موزونی اور لڑکپن کی شوخی نے بارہ تیرہ برس کی عمر میں ان سے ''تاڑی نامہ''، ''آئینہ نامہ''، ''احمق نامہ'' اور ''مثنوی انجمن'' کے نام سے کئی ہجویں لکھوائیں۔ ''مثنوی انجمن'' ایک نئی ماما انجمن پر لکھی گئی تھی اور گھر کی لڑکیوں بالیوں میں بہت مقبول ہورہی تھی، کیوں نہ ہوتی کہ اس میں نثار کبریٰ کی جولانیِ طبع عروج پر تھی:

نزاکت سے ساری اٹھائے ہوئے
زمیں پر نظر کو جھکائے ہوئے
عجب حال سے گھر میں داخل ہوئی
طرف کام کے اپنے مائل ہوئی

وہ کاپی جس میں یہ مثنوی لکھی تھی، خاندان کا ایک شریر لڑکا لے اڑا اور اس نے گھر کے ہر چھوٹے بڑے کو، حد تو یہ ہے کہ مردانے مکان میں ٹھہرے ہوئے ایک مہمان کو بھی پڑھوا دی۔ یہ مہمان تھے ''زندگانیِ بے نظیر'' یعنی نظیر اکبر آبادی کی سوانح کے مصنف عبدالغفور شہباز۔ انھوں نے مولوی میر حسن کی طرز پر لکھی جانے والی اس مثنوی کو دیکھا تو اس کی موزونی اور سلاست کی داد دی۔ آگے کی کہانی نثار کبریٰ کی زبانی سنیے۔ لکھتی ہیں:

> ہر شخص کی زبان پر اس کا کوئی نہ کوئی بند تھا اور گھر باہر میں ہل چل مچی ہوئی تھی۔ ہمارے بھائی غلام مولیٰ مرحوم نے اس لڑکے سے کاپی کو چھینا اور لاکر والدہ مرحومہ کو دے دیا اور کہا کہ لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا کیا اس لیے سکھایا گیا ہے کہ وہ مرزا سودا بن جائیں اور لوگوں کی ہجویں کریں۔

بیٹے نے ماں سے شدید بحث مباحثہ کیا، کاپی کے ٹکڑے کیے اور اسے رشید النساء کے سامنے پھینک کر مردان خانے کی راہ لی۔ وہ رشید النساء جو لڑکیوں پر کسی قسم کی کتاب پڑھنے کی پابندی عائد نہیں کرتی تھیں، بیٹے کی چیخ پکار کے سامنے سر جھکا کر خاموش ہو گئیں اور بیٹے سے یہ نہ کہہ سکیں کہ جس لڑکی کا حوصلہ شاد عظیم آبادی نے بڑھایا ہو، جس کی لکھی ہوئی ہجو کی داد عبدالغفور شہباز دے رہے ہوں، اس پر چیخنے یا اس کی لکھی ہوئی نظم کو پھاڑنے کا انھیں کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اور بہ قول نثار کبریٰ اس مثنوی کے مشتہر ہونے اور گوشالی ہونے کے بعد شاعری کا سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا اور ایک زمانے تک شاعری کا نام لینے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔

پدرسری سماج کے سامنے رشید النساء کی سرفگندگی کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ وہ جو "اصلاح النساء" میں پڑھی لکھی اور سلیقہ شعار لڑکیوں کی شادیاں، پڑھے لکھے لڑکوں سے کراتی ہیں، جب اپنی بیٹی بیاہتی ہیں تو پدرسری سماج کے نمائندوں یعنی اپنے شوہر، بھائیوں اور بیٹوں کے سامنے سر جھکا دیتی ہیں۔ علم کی جویا، شاعرہ، خطاط، گھر بھر کا حساب کتاب رکھنے اور دائی ماماؤں کے خطوط لکھنے والی نثار کبریٰ کی شادی ایک نامی گرامی اور عالم و فاضل گھرانے میں کرتی ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتیں کہ اس کی سسرال میں لڑکیوں کے لیے وہی دم گھونٹ دینے والا ماحول ہے جس کی جی کھول کر مذمت انھوں نے "اصلاح النساء" میں کی تھی۔ نثار کبریٰ کی شادی سولہ برس کی عمر میں ہوئی۔ وہ اپنی سسرال کے بارے میں لکھتی ہیں:

> یہاں کا باوا آدم نرالا تھا۔ خیالات میں آسمان زمین کا فرق تھا، جو باتیں میری سمجھ میں اچھی تھیں وہ یہاں بُری سمجھی جاتی تھیں اور جن باتوں کو میں اچھا نہیں سمجھتی وہ یہاں اچھی سمجھی جاتی تھیں۔ برادری کی جو عورتیں میری ملاقات کے لیے آتیں وہ عورتوں کے پڑھنے لکھنے کی سخت مذمت کرتیں اور ہم کو جہالت پر مائل کرنے کی تاکید کرتیں، ان لوگوں کو جواب دینا دستور کے خلاف تھا۔ سب کی باتوں کو سن کر ناچار خاموش رہنا پڑتا تھا۔ اور تھوڑے عرصے تک تو قلم دوات اور کتابوں کو پوشیدہ کرنا ہوا، مگر پھر کتب بینی اور اخبار بینی کا سلسلہ جاری کر دیا۔ اور یوٹ کے پوٹ کاغذات سیاہ کرنے لگی۔ ہر وہ کتاب جو میرے خیال میں قابلِ اعتراض تھی یا اخبارات کے وہ مضامین جو قابلِ اعتراض ہوتے، اس کا جواب لکھتی اور اخلاقی ناول، قصہ کہانیوں کی کتابیں، مذاق کی باتیں، لطیفہ وغیرہ لکھا کرتی، مگر اس کو شائع نہیں کرا سکتی تھی، کیوں کہ خدا جنت نصیب کرے، ہمارے خسر صاحب پرانے خیال کے تھے۔ وہ عورتوں کی آزادی اور اخبارات میں مضامین دینے کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ ان کی خاطر ہم کو بھی منظور تھی، ڈرتے ڈرتے کبھی کبھی نام بدل کر کسی زنانہ رسالے میں مضمون

دے دیا کرتی تھی۔ ہمارے خسر صاحب جن کا نام مولانا عمر کریم تھا، مشہور حنفی عالم تھے۔ ان کے مضامین ''اہلِ قصبہ'' اخبار لاہور میں شائع ہوا کرتے تھے اور ان کی تصانیف بھی پنجاب میں بہت مقبول تھیں۔ ان کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہوگیا۔ اب میں آزاد ہوگئی، جو چاہتی لکھ پڑھ سکتی تھی۔ مگر افسوس کہ آنکھ کی بصارت کم ہوگئی اور صحت خراب ہوچکی تھی۔ جب تندرستی نے جواب دے دیا تو کیا کرسکتی تھی۔

رشید النساء اس وقت تک شاید اپنے سماج سے لڑتے لڑتے تھک چکی تھیں کیوں کہ نوجوان رشید النساء کو ہم سماج سے بغاوت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور جس زمانے میں عورتوں کا لکھنا تو دُور کی بات ہے، پڑھنا بھی ''جرم'' تھا، اسی دور میں وہ کوئی مذہبی قصہ نہیں، جیتے جاگتے انسانوں کی کہانی لکھنے کے لیے قلم اٹھاتی ہیں، اصلاحِ معاشرہ ان کا عزم ہے، تعلیمِ نسواں پر وہ اصرار کرتی ہیں، انگریزی کے سیکھنے اور سائنسی ایجادات سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتی ہیں۔ ایک طرف آزاد خیالی کا یہ عالم ہے دوسری طرف سماج کی اتنی تابع دار ہیں کہ ''اصلاح النساء'' کے مسودے پر گیارہ برس تک گرد جمتی رہتی ہے اور جب وہ ان کے ولایت پلٹ بیٹے کی خواہش پر شائع بھی ہوتی ہے تو اس پر اپنا نام نہیں چھپواتیں اور ''والدہ بیرسٹر سلیمان بار ایٹ لا'' کی چلمن کے پیچھے رہنے میں عافیت سمجھتی ہیں۔ بیٹا اپنی بہن کی لکھی ہوئی ''مثنوی انجمن'' کو چاک کرتا ہے تو وہ اپنے ہونٹ سی لیتی ہیں۔ تاہم اس بارے میں رشید النساء کو تنقید کا نشانہ بنانا اس لیے غلط ہے کہ رشید النساء کا دور برصغیر کے ہندو مسلم سماج میں ایک بہت بڑی اتھل پتھل کا زمانہ ہے اور یہ تضاد انیسویں صدی میں برصغیر کے پدرسری سماج کو سدھارنے کا دعویٰ کرنے والے بڑے نام ور مصلحین کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔

ہندو سماج کے سب سے بڑے مصلح اور رہنما راجا رام موہن رائے کو ''جدید ہندوستان کا باپ'' تسلیم کیا جاتا ہے۔ راجا رام موہن رائے اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوئے اور انیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں اپنے کام کے سبب مشہور و معروف ہوئے۔ سنسکرت، فارسی، عربی، انگریزی، عبرانی اور یونانی کے اس عالم نے تصوف اور قرآن کا مطالعہ کیا۔ وہ ستی کی رسم کے کٹر مخالف تھے۔ عورتوں کے ساتھ مساوی برتاؤ، جائداد میں ان کے حق اور ان کی تعلیم کے حامی اور کئی شادیوں کے مخالف تھے۔ وہ انیسویں صدی میں ''ہندو عورتوں کے حقوق کے لیے لڑنے والا سورما'' ٹھہرائے جاتے ہیں لیکن ان کی ذاتی زندگی اپنی ماں اور تین بیویوں سے شدید جھگڑوں میں گزری۔ پہلی بیوی تو شادی کے کچھ دنوں بعد ہی چل بسی تھیں۔ ان جھگڑوں کی تفصیل میں جائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندو عورتوں کے حقوق کی لڑائی لڑنے والے موہن رائے اپنی قریب ترین عورتوں سے معاملت میں ایک مثالی فرد کے طور پر سامنے نہیں آتے۔ اسی طرح اس دور کے ایک سرگرم مصلح، تعلیم نسواں کے حامی اور لڑکیوں کی

کم عمری کی شادی کے شدید مخالف کیشب چندر سین ہمیں اپنی کم عمر بیٹی مہاراجا کوچ بہار سے بیاہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قول اور فعل میں اس تضاد کا سبب یہ تھا کہ اس شادی کے سبب ان کی بیٹی ''مہارانی'' بن سکی اور وہ خود ایک مہاراجا کے ''خسر'' ہونے کا اعزاز حاصل کر سکے۔

ادھر رابندر ناتھ ٹیگور تھے جو دیانند سرسوتی کی طرح یہ نقطۂ نظر رکھتے تھے کہ ہندوستان کی ہندو اور مسلمان عورت کی پستی اور پچھڑے پن کی ذمہ داری دونوں مذاہب پر عائد ہوتی ہے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ صرف عقلیت پسندی پر مبنی سیکولر تعلیم ہی ہندوستانی عورت کو جہالت اور پس ماندگی کی دلدل سے نکال سکتی ہے۔ دیانند سرسوتی اور رابندر ناتھ ٹیگور ۱۸۳۸ء اور ۱۸۳۹ء میں مختلف سبھائیں قائم کر کے ان خیالات کا اظہار کر رہے تھے اور آزادیِ نسواں کے محرکین میں سے تھے۔ تعلیمِ نسواں اور آزادیِ نسواں کے لیے ٹیگور کی اس سرگرم حمایت کو یاد رکھنے کے ساتھ ہی ان کی شخصیت کا یہ تضاد بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ رابندر ناتھ ٹیگور ایسا روشن دماغ، روشن خیال ادیب، شاعر، دانش ور اور مصلح برس دو برس یا پانچ سات برس کی نو عمر ہندو بچیوں کی شادی کو بالکل درست سمجھ رہا تھا جب کہ گود میں کھلائی جانے والی ان بچیوں کی شادی کے خلاف صدائے احتجاج اس برطانوی سامراج نے بلند کی جس نے ہندوستان کو اپنی نوآبادی بنایا تھا۔

دوسری طرف مسلمانوں کے مصلحِ اعظم سرسید تھے۔ وہ مسلمان نوجوانوں کی جدید تعلیم کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کیے دے رہے تھے لیکن مسلمان عورتوں کے لیے قرآن اور اردو کی گھریلو تعلیم ہی کافی سمجھتے تھے۔ انھوں نے ۱۸۸۴ء میں خاتونانِ پنجاب کے سپاس نامے کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

> میری یہ خواہش نہیں کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے جو تمھاری دادیاں اور نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانے کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانے میں پھیلتی جاتی ہیں۔ مردوں کو جو تمھارے لیے روٹی کما کر لانے والے ہیں، زمانے کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم یا کوئی سی زبان سیکھنے اور کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آئی ہو، مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت تعلیم سے متعلق تم کو پہلے تھی، اس میں کچھ تبدیلی نہ ہوگی... ممکن ہے کہ (یورپ میں) عورتیں پوسٹ ماسٹر یا پارلیمنٹ کی ممبر ہو سکیں لیکن ہندوستان میں نہ اب وہ زمانہ ہے اور نہ سیکڑوں برس میں آنے والا ہے۔

سرسید مسلمانوں میں جدید تعلیم کے بانی ہیں۔ انھوں نے ۱۸۷۵ء میں مسلمان لڑکوں کے لیے ایک اسکول قائم کیا، اسے دو برس بعد کالج میں تبدیل کیا اور آج وہ ادارہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی بن چکا ہے۔ تعلیم کے میدان میں اتنے بڑے کام کے باوجود مسلمان لڑکیوں کی جدید تعلیم کے حامیوں سے

انھیں آخر عمر تک اختلاف رہا۔ اس مسئلے پر ان کا اختلاف ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، مولوی ممتاز علی، بدرالدین طیب جی، مولوی سیّد کرامت علی اور بین الاقوامی شہرت کے مسلم دانش ور History of Saracens کے مصنف جسٹس سیّد امیر علی سے بھی رہا۔ جسٹس امیر علی نے ۱۸۹۹ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ کلکتہ میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے سرسیّد کا نام لیے بغیر ان کے موقف سے اختلاف کیا اور زور دے کر یہ کہا، ''جب تک ہم تعلیم نسواں جاری نہیں کریں گے، صرف لڑکوں کو تعلیم دینے سے ہم کو ایک زندہ قوم بننے میں بالکل مدد نہیں مل سکتی۔''

برصغیر میں تعلیمِ نسواں کو جدید خطوط پر استوار کرنے کا کام پہلے عیسائی مشنریوں، ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں برطانوی راج نے انجام دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نوآبادیاتی اور استحصالی کردار فراموش کرنے کی چیز نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ برصغیر کی ہندو اور مسلمان عورتیں لارڈ بنٹنگ اور لارڈ ڈلہوزی کے احسانات کو کبھی فراموش نہیں کرسکتیں۔ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۶ء تک گورنر جنرل کے عہدے پر فائز رہنے والا یہ لارڈ ڈلہوزی تھا جس نے کہا تھا کہ ہندوستان میں کوئی بھی بات عورتوں کی تعلیم سے زیادہ اہم بنیادی تبدیلی لانے کا سبب نہیں ہوسکتی۔ تاریخ کی جب بھی ورق گردانی کی جائے گی لارڈ بنٹنگ ہندو عورتوں کو مذہب کے نام پر زندہ جل مرنے کی رسم ''ستی'' سے نجات دلانے والے کے طور پر یاد کیا جائے گا۔ اسی طرح برصغیر کی مسلمان عورت کو بھی یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ جب اس کے اکابرین اور مصلحین جدید تعلیم کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے، اس وقت روشن خیال اور دردمند انگریزوں نے انفرادی طور پر اور برطانوی راج نے سرکاری سطح پر اسے پستیوں سے نکالنے کی کوشش کی۔

اٹھارویں صدی میں یہ عیسائی مبلغین، ان کی بیویاں اور تبلیغی مشن کی دوسری کارکن خواتین تھیں جنھوں نے سب سے پہلے ہندو اور مسلمان عورت کی پستی اور اس کی ذلت آمیز زندگی کو محسوس کیا۔ یہ درست ہے کہ ان کا مقصد ہندوستانی لڑکیوں کو عیسائیت کی طرف مائل کرنا تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکیں، ہاں برصغیر میں جدید خطوط پر تعلیمِ نسواں کی بات ہونے لگی۔ ان مشنری خواتین کی ''ناکامی'' کا نقشہ "Women of the Raj" میں کھینچتے ہوئے مارگریٹ میک میلن نے لکھا ہے کہ ایک انگریز مشنری عورت لکھنو میں ۱۸ برس تک ''تبلیغ'' کا کام کرتی رہی لیکن ایک عورت کو بھی ''مشرف بہ عیسائیت'' کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ مارگریٹ نے یہ نہیں لکھا کہ ان اٹھارہ برسوں میں اس مشنری عورت نے کتنی ہندو اور مسلمان لڑکیوں کو تعلیم سے آشنا کیا۔

اس تحریک کی ابتدائی کوشش ہمیں مدراس پریذیڈنسی کے گورنر کی بیوی لیڈی کیمبل کے قائم کردہ زنانہ یتیم خانے کی صورت میں نظر آتی ہے۔ ۱۷۸۷ء میں قائم ہونے والا Lady Campbell Female Orphan Assylum پہلا ایسا تعلیمی ادارہ تھا جہاں ہندوستانی لڑکیوں کو اس وقت کے

تقاضوں کے مطابق جدید تعلیم دی جاتی تھی۔

انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں خواتین کی ''خواندگی'' کی اصل صورتِ حال ایڈم رپورٹ سے معلوم ہوتی ہے۔ ولیم ایڈم ایک باہمت اور سرگرم مشنری تھا جس نے ۱۸۳۵ء سے ۱۸۳۸ء کے درمیان یہ رپورٹیں مرتب کیں۔ ولیم ایڈم کی دوسری رپورٹ کے مطابق بنگال کے ۴،۹۶،۹۷۴ لوگوں میں سے ۲۱،۹۰۷ مرد خواندہ تھے جب کہ صرف ۴ خواندہ خواتین کا پتا لگایا جا سکا۔

نوراللہ اور جے پی نائیک ''تاریخِ تعلیمِ ہند'' میں ''تعلیمِ نسواں'' کو انیسویں صدی کا ''ایک اہم تنازع'' قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''شروع انیسویں صدی میں ہندوستانی سماج میں عورتوں کی تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔''

اس کے بعد لیڈی امہرسٹ کی سرپرستی میں Ladies Society for Native Female Education قائم ہوئی جس کی نگرانی میں ہندوستانی لڑکیوں کے لیے تین اسکول قائم کیے گئے۔ لندن مشنری سوسائٹی اور چرچ مشنری سوسائٹی نے بھی ہندوستان میں تعلیمِ نسواں کو پھیلانے کے لیے قابلِ قدر کام کیا۔ لارڈ ڈلہوزی نے ہندوستانی عورتوں کے لیے جدید تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس ضمن میں ۱۱ اپریل ۱۸۵۰ء کو کمپنی بہادر کے مکمل تعاون اور امداد کے احکامات جاری کیے۔ تعلیمِ نسواں کے فروغ کے لیے ڈلہوزی کی پالیسی کا اگر کسی کو تفصیلی جائزہ لینا ہو تو اس کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی طرف سے ۱۸۵۴ء میں جاری ہونے والے ایجوکیشنل ڈسپیچ کا مطالعہ ضروری ہے۔

یہ تعلیمِ نسواں کی سرکاری سرپرستی تھی جس کی بنا پر Borthwik یہ لکھ سکا کہ ۱۸۵۴ء میں بنگال پریذیڈنسی، مدراس پریذیڈنسی، بمبئی پریذیڈنسی، اس کے علاوہ شمال مغربی صوبے اور اودھ میں لڑکیوں کے ۶۲۶ اسکول کھل چکے تھے جن میں ۲۱،۷۵۵ لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔

اسے وقت کا مذاق کہیے کہ مسلمان لڑکوں کی جدید تعلیم کے لیے سرسیّد کی بے مثال کوششوں اور علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قیام سے پچاس برس پہلے لندن کا ایک گھڑی ساز جس نے کلکتہ آکر اور گھڑیاں بیچ کر دولت کمائی تھی، اس نے وہ دولت ہندوستانی لڑکیوں کی جدید اور سیکولر تعلیم پر خرچ کی۔ ڈیوڈ ہیر نے انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں کلکتہ کی ''انجمنِ اطفال'' نامی تعلیمِ نسواں کی ایک انجمن کی بھرپور مالی امداد سے بنگال میں لڑکیوں کی تعلیم کو آگے بڑھانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ سرسیّد کے اسکول کے قیام سے چھبیس برس پہلے ۱۸۴۹ء میں لارڈ ایف ڈی بیتھون اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی سے ہندوستانی لڑکیوں کا پہلا سیکولر اسکول قائم کر چکا تھا جو آخرکار کالج بنا اور آج بھی بیتھون کالج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تعلیمِ نسواں کے شاید یہی ادارے تھے جن کے بارے میں سرسیّد نے اپنی مشہور کتاب ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' میں لکھا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ''سب یقین سے جانتے تھے کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں اسکول میں آئیں اور اپنی تعلیم پائیں اور بے پردہ

ہو جائیں، یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی۔''

یہ بات قدامت پسند ہندوستانیوں کو ناگوار تو بہت تھی لیکن کلکتہ کی بندرگاہ پر برطانیہ اور دوسرے ملکوں سے آنے والے جہازوں سے صرف تجارت کے لیے آنے والا سامان ہی نہیں اتر رہا تھا، نئے خیالات و افکار بھی آ رہے تھے اور تیزی سے پھیل رہے تھے۔ ہوا کا رخ بدل چکا تھا، غالب کلکتہ میں نئی زندگی کی جھلکیوں کو دیکھ کر اور برطانوی خیالات و افکار سے آگاہی حاصل کر کے بے ساختہ یہ کہہ رہے تھے کہ:

صاحبانِ انگلستاں رانگر
آنچہ ہرگز کس ندید، آوردہ اند
شیوہ و انداز ایناں رانگر
داد و دانش رابہم پیوستہ اند
تاچہ آئیں باپدید آوردہ اند
ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند

غالب کے یہ اشعار ان کی فارسی مثنوی ''تقریظِ آئینِ اکبری'' سے لیے گئے ہیں جس میں اٹھاون برس کے غالب اڑتیس برس کے سیّد احمد خان کو پرانے آئین پر مشتمل اس کتاب کی تصحیح پر فہمائش کرتے ہیں اور اس کام کو وقت کا زیاں قرار دیتے ہیں۔ انھیں مشورہ دیتے ہیں کہ وہ بھاپ کا انجن اور تار برقی ایجاد کرنے والوں کے آئین و قانون سے استفادہ کریں اور طرزِ زندگی، طرزِ حکومت ان سے سیکھیں۔ کیسا کمال تضاد ہے کہ غالب لال قلعے کے وظیفہ خوار تھے، پرانی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور نئے زمانے کی بات کر رہے تھے، جب کہ سیّد احمد خاں انگریز کی ملازمت کرتے تھے، خود کو مسلمانوں کی نئی نسل کا نمائندہ سمجھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریز خاندانوں کی جان بچانے کے سلسلے میں ''سر'' کا خطاب پایا، دنیا بھر میں سر سیّد کہلائے، بود و باش بالکل انگریزوں کی اپنائی لیکن ان کے باطن میں ایک شدید قدامت پرست اور ماضی سے وابستہ و پیوستہ انسان رہتا تھا جو تعلیمِ نسواں کے باب میں اپنی قدیم روایات کے حصار سے باہر نہ آ سکا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستانی سماج جس تیزی سے منقلب ہو رہا تھا اور اس نئی تبدیلی کو ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد جس طرح قبول کر رہی تھی، اس تناظر میں ہندوستانی عورت کی حالتِ زار پر نگاہ ڈالی جائے تو میر کا یہ شعر بے ساختہ یاد آتا ہے کہ:

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے
چاکِ قفس سے باغ کی دیوار کو دیکھنا

یہ برطانوی راج کا خنجر تھا جو قدامت پرستوں کے سینے پر چل رہا تھا اور ہندوستانی عورتوں کے لیے ''چاکِ

قفس'' کو چاک کر رہا تھا۔ سماج اور روایات کی ''اسیر'' یہ عورتیں اب باغ کی دیوار دیکھنے پر ہی اکتفا نہیں کر رہی تھیں، جدید تعلیم انھیں ''روایات کے قفس'' سے پرواز کر جانے کی ہمت بھی عطا کر رہی تھی۔ اسی ماحول نے رشندری، رشیدہ اور رقیہ کو جنم دیا اور ان کے اندر قلم اٹھانے کی ہمت پیدا کی اور وہ بنگلہ اور اردو کی ایسی اوّلین ادیب عورتیں بن سکیں جنھوں نے ادب کے وسیلے سے ہندوستان میں تعلیمِ نسواں اور حقوقِ نسواں کے معاملات و مسائل کو اجاگر کیا۔

انیسویں صدی میں تعلیمِ نسواں کی انفرادی اور سرکاری کوششوں کا ایک سرسری جائزہ ہمیں رشندری دیوی سے زیادہ رشید النساء اور رقیہ سخاوت حسین کے ذہنی رجحانات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

نو آبادیاتی نظام کے استحصال کی بات کرتے ہوئے ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مذہبی جوش اور تبلیغی ضرورتوں کے تحت ہی سہی، یہ برطانیہ، آسٹریلیا، کینیڈا اور امریکا سے آئی ہوئی مشنری عورتیں تھیں جنھوں نے ہندوستانی عورتوں کی سیکولر تعلیم کے لیے راہ ہموار کی اور اسکول کھولے۔ چرچ آف انگلینڈ زنانہ مشنری سوسائٹی اور زنانہ بائبل سوسائٹی کے نام سے کام کرنے والی تبلیغی تنظیموں سے وابستہ ان عورتوں نے اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں تعلیمِ نسواں کو فروغ دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔

جھانسی کی رانی لکشمی بائی کی بھتیجی مہارانی تپسوینی نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا، اس کی سزا میں قید کاٹی لیکن رہائی کے بعد انھوں نے بنگال میں تعلیمِ نسواں کے ضمن میں بڑا بنیادی کام کیا۔ اسی طرح مرشد آباد کے راجا کرشنو ناتھ کمار کی بیوہ رانی شرنومئی نے تعلیمِ نسواں کے لیے سرمایہ فراہم کیا اور ۱۸۸۶ء میں کلکتہ کے میڈیکل کالج میں لڑکیوں کے لیے ایک ہوسٹل تعمیر کرایا۔

برطانوی نژاد میری کارپنٹر نے تعلیمِ نسواں کے فروغ کے لیے ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۷ء کے دوران چار مرتبہ ہندوستان کا سفر کیا، لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کیے اور تعلیمِ نسواں کی ایک اسکیم حکومت کے سامنے پیش کی جس کے لیے برطانوی حکومت کی طرف سے مناسب رقم مہیا نہ کی گئی چناں چہ اس اسکیم پر عمل نہ ہو سکا۔

۱۸۷۳ء میں مانک جی کرسٹ جی نے بمبئی میں پارسی لڑکیوں کے لیے ایک اسکول کھولا جس میں ہندو اور مسلمان لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کرسکتی تھیں۔ انیتی اکرائڈ Annette Akroyd نے ۱۸۷۳ء میں بعض ہندوستانیوں کی مدد سے ہندو لڑکیوں کے لیے اسکول کھولا۔ شادی کے بعد وہ Annette Beveridge کے نام سے مشہور ہوئی۔ وہ فرانسیسی اور جرمن جانتی تھی، بنگال میں رہ کر اس نے بنگالی، فارسی اور ترکی سیکھی۔

۱۸۸۲ء میں ہنٹر کمیشن نے اپنی تعلیمی رپورٹ پیش کی، اس میں لڑکیوں کی تعلیم پر اصرار کیا گیا تھا اور سرکاری سرپرستی میں چلنے والے اسکولوں میں خرابیوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔ اس کمیشن کی رپورٹ کو نظر میں رکھتے ہوئے ۱۸۸۹ء میں لڑکیوں کے اسکولوں کی گرانٹ میں اضافہ ہوا۔

۱۸۸۴ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور نے لڑکیوں کے لیے دو پرائمری اسکول قائم کیے۔ زمانہ بدل رہا تھا، ناپسند کرنے کے باوجود تعلیم نسواں کا رواج بڑھ رہا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف دو برس میں انجمن کو مزید آٹھ اسکول کھولنے پڑے اور ۱۸۸۶ء میں انجمن دس اسکولوں کا نظم ونسق چلا رہی تھی۔ پنجاب میں ان زنانہ اسکولوں کے قیام کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ لوگ اپنی لڑکیوں کو جدید تعلیم سے بھی روشناس کرانا چاہتے تھے اور اس بات سے بھی خوف زدہ تھے کہ مشنری تعلیمی ادارے ان کی لڑکیوں کو کہیں مذہب تبدیل کرنے کی ترغیب دینے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔

۱۸۹۰ء کی دہائی میں ڈھونڈو کیشو کاروے نے لڑکیوں کے لیے کئی اسکول قائم کیے۔ مہاراجا دربھنگہ تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے اور ۱۸۹۳ء میں وہ مہارانی تھموبئی کے قائم کردہ اسکول کی تیئس شاخوں کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے سربراہ بنے۔ ان کے علاوہ شیخ عبداللہ اور بیگم شیخ عبداللہ، بیگم بھوپال، مسز اینی بیسنٹ، نواب محسن الملک، گوپال سنگھ اور متعدد دوسری ہندو مسلم شخصیات نے تعلیم نسواں کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ ان انفرادی کوششوں اور سرکاری اقدامات کے علاوہ برہمو سماج، پرارتھنا سماج، آریہ سماج اور تھیوسوفیکل سوسائٹی کے قائم کیے ہوئے زنانہ اسکولوں نے بھی تعلیم نسواں کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

درج بالا سطروں میں تعلیم نسواں کی ابتدا تفصیل سے بیان کی جاچکی ہے، یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں کہ سرسید کو انگریزوں سے ربط خاص تھا، اس کے باوجود وہ عورتوں کی تعلیم کے بارے میں لارڈ ڈلہوزی، سر ولیم میور، ڈیوڈ ہیر، لیڈی بیلی، لیڈی ایمبرسٹ اور لیڈی فریزر کے رویوں اور احکامات کو بھی خاطر میں نہیں لائے۔ تعلیم نسواں کی وہ تحریک جو بااثر انگریزوں نے ۱۸۴۴ء سے شروع کی تھی جسے ۱۸۵۰ء میں لارڈ ڈلہوزی کی سرپرستی حاصل ہوئی اور ۱۸۵۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے جس تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے ایجوکیشنل ڈسپیچ جاری کیا، اس سے سرسید کو اس قدر اختلاف اور اکراہ رہا کہ انھوں نے ۱۸۸۴ء میں تعلیم نسواں کے حوالے سے اپنے موقف پر اصرار کرتے ہوئے کہا:

> (ہندوستان میں) عورتوں کو جس قسم کے علوم پڑھائے جانے کا خیال پیدا ہوا ہے اس کو بھی میں پسند نہیں کرتا، کیوں کہ نہ وہ ہماری حالت کے مناسب ہیں اور نہ سیکڑوں برس تک ہماری عورتوں کو ان کی ضرورت ہے۔

سرسید کے حامی اور رفقا یہ کہتے نہیں تھکتے کہ "وہ تعلیم نسواں کے ہرگز مخالف نہ تھے" ان لوگوں کا کہنا ہے کہ سرسید دراصل مسلمان نوجوانوں کی تعلیم کے حامی تھے اور سمجھتے تھے کہ جب گھر کے مرد تعلیم یافتہ ہوں گے تو ان گھروں کی لڑکیوں کی تعلیم کی راہ آپ سے آپ ہموار ہو جائے گی۔ سرسید کے ان حامیوں میں سے ایک مولوی مشتاق حسین امروہوی تھے جو نواب وقار الملک کے نام سے مشہور ہوئے۔

انگریزی کے قائم کردہ زنانہ اسکولوں کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ ''میری رائے ان مدارس کی نسبت یہ ہے کہ اشراف خاندانوں کی لڑکیوں کا اپنی موجودہ حالتِ جہالت میں رہنا، ان مدارس کے ذریعے تعلیم و تربیت پانے سے لاکھوں درجہ بہتر ہے۔''

سرسید اور ان کے جیّد ساتھیوں کے اس موقف اور ان کے دلائل کو سامنے رکھیے تو رشید النساء جن کی تعلیم گھریلو تھی اور جنھیں اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا، وہ برصغیر کے ان مسلم اکابرین سے کہیں آگے نظر آتی ہیں، وہ ایک جگہ اشرف النساء کی زبانی کہلواتی ہیں:

> ابا جان کہتے تھے کہ انگریزوں کی عورتیں پڑھی لکھی تعلیم یافتہ ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے لڑکے اور لڑکیاں سب تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ بے تعلیم لوگ اپنی زندگی کے دن بڑی مصیبت سے پورے کرتے ہیں۔

سرسید کا اصرار تھا کہ جب مرد تعلیم یافتہ ہوجائیں گے تو وہ اپنی لڑکیوں اور عورتوں کو بھی تعلیم دیں گے۔ رشید النساء ان سے قطعاً مختلف نقطۂ نظر کا اظہار کرتی ہیں:

> جب لڑکیاں شائستہ اور تعلیم یافتہ ہوجائیں گی تو لڑکوں کا تعلیم پانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

آگے چل کر لکھتی ہیں:

> مرد کی تعلیم تو عورتوں کے اختیار میں ہے، جب لڑکے پیدا ہوتے ہیں تو پہلے ماں سے ہی تعلیم پاتے ہیں اور بعد اس کے مولوی ماسٹر کے سپرد ہوتے ہیں، اس لیے مادری تعلیم کا اثر دل سے نہیں جاتا۔

انھیں لڑکیوں کے صرف خواندہ ہونے پر ہی اصرار نہیں، وہ چاہتی ہیں کہ لڑکیاں لکھنا بھی سیکھیں:

> اگر کوئی شخص چار سطر نقل کیا کرے اور اسی قدر اپنے دل سے بنا کر لکھا کرے تو چند مہینوں میں لکھنا سیکھ جائے گا۔ خوش خطی سے مطلب نہیں، لکھنا ایک ہنر ہے جو ضرورت کے وقت کام آتا ہے، اگر غلط ہو یا حرف بدصورت نادرست لکھے جائیں تو بے دل ہو کر مشق کو موقوف مت کرو۔ کوئی کام ہو ابتدا میں اچھا نہیں ہوا کرتا۔ اگر کسی بڑے عالم کو ایک ٹوپی کترنے اور سینے کو دو جس کو کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا ہو، ضرور وہ ٹوپی کو خراب کرے گا۔

ایک جگہ ''اصلاح النساء'' میں لکھتی ہیں:

> ابھی زمانہ ایسا نہیں آیا ہے کہ سب عورتیں تعلیم یافتہ ہوں اور رسم رسومات کو بُرا سمجھیں، ایسا زمانہ ہونے میں ابھی تیس چالیس برس کا زمانہ باقی ہے۔

یہ جملہ ۱۸۸۱ء میں لکھا گیا، اس کے آٹھ برس بعد ۱۸۸۹ء میں ولایت پلٹ اور دنیا دیکھے

ہوئے سرسید نے اس مدت کو ''سیکڑوں برس'' پر پھیلا دیا اور محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے اجلاس میں تعلیم نسواں کے حق میں پیش کی جانے والی قرارداد کی کھل کر مخالفت کرتے ہوئے کہا:

جو جدید انتظام عورتوں کی تعلیم کا اس زمانے میں کیا جاتا ہے، خواہ وہ انتظام گورنمنٹ کا ہو اور خواہ اسی طرز کا انتظام کوئی مسلمان یا کوئی انجمن اسلامی اختیار کرے، اس کو میں پسند نہیں کرسکتا۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے مدرسوں کا قائم کرنا اور یورپ کے زنانہ مدرسوں کی تقلید کرنا، ہندوستان کی موجودہ حالت کے لیے کسی طرح مناسب نہیں ہے اور میں اس کا سخت مخالف ہوں۔

ادھر پردہ نشین اور زنان خانے میں زندگی گزارنے والی رشید النساء لڑکیوں کے لیے کھلنے والے اسکولوں اور انگریزی تعلیم کی حمایت کا طریقہ یہ اختیار کرتی ہیں کہ لاڈلی جب طنزاً کہتی ہے:

''اب وہاں اسکول بھی لڑکیوں کا بنے گا، لڑکیاں انگریزی بھی پڑھیں گی۔''

تو اشرف النساء فوراً جواب دیتی ہیں، ''کوئی علم ہو اس کے حاصل کرنے میں برائی نہیں ہے۔''

پڑھنے کے لیے لڑکیوں کے گھر سے نکل کر مکتب یا اسکول جانے کے فوائد یوں بیان کرتی ہیں کہ:

دو روپے مہینے کی آتو سے گھر پر تعلیم نہیں ہوسکتی ہے کیوں کہ آتو کو خود کچھ پڑھنا تو آتا ہی نہیں ہے، سوائے قرآن شریف کے اور وہ بھی غلط۔

جہل کیسے کیسے عذاب لاتا ہے، اس کا نقشہ رشید النساء نے یوں کھینچا ہے کہ بسم اللہ اور اس کی ماں چوں کہ پڑھی لکھی نہیں، اس لیے ذاتی خط پڑھوانے کے لیے بھی کسی کی محتاج رہتی ہیں اور چار پیسے دے کر کسی طالب علم سے خط پڑھوا کرسنتی ہیں اور پھر پیسے دے کر ہی خط کا جواب لکھواتی ہیں۔ قانونی امور سے ناواقف ہیں، سرکاری کاغذات پڑھ نہیں سکتی ہیں، اپنی جائداد اور زمینوں کا انتظام و انصرام بھی ان کے بس کا نہیں۔ چناں چہ ایک شخص کے نام ''جمیع اُمورات'' کا مختار نامہ لکھ دیتی ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ شخص ان کی جائداد پر قرض لیتا جاتا ہے، خود صاحب جائداد ہوجاتا ہے اور ان ماں بیٹیوں کی لاکھوں کی جائداد خاک ہوجاتی ہے۔

''اصلاح النساء'' میں ایک ایسی لڑکی کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو پڑھی لکھی تھی لیکن شادی میر نادر نام کے ایک لڑکے سے ہوئی جسے پڑھنے کا شوق نہ تھا۔ بی بی نے طب کی کتابیں پڑھنا شروع کیں تو میر نادر کو بھی شوق ہوا، پھر اس نے باقاعدہ طب پڑھی اور حکیم ہوا۔ عورت اور مرد کی مساوات اور equal opportunity کا فلسفہ ۱۸۸۱ء میں یوں بیان کرتی ہیں:

شہزادی: یہ عورت ذات ہو کر طبابت کی کتابیں کیوں کر پڑھیں؟

اشرف النساء: یہ کیوں؟ کیا عورت طب پڑھ نہیں سکتی ہے؟ کون سا کام ہے جو

عورت نہیں کر سکتی ہے۔ آنکھ، کان، سمجھ بوجھ تو عورت کو بھی اللہ نے دی ہے مگر
یہاں تو لڑکیوں کو چھوڑ دیتے ہیں کہ نہ پڑھیں لکھیں، نہ ہنر سیکھیں، گڑیا کھیلنے
میں اپنے دن گنوائیں۔ مردوں کی تعلیم ہوتی ہے تو ان کا جوہر کھلتا ہے کہ یہ
ہوئے، وہ ہوئے۔ عورت کی تعلیم ہی نہیں ہوتی ہے جس سے گھر کی سب طرح
کی درستگی اور دین دنیا کی بھلائی ہو۔

ایک جگہ بیگم محمد اعظم سے کہلواتی ہیں:

''علم بڑی دولت ہے۔ روپیا پیسا اس کے سامنے کچھ نہیں ہے۔''

تعلیم کا رشتہ وہ اقتدار اور حاکمیت سے جوڑتی ہیں:

''پڑھنے لکھنے میں محنت کرو گے تو حاکم ہو جاؤ گے۔''

انیسویں صدی میں لکھی جانے والی ''اصلاح النساء'' کو اول سے آخر تک پڑھ جایئے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس تمثیلی قصے یا ناول کو لکھنے کا واحد سبب یہ تھا کہ رشید النساء لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم کے لیے بے قرار تھیں۔ ان کی یہ بے قراری ہر صفحے پر جھلکتی ہے اور تعلیمِ نسواں کو وہ سماج کے تمام معاملات سے جوڑ کر دیکھتی ہیں۔ جب کہ بیسویں صدی میں بھی تعلیمِ نسواں کا مسئلہ برصغیر کے بعض اہم اور معتبر دانش وروں کے لیے کس قدر ''غیر اہم معاملہ'' تھا، اس کا اندازہ عبداللہ یوسف علی کی کتاب ''انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ'' سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب جو ۳۹۸ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے، اس میں ہندو مسلم خواتین کی تعلیم کے مسئلے نے جس حد تک بار پایا اس کا اندازہ عبداللہ یوسف علی کے ان دو جملوں سے لگایا جاسکتا ہے ''پریذیڈنسی شہروں میں بھی لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد اس قدر غیر مناسب تھی کہ ایجوکیشن کمیشن نے تعلیمِ نسواں کے معاملے میں خاص توجہ کی اور خاص سفارشات کیں۔''

عورتوں کی تعلیم اور ان کے حقوق کے لیے اس سے بھی کہیں زیادہ بے قراری رقیہ سخاوت حسین (۱۸۸۰ـ۱۹۳۱ء) کے یہاں نظر آتی ہے۔ وہ ''اصلاح النساء'' کے تحریر کیے جانے سے ایک برس پہلے ۱۸۸۰ء میں مشرقی بنگال کی بستی رنگ پور میں پیدا ہوئیں۔ باپ زمیں دار تھے، انھوں نے بیٹے کو ہفت زبان بنایا لیکن بیٹیوں کی تعلیم کا معاملہ ''عزت و ناموس کا مسئلہ'' تھا۔ رقیہ اپنی شاعرہ بہن کریم النساء سے کہیں خوش نصیب رہیں۔ کریم النساء کم عمری میں ایک بنگلہ نظم پڑھتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھیں، جس کی سزا میں کئی برس تک انھیں تقریباً ایک قیدی کی سی زندگی گزارنی پڑی۔ ڈھاکا سے شائع ہونے والی ''ناری گرنتھ پر برتنا'' میں کریم النساء کی ایک نظم دی گئی ہے:

وہ امیر ہوں، غریب ہوں یا درمیانے طبقے کے
مرد قابلِ اعتبار نہیں ہیں

یہ مت بھلانا میری بہن، مت بھلانا
ان کے بول عورتوں کو تباہ کر دیتے ہیں

چشمِ تصور سے اس بڑے بھائی کو دیکھیے جو کریم النساء کے انجام سے افسردہ اور ناراض ہے لیکن سماج کے اصولوں کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا، ادھر رقیہ کو دیکھتا ہے جو پڑھنے کے لیے، دنیا کو اپنی آنکھ سے دیکھنے اور اپنے ذہن سے سوچنے کے لیے بے تاب ہے۔ رات گئے جب سب سو جاتے ہیں، وہ کبھی اپنے کمرے میں، کبھی کوٹھے پر رقیہ کو لالٹین کی روشنی میں بنگلہ اور انگریزی پڑھنا اور لکھنا سکھاتا ہے۔ لالٹین کی لَو اونچی نہیں کی جاتی کہ کہیں کسی کی آنکھ کھل جائے اور دونوں بھائی بہن پڑھانے اور پڑھنے کا کام کرتے ہوئے پکڑے جائیں۔

رقیہ خوش نصیب تھیں کہ ان کی شادی بہار کی اشرافیہ کے ایک ایسے اردو داں، ولایت پلٹ اور روشن دماغ شخص سے ہوئی جو عورتوں کی تعلیم کو لازمی سمجھتا تھا، جسے جاہل عورتوں سے وحشت ہوتی تھی۔ سید سخاوت حسین کی ایک بیوی کا انتقال ہو چکا تھا، وہ کسی ایسی عورت کی تلاش میں تھے جو اُن کی شریکِ زندگی بن سکے۔ انھیں جب رقیہ کے بارے میں معلوم ہوا تو حالاں کہ وہ رقیہ سے عمر میں خاصے بڑے تھے لیکن انھوں نے اس شادی میں دیر نہیں لگائی۔ رقیہ کے لیے یہ شادی ایک ایسی نعمت ثابت ہوئی جس کا انھوں نے خواب میں بھی کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ سید سخاوت حسین نے اپنی نوعمر بیوی کی ناز برداریاں کیں تو اس طرح کہ اسے انگریزی زبان کی تعلیم دی اور اصرار کیا کہ وہ انگریزی میں مضامین تحریر کریں۔

یہ اس کا نتیجہ تھا کہ اپنی شادی کے صرف تین برس کے اندر رقیہ ایک ادیب اور تعلیمِ نسواں کی زبردست حامی بن کر ابھریں۔ انھوں نے متعدد مضامین، کہانیاں اور ناول لکھے۔ ۱۹۰۵ء میں ان کی انگریزی کہانی The Sultana's Dream چھپی تو اس نے ہندوستان بھر میں تہلکہ مچا دیا۔ اس کہانی میں انھوں نے عورت اور مرد کا صنفی کردار بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔ رقیہ سخاوت حسین کا یہ افسانہ اس قدر دلچسپ ہے کہ اسے پورا ہی پڑھنا چاہیے۔ تاہم یہاں چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''سب مرد کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنے صحیح مقام پر، جہاں انھیں ہونا چاہیے!''

''صحیح مقام سے تمھاری کیا مراد ہے بھلا؟''

''اوہ سمجھی! تم پہلے کبھی یہاں نہیں آئی ہو نا اسی لیے ہمارے رسم و رواج سے واقف نہیں۔ ہم اپنے مردوں کو اندر بند رکھتے ہیں۔''

''جیسے ہمیں زنانے میں رکھا جاتا ہے؟''

''کیا بات ہے!'' میں کھلکھلا اٹھی۔ سارہ آپا بھی ہنسنے لگیں۔

''لیکن سلطانہ جان! کتنی غلط بات ہے کہ بے چاری عورتوں کو تو اندر بند رکھا جائے اور

مردوں کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔"

"کیوں، ہم فطرتاً صنفِ نازک جو ٹھہریں۔ اس لیے زنانے سے باہر آنا ہمارے لیے محفوظ نہیں۔"

"ہاں، اسی وقت تک محفوظ نہیں جب تک مرد سڑکوں پر ہوں یا جب کوئی جنگلی جانور بازار میں گھس آئے۔"

"بے شک!"

"فرض کرو، پاگل خانے سے کچھ پاگل بھاگ نکلیں اور آدمیوں، گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کے ساتھ شرارتیں کرنے لگیں، اس حالت میں تمھارے ہم وطن کیا کریں گے؟"

"وہ انھیں پکڑ کر دوبارہ پاگل خانے میں بند کر دیں گے۔"

"کہیں تم یہ تو نہیں سوچتیں کہ سیانے لوگوں کو پاگل خانے میں بند کر دیا جائے اور پاگلوں کو کھلے عام چھوڑ دیا جائے؟"

"قطعاً نہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"سچ تو یہ ہے کہ تمھارے ملک کا یہی دستور ہے۔ وہ مرد جو غلط حرکتیں کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں، کھلے چھوڑ دیے جاتے ہیں اور بے گناہ خواتین کو زنانے میں بند رکھا جاتا ہے، تم کھلے گھومتے ان مردوں پر کیسے یقین کر سکتی ہو؟"

"ہمارے معاشرتی معاملات کی دیکھ ریکھ میں ہماری کوئی شنوائی نہیں ہے، ہندوستان میں مرد ہی نعوذ باللہ خدا اور مالک ہے۔ اس نے تمام اختیارات اور اقتدار خود حاصل کر لیا ہے اور عورتوں کو زنان خانے میں مقید کر دیا ہے۔"

"تم بند ہونے کے لیے کیوں تیار ہوتی ہو؟"

"کوئی اور چارہ بھی تو نہیں ہے، وہ عورتوں سے زیادہ طاقت ور ہیں۔"

"ایک شیر بھی آدمی سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ آدمی پر حاوی تو نہیں ہو جاتا۔ تمھارے جو فرائض ہیں تم نے انھیں نظر انداز کر دیا ہے اور اپنی ہی بھلائی سے آنکھیں موند لینے کی وجہ سے تم نے اپنے پیدائشی حقوق بھی کھو دیے ہیں۔"

بنگلہ دیش کی مشہور مصنف روشن جہاں لکھتی ہیں کہ "سلطانہ کا خواب" ایک خیالی کہانی ہے اسی لیے:

> خواب کے طور پر بیان کی گئی ہے، لیکن اس میں ایک منطقی تعلق موجود ہے۔ غیر معمولی چیزوں کا ہونا ممکن ہے مگر جادو یا مافوق الفطری طریقوں سے نہیں۔ اس سب کو ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کی اصطلاحوں میں بیان کیا گیا ہے۔

ٹیکنالوجی انسان کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ یہاں پھر ہندوستانی مزاج صاف نظر آتا ہے۔ عورتوں کی مملکت میں وہ تمام سہولتیں ہیں جو رقیہ کی سرزمین میں نہیں۔ اس کہانی کے افلاطونی عنصر کی تحسین اور مصنف کا یہ اعتبار کہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے یہ مسائل حل ہو سکتے ہیں، غور کے قابل باتیں ہیں۔ ہم جو آج کل نیوکلیئر تباہی کی دھمکی تلے جیتے ہیں، انھیں سائنس اور ٹیکنالوجی کا یہ فلاحی زاویہ، جس کا ذکر رقیہ اور Gillman جیسے مصنفین نے کیا ہے، شاید ایک جذباتی اور سادہ لوحی کا زاویہ معلوم ہو لیکن پہلی جنگ عظیم سے پہلے کی دنیا میں یہ تصویر اس طرح نظر نہ آتی ہوگی جس طرح ہماری آنکھ کے سامنے ہے۔

عورتوں کی مملکت میں رقیہ نے سائنس اور ٹیکنالوجی پر جو اس قدر زور دیا ہے، اسے اس بحث کے پس منظر میں بھی دیکھنا چاہیے جو اس وقت عورتوں کی تعلیم سے متعلق جاری تھے۔ ان کے ہم عصروں میں، ترقی پسند برہمو، جو خواتین کی تعلیم کے بڑے حمایتی تھے، وہ بھی سائنس اور حساب کو عورتوں کے تعلیمی نصاب کے لیے لازمی نہ جانتے تھے۔ اس حوالے سے رقیہ صرف عورتوں کی تعلیم کی سادہ سی بات نہیں کر رہی تھیں بلکہ ایسی تعلیم کی بات کر رہی تھیں جو عورتوں کو سائنس کے میدان میں برتری دلائے۔

رقیہ بنگال میں پیدا ہوئیں، اپنی جوانی کے ماہ و سال انھوں نے بہار میں گزارے۔ وہ بنگال اور بہار کی مسلم اور ہندو اشرافیہ کی عورتوں پر عائد کردہ پابندیوں سے بہ خوبی آگاہ تھیں۔ آگاہ کیسے نہ ہوتیں کہ انھوں نے خود کو اور اپنی نانی، دادی، ماں، بہنوں اور دوسری تمام رشتہ دار لڑکیوں اور عورتوں کو دم گھونٹ دینے والے اس پردے میں سانس لیتے دیکھا تھا۔ انھوں نے ہندو بنگالی گھرانوں کی لڑکیوں اور عورتوں کو بھی پردے کی اسی اندھیری کوٹھری میں زندگی گزارتے دیکھا تھا۔ ان سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم اور انھیں سخت پردے میں رکھنے کی روایات کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے۔ وہ لڑکیاں جو اپنے باپ، بھائیوں اور حد تو یہ ہے کہ گھر میں آنے والی غیر عورتوں سے پردہ کرتی تھیں، ان کی تعلیم کا سوال ہی کیسے اٹھ سکتا تھا؟

اپنی بہن کریم النساء کو رقیہ نے پڑھنا اور لکھنا سیکھنے کے "جرم" میں گھر سے نکال کر اپنی کسی بزرگ رشتہ دار کی قید میں بھیجے جاتے دیکھا تھا۔ کریم النساء، رقیہ سے کچھ ہی بڑی تھیں، دونوں نے ساتھ گڑیاں کھیلی تھیں، جھولے پر جھولی تھیں، آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے ایک دوسرے کو ڈھونڈا تھا، بارہ برس کی کریم النساء کا یوں رقیہ سے جدا ہو جانا اور ایک طرح کی قید تنہائی میں بھیج دیا جانا، رقیہ کے لیے ایک بڑا جذباتی صدمہ تھا۔ ان کے گھر کی دوسری لڑکیاں کریم النساء کو رو پیٹ کر بیٹھ گئی تھیں لیکن رقیہ نے اس قید

سے آزادی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

وہ سمجھ گئی تھیں کہ یہ پردے کی روایت ہے جو عورتوں کے تمام اختیارات ان سے چھین لیتی ہے اور انھیں پیدائش سے موت تک زنان خانے کے زنداں میں قید رکھتی ہے، پھر صرف موت ہی انھیں اس عمر قید سے رہائی دلاتی ہے۔ یہاں یہ عرض کرتی چلوں کہ آج اکیسویں صدی کے آغاز پر بھی سندھ کے کئی نامی گرامی سید گھرانے ایسے ہیں جہاں کی خواتین غیر سید عورتوں سے پردہ کرتی ہیں۔ سندھ کے مشہور اور روایت شکن سیاست داں شاہ محمد شاہ کے گھرانے کی خواتین نے مجھے بتایا کہ مخدوموں کے خاندان کی خواتین کو وہ صرف اس لیے دیکھ سکی ہیں کہ خود ان کا تعلق بھی سادات کے گھرانے سے ہے۔ شاہ محمد شاہ کی بہنوں اور بھتیجیوں کا کہنا تھا کہ اس خاندان کی خواتین یا لڑکیاں جان سے گزر جائیں تو ان کے جنازے رات کے اندھیرے میں صرف محرم مرد ہی اٹھا سکتے ہیں۔ گیس بتی کی روشنی میں اٹھائے جانے والے ان جنازوں کا غیر مردوں سے پردہ کرایا جاتا ہے۔ بستی کے کسی مرد کی مجال نہیں کہ وہ سیدانی کا جنازہ گزرتا ہوا دیکھ لے۔ یہ اس گھرانے کے مردوں کی توہین اور ان عصمت پناہ سیدانیوں کی بے حرمتی کے مترادف ہے۔

اوپر کی سطروں میں بنگالی ہندو خواتین کی ''پردہ نشینی'' کا ذکر آیا ہے۔ کچھ لوگوں کو یہ شاید مبالغہ یا زیب داستاں کے لیے لکھی جانے والی بات محسوس ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ہندو عورت بھی اسی پردہ نشینی میں زندگی گزار رہی تھی جو مسلمان عورت کا مقدر تھی۔ تانیکا سرکار، ہندوستان کی ایک جانی اور مانی ہوئی دانش ور اور استاد ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک جگہ تانیکا نے لکھا ہے کہ انیسویں صدی اور اس کے بعد بھی (بنگالی ہندو) گھر کے بڑے بوڑھے تو دور کی بات ہیں، شوہر بھی اپنی بیوی کا گھونگھٹ میں چھپا ہوا چہرہ دن کی روشنی میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

رابندر ناتھ ٹیگور اور شرت چندر چٹرجی کے ناولوں میں اس بنگالی ہندو عورت کی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان جھلکیوں سے زیادہ اہم اور مستند رشندری دیوی کی خودنوشت ''امار جیون'' ہے جس میں وہ ہمیں اپنی رسوئی میں بھی ہر وقت ایک لمبا گھونگھٹ کاڑھے نظر آتی ہیں اور اپنی ملازماؤں سے اتنی دھیمی آواز میں بات کرتی ہیں کہ کسی اور کو سنائی نہ دے اور آواز کا بھی پردہ رہے۔ پردہ بنگالی ہندو عورت کے خون میں کس طرح رچا ہوا تھا اور اس کی رگ و پے میں جس طرح سمایا ہوا تھا اس کا اندازہ ''امار جیون'' سے لگایا جا سکتا ہے۔ رشندری دیوی پچیس برس کی ہو چکی ہیں، ان کا بڑا بیٹا گھڑ سواری سیکھ رہا ہے، اس وقت کا ایک واقعہ ان کی زبان سے سنیے:

> ہمارے گھر میں ایک گھوڑا تھا جس کا نام جے ہری تھا۔ ایک روز اسے زنان خانے کے آنگن میں لایا گیا تاکہ میں اپنے بڑے بیٹے کو گھڑسواری کرتے

ہوئے دیکھ سکوں۔ میں نے لوگوں کو کہتے سنا تھا کہ یہ کرتار (مالک، مجازی خدا) کا گھوڑا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ میں اس کے سامنے کیسے جاسکتی ہوں۔ یہ یقیناً بہت شرم اور ذلت کی بات تھی کہ میرے سوامی کا گھوڑا مجھے دیکھ لے، سو میں اندر چھپ گئی۔ گھر والے مجھے آنگن میں کھڑے پکارتے رہے لیکن میں اس کے سامنے نہ گئی ... ہمارے زنان خانے کے آنگن میں دھان کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔ بے ہری اب تقریباً روزانہ اندر آجاتا اور دھان کی ڈھیریوں پر منھ مارنے لگتا۔ اسے دیکھ کر میں فوراً چھپ جاتی۔

وہ عورتیں جو اپنے سوامی، اپنے کرتار کے گھوڑے سے ''پردہ'' اپنا دھرم سمجھتی ہوں، وہ انسانوں سے کس قدر چھپ کر نہ رہتی ہوں گی؟ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے ''پردہ'' عورتوں کی سائیکی میں کس گہرائی تک اترا ہوا تھا اور یہ بھی کہ مسلمان عورتیں تو ایک طرف رہیں، ہندو اشرافیہ کی عورت بھی پردے کے حصار میں تھی۔ یہ قیداسے علم اور تعلیم سے جس طرح دُور رکھتی تھی اس کے انداز رشندری دیوی کی روداد ''امار جیون'' میں دکھائی دیتے ہیں۔

رقیہ نے اپنی بہن کریم النساء کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک دیکھا تھا، گھر کی دوسری عورتوں کو سخت پردے میں گھٹ گھٹ کر جیتے ہوئے دیکھا تھا، تعلیم سے ان کی محرومی دیکھی تھی۔ وہ ابتدائی برسوں میں ہی سمجھ گئی تھیں کہ پردہ اور علم سے ناآشنائی عورتوں کی پیدائشی صلاحیتوں کو کس طرح برباد کر دیتی ہے، اپنے چہیتے بھائی سے انھوں نے اردو، بنگلہ اور انگریزی کی شُد بُد حاصل کی، اپنے مہربان شوہر کی مدد سے وہ انگریزی پڑھنے اور لکھنے پر قادر ہوئیں۔ رقیہ کی قریبی دوست اور ان کی پہلی سوانح نگار شمس النساء محمود کی تحریر کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شادی کے بعد جب وہ اپنے شوہر سید سخاوت حسین کے ساتھ بہار کے شہر بھاگل پور گئیں تو وہاں انھیں ہندو اشرافیہ کی تعلیم یافتہ خواتین اور کچھ عیسائی خواتین سے ملنے اور ان میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا۔ بھاگل پور میں ہی انھوں نے انگریزی ادب کا مطالعہ کیا، اس مطالعے نے ان پر ایک نئی دنیا کے در کھول دیے۔ اس دنیا میں عورت اندھیری کوٹھڑی میں بند رہنے والی جانور نہیں تھی۔ یہ وہ دنیا تھی جس میں عورتیں اپنی زندگی کے فیصلے خود کرسکتی تھیں، اپنی مرضی سے جہاں چاہیں جاسکتی تھیں، انھوں نے ان عورتوں کی یادداشتیں پڑھیں جو ہزاروں میل کا بحری سفر کر کے انگلستان، فرانس اور امریکا سے ہندوستان آ پہنچی تھیں۔

رقیہ کا کہنا تھا کہ پردہ کرنا فطری نہیں ایک اخلاقی عمل ہے۔ فطری ہوتا تو جانور بھی پردہ کرتے۔ وہ پردے کی ایک مناسب حد تک پابندی خود بھی کرتی تھیں، بہ قول ان کے ''پردے سے میری مراد یہ ہے کہ اچھی طرح ستر پوشی ہو، نہ کہ مقید ہو کر رہا جائے۔'' پردے کے خلاف اپنی تحریر

''عزلت نشین'' میں وہ لکھتی ہیں:

پورے ہندوستان میں عورتوں کو علاحدہ کر کے رکھنے کا رواج ہے۔ صرف مردوں سے ہی نہیں ان عورتوں سے بھی جو خاندان اور برادری کی نہیں ہوتیں۔ قریبی رشتہ دار خواتین اور اعتبار والی خادماؤں کے علاوہ کنواری لڑکیوں پر کسی کی بھی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ شادی شدہ خواتین، خانہ بدوش عورتوں، میراثنوں، ڈومنیوں اور ناچ تماشے والے طائفہ کی عورتوں سے بھی پردہ کرتی ہیں۔ ان عورتوں میں جو سب سے زیادہ اندھیرے، کونوں کھدروں میں، الّو کی طرح چھپتی پھرتی ہیں، ان ہی کی تربیت زیادہ امیرانہ وضع کی سمجھی جاتی ہے۔ شہر کی کھاتی پیتی خواتین بھی انگریز مشنری عورتوں کو دیکھ کر دبک جاتی ہیں۔ یہ انگریز عورتیں تو ایک طرف رہیں، اپنی ہندو یا عیسائی عورتوں پر بھی نظر پڑ جائے تو بھی دوڑ کر اپنی خواب گاہ میں جا چھپتی ہیں۔ حالاں کہ ان عورتوں کا لباس وہی اپنی مانوس ساڑی ہوتا ہے۔

بہت پہلے کی بات ہے کہ ضلع رنگ پور کے گاؤں پیرابند کے زمیں دار کی بیٹیاں ظہر کی نماز کے لیے وضو کر رہی تھیں۔ باقی سب نے تو وضو پورا کرلیا لیکن بی بی ''الف'' ابھی آدھا ہی وضو کر پائی تھیں۔ ان کی ذاتی خادمہ آلتر ماں پیتل کے لوٹے سے ان کی ہتھیلیوں پر پانی ڈال رہی تھیں۔ اچانک ایک کابلی عورت پچھلے دروازے سے زنانے صحن میں داخل ہوئی۔ آلتر ماں کے ہاتھوں سے لوٹا گر پڑا اور اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا، ''یہ مردوا کہاں سے گھس آیا؟'' عورت ہنس دی اور شکایتاً بولی، ''مردوا، کون سا مردوا، ارے میں تو عورت ہوں۔'' بی بی ''الف'' جیسے اپنی جان بچا کر بھاگیں اور اپنی پھوپھی کے کمرے میں جا کر دم لیا۔ ڈر کے مارے تھرتھری چھوٹی ہوئی، بس اتنا ہی کہہ پائیں، ''بُوا شلوار پہنے ایک عورت اندر گھس آئی ہے۔'' خاتونِ خانہ کا تو رنگ فق ہوگیا۔ ''تمھیں تو نہیں دیکھ لیا کہیں اس نے؟'' بی بی ''الف'' نے جن کے آنسو روکے نہ رک رہے تھے، سر ہلا کر ہاں کا اشارہ کیا۔ گھر کی دوسری عورتیں نماز چھوڑ چھاڑ کے دروازے بند کرنے کو دوڑیں کہ کہیں کابلی عورت کی نظر دوسری لڑکیوں پر نہ پڑ جائے۔ جس تیزی اور گھبراہٹ میں وہ یہ سب کچھ کرتی پھر رہی تھیں، اس سے لگتا تھا کہ جیسے جنگل سے کوئی چیتا چھوٹ کر صحن میں آن گھسا ہو۔

رشید النساء نے پردے کے خلاف کہیں بھی آواز نہیں اٹھائی ہے لیکن بعض معاملات میں ان کے اور رقیہ سخاوت حسین کے خیالات کی مماثلت دیکھیے کہ رشید النساء سر سید کی اس دلیل کو رد کرتی ہیں کہ جب مرد تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو وہ اپنے گھر کی عورتوں کو بھی تعلیم دیں گے۔ رشید النساء کی طرح رقیہ سخاوت حسین بھی بہ اصرار یہ کہتی ہیں کہ:

> ماں ہونے کے لیے تعلیم پہلی شرط ہے کیوں کہ بچے کی پہلی اور انتہائی اہم استاد اور تربیت دینے والی ذات ماں کی ہوتی ہے۔

عورتوں کی معاشی خود مختاری کے بارے میں رقیہ سخاوت حسین کے خیالات بہت واضح اور جدید تھے۔ اسے وہ عورتوں کی آزادی اور خود مختاری کی اوّلین شرط قرار دیتی تھیں۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

> کچھ لوگ یہ کہتے ہیں اور درست کہتے ہیں کہ عورتیں مردوں کے ہاتھوں ظلم اور زیادتی برداشت اس لیے کرتی ہیں کہ وہ معاشی لحاظ سے ان کی محتاج ہوتی ہیں... چناں چہ اگر مردوں کے جبر سے آزادی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہم خود روزگار پیدا کر سکیں تو پھر ہمیں کام کرنا شروع کر دینا چاہیے۔ ہمیں وکیل، مجسٹریٹ، جج اور کلرک بننا چاہیے۔ جس طرح کا کام ہم اپنے گھروں میں کرتی ہیں اگر یہی کام ہم باہر کرنے لگیں تو اس سے بھی اجرت مل سکتی ہے، ان ملازمتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں ان مواقع کے لیے بھی سوچنا چاہیے جن کا تعلق زراعت سے ہے۔

رقیہ کے خیالات کتنے واضح اور شفاف تھے، اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ پردے کی پابندی کے ختم ہونے کو ''آزادی ملنے کی شرط'' نہیں سمجھتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ دنیا کے معاملات کے بارے میں آزادانہ سوچنے اور فیصلہ کرنے کی خود مختاری کے لیے عورتیں جب تک جدوجہد نہیں کریں گی وہ درحقیقت آزاد نہیں ہوں گی۔ سید سخاوت حسین اس وقت کی افسر شاہی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس حوالے سے رقیہ کا ملنا جلنا اور اٹھنا بیٹھنا ان حلقوں میں ہوتا تھا جہاں پارسی خواتین بھی موجود ہوتی تھیں اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ان کی ''آزادی'' کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ لیکن رقیہ سخاوت حسین نے ان پارسی خواتین کی ''آزادی'' کو کسی اور نظر سے دیکھا اور لکھا:

> حال ہی میں پارسی عورتوں نے بغیر پردے کے باہر نکلنا شروع کیا ہے، مگر کیا وہ واقعی ذہنی غلامی سے آزاد ہیں؟ قطعی نہیں۔ ان کا بے پردہ ہونا بھی ان کے اپنے کسی فیصلے کا نتیجہ نہیں ہے۔ پارسی مرد، مغرب کی اندھی تقلید میں اپنی عورتوں کو باہر گھسیٹ لائے ہیں۔ اس سے ان کی عورتوں کی منشا اور رضا ظاہر نہیں

ہوتی، وہ اسی طرح بے اختیار ہیں جس طرح پہلے تھیں۔ جب تک ان کے مردوں نے انھیں پردے کا پابند رکھا، وہ رہیں۔ جب مرد انھیں نتھ سے کھینچ کر باہر لے آئے، وہ باہر آگئیں۔ اسے ہم عورتوں کی کامیابی کسی طرح نہیں کہہ سکتے۔

رقیہ کو مسلمان عورتوں کی تعلیم اور آزادی سے گہری دلچسپی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مقامی اور بین الاقوامی سطح پر عورتوں کی صورتِ حال سے بھی بہ خوبی واقف تھیں، اس بارے میں بنگلہ دیش کی معروف ادیب روشن جہاں لکھتی ہیں:

''عزلت نشین'' میں اپنی رپورٹ میں انھوں نے ہندو عورتوں میں پردے کی رسم کا بھی ذکر کیا، اپنی دوسری ہندوستانی بہنوں کے برعکس انھیں اس بات کا بھی علم تھا کہ اپنی ظاہری آزادی کے باوجود مغرب کی عورتیں بھی مرد کے ستم کا شکار ہیں جس کی تائید ان کے اپنے بنائے ہوئے قوانین کرتے ہیں۔ وکٹورین عہد کی میری کوریلی کی ایک کہانی ''ڈیلیشیا کا قتل'' کے ترجمہ میں انھوں نے مغربی طرزِ زندگی کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی، ''افسوس قانون بھی ان کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے جن کے پاس رسوخ اور دولت ہے۔ یہ ہم جیسی ناتواں عورتوں کی مدد نہیں کرتا۔'' اپنے ناول ''پدم راگ'' میں انھوں نے کچھ سچے قصے بھی لکھے ہیں جو انھوں نے سخاوت حسین میموریل گرلز اسکول کی ہندو اور عیسائی استانیوں سے سنے تھے۔ ان قصوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان طبقوں کی عورتیں بھی اپنے نگرانوں کے جبر کی گرفتار تھیں۔

عورتوں کی تعلیم، ان کی حالتِ زار اور پردے کے بارے میں انھوں نے ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء کے دوران جو مضامین لکھے وہ ۱۹۰۸ء میں ''موتی چور'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد ان کے مضامین کا مجموعہ ''عزلت نشین'' کے نام سے سامنے آیا جس میں ہندو اور مسلمان عورتوں پر ہونے والے سماجی، روایتی اور مذہبی جبر کے بارے میں رپورٹیں یکجا کی گئی تھیں۔

ان کی کہانیاں ''برقعہ''، ''آدھی عورت''، ''مثالی بیوی'' چھپیں تو ایک بہت چھوٹا سا حلقہ ان کی تعریف و توصیف کر رہا تھا لیکن زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو انھیں برا بھلا کہہ رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے خیال میں رقیہ سخاوت حسین، بنگال اور بہار کی مسلمان عورتوں کو بہکا رہی تھیں، انھیں ''کرشٹان'' بنانے کے درپے تھیں۔ یہ وقت کا کمال ہے کہ آج ان کی تحریریں بنگلہ دیش کے اسکولوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

شادی کے صرف تیرہ برس بعد ہی سید سخاوت حسین کا انتقال ہوا تو رقیہ بہار کے شہر

بھاگل پور میں تھیں جو اُن کی سسرال تھی۔ سیّد سخاوت حسین نے اپنی وصیت میں ان کے لیے خاصی رقم چھوڑی تھی اور اس امید کا اظہار کیا تھا کہ وہ تعلیم نسواں کے کام کو آگے بڑھائیں گی۔ رقیہ سخاوت حسین نے اپنے محبوب شوہر کی وصیت اور اپنی خواہش کے مطابق اپنے گھر میں مسلمان لڑکیوں کے لیے ایک اسکول کھول لیا۔ یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ جس پر انھیں نہ سماج معاف کرسکا اور نہ ان کی سسرال۔ سوتیلی بیٹی اور داماد نے اسکول کو بہانہ بنا کر رقیہ کو خود ان کے گھر سے دھکے دے کر نکال دیا۔ رقیہ نے اپنے چند جوڑے کپڑے اور کتابیں سمیٹیں اور کلکتہ کا رخ کیا۔ کلکتہ برٹش انڈیا میں جدید خیالات اور جدید زندگی کا سب سے بڑا مرکز تھا، وہاں سب ہی کو پناہ ملتی تھی۔ رقیہ کو بھی وہیں امان ملی، ایک برس بعد ۱۹۱۱ء میں انھوں نے سخاوت حسین میموریل گرلز اسکول کھولا۔ یہ اسکول بیسویں صدی میں کلکتہ کے اہم اور معتبر تعلیمی ادارے کے طور پر سامنے آیا۔

آج برصغیر میں عورتوں کی ایک نہیں بلا مبالغہ ایک ہزار سے زیادہ غیر سرکاری تنظیمیں کام کر رہی ہیں جو عرفِ عام میں این جی او کہلاتی ہیں، یہ این جی اوز کچی آبادیوں میں کام کرنے کی داد وصول کرتی ہیں اور مغربی ممالک سے ہزاروں اور لاکھوں ڈالر کی امداد بھی پاتی ہیں۔ ملکوں ملکوں کے سفر اور وہاں اعزازی قیام و طعام کا اہتمام اس پر مستزاد ہے۔ رقیہ سخاوت حسین نے ۱۹۱۶ء میں ''انجمنِ خواتینِ اسلام'' قائم کی۔ روشن جہاں لکھتی ہیں:

> گھر گھر جا کر انھوں نے خواتین کو ممبر بننے پر آمادہ کیا۔ اس میں انھیں بہت سے طعنے تشنے سہنے پڑے لیکن ان کے ارادے کی پختگی اور اپنے مقصد سے لگن پھر جیت گئی۔ انجمن کی روح و رواں کی حیثیت سے انھوں نے جس طرح کے کام اپنے ذمے لیے اس کے نتیجے میں غریب طبقے کی عورتوں سے ان کا براہ راست سابقہ پڑا۔ ان کا اسکول اور ان کی تحریروں کا دائرۂ عمل امیر اور متوسط طبقے تک تھا۔ آج کل ان کے اس ابتدائی رویّے پر کافی تنقید کی گئی ہے لیکن انجمن کی سرگرمیاں غریب اور درماندہ عورتوں سے براہ راست متعلق تھیں۔
> انجمن غریب بیواؤں کو مالی امداد دیتی، پریشان حال مظلوم بیویوں کو تحفظ اور پناہ مہیا کرتی، غریب گھرانوں کی بچیوں کے بیاہ شادی کا انتظام کرتی اور سب سے بڑھ کر غریب عورتوں کو خواندگی کے مواقع دیتی۔ رقیہ کو اپنے وقت کے بنگال میں رسمی تعلیم کی اعزازی حیثیت کا پوری طرح احساس تھا۔ یہ بات ان پر واضح تھی کہ غریب عورتوں کی غربت انھیں تعلیم حاصل کرنے سے مجبور رکھتی ہے۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کی انجمن نے کلکتہ کی کچی بستیوں اور جھونپڑیوں میں رہنے والی ہندو اور مسلمان عورتوں کے لیے خواندگی کا ایک

باقاعدہ پروگرام منظم کیا۔ کلکتہ میں پھیلی ہوئی ان کچی آبادیوں تک رسائی کے لیے انجمن کی ممبروں نے ٹیمیں بنائیں تاکہ ان آبادیوں میں گھر گھر جا کر عورتوں کو معمولی لکھنا پڑھنا، حفظان صحت اور بچوں کی دیکھ بھال کرنا سکھا سکیں، ذریعۂ تعلیم مکینوں کی زبان کے مطابق بنگلہ یا اردو ہوتا۔اس کارِ خیر میں سخاوت اسکول سے فارغ التحصیل بہت سی شاگردوں نے اپنی خدمات پیش کیں۔

میں جب بعض خواتین کو کچی آبادی میں کام کرتے ہوئے دیکھتی ہوں، جب ان کے جلسوں میں جاتی ہوں یا ان کے کام کے بارے میں پڑھتی ہوں تو میری نگاہوں میں متعدد نام ور اور گم نام خواتین کے چہرے ابھرتے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے زمانے میں اپنی تحریر اور تقریر سے، تعلیمی اداروں اور اصلاحی انجمنوں کے قیام سے برصغیر کی عورت کا مقدر بدلنے کی اپنی سی کوشش کی۔

رشندری دیوی، رشید النساء اور رقیہ سخاوت حسین اب ایک سوا صدی پہلے کا قصہ ہیں، لیکن بنگلہ اور اردو ادب کی یہ وہ تین عورتیں ہیں جن کی ہمت، محنت اور استقامت نے اپنے بعد آنے والیوں کے لیے راہیں نکالیں۔ یہ سب کچھ لکھ کر مجھے اور شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ اگر یہ تینوں اور ان ایسی دوسری بہت سی عورتیں اور ان کے ہمدرد اور معاون بہت سے روشن خیال مرد نہ ہوتے تو کیا میرے لیے اور بہت سی دوسری عورتوں کے لیے زندگی آج بھی گنبدِ بے در نہ ہوتی!؟

☆☆

کتابیات

۱۔ ''اصلاح النسا''... رشید النسا

۲۔ ''سلطانہ کا خواب''... مترجم حیدر جعفری سید

۳۔ ''سلطانہ کا خواب''... مرتب ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا

۴۔ ''تاریخ تعلیم ہند'' (۱۸۰۰۔۱۹۶۵ء)... سید نور اللہ اور جے پی نائیک، مترجم مسعود الحق

۵۔ ''انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ''... عبداللہ یوسف علی

۶۔ ''ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ''... ڈاکٹر سیمیں ثمر فضل

۷۔ ''اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار''... تعلیم فرزانہ

۸۔ ''بہار میں اردو ناول نگاری''... ڈاکٹر آصفہ واسع

۹۔ ''مثنویاتِ غالب'' (فارسی)... اردو ترجمہ: ظ انصاری

۱۰۔ ''مسلم خواتین کی تعلیم''... محمد امین زبیری

۱۱۔ ''داستاں میری''... ڈاکٹر اقبال حسین

۱۲۔ ''خیالاتِ کبریٰ''... نثار کبریٰ عظیم آبادی

13. "Words To Win"... By Tanika Sarkar
14. Diary 2000- "Women of Pakistan : Looking Toward The New Millennium"... By Tasneem Ahmar
15. "Women of The Raj"... By Margaret MacMillan
16. "The New Cambridge History of India : Women In India"... By Geraldine Forbes
17. "The History of Doing"... By Radha Kumar
18. "The First Indian War of Independence, 1857-1858"... By Karl Marx and Fredric Engels

☆☆☆

رشندری دیوی / فینانہ فرنام کامران

میرا جیون☆

میری زندگی محنت اور مشقت میں گھری ہوئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وقت کیسے گزرتا تھا۔ آہستہ آہستہ ایک خواہش میرے ذہن میں گھر کرتی گئی اور میں ایک خواہش کی اسیر ہوتی چلی گئی۔ میں پڑھنا سیکھوں گی اور مذہبی کتابیں پڑھوں گی۔ میں نے اپنے خیالات کی وجہ سے آزردہ ہونا شروع کر دیا۔ میرے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ عورتیں نہیں پڑھتیں تو پھر میں یہ کیسے کر سکتی ہوں اور یہ بات مجھے اس قدر پریشان کیوں کرتی ہے؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کیا کروں۔ یہ اس طرح نہیں ہے کہ ان دنوں ہمارے طور طریقے غلط تھے لیکن ان دنوں بس اسی طرح ہوتا تھا۔ سب نے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا اور سب ہی عورتوں کو تعلیم سے محروم رکھنا چاہتے تھے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت کی عورتیں انتہائی بدبخت تھیں۔ عورتوں میں اور مشقت کرنے والے جانوروں میں کچھ ہی فرق تھا اور دوسروں کو اس بارے میں دوش دینا بے کار تھا۔ یہ میری تقدیر کا لکھا تھا۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں اگر کسی عورت کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا دیکھ لیتیں تو آسمان سر پر اُٹھا لیتی تھیں تو پھر میں لکھنا پڑھنا کیسے سیکھ سکتی تھی؟ لیکن میرا دل اس بات کو قبول نہیں کرتا تھا۔ پڑھنا سیکھنے کی خواہش ہر وقت مجھے بے تاب رکھتی۔ میں نے اس مسئلے پر ہر پہلو سے غور کرنا شروع کر دیا۔ جب میں ایک لڑکی تھی تو میں نے گھر کے لڑکوں کے ساتھ چونتیس حروف تہجی اور لفظوں کے ہجے چیخ چیخ کر یاد کیے تھے۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ کیا مجھے اس میں سے کچھ یاد ہے؟ ذہن پر بہت زور ڈالنے کے بعد مجھے وہ چونتیس حروف تہجی، حروف علت اور بعض الفاظ کے ہجے یاد آ گئے۔ لیکن یہ وہ لفظ تھے جنھیں میں پڑھ تو سکتی تھی مگر لکھ نہیں سکتی تھی۔ تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ سچ تو یہ ہے کہ اگر کوئی آپ کو سکھانے والا موجود نہ ہو تو آپ کچھ بھی نہیں سیکھ سکتے۔ اس پر سے ستم یہ تھا کہ میں ایک عورت تھی اور وہ بھی ایک شادی شدہ عورت۔ اگر کوئی مجھے ڈانٹ یا جھڑک دیتا تو مجھے شرم سے ڈوب مرنا چاہیے تھا۔ مجھ سے توقع کی جاتی تھی کہ میں دوسروں سے بات نہیں کروں گی۔ اس لیے میرے خوف اور خدشات نے

☆۔ رشندری دیوی کی خود نوشت "امار جیون" کے پہلے حصے کا چھٹا باب، بنگالی سے ترجمہ۔

مجھے تقریباً گونگا بنا دیا تھا۔ میں سارا وقت دعا مانگا کرتی کہ اے دنیا کے مالک! اے پرمیشور، تُو مجھے خود سکھا دے تب ہی میں سیکھ سکوں گی، مجھے بھلا کون سکھائے گا اگر تُو نے بھی نہیں سکھایا؟ یہ خیالات ہر وقت میرا پیچھا کرتے رہتے۔

اس طرح بہت سے دن گزر گئے۔ پھر میں نے ایک خواب دیکھا، میں نے دیکھا کہ میں ''چیتنا بھگت'' کی عبارت پڑھ رہی ہوں۔ جب میں اٹھی تو ایک روحانی خوشی میرے جسم اور دل کو اپنا اسیر کر چکی تھی۔ اس کے باوجود کہ میں پوری طرح جاگ گئی تھی، میں اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔ میں اپنے خواب کو بار بار یاد کر رہی تھی۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے کہ مجھے کوئی اَن مول ہیرا دے دیا گیا ہو۔ میرے بدن اور دماغ میں خوشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ میں نے حیرانی سے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ میں نے یہ کتاب پہلے کبھی دیکھی بھی نہیں تھی، میں اسے پہچان بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے باوجود میں اس کتاب کو اپنے خواب میں پڑھ رہی تھی۔ میں کچھ بھی نہیں پڑھ سکتی تھی، نہ کہ کسی ایسی کتاب کو پڑھنے کے بارے میں سوچ بھی سکوں، یہ ناممکن سی بات تھی اس کے باوجود مجھے بھگوان نے یہ موقع دیا کہ اس کتاب کو کم سے کم اپنے خواب میں پڑھ سکوں۔ میں ہمیشہ سے بھگوان سے یہ پرارتھنا کرتی تھی کہ وہ مجھے پڑھنا سکھا دے۔ تو اس نے جس نے مجھے زندگی میں پڑھنا نہیں سکھایا تھا، اب میرے خوابوں میں مجھے پڑھنا سکھا دیا تھا۔ یہ یقیناً ایک سعادت تھی، مجھے پرمیشور کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے مجھے زندگی میں یہ سعادت نصیب کی کہ میں اپنی شدید خواہش پوری کر سکوں۔ میں بہت خوش تھی۔

میں نے سوچنا شروع کر دیا، اس گھر میں بہت سی کتابیں ہیں، کیا معلوم کہ ''چیتنا بھگت'' بھی ان ہی میں ہو۔ مگر اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے؟ مجھے نہیں معلوم کہ کیسے پڑھتے ہیں۔ میں تو اس کتاب کو پہچان بھی نہیں سکتی۔ میں نے پھر پرارتھنا شروع کر دی:

''اے غریبوں کے بھگوان! تُو مجھے اس کتاب تک پہنچا دے جو میں نے اپنے خواب میں دیکھی تھی۔ اے بھگوان تجھے یہ کرنا ہوگا، تیرے سوا اور کون 'چیتنا بھگت' مجھ تک پہنچا سکتا ہے؟'' میں بھگوان سے اسی طرح باتیں کرتی رہی۔

اس نرم دل اور رحم کرنے والے کے چمتکار کا ایک ثبوت یہ تھا کہ میں جب اداس اور دکھی تھی تو اس نے میری دعا سن لی اور اس نے فوراً مجھے میری دعا کی تعبیر بھی دکھا دی۔ اس وقت میرا سب سے بڑا بیٹا آٹھ سال کا تھا۔ میں باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی کہ میں نے اپنے سوامی کو اس سے کہتے سنا کہ جن میں اپنی ''چیتنا بھگت'' یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔ جب میں مانگوں تو مجھے دے دینا۔ سوامی وہ کتاب وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔

میں باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی تھی اور خوشی سے یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ میں نے بھگوان کا شکر ادا کیا جس نے میری دعا سن لی تھی اور جلدی سے وہ کتاب دیکھنے گئی۔ میں نے اسے کھولا اور اسے

مکمل طور پر محسوس کیا۔ اس کتاب کا انداز آج کی کتابوں سے بہت مختلف تھا۔ کتاب کے ورق الگ الگ تھے اور وہ لکڑی کی نقش و نگار والی پرتوں میں اس طرح سے محفوظ تھے کہ اگر ایک ورق نکال لیں تو کتاب کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ میں کیوں کہ بالکل بھی نہیں پڑھ سکتی تھی اس لیے میں نے کتاب پر بنے ہوئے رنگین نقش و نگار کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تا کہ میں بعد میں کتاب کو پہچان سکوں۔ کتاب ابھی گھر کے اندر ہی تھی کہ میں نے چپکے سے اس کا ایک ورق علاحدہ کر لیا اور اسے احتیاط سے چھپا دیا۔ اس کو چھپانا بھی ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی بھی اس ورق کو میرے ہاتھ میں دیکھ لے۔ اس کو دیکھ لیے جانے کی صورت میں مجھے شدید ڈانٹ پھٹکار کا سامنا کرنا پڑتا اور میں اسے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ایک ایسا کام کرنا آسان نہیں ہوتا جس کی ہمیں اجازت نہ ہو اور پھر اس کے نتیجے کو بھگتنا اور مشکل ہوتا ہے۔ وہ وقت اور زمانہ ہی کچھ اور تھا۔ اور میں غیر معمولی حد تک جلدی گھبرا جانے والے لوگوں میں سے ہوں۔ وہ بھی کیا دن تھے۔ اس زمانے میں عورتیں مکمل طور پر قید میں تھیں اور اس حساب سے میں زیادہ ڈرتی تھی۔ "چیتنا بھگت" کا ورق میرے لیے دردِ سر بن گیا۔ میں اسے کہاں چھپاتی کہ وہ کسی کی نظروں میں نہ آئے؟ آخرکار میں نے سوچا کہ کوئی ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں میں ہر وقت موجود رہوں اور دوسرے لوگوں کو وہاں پر زیادہ آنا جانا نہ ہو۔ باورچی خانے کے علاوہ ایسی اور کون سی جگہ ہو سکتی تھی؟ میں نے اس ورق کو چولہے کے نیچے چھپا دیا۔ مگر اس کو دیکھنے کا وقت نکالنا بھی ایک نہایت مشکل کام تھا۔ کھانا پکاتے اور سب کو کھلاتے ہوئے مجھے بہت رات ہو جاتی تھی۔ جب وہ کام ختم ہوتا تو ایک کے بعد ایک کر کے بچے اٹھنا شروع ہو جاتے اور اس کے بعد ایک طوفانِ بدتمیزی برپا ہو جاتا۔ ایک کہتا کہ اسے پیشاب آ رہا ہے، دوسرا کہتا اسے بھوک لگ رہی ہے اور تیسرا یہ فرمائش کرتا کہ میں آپ کی گود میں لیٹوں گا، کوئی بچہ اٹھ کر چیخنا چلانا شروع کر دیتا۔ مجھے ان سب کو دیکھنا ہوتا۔ میں ان سب سے نمٹتی اور دیر ہو چکی ہوتی، اس وقت تک میں بے طرح اونگھنے لگتی اور نیند سے لڑنا ممکن نہ رہتا۔ اس طرح مجھے اس ورق کو پڑھنے کا وقت ہی نہ ملتا۔ اس چکر سے باہر نکلنے کی کوئی صورت میری سمجھ میں نہ آتی۔ میں سوچتی کہ کوئی بھی استاد کے بغیر پڑھنا کیسے سیکھ سکتا ہے؟ میں آہستگی کے ساتھ کچھ حروفِ تہجی اور الفاظ ادا کرتی رہتی مگر میں ان کو پڑھنے میں روانی ہونا ممکن نہیں ہے۔ مجھے اس ورق کو پڑھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی اور میں اس کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ اس بات کا خوف ہمیشہ موجود رہتا تھا کہ کہیں یہ بات لوگوں پر کھل نہ جائے۔

میں نے بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں بھگوان سے دعا کی، "اے بھگوان! اسے پڑھنے میں میری مدد کر، تیرے سوا اور کون ہے جو مجھے کچھ سکھا سکے؟" میں ہر وقت دعا کرتی رہتی تھی اور کبھی کبھی مجھے بہت مایوسی ہوتی۔ اگر کوئی مجھے حروفِ تہجی پڑھا بھی دیتا تو اس کا وقت کہاں تھا کہ میں پڑھائی کے لیے وقت نکال سکوں؟ ایک ناممکن خواب کو عزیز رکھنے سے فائدہ؟ کبھی کبھی میرا دل امید سے بھر جاتا۔ یہ

اُمید خود پرمیشور نے میرے اندر پیدا کی تھی اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ میری راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ اسی لیے میں اس ورق کو اپنے پاس رکھے رہی۔ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہوتا تھا کہ میں اس پر ایک نظر ہی ڈال لوں، کبھی یوں بھی ہوتا کہ کھانا پکاتے ہوئے میں سیدھے ہاتھ سے دیگچی میں کف گیر چلاتی اور اُلٹے ہاتھ میں اس ورق کو تھامے رہتی اور کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ میں لوگوں کی نظر بچا کر اپنے گھونگھٹ کے نیچے سے اس پر ایک نگاہ ڈال لیتی، پھر بھی اس پر لکھے ہوئے لفظ میری سمجھ میں نہ آتے۔

اُن دنوں میرا سب سے بڑا بیٹا تاڑ کے پتے پر حروف تہجی لکھنے کی مشق کر رہا تھا۔ میں نے تاڑ کے ان پتوں میں سے بھی ایک پتا چھپا لیا۔ بعض اوقات میں تاڑ کے اس پتے پر لکھے ہوئے الفاظ میں سے ان کو پہچاننے کی کوشش کرتی جو مجھے یاد تھے۔ میں سارے دن میں جو لفظ سنتی تھی ان کو بھی تاڑ کے پتے پر لکھے ہوئے الفاظ سے ملانے کی کوشش کرتی۔ میں ایک نگاہ تاڑ کے پتے پر ڈال کر اسے بھی چولھے کے نیچے چھپا دیتی۔ میں نے اچھا خاصا عرصہ اسی طرح گزارا۔

یہ کتنی تکلیف دہ بات تھی! کیسی افسوس ناک، صرف اس لیے کہ میں ایک عورت تھی! ہم عورتیں یوں قید تھیں جیسے کہ ہم چور ہوں اور اس پر سے ستم یہ تھا کہ پڑھنا ایک بہت بڑا جرم تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اب پہلے کی نسبت عورتوں کے لیے زندگی آسان ہوگئی ہے۔ اب اگر کسی کی بیٹی ہوتی ہے تو اس کا باپ اس کو توجہ سے تعلیم دلواتا ہے۔ ہم نے اتنی تکلیفیں اٹھائیں تو صرف اس لیے کہ ہم پڑھنا سیکھ سکیں۔ میں نے جو کچھ بھی تھوڑا بہت سیکھا وہ صرف اس لیے کہ مجھ پر بھگوان کی کرپا تھی۔

وہ آدمی جو میرا سوامی، میرا مالک تھا، بہت اچھا انسان تھا۔ مگر یہ سب سے مشکل کام تھا کہ دھرتی کے رسم و رواج سے دست بردار ہوا جائے۔ اسی وجہ سے میں نے اتنی تکلیفیں اٹھائیں۔ لیکن اب پچھلی بدنصیبیوں پر کیوں آنسو بہائے جائیں؟ اُن دنوں لوگوں کو اس بات پر یقین تھا کہ عورت کا پڑھنا گناہ ہے، دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ صرف ان ہی کو قصوروار کیوں ٹھہرایا جائے؟ اب بھی ایسے لوگ ہیں جو اس بات کے حق میں نہیں ہیں کہ عورت کو تعلیم دی جائے لیکن ان کو بھی الزام دینا بے کار ہے۔ وقت ایک اَن مول خزانہ ہے، اُس وقت میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق ہے (یہاں رشندری دیوی انیسویں صدی کی دوسری تیسری اور آٹھویں دہائی کا موازنہ کر رہی ہیں) اگر ہم تب اور اب کا موازنہ کریں تو ہمارے لیے اس عرصے میں ہونے والی تبدیلیوں کا شمار کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اُس زمانے کے لوگ اگر آج کے زمانے کے طور طریقے دیکھ لیں تو وہ صدمے اور دہشت سے مر جائیں۔ ایک مخصوص وقت میں پرمیشور ہمارے لیے جو حکم جاری کرتا ہے، اسے ہم بہ خوشی قبول کرتے ہیں۔ اُس وقت عورتیں موٹے جھوٹے کپڑے، بھاری زیور، ہاتھ بھر بھر کر سیپ کے خول کی چوڑیاں پہنتیں، ان کی پیشانیوں پر سیندور کی بندیاں ہوتی تھیں۔ یہ سب کچھ اُس وقت بُرا نہیں لگتا تھا۔ اُس وقت ہم لوگوں کو اس طرح سے تیار نہیں ہونا پڑتا تھا، مگر اُس وقت بھی مجھے جو کچھ پہننا پڑتا تھا اس کے بارے میں سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس پورے عرصے میں پرماتما نے میرا دھیان رکھا۔ میں خوش اور مطمئن تھی۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ پرماتما کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔ جب میں بچی تھی تو مجھے گھر کی پاٹھ شالا میں بٹھایا جاتا تھا، اس وقت وہاں بیٹھنا اب میرے کام آرہا تھا۔ تاڑ کے پتے پر لکھے ہوئے حرف اور ''چیتنا بھگت'' کے ورق پر جو الفاظ تھے اور جو مجھے یاد تھے، میں اب ان کو آپس میں ملا سکتی تھی۔ میں خاموشی کے ساتھ انھیں اپنے اندر دوہراتی رہتی تھی۔ میں سارا دن یہ کوشش کرتی کہ ان سب لفظوں کو ذہن نشین کرتی رہوں۔ میں بہت توجہ اور محنت کے بعد ایک لمبے عرصے میں اس قابل ہوئی کہ ہکلاتے ہوئے اور اٹکتے ہوئے ''چیتنا بھگت'' کو پڑھ سکوں۔ اُن دنوں ہمیں چھپی ہوئی کتابیں نظر نہیں آتی تھیں۔ ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں کی عبارت پڑھنا انتہائی مشکل کام تھا۔ پڑھنا سیکھنا مجھے بہت ہی مشکل سے آیا لیکن اتنی محنت کے باوجود مجھے لکھنا نہیں آتا تھا۔ لکھنے کے لیے بہت محنت کی ضرورت تھی۔ کاغذ، قلم، روشنائی، دوات مجھے سب ہی کچھ چاہیے تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ میں اپنے چاروں طرف یہ سارا سامان پھیلا لوں اور پھر لکھنے بیٹھوں۔ میں ایک عورت تھی اور وہ بھی شادی شدہ۔ شادی شدہ عورتوں کو لکھنے پڑھنے سے بھلا کیا تعلق؟ سماج کا فرمان تھا کہ عورت کا پڑھنا اور لکھنا گناہِ کبیرہ ہے۔ میں ایک ایسی صورتِ حال میں یہ کوشش بھی کیسے کرسکتی تھی کہ لکھنا سیکھوں اور پھر لکھوں؟ مجھے ڈانٹ پھٹکار سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنی لکھنے کی خواہش کا گلا گھونٹ دیا اور حرف پڑھنے کو ہی بہت غنیمت سمجھا اور وہ بھی سب سے چھپ کر۔ یہ بھی میرے خواب وخیال سے باہر کی بات تھی۔ یہ ایک ایسی کامیابی تھی جسے حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ یہ میرے لیے صرف اس طرح سے ممکن ہوسکا کہ میرے سر پر بھگوان کا سایہ تھا جس نے خود اپنے ہاتھوں سے مجھے راستہ دکھایا تھا اور میری رہنمائی کی تھی۔ یہ حقیقت کہ آخرکار میں پڑھ سکتی ہوں، میرے لیے بہت بڑی بات تھی اور میں نے لکھنا سیکھنے کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

رقیہ سخاوت حسین/ حیدر جعفری سیّد

سلطانہ کا خواب

میں ایک شام اپنی خواب گاہ میں آرام کرسی میں نیم دراز ہندوستانی عورتوں کی حالت پر غور وفکر کر رہی تھی۔ اونگھتے اونگھتے شاید میں سوگئی۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے، میں مکمل طور پر جاگ رہی تھی۔ ہزاروں لاکھوں ہیروں سے چمکتا اور چاندنی سے دمکتا ہوا آسمان مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔

یکایک ایک خاتون میرے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ وہ اندر کیسے آئیں مجھے معلوم نہیں بس یوں محسوس ہوا جیسے میری سہیلی سائرہ آپا آئی ہیں۔

''آداب!'' وہ بولیں۔ اور میں نے جواباً پوچھا،''آپ کیسی ہیں؟''

''کیا ذرا دیر کو باہر چلا جائے؟''انھوں نے کہا۔

میں نے کھلی کھڑکی سے چاند کو دیکھا اور سوچا کہ اس وقت باہر جانے میں کوئی ہرج نہیں، باہر، نوکر چاکر اب گہری نیند میں ہوں گے اور میں آرام کے ساتھ سائرہ آپا کے ساتھ سیر کے لیے جا سکتی ہوں۔ جب ہم دارجلنگ میں تھے، میں اکثر سائرہ آپا کے ساتھ سیر کے لیے جاتی تھی۔ کئی بار ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے وہاں کے بوٹا گارڈن میں گھوما کرتے۔ مجھے لگا کہ سائرہ آپا شاید مجھے کسی ایسے ہی باغ میں لے جانے کے لیے آئی ہیں۔ اس لیے میں نے فوراً ہامی بھرلی اور ان کے ہم راہ باہر نکل آئی۔

چلتے ہوئے مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اچھی بھلی صبح تھی۔ شہر پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور سڑکوں پر خوب چہل پہل تھی۔ میں دن دہاڑے سڑک پر بے پردہ چل رہی ہوں، یہ سوچ کر مجھے پہلے تو بہت شرم آئی لیکن پھر میں نے دیکھا کہ وہاں ایک بھی مرد موجود نہیں ہے۔

راہ چلتی کچھ عورتوں نے مجھ سے مذاق کیا۔ میں ان کی زبان سے واقف نہ تھی، پھر بھی یہ بات طے تھی کہ وہ مذاق کر رہی تھیں۔ میں نے اپنی سہیلی سے پوچھا،''کیا کہہ رہی ہیں؟''

''کہتی ہیں کہ تم میں مردوں والی عادتیں ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ تم مردوں کی طرح جھینپو اور بزدل ہو۔''

''مردوں کی طرح جھینپو اور بزدل؟'' مجھے یہ واقعی مذاق ہی لگا۔ پر جب مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ چلنے والی خاتون میری سہیلی سائرہ آپا نہیں بلکہ کوئی غیر ہے تو میں گھبرا گئی۔ اف، میں نے کتنی بڑی غلطی کی جو انھیں اپنی پرانی سہیلی سائرہ آپا سمجھا۔

انھوں نے شاید میری انگلیوں کا لرزنا محسوس کیا کیوں کہ ہم ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے چلے جا رہے تھے۔ ''میری جان! تمھیں کیا ہوا؟'' انھوں نے بہت لاڈ سے پوچھا۔

''مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے، پردہ نشین عورت ہوں نا، مجھے سڑک پر بے پردہ چلنے کی عادت نہیں۔'' میں نے کچھ معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''یہاں کسی مرد کا سامنا ہونے کا خوف نہیں، یہ عورتوں کا شہر ہے، گناہ اور اذیت سے بالاتر۔ یہاں خود نیکی کی حکومت ہے۔''

اب مجھے بھی یہ منظر اچھا لگنے لگا تھا۔ واقعی بہت خوش گوار منظر تھا، ہری گھاس کے ایک قطعے کو میں نے مخملیں فرش سمجھا۔ ایک نرم قالین پر چلنے کا احساس ہونے پر نیچے دیکھا تو پھولوں اور گھاس سے ڈھکا ہوا راستہ نظر آیا۔

''کتنا اچھا لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''پسند آیا؟'' سائرہ آپا نے پوچھا (میں انھیں سائرہ آپا کہہ کر ہی مخاطب کر رہی تھی اور وہ مجھے میرے نام سے بلا رہی تھیں)۔

''بہت زیادہ۔ لیکن میں ان نرم و نازک پھولوں پر چل کر انھیں روندنا نہیں چاہتی۔''

''فکر کیوں کرتی ہو، سلطانہ جان! یہ راستے کے پھول ہیں، تمھارے چلنے سے ان پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''تمام جگہ ایک باغ کی طرح لگ رہی ہے، ہر پودا اتنی احتیاط سے لگایا گیا ہے۔'' میں نے انھیں سراہا۔

''تمھارا کلکتہ بھی ایسا باغ بن سکتا ہے بہ شرطے کہ تمھارے ہم وطن اسے ایسا بنانا چاہیں۔''

''باغبانی کو اتنی اہمیت دینا انھیں فضول ہی لگے گا، آخر انھیں اتنے اور کام جو ہیں۔''

''اس سے بہترین بہانہ ان کے لیے اور کیا ہوگا؟'' انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مجھے یہ جاننے کی شدید بے چینی ہو رہی تھی کہ آخر تمام مرد کہاں چلے گئے؟ یہاں تک آتے آتے سو سے بھی زیادہ عورتوں سے میرا سامنا ہو چکا تھا لیکن کسی ایک بھی مرد پر نگاہ نہیں پڑی تھی۔

''سب مرد کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنے صحیح مقام پر، جہاں انھیں ہونا چاہیے!''

''صحیح مقام سے تمھاری کیا مراد ہے بھلا؟''

''اوہ، سمجھی! تم پہلے کبھی یہاں نہیں آئی ہو نا اسی لیے ہمارے رسم و رواج سے واقف نہیں۔ ہم اپنے مردوں کو اندر بند رکھتے ہیں۔''

''جیسے ہمیں زنانے میں رکھا جاتا ہے؟''

''ہاں بالکل ویسے ہی۔''

''کیا بات ہے!'' میں کھلکھلا اٹھی۔ سارہ آپا بھی ہنسنے لگیں۔

''لیکن سلطانہ جان! کتنی غلط بات ہے کہ بچاری عورتوں کو تو اندر بند رکھا جائے اور مردوں کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔''

''کیوں... ہم فطرتاً صنفِ نازک جو ٹھہریں، اس لیے زنانے سے باہر آنا ہمارے لیے محفوظ نہیں۔''

''ہاں اسی وقت تک محفوظ نہیں جب تک مرد سڑکوں پر ہوں یا جب کوئی جنگلی جانور بازار میں گھس آئے۔''

''بے شک!''

''فرض کرو، پاگل خانے سے کچھ پاگل بھاگ نکلیں اور آدمیوں، گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کے ساتھ شرارتیں کرنے لگیں، اس حالت میں تمھارے ہم وطن کیا کریں گے؟''

''وہ انھیں پکڑ کر دوبارہ پاگل خانے میں بند کر دیں گے۔''

''کہیں تم یہ تو نہیں سوچتیں کہ سیانے لوگوں کو پاگل خانے میں بند کر دیا جائے اور پاگلوں کو کھلے عام چھوڑ دیا جائے؟''

''قطعاً نہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''سچ تو یہ ہے کہ تمھارے ملک کا یہی دستور ہے۔ وہ مرد جو غلط حرکتیں کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں، کھلے چھوڑ دیے جاتے ہیں اور بے گناہ خواتین کو زنانے میں بند رکھا جاتا ہے، تم کھلے گھومتے ان مردوں پر کیسے یقین کر سکتی ہو؟''

''ہمارے معاشرتی معاملات کی دیکھ ریکھ میں ہماری کوئی شنوائی نہیں ہے، ہندوستان میں مرد ہی نعوذ باللہ خدا اور مالک ہے، اس نے تمام اختیارات اور اقتدار خود حاصل کر لیا ہے اور عورتوں کو زنان خانے میں مقید کر دیا ہے۔''

''تم بند ہونے کے لیے کیوں تیار ہوتی ہو؟''

''کوئی اور چارہ بھی تو نہیں ہے، وہ عورتوں سے زیادہ طاقت ور ہیں۔''

''ایک شیر بھی آدمی سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ آدمی پر حاوی تو نہیں ہو جاتا۔ تمھارے جو فرائض ہیں تم نے انھیں نظر انداز کر دیا ہے اور اپنی ہی بھلائی سے آنکھیں موند لینے کی وجہ سے تم نے اپنے پیدائشی حقوق بھی کھو دیے ہیں۔''

''لیکن آپا جان! اگر ہم سب کچھ خود ہی کر لیں گی تو پھر مرد بیچارے کیا کریں گے؟''

''معاف کرنا بھتو! انھیں کچھ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ وہ کچھ کرنے کے لائق ہیں ہی نہیں۔ انھیں تو بس پکڑ کر مردان خانے میں ڈال دینا چاہیے۔''

''لیکن کیا انھیں پکڑنا اور چہار دیواری میں مقید کرنا اتنا آسان ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر ایسا ہو بھی جائے تو ان کا تمام کام کاج، سیاسی معاملات اور کاروبار وغیرہ سب ان کے ساتھ مردان خانے میں محدود ہو جائیں گے؟''

سائرہ آپا کچھ نہ بولیں، بس مسکرا دیں۔ شاید یہ سوچ کر کہ ایسے شخص سے بحث کرنے سے کیا فائدہ جو کنویں کے مینڈک جیسا ہو۔

اس وقت تک ہم سائرہ آپا کے گھر تک پہنچ گئے تھے جو دل کی شکل کے باغ کے بیچوں بیچ بنا ہوا تھا۔ بنگلے کی چھت نالی دار ٹین کی تھی۔ ان کا گھر ہماری کسی بھی شان دار عمارت سے زیادہ خوب صورت اور ٹھنڈا تھا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کتنے قرینے سے سجایا گیا تھا اور کس قدر صاف ستھرا تھا۔

ہم لوگ ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ وہ اندر سے کڑھائی کا کوئی کام اٹھا لائیں اور اس پر ایک نیا نمونہ بنانے لگیں۔

''کیا تم سلائی، کڑھائی جانتی ہو؟'' انھوں نے پوچھا۔

''ہاں، زنان خانے میں کوئی اور کام کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔''

''لیکن ہم اپنے مردان خانے کے لوگوں کو کڑھائی کا کام سونپنے میں یقین نہیں رکھتے کیوں کہ مرد کے پاس تو سوئی میں دھاگا تک ڈالنے کا صبر نہیں ہوتا۔'' انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا آپ نے یہ سب خود ہی بنایا ہے؟'' میں نے ان کڑھے ہوئے تپائی پوشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!''

''اتنا سب کچھ کرنے کی فرصت کیسے مل جاتی ہے؟ آپ کو آفس کا تمام کام بھی تو کرنا ہوتا ہوگا! ہے نا!''

''ہاں! لیکن میں تمام دن تجربہ گاہ میں ہی بیٹھی نہیں رہتی۔ میں اپنا کام دو گھنٹے میں مکمل کر لیتی ہوں۔''

''دو گھنٹے میں!؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ ہمارے ملک میں افسر لوگ، مجسٹریٹ وغیرہ روز سات

گھنٹے کام کرتے ہیں۔''

''میں نے ان میں سے کچھ کو کام کرتے دیکھا ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے، وہ پورے سات گھنٹے کام کرتے ہیں؟''

''بالکل کرتے ہیں!''

''نہیں سلطانہ جان! وہ بالکل نہیں کرتے۔ وہ اپنا تمام وقت گپ شپ میں خرچ کر دیتے ہیں، کچھ لوگ تو آفس کے وقت میں گھنٹوں سگریٹ پھونکتے ہیں، چائے پیتے ہیں۔ وہ اپنے کام کے بارے میں جتنی باتیں کرتے ہیں اتنا کام نہیں کرتے۔ فرض کرلو ایک سگریٹ اور چائے کی ایک پیالی ختم کرنے میں آدھا گھنٹا لگ جاتا ہے تو اگر ایک مرد روزانہ بارہ مرتبہ سگریٹ اور چائے پیتا ہے تو یہ سمجھو کہ وہ روزانہ دھواں اڑانے میں چھ گھنٹے ضائع کردیتا ہے۔''

ہم دونوں کئی موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ گفتگو کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ ان کے یہاں کوئی وبائی مرض نہیں پھیلتا اور نہ انھیں مچھروں کے ڈنک جھیلنے پڑتے ہیں۔ یہ معلوم کرکے بہت حیرت ہوئی کہ خواتین کے شہر میں کوئی جوانی میں نہیں مرتا، سوائے اکا دکا حادثوں کے۔

''کیا تم ہمارا باورچی خانہ دیکھنا پسند کروگی؟'' انھوں نے پوچھا۔

''بصد خوشی۔'' میں نے کہا، اور ہم اسے دیکھنے چل دیے۔ بے شک میرے وہاں جانے سے پہلے مردوں کو وہاں سے ہٹنے کے لیے کہہ دیا گیا تھا۔ باورچی خانہ، سبزی ترکاری کے ایک خوب صورت باغ کے وسط میں تھا۔

ترئی کی ہر بیل، ٹماٹر کا ہر پودا آنکھوں کو کس قدر بھلا لگ رہا تھا۔ باورچی خانے میں نہ تو دھواں تھا اور نہ کوئی چمنی۔ بالکل صاف ستھرا۔ کھڑکیوں پر پھولوں کی بیلیں تھیں، کوئلے اور دھویں کا نام ونشاں تک نہیں تھا۔

''آپ لوگ کھانا کیسے پکاتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''سورج کی گرمی سے۔'' انھوں نے یہ کہتے ہوئے مجھے ایک نلکی دکھائی جس کے اندر سے سورج کی گاڑھی روشنی اور گرمی بہہ رہی تھی۔ پورا نظام سمجھانے کے لیے وہ مجھے کچھ اور دکھانے لگیں۔

''آپ لوگ سورج کی گرمی کو کس طرح جمع اور استعمال کرتے ہیں؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''چلو، تمھیں اپنی تاریخ سے کچھ واقف کرایا جائے۔ تیس سال پہلے کی بات ہے جب ہماری موجودہ ملکہ ۱۳ سال کی تھیں، انھیں تخت پر بٹھایا گیا۔ وہ صرف نام کی ملکہ تھیں ورنہ دراصل وزیر اعظم ہی ملک پر حکومت کرتے تھے۔ ہماری ملکہ کو سائنس سے بہت دلچسپی تھی۔ انھوں نے یہ فرمان جاری کیا کہ ان کے ملک کی تمام لڑکیوں اور عورتوں کو پڑھنا ہوگا۔ اس کے لیے حکومت نے لڑکیوں کے لیے کئی اسکول

کھولے اور کئی ایک کی سرپرستی کی۔ دُور دُور تک عورتوں میں تعلیم کا چلن ہوا۔ اکیس برس کی عمر سے پہلے کسی عورت کو شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ بھی بتادوں کہ اس تبدیلی سے پہلے ہمیں سخت پردے میں رکھا جاتا تھا۔"

"گو پانسہ ہی پلٹ گیا۔" میں نے ہنستے ہوئے اضافہ کیا۔

"لیکن علاحدگی تو ویسی ہی ہے۔"

انھوں نے کہا، "کچھ سال بعد ہماری الگ جامعات بن گئیں جہاں مردوں کو داخلہ نہیں ملتا تھا۔ دارالحکومت میں، جہاں ہماری ملکہ کی رہائش ہے، دو یونی ورسٹیاں ہیں۔ ان میں سے ایک میں ایک حیرت انگیز غبارہ بنایا گیا جس کے ساتھ کئی نلکیاں جوڑ دی گئیں۔ اس غبارے کو انھوں نے اس طرح باندھ دیا کہ وہ بادلوں کے اوپر تیرتا رہے اور اس کے ذریعے وہ حسب ضرورت پانی حاصل کرسکیں۔ چوں کہ یونی ورسٹی کے لوگ برابر پانی نکالتے رہے اس لیے بادل نہیں بنے اور اس طرح ہماری ذہین وائس چانسلر نے بارش اور طوفانوں کو روک دیا۔"

"سچ! اب پتا چلا کہ یہاں کیچڑ کیوں نہیں ہوتی!" میں نے کہا۔ "لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ان نالیوں میں پانی کس طرح جمع کیا جاتا ہے؟"

وہ مجھے سمجھانے لگیں کہ یہ سب کیسے ہوتا ہے۔ لیکن سائنس کے بارے میں میرا علم بہت محدود تھا۔ بہرحال انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"جب دوسری یونی ورسٹی کو یہ خبر ملی تو انھیں بہت حسد ہوا اور انھوں نے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دینے کا منصوبہ بنایا۔ انھوں نے ایک ایسا آلہ بنایا جس سے کہ سورج کی روشنی حسبِ ضرورت جمع کی جاسکے۔ اور بہ وقتِ ضرورت جمع کی ہوئی سورج کی اس گرمی کو گھروں میں استعمال کیا جاسکے۔"

"اب عورتیں تو سائنسی تحقیقات میں مصروف تھیں اور مرد فوجی قوت بڑھانے میں لگے ہوئے تھے۔ جب انھوں نے سنا کہ خواتین نے یونی ورسٹیوں میں سورج کی روشنی کے حصول اور بادلوں سے پانی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے تو وہ یونی ورسٹی کی خواتین کا مذاق اڑانے لگے اور اسے دیوانے کا خواب کہنے لگے۔"

"آپ کی کامیابیاں واقعی شان دار ہیں لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ اپنے مردوں کو مردان خانے میں ڈالنے میں کیسے کامیاب ہوئیں؟ کیا آپ نے پہلے انھیں قید کیا؟"

"نہیں!"

"یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ خود اپنی آزادی سے محروم ہو کر چہاردیواری میں بند ہونے کے لیے خوشی سے راضی ہو گئے ہوں، یقیناً انھیں قابو میں کرنا پڑا ہوگا۔"

''ہاں کرنا پڑا۔''

''کس نے کیا؟ شاید خواتین فوجیوں نے؟''

''نہیں، ایسا ہم نے ہتھیاروں سے نہیں کیا۔''

''ایسا کیسے ممکن ہے!؟ مرد کے بازوؤں میں نسبتاً زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ پھر؟''

''دماغ سے!''

''لیکن ان کے دماغ بھی عورتوں سے زیادہ بڑے اور بھاری ہوتے ہیں۔ ہیں نا؟''

''ہاں، ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ایک ہاتھی کے پاس آدمی سے زیادہ بڑا اور بھاری دماغ ہوتا ہے پھر بھی آدمی ہاتھیوں کو زنجیروں سے باندھ سکتا ہے، ان سے حسبِ خواہش کام لے سکتا ہے۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے، لیکن یہ سب ہوا کیسے؟ میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں۔''

''عورت کا دماغ مرد کے دماغ سے زیادہ تیز ہوتا ہے۔ دس سال پہلے جب فوج کے افسروں نے ہماری سائنسی تحقیقات کو جذباتی خواب کہا تو کچھ عورتوں نے اس کا جواب دینا چاہا لیکن دونوں وائس چانسلروں نے انھیں روک دیا اور کہا کہ انھیں بول کر نہیں بلکہ مناسب موقع آنے پر کچھ کر کے اس کا جواب دینا چاہیے اور انھیں اس موقعے کے لیے زیادہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑا۔''

''کس قدر تعجب کی بات ہے!'' میں خوشی سے تالیاں بجانے لگی۔

''اور اب وہ مغرور مرد خود جذباتی خواب دیکھ رہے ہیں۔ کچھ عرصے بعد ہمارے پڑوسی ملک کے کچھ لوگوں نے آکر ہمارے یہاں پناہ لی۔ انھوں نے کوئی سیاسی جرم کیا تھا۔ ان کے بادشاہ نے، جسے ڈھنگ سے حکومت کرنے کے بجائے حاکمانہ اختیارات کے استعمال کا شوق تھا، ہماری ملکہ سے ان افسروں کو واپس کر دینے کے لیے کہا۔ ملکہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا کیوں کہ پناہ گزینوں کو لوٹانا ان کے اصولوں کے خلاف تھا۔ بس اس بات پر بادشاہ نے ہمارے ملک کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ ہمارے فوجی افسران فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے چل پڑے۔ لیکن دشمن اُن سے زیادہ طاقت ور تھا۔ بے شک ہمارے فوجی بہت ہمت سے لڑے لیکن اپنی تمام شجاعت کے باوجود دشمن کی فوج آہستہ آہستہ ہمارے علاقے فتح کرنے لگی۔ ہمارے بیش تر مرد جنگ پر گئے ہوئے تھے، حد یہ ہے کہ سولہ سال کے لڑکے بھی۔ ہمارے زیادہ تر سپاہی مارے گئے اور دشمن دارالحکومت سے پچیس میل کے فاصلے پر رہ گیا۔ ملک کو بچانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ اس پر غور کرنے کے لیے ملکہ کے محل میں سمجھ دار خواتین کی ایک نشست ہوئی۔ کچھ نے فوجیوں کی طرح لڑنے کی بات کی تو کچھ نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ عورتوں کو نہ تو ہتھیاروں سے لڑنے کی تربیت دی گئی ہے اور نہ انھیں ہتھیار چلانے کی عادت ہے۔ تیسرے گروپ نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ وہ جسمانی طور پر کم زور ہیں۔

ملکہ نے کہا، 'اگر تم میں ملک کو بچانے کے لیے جسمانی طاقت نہیں تو ذہنی قوت سے کام لو۔'
کچھ دیر خاموشی رہی ملکہ نے پھر کہا، 'اگر میرا ملک فتح ہو جاتا ہے تو پھر مجھے اپنی جان دے دینی ہوگی۔'

اس موقعے پر اس یونی ورسٹی کی وائس چانسلر جس نے شمسی توانائی جمع کی تھی اور جو اس دوران خاموش بیٹھی غور وفکر میں گم تھی، کہا، 'ہم اپنے سب داؤ ہار چکے ہیں اور کوئی اُمید نہیں رہی ہے۔ ہاں ایک ترکیب ہے، اگر آزمانا چاہیں تو دیکھ لیں، یہی ہماری پہلی اور آخری کوشش ہوگی۔ اگر اس میں بھی ہار ہو جاتی ہے تو پھر خودکشی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔' وہاں سب ہی حاضرین نے عہد کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ جیتے جی خود کو دشمن کے ہاتھ میں نہیں جانے دیں گی۔

ملکہ نے سب کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا اور وائس چانسلر سے اپنی تدبیر بہ روئے کار لانے کے لیے کہا۔

وائس چانسلر نے کہا، 'ہمارے باہر نکلنے سے پہلے مردوں کو مردان خانے میں جانا ہوگا۔ میں پردے کی خاطر یہ مطالبہ کر رہی ہوں۔'

'بے شک!' ملکہ نے جواب دیا۔

اگلے دن ملکہ نے تمام مردوں سے آزادی اور عزت کی خاطر مردان خانے میں جانے کے لیے کہا۔ ہمارے مرد تھکے ہارے تو تھے ہی، لہٰذا اس حکم کو انھوں نے اپنے لیے اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم سمجھا اور منھ سے ایک لفظ نکالے بغیر وہ مردان خانوں میں گھس گئے۔ انھیں یقین تھا کہ اب ملک کے لیے کوئی اُمید باقی نہیں رہ گئی ہے۔

اس کے بعد وائس چانسلر نے اپنی دو ہزار طالبات کے ساتھ میدانِ جنگ کے لیے کوچ کیا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے سورج کی جمع کردہ نہایت تیز روشنی اور گرمی دشمن پر مرتکز کر دی۔ اتنی روشنی اور گرمی کو برداشت کرنا دشمن افواج کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس بھیانک گرمی کا مقابلہ کیسے کریں؟ چناں چہ وہ اپنا اسلحہ چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرنے لگے۔ اس پر بھی سورج کی گرمی سے ان کے جسم جھلس رہے تھے۔ اس واقعے کے بعد کسی نے ہمارے ملک پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''اور اسی وقت سے آپ کے ملک کے مردوں نے بھی مردان خانوں سے باہر آنے کی کوشش نہیں کی؟''

''وہ آزاد ہونا چاہتے تھے، کچھ پولیس کمشنروں اور ڈسٹرکٹ ججوں نے ملکہ کو یہ پیغام بھیجا کہ فوجی افسروں کو ان کی ناکامی کی سزا ملنی چاہیے لیکن خود انھوں نے کبھی ادائیگی فرض میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی، لہٰذا انھیں سزا دینا مناسب نہیں۔ انھوں نے اپنی ڈیوٹی پر دوبارہ حاضر ہونے کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔

ملکہ نے انھیں ایک گشتی مراسلہ بھیجا کہ جب بھی ان کی خدمات کی ضرورت ہوگی تو انھیں واپس بلا لیا جائے گا۔ اس وقت تک وہ جہاں ہیں، وہیں رہیں۔ اس واقعے کو خاصے دن گزر چکے ہیں۔

اب تو وہ پردے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ انھیں اپنی اس الگ تھلگ زندگی کا شکوہ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ اب ہم اس رویے کو 'زنانہ' کی جگہ 'مردانہ' کہتے ہیں۔''

''لیکن پولیس یا مجسٹریٹ کے بغیر چوری یا قتل ہو جانے پر آپ کا کام کیسے چلتا ہے؟'' میں نے سارہ آپا سے پوچھا۔

''جب سے یہ مردانہ رواج شروع ہوا ہے کوئی گناہ یا جرم ہوتا ہی نہیں۔ اس لیے نہ ہمیں مجرم پکڑنے کے لیے پولیس کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ مقدمہ چلانے کے لیے کسی مجسٹریٹ کی۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر کوئی شخص بے ایمان ہے بھی تو آپ اسے آرام سے راہ راست پر لا سکتی ہیں۔ آپ لوگوں نے جس طرح خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر جنگ میں فتح حاصل کی اسی طرح آپ کسی زحمت کے بغیر جرم اور مجرم سے لڑ سکتی ہوں گی۔'' میری حیرت کی انتہا نہیں تھی۔

''اب یہ بتاؤ سلطانہ جان کہ تم یہیں بیٹھی رہو گی یا میرے کمرے میں بھی چلو گی؟''

''آپ کا باورچی خانہ کسی ملکہ کی خواب گاہ سے کم تو ہے نہیں!'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''لیکن اب ہمیں چلنا چاہیے کیوں کہ بچارے مرد مجھے گالی دے رہے ہوں گے کہ میں نے اتنی دیر انھیں ان کے کام سے محروم رکھا ہے۔'' ہم دونوں کھل کر ہنس دیے۔

''میری سب سہیلیاں کتنی خوش اور حیران ہوں گی جب میں گھر لوٹ کر انھیں بتاؤں گی کہ دور دراز کہیں ایک ایسا شہر ہے جہاں عورتیں حکومت کرتی ہیں اور تمام معاشرتی معاملات پر ان ہی کا اختیار ہے جب کہ مردوں کو مردانے میں رکھا جاتا ہے کہ وہ بچوں کی پرورش اور امورِ خانہ داری انجام دیں۔ ان کے لیے کھانا پکانا نہ صرف آسان ہے بلکہ وہ کھانا پکانے میں لطف بھی محسوس کرتے ہیں۔''

''ہاں تم نے جو کچھ یہاں دیکھا ہے وہ سب انھیں بتانا۔''

''اچھا یہ تو بتائیے کہ آپ کھیتی کیسے کرتی ہیں؟ زمین کیسے بوتی ہیں اور سخت مشقت والے کام کیسے کرتی ہیں؟''

''ہمارے کھیت بجلی کے ذریعے جوتے جاتے ہیں۔ سخت محنت والے کام بھی اسی طرح کیے جاتے ہیں۔ ہم اپنے فضائی سفر کے لیے بھی اسی کا استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں نہ تو ریل ہے نہ پکی سڑکیں۔''

''اسی لیے یہاں سڑک یا ریلوے کے حادثات نہیں ہوتے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ کو کبھی بارش کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؟'' میں نے پوچھا۔

''جب سے پانی کا یہ غبارہ لگا ہے ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ تم وہ بڑا غبارہ اور اس میں لگی ہوئی نلکیاں دیکھ رہی ہو نا! ان کی مدد سے ہم حسبِ ضرورت پانی نکال سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں نہ تو سیلاب آتا ہے، نہ آندھی اور طوفان۔ ہم فطرت سے اسے صرف حسبِ ضرورت حاصل کرتے ہیں۔

ہمیں ایک دوسرے سے لڑنے کا وقت ہی نہیں ملتا کیوں کہ ہم خالی بیٹھتے ہی نہیں۔ ہماری ملکہ کو باغبانی کا بہت شوق ہے، وہ چاہتی ہیں کہ تمام ملک کو ایک حسین باغ میں تبدیل کر دیں۔''

''بہت نیک ارادہ ہے۔ آپ کی خاص غذا کیا ہے؟''

''پھل۔''

''آپ موسم گرما میں اپنے ملک کو ٹھنڈا کیسے رکھتی ہیں؟ ہمیں تو موسم گرما میں بارشیں خدا کی نعمت لگتی ہیں۔''

''جب گرمی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو ہم زمین پر فوارے سے خوب پانی چھڑک دیتے ہیں اور سردیوں میں ہم شمسی توانائی سے اپنے کمروں کو گرم رکھتے ہیں۔''

انھوں نے مجھے اپنا غسل خانہ دکھایا جس کی چھت ایک صندوق کے ڈھکن کی طرح تھی اور ہٹائی جا سکتی تھی، اس چھت کو ہٹا کر صرف فوارے کی ٹوٹی کھول دینے سے کسی بھی وقت غسل کیا جا سکتا تھا۔

''آپ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں!'' میں یکا یک بول اٹھی۔ ''آپ کے پاس سب کچھ ہے، پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کا مذہب کیا ہے؟''

''ہمارا مذہب پیار اور سچ کی بنیاد پر منحصر ہے۔ یہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے پیار کریں اور مکمل سچ بولیں۔ اگر کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت، تو اسے...!''

''سزائے موت دی جاتی ہے؟''

''نہیں، موت کی سزا نہیں! ہم خدا کے کسی بھی بندے کو خصوصاً انسان کو مارنا پسند نہیں کرتے۔ جھوٹے شخص کو ملک بدر کر دیا جاتا ہے اور اسے کبھی واپس آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔''

''کیا مجرم کو کبھی معاف نہیں کیا جاتا؟''

''کیا جاتا ہے اگر وہ واقعی ندامت محسوس کرے۔''

''کیا اپنے رشتہ داروں کے علاوہ دوسرے مردوں کو دیکھنے کی آپ کو اجازت حاصل نہیں؟''

''اپنے قریبی رشتہ داروں کے علاوہ کسی دوسرے مرد کو دیکھنے کی اجازت نہیں۔''

''ہمارے نزدیکی رشتہ داروں کا دائرہ تو کافی چھوٹا ہے حتیٰ کہ چچیرے اور ممیرے بھائی بہن بھی نزدیک نہیں کہلاتے۔''

''ہمارے یہاں تو یہ حلقہ بہت وسیع ہے۔ دور کے رشتے کا بھائی بھی سگے بھائی کی طرح ہوتا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ آپ کی زمین پر خود نیکی کی حکومت ہے۔ میں آپ کی ملکہ سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں جو اتنی ذہین اور دور اندیش ہیں کہ اتنے اچھے قانون بنائے ہیں۔''

"اچھی بات ہے۔" سائرہ آپا نے یہ کہہ کر تخت کے ایک چوکور ٹکڑے میں دو کرسیاں کس دیں پھر اس تخت پر انھوں نے دو چکنی اور چمک دار گیندیں جوڑ دیں۔ میرے یہ پوچھنے پر کہ ان گیندوں کا کیا کام ہے؟ انھوں نے بتایا کہ وہ ہائڈروجن کی گیندیں ہیں اور کششِ ثقل کو قابو میں کرنے کے لیے لگائی گئی ہیں۔ یہ گیندیں مختلف درجے کی تھیں تاکہ مختلف وزن اٹھانے کے لیے استعمال کی جاسکیں۔ پھر اس اڑن کھٹولے میں انھوں نے پروں جیسی دو پٹیاں اور جوڑ دیں جو بجلی سے چلتی تھیں۔ ہمارے آرام سے بیٹھ جانے کے بعد انھوں نے ایک بٹن دبایا اور یہ پٹیاں گھومنے لگیں اور ان کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ پہلے ہم چھ سات فٹ کی بلندی تک اٹھے پھر اڑنے لگے۔ اس سے پہلے کہ میں یہ سمجھ پاتی کہ ہماری پرواز پوری ہو چکی ہے، ہم ملکہ کے باغ میں پہنچ چکے تھے۔

میری سہیلی نے مشین کو الٹا گھما کر اڑن کھٹولے کو نیچے اتارا۔ اور جب وہ زمین پر اتر گیا تو مشین بند ہو گئی اور ہم باہر نکل آئے۔

میں نے اڑن کھٹولے کے اندر سے دیکھا کہ ملکہ اپنی چار سال کی بیٹی اور کچھ کنیزوں کے ساتھ باغ میں چہل قدمی کر رہی ہے۔

"کہو کیسی ہو؟" ملکہ نے سائرہ آپا سے پوچھا۔

جب مجھے ان سے ملایا گیا تو انھوں نے کسی شاہانہ شان و شوکت کے بغیر بہت سادگی کے ساتھ میرا گرم جوشی سے استقبال کیا۔

مجھے ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ بات چیت کے دوران ملکہ نے مجھے بتایا کہ انھیں اپنی رعایا کے دوسرے ممالک سے تجارت کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ لیکن ان ممالک سے تجارت کرنا ممکن نہیں جہاں عورتوں کو زنان خانے میں رکھا جاتا ہو اور بدیں وجہ وہ ہم سے تجارت کرنے کے لیے باہر نہ آسکتی ہوں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں دوسروں کی زمین کی چاہ نہیں۔ ہم ہیرے کے کسی ٹکڑے کے لیے جنگ نہیں کرتے خواہ وہ "کوہ نور" سے زیادہ قیمتی کیوں نہ ہو، نہ ہم کسی بادشاہ سے اس کا تختِ طاؤس چھیننا چاہتے ہیں۔ ہم تو علم کے سمندر کی گہرائی میں جاکر نایاب موتی تلاش کرنے کے خواہش مند ہیں، وہ موتی جو فطرت نے ہمارے لیے فراہم کیے ہیں۔ ہم فطرت کے تحائف سے کھل کر لطف اندوز ہونے کی متمنی ہیں۔"

ملکہ عالیہ سے رخصت لینے کے بعد ہم نے ان مشہور یونی ورسٹیوں کا دورہ کیا اور ان کے کچھ کارخانوں، تجربہ گاہوں اور ہسپتالوں کو بھی دیکھا۔

یہ سب مقامات دیکھ کر آنے کے بعد ہم پھر اڑن کھٹولے میں سوار ہوئے لیکن جیسے ہی وہ اڑنا شروع ہوا میں اس میں سے گر پڑی۔ میں نے سنبھلنا چاہا تو آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو میں اس آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی جس پر بیٹھے بیٹھے میں اپنی عورتوں کے حالِ زار پر غور کر رہی تھی۔

☆☆☆

وحید احمد

"اصلاح النساء"

رشید النسا کا یہ ناول برصغیر پاک و ہند میں خواتین کی بیداری، ان کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے آواز اٹھانے والی ابتدائی تحریروں میں سے ایک ہے۔ یہ ناول حال ہی میں دوسری بار شائع ہوا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۸۹۴ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت ناول پر مصنفہ کے نام کی جگہ "والدہ محمد سلیمان سلمہ الرحمٰن (بیرسٹرایٹ لا)" درج تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس زمانے میں یہ ناول لکھا گیا ہے اور اس کی اشاعت ہوئی، اُس وقت کے معاشرے کی صورتِ حال یہ تھی کہ شریف گھرانے کی ایک خاتون اپنی کتاب پر اپنا نام دینے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ علاوہ ازیں اس سے ایک بات اور بھی ظاہر ہوتی ہے کہ مصنفہ نام ونمود کی خواہش مند نہیں بلکہ اس کے نزدیک اصل اہمیت کام کی ہے۔ وہ اپنے معاشرے کی عورتوں کی اصلاح چاہتی ہے خواہ کسی بھی عنوان ہو۔ مصنفہ نے اپنے دیباچے میں بتایا ہے کہ یہ ناول ۱۸۸۱ء میں لکھا گیا تھا لیکن اس کے چھپنے کی نوبت ۱۸۹۴ء میں آئی۔ انھوں نے ان وجوہات کا ذکر تو نہیں کیا جو اس ناول کی اشاعت کی راہ میں تیرہ سال تک حائل رہیں لیکن جس معاشرے کا نقشہ اس ناول میں پیش کیا گیا ہے، اس سے اور انیسویں صدی کی آخری دہائیوں کے حوالے سے معاشرے کا حال بیان کرنے والی دوسری تحریروں سے، بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ ناول تیرہ برس کیوں نہ شائع ہوسکا؟

اس ناول کی قدر و قیمت کے حوالے سے پہلی بات تو یہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ یہ خواتین کی تعلیم و تربیت اور شعور کے مسائل پر لکھی جانے والی ابتدائی تحریروں میں تو ہے ہی لیکن اس کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ اسے ایک خاتون نے تحریر کیا ہے۔ برصغیر میں خواتین کی تعلیم و تربیت کے مسئلے پر سب سے پہلے سرسید اور ان کے رفقا کی سنجیدہ کوششوں کا ذکر تاریخی کتابوں میں ملتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرسید اور ان کے ساتھیوں کی ساری کوششیں خواتین کی گھریلو تعلیم اور ان کے سگھڑپن کی اہمیت اجاگر کرنے تک محدود تھیں۔ سرسید اور ان کے ساتھی اپنے معاشرے کی خواتین کی اسکول کالج کی تعلیم کے حامی نہیں تھے

بلکہ اس زمانے میں اگر کسی طرف سے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا کہ خواتین کو اسکول کالج کی تعلیم دلائی جانی چاہیے تو سرسید نے اس کی مخالفت کی تھی۔ یہ باتیں بھی ہمیں تاریخی حوالے کی کتابوں میں مل سکتی ہیں۔ اس کتاب پر زاہدہ حنا کے مضمون میں اس حقیقت کو تاریخی حوالوں اور شہادتوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ زاہدہ حنا نے نہ صرف ناول اور اس کی مصنفہ کے حوالے سے اپنے خیالات رقم کیے ہیں بلکہ انھوں نے برصغیر میں خواتین کی بیداری کی تحریک پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور مدلل تحقیقی انداز میں اپنے موقف کی وضاحت کی ہے۔

رشید النسا نے لکھا ہے کہ انھیں یہ ناول لکھنے کی تحریک اپنے اردگرد کی صورت حال اور اس کے مسائل دیکھ کر ہوئی۔ انھیں خواہش ہوئی کہ وہ اپنے معاشرے کی عورتوں میں بہتر اور خوش گوار زندگی گزارنے کا شعور پیدا کریں۔ اس خواہش کے لیے ڈپٹی نذیر احمد کی ''مراۃ العروس'' ایسی کتاب مزید تحریک کا باعث بنی اور انھوں نے سوچا کہ انھیں بھی اپنی بات قصہ کہانی کے انداز میں بیان کرنی چاہیے۔ اس ناول کی تاریخی اہمیت بھی کسی طرح کم نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم اس کا جائزہ صرف اور صرف ایک ناول کی حیثیت سے لیں تو بھی یہ ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس میں وہ فن کارانہ مہارت اور تکنیک کا تجربہ تو ہمیں نہیں ملتا جو نئے ناولوں میں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود مصنفہ نے جس خوب صورت انداز، عام بول چال کی زبان اور کہانی پن کے سلیقے سے یہ کتاب لکھی ہے، اس کی داد نہ دینا دیانت کے خلاف ہوگا۔ اس کے علاوہ اُس ماحول اور معاشرے کی جس انداز میں نقشہ کشی کی گئی ہے اور اس میں خواتین کے مسائل کو جس خوب صورت انداز سے اُٹھایا اور ان کے حل کا راستہ بھایا گیا ہے، وہ نہایت دلچسپ ہے اور قاری خود کو اس کے کہانی کے ساتھ ساتھ چلنے پر مجبور پاتا ہے۔ اس ناول میں اُٹھائے گئے کتنے ہی مسائل ایسے ہیں جو آج بھی ہمارے معاشرے کی خواتین کو درپیش ہیں اور جن پر ناول نگار نے بڑی خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اس ناول کے کردار وزیرن، بسم اللہ، اس کی ماں اور اشرف النسا وغیرہ بے حد دلچسپ ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعے ہمیں انداز ہوتا ہے کہ ناول نگار اپنے معاشرے کی صورت حال کا کتنا گہرا شعور رکھتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کی خواتین کے لیے نصیحتوں کا کتابچہ لکھنے کی بجائے اوّل تا آخر ایک دلچسپ اور قابلِ توجہ کہانی کے ذریعے ان میں شعور پیدا کرنے کو مناسب سمجھا۔ مجموعی طور پر یہ کتاب ایک اچھی، دلچسپ اور معیاری کتاب ہے اور اس کی جگہ بجا طور پر ہمارے ناول کی تاریخ میں بنتی ہے۔

☆☆☆

انتظار حسین

تذکرہ ایک کتاب کا ☆

آخر کیا وجہ ہے کہ اردو کے ابتدائی زمانے میں ہمیں اس زبان کا کوئی ہندی شاعر نہیں ملتا؟ لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو ادیبوں اور شاعروں کا تانتا بندھ گیا۔

ہمارے دانش ور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کو اس دور کی ادبی صورتِ حال کے حوالے سے دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے اور وہ اس کی کھوج میں لگ جاتے ہیں۔ چھان پھٹک کے بعد وہ ایک سازش کا سراغ لگاتے ہیں جسے فرنگیوں کی لڑاؤ اور راج کرو کی حکمتِ عملی کہا جاسکتا ہے جو کہ اس وقت لسانی سطح پر کام کر رہی تھی۔ اس مسئلے کی گہری چھان بین کے نتیجے میں ہمیں فاروقی کی کتاب ''اردو کا ابتدائی زمانہ'' میسر آئی ہے جو انگریزی میں ہندوستان سے شائع ہوئی اور اردو میں اسے آج پبلشرز کراچی، نے پاکستان میں شائع کیا ہے۔

فاروقی ہمیں بتاتے ہیں کہ ہندوستان میں فرنگی دانش وروں خاص طور سے ان لوگوں نے جو فورٹ ولیم کالج سے وابستہ تھے، سازش کا یہ جال بچھایا تھا کہ مذہب کی بنیاد پر زبان کو تقسیم کیا جائے۔ اس منصوبے کے نتیجے میں اردو اپنے پرانے ناموں ''ہندی'' اور ''ہندوی'' سے لاتعلق ہوگئی۔ اس لیے کہ اب ''ہندی'' کا صیغہ اُس نئے طرزِ بیاں سے مخصوص ہوا جس پر سنسکرت کی چھاپ تھی اور اسے ناگری خط میں لکھا جاتا تھا۔

فاروقی ڈاکٹر تاراچند کی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہیں جو ۲۰/ فروری ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا ریڈیو کے دہلی اسٹیشن سے نشر ہوئی تھی۔ ڈاکٹر تاراچند نے انکشاف کیا کہ فورٹ ولیم کالج کے لیے کام کرنے والے ہندو ادیبوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ صرف ہندوؤں کے لیے نثر کی کتابیں تیار کریں۔ لہٰذا انھوں نے یہ کیا کہ میر امن، افسوس وغیرہ کے کام کو نمونے کے طور پر سامنے رکھا لیکن اسے اپنی بھاشا میں رنگنے کے لیے اس میں سے فارسی، عربی کے لفظ چھانٹ دیے اور ان کی جگہ سنسکرت اور ہندی کے لفظ

☆۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب ''اردو کا ابتدائی زمانہ'' پر تبصرہ۔ انگریزی سے ترجمہ تحسین مرزا۔

رکھ دیے۔ ڈاکٹر تاراچند کا کہنا ہے کہ اس طرح دس برس سے بھی کم مدت میں ہمارے یہاں دو زبانیں اردو اور ہندی پیدا ہوئیں۔ ''اسی وقت سے ہندوستان زبان کی مصنوعی تقسیم کے باعث دکھ اٹھا رہا ہے۔'' فاروقی معروف ماہر لسانیات سنیتی کمار چٹرجی کا حوالے بھی دیتے ہیں جنھوں نے ڈاکٹر تاراچند کے بیان پر صاد کیا ہے۔

فاروقی کے بہ قول دوسری طرف مسلمانوں کو اس کے برعکس ہدایات دی گئیں۔ لہٰذا انھوں نے اردو ادب میں ہندو ادیبوں کی خدمات کا اعتراف کرنا چھوڑ دیا۔ اس سلسلے میں وہ ''آب حیات'' کا حوالہ دیتے ہیں جو اردو شاعری کی پہلی مفصل تاریخ ہے۔ یہ کتاب انیسویں صدی کے اواخر میں لکھی گئی تھی۔ اس میں کوئی ہندو شاعر شامل نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ دیا شنکر نسیم جو اپنی مثنوی ''سحرالبیان'' کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتے تھے، وہ بھی اردو شاعری کی کہکشاں میں جگہ پانے سے قاصر رہے۔ مولانا آزاد نے میر حسن پر بات کرتے ہوئے صرف ایک جگہ ان کا سرسری سا حوالہ دیا ہے۔ فاروقی نے ایسے ہندو شاعروں کی ایک فہرست درج کی ہے جو اٹھارویں صدی میں شہرت اور استناد کی منزلیں سر کر چکے تھے مگر آزاد نے ان سب کو نظر انداز کیا تھا۔

مولانا آزاد نے جو ریت ڈالی، ان کے بعد آنے والے ادب کے مؤرخین پوری ذمہ داری سے اسے نبھاتے رہے۔ ہاں ایک کتاب اس روش سے ہٹ کر نظر آتی ہے اور وہ ہے ''خم خانۂ جاوید'' جس میں ہندو شاعروں کا ذکر ملتا ہے، لیکن یہ تذکرہ لالہ سری رام کا لکھا ہوا ہے۔ مسلمان مؤرخین مولانا آزاد کی روش پر قائم رہے۔ یہ افسوس ناک بات ہے کہ انھوں نے اس انداز کی اندھی تقلید کی اور ایک لمحے کے لیے یہ نہ سوچا کہ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ ابتدائی زمانے کے بعد اردو کے ادبی منظرنامے میں یکایک ہندو ادیبوں شاعروں کی پوری ایک کھیپ دکھائی دینے لگے؟ اس نرالے قصے کی آخر کوئی توجیہ تو ہونی چاہیے۔

فاروقی کا قیافہ یہ ہے کہ آزاد نے جو کچھ کیا، اگر اس کی ہدایت انھیں اپنے انگریز سرپرستوں سے نہیں ملی تھی تو بھی اُن کا یہ عمل اپنے حاکموں کے زیرِاثر ہونے کی وجہ سے تھا۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ ان ادیبوں اور مؤرخوں کی بابت کیا کہا جائے گا جنھوں نے شد و مد سے اسی ایک مثال کو اپنے سامنے رکھا؟ کیا ہم اُن کے اس اقدام کے بُرے یا بھلے ہونے کی ساری ذمہ داری فورٹ ولیم کالج سے وابستہ انگریز دانش وروں پر ڈال کر الگ ہو سکتے ہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ تو مسلمان اہل نظر کے اندازِ فکر میں بھی تھی۔ لگ بھگ صدی بھر پرانے اس تعصب نے جسے پوری ایک معاشرت نے دوسری کے خلاف پروان چڑھایا، زبان کی تقسیم کے اس گھناؤنے ناٹک میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور وہ بعد ازاں اردو کے لیے سخت مضر ثابت ہوا۔

فاروقی نے آگے چل کر مسلمانوں خاص طور سے دہلی کے لوگوں میں پائے جانے والے ثقافتی

اور لسانی برتری کے احساس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

رتن ناتھ سرشار جیسے بلند پایہ ادیب کے ہوتے ہوئے بھی خود فریبی میں مبتلا ان لوگوں کا خیال یہی تھا کہ ایک ہندو کو اردو میں اظہار و ابلاغ پر خواہ کیسی قدرت کیوں نہ حاصل، طبقۂ اشراف کے مسلمان کو اس پر بہرحال برتری حاصل ہوگی۔ اس زمانے میں جو لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب تھے، وہ گاہے ہندو ادیبوں کی خدمات کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ تاہم مولانا شبلی اور حالی جن سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایسے مسائل کو ان کی کُنہ میں سمجھتے ہوں گے، فاروقی نے اُن کے یہاں بھی اسی قسم کے احساسِ برتری کا کھوج لگایا ہے۔

بات اصل میں یہ ہے کہ فاروقی نے مسلمانوں خاص طور سے یو پی اور دہلی کے لوگوں کے اس رویّے کا بڑی سفاکی سے تجزیہ کیا ہے۔ مکمل معروضیت کے ساتھ جو کہ برصغیر کے لوگوں میں کم یاب ہے، انھوں نے ہماری لسانی صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے اور ان گروہی تعصبات کو آشکار کیا ہے جو اس وقت ان لوگوں میں رائج تھے۔ یہی معروضیت اس کتاب کو اعتبار عطا کرتی ہے اور اسے ایک قابلِ قدر تحقیقی کام بناتی ہے۔

☆☆

اردو کا ابتدائی زمانہ (تنقید و تحقیق)، نقاد: شمس الرحمٰن فاروقی، ضخامت: ۱۹۹ صفحات، قیمت: ۱۲۰ روپے، ناشر: ۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی، مبصر: **خلیق ابراہیم خلیق**

شمس الرحمٰن فاروقی کی تازہ تصنیف ''اردو کا ابتدائی زمانہ: ادبی و تہذیبی تاریخ کے پہلو'' اردو کے تحقیقی و تنقیدی ادب میں ایک شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔

موجودہ زمانے میں اردو کے ابتدائی زمانے پر قلم اٹھانے سے پہلے ضروری ہو جاتا ہے کہ اردو اور جدید (مصنوعی) ہندی کے تنازعے کے بنیادی محرکات کو سمجھ لیا جائے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ اردو وہی زبان ہے جو پرانے زمانے میں ہندی، ہندوی، دہلوی، گجری، دکنی، ریختہ اور ہندوستانی کہلاتی رہی۔ اس زبان کے لیے ''اردو'' کے نام کا استعمال اٹھارویں صدی کی آخری چوتھائی سے شروع ہوا، مگر انیسویں صدی کے آخر تک اسے ریختہ اور زیادہ تر ہندی ہی کہا جاتا رہا۔ بیسویں صدی کے پہلے پندرھواڑے میں بھی اقبال نے اسے فارسی سے ممیّز کرنے کے لیے ہندی ہی کہا ہے۔ جدید سنسکرت زدہ ہندی کی تشکیل ہندوستان کے انگریز حاکموں کی اپنے اقتدار کو مستحکم اور برقرار رکھنے کی غرض سے ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی اور ہندو شاونیت کے علم برداروں کی احیاپرستی کی

مرہونِ منت ہے۔ بہ قول شمس الرحمٰن فاروقی آج جدید ہندی کے حمایتیوں کا یہ دعویٰ کہ اردو، ہندی کی محض ایک شیلی (طرز) ہے، ہندو عصبیت پر مبنی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ آج کی ہندی دراصل اردو کی ایک شیلی (طرز) ہے اور جس زبان کو آج اردو کہا جاتا ہے اس کا قدیم نام ہی ہندی ہے۔

ہندی اردو تنازعے کی پشت پر کارفرما عوامل کی چھان پھٹک کے بعد فاروقی نے اردو زبان اور اس کے ادب کے آغاز اور ان کے عہد بہ عہد ارتقا کی داستان بڑے انہماک اور عرق ریزی کے ساتھ قلم بند کی ہے۔ نظری تنقید اور شعریات کے اصول وقواعد کی تشکیل وتدوین میں خسرو کی مساعی کی بنیادی اہمیت اور ان میں سنسکرت کی مرکزیت کا ذکر کرکے انھوں نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اردو زبان اور اُس تہذیب کی جڑیں، جس کی یہ زبان سب سے بڑی ترجمان ہے، قدیم ہندوستانی روایات میں پیوست ہیں۔ طرز شعرگوئی کے مختلف انداز اور طریقوں پر روشنی ڈالنے اور سلاست، روانی، مضمون، معانی وغیرہ کی صراحت کے ساتھ ساتھ انھوں نے مختلف ادوار میں فروغ پانے والے اسالیب شعر مثلاً ایہام، خیال بندی، معنی آفرینی اور کیفیت پر بڑی پُرمغز گفتگو کی ہے۔

بصیرت افروز معلومات اور محاکمات سے بھری ہوئی یہ کتاب بعض ایسی معلومات بھی فراہم کرتی ہے جو آج کے قاری کے لیے خاصی دلچسپ ہیں، مثلاً فاروقی بتاتے ہیں کہ ۱۹۱۶ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی شادی کا دعوت نامہ دو زبانوں یعنی فارسی اور انگریزی میں تھا۔

فاروقی نے بھی اور محققوں اور نقادوں کی طرح اردو کو ترکی زبان کا لفظ بتایا ہے۔ سندھ کے عظیم دانش ور علامہ آئی آئی قاضی کی تحقیق کے مطابق اردو قدیم الایام سے سندھی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بھیڑ، مجمع، ہجوم کے ہیں۔ سندھ سے ہی یہ لفظ ترکی پہنچا اور ترکی زبان میں شامل ہوگیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی اقبال کی اصطلاح میں ''مذاقِ سخن'' کے حامل ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے تحقیق کے معاملے میں بہت احتیاط اور باریک بینی سے کام لیا ہے اور واقعات کے تحلیل و تجزیہ میں بڑی ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ کتاب کے مختلف مباحث میں جگہ جگہ دستاویزی شواہد پیش کیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں اُن کی بعض باتوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ باتیں بھی فکر و خیال کو مہمیز کرتی اور کارآمد بحث وتجسس کے نئے دروازے کھولتی ہیں۔ فاروقی جدیدیت کے برگزیدہ اور سرگرم رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں مگر ان کی زیرِنظر کتاب اور بعض دوسری تحریریں ترقی پسند فکر کے فروغ کی آئینہ دار ہیں۔

☆☆

مبصر: وحید احمد

اس کتاب کا موضوع اردو زبان اور اس کا تاریخی سفر ہے۔ مصنف نے سات ابواب پر مشتمل اس کتاب میں پوری تحقیقی نظر اور تنقیدی انداز میں اردو زبان اور اس کے تہذیبی اور تاریخی سفر کا مطالعہ

کیا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ زبان کے نام کی حیثیت سے لفظ "اردو" کے استعمال کو بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اس لیے "قدیم اردو" کی اصطلاح درست نہیں ہے۔ آج اردو صرف ایک زبان نہیں ہے بلکہ ایک سیاسی مسئلے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے یہ حیثیت اپنے فرنگی حکمرانوں کے دور میں ہی حاصل کرنا شروع کردی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا اصل مقصد انگریزوں کے ہندوستان پر مستحکم راج کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔ اُس وقت انھوں نے اس راج دھانی کے لوگوں کو زبان کی بنیاد پر تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اردو اور ہندی مسئلے کا بیج اسی زمانے میں بویا گیا تھا۔ اردو زبان کے سنگین مسائل کے حوالے سے یہ باتیں ہمیں اسی کتاب سے معلوم ہوتی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ ہندوستان کے عوام کو انگریزوں نے اردو اور ہندی کے حوالے سے تقسیم کیا۔ یہ تقسیم کرو اور حکومت کرو کی حکمتِ عملی تھی جس نے ایک طرف مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنی زبان سے ہندی کے الفاظ نکال دیں اور اردو زبان و ادب کی تاریخ لکھتے ہوئے ہندو ادیبوں شاعروں کی خدمات کو بالکل نظرانداز کرتے ہوئے آگے بڑھ جائیں۔ دوسری طرف ہندوؤں کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ اپنی زبان کو مسلمانوں کے اثرات سے پاک کریں، اردو کے الفاظ اپنی زبان سے نکال کر اس میں سنسکرت، برج اور دوسری مقامی بولیوں کے الفاظ ڈالیں۔ انگریز کا یہ آزمودہ نسخہ اس بار بھی کامیاب رہا اور مسلمان ہندو مصنفین، ادیب، شاعر اور مؤرخ اس کام میں لگ گئے۔ بہت جلد دونوں الگ الگ اپنی شناخت بنا کر بیٹھ گئے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس سلسلے میں ڈاکٹر تاراچند کا حوالہ دیا ہے جن کے بہ قول صرف دس سال کی مدت میں دو نئی زبانیں وجود میں آکر پھیل چکی تھیں۔

اس کتاب میں مصنف نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ اردو کے بڑے بڑے دانش ور، مثلاً مولانا محمد حسین آزاد جیسے لوگ بھی اس سازش کا شکار ہوئے اور انھوں نے وہی کیا جو انگریز اُن سے کرانا چاہتا تھا۔ اسی طرح ہندی کے اس دور کے اہم لوگ ایسی ہی جوابی کارروائی میں مصروف تھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کتاب میں پوری غیر جانب داری اور ایمان داری کے ساتھ اس مسئلے کا جائزہ لیا ہے۔ ان کی تحقیق و تنقید کا پلڑا ہندو یا مسلمان کسی کی طرف نہیں جھکتا بلکہ حقائق اور واقعات جو کچھ بیان کرتے ہیں، وہ اس کا تجزیہ اور نتائج ایمان داری کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔

بہ ظاہر تو یہ کتاب اردو زبان اور اس کی تاریخ کے حوالے سے لکھی گئی ہے لیکن مصنف نے اپنے کام کو تاریخ اور تحقیق سے آگے بڑھا کر زبان اور ادب کے سماجی حوالے تک پھیلایا ہے۔ جب سماجی حوالہ آتا ہے تو سیاسی حوالہ آنا بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ یوں یہ کتاب اردو زبان کے ادبی، تاریخی، سماجی اور سیاسی اثرات اور پھیلاؤ کا مطالعہ بن جاتی ہے۔ کیا اردو اصل میں لشکری اور فوجی زبان ہے؟ اردو کے معنی کیا ہیں؟ جسے ہم اردو زبان کہتے ہیں، اس کا یہ نام کب رکھا گیا اور یہ نام رکھنے کے کیا اسباب تھے؟ اردو اور ہندی کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے اور اکسانے کا مقصد انگریزوں کے سامنے کیا تھا؟

استادی اور شاگردی نے ایک ادارے کی شکل کیوں اختیار کی؟ کیا یہ بات درست ہے مسلمانوں نے ہندی کے الفاظ کو ترک کر کے فارسی اور عربی کے مشکل الفاظ اپنی زبان میں شامل کیے؟ کیا اسی رویے نے آگے چل کر سیاست میں وہ چکر چلایا کہ آخر ہندوستان دو ملکوں میں تقسیم ہوگیا؟ یہ اور ایسے ہی اور دوسرے کئی سوالات ہیں جو اس کتاب میں اٹھائے گئے ہیں اور ان پر تفصیل کے ساتھ بات کی گئی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کتاب صرف زبان کی تحقیق اور اس کی تاریخ کے تنقیدی مطالعے سے آگے نکل کر سماجی اور سیاسی میدان میں بھی داخل ہوجاتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس مسئلے پر صرف غیر جانب داری سے نظر نہیں ڈالی بلکہ ان کا انداز بھی قابل تعریف ہے کہ وہ پوری کتاب میں کسی ایک جگہ بھی اس مسئلے کے جذباتی پہلو کو ابھرنے نہیں دیتے۔ وہ محققانہ اور عالمانہ انداز میں مسئلے کی پیچیدگی پر بات کرتے اور اپنے نکتۂ نظر کو واضح کرتے چلے جاتے ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس موضوع پر شائع ہونے والی یہ سب سے اہم اور جامع کتاب ہے جس میں اردو کے مسئلے کو پوری سنجیدگی کے ساتھ غیر جذباتی انداز میں دیکھا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کو اس کے سارے حوالوں کے ساتھ جانچتی اور پرکھتی ہے۔ اسے اردو تنقید اور تحقیق کی اہم ترین کتابوں میں شمار کیا جائے گا۔

☆☆☆

زمین کا نوحہ (انتخاب)، مرتب: ضمیر نیازی، ضخامت: ۳۴۰ صفحات، قیمت: ۲۰۰ روپے،
ناشر: شہرزاد (پتا درج نہیں)، مبصر: **انور جمال**

ہمارے ہاں موضوعاتی کتابیں ترتیب دینے کا رواج تو ویسے ہی کم ہے اور پھر خاص طور پر سنجیدہ اور دقیق موضوعات پر تو کتابیں بہت ہی کم مرتب کی جاتی ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ایسی کتابیں زیادہ فروخت نہیں ہوتیں۔ میری ذاتی رائے میں یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اگر سنجیدہ موضوعات پر اچھے اور معیاری مجموعے ترتیب دیے جائیں تو وہ ضرور فروخت ہوں گے۔ بہرحال اس صورت حال میں جب ایک عزیز کے ذریعے ''زمین کا نوحہ'' ملی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ایٹمی تباہ کاری کا موضوع ہمارے ہاں عوامی دلچسپی کے دائرے میں نہیں آتا۔ یہ تو سنجیدہ اور غور وفکر کرنے والے لوگوں کی پسند سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس کتاب کے تفصیلی مطالعے سے اندازہ ہوا کہ دقیق سے دقیق موضوع پر بھی ایسی کتابیں مرتب کی جاسکتی ہیں جو عوام اور خواص دونوں کے لیے بہ یک وقت دلچسپی کا باعث ہوں۔

''زمین کا نوحہ'' میں ہیروشیما سے لے کر چاغی تک ایٹمی تباہ کاری کے حوالے سے ادبی نگارشات کو جمع کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ضمیر نیازی، خلیق ابراہیم خلیق اور آصف فرخی کے مضامین اس موضوع پر مختلف حوالوں سے روشنی ڈالتے ہیں۔ ضمیر نیازی نے اپنے مضمون میں حوالہ جات سے اس موضوع کی اہمیت اور عالمی سطح پر اس کے بارے میں انسان دوست دانش وروں اور ادیبوں کے ردِّعمل کا احاطہ کیا ہے۔ ان کا یہ مضمون اس موضوع پر لکھے گئے اہم مضامین میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ خلیق ابراہیم خلیق اور آصف فرخی کے مضامین اس موضوع کا ادبی اور سماجی پہلو سے بڑی خوبی سے مطالعہ کرتے ہیں اور ہمیں انسانی معاشرے کو درپیش سب سے بڑے خطرے اور انسانیت کے مستقبل پر سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس کتاب میں موضوع تو ضرور ایک ہے لیکن اصناف ادب میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ مرتب نے کوشش کی ہے کہ اس موضوع پر جس صنفِ ادب میں جو اظہار کیا گیا ہے وہ اس کتاب میں شامل کرلیا جائے۔ اسی لیے مضامین اور افسانوں کے ساتھ ساتھ نظمیں اور کالم بھی اس مجموعے کا حصہ ہیں۔ لیکن ایک بات ہمیں محسوس ہوتی ہے کہ اس انتخاب میں شامل شاعری کڑے معیار پر منتخب نہیں کی گئی۔ اس لیے کئی کم زور نظمیں منتخب ہوگئی ہیں۔ اس کے علاوہ بہتر ہوتا کہ اس انتخاب میں کالم بھی شامل نہ کیے جاتے۔ ویسے نثر کا حصہ بے حد معیاری اور تعریف کے قابل ہے۔ پرانی کہانیوں میں منٹو کی ''چچا سام کے نام پانچواں خط''، احمد ندیم قاسمی کی ''ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد''، محمد سلیم الرحمٰن کی ''راکھ''، ''زاہدہ حنا کی ''تنہائی کے مکان میں'' بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ نئی کہانیوں میں انتظار حسین کا ''مورنامہ''، فردوس حیدر کی ''خالی ہوا یہ دل'' اور ''خواب ہارا ہوا آدمی'' ایسی کہانیاں جو اپنے اپنے انداز

سے قاری کی توجہ حاصل کرتی ہیں اور اسے سوچ بچار کے پہلو دکھاتی ہیں۔ نظموں میں ضیا جالندھری، احمد فراز، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، صبا اکرام، ذیشان ساحل اور حارث خلیق کے ہاں اپنے جذبے اور فکر کا خوب صورت اظہار ملتا ہے۔

اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں علاقائی زبانوں کے ادب کا انتخاب بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ قابلِ تعریف اقدام ہے۔ قومی اہمیت کے مسائل پر اسی طرح پوری قوم کا ردِ عمل سامنے آنا چاہیے، اس سے ہماری یک جہتی کا اظہار ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔

☆☆

مبصر: صابر وسیم

یہ ۲۷ مئی سن دو ہزار ہے۔ میں اپنے اخبار کے نیوز روم میں بیٹھا معمول کے کام میں مصروف ہوں۔ ایڈیٹوریل پیج کے انچارج میرے پاس آتے ہیں اور دو مضامین مجھے دے کر کہتے ہیں، ''یہ مضامین میں نے پڑھ لیے ہیں مگر ایڈیٹر صاحب کی ہدایت ہے کہ ان میں کوئی غلطی نہ جائے، لہٰذا ایک نظر آپ بھی ان پر ڈال لیجیے۔'' میں اُن سے کہتا ہوں، ایڈیٹوریل پیج تو تیار ہو چکا تھا، اب یہ مضامین کیسے ہیں؟ وہ مجھے بتاتے ہیں کہ کل ۲۸ مئی ہے، ایٹمی دھماکوں کی دوسری سال گرہ۔ لہٰذا اس حوالے سے مضامین جائیں گے۔ ایک مضمون کے بارے میں مجھے بتایا جاتا ہے کہ وہ ضمیر نیازی صاحب کا ہے۔ پروف کی غلطیوں کی تصحیح کے دوران مجھے اس کتاب سے رجوع کرنا پڑا جس سے یہ مضمون لیا گیا تھا۔ یہ کتاب ہے ''زمین کا نوحہ'' (ایٹمی جنگ کے خطرے اور تباہ کاری کے حوالے سے ادبی انتخاب)۔ یہ کتاب ضمیر نیازی صاحب کی مرتب کی ہوئی ہے۔ فہرست پر نظر ڈالی، پاکستان کے معروف شاعروں اور ادیبوں کے نام نظر آئے۔ فوری طور پر مجھے حیرت انگیز خوشی ہوئی اور اپنے اندر کہیں ہلکی سی سنسناہٹ بھی محسوس ہوئی۔ حیرت انگیز خوشی اس لیے کہ میں اردو میں اس نوعیت کی کسی کتاب کی توقع ہی نہیں رکھتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کتاب کے بارے میں پہلے سے کوئی ذکر بھی نہیں سنا تھا۔ اس لیے جب اچانک اسے دیکھا تو ایک خواہش کی تکمیل، ایک تشنگی کی تسکین اور ایک ندامت میں کمی کے احساس نے خوشی سے سرشار کر دیا۔ سنسناہٹ کی لہر اس لیے دوڑی کہ دو سال قبل ۱۳ مئی اور ۲۸ مئی کے بعد جس شدید غصے، جھنجھلاہٹ اور بے بسی کی اذیت سے میں دوچار رہا وہ پھر اپنے اندر بیدار ہوتی محسوس ہوئی۔ مگر اس وقت میں اخبار کے دفتر میں تھا اور خبروں کے ''رش آورز'' شروع ہو چکے تھے، لہٰذا میں نے جذبات کو لگام دے کر چکی کی مشقت شروع کر دی۔

چند دن بعد یہ کتاب ایک دوست کے ذریعے مجھ تک پہنچ گئی۔ میں چوں کہ اسے پڑھنے کے لیے بے چین تھا، لہٰذا جو کام ملتوی ہو سکتے تھے، انھیں ملتوی کر کے کتاب پڑھنے بیٹھ گیا۔ ایک ذاتی سا تاثر

جو آپ اس کتاب پر تبصرے کے طور پر پڑھ رہے ہیں، اصل میں اس موضوع اور کتاب کے بارے میں میرا فکری اور تحریری ردِ عمل ہے۔ بات یہ ہے کہ جب انسان اپنے ہدف کے سامنے خود کو کم زور اور بے بس پاتا ہے تو گالی دے کر اپنے اندر کی گھٹن کا اخراج کرتا ہے لیکن جب میری طرح کوئی بزدل اور ناکارہ شخص گالی دینے کی ہمت بھی نہیں رکھتا تو پھر وہ اپنے ہدفِ ملامت پر دوسروں سے گالی پڑتے ہوئے دیکھ کر اپنی تسکین کرتا ہے۔ اس کتاب میں یہی کشش میرے لیے تھی۔ جب ہندوستان نے ایٹمی دھماکے کیے تو پاکستان میں دل کھول کر بھارت کو گالیاں دی گئیں اور بہت پُرجوش انداز میں پاکستانی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ فوری طور پر جوابی ایٹمی دھماکے کرے۔ پورے ملک میں اس کے لیے احتجاج کی کیفیت پیدا کر دی گئی اور پھر جب ۲۸ مئی کو پاکستان نے بھی ایٹمی دھماکے کر لیے تو سرکاری میڈیا سے وہ پروپیگنڈا کیا گیا اور ایسے شادیانے بجائے گئے کہ لوگ گھروں سے نکل کر سڑکوں پر رقص کرنے لگے۔ ایک ایسے ناخواندہ ملک میں جہاں کے لوگ ایٹم بم کی تباہی اور بربادی سے واقف ہی نہیں، یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی بلکہ ایک فطری ردِ عمل تھا۔ تاہم اس دوران ہمارے ملک کے شاعروں، ادیبوں اور دانش وروں اور انسانی جہد وللبقا اور انسانی آزادی کے علم برداروں نے بھی اپنے ہونٹوں پر تالے ڈالے ہوئے تھے۔ اور کیوں نہ ڈالتے کہ دھماکوں کے بعد پورے ملک میں داد و تحسین کا جو طوفان برپا تھا اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ پوری قوم نے آج نیا جنم لیا ہے۔ ایسے میں ایٹمی دھماکوں کی ذرا سی مخالفت کسی پر بھی غداری کا لیبل لگانے کے لیے کافی تھی۔ جشن منانے والوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ اب ایٹم بم کی تباہی ہیروشیما اور ناگاساکی کی طرح صرف دو شہروں تک محدود نہیں رہے گی، اب ایٹمی ٹیکنالوجی زیادہ جدید اور ترقی یافتہ ہو چکی ہے اور تباہی اور بربادی کا دائرہ سیکڑوں میل تک وسیع ہو سکتا ہے۔ ہماری اسّی فی صد ناخواندہ قوم تو معصوم ہے بلکہ بیس فی صد پڑھے لکھے افراد میں سے بھی اکثریت ہیروشیما اور ناگاساکی میں بمباری کی نسل در نسل ہلاکت خیزی سے واقف ہی نہیں (واضح رہے کہ خواندگی کی شرح کے بارے میں سرکاری اعداد و شمار کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا)۔ لہٰذا اس وقت لوگوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ اپنی ہی موت کے جشن کا رقص کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں مجھ جیسے بزدل لوگ جو اس ہلاکت خیزی کا پورا ادراک رکھتے تھے، بلوں میں دبکے رہے اور اپنا خون جلاتے رہے۔ میں ضمیر نیازی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے "زمین کا نوحہ" مرتب کر کے مجھے اپنے غصے کے اظہار اور اپنے آپ پر ملامت کرنے کا موقع فراہم کیا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کروڑوں سال میں تخلیق پانے والے اس کرۂ ارض کو جسے ہزاروں سال سے ماہرینِ تعمیرات، سائنس داں، دانش ور، فلسفی، شاعر، ادیب، مصور اور مصلح رات دن اپنا لہو صرف کر کے، اپنی بہترین صلاحیتیں استعمال کر کے اور اپنی نیندیں، اپنا چین اور آرام نثار کر کے بناتے سنوارتے رہے ہیں جو اس نظامِ شمسی کا خوب صورت ترین سیارہ ہے اور جس پر اللہ کی محبوب ترین اور اعلیٰ ترین مخلوق بستی ہے، اس خوب صورت زمین کو چند سر پھرے

power crazy سیاست دان صرف اپنی طاقت کا زور دکھانے کے لیے جب چاہیں برباد کر دیں، نیست و نابود کر دیں، راکھ کا ڈھیر بنا دیں، انھیں یہ حق کس نے دیا ہے...؟ کیا اس کُرے پر بسنے والے انسان یہ چاہتے ہیں کہ اُن کی یہ دنیا تباہ ہو جائے؟

دھماکوں کے کچھ عرصے بعد ہندوستان کی دھان پان سی ناول نگار God of Small Things کی خالق ارون دتی رائے کا ایٹمی دھماکوں کے خلاف مضمون اجمل کمال نے ترجمہ کر کے ''آج'' میں شائع کیا۔ انٹلیکچوئل سطح پر اس بہادر ادیبہ کی یہ پہلی تحریر تھی جو میری نظر سے گزری۔ اس کا ذکر آصف فرخی نے بھی اپنے مضمون میں کیا ہے۔ اس کے کچھ عرصے بعد قطر کے ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں، دانش وروں اور شاعروں کی ایک شان دار تقریب میں ایٹمی دھماکوں کے خلاف ایک آواز سننے کو ملی۔ یہ آواز بھی ایک بھارتی ادیبہ جیلانی بانو کی تھی۔ انھیں اور انتظار حسین صاحب کو اس تقریب میں ایوارڈ دیے جا رہے تھے۔ مگر وہاں موجود پاکستان اور بھارت کے ادیبوں نے اس موضوع پر کچھ کہنا پسند نہیں کیا یا وہ بھی اپنی اپنی حکومتوں سے ڈرے ہوئے اور میری طرح بزدل تھے۔ تقریب کے بعد جیلانی بانو اور ڈاکٹر انور معظم سے ہوٹل کے کمرے میں بہت دیر تک اس موضوع پر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے ہندوستان کے ادیبوں اور دانش وروں کے ردِعمل کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ گو وہاں بھی موت کا رقص اور جشن کا جنوں پاکستان کی ہی طرح تھا، مگر اس کے ساتھ عقل و دانش اور ہوش مندی کی ایک مضبوط آواز بھی سامنے آئی تھی جو ایٹمی ہتھیاروں کی ہلاکت خیزی سے اپنے لوگوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی بلکہ ہندوستان کے دانش وروں نے اس سلسلے میں باقاعدہ نشستیں اور اجلاس منعقد کیے۔ بھارت کی ادھوری جمہوریت میں اتنی آزادی تو میسر ہے، لیکن ہم آزادیِ اظہار کی یہ عیاشی نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ ہمارے ہاں ادھوری جمہوریت بھی نہیں ہے۔ لیکن کچھ عرصے بعد انتظار حسین صاحب کا افسانہ ''مورنامہ'' پڑھا اور پھر ''ڈان'' میں اُن کے دو کالم نظر سے گزرے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ بہر حال رفتہ رفتہ ہمارے ادیب، شاعر اور دانش ور ''سچ کے خوف'' سے باہر نکل آئے اور سچ کا اظہار کرنے لگے۔ مگر یہ اظہار ادھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ ضمیر نیازی صاحب نے ان تحریروں کے انتخاب کو کتابی شکل دے کر ان بکھری ہوئی آوازوں کو یک جا کر دیا ہے۔ یہ آوازیں اب ایک طاقت ور گونج بن گئی ہیں۔ ضمیر نیازی صاحب کی مرتب کردہ اس کتاب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ Press In Chains سے لے کر ''زمین کا نوحہ'' تک ان کا عزم اپنی جگہ زندگی سے بھرپور ہے، خدا اس عزم کو تادیر توانا رکھے۔

اس ساری گفتگو میں ایک اہم کام نہیں ہو سکا، وہ ہے اس کتاب پر تبصرہ۔ مگر اس ساری گفتگو کے بعد میں اب یہ سوچ رہا ہوں کہ کتاب پر کیا تبصرہ کروں۔ یہ ساری کتاب تو بلا تبصرہ پڑھنے کی ہے۔ لہٰذا میں تبصرے کے بجائے اس کتاب کی تفصیلات آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ تین سو چالیس صفحے کی یہ

کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصے میں سب سے پہلے تو اسد محمد خان کی زہر میں بجھی طنزیہ مناجات ہے اور پھر ضمیر نیازی، خلیق ابراہیم خلیق اور آصف فرخی کے مضامین ہیں۔ آصف فرخی کا مضمون اس کتاب پر تبصرے کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور اس موضوع کا احاطہ بھی کر رہا ہے۔ ضمیر نیازی صاحب کا مضمون بہت جامع ہے اور اس موضوع پر ہندوستان اور پاکستان کی تمام صورتِ حال کو سمیٹنے کے ساتھ ساتھ ہیروشیما، ناگاساکی اور اس کے ہول ناک اثرات کو ایک بار پھر بڑے مؤثر انداز میں ہمارے سامنے لاتا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں وہ تحریریں ہیں جو پوکھرن اور چاغی دھماکوں سے قبل ہیروشیما اور ناگاساکی کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔ ان میں افسانے اور شاعری کے علاوہ ایک جاپانی طالب علم کا رپوتاژ بھی ہے جس میں ایٹمی تباہ کاریوں کی ہول ناکی بتائی گئی ہے۔ کتاب کے تیسرے حصے میں پوکھرن اور چاغی دھماکوں کے بعد لکھی جانے والی تحریریں ہیں۔ اس میں شاعری، افسانے، طنز، مضامین اور کالم سب شامل ہیں۔ یہ اس کتاب کا سب سے ضخیم حصہ ہے۔ اس حصے میں ''مورنامہ'' کے علاوہ ''خواب ہارا ہوا آدمی'' کو اہم افسانوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ نظموں کے حصے میں فہمیدہ ریاض، احمد فراز، عذرا عباس، ذیشان ساحل، ن م راشد، مصطفےٰ ارباب اور حارث خلیق کی نظمیں اچھی ہیں۔ آخر میں اسلم فرخی صاحب کی حرفِ دعا بھی متاثر کن ہے۔ اس انتخاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں پاکستان کی مختلف زبانوں میں ایٹمی دھماکوں کے خلاف لکھی گئی تحریروں کے تراجم بھی شامل کیے گئے ہیں جن میں پشتو، سندھی، بلوچی زبان کی تحریریں بھی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب پاکستان کی ہر زبان کے لکھنے والوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ اردو میں پہلی کتاب سہی مگر آخری نہ ہو۔

☆☆

مبصر: رؤف نظامانی

دنیا کی تاریخ بربریت اور ظلم کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ جنگیں، لوٹ مار اور بے گناہ اور نہتے لوگوں کا قتلِ عام تاریخ کا حصہ ہیں۔ لیکن جہاں ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ گزشتہ دو تین صدیوں میں سائنسی اور تہذیبی لحاظ سے انسان نے جو ترقی کی ہے وہ پوری انسانی تاریخ کی ترقی سے کئی گنا زیادہ ہے، وہاں کیا اس بات سے انکار ممکن ہے کہ انسان نے اس پورے عرصے میں اپنے اور اس دھرتی کے دوسرے باسیوں کے وجود کے لیے جن خطرات کو جنم دیا ہے وہ اس پوری ترقی کی اہمیت کو ختم کر دینے کے لیے کافی ہیں۔

ایٹم کی معلومات بلاشبہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم میں اس کو جس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا اس نے اس کے خالق آئن اسٹائن کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ صدر روزویلٹ کو ایٹم بم کی تیاری کے لیے آمادہ کرنے والے اس عظیم سائنس دان نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''اگر مجھے یہ

معلوم ہوتا کہ ہٹلر ایٹم بم نہ بنا سکے گا تو میں کسی بھی صورت میں امریکا کے جوہری تحقیق کے منصوبے کی حمایت نہ کرتا۔" ایک اور موقعے پر انھوں نے کہا تھا کہ "میں نے صدر روزویلٹ کو آگاہ کر دیا ہے کہ ایٹم بم کے معاملے میں بدقسمتی ہم سب کی منتظر ہے۔" لیکن جن بوتل سے باہر نکل چکا تھا۔ اُسے دوبارہ بوتل میں بند کرنے کی صلاحیت آئن اسٹائن اور ان جیسے دوسرے سائنس دانوں میں نہ تھی۔ ہیروشیما اور ناگاساکی میں جو کچھ ہوا وہ پوری انسانی تاریخ میں کیے گئے ظلم و بربریت سے کئی گنا زیادہ ہول ناک تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تاریخ اب بھی چنگیز، ہلاکو اور تیمور لنگ کو، جن کے پاس بندوق بھی نہ تھی... سفاک، ظالم اور قاتل گردانتی ہے، لیکن ہیروشیما اور ناگاساکی میں کی گئی کارروائی کو فتح حاصل کرنے کا ایک وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے ایٹم بم ایک نفرت آمیز انسانیت دشمن ہتھیار کے بجائے طاقت، عزت اور وقار کا ایک نشان بن گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے رہنما امریکا نے دنیا کے لیے مستقبل کا تعین کر دیا تھا۔ جوہری طاقت کا حصول ہر ملک کا آدرش بن گیا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مستقبل چنگیز اور ہلاکو کی طرح اس بات پر بھی اپنا فیصلہ صادر کرے گا۔ لیکن اہم سوال یہ ہے کہ کیا دنیا کو کئی مرتبہ تباہ کرنے والے جوہری ہتھیاروں کی موجودگی میں ایسے کسی مستقبل کی توقع کی جاسکتی ہے؟

کیا جنگ، تباہی، بربادی اور طاقت کا حصول انسان کی سرشت میں داخل ہے؟ کیا انسان اب تک چیر پھاڑ اور خون خرابہ کرنے کی حیوانی خصلتوں سے نجات نہیں پاسکا ہے؟ لیکن اس سوال کا جواب اس سوال سے بھی دیا جاسکتا ہے کہ انسانی تاریخ میں جو کچھ ہوا ہے اُس کا تعین کرنے میں عام آدمی کا کیا کردار رہا ہے؟ وہ چاہے فوج کا سپاہی رہا ہو یا عام شہری، بدقسمتی ہمیشہ اس کے ساتھ رہی ہے۔ فیصلے کا اختیار ہمیشہ طاقت ور اور دولت مندوں کے ہاتھوں میں رہا جو مزید دولت اور مزید طاقت کی تگ و دو میں کسی بھی حد تک جانے کو تیار رہے ہیں۔

لیکن اس سب کچھ کا الزام تحقیق، دلائل اور مباحث کی بنیاد پر ہمیشہ پوری انسانیت پر رکھا جاتا رہا ہے۔ ڈارون نے جب "Survival of The Fittest" کا نظریہ پیش کیا تو اُس کا اطلاق اور سب چیزوں کے علاوہ انسانی سماج پر بھی اسی طرح کر دیا گیا۔ انسانی سماج اور اس میں موجود اداروں کی تشکیل کا مقصد ہی سماجی نظم و ضبط کو قائم کرنا اور کم زور کو طاقت ور کے خلاف تحفظ فراہم کرنا تھا۔ لیکن جنگل کے قانون کو انسانی سماج پر لاگو کرنے کا مقصد ہی کم زور لوگوں اور کم زور ملکوں پر طاقت ور لوگوں اور ملکوں کی حاکمیت کا ایک جواز فراہم کرنا تھا۔

اس سلسلے میں ایک نظریہ یہ بھی پیش کیا جاتا رہا ہے کہ انسان، سماجی تبدیلی کی طرح جسمانی تبدیلی کے سلسلے میں بھی بہت قدامت پرست واقع ہوا ہے۔ ڈارون کی تحقیق کے بہ موجب جینیاتی طور پر بھی انسان میں دس ہزار سال کے عرصے میں ایک فی صد تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کی جینیاتی ہیئت اس وقت بھی وہی ہے جو پتھر کے دور میں تھی۔ تاریخ کے خاتمے کا اعلان

کرنے والے فکویاما نے حال ہی میں اسی بنیاد پر اپنے نظریے میں تبدیلی کی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اس بات کے باوجود کہ مذاہب، نظریات اور عقائد سماجی طور پر انسان کی تبدیلی میں ناکام رہے ہیں، لیکن اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ جینیاتی طور پر اُس میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں جو اسے نیکی کی جانب مائل کرسکیں۔ اس نظریے کا بھی حاصل یہی ہے کہ چوں کہ انسان فطرتاً لالچی، حاسد اور جنگ جو واقع ہوا ہے اس لیے دوش کسی ایک ملک یا کچھ ملکوں اور کچھ لوگوں کو نہیں دیا جاسکتا۔

اس وقت سائنس اور ٹیکنالوجی نے دنیا کو بہت مختصر کر دیا ہے۔ فاصلے سمٹ گئے ہیں اور لوگ ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں۔ لیکن دوسری جانب غریب اور امیر ملکوں اور غریب اور امیر لوگوں کے درمیان فرق پہلے سے کہیں زیادہ ہوگیا ہے۔ اس وقت اس بات کے لیے کوششیں ہو رہی ہیں کہ پوری دنیا کو سرمایہ داری کے دائرے میں لایا جائے اور اس سلسلے میں موجود رکاوٹوں کو کسی بھی طرح سے ختم کیا جائے۔ منافع اور منڈی کا حصول اس نظام کے دو اہم عنصر ہیں۔ اس لیے مختلف ملکوں کے سرمایہ داروں کے درمیان مسابقت ایک لازمی امر ہے۔ اس سلسلے میں اتحاد اور رقابتوں کی بنیاد نظریات کے بجائے اب مفادات کے حصول پر ہوگی۔ اس وقت دنیا کا کوئی بھی خطہ جوہری ہتھیاروں کی زد سے باہر نہیں ہے۔ مسابقت اور مقابلے میں مقصد دشمن کو زیر کرنا ہوتا ہے، ذریعے کا انتخاب ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کی مثال پوری دنیا کے سامنے ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان ہتھیاروں کی تیاری اور دیکھ بھال پر جو کروڑوں اربوں ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں، ان کا مقصد صرف سجاوٹ نہیں بلکہ دوستوں اور دشمنوں دونوں پر اپنی دھاک جمانا ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ چوں کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد ان ہتھیاروں کا استعمال نہیں ہوا تو اب بھی نہیں ہوگا۔ اس طرح کی بات کرنا کبوتر کی طرح آنے والی آفت سے آنکھیں موند لینے کے مترادف ہوگا۔ جوہری ہتھیاروں کی موجودگی میں انسان بلکہ اس دھرتی کے مستقبل کے متعلق بھی کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔

بھارت اور پاکستان کے جوہری دھماکوں کے بعد برصغیر کے لوگوں کے خدشات میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ اس سلسلے میں تشویش کی ایک وجہ بھارت اور پاکستان میں موجود کشیدگی ہے جس میں حال میں مزید پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ دونوں ملکوں کے بڑے شہر جہاں کروڑوں لوگ رہتے ہیں، جوہری ہتھیاروں کی زد میں ہیں۔ اس طرح وہ سرزمین جہاں دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں نے جنم لیا ہے اور جو اب تک اپنی کوکھ سے عظیم لوگوں کو جنم دیتی رہی ہے، تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنے وجود کے مٹ جانے کے خطرے سے دوچار ہے۔ اس صورتِ حال میں غربت، تعلیم اور صحت کے مسائل پس منظر میں چلے جاتے ہیں کیوں کہ یہ سبھی مسائل زندگی سے وابستہ ہیں جو خود سنگین خطرات میں گھری ہوئی ہے۔

ماضی کے مقابلے میں موجودہ دور میں ''سول سوسائٹی'' کا کردار بڑھ گیا ہے۔ مختلف خیال رکھنے والے لوگ اپنے غیر سرکاری اداروں کی تشکیل اور انفرادی طور پر اپنے خیالات کے اظہار کے ذریعے

ریاستی معاملات اور فیصلوں پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر امن کی تحریکوں نے عالمی طاقتوں کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ وہ اپنے مسائل مذاکرات کے ذریعے حل کریں اور ہتھیاروں کی دوڑ کو روکیں۔ اس وقت برصغیر میں سرحد کے دونوں جانب امن کی قوتیں موجود ہیں اور سرگرمی سے اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔ شاعر، ادیب اور دانش ور اس مہم میں ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک مثبت بات ہے کہ اس وقت جنگ کے نقاروں کے بیچ نحیف اور کم زور ہی سہی لیکن امن کی حمایت میں ایک آواز موجود ہے جو ماضی میں تقریباً نہ ہونے کے مترادف تھی۔

زیرِنظر کتاب ''زمین کا نوحہ'' اسی سلسلے کی ایک کوشش ہے۔ برصغیر میں جوہری ہتھیاروں کی دوڑ ایک الگ تھلگ یا صرف اس علاقے کا مخصوص مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ عالمی طور پر جاری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کا ایک حصہ ہے۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں شامل تخلیقات اس پورے تناظر کا احاطہ کرتی ہیں۔ سوزوکی تاکیشی کا رپورتاژ ''ہیروشیما''، شیخ ایاز کی نظم ''ہیروشیما'' اور منٹو کا ''چچا سام کے نام پانچواں خط'' وغیرہ قاری کے لیے عمومی لحاظ سے جوہری ہتھیاروں کی ہول ناکی کو پیش کرتے ہیں۔ ''پوکھرن اور چاغی'' کے عنوان کے تحت جو تخلیقات کتاب میں شامل کی گئی ہیں ان میں اس ردِعمل اور درد کا اظہار ہوتا ہے جو پاکستان کی مختلف زبانوں میں لکھنے والوں نے جوہری دھماکوں کے جواب میں ظاہر کیا ہے۔ میرے خیال میں اس کتاب کا جوہر کتاب کے مرتب ضمیر نیازی کا مضمون ''اگر ذرّے کا جگر چیریں'' ہے۔ اس مضمون کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف نے انسانی درد، ایٹم کے دریافت کی تاریخ اور اس کی اہمیت اور جوہری ہتھیاروں کے سماجی اور معاشی اثرات کا ایک synthesis پیش کیا ہے۔ بہرحال اس کتاب میں پھر بھی ایک کمی کا احساس ہوتا ہے۔ بھارت میں بھی جوہری دھماکوں اور ہتھیاروں کی دوڑ کے خلاف مختلف زبانوں کے مصنفین نے بڑے بھرپور انداز میں اپنا اظہار کیا ہے۔ کتاب کے مرتب اور اُن کے معاون ڈاکٹر آصف فرخی یقیناً ان سے ناواقف نہیں ہیں۔ میرے خیال میں کتاب میں اگر ایک حصہ بھارت کے لکھنے والوں کے لیے بھی رکھا جاتا تو اُس کی اہمیت یقیناً اور بڑھ جاتی۔ لیکن چوں کہ امن کے لیے جدوجہد ایک مسلسل عمل ہے اس لیے اس کتاب میں یقیناً مستقبل میں ترامیم اور اضافے ہوں گے اور اس بات کا امکان موجود ہے کہ اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس بات کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ سرحد کے دونوں جانب امن تحریک کے جو روابط موجود ہیں انھیں ہر طرح سے مزید مضبوط کیا جائے۔

اس بات کے باوجود بھی کہ پاکستان کے سماجی حالات اور تعلیمی تناظر کے مدِنظر کتابوں کی پہنچ بہت محدود ہے لیکن ''زمین کا نوحہ'' ایک ایسی کتاب ہے جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ سرنگ کے پار روشنی کی ایک کرن ضرور موجود ہے۔

☆☆☆

ناول / ناولٹ

قرۃ العین حیدر

کوچوان کا بگل

کمپنی بہادر کے وردی پوش کوچوان نے کوچ کا بگل بجایا۔ یہ گورا پلٹن کے مارچ کی دھن تھی اور قدیم رومن فوج کے سپاہی بجایا کرتے تھے، جب وہ برطانیہ کے حاکم تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہی برطانوی فوج میں منتقل ہوئی جب انگلستان نے عیسوی مذہب اختیار کیا۔ اب یہ دھن فوجی سپاہی برٹش انڈیا کی چھاؤنیوں اور پولیس لائنز میں بجا رہے تھے اور یہ بڑی دل آویز دھن ہے۔ برٹش میوزیم لندن کی ایک دکان میں چند سال قبل مجھے دو آڈیو کیسٹ ملے جن میں سے ایک نویں دسویں صدی عیسوی کی Viking میوزک کا تھا جو موسیقی کے مؤرخین نے قدیم نارویجین کتبے decipher کر کے کمپوز کیا تھا۔ دوسرا کیسٹ اور زیادہ قدیم تھا یعنی رومن برطانیہ کی فوجی موسیقی۔ جب میں نے یہ کیسٹ بجا کر سنا تو میں چونکی کیوں کہ اس میں بگل کی وہی دھن موجود تھی جو میں بچپن سے آج تک ہندوستان اور بعد میں پاکستان کی چھاؤنیوں میں صبح اور شام پرچم بلند کرتے اور اتارتے وقت بجائی جاتی ہے، سنا کرتی تھی اور میں حیرت میں پڑ گئی کہ سروں کا یہ قافلہ کون کون سی وادیاں، منزلیں اور فاصلے طے کرتا ہم تک پہنچا ہے۔ لکھنؤ کی پولیس لائنز میں بگل کی وہی ٹیون بجتی ہے جو لاہور پاکستان کی چھاؤنی میں سنائی دیتی ہے۔ لارنس روڈ لاہور میں صبح سویرے حمن آپا کی کوٹھی تک اس کی آواز آتی تھی۔ سر وہی ہیں، دھن وہی ہے۔ قدیم سلطنت روما مٹ گئی۔ سلطنت برطانیہ بھی غائب۔ اس سلطنت کی وارث دو ریاستیں جن کی فوجیں ایک دوسرے کے سامنے تنی کھڑی ہیں یہاں بھی دونوں طرف کے سپاہی یہی دھن بجا رہے ہیں۔ سر اٹل ہے۔ سلطان حسین شاہ شرقی کی سلطنت کا زیادہ تر لوگ نام بھی نہیں جانتے لیکن ان کے خیال برابر گائے جا رہے ہیں۔

Red Coats کو ہندوستانیوں نے لال کرتی والے پکارا۔ اسکاٹ لینڈ کے فوجی گھاگرا پلٹن کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ ہندوستانیوں نے اپنی سہولت کے لیے بہت سے انگریزی نام اردو میں ترجمہ کر لیے تھے۔ ریلوے ٹرین آگ گاڑی کہلائی۔ جنرل جرنیل بن گیا، گیریسن انجینئرز گڈھ کپتان۔

عظیم شاہراہ جرنیلی سڑک کہلائی۔ اس سڑک پر جا بہ جا ڈاک بنگلے تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ ڈاک بنگلے اس لیے کہلاتے تھے کہ کمپنی کی ڈاک لے جانے والی تیز رفتار ڈاک گاڑیاں یہاں رکتی تھیں اور ان کے گھوڑے تبدیل کیے جاتے تھے۔ ڈاک ایک مقام سے دوسرے تک پہنچانے کا یہ انتظام سب سے پہلے خلفائے عباسیہ نے متعارف کیا تھا۔ ہندوستان میں عہد مغلیہ میں بھی یہ انتظام موجود رہا۔ اٹھارویں صدی میں نواب شجاع الدولہ کا مراسلہ فیض آباد سے مرہٹہ پیشوا کے پاس سات دن میں پونا پہنچ جاتا تھا۔ انگریزوں نے اس انتظام کو مزید ترقی یافتہ بنایا۔ برٹش انڈیا کے اضلاع میں بھی ڈاک بنگلے تعمیر کیے گئے۔ سندھ میں باقاعدہ ڈاک ٹکٹ جاری ہوا جس پر Sind Dawk (سندھ ڈاک) چھپا ہوا تھا۔ کمپنی کی ڈاک کو جا بہ جا پہنچانے کے لیے جو تیز رفتار گھوڑا گاڑیاں چل رہی تھیں وہ ڈاک گاڑی کہلاتی تھیں، بعد میں جب دھوئیں کی گاڑی چلی تو اس میں بھی ڈاک لے جانے والی تیز رفتار گاڑی میل ٹرین کہلائی۔ لیکن ابھی گاڑی یعنی ریلوے ٹرین دوآبے کے علاقے میں نہ پہنچی تھی۔ میر معصوم علی چکلہ دار کی اچانک اور بے وقت موت کے بعد ان کے لواحقین کی ذمہ داری ان کے اکلوتے بیٹے میر قائم علی پر آن پڑی۔ میر معصوم کی وفات کے بعد اودھ کے قانون کے مطابق ان کی چکلہ داری ان کے بیٹے کو نہ ملی بلکہ ان کے قرضے ادا کرنے کے لیے میر قائم علی کو ان کی ساری جائداد اور املاک بھی فروخت کرنی پڑی۔ ان کے امام باڑے کے نقرئی ضریح اور سونے چاندی کے علم انھوں نے اپنے ایک رشتے دار کے امام باڑے میں منتقل کیے اور خود تقدیر آزمانے آبائی شہر سے نکلے۔ آبائی قرضے چکانے کے لیے باہمت نوجوان کا پردیس جانا بھی ایک کلاسیکل صورت حال تھی۔

پردیسی بالما syndrom اب کے ساون گھر آجا۔

میر قائم علی نے انگریزی پڑھی تھی کیوں کہ لکھنؤ میں انگریز گردی شروع ہوچکی تھی اور انگریزی رہن سہن کا چلن عام ہوگیا تھا۔ عورتیں گھر سے باہر قدم نہیں نکالتی تھیں لیکن میر قائم علی نئی روشنی کے آدمی تھے، وہ ایک غیر معمولی شخصیت رہے ہوں گے کہ ان کی زندگی کے حالات پر نظر ڈالنے کے بعد تعجب ہوتا ہے کہ وہ کس ماحول سے نکل کر کہاں جا پہنچے اور ایک بالکل غیر علاقہ اور اجنبی طرز معاشرت میں بھی اپنی جگہ بنائی۔

چناں چہ میر صاحب اپنی بیوی امراؤ بیگم اور بچوں کو لے کر کان پور پہنچے۔ دریا کے کنارے ایک بے حد قدیم کوٹھی میں قیام کیا۔ برسات کی جھڑی لگی تھی۔ امراؤ بیگم اور ان کے تین چار بچے ایک کمرے میں سو رہے تھے۔ میر صاحب اور ان کا سب سے بڑا لڑکا میر مظہر علی برآمدے میں سوتے تھے۔ ایک رات طوفانی بارش میں اس کمرے کی چھت گر گئی اور امراؤ بیگم اور ان کے خورد سال بچے ملبے میں دب کر مر گئے۔ محض مظہر علی باقی بچے۔ میر قائم علی لڑکے کو ساتھ لے کر مراد آباد آئے تاکہ پرورش کے لیے اس کو اس کے ننھیال میں چھوڑ دیں۔ یہاں انھوں نے اپنی سسرال والوں کے گھر کے نزدیک ایک مکان

تعمیر کروایا جس کے برآمدوں کے ستون نہایت سبک، محرابیں خوب صورت، دالان اور صحنچیاں ہوادار تھے (یہ مکان اب بھی موجود ہے اور محل سرا کہلاتا ہے) میر قائم علی نئے زمانے کے آدمی تھے، اس مکان پر اکتفانہ کیا، کچھ فاصلے پر انگریزی وضع کی کوٹھی بنوائی۔ اونچی کرسی، ڈاٹ کی چھتیں، اینٹوں کا فرش، وسیع کمرے۔ سامنے کا کمرہ بیضوی یعنی اس کے سامنے کا حصہ آدھا گولائی لیے ہوا تھا اور اس کے گرداگرد برآمدہ تھا۔ کمپنی کی کوٹھیوں کا یہ گول کمرہ میرا ذاتی خیال ہے سب سے پہلے کمپنی کے یورپین تاجر جو بہار، بنگال اور شمالی ہند میں آئے انھوں نے شہر سے باہر اپنے تجارتی مال یعنی نیل کے اسٹور روم کی حیثیت سے بنوائے ہوں گے۔ جس طرح بنیے کے اناج کا کمرہ کوٹھا کہلاتا تھا اور ساہوکار کا بینک کوٹھی، اسی طرح فرنگیوں کی تجارتی عمارتیں بھی کوٹھی کہلائی ہوں گی جہاں وہ اپنا خام مال بھی گوداموں میں رکھتے تھے۔ ان کوٹھیوں کا طرزِ تعمیر کمپنی اسٹائل کہلایا۔ زیادہ تر جارجیین یا نیو کلاسیکل (Neo Classical) یعنی یونانی اور رومن وضع کے پیل پائیوں والے برآمدے venetian جھلملوں والی کھڑکیاں۔ یہ طرزِ تعمیر یوپی، بہار اور پنجاب کی پرانی کوٹھیوں میں اب بھی نظر آجاتا ہے۔ دوسرا طرزِ تعمیر ''پرتگالی کولونیل'' تھا۔ یہ اسلامی اسپین کا اسٹائل تھا جو پرتگالی اپنے ساتھ گووا لائے اور وہاں سے یہ برطانوی ہند میں رائج ہوا۔ یہ نیچی کرسی اور گول محرابوں والے برآمدے پر مشتمل تھا۔ ہسپانیہ کا عرب طرزِ تعمیر کہاں سے کہاں آ پہنچا۔ اول الذکر اسٹائل اٹھارویں صدی کے انگلستان میں رائج تھا۔

میں اب بھی یوپی کے چھوٹے چھوٹے اضلاع میں جاتی ہوں تو درختوں میں چھپی ان کمپنی اسٹائل کوٹھیوں کو دیکھتی پھرتی ہوں جو اب گرتی جارہی ہیں۔ کیوں کہ عام طور پر ہم لوگ فنِ تعمیر سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے جب کہ اسی طرز کی کولونیل نیوکلاسیکل دومنزلہ رہائشی مکانات جو اسی زمانے میں ریاست ہائے متحدہ امریکا اور انگلستان میں تعمیر کیے گئے، ان کو بہت ہی احتیاط سے محفوظ کیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں یہ عالم ہے کہ میں نے سنا ہے، فیض آباد میں نواب شجاع الدولہ کا بنگلہ اتنا شان دار تھا کہ فیض آباد بنگلہ ہی کہلانے لگا۔ لکھنؤ میں روشن الدولہ کی تاریخی کچہری حال ہی میں سرکاری طور پر منہدم کی گئی ہے اور یہ بھی اتنی مضبوط اور پختہ تھی کہ بلڈوزر اور مشینوں کے ذریعے اس کو گرایا گیا۔ اپنے تہذیبی ورثے سے بے اعتنائی ہمارے ترقی پسندوں کی بھی دین تھی کیوں کہ جس زمانے میں ہمارے یہاں ذہنی جاگرتا کا آغاز ہوا وہی بائیں بازو کے نظریہ سازوں کا بھی دور تھا جنھوں نے اس سارے ماضی کو محنت کش طبقے کا دشمن قرار دیا۔ اس نئی طرزِ فکر کا منشور ساحر کی وہ نظم ''تاج محل'' تھی۔ لہٰذا افسانوی ادب میں اگر محلات، کوٹھیوں، بنگلوں اور ان کی طرزِ آرائش کا ذکر آیا تو ناقابلِ معافی سمجھا گیا۔ مغرب کے فکشن کے ذریعے ہی وہاں کی سماجی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ ہمارے یہاں تقریباً یہ ناممکن ہے۔ بنگالی اور مراٹھی ناولوں میں اس صدی کے اوّلیں برسوں کی سماجی تصویر کشی بہ آسانی مل جائے گی۔ ہمارے ناولوں میں ایسے اشارے موجود ہیں لیکن ان کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں دی، مثلاً اکبری بیگم والدہ افضل علی اور نذر سجاد حیدر کے

ناولوں سے بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ شمالی ہند کا نیا ترقی یافتہ طبقہ کیا سوچ رہا تھا اور کس طرح کی زندگی گزار رہا تھا۔ اسی طبقے یعنی نئی اپر مڈل کلاس نے ملک کی سیاسی قیادت سنبھالی اور وہ تمام تعصبات، تحفظات اور ترجیحات ساتھ لے کر سیاست میں شامل ہوا اور جن کا نتیجہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہمیں نہ ان محرکات اور تعصبات کے تجزیے کرنے کی فرصت ہے نہ دلچسپی۔ دونوں فرقے دو ایسے بیل ہیں جو اپنے اپنے رہٹ کھینچتے اپنے اپنے دائرے میں گھوم رہے ہیں۔ کبھی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں یا پھر الگ الگ چلنے لگتے ہیں۔

میر قائم علی نے ۱۸۵۴ء کے مرادآباد میں جو کمپنی اسٹائل عالی شان کوٹھی بنوائی تھی، اس میں ان کی آل اولاد اور اگلی پیڑھیوں کو رہنا نصیب نہیں ہوا۔ جب میر قائم علی کی جائداد کا ان کے پوتے پوتیوں میں بٹوارہ ہوا، یہ کوٹھی اور ایک دوسری کوٹھی جو انھوں نے گورداس پور میں بنوائی تھی، اماں کے حصے میں آئی۔ مرادآباد والی کوٹھی عموماً خالی پڑی رہتی تھی کیوں کہ اس زمانے میں اپنا مکان کرائے پر اٹھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ پھر کسی نے اس پر قبضہ مخالفانہ کرلیا۔ اماں نے اس پر مقدمہ دائر کر دیا جو برسوں چلا اور اماں نے خالص فیوڈل انداز میں وہاں جاکر اس شخص کا سامان باہر پھنکوا دیا اور اس کو بھی باہر نکلوایا۔ ایک مقدمہ اماں کا گورداس پور میں بھی جائداد کے سلسلے میں چل رہا تھا۔ یہ مقدمے بازی شرفا کا ایک مرغوب مشغلہ تھا۔ اماں کی طرف سے پیروی ان کے چچازاد بھائی سید آل حسنین کرتے تھے جو علی گڑھ سے لا گریجویٹ تھے۔ ان کی لا کی پریکٹس بھی گویا ایک تہذیبی مشغلہ تھی۔ وہ برٹش انڈین آرمی کی ریزرو فورس میں کیپٹن ہو گئے تھے اور بیش تر وقت میرٹھ چھاؤنی میں گزارتے تھے۔ ان کی شادی ان کی ایک کزن سے ہوئی تھی جو نواب محمود پور کی بیٹی تھیں اور نواب صاحب بھی اماں کے اور حسنین ماموں کے کزن تھے۔ ان کے بڑے بھائی نواب عاشق حسین ایم ایل سی تھے۔ ان کے ایک اور کزن نواب حامد علی خاں کلکتے والی گوہر جان کا مجرا اپنے یہاں کرواتے تھے۔ وہ ایک نہایت لیجنڈری خاتون تھیں اور کہا جاتا ہے سات زبانوں میں گانا گاتی تھیں۔

میر قائم علی ایک روز اپنی نوتعمیر کوٹھی کا معائنہ کر کے خوش خوش محلہ سادات لانگڑی اپنی محل سرا میں آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے سالے میر یعقوب علی تلوار سونتے اپنے دروازے پر کھڑے ہیں۔ انھیں لگائی بجھائی کرنے والوں نے یقین دلا دیا تھا کہ میر قائم علی اب لکھنؤ واپس نہ جانے کے۔ وہاں کے حالات دگرگوں ہیں۔ چناں چہ میر قائم علی یہیں رہیں گے اور لانگڑی میں بھی حصہ داری کا دعویٰ کریں گے کیوں کہ قدیم دستاویزوں کے مطابق لانگڑی میں پانچواں حصہ ان کا بھی نکلتا تھا۔ میر قائم علی کو دیکھتے ہی میر یعقوب علی نے للکار کر کہا، قائم علی لانگڑی سے لادعویٰ لکھ دو ورنہ میں تمھارے بیٹے کا سر قلم کرتا ہوں۔ میر قائم علی نے آہستہ سے جواب دیا، میاں کسی کا سر قلم نہ کرو، قلم دوات منگواؤ۔ انھوں نے لادعویٰ لکھا اور بولے اچھا بھائی خدا حافظ۔ لکھنؤ کے بعد اب مرادآباد بھی چھوٹا ہم سے۔ اب ہم یہاں کبھی نہ

آویں گے۔ بہ قول حسنین ماموں، میر قائم علی کے منھ سے جو بات نکلی اللہ تعالیٰ نے اسے پورا کیا۔ وہ یہاں سے ایسے نکلے کہ لکھنؤ اور مرادآباد کبھی واپس نہ آئے۔ میر یعقوب علی سے اس ڈرامائی گفتگو کے بعد میر قائم علی فوراً پالکی میں بیٹھے اور کلکٹر ضلع کے یہاں پہنچے اور اس سے کہا، آپ میرا تبادلہ کسی دور دراز علاقے میں کرا دیجیے۔ کلکٹر ایک دو منٹ سوچتا رہا پھر بولا ویل میر صاحب آپ پنجاب جائیے گا۔ انھوں نے کہا، بالکل جاؤں گا اور مجھے پنجاب چھوڑ برما بھیج دیجیے، میں وہاں بھی چلا جاؤں گا۔ کلکٹر نے کہا، پنجاب میں ہم نہریں کھدوا رہے ہیں اور ہمیں اس صوبے کے administration کے لیے قابل اور انگریزی داں نوجوانوں کی ضرورت ہے۔

لانگڑی والوں کے مکان کے سامنے وسیع قطعۂ زمین چوک کہلاتا تھا۔ رات کو چوک کا بڑا پھاٹک بند کر دیا جاتا تھا۔ میر قائم علی کی محل سرا بھی اس چوک کے اندر تھی۔ جب وہ صبح صبح گھر لوٹے تو اچانک ایک تہلکہ مچ گیا۔ پتلا چلا سرکاری سپاہی باہر کھڑے ہیں۔ ایک آدمی نے سامنے آکر کہا، صاحب کلکٹر بہادر نے میر قائم علی کو سلام بولا ہے۔ دکڑی بھیجی ہے۔ میر صاحب نے کہا، اب یہ کون نئی آفت آئی۔ وہ لکھنؤ سے نکلنے کی صعوبتوں کو ابھی تک نہیں بھولے تھے۔ برقنداز کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے محلے سے باہر نکلے۔ اب سارا محلہ مغل پورہ اوّل میں غل مچ گیا کہ میر قائم علی کو کلکٹر صاحب کے سپاہی پکڑ کر لے گئے۔ ابھی ہندوستانی نہتے نہیں کیے گئے تھے، تلوار اور بندوق سب کے پاس تھی۔ محلّے کے چند نوجوان تلواریں سونت کے باہر نکلے۔ نیم تلے مسکوٹ ہوئی، طے کیا گیا کہ سادات لانگڑی کی عزت کا سوال ہے۔ انگریزی سرکار کے سپاہی آج تک اس پھاٹک کے اندر نہیں آئے تھے، کلکٹر صاحب کو دیکھتے ہیں۔ اتنے میں میر قائم علی شاداں و فرحاں واپس لوٹے۔ ایک خلعت زیب تن تھی ہاتھ میں قلم دان۔ کمپنی کی حکومت نے خلعت اور قلم دان کی مغلیہ رسم باقی رکھی تھی۔ میر صاحب نے فرمایا، او بھئی ہم کو تو کلکٹر صاحب نے متصدی بنا دیا ہے (راقم الحروف نے حسنین ماموں سے پوچھا کہ منشی متصدی کا محاورہ تو ہمارے یہاں اونی درجے کے سرکاری ملازموں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ماموں نے کہا، ہاں۔ لیکن چند روز بعد ہی ان کو تحصیل دار نامزد کیا گیا جو اس زمانے میں نیٹو کے لیے بہت بڑا عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ تحصیل دار مجسٹریٹ درجۂ اوّل کا کام کرتا تھا اور انکم ٹیکس بھی وہی لگاتا تھا)۔

میں اور سلو شجرحیات کے ایرانی قالین پر بیٹھے حسنین ماموں سے قصہ سن رہے تھے۔ ماموں سلو سے کہنے لگے، اگر تم ذرا سرک کے اس دوسری شاخ پر بیٹھ جاؤ تو شجرحیات کی سمبل ازم مکمل ہوجائے۔ انھوں نے سلو سے کہا تم بھی یعقوب علی کی پڑپوتی ہو اور ہم لوگ میر قائم علی کی نسل سے ہیں۔ آہا! میں نے کہا۔ میر یعقوب علی جو اپنے بھانجے کو مارے ڈال رہے تھے، سلو نے پوچھا۔ ہاں، ماموں نے جواب دیا۔ یہ فیوڈل سماج کی ایک خصوصیت تھی۔ بات بے بات تلوار نکل آتی تھی۔ آخر یورپ میں بھی تو لوگ ذرا سی بات پر ڈوئیل لڑنے لگتے تھے، ماموں نے اطمینان سے پیچوان گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

لفظ فیوڈل کا مطلب ہی ہے جنگی لڑائی۔ جھگڑنے والا feud کرنے والا۔ انھیں میر یعقوب علی کی پڑپوتی سلو چند روز بعد ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مانچسٹر جانے والی تھیں۔ یہ کوئٹہ چھاؤنی تھی اور موسم بہار کا ایک دن۔ ایران اور بلوچستان میں بہار جس شدت سے آتی ہے اور کہیں نہیں آتی۔ سارا لینڈ اسکیپ کسی ایرانی شاعر کا یا عزیز بانو کے پڑدادا خواجہ عزیز لکھنوی کا قصیدۂ بہاریہ میں تبدیل ہو جاتا۔ پھر اچانک موسم گل غائب اور شجر حیات پر چہچہاتے پرند بھی اڑ جاتے ہیں۔ اس وقت تو شجر حیات کے کنارے بیٹھے حسنین ماموں کو بھی پرواز کرنے میں پچیس چھبیس سال باقی تھے۔ ان کی والدہ مرادآباد میں رہتی تھیں اور ہجرت پر آمادہ نہیں ہوئی تھیں۔ یہ فوج میں تھے اس لیے انڈیا نہ جاسکتے تھے۔ تقسیم شدہ خاندانوں کے المیے کے نقوش رفتہ رفتہ واضح ہوتے جا رہے تھے۔ اب مجھے کوئٹہ چھاؤنی کے اس حسین بنگلے میں بیٹھے بیٹھے اٹاری کے اس نیم تاریک زینے کا خیال آیا جس کی سیڑھیاں تین سو برس میں گھستے گھستے تقریباً سپاٹ ہو چکی تھیں۔ بہت ممکن ہے کہ حسنین ماموں کی والدہ جب اس دنیا سے رخصت ہوں تو وہ مکان بھی ڈھ جائے یا اس کو منہدم کر کے اس کی جگہ نئی عمارت بن جائے گی۔

میر قائم علی کی کوٹھی آزادی کے کئی سال بعد تک موجود رہی پھر بہ طور متروکہ جائداد اس کے شرنارتھی مالکوں نے اسے گرا کر وہاں نئی عمارت کھڑی کر لی۔ اس کے شاگرد پیشہ کی جگہ دکانوں کی قطار نظر آئی جس کے ہر دروازے کے پاس شیشے کے شوکیس میں ایک ایک قد آدم ڈمی ساڑی پہنے کھڑی تھی۔ چند کھڑکیوں میں مرادآبادی برتن رکھے تھے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل شاگرد پیشے کے اوپر کے کمرے کرائے پر اٹھائے جاتے تھے اور ان میں سے ایک کمرے میں رئیس امروہوی رہا کرتے تھے، (پھر اچانک نیا ملک بنا، اس کے شہر کراچی میں ایک گم نام قاتل نے رئیس امروہوی کو اپنی گولی کا نشانہ بنا دیا)۔ شاگرد پیشہ بھی اردو کی ایک ایسی اصطلاح ہے جسے لوگ اب نہیں سمجھتے۔ جس طرح پیل پائے یعنی گول ستون بھی اب ایک غیر مانوس لفظ ہے۔

میر قائم علی کی یہ ساری urban estate بھی سرکار کی تحویل میں چلی گئی۔ اس فاصلے سے دیکھا جائے تو میر قائم علی کی اتنی بڑی جائداد کا دراصل وارث کوئی نہ تھا۔ جب انھیں کلکٹر ضلع نے پنجاب بھیجا تو انھوں نے وہاں بہت نام پیدا کیا۔ بہ حیثیت ایک ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر گورداس پور انھوں نے وہاں زیر تعمیر بڑی دوآب کنال کا انتظام سنبھالا اور مسٹر پرنسپ کے ساتھ مل کر پنجاب کے Revenue Laws بنائے اور اس میں ایک ایسی شق رکھی جس کی رو سے پنجاب کا کسان مہاجن کے چنگل سے بچ گیا۔ اس قانون کی وجہ سے وہ پنجاب میں بے حد ہر دل عزیز ہوئے۔ انھوں نے خان بہادر اور سی آئی ای کا خطاب بھی حاصل کیا (یعنی کمانڈر آف دی انڈین امپائر)۔ اپنی وفات کے بعد وہ فری میں پیر بن گئے۔ ان کے مزار پر ہری جھنڈیاں لگ گئیں، قوالیاں شروع ہوئیں اور عرس ہونے لگا۔ گویا دنیا بھی ملی اور دین بھی۔ انھوں نے گورداس پور میں ایک بہت بڑی کوٹھی بنوائی تھی۔ اناں اس کی بھی وارث تھیں۔

اس پر بھی ایک مقدمہ چل رہا تھا۔ امّاں جب اس مقدمے کے سلسلے میں گورداس پور گئیں اور انھوں نے پیر قائم علی شاہ کی قبر پر میلا سا لگا دیکھا تو انھوں نے بہ حیثیت مصلح قوم وہیں کھڑے ہوکر ایک عدد تقریر جھاڑ دی کہ آپ لوگ اس بدعت کو فوراً ختم کیجیے۔ میر قائم علی قطعی کوئی پیر ویر نہیں تھے ورنہ میں جوان کی پڑپوتی یہاں کھڑی ہوں، میں نے ان کی کرامتوں کے قصے ضرور اپنے بزرگوں سے سنے ہوتے۔ لیکن امّاں کی ان نصیحتوں کا پیر کے معتقدین پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا بلکہ انھوں نے اظہار افسوس کیا کہ بے پردہ پیرزادی بے دین بھی ہو چکی ہے۔ پیر صاحب کے مزار کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اس کی خاک کالی کھانسی کے مریض بچوں کو چٹائی جاتی ہے تو وہ تن درست ہو جاتے ہیں۔

امّاں سرسیّد کی تربیت یافتہ عقلیت پسند نسل سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے برعکس میں سمجھتی ہوں کہ ہم نے اپنی پرانی روایات اور اعتقادات کو مسترد کر کے کسی دانش مندی کا ثبوت نہیں دیا۔ کیا پتا وہ سب بھی ہو...!
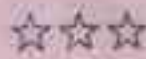
☆☆☆

قرۃ العین حیدر

کاٹھ کا عبدل

لفظ bearer سے بیرا۔ بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پالکی برادر یعنی palanquin carrier کو bearer کہتے تھے بعد میں یہی "صاحب لوگ" کا ذاتی ملازم بیرا بن گیا جو ان کے کپڑوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور ان کا روپیہ پیسا بھی اس کی تحویل میں رہتا تھا۔ بنگال میں بیرا ایک خانگی ملازم یا سردار کہلاتا تھا جو انگلش جنٹل مین اپنی پالکیوں پر سوار ہوتے تھے ان کے کہار palanquin bearer کہلاتے تھے۔ لکھنؤ میں بھی پالکی "صاحب لوگ" کی تیز رفتار سواری تھی۔ بنگال میں بیرا یا valet یعنی صاحب لوگ کا خدمت گار ذات کا کہار ہوتا تھا۔ اس کے باپ دادا بھی فرنگیوں کی پالکی اٹھاتے تھے۔ پالکی چار یا چھ کہار اٹھاتے تھے۔ کوٹھی یا بنگلے پر کم از کم چار پالکی بردار ملازم ہوتے تھے۔ سردار bearer پالکی برداروں کا سردار تھا۔ اس کے ماتحت آٹھ یا دس کہار ہوتے تھے۔

اب سوچنے کی بات ہے کہ غازی پور میں ہمارے عبدل جو محض سردار کہلاتے تھے دراصل ان کا عہدہ سردار bearer کا تھا اور اب پالکیوں کا زمانہ گزر چکا تھا اور عرصے سے موٹریں چل رہی تھیں لیکن کوٹھی کا وہ ملازم جو صاحب کے لباس کی دیکھ بھال کرتا تھا، اب بھی محض سردار کہلاتا تھا اور لفظ bearer عام بیرا بن گیا تھا جسے آج تک ہوٹلوں کا بیرا پکارا جاتا ہے۔ اس لفظ بیرے کا سلسلۂ نسب دراصل پالکی bearer سے جا کر ملتا ہے۔

امبوا تلے ڈولا رکھ دے کہروا آئی ساون کی پھوہار

یہ بڑے گانے بجانے والے لوگ تھے۔ ان کی ایک تال ہی تال کہروا کہلائی۔ پالکیاں غائب ہوئیں، کہار گاڑی بان، کوچوان بن گئے۔ میرے بچپن تک پرانے لکھنؤ کی گلی کوچوں میں ڈولیاں اور چوپہلے چل رہے تھے۔ اماں جب محرم کی مجالس میں جاتیں تو موٹر کار باہر سڑک پر چھوڑ دی جاتی۔ فوراً چوپہلے والے لپکے ہوئے آتے۔ اماں اندر پردے میں بیٹھتیں، حالاں کہ انھوں نے کبھی پردہ نہیں کیا تھا۔ لیکن شہر کے اندر وہ اس رسم کو نبھاتی تھیں اور میں پردے سے باہر منھ نکال کر گلی کوچوں کی سیر کرتی جاتی

تھی۔ وہ یقیناً سرور اور سرشار کا لکھنؤ اب تک موجود تھا۔ عرفان منزل جہاں اماں عموماً مجلسوں کے لیے جاتیں (میں نے مکان کا نام اس مضمون کے لیے تبدیل کر دیا ہے)، ایک وثیقہ دار بیگم صاحب کی ملکیت تھی۔ وہ بیوہ تھیں اور ان کی ایک ہی لڑکی تھی جو بہت کم سن نہیں تھی لیکن اب تک اس کی شادی نہ ہو سکی تھی۔ اس لڑکی کی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے پرائیویٹ طور پر سینئر کیمبرج پاس کیا تھا۔ وہ بہت خوش شکل خاتون تھیں۔ ہمارے ایک ماموں کے لیے بھی اس کی نسبت کی بات چیت چلی لیکن یہ لوگ ماموں کو گھر داماد بنانا چاہتے تھے۔ جس کے لیے وہ مرحوم ہرگز تیار نہ ہوئے۔ اسی محل سے ملحق ایک اور وسیع مکان تھا جو ہمارے ایک ننھیالی عزیز کی ملکیت تھی۔ اس کے بعد ایک اور مکان نواب یوسف کی حویلی کہلاتا تھا۔ نواب یوسف کی والدہ یوریشین تھیں اور ان کے والد کلکتے کے نواب سید احمد علی تھے اور دادا نواب مظفر جنگ نائب ناظم بنگال، بہار، اڑیسہ تھے، جن کے نام پر شہر مظفر پور بسایا گیا تھا۔ نواب احمد علی نے جنرل لارڈ رابرٹ کی بہن مارگریٹ سے شادی کی تھی۔ ان کا اسلامی نام اشرف النساء بیگم رکھا گیا تھا۔ نواب احمد علی کا ایک مکان کنزنگٹن گارڈن لندن میں بھی تھا، جہاں وہ ہر سال جاتے رہتے تھے۔ یہ ایک بے حد تاریخی قسم کا خاندان تھا۔ ان کی شادیاں ٹیپو سلطان کے گھرانے میں ہوتی تھیں۔ دراصل کلکتے میں فاتح انگریزوں کے معزول کیے ہوئے سلاطین کے تین خاندان آباد تھے۔ ایک تو یہی واجد علی شاہ کا خاندان، دوسرا بہار کے نواب مظفر جنگ کی اولاد اور تیسرے ٹیپو سلطان کے نام لیوا۔ ان تینوں گھرانوں کی آپس میں شادیاں ہوتی رہتیں۔ آمدنی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی لیکن نئی نسل میں پڑھ لکھ کر کسی نے نہیں دیا۔ سب پدرم سلطان بود کا ورد کرتے رہے۔ ایک بار جب میں کلکتے گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ ٹیپو سلطان کی نسل سے دو لڑکے کلکتے میں رکشا کھینچ رہے ہیں۔ تب میں نے کہیں لکھا تھا کہ راجا رام موہن رائے اور ٹیپو دونوں ہم عصر تھے۔ ٹیپو کی اولاد کلکتے میں رکشا کھینچ رہی ہے جب کہ راجا رام موہن رائے کی قوم نے اس شہر میں زمین کے نیچے انڈر گراؤنڈ ریلوے چلا دی۔ عبرت!! عبرت! تبھی میں نے کلکتہ کلب یا شاید بنگال کلب میں ایک پرانا پرنٹ دیکھا تھا جو کھانے کے کمرے میں بہت اونچائی پر آویزاں تھا۔ لہٰذا بہت کم لوگوں کی نظر اس پر پڑتی تھی یا اگر کلب کے براؤن صاحب لوگ اسے دیکھتے بھی تو کیا فرق پڑتا۔ اس تصویر میں نواب مظفر جنگ ہاتھی کے ہودے پر سے جھک کر لارڈ کلائیو کو بنگال کے دیوانی حقوق کی دستاویز بخش رہے ہیں۔ میں پہلے بھی کہیں لکھ چکی ہوں کہ کمپنی کے متعصب مصور نے اس تصویر میں نواب مظفر جنگ کو بالکل سیاہ فام دکھلایا ہے حالاں کہ وہ ایران النسل گورے چٹے آدمی تھے۔ ان کی اولاد آج تک بہت صاف رنگت رکھتی ہے۔ لیکن فاتح قوم کا مصور مفتوح کو ہمیشہ کم تر دکھلاتا ہے۔ چناں چہ ہندوستان کے ہمایوں بادشاہ کو ایران کے شاہ طہماسپ صفوی کی طرح کالا اور کوتاہ قد دکھلایا گیا ہے۔ میری دوست اور ٹائمز آف انڈیا بمبئی کی پرانی رفیق کار ایلا دتا اور اس کا شوہر میرے ہمراہ اس کلب میں گئے تھے۔ مسٹر بنارجی پام دت کے بھتیجے تھے گویا راجا رام موہن رائے کے بنگال کے وارث۔ چگی داڑھی والا

بیرا جس نے ہمیں کلب میں کھانا سرو کیا، مسلمان تھا۔ گویا دہرہ دون کے کشتی بردار پوربی بیرے کاٹھ کے عبدل کا نمائندہ۔ اس طرح گویا اس وقت پچھلی تین صدیوں کی نمائندگی بنگال کلب کے اس دیوان طعام میں ہو رہی تھی۔ ابھی چند ماہ قبل کراچی میں اپنے ایک کزن کے ساتھ سندھ کلب (یا شاید کراچی کلب مجھے اچھی طرح یاد نہیں) گئی تو وہاں کا ماحول اور فضا اب تک ہو بہو وہی پائی جو ہندوستان میں انگریزوں کے قائم کیے ہوئے ان اپر کلاس کلبوں میں برقرار ہے۔ کلاس سسٹم کا یہ استحکام اور پائداری حیرت انگیز ہے۔ مزید برآں اگر ہندوستان کے ان کلبوں کا کوئی ممبر کراچی یا لاہور جم خانے میں شام گزارے تو اسے قطعی کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوگی۔ اصل چیز کلاس ہے، نہ مذہب اور نہ ملک۔ مان جائیے بھئی۔

بیرے کے علاوہ دوسرا ملازم خدمت گار بھی تھا جو میز پر کھانا پیش کرتا تھا اور انگریزی ٹیبل کے تمام قاعدے قانون سے واقف تھا۔ ہمارے یہاں عبدل خدمت گار اور بیرا دونوں کا کام کرتے تھے۔ وہ سفید اچکن پہن کر اور صافے پر پتلی اسی طرح کی پٹی آڑی لگا کر جس کے اوپر چاندی کا S.H (یعنی سجاد حیدر) کا مونوگرام لگا ہوا تھا، باندھ کر بڑی تمکنت سے پکن انگلش بولتے ہوئے مہمانوں کو لنچ سرو کرتے تھے۔ عبدل گول مٹول پرسکون چہرے والے پوربیے تھے اور ان کی شکل پر وہی شانتی برستی تھی جو ان کے ہم وطن مہاتما بدھ کے چہرے پر نظر آتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر مرزاپور کے عبدل کسی طرح بھی رام پور یا بریلی کے جنگجو ماحول میں خوش نہ رہتے۔ ان کے برعکس اباں کے ریزیڈنٹ استاد یوسف خاں صاحب خالص رام پوری تھے۔ عبدل کی مونچھیں چینی انداز میں نیچے کو جھکی ہوئی تھیں جب کہ استاد کی نوکیلی مونچھیں اوپر کو تھیں۔ لیکن ان کی مونچھوں کی شان ہی الگ تھی۔ ان کی مونچھوں سے خان صاحبی ٹپکتی تھی۔ حالاں کہ خود استاد بڑے نرم مزاج انسان تھے۔ رام پور کے ریاستی ماحول نے ان کا مزاج درباری بنا دیا تھا۔ استاد شاعر بھی تھے، لیکن جب وہ اپنی تنخواہ بڑھانے کی درخواست (ان کو پچاس روپیہ مع کھانے کے ملتا تھا اور کھانا اور چائے بڑے اہتمام سے عبدل خود لے جا کر ان کے کمرے میں ان کو پیش کرتے تھے) بہ طور قصیدہ لکھ کر اباجان کی میز پر رکھ آئے تو اباجان بہت ناخوش ہوئے چوں کہ ہمارے گھر کے جمہوریت پسند ماحول سے یہ قصیدہ خوانی لگا نہ کھاتی تھی۔ ہمارے پڑوس میں رام پور کے ایک صاحب زادہ صاحب فروکش تھے جو نواب رام پور کے قریبی عزیز تھے۔ ان کی لڑکی میری ہم عمر تھی۔ جب ان کے نوکر کہتے، صاحب زادی جاگ گئی ہیں، صاحب زادی کھیل رہی ہیں یا صاحب زادی رو رہی ہیں تو مجھے بڑا عجیب سا لگتا۔ کیوں کہ میں تو محض بی بی یا بٹیا کہلاتی تھی۔ گو پورٹ بلیر کے بے حد برطانوی کولونیل ماحول میں جو بالکل سمرسٹ ماہم کا ماحول تھا، ہمارے ملازم مجھے مسی بابا پکارتے تھے۔ بھائی کو ہمارے پرانے ملازم امیر خاں آج تک بابا پکارتے رہے۔ میں نے ایک دن اباجان سے اپنی ہم جولی کے متعلق پوچھا کہ وہ صاحب زادی یا شہزادی کیوں کہلاتی ہیں؟ اباجان نے جواب دیا کہ یہ ان کے یہاں کا دستور ہے۔ گو ہمیں اپنے حسب و نسب پر کبھی غرور نہیں کرنا چاہیے۔ فخر کا مقام محض وہ ہوتا ہے

جب آپ دوسروں کے لیے کچھ کر سکیں اور وہ بھی بغیر نام و نمود کی پروا کیے یا آپ کسی ہنر میں مہارت حاصل کریں، جیسے ہمارے استاد یوسف خاں بھی ایک ہنر مند انسان ہیں۔ لیکن ہنر مندوں کو ان کی قابلیت کے مطابق شہرت یا دولت نہیں ملتی۔ استاد بے چارے بھی تو ہمارے یہاں گم نام پڑے ہوئے ہیں۔

Creative آرٹسٹوں کی زندگیاں اور ان کے المیوں کے بارے میں تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا۔ ہمارے استاد یوسف خاں نہ ہی افیم کھاتے تھے، شراب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پنج وقتہ کے نمازی تھے۔ پابندی سے بال بچوں کو ہر مہینے "منی آرڈر" بھیجتے تھے۔ جب ہم لوگ غازی پور سے چلے تو مجھے اچھی طرح یاد ہے باغ کی سڑک کے کنارے سارا عملہ موجود تھا۔ استاد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ بھی رام پور واپس جا رہے تھے۔ اماں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انھیں جلد دہرہ دون بلا لیں گی۔ مگر نہ جانے کیوں ایسا نہیں ہو سکا۔ آج کل کا زمانہ ہوتا تو استاد کسی ریڈیو اسٹیشن پر لگ گئے ہوتے لیکن اس زمانے میں ریاستوں کے علاوہ کلاکاروں کے لیے ذرائع آمدنی بھی بہت محدود تھے۔ آج تک میں performing artists سے جو یگانگت اور دردمندی محسوس کرتی ہوں اس کو بہت سے لوگ سمجھ نہیں سکتے۔ یہ مسکین صورت فن کار جنھیں ہم سارنگیے، طبلچی، گویے، نچنیے اور نٹ باہر سمجھتے رہے ہیں، میراثی تو میراثی ہی ہے۔ بھلا آپ اپنے گھرانے کی کسی لڑکی کی شادی ایک اعلیٰ درجے کے فائیو اسٹار میراثی سے کر دیں گے؟ غالباً نہیں۔ طوائفوں سے وابستگی کی وجہ سے فن موسیقی کو بھی معیوب سمجھا گیا یا محض عیاش رئیس زادوں کا مشغلہ۔ کیوں کہ گویوں کے گھر کے ماحول اور ہمارے ماحول میں فرق ہے (حالاں کہ بڑے استادوں کے گھرانے کی عورتیں شدید پردے میں رہتی ہیں اور انھیں ایک سُر نہیں سکھلایا جاتا) لیکن یہ فرق کس نے پیدا کیے؟ سماجی حالات اور اقدار نے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کی اولاد اور اشرافیہ کی اولاد کے مابین جو سماجی فرق تھا وہ بھی اب مٹتا جا رہا ہے۔ یہ ہمارے یہاں کے کاسٹ سسٹم کا بھی ایک پہلو ہے۔ میراثی کا لفظ ہی پکار پکار کر کہتا ہے کہ یہ فن اس کو اپنے باپ دادا سے میراث میں ملا ہے۔ اور ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اس نے ہم پر کتنا کرم اور احسان کیا ہے کہ اس لاثانی آرٹ کو زندہ رکھا ہے۔ جس طرح بمبئی میں ہر گھاٹن ملازمہ گنگا اور ہر پوربی نوکر راما کہلاتا ہے چوں کہ مغربی گھاٹ کی سرسبز پہاڑیوں کے باشندے بھی افلاس زدہ تھے اور محنت مزدوری کے لیے بمبئی آئے، اسی طرح فاقہ زدہ مشرقی یوپی اور بہار کے لوگ جزائر غرب الہند اور بحرالکاہل کے دور افتادہ جزیروں تک بہ طور indentured labour جہازوں میں بھر بھر کر بھیجے گئے۔ ان کی اولاد میں وی ایس نئی پال جیسے ادیب بھی پیدا ہوئے۔ زیادہ تر پوربی جو باہر کے ملکوں میں ملے جیسے بنکاک کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا وہ بڑی بڑی مونچھوں والا وردی پوش دربان مجھے دیکھ کر بڑی اپنائیت سے مسکرایا، وہ بہرائچ سے وہاں گیا تھا۔ اس طرح دور دراز کے جزیروں میں یہ پوربی آباد ہیں اور ان کا باوا آدم پروٹوٹائپ وہ کیگ اسٹینڈ تھا جس کا نام ہی انگریزوں نے عبدل رکھ دیا تھا۔ یہ چار فٹ اونچا چگی داڑھی والا چوبی بیرا دونوں ہاتھوں

میں کشتی اٹھائے انگریزوں کے ڈرائنگ روم کے کونے میں کھڑا رہتا تھا۔ عبدل میرے خیال میں برطانوی تسلط اور کولونیل فرنگی تہذیب کا ایک سمبل تھا۔

ہم شمالی ہند کے باشندے بلکہ زیادہ تر ہندوستانی house proud نہیں تھے بلکہ gold and jewellery proud تھے۔ عہد مغلیہ کا طرزِ حیات ہمیں مغل راجپوت تصاویر میں نظر آتا ہے۔ نہایت سبک دروں اور محرابوں والے برآمدے جن میں چھینٹ کے پردے یا چقیں پڑی ہوئی تھیں اور stone work کی جالی دار کھڑکیاں۔ برآمدے کے آگے مہتابی یا چبوترے کے وسط میں حوض یا فوارہ یا چھوٹی سی نہر۔ امرا کے یہاں صحن چمن کے اندر ایک پویلین بھی ہوتا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں مہتابی پر پلنگ بچھا دیے جاتے اور آسمان کے نیچے سویا جاتا تھا۔ آنگنوں میں بیلہ، چنبیلی، موتیا کی جھاڑیاں مہکتی تھیں۔ مسلمانوں کے یہاں انار کا درخت ضرور ہوتا تھا جو ایک ایرانی روایت تھی اور ایران سے یہاں آئی تھی۔ آنگن کی دیوار کے ساتھ گھڑونچی پر گھڑے اور صراحیاں رکھی جاتیں جو جھلملاتے مرادآبادی کٹوروں سے ڈھکی رہتیں۔ عموماً دالان سے ملحق چبوترے پر شام کو مونڈھے بچھائے جاتے۔ جاڑوں میں دھوپ بھی چبوترے پر سینکی جاتی۔ چبوترے کے نیچے پھولوں کی جھاڑیاں لگی ہوتیں۔ چبوترے کے کنارے پر پیڑھیاں رکھی جاتیں اور ان کے نزدیک لوٹے اور صابن دانیاں اور بیسن دانیاں۔ گھر کے افراد پانچ وقت وضو کرتے تو نیچے لگی ہوئی پھلواری کی خوب آبیاری ہو جاتی۔ امیر غریب سب کے مکانوں کا بنیادی نقشہ یکساں تھا۔ ایک لمبا کمرہ جس میں کم از کم ایک قطار میں چھ دروازے ہوتے تھے۔ اس کے آگے دالان۔ دونوں طرف کوٹھریاں یا صحنچیاں۔ اندر کے بڑے کمرے میں دونوں جانب ایک ایک "پرچھتی" اور اس کی چوبی سیڑھیاں، عقبی دیوار میں بہت اوپر روشن دان۔ پردے کے خیال سے عقبی دیوار میں کھڑکیاں نہیں رکھی جاتی تھیں اور سارا گھر ایک محفوظ قلعہ سا معلوم ہوتا تھا۔ زنانے صحن کی دیوار کی دوسری طرف اسی نقشے کا مردان خانہ۔ دونوں آنگنوں کے بیچ میں دروازہ۔ صحن کے سرے پر باورچی خانہ اور ماماؤں، اسیروں کے لیے کوٹھریاں، آنگن کے دوسرے کونے میں بیت الخلا، حمام یعنی باتھ روم دالان کے برابر رکھا جاتا تھا۔ فریج کی آمد سے پہلے آئس بکس استعمال کیے جاتے تھے اور کھانا گرم کرنے کے لیے Hot کیس، یہ دونوں چیزیں انگریزی وضع کی کوٹھی کی pantry کا لازمی جزو تھیں۔ pantry آب دار خانہ کہلاتی تھی۔ انگریزوں کے آب دار خانے کو بوتل خانہ بھی کہتے تھے کیوں کہ اس میں شراب کا اسٹاک رہتا تھا۔ غدر کے زمانے میں فرنگیوں سے نفرت کے اظہار کے طور پر ہندوستانیوں نے ایک گیت بنایا تھا:

اگلا ناچے پگلا ناچے ناچے بوتل خانہ
بڑے صاحب کا ٹوپا ناچے میم صاحب کا سایا

ہندوستانی کوٹھیوں میں جالی کا نعمت خانہ بھی pantry میں رکھا رہتا تھا اور وہ ڈولی بھی کہلاتا تھا۔ امرا کے گھروں میں گرمیوں کی دوپہر گزارنے کے لیے تہ خانہ بھی ہوتا تھا۔ یورپین تاجروں نے جو بنگلے تعمیر

کروائے ان کے پچھلے حصے میں اپنی ہندوستانی بیویوں کے لیے پردے دار آنگن بھی ہوا دیے۔ کوٹھی کا یہ حصہ بی بی خانہ کہلایا۔ انگریزوں نے عہد مغلیہ کے اونچے عہدوں کی کم وقعتی کرنے کے لیے ان عہدوں کی حیثیت بہت ہی کم کر دی۔ ہمارے یہاں بی بی ایک باعزت خاتون کو کہتے تھے۔ انگریزوں نے طوائفوں کو یا ان عورتوں کو جو ان کے حرم میں داخل ہوتیں، بی بی پکارا۔ خانساماں یعنی controller of the imperial house hold کو انھوں نے کھانا پکانے والا بنا دیا جس کے لیے ترکی لفظ باورچی بھی مستعمل تھا۔ اہل ہنود جسے بھنڈاری اور رسوئیا کہتے تھے۔

انگریزوں نے اپنی کوٹھیاں بے حد خوب صورتی سے سجا رکھی تھیں۔ ان کے ڈرائنگ روم زیادہ تر ہندوستان کے بازاروں، پہاڑوں یا دوسری لوکل کلر سے مزین ہوتے تھے۔ انگریزوں کی نفسیات یہ تھی کہ یہ مناظر ہاتھی، گھوڑا، پالکی، سادھو، فقیر، سپیرے، محنت کش عورتیں یہ سب ان کے پس منظر کے props ہیں۔ اسی انہماک سے ان کے اسکالرز نے ہندوستان کی عمرانیات کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے اپنے Imperial Gazetteer میں ایک ایک گاؤں اور قصبے کی بالتفصیل جغرافیائی اور تاریخی اور اقتصادی کیفیت قلم بند کی اور تب ہمیں اندازہ ہوا کہ ان کے پیش رو مغل بھی اپنے وقت سے کتنے آگے اور ہوش مند تھے کہ انھیں کی لکھی ہوئی کتابوں پر انگریزوں نے مزید تحقیقات کی۔ مغل راجپوت تصاویر کے ان گنت ذخیرے ابھی تک محتاج مطالعہ پڑے ہیں۔ جن کے ذریعے ہمیں ماضی کی زندگی کے بہت سے پہلو اجاگر کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ جب مغل دورے پر یا شکار کھیلنے جاتے تھے تو ان کے مصور بھی ہم رکاب رہتے تھے جو قدرتی مناظر، پھول، پتوں، جانوروں اور پرندوں کی تصویریں تیار کرتے جاتے تھے۔ وہ گویا ان کے ڈاکومنٹری فلم پروڈیوسر تھے۔ محاوروں، شادی بیاہ کے گیت اور ضرب الامثال بھی ماضی کی کلچر کی آئینہ دار ہیں۔ ہماری اماں جو خاصی انگریزی داں تھیں اور ایک انگریزی طرز معاشرت میں پلی بڑھی تھیں، وہ بھی ایسے محاورے استعمال کر جاتی تھیں جو عہد رفتہ کے کلچر کی نمائندگی کرتے تھے، جیسے ارے وہ تو بارہ پتھر باہر رہتے تھے (پتھر یعنی سنگ میل) یا شرفو صبح سے بازار کا کوڑی پھیرا کر رہا ہے لیکن ابھی تک تمھارے پان نہ لایا۔ اب یہ کوڑی پھیرا اس دور کی یاد دلاتا تھا جب کوڑیاں بھی بہ طور سکہ چلتی تھیں۔ فلاں چیز تو اب دو کوڑی کی نہیں رہی۔ کبیر داس کا مشہور بھجن ہے:

ہیرا جنم اَمول تھا کوڑی بدل جائے

ہماری چندا ممانی ایک دفعہ کسی بد دماغ کے لیے کہنے لگیں، اے ہے وہ تو برف خانے کے محافظ کی طرح اکڑے ہوئے ہیں۔ نہ تیوں میں نہ تیروں میں۔ ایک اور دلچسپ محاورہ تھا۔

صاحب لوگ کی چٹھیاں اس زمانے میں اہم سمجھی جاتی تھیں۔ جب کوئی بیرا یا خانساماں ملازمت کی غرض سے آتا تو اماں سے کہتا، بیگم صاحب! ہمارے پاس بڑے بڑے صاحب لوگ کی چٹھی ہے، یہ دیکھیے۔ پھر وہ رومال میں بندھی سرٹیفکیٹ پیش کرتا۔ یہ مختلف انگریز کرنلوں اور سویلین

عہدے داروں کی دبیز شکستہ سطروں پر مشتمل اسناد ہوتیں جن میں لکھا ہوتا کہ عبدالرشید نے ہمارے یہاں سات برس کام کیا، وہ بڑا ہی محنتی اور ایمان دار آدمی ہے۔ اب ہم ہوم واپس جارہے ہیں اس وجہ سے ہمیں مجبوراً اسے علاحدہ کرنا پڑ رہا ہے۔ بعض اوقات یہ بیرے، خانساماں اور خدمت گار دُور دُور کے شہروں تک ہو آتے تھے اور ان کی چٹھیوں پر پونا، پشاور، ناگ پور، رنگون وغیرہ پتے ہوتے تھے۔ چند بیرے ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں اپنے صاحب لوگ کے ساتھ یورپ بھی گھوم آئے تھے۔ ہمارے اپنے غلام حسنین جن کا تذکرہ میں ''کارِجہاں دراز ہے'' میں کرچکی ہوں، ہمارے نانا کے ساتھ جنوبی افریقا کی Boer War سے لے کر چین کی Opium War کے علاوہ چار سال فرانس میں بھی رہ آئے تھے۔ ان کو عبدل بیرے کے زمرے میں بھی شامل نہیں کیا جاتا تھا اور وہ کھانا بھی دوسرے نوکروں کے ساتھ نہیں کھاتے تھے۔ یہ بھی ہماری تہذیب کی ایک روایت تھی کہ پرانے ملازموں کو محض ملازم ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ خاص طور پر بچوں کو یہ ٹریننگ ملتی تھی کہ وہ ان کی عزت کریں۔ چناں چہ ہماری ایک کزن اپنے نانا چودھری محمد علی ردولوی کے پرانے نوکر منور کو منور ماموں کہتی تھیں۔ یہ دراصل فیوڈل تہذیب کے حفظ مراتب کا ایک پہلو تھا۔ ایک قدیم ملازم حسنین ماموں کے یہاں رہتے تھے اور چھٹو کہلاتے تھے۔ اس کلچر کی شاگرد پیشے کا آخری نمونہ ہمارے یہاں امیر خاں تھے۔ ہمارے یہاں آنے سے پہلے لکھنؤ یونی ورسٹی کے مشہور پروفیسر Strang صاحب کے یہاں کام کرتے تھے، اس وجہ سے وہ پرانے زمانے کے انگریزوں کی شرافت اور وضع داری کے بہت معترف تھے۔ امیر خاں ۱۹۴۷ء میں ہم لوگوں کے لکھنؤ سے جانے کے بعد بنے بھائی اور رضیہ آپا کے یہاں چلے گئے اور وہاں سے پنڈت آنند نرائن ملا کے یہاں الٰہ آباد گئے۔ جب میں ۱۹۶۲ء میں بمبئی گئی تو اماں نے کہا کہ امیر خاں کو بلوا لو۔ چناں چہ میں نے ملا صاحب کو خط لکھا کہ وہ امیر خاں کو بھیج دیں۔ اب آنند نرائن ملا صاحب کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے امیر خاں کو جو پچھلے کئی برسوں سے ان کے یہاں کام کررہے تھے، فوراً بمبئی بھیج دیا۔

بمبئی میں بدقسمتی سے بے چارے امیر خاں کو بڑا زبردست culture shock پہنچا۔ جس روز وہ تشریف لائے اس کے دوسرے روز صبح کو فلیٹ پر دودھ والا آیا اور اس نے پوچھا بائی ہیں؟ پھر لفٹ مین نے پوچھا کہ کیا بائی آج آفس جائے گا؟ امیر خاں نے غصے میں بھنّا کر کہا، کیا بکتے ہو؟ یہاں کوئی بائی نہیں رہتی، ہماری بٹیا کا فلیٹ ہے، کیا تم جانتے نہیں؟ قصہ مختصر امیر خاں کو بمبئی کلچر راس نہ آیا۔ جب وہ لکھنؤ سے یہاں پہنچے تھے تو اماں کو سلام عرض کرنے کے بعد والد مرحوم کو یاد کرکے پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ اب وہ نمبر ۲۱ فیض آباد روڈ لکھنؤ کی دنیا اور نمبر ۲ آشا محل نروجی گماڈیا روڈ کی دنیا میں آسمان زمین کا فرق تھا۔ تب اندازہ ہوا کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جو لوگ زندہ رہے انھوں نے کتنے زبردست تہذیبی تصادم اور صدمے کا سامنا کیا ہوگا۔ رضیہ آپا نے امیر خاں کے متعلق ایک افسانہ بھی لکھا تھا جس کا عنوان ''چھتنار'' تھا۔ رضیہ آپا بنے بھائی کے زیراثر کمیونسٹ تو ہوگئی تھیں لیکن امیر خاں جیسے

فیوڈل ماحول کے نمائندے کی بھی بہت مداح تھیں۔ اس زمانے تک ہمارے ترقی پسند ادیب اٹھتے بیٹھتے کمیونسٹ پارٹی کی مرغوب اصطلاحات استعمال کرتے تھے، مثلاً فلاں جگہ تو tope بورژوازی رہتی ہے، یہ تو آپ کی ریکشنری (reactionary) رومانیت ہے، یہ ایک ڈیکیڈنٹ افسانہ ہے، فلاں فلاں بے حد رجعت پسند نظمیں لکھ رہے ہیں۔ اسی زمانے میں اس حقیر فقیر پر تقصیر کو جو culture shock پہنچا وہ یہ تھا کہ جب ایک شعلہ جوالہ ترقی پسند ادیبہ نے مجھے بڑی خوشی سے بتایا کہ ان کی بیٹی کے منگیتر نے بیٹی کو بیس ہزار کی مالیت کی ہیرے کی انگوٹھی خرید کر دی ہے تب مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے بیش تر انقلابی بھی محض کاٹھ کے پتلے اور پتلیاں ہیں یا Ventri Loquest کی ڈمی۔ یہ بڑا افسوس ناک انکشاف تھا۔ اس کے بعد دلی میں ایک بہت بڑے انقلابی لیڈر کی لڑکی کی شادی کے عصرانے میں شرکت کی تو وہاں سب دلی کے اعلیٰ ترین افسر، منسٹر وغیرہ کی ریل پیل دیکھی۔ اس میں ایک شخص بھی معمولی حیثیت کا یا کوئی جانا پہچانا کامریڈ نظر نہ آیا۔ تب میں نے میزبان سے پوچھا کہ آپ نے اپنی کمیون کے اراکین کو مدعو نہیں کیا!؟ کہنے لگے کہ بی بی کیا بتائیں یہ At home تو اپنے بڑے بھائی کے یہاں کیا ہے، انھوں نے اپنے حلقے کے لوگوں کو بلایا ہے۔ پھر جب ان کامریڈ کی لڑکی دلی سے بمبئی جانے لگی تو میں بھی اسے پہنچانے کے لیے اسٹیشن گئی تھی۔ وہاں لڑکی کی والدہ نے جو خود ایک انتہائی خاتون تھیں، لڑکی کے بازو پر امام ضامن باندھا۔ میں نے جب کہا کہ آپا یہ کیا ہو رہا ہے تو وہ بولیں یہ تو ہمارا کلچر ہے۔

ایک مرتبہ سوویت یونین میں، میں ٹرین پر اپنی ترجمان لڑکی کے ساتھ کہیں جا رہی تھی (وہ لڑکی بھی پارٹی ممبر تھی) وہ اپنی دادی کا تذکرہ کر رہی تھی۔ میں نے بے دھیانی سے پوچھا، تمھاری دادی کہاں رہتی تھیں؟ اس نے فوراً جواب دیا تھوتھو۔ توبہ توبہ۔ دادی ابھی زندہ ہیں۔ خدا کرے وہ ہمیشہ زندہ رہیں۔ تب میں نے سوچا کہ ہزارہا برس سے جو عقائد ہمارے ذہنوں میں جاگزیں ہیں، ستر اسّی سال میں آسانی سے زائل نہیں ہو سکتے۔ گو اب بہت سے بائیں بازو والوں کے وہاں مذہبی رسوم ان کے گھروں میں ادا کی جاتی ہیں لیکن ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارا کلچر ہے۔ فادر کرسمس کو موجودہ روس میں کایا پلٹ سے پہلے فادر ونٹر کہا جا رہا تھا۔ وہ سیاحوں کو بڑے فخر کے ساتھ اپنے کلیسا دکھلانے لے جاتے تھے۔ روس کے ہر گرجے میں، میں نے اونچی اونچی شمعیں روشن دیکھیں۔ ایک روسی خاتون نے فخریہ مجھ سے کہا، گریک اور تھوڈوکس چرچ ہمارا چرچ ہے۔ اگر بنّے بھائی زندہ ہوتے تو میں ان سے پوچھتی، یہ سب کیا ہو رہا ہے!؟

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

روس میں میں نے طبقاتی تفریق بھی خوب دیکھی۔ اس کا تذکرہ میں اپنے رپورتاژ ''گلگشت'' میں کر چکی ہوں۔

دہرہ دون میں ایسٹرن کنال روڈ پر ایک حسین اور پُرفضا کوٹھی بیلی لاج کہلاتی تھی جس کے

باغ میں بہت سے چکوترے یعنی grape fruit کے درخت تھے اور یہ چکوترے بالکل گھاس پر جھکے ہوئے بڑے بڑے زرد گلوب یا قمقمے معلوم ہوتے تھے۔ مسز بیل کے ڈرائنگ روم میں بھی کاٹھ کا عبدل ٹرے لیے کونے میں موجود تھا۔ بیلی لاج کی مالک ایک انگریز خاتون مسز بیل تھیں۔ انھوں نے جس انگریز سے یہ کوٹھی خریدی تھی اس کا نام کرنل بیلی تھا (جان صاحب کا آلا بیلی!)۔ کرنل صاحب مر چکے تھے ان کی بیوہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ رہتی تھیں جو ایک مجرد خاتون تھیں اور ایک چھوٹی سی پھدکنے والی چڑیاں معلوم ہوتی تھیں۔ یہ دونوں بہنیں غضب کی آرٹسٹ تھیں اور ان کی کوٹھی کا ہر کمرہ ان دونوں کی بنائی ہوئی آبی رنگوں کی تصاویر سے مزین تھا لیکن اس زمانے میں شاید تصویروں کی نمائش کا دستور ہی نہیں تھا۔ آرٹ کے رسالے بھی سوائے کلکتے اور بمبئی کے مفقود تھے۔ بہرحال مسز بیل اور ان کی طرح کے بہت سے انگریز بوڑھے اور بوڑھیاں جو بہترین فن کار تھے لیکن گم نام رہے۔ ہندوستانی مناظر بیپرے، دھوبی وغیرہ ان کے محبوب موضوع تھے۔ اس طرح ہندوستان کے flora and fauna کو انھوں نے بڑے ہی پیار اور جاں فشانی سے مصور کیا۔

نہ جانے مسز بیل اور ان کی بہن کا اتنا بڑا ذخیرہ کیا ہوا کیوں کہ ۱۹۴۷ء تک وہ دونوں بہنیں مرکھپ چکی تھیں اور ان کی جگہ ایک مسلمان خاندان بیلی لاج میں فروکش تھا، جنھوں نے مع فرنیچر وہ کوٹھی خرید لی تھی۔ بیلی لاج میں اب ہماری عطیہ آپا رہتی تھیں۔ انھوں نے کاٹھ کے عبدل کی ٹرے پر اپنا روپہلی پان دان رکھ دیا تھا۔ بیلی لاج کے سامنے ایسٹرن کینال اسی طرح شور مچاتی ہوئی بہتی جا رہی ہے۔ انگریزوں نے برف پوش ہمالیہ سے یہ آب جو ایسی نکالی تھی کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر یہ ایک پُرشور کنویں میں گرتی اور پھر اسی طرح ترنم ریز کنویں سے باہر نکل کر اپنے رستے پر رواں ہو جاتی ہے۔ ہمالیہ کے سرسبز حسین ترین پہاڑ جو اس نہر کے پس منظر میں ایستادہ ہیں، ان کو لکڑی کے ٹھیکے داروں نے گنجا کر دیا ہے۔ ان پہاڑوں میں چونا کھودا جا رہا ہے۔ وہ بے حد بے وضع ہو گئے ہیں۔ جب جنگل کٹ گئے تو موسم بھی بدل گیا، مسوری میں اب لُو چلتی ہے۔ جب برف باری ختم ہو گئی تو پہاڑی نہر بھی خشک ہو جائے گی۔ بیلی لاج کے ڈرائنگ روم میں اگر اس کے نئے مالکوں نے کاٹھ کے عبدل کو کوڑے میں نہیں پھینکا تو شاید وہ اسی طرح اپنے کونے میں کھڑا سورج کے سوا نیزے پر آنے کا منتظر ہوگا۔

☆☆☆

قرۃ العین حیدر

مسز جوڈا کی کوٹھی

''آپ کا گھسیاری منڈی کا اسکول...'' بیگم کلثوم نواز شریف نے بات شروع کی۔ میں چونکی۔ پنجاب (پاکستان) کے چیف منسٹر کی بیگم جو خود بھی مغربی پنجاب سے تعلق رکھتی تھیں اور کبھی لکھنؤ گئی نہیں تھیں، یہ گھسیاری منڈی کہاں پہنچ گئیں۔ میری کزن اچھو (خالدہ حیدر) جو دنیا کے معاملات پر مستقل متحیر رہنے کے لیے بھی اس دنیا میں نہیں رہیں اور جانے کہاں چلی گئیں جہاں کا اور ہے نہ چھور، نہ سرحدیں ہیں نہ پاسپورٹ نہ ویزا فارم۔ اچھو قریب کے صوفے پر اس طرح حسبِ عادت گویا عالمِ حیرت میں بیٹھی تھیں۔ دوسری کرسی پر آغا سہیل تشریف فرما تھے جو بیگم نواز شریف کو لکھنؤ کے بارے میں پڑھاتے تھے اور لکھنوی تہذیب بیگم کلثوم نواز شریف کا خاص موضوع تھا۔ جس زمانے کے گھسیاری منڈی کا میں نے تذکرہ کیا ہے اس وقت لکھنؤ اور لاہور ایک ہی ملک کے دو شہر تھے۔ آپ چارباغ ریلوے اسٹیشن سے ٹکٹ کٹا کر فراٹے بھرتے لاہور پہنچ سکتے تھے یا وہاں سے لکھنؤ آسکتے تھے۔ دونوں شہروں کو اپنی اپنی جگہ عظیم تہذیبی مرکز ہونے پر بڑا ناز تھا۔ گو لاہور اردو صحافت اور ادبی سرگرمیوں کے معاملے میں لکھنؤ سے سبقت لے گیا تھا۔ آج کی مقبول اصطلاح ''میڈیا'' سے لوگ باگ ناآشنا تھے۔ لیکن لکھنؤ اور لاہور کے ریڈیو اسٹیشن اچھے پروگراموں کے سلسلے میں ایک دوسرے کو اپنا حریف سمجھتے تھے۔ دونوں شہروں سے بلند پایہ کلاکار آتے جاتے رہتے۔ لاہور ریڈیو میں امتیاز علی تاج اگر اسٹار پروڈیوسر تھے تو لکھنؤ میں شوکت تھانوی اور عشرت رحمانی کسی سے کم نہیں تھے۔ شوکت تھانوی ورسٹائل صداکار تھے۔ ریڈیو پر اردو کلچر حاوی تھی۔ ہر ٹرانس میشن کے شروع اور آخر میں ''آداب عرض'' کیا جاتا تھا۔ سبھا کے بجائے لفظ مجلس مستعمل تھا۔ دہلی اور لکھنؤ کی عورتوں کے پروگرام ''حسنہ باجی'' اور ''سعیدہ آپا'' کنڈکٹ کرتی تھیں۔ لکھنؤ میں بچوں کے پروگرام کی ''آپاجان'' اپنی سنہری آواز اور شیریں لکھنوی لہجے کے لیے مشہور تھیں۔ کچھ عرصے کے بعد ہندو مسلم کلچر کا توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک ''دیدی'' کا اضافہ کیا گیا۔ جن کا اصل نام سردار اختر تھا اور یہ رام پور کی رہنے والی ایک گوری چٹی اور ذرا فربہ خاتون تھیں۔ ''آپاجان'' جو دراصل عرش منیر[*] تھیں

---

*۔ آزادی کے بعد یہ پاکستان چلی گئیں اور پی ٹی وی کے ڈراموں کی ایک نامور کیریکٹر ایکٹریس بنیں۔

خالص لکھنوی تھیں۔ لکھنؤ ریڈیو کی مشہور تمثیلوں کی ہیروئن یہی بنتی تھیں۔ یہ لکھنؤ کی بہت ہی مثالی قسم کی سانولی سلونی اور "بے حد شیریں کلام پرفورمنگ آرٹسٹ تھیں اور ایک مشہور مزاح نگار کی زوجۂ ثانی بن چکی تھیں۔ اس وقت ریڈیو ایک نیا اور فسوں خیز میڈیا تھا اور اس کے صداکاروں کو وہی مقبولیت حاصل تھی جو آج ٹیلی وژن کے اسٹارز کے حصے میں آئی ہے۔ پرانے زمانے کی اسٹیج اور سینما ایکٹریس جہاں آرا کجن ریڈیو کی سنگیت ناٹکوں کی ہیروئن بنتی تھیں۔ جہاں آرا کجن اور عشرت سلطانہ ببو اور ملکہ پکھراج کو کلکتے، بمبئی اور لاہور سے خاص طور پر لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر مدعو کیا جاتا تھا۔ ملکہ پکھراج مہاراجا کشمیر کی درباری مغنّیہ تھیں اور اختری بائی نواب رام پور کے یہاں گانے کے لیے جاتی تھیں۔ لکھنؤ کے ایک بڑے انڈسٹریلسٹ اصطفیٰ خاں جو ایک بارِیش حاجی تھے، اسکیٹنگ چیمپئن کی حیثیت سے بھی مشہور تھے۔ ببو کسی ریڈیو ڈرامے میں حصہ لینے کے لیے لکھنؤ آئی تھیں۔ ان کو حاجی اصطفیٰ خاں نے اپنے یہاں ایک بڑے ڈنر پر مدعو کیا جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ چوں کہ اس زمانے میں اشرافیہ کے یہاں مخلوط عورتوں میں جس میں بیگمات بھی شامل ہوتی تھیں، اربابِ نشاط کو نہیں بلایا جاتا تھا۔ لیکن اختری فیض آبادی، جہاں آرا کجن، عشرت سلطانہ، ببو اور ملکہ پکھراج کو اب گویا ایک حد تک قبول کر لیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے لاہور کی سوسائٹی کہیں زیادہ آزاد خیال تھی اور وہاں کی مشہور مغنّی خواتین اس طرح ٹاٹ باہر نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ پنجاب کے وڈیرے سیاسی اقتدار بھی رکھتے تھے اور اربابِ نشاط کا ان کے یہاں کافی عمل دخل تھا۔

قیصر باغ کے چوراہے سے جو سڑک گھسیاری منڈی کی طرف جاتی ہے اس میں ایک سرخ رنگ کے پھاٹک کے اندر ایک اونچی کرسی والی پرانی وضع کی کوٹھی ایستادہ تھی۔ لکھنوی دستور کے مطابق اس پھاٹک کے محراب پر بھی آمنے سامنے دو مچھلیاں بنی ہوئی تھیں۔ مچھلیاں سلطنتِ اودھ کا طغریٰ کیوں بنیں؟ کہا جاتا ہے کہ نواب صفدر جنگ لکھنؤ کے شیخ زادوں سے جنگ کے دوران کشتی میں گومتی ندی عبور کر رہے تھے، جب دو مچھلیاں پانی سے اُچھل کر ان کی گود میں آن گریں۔ نواب کے مصاحبین نے ان سے کہا، خداوند یہ بہت ہی نیک شگون ہے۔ اب آپ کی فتح ضرور ہوگی۔ لکھنؤ پر تسلط کے بعد نواب صفدر جنگ نے آمنے سامنے دو مچھلیاں اپنی حکومت کے طغرے میں بنوائیں۔ لہٰذا آج تک لکھنؤ کے سارے پرانے پھاٹکوں پر دو مچھلیاں bas-relief میں بنی نظر آتی ہیں اور مچھلی کا یہ طغریٰ آزادی کے بعد بھی اتر پردیش سرکار نے برقرار رکھا ہے۔ شادی بیاہ کے موقعے پر اکثر اب بھی متعدد مسلمان گھرانوں میں براتی ایک مٹی کی ہنڈیا میں پانی بھر کے اور اس میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ڈال کر دلھن کے یہاں لاتے ہیں۔ کہیں سفر پہ جاتے وقت وہی مچھلی کے شگون کے علاوہ کڑوے تیل میں اپنا عکس دیکھا جاتا۔ جب ہم لوگ بنارس اپنا ہائی اسکول کا امتحان دینے گئے تو اپنی جائے قیام سے امتحان کے لیے یونی ورسٹی جاتے وقت دروازے سے نکلتے تو "دیدی" یعنی مسز پرتھی سنگھ سری واستو کڑوا تیل ایک برتن میں لیے کھڑی

ہوتیں۔ ہم لوگ باری باری اپنا عکس تیل میں دیکھتے اور پھر امتحان گاہ روانہ ہوتے۔

میرے لیے ماسٹر صاحب کا اسکول وہی مچھلی ثابت ہوا۔ ماسٹر صاحب یوپی کی گنگا جمنی تہذیب کی آخری مثالوں میں تھے، انتہائی نستعلیق اور وضع دار۔ اردو ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ بے حد دُبلے پتلے، ہمیشہ سفید براق کھادی کی دھوتی، لمبا کرتا پہنتے تھے۔ پکے گاندھی وادی تھے۔ ''کارِ جہاں دراز ہے'' جلد اول میں لکھ چکی ہوں کہ ہمارے ایک رشتے کے چچا خان بہادر سیّد احمد حسین چینا بازار گیٹ کے اندر ایک قدیم کوٹھی میں رہتے تھے۔ کوٹھی غالباً بادشاہ نصیرالدین حیدر کے عہد میں تعمیر کی گئی تھی اور لکھنؤ Rococo یعنی انتہائی پُرتکلف اور مرصع لکھنوی طرزِ تعمیر کا ایک نمونہ تھی۔ چچا احمد حسین کی گاڑی بھی کچھ کم دقیانوسی نہیں تھی، اونچی چھت والی اس وضع کی گاڑیاں لندن میں آج تک بہ وجہ برطانوی وضع داری بہ طور ٹیکسی چلتی ہیں۔ اس وقت بھی یعنی ۱۹۳۹ء میں ہماری اور چچا احمد حسین کی گاڑیاں جو سیلون کاریں کہلاتی تھیں، دس سال پرانی ہو چکی تھیں۔ لیکن ان کی مضبوطی کا یہ عالم تھا کہ ہماری اوک لینڈ ہزارہا میل چلنے کے بعد بھی محض ایک دفعہ کارخانے بھیجی گئی تھی اور اس کا انجن بالکل شور نہیں کرتا تھا۔

علامہ اقبال کی موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش

کے مانند گاڑی کے اندر کٹ گلاس کے گل دان آویزاں تھے اور سیٹیں چمڑے کے بجائے نہایت دبیز اور نفیس سرمئی مخمل کی تھیں۔ چھت اتنی اونچی تھی کہ جب یہ ہمارے یہاں کلکتے سے غازی پور آئی تو میں اس کے اندر کھڑی ہو جاتی تھیں لیکن چھت تب بھی اونچی رہتی تھی۔ ایک لگیج کیریئر پیچھے تھا، ایک چھت پر۔ جب ابّا جان دورے پر جاتے تو ہمارا پنکھا قلی پندرہ سالہ ہنس مکھ دلیپ لمبے شملے کی پگڑی باندھ کر بڑی مستعدی سے باہر فٹ بورڈ پر کھڑا ہو جاتا، وہ دروازے کو مضبوطی سے پکڑے رہتا اور پچاسوں میل کا راستہ اسی طرح طے کرتا۔ فٹ بورڈ بھی بہت چوڑے تھے اور دلیپ کے گرنے کا بھی کوئی خدشہ نہ تھا۔ ڈرائیور قدیر کی بیوی مع اپنے خورد سال بچے فرید کے ساتھ آگے بیٹھتیں اور والدین، بھائی اور میں پچھلی سیٹ پر۔ شام کو کمرے کی طرح کا سوئچ (switch) آن کر کے چھت میں لگا لیمپ روشن کیا جاتا۔ اب جس روز چچا احمد حسین نیلی اوک لینڈ کی توام وین اپنی عنابی گاڑی (اس کی چھت اور مڈگارڈ بھی سیاہ تھے) پر بیٹھ کر ہمارے یہاں آئے، وہ میرے لیے ایک بہت ہی اہم دن ثابت ہوا اور احمد حسین خواجہ خضر۔ کیوں کہ چچا احمد حسین نے ماسٹر پرتھی سنگھ سری واستو کے پرائیوٹ اسکول کا ذکر ابّا جان سے کیا جو انھوں نے حال ہی میں کھولا تھا جس میں چچا احمد حسین کی لڑکی زہرہ داخل تھیں۔ دوسرے روز انھوں نے ماسٹر صاحب کو ابّا جان کے پاس بھجوایا۔ تیسرے روز میں خوشی سے بے حال اپنی تاریخی اوک لینڈ پر سوار ہو کر گھسیاری منڈی پہنچی۔ جس کا پتا ماسٹر صاحب نے ڈرائیور کو سمجھا دیا تھا۔ قیصر باغ کے چوراہے کے نزدیک گھسیاری منڈی واقع تھی جو کسی زمانے میں گھاس کی منڈی رہی ہوگی، اب ایک صاف ستھرا رہائشی علاقہ تھا۔ پھاٹک کے اندر جا کر میں اونچی کرسی کی کوٹھی کے برآمدے میں پہنچی۔ اس کوٹھی کی مالکن مسز جوڈا لال باغ

میں رہتی تھیں اور عہد نواب سعادت علی خاں کے مشہور ڈاکٹر جوڈا کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ برآمدے کے اندر دو کمرے تھے۔ کوٹھی کے برابر والے حصے میں ماسٹر صاحب خود رہتے تھے۔ کلاس روم میں جس کی کھڑکیاں پہلو کے باغ میں کھلتی تھیں، قیصر باغ کی عمارتوں میں گھرا یہ باغ اور اس پر بکھری ہوئی سنہری دھوپ جاڑوں میں بہت ہی خوش گوار معلوم ہوتی۔ شہر کے مکانوں کے اندر چھپے ہوئے باغوں کی کیفیت بھی ذرا سی مختلف ہوتی ہے اور وہ بڑے پُراسرار معلوم ہوتے ہیں۔ آذربائیجان کے شہر باکو میں ایک باغ دیکھ کر مجھے گھسیاری منڈی کا یہ چہاردیواری میں چھپا چمن بے ساختہ یاد آیا۔ باکو (بادکو یعنی کوئے باد: ہواؤں کا کوچہ) بھی لکھنؤ کی طرح اپنے اندر بے شمار افسانے رکھتا ہے۔ ماسٹر صاحب اس وقت بورڈ پر چاک سے لکھ رہے تھے Bana جو گپتا عہد کے شاعر کا نام تھا۔ میں اندر جاکر سامنے کی قطار میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ ماسٹر صاحب پڑھاتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ سب لڑکیاں مجھ سے بڑی تھیں۔ وہ زیادہ تر ایسے خاندانوں کی تھیں جہاں کسی نہ کسی وجہ سے ان کی تعلیم دیر میں شروع ہوئی تھی۔ مسلمان لڑکیوں نے غرارے پہن رکھے تھے۔ ہندو لڑکیوں نے دھوتیاں (سوتی ساڑیاں بھی دھوتی کہلاتی تھیں)۔ میں واحد فراک پوش سب سے کم سن طالب علم تھی۔ کلاس کے بعد ان سب سے فوراً دوستی ہوگئی۔ عقیلہ باجی جسٹس محمد رضا مرحوم کی بیٹی جن کے بھائی کاظم رضا انڈین پولیس اور ہاشم رضا آئی سی ایس اور آل رضا مشہور شاعر تھے۔ عقیلہ باجی بہت خوش شکل خاتون تھیں۔ ناک میں ہیرے کی بڑی سی لونگ پہنتی تھیں۔ ان کے علاوہ صغریٰ اور عطیہ دونوں بہنیں دراز قد گراں ڈیل اور خوش مزاج، یہ جج مسعودالحسن کی بیٹیاں تھیں۔ یٰسین باجی چودھری خلیق الزماں کی صاحب زادی تھیں۔ مسلم لیگ کی تجدید کے سلسلے میں چودھری صاحب کا نام اخباروں میں بہت آرہا تھا۔ ایک لمبی چوڑی خوش شکل لڑکی سراج فاطمہ عرف چندا پورے مردانہ لباس میں چوڑی دار پاجامہ، قمیص اور مردانہ کوٹ، بال بھی مردوں کی طرح ترشے ہوئے۔ یہ لکھنؤ کے مشہور خاندان ہڈی والوں کی دختر نیک اختر تھیں۔ زہرہ گوری چٹی دراز قد شربتی آنکھیں، چہرے کی ساخت بالکل انگریزوں والی، لیکن تھیں وہ ہماری دور کی کزن یعنی چچا احمد حسین کی بیٹی۔ سیدھی سادی اور کم سخن۔ اقبال گوری چٹی کشمیری نژاد جو خاص کشمیری محلے سے آتی تھیں۔ کشمیری مسلمانوں اور پنڈتوں کے قبیلے شاید نواب سعادت علی خاں کے دور میں کشمیر سے لکھنؤ آئے تھے۔ انھوں نے بڑے ادیب اور شاعر پیدا کیے۔ سرشار، چکبست، بشن نرائن در، پنڈت آنند نرائن ملا وغیرہ ان کشمیریوں نے آپس میں شادیاں کرکے اپنا رنگ روپ برقرار رکھا۔

صفیہ عبدالحکیم کے والد یوپی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر تھے۔ جن باجی جنھوں نے ازابیلا تھوبرن کالج سے بی اے کرلیا تھا اور اعزازی طور پر اردو پڑھاتی تھیں اور ماسٹر صاحب ان کو پٹرول کے لیے پچاس روپیہ مہینہ دیتے تھے اور اماں ان کی شادی سندیلے کے سید محمد عباس سے لگوا رہی تھیں۔ وہ ایک بہت نستعلیق اور سویٹ خاتون تھیں۔ ناک میں ہیرے کی لونگ وہ بھی پہنتیں اور غرارہ جو لکھنؤ کی امیرو

غریب مسلم خواتین کا عام لباس تھا۔ شلوار قمیص اس زمانے میں بالکل رائج نہیں تھی۔ جن باجی جو نزدیک ہی رہتی تھیں، اپنی اوپل گاڑی میں آتی تھیں جس میں نیلے پردے پڑے رہتے تھے یعنی وہ نیم پردے میں تھیں۔ ماسٹر صاحب انگلش اور ہسٹری پڑھاتے تھے۔ ایک صاحب زادے جو یونی ورسٹی میں فارسی میں ایم اے کر رہے تھے، یہ مضمون پڑھانے کے لیے آتے۔ لکھنؤ کے روایتی پرانے مکانوں کے مانند یہاں بھی ایک گیسٹ ہاؤس موجود تھا یعنی پھاٹک سے ملحق ایک بڑا کمرہ جس کا ایک دروازہ باہر کھلتا تھا اور دوسرا اسکول کے صحن کے اندر۔ اس کمرے میں بہت بڑا تخت بچھا تھا اور اس پر چاندنی۔ کمرے کو مع تخت ایک سفید پردے کے ذریعے دو حصّوں میں منقسم کیا گیا تھا۔ یہ فارسی والے ٹیچر باہر سے آکر پردے کی دوسری طرف بیٹھ جاتے اور وہ باہر سے ہی چلے جاتے تھے۔ اسکول کی کسی لڑکی نے ان کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ ماسٹر صاحب کی بیوی جو "دیدی" کہلاتی تھیں، اپنی کرسی اس طرح بچھا کر بیٹھتی تھیں کہ دونوں طرف نگرانی کرتی رہیں۔ فارسی پڑھنے والی لڑکیاں پردے کے دوسری طرف بیٹھ جاتیں۔ میں نے فارسی کے بجائے کلاسیکل میوزک لی تھی جس کی استاد میرس کالج کی گریجویٹ ایک کشمیری پنڈت خاتون کماری شیوپوری تھیں۔ اس زمانے میں انقلاب کا بہت چرچا تھا۔ پرشین (Persian) ٹیچر بھی شاید انقلابی تھے۔ ایک دن اسکول میں دیدی ہم لوگوں سے کہنے لگیں یہ حضرت کہتے ہیں کہ کنووکیشن میں اپنی ڈگری لینے نہیں جائیں گے، سنکی ہیں۔ دیدی بہت پُرسکون اور شانت قسم کی خاتون تھیں۔ انھوں نے جس اطمینان سے یہ بات کہی، سنکی ہیں، مجھے آج تک یاد ہے۔ نہ جانے یہ فارسی والے ٹیچر کون تھے اور ان کا کیا نام تھا، کن چکروں میں مصروف تھے اور اب کہاں ہیں؟

کوٹھی کے آدھے حصّے میں ماسٹر صاحب رہتے تھے۔ برآمدے میں ایک کھٹولا پڑا تھا جس پر جمنا میری زرد رنگ کی ریشمی ململ کی ساڑی پھیلائے اس پر سیاہ فیتہ ٹانکتی رہتیں۔ دیدی نے اسی سال یونی ورسٹی سے بی ایس سی کیا تھا۔ وہ کمال کی خاتون تھیں، گرہستن بھی تھیں۔ ماسٹر صاحب کی نہایت پتی ورتا بیوی، بچے بھی پالتی تھیں، بوٹنی (علم نباتات) کا کلاس بھی لیتی تھیں اور بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ زندگی گزار رہی تھیں۔

ماسٹر صاحب اب گھسیاری منڈی مسز جوڈا (Mrs.Judah) کی کوٹھی سے لال باغ منتقل ہو چکے تھے۔ جہاں ہیو روڈ پر انھوں نے جو مکان کرائے پر لیا تھا، اتفاق سے وہ بھی تاریخی حیثیت کا حامل تھا۔ اس مکان میں وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل نے بیگماتِ اودھ یعنی نواب شجاع الدولہ کی بیگم اور بہو کو کچھ عرصے کے لیے نظر بند کر رکھا تھا۔ وہ بڑی حویلی جس میں بیگمات کو محصور کیا گیا تھا، اب یہ منہدم ہو چکی تھی جس کے آثار ابھی صحن میں باقی تھے۔ لیکن پھاٹک اور شاگرد پیشہ صحیح و سالم موجود تھے جس میں ماسٹر صاحب نے اپنا اسکول یہاں منتقل کیا۔ اس کے گیسٹ ہاؤس میں اسکول کا ہال بنایا گیا یعنی جہاں پردے دار چوپہلے پالکیاں اور ہوادار رکھے جاتے تھے۔ وہاں اب نئے ہندوستان کی لڑکیاں صبح کو اسکول

لگنے سے پہلے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" گاتی تھیں اور ماسٹر صاحب بڑی عقیدت کے ساتھ ایک طرف کو کھڑے ہو کر یہ ترانہ سنتے تھے۔ ماسٹر صاحب ایک سچے، کھرے اصول پرست گاندھی وادی تھے۔ جنھیں فرقہ پرستی چھو کر نہیں گئی تھی۔ ایسے سادھو سنت قسم کے انسان اب تقریباً ناپید ہیں۔ ریڈرز ڈائجسٹ میں ایک کالم میں قارئین ایسے لوگوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے ناقابلِ فراموش رہے۔ ہمارے ماسٹر پرتھی سنگھ سری واستو بھی ایسے ہی ناقابلِ فراموش ہستیوں میں سے تھے۔ ایک نہایت منکسر المزاج سیدھے سادے آدمی جو کانگریس سے اپنی بہت پرانی وابستگی کی بنا پر اگر چاہتے تو بڑی آسانی سے نیتا گیری کر سکتے تھے اور آزادی کے بعد کم از کم یوپی کے وزیرِ تعلیم تو ضرور بن جاتے۔ لیکن ان کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ پرانے زمانے کے اردو داں کائستھ۔ جب انھوں نے قیصر باغ کی اس کوٹھی کے آدھے حصے میں اسکول کھولا تو ان کے کلچر، نیک نفسی اور خلوص سے متاثر ہو کر لکھنؤ کے قدامت پرست مسلمانوں نے بھی اپنی لڑکیاں ان کے اسکول میں داخل کر دیں۔ دراصل اس زمانے میں شرافت ایک عام چلن تھا اور نامعقول لوگ تعداد میں کم تھے۔ اب معاملہ اس کے برعکس ہے۔ چناں چہ ماسٹر پرتھی سنگھ کو بھی عجوبۂ روزگار نہیں سمجھا گیا۔ ان کے ایسے کریم الطبع لوگ اور بھی تھے۔

بتن باجی شادی کے بعد بمبئی جا چکی تھیں۔ ان کی جگہ نئی ٹرم میں سوز شاہ جہاں پوری اردو پڑھانے کے لیے مقرر کیے گئے۔ سوز صاحب کی دو بیویاں تھیں۔ چھوٹی بیگم بھی دسویں کلاس میں ہمارے ساتھ داخل ہوئیں۔ سوز صاحب جب پہلے روز اردو پڑھانے کے لیے تشریف لائے اور شعریات کے متعلق چند ادق سوالات کیے اور لڑکیوں سے خاطر خواہ جواب نہ پا کر بہت بھنّائے اور فرمایا میں پڑھاؤں کیا خاک! آپ لوگ سب بالکل کوری ہیں۔ عزیز بانو داراب جو مشہور فارسی شاعر خواجہ عزیز لکھنوی کی پڑپوتی ہیں، اس ٹرم میں داخل ہوئی تھیں اور میرے برابر کے ڈیسک پر تشریف فرما تھیں۔ انھوں نے فوراً کاپی پر لکھا ہم لوگ ابھی ابھی کمہار کے یہاں سے بن کر آ رہے ہیں اور کاپی میری طرف سرکائی۔ لیکن سوز صاحب ایک شفیق استاد ثابت ہوئے۔ وہ مجاز کے ہمراہ ابّا جان سے ملنے ہمارے یہاں ۲۱ فیض آباد روڈ بھی آیا کرتے تھے، اس لیے میں ان سے واقف تھی۔ جغرافیہ پڑھانے کے لیے لال باغ مقبرہ کمپاؤنڈ سے ایک عیسائی خاتون آئیں۔ مقبرہ کمپاؤنڈ کے اندر جو امام باڑہ تھا اسے ایامِ غدر میں انگریزوں نے ایک گرجا میں تبدیل کر دیا تھا اور وہاں پر کمپاؤنڈ کے شاگرد پیشے میں دیسی عیسائی آباد کر دیے تھے۔ کچھ عرصے بعد امام باڑہ مسلمانوں کو واپس کر دیا گیا، لیکن عیسائی کنبے اس کے شاگرد پیشے میں آباد رہے۔ ہمارے یہاں احاطے کے عیسائی ایک خاص اصطلاح ہے۔ ہر ضلع میں ایک مشن کمپاؤنڈ ہوتا تھا جس میں مشنری لوگ مقامی غریب غربا کو بپتسمہ دے کر آباد کر دیتے تھے۔ مقبرہ کمپاؤنڈ بھی اسی روایت کی یادگار تھا۔

ماسٹر صاحب کا ایک اسکول ہندوستان کی رنگارنگ سوسائٹی کا ایک میناطوری مرقع تھا۔ مسز فضل مسیح جغرافیہ ٹیچر، سوز شاہ جہاں پوری اردو فارسی، نابینا ماسٹر سورج بخش سری واستو ہندوستانی کلاسیکل

موسیقی، سنسکرت کے پنڈت جی، ان کے علاوہ ماسٹر صاحب خود انگریزی اور تاریخ پڑھاتے تھے اور جس روز سوز صاحب نہ آویں تو اردو بھی پڑھاتے تھے۔ اردو لکھنؤ کے کشمیری پنڈتوں اور کائستھوں کی مادری زبان تھی۔ لیکن دستور کے مطابق لڑکیاں ہندی پڑھتی تھیں تاکہ گیتا اور رامائن کا پاٹھ کرسکیں۔ اس وجہ سے اس اردو طبقے کے مرد ہندی کو لڑکیوں کی زبان کہتے تھے۔ نامور ہندی ادیب کملیشور نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے کائستھ خاندان کے پہلے نوجوان تھے جنھوں نے ہندی پڑھی۔ یوں تو شہر کا بچہ بچہ اہل زباں تھا۔ ضلع جگت کا استاد۔ دو بہنیں جو ایک کانونٹ اسکول سے آئی تھیں اور فخریہ کہتی تھیں کہ ہمیں اردو نہیں آتی۔ باقی لڑکیوں نے ان کو نکو بنا ڈالا۔ چوں کہ اس اسکول کی کافی لڑکیاں کانونٹ اسکول میں پڑھ چکی تھیں۔ لیکن یہ اب بھی انگریز کا زمانہ تھا اور بہت سے خاندان اپنی انگریزیت پر نازاں تھے۔ خود ہمارے یہاں ہماری والدہ بہت زیادہ انگریز تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے ہندوستانیت کا توازن بھی برقرار رکھا تھا۔

نوابی کلچر لکھنؤ کی نمائندہ کلچر تھی۔ یہاں گزشتہ ادوار میں متعدد اینگلو انڈین حضرات و خواتین اردو شعرا کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ کتھک اودھ کا قومی رقص تھا اور اس کے متعلق عہد رامائن چھتھا، کتھا واچک، کتھک میرتھ کے ذریعے دیومالا کی کہانیاں پیش کرتے تھے۔ اب بھی کتھک رقاص کہیں کہیں دورانِ رقص رادھا کرشن کی کہانی سناتا جاتا تھا۔ ماسٹر صاحب کے اسکول میں دوسری منزل پر ایک برجی نما کمرہ تھا جس میں ہماری میوزک کی کلاس لگتی تھی۔ اس کے دریچے کے سامنے ایک تناور درخت بارش میں یا ہوا میں جھومتا رہتا۔ یہ بھی بڑا موسیقی ریز درخت تھا۔ اور ہوائیں اس کی شاخوں میں سے اپنے فضائی راگ راگنیاں سناتی ہوئی گزرتیں۔ ماسٹر صاحب نے پردے کے خیال سے سڑک کے کنارے کنارے ایک اونچی ٹیٹوں کی دیوار کھڑی کروا دی تھی۔ جس پر گھنی بیل پھیل گئی تھی۔ کاسنی پھولوں والی یہ بیل Railway Creepers کہلاتی ہے۔ کیوں کہ انڈین ریلوے کے اینگلو انڈین اسٹاف نے اپنے بنگلوں کی دیواروں کو اسی بیل سے سجایا تھا۔ ہمارے احاطے کی چٹائی کی دیوار کی وجہ سے ہماری درس گاہ ٹٹر والا اسکول کہلائی۔ اس کے عین مقابل میں ایک اینگلو انڈین کنبہ اپنے بنگلے میں رہتا تھا۔ یہ بنگلہ سڑک سے ذرا نشیب میں ایستادہ تھا۔

جاننا چاہیے کہ جس طرح چوک لکھنؤ کی روایتی کلاسیکل طوائفوں کا مرکز تھا، لال باغ میں بہت سے یوریشین کنبے آباد تھے، جن کی لڑکیوں نے کتھک سیکھ رکھا تھا اور وہ روسا کی محفلوں میں جا کر ناچتی تھیں۔ ان ہی میں سے ایک لڑکی ونی کلارک تھی اور دوسری روزی۔ اب دلچسپ بات یہ ہے کہ جب میں نے ''میرے بھی صنم خانے'' لکھا اور اس میں لال باغ کی ایک اینگلو انڈین رقاصہ کا نام کوئن روزی رکھا، اس وقت میں روزی کے نام سے ناآشنا تھی۔ یہ ابھی دو تین سال قبل مجھے سیدہ نسیم چشتی نے بتلایا کہ وہ لڑکی روزی کہلاتی تھی۔ آزادی کے بعد شاید اس قسم کی لڑکیاں اپنے کنبوں کے ساتھ آسٹریلیا وغیرہ چلی گئیں۔ میں نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں یہ اینگلو انڈین ارباب نشاط لال بی بی کہلاتی

تھیں اور اس کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں۔ اور یہ زیادہ تر لال باغ میں رہتی تھیں۔ لال باغ اس لیے کہلایا کہ روایت کے مطابق شاہان اودھ کے لعل و گوہر کے خزانے دفن کیے گئے تھے۔ یوں تو ہمارے یہاں انواع و اقسام کے دفینے موجود ہیں، محض انھیں کھود کر نکالنے کی ضرورت ہے۔ لال باغ میں اینگلو انڈین اور یوریشین اب بھی رہتے ہیں۔ اور ان کی نہایت مطمئن اور خوش حال زندگی کا ثبوت وہ بے انتہا عظیم الشان کیتھڈرل ہے جو آزادی کے بعد حضرت گنج میں تعمیر کیا گیا ہے۔

ہمارے ایک عزیز جو لال باغ میں بیرو روڈ پر رہتے تھے، بتاتے تھے کہ اودھ چیف کورٹ کا ایک انگریز جج بھی ان یوریشین رقاصاؤں کے یہاں آیا کرتا تھا۔ اینگلو انڈین پرانی برطانوی اصطلاح میں ان انگریزوں کو کہتے تھے جنھوں نے ہندوستان میں زندگیاں گزاریں، گو شادیاں یہاں نہیں کیں۔ پرتگالی، ڈچ، فرانسیسی اور انگریز جنھوں نے یہاں سکونت اختیار کی اور شادیاں بھی دیسی عورتوں سے کیں، ان کی اولاد یوریشین کہلائی۔ انگریز باپ اور ہندوستانی ماں کی اولاد کے لیے اینگلو انڈین کی اصطلاح بہت بعد میں رائج ہوئی۔

جب میں مدتوں بعد ۱۹۶۸ء میں لکھنؤ گئی تو ماسٹر صاحب بے حد خوش تھے۔ ''آگ کا دریا'' اندر سے نکال کر لائے اور وہاں پر موجود لوگوں سے کہا دیکھو مس حیدر نے ہمارا ذکر اس میں کیا ہے (میں نے ''آگ کا دریا'' حصہ سوم میں ماسٹر صاحب کو رگبیر ماما کے روپ میں پیش کیا تھا)۔ ماسٹر صاحب کا اسکول اسی پرانی عمارت میں موجود تھا اور مہاتما گاندھی گرلز کالج کہلا رہا تھا۔ دیدی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے بیٹے بہوئیں ان کے ساتھ رہتے تھے اور یہ لوگ آج کے ہندوستان سے تعلق رکھتے تھے۔ ماسٹر صاحب کی گم شدہ دنیا اور اس کی اقدار سے ان کا کوئی رابطہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔

ماسٹر صاحب کے کالج میں ہماری ایک دوست رقیہ قدوائی بھی پڑھا رہی تھیں۔ بہت بڑا اسٹاف تھا۔ لڑکیوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ اب ان کے اسکول سے لڑکیاں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ہائی اسکول کا امتحان بھی دیتی تھیں۔ گھسیاری منڈی کے سرخ شاہی پھاٹک کے اندر مسز جوڈا کی کوٹھی میں لگنے والی وہ کلاسیں اور آج کے مہاتما گاندھی گرلز کالج میں وہی فرق تھا جو زمانے کی رفتار کا تقاضا تھا۔ اس کالج کی پرنسپل اب رقیہ قدوائی تھیں۔ اس کالج اور لکھنؤ کے دوسرے اداروں میں اب کوئی فرق نہیں ہے۔ ماسٹر صاحب ایک منفرد ہستی تھے... اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے!

☆☆☆

قرۃ العین حیدر

مرزا رسوا کا بنگلہ

جولائی اگست کی کالی گھٹائیں زمین کے سبزے اور ہرے بھرے درختوں میں اس طرح گھل مل جاتیں جیسے واٹرکلر یا اگر آپ کسی منظر میں رنگ بھر رہے ہوں تو ہلکا آبی رنگ لینڈ اسکیپ کی ہریالی میں کناروں میں پھیل جائے۔ ماسٹر صاحب (ماسٹر صاحب پرتھی سنگھ سریواستو) کی پرانی فورڈ جو دیکھنے میں کھٹارا تھی لیکن فولادی ٹینک کا حکم رکھتی تھی، صبح سویرے ہمارے پھاٹک پر پہنچ کر ہارن بجاتی۔ میں ہارن کی آواز سنتے ہی پچھلے برآمدے کی سیڑھیاں پھلانگ کر فراٹے سے باہر نکلتی۔ امیر خاں اوول ٹین کی پیالی لیے پیچھے پیچھے آتے۔ میں ان کو نظر انداز کر کے فورڈ پر چڑھتی۔ عزیز بانو داراب وفا کو یہ منظر آج تک یاد ہے۔ وہ فرماتی ہیں کبھی امیر خاں گاڑی میں بیٹھی لڑکیوں کے لیے ایک ٹرے میں پانی کے گلاس اور جگ یا چائے کی کشتی اٹھا کر لاتے۔ پھر تم فراک پہنے بستہ اٹھائے بھاگتی ہوئی آتیں اور اچک کر گاڑی میں سوار ہو جاتیں۔ گاڑی کے پچھلے دروازے کو بند کر کے ان کے سامنے پتلی پتلی بینچیں لگا دی گئی تھیں۔ ایک روز اس گاڑی کو دیکھ کر والد مرحوم کے ایک دوست نے کہا تھا، ایک کائستھ بچے کا ذہن ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ گاڑی فورڈ موٹر کار کے میوزیم میں رکھنے کے مستحق تھی۔ ایک بار یہ افواہ سنی کہ ایک تعلقے کے راجا صاحب ماسٹر صاحب کی نیک نامی اور تعلیم نسواں کے سلسلے میں ان کی جاں فشانی سے متاثر ہو کر اپنا ایک موونگ ہوم اسکول کو نذر کر رہے ہیں۔ اس پر میں نے کہا:

مل گیا اسکول کا عطیہ یہ ہندی قوم سے

جڑ گیا چھکڑا ہمارا ان کے موونگ ہوم سے

عزیز بانو نے جو بہ طور ہونہار بروا اس وقت بھی فکر سخن فرماتی تھیں، فوراً کہا قوم اور ہوم فٹ نہیں بیٹھ رہا ہے۔ میں نے جواب دیا، ماسٹر صاحب کا چھکڑا ابھی کون سے موونگ ہوم میں فٹ بیٹھے گا۔ ہمارے پڑوسی مسٹر چکرورتی سپرنٹنڈنگ انجینئر کے یہاں مدراسنگ شروع ہو جاتا، بدھم مدھورم ہستم مدھورم، کیوں کہ یہ جنم اشٹمی کا سیزن ہوتا۔ اس وقت گاڑی میں عزیز بانو کے علاوہ اختری بھی موجود ہوتیں۔ یہ دونوں سبزی منڈی

کی طرف پرانے شہر میں رہتی تھیں۔ میں گاڑی میں بیٹھنے کے بعد جغرافیہ کا سبق یاد کرنے کے لیے اٹلس نکالتی۔ یہ ایک بہت ہی خوب صورت ولایتی اٹلس تھی جس کے اندر شوخ رنگوں میں چھپے نقشے paintings معلوم ہوتے تھے۔ اس وقت بے دھیانی سے امریکا کے نقشے پر نظر دوڑاتے ہوئے اختری کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ دور دراز شکاگو کو ایک روز اپنا وطن بنالیں گی۔ اور بانو بہ طور ایک نام ور شاعرہ مشہور ہوں گی۔ عزیز بانو نے اس وقت اسکول کی فورڈ موٹر کے اوپر ایک ایسی ہجو لکھ ڈالی جس پر سودا کا گھوڑا بھی رشک کرتا۔ اکبرالہ آبادی ہوں یا میر وسودا شاعری سب کی گھٹی میں پڑی تھی۔ گو بانو کو ایک مشہور فارسی شاعر اور علامہ اقبال کے دوست خواجہ عزیز لکھنوی کی پڑپوتی ہونے کے ناتے فارسی میں اس وقت قصیدۂ بہاریہ لکھنا چاہیے تھا:

خیز در باغ وراغ قافلۂ گل رسید

اب ہم لوگ ریلوے لائن کراس کرکے مسلم گرلز کالج کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک طرف کو مڑتے جہاں سڑک سے کچھ فاصلے پر گھاس اور خودرو چولائی کے پودوں سے بھرے امرود کے باغ کے اندر ایک سفید رنگ کی کوٹھی پوشیدہ تھی، جس کے پچھواڑے سے چھوٹی لائن کی مال گاڑی درختوں کے جھرمٹ میں سے گزرتی دور پورب دیس گورکھ پور وغیرہ کی طرف نکل جاتی۔ یہ شکارگاہوں اور جنگلوں میں چھپے ڈاک بنگلوں والے ہرے بھرے پُرسکون اضلاع مجھے بچپن سے ہمیشہ بہت مسحور کرتے تھے اور یہ چھوٹی لائن کی مال گاڑی ہمیشہ مجھے بڑی پُراسرار اور افسانوی معلوم ہوتی تھی۔ جب یہ ٹرین مرزا رسوا کی کوٹھی کے پچھواڑے سے گزرتی،اس کے آخری ادھ کھلے ڈبے میں ایک سرخ ناک اور چقندر جیسی شکل والا اینگلوانڈین بڑے فلسفیانہ انداز میں اپنے اسٹول پر بیٹھا نظر آتا۔ مرزا رسوا کی کوٹھی میں رہنے والی بہنوں میں سے سب سے چھوٹی بہن جو اسکول میں میری ہم جماعت تھی، اس نے ایک بار ہمیں بتایا تھا کہ وہ بوڑھا گارڈ ان کا دوست بن گیا ہے۔ جب ڈبہ بالکل ان کے احاطے کے جھاڑ جھنکاڑ کے برابر سے گزرتا تو وہ انھیں دیکھ کر بڑی خوش دلی سے اپنا رومال ہلاتا یا کبھی کوئی بچی نظر آتی تو اس کی طرف ٹافی کا ڈبہ پھینک دیتا یا کبھی بنارس میں بنا مٹی کا کوئی کھلونا جو ڈھیروں نرم گھاس پر گرنے کی وجہ سے ثابت رہتا اور ظاہر تھا کہ وہ کھلونے خاص طور پر ان کے لیے خرید کر لاتا ہوگا۔ کبھی کبھی وہ لڑکیاں بھی خاردار گھاس میں سے نکلتی ہوئی اس کے ڈبے کے قریب جا کر sandwiches کا پیکٹ تھما دیتیں اور وہ God bless you ، God bless you کہتا ہوا sandwich کھاتا جاتا اور ریل گاڑی درختوں میں اوجھل ہوجاتی۔ اس کی زندگی کیسی تنہائی میں گزرتی ہوگی۔ خاموش مال گاڑی کے آخری ڈبے پر گھنے سنسان جنگلوں میں سے گزرتے رہنا اس کا مقصدِ حیات تھا کیا وہ اسی لیے پیدا ہوا تھا؟ کبھی کبھی وہ اپنے اسٹول پر beer کا مگ لیے بیٹھا نظر آتا۔ اس وقت چارلس ڈکنز کے پک وک پیپرز کا ایک کردار یا ہوگارتھ کی ایک پینٹنگ معلوم ہوتا۔ اس کوٹھی میں پہلے کبھی مرزا محمد ہادی رسوا کی یوریشین گرل فرینڈ رہتی تھیں۔ لہٰذا اس

باب کا عنوان ''مرزا رسوا کی یوریشین گرل فرینڈ کا بنگلہ'' ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہ عنوان بہت طویل ہو جاتا اور اس کھنارا موٹر کار کی طرح کتاب کے اس صفحے پر فٹ نہ بیٹھتا۔ مرزا رسوا اپنی فٹن یا بگھی یا جھلملیوں والی کھڑکیوں کی پالکی گاڑی یعنی ولایتی کوچ میں بیٹھ کر گولا گنج یا وزیر گنج سے اتنی دور اس میم صاحب کے پاس آتے ہوں گے اور جاڑوں کی سنہری دھوپ یا گرمیوں کی سہانی شام اسی گول چبوترے پر پڑی ایک کرسی پر بیٹھ کر اس خاتون سے انگلش پڑھتے ہوں گے، ہوسکتا ہے اسے ریاضی بھی پڑھاتے ہوں۔ مرزا رسوا کی شاگردوں میں ایک مس گریس بھی تھیں، ممکن ہے یہ ان موصوفہ ہی کی کوٹھی رہی ہو۔

امراؤ جان بے چارے مرزا صاحب کا ایسا ٹریڈ مارک بن گئیں کہ ہم ان کے علاوہ اس حیرت انگیز مصنف کے متعلق بہت کم جانتے ہیں۔ جب میں سورگ باسی صابر دت کے غزل نمبر کا حصہ خواتین مرتب کر رہی تھی تو اس بے چارے، سچے، کھرے پرخلوص خادمِ اردو نے کہیں سے امراؤ جان اداؔ کا ایک فوٹوگراف لا کر دیا جو انھیں حیدرآباد دکن کے کسی ذخیرے سے ملا تھا اور یہ تصویر عین میں اسی سائز کی تھی، گزشتہ صدی میں جس سائز کی تصویریں قیصر باغ کے مشکور الدولہ فوٹوگرافر کی فرم نے سرکاری حکم کے مطابق لکھنؤ کی تمیں چالیس اعلیٰ درجے کی ارباب نشاط کی کھینچی تھیں۔ تاکہ ان کو لکھنؤ کی میونسپل کارپوریشن اپنے ریکارڈ میں رکھے اور ایک تصویر اپنے لائسنس کے ساتھ ان بے چاریوں کو بھی رکھنی پڑتی تھی۔ امراؤ جان اداؔ کی اس تصویر سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک سانولی سلونی قبول صورت خاتون تھیں لیکن حسین مہ جبین ہرگز نہیں تھیں۔

راقم الحروف نے کہیں لکھا ہے کہ In Lucknow all history is yesterday

۱۸۵۷ء کے بعد آدھا لکھنؤ توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا گیا اور اس کے ملبے میں سے فوجوں کی تیز رفتار نقل و حرکت کے لیے پانچ بڑی سڑکیں نکالی گئی تھیں۔ اس تباہی کے باوجود چند عمارتیں بچ گئی تھیں، ان میں انگریزوں نے اپنے بینک اور کلب گھر وغیرہ بنائے۔

مرزا رسوا کی گرل فرینڈ ہوسکتا ہے کہ کلکتہ کی باشندہ رہی ہوں یا لکھنؤ ہی کے عیسائی فرقے سے تعلق رکھتی ہوں، جو فرقہ یہاں عہدِ آصفی سے آباد تھا۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے اودھ انگریزوں کی ایک سیٹلائٹ پروردہ سلطنت تھی۔ ان کا یہاں جتنا رسوخ نہ ہوتا کم تھا۔ روپ موسیو کا باغ جو عوام نے موتی کا باغ بنا لیا، لامارٹینیر جو مارٹین کوٹھی کہلائی، پرانے گرجا گھر، مثلاً حضرت گنج کے عقب کا مقبرہ کمپاؤنڈ اور لال باغ وغیرہ سب عیسائیوں کے مسکن تھے۔ پرانے یوریشین خاندانوں میں ایک کنبہ جن کی خواتین سے اکثر مجالسِ محرم میں ملاقات ہوتی تھی، اس کی لڑکیاں گوری چٹی اور نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والی تھیں اور سب برقع پوش۔ ان میں سے ایک لڑکی نے مجھے بتایا کہ اس کے دادا Rochester سے آئے تھے اور خستہ حال کنبہ جس کے مرد پیشہ ور مرثیہ خواں تھے ان کا تعلق جنرل لارڈ رابرٹ کے خاندان سے تھا۔ جنرل صاحب خود نصف آئرش اور نصف ہندوستانی تھے۔ جنرل اسکنر کی والدہ کی طرح

ان کی ماں بھی دیسی تھیں۔ فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹ کی بہن مارگریٹ نے کلکتہ کے نواب سیّد احمد علی سے شادی کی تھی جو نواب مظفر جنگ نائب ناظم بنگال، بہار، اڑیسہ کے بیٹے تھے۔ نواب میر قاسم علی خاں کی ٹریجڈی کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا البتہ لارڈ کلائیو ایک برطانوی ہیرو ہیں، جن کے کارنامے انگلستان کے اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ چناں چہ ثابت ہوا کہ بالکل غیر جانب داری سے تاریخ نویسی ایک بہت مشکل کام ہے اور انتہاپسندی کا رویہ بھی اختیار کرنا بہت آسان ہے، مثلاً سارے اہلِ مغرب کی نظر میں مشرقی بادشاہ و سلاطین ظالم اور عیاش تھے اور اہلِ مشرق کے نزدیک وہ خود معصوم بھولے فرشتے جن کو بدمعاش فرنگیوں نے آ کر چل دیے۔ ادھر جو تاریخ کی کتابیں زیادہ امپیریلسٹ مؤرخوں نے لکھیں وہ میں نے اسکول میں بھی پڑھیں۔ میرے پاس "The Book of Knowledge" کی ساری جلدیں موجود ہیں۔ یہ سیٹ میرے لیے بچپن میں کلکتہ سے منگوایا گیا تھا۔ اسی طرح کی کتابوں کا ایک سیٹ میرے فرسٹ کزن پارے اور اچھو کے پاس بھی تھا۔ دراصل وہ زمانہ ویڈیو کیسٹ کے بجائے کتابوں کا تھا۔ حالاں کہ اب سارے کلاسک اور مشہور ناول ویڈیو کیسٹ میں منتقل ہو چکے ہیں۔ لیکن پرنٹڈ ورڈ یعنی چھپے ہوئے الفاظ سے ذہن جو رابطہ قائم کرتا ہے وہ متحرک تصاویر کے ذریعے نہیں ہوتا۔ "The Book of Knowledge" میں شامل ایک تصویر میں اقوامِ عالم کے بچے ایک جلوس کی صورت میں دکھلائے گئے ہیں۔ سب سے آگے انگریز لڑکا اور لڑکی پھر دوسرے یورپین بچے جن کی قومیت ان کے لباس سے ظاہر ہوتی ہے، ان کے بعد جاپانی، چینی، عرب بچے۔ ہندوستانی اور افریقی بچے کالے کالے چھوٹے چھوٹے ننگ دھڑنگ اور ننگے پاؤں۔

آج کل آپ مغرب میں اگر کسی یہودی کو Jew کہہ دیں تو بہت بُرا مانتے گا۔ لیکن اصلیت میں اب بھی زیادہ تر اہلِ مغرب نسل پرست ہیں۔ سیکڑوں برس کا غرور اور احساسِ برتری چند سال میں زائل نہیں ہو سکتا۔ نسلی فوقیت کا یہ احساس ہمارے یوریشین طبقے میں بھی موجود تھا۔ مرزا رسوا کی ٹیچر بھی اپنے آپ کو میم صاحب سمجھتی ہوں گی۔ وہ لوگ جانے کہاں گئے (پورے پورے خاندان اور قبیلے اچانک کس طرح غائب ہو جاتے ہیں)۔

اب مرزا رسوا کی کوٹھی واپس چلیے۔ اس کوٹھی میں اب ایک ہندوستانی خاندان رہتا تھا جس کی چار لڑکیاں تھیں۔ بڑی دو یونی ورسٹی میں پڑھ رہی تھیں۔ چھوٹی دونوں ہمارے اسکول میں تھیں۔ یہ چاروں روزانہ ایک سے ایک اچھے اور قیمتی کپڑے پہنتیں اور اپنی خوش لباسی کے لیے مشہور تھیں۔ اس طرح کی باتیں وہ کرتیں اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی رجواڑے یا تعلقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اصلیت میں وہ انتہائی سلیقہ مند اور سمجھ دار لڑکیاں تھیں۔ وہ محض اپنی گفتگو میں شامل ہلکے پھلکے اشاروں سے اپنی Aristocartic بیک گراؤنڈ ظاہر کرتی تھیں جو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کیوں کہ سارے لکھنؤ میں قدیم کوٹھیوں کے اندر سے پابندِ وضع تعلقہ دار رہتے تھے جن کی اولاد لکھنؤ کے انگریزی اسکولوں یا کالجوں میں

پڑھ رہی تھی اور وہ خود اپنے علاقے پر جاتے آتے رہتے تھے۔ بنیائن اور تہمد میں ملبوس امرود توڑنے والے بزرگ کے متعلق اسکول کی گاڑی میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں نے لامحالہ یہ خیال کیا تھا کہ یہ ان بہنوں کے تعلقے کے کارندے ہیں۔ ان حوصلہ مند بہنوں نے اس زمانے ہی میں سمجھ لیا تھا کہ سماجی ترقی سیاست کی سیڑھی لگا کر ہی چڑھی جاسکتی ہے۔ ان چار بہنوں میں سے سب سے چھوٹی نے کالج میں پہنچنے کے بعد سات سات سو صفحات کے دو ضخیم ناول بہ یک وقت تصنیف کیے۔ بہ طرز ''انور'' اور ''شمیم'' از منشی فیاض علی اور ان ناولوں کے نام رکھے ''منور'' اور ''نسیم'' جب وہ اپنے پلندے لے کر کالج میں آتیں اور اکثر فری پیریڈ میں ہم لوگ اپنی پسندیدہ کسی سیڑھی پر جا بیٹھتے اور وہ اپنا ناول پڑھنا شروع کرتیں۔ سعید بانو عباسی جن کے والد لکھنؤ کے مشہور روزنامے ''صدق'' کے ایڈیٹر تھے اور مہر جبیں ان کے نہایت وفادار سامعین تھے۔ دو تین روز یہ ناول سنتے سنتے مجھے خیال آیا کہ اس طرح تو میں بھی لکھ سکتی ہوں۔ میں بچپن سے اب تک ہفتہ وار اخبار ''پھول'' (لاہور) اور رسالہ ''بنات'' (دہلی) میں پریوں کی کہانیاں وغیرہ لکھا کرتی تھی۔ ایک بار ''پھول'' اخبار کے سالانہ انعامات میں سرفہرست میرا نام بھی تھا اور مجھے مبلغ دس روپے کا اوّل انعام ملا تھا۔ خوشی کے مارے بُرا حال۔ لہٰذا اب میں نے ان نوعمر ادیبہ کی تقلید میں ایک عدد افسانہ لکھا۔ لیکن وہ قطعی غیر رومانٹک تھا۔ وہ میں نے کسی کو نہیں دکھلایا اور سات سو صفحے کا ناول لکھنا اپنے بس کی بات نہیں تھی۔ والد کے انتقال کو ابھی محض چھ مہینے گزرے تھے جب ہم لوگ دہلی منتقل ہوئے اور کچھ عرصے والد مرحوم کے ایک عزیز دوست چچا مشتاق احمد زاہدی کے یہاں قیام کیا۔ وہ مرحوم مجھ سے اور بھائی سے سگے چچاؤں جیسی محبت کرتے تھے۔ ایک دن حکیم یوسف حسن ایڈیٹر ''نیرنگ خیال'' لاہور سے اماں کے پاس تعزیت کے لیے آئے۔ میں دس گیارہ سال کی عمر سے اماں کی گویا سیکریٹری بنی ہوئی تھی۔ ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے وہ عموماً پلنگ پر لیٹی رہتیں۔ جب ان کے پاس رسالوں کے ایڈیٹروں کی فرمائشیں آتیں تو وہ ڈپٹ کر مجھے آواز دیتیں، لڑکی قلم دوات لاؤ اور بیٹھ کر لکھو۔ پھر وہ لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر کے فرفر لکھوانا شروع کرتیں۔ کبھی کوئی جملہ یا پیراگراف قلم زد نہیں کروایا۔ پورے پورے ناول انھوں نے اسی طرح لکھوا ڈالے۔ اگر کوئی ملنے والی آجاتیں تو کبھی کبھی ان سے لکھوا لیتیں۔ ان کی یادداشت اور قوتِ متخیلہ حیرت انگیز تھی۔ ناول کا پلاٹ بُنتی چلی جاتی تھیں اور اسی وقت کوئی اسے قلم بند کر لیتا تھا۔ وہ ایک نیچرل رائٹر تھیں۔ جب جناح صاحب مسلم لیگ کی تجدید کے سلسلے میں لکھنؤ آئے تو مرزا رسوا کی کوٹھی میں رہنے والی چار بہنوں میں سے بڑی بہن ان کی جائے قیام پر پہنچ کر ان سے ملیں اور ان سے کہا، یہ کام تو آپ میرے ذمے کر دیجیے، اس شہر میں زنانہ مسلم لیگ میں قائم کروں گی۔ چناں چہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور بیگم حبیب اللہ کے ساتھ مل کر گونگے نواب کے باغ میں زنانہ پارک کے اندر وہ خواتین کے جلسے کرنے لگیں۔ ہماری کوٹھی کے عین مقابل الٰہ آباد کے ریٹائرڈ جج سعیدالدین جعفری رہتے تھے۔ ان کی بیگم ایک کیم شحیم پنجابی خاتون تھیں جنھوں نے ۱۹۲۸ء میں ازابلا تھوبرن کالج

سے بی اے کیا تھا۔ ہمارے والدین اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان لڑکیوں کی بڑی قدر اور ہمت افزائی کرتے تھے۔ بیگم جعفری سے بھی ان کی بہت دوستی ہوگئی۔ بیگم جعفری ان حوصلہ مند بہنوں کی باتوں سے ذرا چڑتی تھیں۔ ایک دن وہ اماں سے کہنے لگیں، تنویر فاطمہ آج آئی تھی، بولی میں بمبئی جاکر قانون کی پریکٹس کروں گی۔ جناح صاحب مجھے پیش کریں گے۔ اب بتایئے بہن جناح صاحب بے چارے دھان پان آدمی وہ انھیں پیش کس طرح کریں گے۔

ان دنوں منشی فیاض علی کے ناول ''انور'' اور ''شمیم'' کا بہت چرچا تھا اور واقعی وہ ضخیم ناول تھے بھی بے حد دلچسپ۔ منشی فیاض علی لکھنؤ کے ایک نامی ایڈووکیٹ تھے اور والد مرحوم کے قانونی مشیر۔ ان حیرت انگیز ادیبوں میں تھے جنھوں نے جہاں تک مجھے علم ہے، نہ ان ناولوں سے پہلے کچھ لکھا اور نہ بعد میں۔ آزادی کے بعد پاکستان چلے گئے۔ جہاں ایڈووکیٹ جنرل مقرر ہوئے۔ ان کی لڑکیاں سلمیٰ اور حمیرہ بھی آئی ٹی کالج میں پڑھ چکی تھیں اور سلمیٰ نے ۱۹۴۳ء میں بی اے میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ یہ دونوں بہنیں بہت ہی خوش اخلاق اور سیدھی سادی لڑکیاں تھیں۔ کراچی جاکر ناظم آباد میں ہمارے لڈن ماموں کی کوٹھی میں سرسید گرلز کالج قائم کیا۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

پھر بھی مجھ کم فہم کی سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ ہندی مسلمان نے خوشی خوشی من حیثیت القوم اپنے آپ کو کس طرح اور کیوں اپنے ان علاقوں سے بھی transplant کرلیا جہاں وہ فسادات سے محفوظ آرام سے رہ رہے تھے۔ اس سوال پر اب تک ان گنت کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور آئندہ لکھی جاتی رہیں گی۔ لیکن ایسا کس طرح ہوا؟ یہ سوال میرے لیے جوں کا توں موجود ہے۔ اس قسم کا انقلاب تاریخ میں محض ایک مرتبہ پہلے ہوا ہے یعنی ہسپانیہ میں، جب وہاں سے مسلمان نکلے تو اپنے گھروں کو تالا لگا کر آئے تھے اور کنجیاں شمالی افریقا میں اپنے نئے مکانوں کی دیواروں پر ٹانگ دی تھیں کہ ایک روز واپس جائیں گے لیکن ہندوستان سے بیش تر ہجرت کرنے والوں کے لیے ایسی کوئی جذباتی کھونٹی موجود نہیں تھی جس پر وہ اپنی کنجیاں ٹانگتے۔ ایک بار گئے تو گئے، مثلاً مرزا رسوا کی اس سابقہ کوٹھی سے چلتے وقت ان بہنوں نے پیچھے پلٹ کر نہ دیکھا نہ ان کے والد کو امرود کا درخت یاد آیا۔ یہ کس قسم کا اجتماعی جذباتی خلا تھا جو سیاست نے پیدا کیا۔ اپنی مٹی، اپنے ماحول، اپنے کھیت، کھلیان، ندیوں اور بستیوں کی کشش ایسی ناپائدار کیوں ثابت ہوئی لیکن ہجرت کا syndrome جس پر انتظار حسین کی ادبی شہرت کا دارومدار ہے، ہندوستان کی ہندوستانی مسلمانوں کی پندرہ کروڑ کی آبادی کے ایک بہت ہی قلیل تعداد کے افراد یا خاندانوں کے لیے ایک مسئلہ بنا۔ خصوصاً شہروں میں رہنے والوں کے لیے۔ دور دراز دیہات میں آباد مسلمان آج تک پاکستان کے مسئلے سے ناآشنا ہیں۔ ان کو اپنی روزمرہ کی محنت و مشقت سے ہی فرصت نہیں کہ وہ ان معاملات کے متعلق سوچیں۔ وہ اگر ریڈیو بھی سنتے ہیں تو ان کے مسائل کے لیے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ

معاملات انھوں نے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے چھوڑ دیے ہیں۔ دہقان کا اجتماعی حافظہ ہمارے اجتماعی حافظے سے مختلف ہے۔ ایک تو اس کا ذہن information explosion نے ابھی تک گنجلک نہیں کیا ہے۔ وہ بہت سی باتیں جو ہم بھول چکے ہیں اس کے ذہن میں ابھی موجود ہیں، مثلاً چند سال قبل میں ضلع بجنور کے گاؤں میں گھوم رہی تھی۔ وہاں مجھے اندازہ ہوا کہ مسلمانوں کو اب بھی ترک کہا جاتا ہے۔ ترکوں کے بعد افغان اور مغل آئے لیکن تیرھویں چودھویں صدی کا ترک اب بھی مسلمانوں کا نمائندہ ہے۔ اس گاؤں کے مکھیا جو بہ طور گائڈ میرے ساتھ چل رہے تھے، میں slacks میں ملبوس تھی، لہٰذا وہ مجھ کرسچین سمجھے۔ اور بہ طور گائڈ بتانے لگے اس جگہ ترکوں نے یہ کیا، اس جگہ ترکوں نے وہ کیا۔ پھر نہ جانے کس طرح انھیں میری اصلیت کا اندازہ ہوا، وہ بہت جھینپے۔ اپنے مکان پر انھوں نے میرے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست کر رکھا تھا۔ وہاں لے گئے اور بڑی خاطریں کیں اور چلتے وقت کہنے لگے بٹی بزرگوں کی دعائیں لو۔ سارے وقت وہ نہایت نفیس اردو بولتے رہے۔ یہ تہ در تہ نفسیاتی الجھاوے شاید ان قوموں کا مقدر ہیں جو ایک بہت طویل اور پیچیدہ تاریخ کی وارث ہیں۔ اسی پیچیدہ تاریخ کا ایک پہلو ضلع بجنور ہی کا وہ مقتدر عیسائی خاندان ہے جس کے ٹھاکر اجداد نے ایامِ غدر سے ذرا قبل اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے دوران ان کی گراں قدر وفاداری کے صلے میں برٹش سرکار نے انھیں پانچ سو گاؤں اور راجا کا موروثی خطاب عطا کیا۔ اس خاندان کے کچھ افراد اپنی شان دار کوٹھی میں اپنے قصبے تاج پور میں رہتے ہیں۔ کچھ پونا میں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ ان کی خواتین جو راج کماریاں کہلاتی ہیں، اپنے کیتھولک چرچ کی بڑی سرگرم اراکین ہیں۔ شفاخانہ، یتیم خانہ اور جذامیوں کا اسپتال وغیرہ ان کے پیسے سے ان کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔ ایک ٹیلے پر ایستادہ ان کی کوٹھی Wuthering Height کی سی معلوم ہوئی یعنی ایک نامعلوم سی کیفیت اس جگہ کی ہندوستان کے بجائے مغربی سی تھی۔ بعض مقامات یا مکانوں کا غیر مرئی dimension ایسا ہوتا ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اور الفاظ میں اس کی مکمل تشریح کرنا ممکن نہیں، کیوں کہ الفاظ و ادراک اور احساسات میں خاصا فرق موجود ہے۔ ایک عیسائی خاندان کی یہ پرانی کوٹھی ضلع بجنور کی قدیم ترین تاریخ کے آخری ابواب کا ایک حصہ تھی۔

ایک روز ہم لوگ تاج پور مشن گئے جہاں میرا خیال تھا کہ ہمیں میری صاحب فراش کزن زہرا آپا کی دیکھ بھال کے لیے ایک ٹرینڈ نرس مل جائے گی۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہمارے یہاں کوئی ایسا مسلمان یا ہندو فلاحی ادارہ موجود نہیں۔ لامحالہ مشنریوں ہی کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ تاج پور میں انھوں نے جنگل میں منگل منا رکھا تھا۔ سب سے قابلِ ذکر چیز ان کا جذامیوں کا اسپتال تھا۔ جہاں وہ دور دور خود جا کر بے سہارا جذامیوں کو بلا تفریق مذہب و ملت اٹھا کر لاتے ہیں اور ان کا علاج کرتے ہیں۔ ان اپاہجوں میں اکثریت اہلِ ہنود اور اہلِ اسلام کی تھی، ان میں کوئی سکھ نظر نہیں آیا۔

بجنور کے اسی trip میں جب میں اس ضلعے کے بڑے ہندو اور مسلمان زمین داروں کے

یہاں گئی اور ان کے بعد ان ہی کے ہم پلہ کرسچین زمین دار خاندان سے ملاقات کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ ڈیڑھ سو سال میں عیسائیت نے ان کی شخصیت اور سائیکی ہی بدل دی ہے۔ کسی ہندو یا مسلمان زمین دار کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اپنے یہاں فلاحی ادارے قائم کرے۔ دنگل اور مشاعرے البتہ منعقد کیے جا رہے تھے۔ یہاں تاج پور میں ماحول ہی مختلف تھا۔ اندھوں کا اسکول، یتیم خانہ، گھریلو صنعتیں عجیب گہما گہمی تھی۔ ان کے ایک پُرفضا مصنوعی جنگل میں سے گزرتے ہوئے ایک ٹیلے پر پہنچی جس کے اوپر فاطمہ برج لکھا تھا۔ اس نام کو دیکھ کر مجھے اور زیادہ کوفت ہوئی کیوں کہ یہ فاطمہ بنت رسولؐ کی یادگار نہیں تھا بلکہ ہسپانیہ کے ایک شہر فاطمہ کے نام پر بنایا گیا تھا۔ اور یہ Our lady of Fatima کے کلیسا کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس کی کہانی یہ تھی کہ اسپین کے سابق اسلامی شہر مدینہ فاطمہ جس کا نام اپنے تسلّط کے بعد عیسائیوں نے تبدیل نہیں کیا، وہاں پر آج سے ستر اسّی سال قبل حضرت مریم کو چند گڈریا بچوں نے عالم رویا میں دیکھا، وہاں فوراً ایک چرچ تعمیر کیا گیا۔ اس میں حضرت مریم کی مورتی رکھی گئی۔ جب سے وہ شہر مدینہ فاطمہ ساری دنیا کی کیتھولک عیسائیوں کے لیے ایک بڑی زیارت گاہ بن چکا ہے۔ حضرت مریم کا وہ مجسمہ معجزنما سمجھا جاتا ہے اور چوں کہ حضرت مریم اس فاطمہ نامی شہر میں دکھلائی دی تھیں۔ ہندوستان میں بھی Our lady of Fatima کے کانوینٹ اسکول موجود ہیں جن میں مسلمان بچے جوق در جوق پڑھنے جاتے ہیں۔ علی گڑھ میں ہماری ایک سادہ لوح عزیزہ نے مجھ سے کہا، عیسائی بھی تو جنابِ زہرا کو مانتے ہیں، دیکھو انھوں نے لیڈی فاطمہ اسکول یہاں کھولا ہے۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ اللہ میاں شاید واقعی بہت ہی بے نیاز ہیں کہ اتنے بڑے اسلامی ملک ہسپانیہ سے اسلام کا نام و نشاں مٹ گیا، وہاں شان دار مساجد گرجا گھروں میں تبدیل کر دی گئیں۔ اللہ میاں نے ایسا کیوں ہونے دیا؟ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے بھی تو قسطنطنیہ کے عالی شان کلیسا سینٹ صوفی کو چھ سو سال تک مسجد بنائے رکھا۔ بہر حال اللہ میاں کی باتیں وہی جانیں۔!

عمر شیخ مرزا

آفتابِ زمیں

آفتابِ زمیں ہوں میں لیکن
مجھ سے روشن ہے آسمانِ سخن
(مصحفی، دیوان ہفتم)

حیات النسا بی بی عرف بھورا بیگم۔ یہ ان مخذرہ کا نام تھا اور گھر کا پتا... لیکن اسی میں تو مشکل تھی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے دن کا تیسرا پہر ہونے کو آیا تھا اور وہ گھر نہ ملنا تھا نہ ملا۔ کہنے کو تو بالکل آسان سی راہ تھی، جھوائی ٹولے میں حکیم منن صاحب کے احاطے کے پچھواڑے سے ایک گلی پھوٹتی ہے، بتانے والوں نے مجھے بتایا تھا۔ گلی آگے چل کر بند ہو جاتی ہے کہ وہاں معتمد الدولہ بہادر آغا میر وزیر اعظم مملکت اودھ کے کسی دشمن کی حویلی تھی، جب وہ صاحب دربار شاہی میں معتوب ہوئے تو معتمد الدولہ بہادر کو موقع ہاتھ آیا۔ جس شخص نے مسجدیں اور بے گناہ غریب غربا کے مکانات گروانے میں کوئی تامل نہ کیا ہو، اس کے لیے بادشاہ کے معتوب بدنصیب کی حویلی گروانا کیا مشکل تھا؟ بہرحال، مجھے بتایا گیا تھا کہ اس منہدم حویلی کے کھنڈروں کے ذرا پہلے ایک تاریک سی گلی اور ہے۔ اس میں داخل ہو جائیں، وہ آپ کو تھوڑے خم و پیچ کی سیر کرائے گی، لیکن بالآخر گندہ نالہ نامی محلے کے پھاٹک پر لا کر چھوڑ دے گی۔ وہاں پہنچ کر پوچھ لیجیے گا کہ راجا جھاؤ لال کے داروغہ کے اخلاف کہاں رہتے ہیں؟ کچھ تو نالے کے اِدھر ہیں، اور کچھ نالے کے پرلی طرف۔

"انھیں کے گھروں میں سے ایک گھر میں وہ بی بی رہتی ہیں، شاید۔ شاید اس لیے کہا کہ استاد مصحفی کی اہلِ خانہ ایک ضرور تھیں جو استاد کے فردوس مکانی ہونے کے بعد یہاں سے نکلیں، لیکن خدا معاف کرے، آپ کو شاید خبر ہو، استاد مغفور کے مراسم اور آشنائیاں... سو پتا نہیں کہ یہ وہی ہیں یا کوئی اور۔ امکان اور گمان دونوں کہتے ہیں کہ وہی ہوں گی۔ نام ان کا میں نے بتا ہی دیا ہے۔ اب جناب خود جا کر معلوم کر لیں۔"

مشکل یہ تھی کہ منہدم شدہ حویلی کے آس پاس کوئی گلی پھوٹتی نظر نہ آتی تھی۔ میں حکیم من صاحب کے احاطے کے دو تین چکر لگا چکا تھا۔ کئی آنے جانے والوں سے پوچھا، لیکن کسی نے بھی حسب دل خواہ اطلاع بہم نہ پہنچائی۔ برسات کے دن، شدید حبس والی گرمی، راہوں کا تعفن اور کیچڑ اس پر مستزاد۔ میں تو ہلکان تھا ہی، میرے ساتھ جو مزدور تحفہ جات کا خوان اٹھائے چل رہا تھا، وہ بھی میری آوارہ گردی سے اب دل برداشتہ ہوتا نظر آتا تھا۔

کہنے کو تو میں بھی لکھنؤ کا تھا، لیکن محض برائے نام۔ صفر ۱۲۰۸ (ستمبر ۱۷۹۳ء، مرتب) میں جب میں اس شہر مینو سواد میں پیدا ہوا تو اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ہماری شومی قسمت سے میرے والد ماجد لالہ کانجی مل صبا، جو عوام میں "چاندی والے" کے نام سے مشہور تھے، اچانک لقمۂ اجل ہوئے۔ "چاندی والے" وہ اس لیے کہلاتے تھے کہ چاندی کی خرید و فروخت ان کا پشتینی کاروبار تھا۔ میرے دادا جان مرحوم دہلی کے مشہور چھنا مل چاندی والوں کے چھوٹے بھائی تھے۔ بڑے بھائی سے کسی بات پر ناچاقی ہوئی تو انھوں نے سیدھے لکھنؤ کی راہ لی۔ یہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر یحییٰ خان بہادر ہزبر جنگ کا عہد سخاوت مہد تھا۔ دادا جان نے ایک ہی دو برس میں کاروبار کو اس قدر ترقی دی کہ دولت، عزت، شہرت، ہر بات میں وہ دلی میں مقیم اپنے بڑے بھائی سے بڑھ گئے۔

نئی جگہ کی مشقت اور دہلی چھوڑنے کے تعب نے میرے دادا مرحوم کی زندگی کے کئی برس کم کر دیے۔ شعبان ۱۲۰۴ (اپریل ۱۷۹۰ء، مرتب) میں بہ عمر پچاس سال وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔ ان کے بعد سارا مال و کاروبار میرے خلد مآب فرشتہ صفات باپ کانجی مل صبا کے ہاتھ لگا کہ وہ دادا جان مرحوم کے اکلوتے نور نظر اور ساری املاک و اموال کے وارث تھے۔ افسوس کہ کانجی مل صبا کو بھی اس دار فانی میں بہت دن قیام پذیر نہ ہونا تھا۔

لالہ کانجی مل صبا کے کچھ مرنے کے ایسے دن نہ تھے، لیکن اجل گرفتہ کے لیے ہزاروں بہانے ہیں۔ انھیں کئی مہینے سے ہلکا بخار رہتا تھا۔ کبھی کبھی کمر میں درد کی بھی شکایت کرتے۔ اطبا نے عمومی کمزوری کو ان شکایتوں کا باعث قرار دے کر مقویات دینا شروع کیے، لیکن کچھ خاص افاقہ نہ ہوا۔ بیماری کے باجود وہ روزمرہ، عام لوگوں کی زندگی گزارنے سے گریز نہ کرتے۔

ہولی کی تیسری شام تھی۔ والد صاحب مرحوم نہا دھو سج بن کر دوستوں سے ملنے کے لیے گھر سے نکلے۔ محبوب عراقی سمند کو سواری کے لیے انتخاب فرمایا۔ خدمت گار، دستی بردار، ساتھ تھے۔ چند ہی قدم گئے ہوں گے کہ اچانک سامنے سے کسی کے یوم پیدائش کا جلوس نکلا۔ میرے باپ کی جان جانا آج ہی کے دن کے لیے لکھا تھا۔ یکے می رود دیگر آید بجائے شاید ایسے ہی موقعے کے لیے کہا گیا تھا۔ سیر تفریح کرنے والوں اور تماشبینوں کے گروہ در گروہ، چہار جانب چرخ، بان، انار، ہوائی برج کا جوش۔ ہر چند کہ ایسے مواقع پر جنگی آتش بازی نہیں، گل کاری آتش بازیاں کام میں لاتے ہیں، لیکن اس دن اور

اس وقت خدا جانے کس ظالم کو شیطنت سوجھی کہ ایک ہاتھی چنگھاڑ روشن کر کے اس نے میرے والد کے صبا رفتار کے بالکل قدموں ہی میں تو ڈال دیا۔ زور کا دھماکا ہوا۔ اصیل گھوڑا نازک مزاج، بے اختیار الف ہوا۔ والد مرحوم نے ران باگ بنائے رکھنے اور پٹری جمائے رکھنے کی ہزار کوشش کی لیکن فرس بے لگام ہو چکا تھا۔ مرحوم نے گھوڑے کے ساتھ ایک چکر کھایا اور آن کی آن میں بیس قدم دور سر کے بل گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو بخار کے ساتھ کمر میں سخت درد تھا۔ کئی دن کی تفحص اور متعدد قاروروں کے معائنے کے بعد تشخیص یہ ہوئی کہ اصل مرض ریڑھ کی ہڈی کا تپِ دق تھا، گھوڑے سے گرنے کی ٹکان نے اس میں شدت پیدا کر دی تھی۔ اب بستر پر بے حس و حرکت لیٹے رہنے کے سوا چارہ نہ تھا۔

والد صاحب تین مہینے بستر سے لگے رہے، بہت رنج جسمانی اٹھا کر انھوں نے آخرکار جانِ شیریں جان آفریں کے سپرد کر دی۔

میری والدہ کی آنکھوں میں دنیا اندھیری ہو گئی۔ مجھ شیر خوار کو گود میں لے کر حویلی کی باؤلی میں چھلانگ لگانا چاہتی تھیں لیکن خادماؤں اور عزیزوں نے دوڑ کر مضبوطی سے ان کی کمر تھام لی۔ طبیب بلائے گئے، والدہ کو تیز سے تیز تر مسکنات دیے گئے، لیکن ہوش میں آنے پر ان کی ایک ہی رٹ تھی، میں اب نہ جیوں گی۔ میں ستی ہو جاؤں گی۔ وہ تو کہیے کہ میرے ماموں جان اور کچھ اور ننہالی لوگ بہت جلد پہنچ گئے۔ میرے چاچا کی منظوری سے وہ لوگ والدہ کو اور مجھے اپنے ساتھ عظیم آباد لے گئے۔ پھر انھیں بہت جلد عظیم آباد شہر کے شور غل سے بھری ہوئی مرطوب ہوا سے دور میرے نانا کے دیہی بنگلے میں منتقل کر دیا گیا۔

ہزاری باغ کے تاریک سر سبز جنگلات کے باہری سرے پر، ایک ننھے سے پہاڑی چشمے کے دامن میں بنے ہوئے اس مختصر لیکن خوش نما بنگلے میں پہنچ کر والدہ پھر وہیں کی ہو رہیں۔ انھوں نے پھر لکھنؤ اور لکھنؤ ہی کیا، عظیم آباد کا بھی منھ نہ دیکھا۔ رجب ۱۲۴۰ (فروری ۱۸۲۵، مرتب) میں ان کی آنکھ بند ہوئی۔ اس ساری مدت میں لکھنؤ کے املاک و تجارت پر میرے چاچا اور ان کی اولادیں قابض رہیں۔ نہ انھوں نے کبھی پوچھا کہ تم لوگ کیسے ہو؟ اور نہ ہم نے کبھی سوچا کہ لکھنؤ واپس جائیں۔

میرے والد مرحوم کو اپنے استاد حضرت شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے بہت محبت تھی۔ دلی سے تشریف لانے کے بعد حضرت شیخ نے ان کے یہاں چندے قیام بھی کیا تھا۔ لیکن فی مابین سلوک و رافت کے لیے قیام کی شرط نہ تھی۔ حضرت شیخ کی لکھنؤ تشریف آوری کے ہی وقت سے میرے والد کی طرف سے نیاز مندی اور خدمت گزاری اور حضرت استاد کی طرف سے شفقت و تعلیم و تدریب کا سلسلہ جو شروع ہوا تو وہ میرے والد مبرور کے اللہ کو پیارے ہونے ہی پر مختتم ہوا۔

والدہ مرحومہ کے داغ مفارقت دینے کے کچھ بعد حضرت شیخ کی سناونی ہم تک پہنچی۔ ان کا

وصال تو ۱۲۴۰ (۱۸۲۴، مرتب) کے شروع ہی میں ہو چکا تھا، لیکن اطلاع ہم لوگوں کو تاخیر سے ملی۔ ظاہر ہے کہ میں نے ان کا نام ہی نام سنا تھا۔ لیکن لکھنؤ کی بات چلتی تو میری والدہ حضرت شیخ کا ذکر اکثر درمیان لاتی تھیں اور قرائن سے ایسا لگتا تھا کہ وہ ان سے پردہ بھی نہیں کرتی تھیں۔ ان کا درجہ وہی تھا جو حضرت استاد کی کسی چہیتی بہو کا ہوتا، لیکن حضرت شیخ کی شخصیت میں ایسی دلچسپی، ایسی جاذبیت تھی، اور ان کا سارا وجود ایسا سحر خیز تھا کہ اماں جی خواہی نخواہی ان کی بیٹی بن بیٹھی تھیں۔

اماں کے جانے کے بعد ننھیال میں میرے لیے کوئی خاص دل کشی نہ رہ گئی تھی۔ حضرت شیخ کی باتیں اماں کی زبانی سن سن کر مجھے بھی حضرت سے یک گونہ لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی موت کی خبر سن کر ایک دھکا سا لگا۔ رائے صاحب رام خاموش نے کیا خوب تاریخ کہی تھی:

گفت صاحب رام تاریخِ وفات
مصحفِ معنی ز دنیا گشت گم

اتالیقوں کی توجہ اور ماموں صاحب کی سختی کی دولت سے میں نے فارسی، ریختہ، تھوڑی بہت عربی، ریاضی، سیاق اور دیگر علوم ضروریہ سیکھ لیے تھے۔ اساتذۂ فارسی میں میرزا بیدل، شیخ فیضی، آنند رام مخلص، نظیری، صائب، علی حزیں، خان آرزو وغیرہ کے کلام سے خوب واقف تھا۔ اور اساتذۂ ریختہ میں سے اکثر ہم کا کلام اچھی طرح دیکھ بھال اور سوچ سمجھ کر پڑھا تھا۔ بالخصوص رائے سرب سکھ دیوانہ، خدائے سخن حضرت میر تقی، مالک الملک سخن میرزا سودا، حضرت خواجہ میر درد اور پھر حضرت شیخ مصحفی کے دواوین متعددہ سے اچھی مزاولت پیدا کر لی تھی۔ والد مرحوم کی اتباع میں اپنے نام درباری مل کے ساتھ "وفا" تخلص بھی میں نے ٹانک لیا تھا۔ لیکن حق بات یہ تھی کہ میں نے اس وقت تک دو ہی چار قطعے اور ایک دو مخمس موزوں کیے ہوں گے، اور وہ بھی کسی استاد کی رہنمائی کے بغیر۔ غزل یا رباعی کہنے کی ہمت نہ تھی، مثنوی اور قصیدہ کہنے کے لیے نہ مضمون تھے نہ ممدوح۔

حضرت شیخ کے ارتحال پر رائے صاحب رام خاموش کی تاریخ سن کر میرے دل میں عجب ہوک سی اٹھی۔ جی چاہا کہ میں بھی لکھنؤ جاؤں، حضرت استاد کے کسی نامور شاگرد، مثلاً جناب خواجہ آتش صاحب یا منشی مظفر علی صاحب اسیر کے رشتۂ تلمذ سے خود کو کمربستہ کروں۔ ناقص ہی دنیا سے اٹھوں، لیکن کسی کامل کی شاگردی کی کلاہ آفتاب جناب تو سر پر ہو۔ یوں تو حضرت شیخ کے شاگردوں میں حضرت میرزا امان علی خان ذبیح عظیم آبادی گویا ہمارے پڑوس ہی میں تھے کہ ہزاری باغ سے عظیم آباد صرف چار دن کا سفر تھا، لیکن مجھے تو لکھنؤ کی کشش لیے جاتی تھی۔ حضرت استاد الشعرا خدائے سخن میر صاحب اعلی اللہ مقامہ کیا خوب فرماتے ہیں:

جس طرف دیکھو معرکہ سا ہے
شہر ہے یا کوئی تماشا ہے

چشم بد دور ایسی بستی ہے
یہی مقصد ہے ملک ہستی ہے
لکھنؤ دلّی سے بھی بہتر ہے
کہ کسو دل کی لاگ ایدھر ہے

اسے سنجوگ ہی کہیے یا خلطے کی خوبی کہ لکھنؤ جانا، جو بہت مشکل اور مستبعد معلوم ہو رہا تھا، درحقیقت بہت آسان نکلا۔ میں نے اپنے چاچا کو لکھا کہ میں بہ غرضِ تعلیم لکھنؤ آنا چاہتا ہوں۔ جائداد اور دکان کے بارے میں ایک حرف نہ لکھا، اور سچ یہ ہے کہ مجھے ایک حبہ بھی واگزار ہونے کی امید نہ تھی۔ لیکن خدا چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ میرے خط کا جواب آیا اور جلد آیا۔ چاچا نے لکھا کہ جب چاہو آجاؤ، ہم تمھارے منتظر ہیں۔ کہو تو زادِ راہ بھیج دیں۔ اپنی طویل خاموشی پر ان کی طرف سے کوئی اعتذار تو نہ تھا، لیکن میری ہلکی سی شکوہ سنجی بے شک تھی کہ میری اماں نے سسرال والوں کو، اور میں نے اپنے دادیہال کو بالکل ہی فراموش کر دیا تھا۔

''خیر یہ سب باتیں تو ہو رہیں گی۔'' انھوں نے لکھا، ''اب تم بس آ ہی جاؤ، کھانا وہاں کھاؤ تو پانی یہاں پیو۔ سب کی آنکھیں تمھاری معاودت پر لگی ہیں۔''

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ میں نے سازِ سفر مہیا کیا، کچھ سامان، کچھ تحفے تحائف بہلی پر بار کیے۔ دو نوکر ساتھ لیے، انھیں بہلی پر رکھا اور خود کے لیے دو عمدہ گھوڑے منتخب کیے۔ مجھے عورتوں سے کوئی خاص طوح نہ تھا۔ اپنی عمر کے مردوں میں رہنا اور مردانہ مشاغل، مثلاً شکار بازی، بنوٹ، بندوق اور طمنچہ کی مشق، تھوڑا بہت علم رمل، یہ میرے ان دنوں کے شوق تھے۔ شادی میں نے کی نہ تھی، لہٰذا کنبہ قبیلہ کا کوئی جھگڑا ٹنٹا نہ تھا۔ اپنے ہی علم کے زور پر نقش کھینچا اور مبارک و مسعود گھڑی متعین کر کے ماموں صاحب اور ہزاری باغ کو سلام کر کے نکل چلا۔ ہزاری باغ سے عظیم آباد کا سفر تین ہی دن میں پورا کیا۔ پھر ایک دن وہاں ٹھہر کر لکھنؤ کے لیے ہر چہ بادا باد کہہ کر روانہ ہوا۔

مہندرو گھاٹ پر گنگا جی کی وہ شان تھی کہ بس۔ چمکتی چمکیلی لہروں کا وفور، گھاٹ کی وسعت، پاٹ کی سر چکرا دینے والی چوڑائی، کشتیوں، چھوٹے بڑے بجروں، نواڑوں کا ہجوم، روسا کی مور پنکھیوں اور پنسوئیوں کی جھکا جھک کرتی چہل پہل، بار برداری خلاصیوں کا شور، اونٹوں کا ارنا ارانا، گھوڑوں کی ہنہناہٹ، گدھوں کا رینکنا، بچوں کی چیخ پکار، ناؤوں پر چڑھائی جاتی بیل گاڑیوں، بہلیوں اور رتھوں کی چرخ چوں، بعض بڑی کشتیوں سے صبح کے ناشتے کی تیاری کا دھواں اب تک اٹھتا ہوا، کہیں برہمن دیوتا لوگ سورج دیوتا اور گنگا میّا کی عبادت کے سنسکاروں میں محو، ایک پوری دنیا تھی جس سے میں اب تک بے خبر رہا تھا۔ جی میں لہر سی آئی کہ میں بھی کشتی سے کیوں نہ سفر کروں۔ لیکن پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بنارس پہنچ کر پھر خشکی ہی کی راہ پکڑنی ہوگی۔ لہٰذا یہیں سے زمینی قافلوں کے ساتھ لگے رہنا بہتر ہے۔

(۲)

جمعے کا مبارک دن تھا اور ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۴۰ (مطابق ۷ جولائی ۱۸۲۵، مرتب) کی تاریخ، جب ہم رشک خلخ و نوشاد، ثانی دولت گاہ بہشت سواد شاہ جہان آباد، شہر لکھنؤ پایہ تخت مصر رنگ و بو میں وارد ہوئے۔ اللہ اللہ کیا شہر اور کیا سواد شہر، سب ہلکے گلابی رنگ میں رنگے ہوئے سے لگتے تھے۔ رفعت الدولہ، رفیع الملک، شاہ زمن غازی الدین حیدر خان بہادر بادشاہ غازی کی جہانبانی اور انتظام دولت و کامرانی کے دن تھے۔ سارے جہان کے لوگ اور چار دانگ عالم کی خلقت اس ایک شہر میں یک جا و یک رنگ تھی۔ میں نے عالم شیر خوارگی میں لکھنؤ چھوڑا تھا اور آج جب ادھر کو مراجع ہوا ہوں تو انتیس تیس سال کا جوان تھا، اگر چہ ذرا ناکردہ کار و ناجہاں دیدہ تھا۔ لکھنؤ کی رونق دیکھ کر دیدے پھٹے کے پھٹے رہ گئے۔ یقین ہے کہ میں اگر جہاں دیدہ ہوتا تو بھی اسی حال میں ہوتا اور اسی حال کو پہنچتا۔

ایسا نہیں کہ غریب غربا لکھنؤ میں نہ تھے۔ بے شک تھے، اور بعض راہوں میں، جہاں سے میں گزرا، بہت تھے۔ اور اسے اتفاق کہیے یا یہ کہ شہر لکھنؤ کو منظور تھا کہ مجھے یہاں پہنچتے ہی میرے والد کا خلد آشیانی ہونا یاد دلایا جائے۔ ہم لوگ جس قافلے کے ساتھ تھے وہ چھپرہ، بلیا، غازی پور، بنارس، گوپی گنج، الٰہ آباد، سورام، سلون، اور اناؤ ہوتا ہوا شہر کی جنوبی مغربی سرحد پر نکلا تھا۔ یہاں پہنچ کر قافلے کا بڑا حصہ تو چار باغ ہو کر دل کشا کی طرف نکل گیا، اور ہم عیش باغ کے قبرستان کا چکر کاٹ کر اکبری دروازے کی طرف چلے۔

ہم تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ برات کا شور سنائی پڑا۔ معلوم ہوا نواب مستطاب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں وکیل شاہی نواب محمد خلیل الدین خان کے بھتیجے کی برات ہے۔ ہاتھیوں اور اونٹوں کی وہ کثرت تھی کہ الاماں۔ ہم تو ایک گھنے درخت کے نیچے دبک کر محفوظ رہے لیکن آرائش لوٹنے والوں کی وہ گت دیکھی کہ خدا یاد آگیا۔ نوعمر لڑکیاں میلے چیکٹ دوپٹے اوڑھے، پاجامے لیر لیر، اکثروں کے بدن کرتے یا شلوکے سے بے نیاز، بالوں کی جگہ بئے کی بھوری جھونجھ سی بنائے۔ ادھر سے لونڈے لفنگے، بھیک منگے جن کا حال ان لڑکیوں سے بھی بدتر۔ چہروں سے وحشت ٹپکتی ہوئی، بالوں کا رنگ شدت غبار آلودگی سے سیاہ کے بجائے گندہ ماشی۔ بعضوں کے بر میں صرف ایک سیاہ یا سیاہی مائل گزی کی لنگوٹ، ایک آدھ اس سے بھی بے نیاز۔ سب کے بدن سے پسینے اور میل اور چیکٹ تیل کا تعفن پھوٹتا ہوا۔ انھیں ہاتھیوں کے پاؤں تلے آنے کا خوف تھا نہ اونٹوں کے چوڑے کھائی جیسے جبڑوں کے درمیان اپنا سر دینے کا۔ دو چار تو ہمارے سامنے زخمی ہوئے۔ ایک کا کاسۂ سر گھوڑے کی ٹاپ سے چور چور ہوا۔ اور پھر جب روپیہ اشرفی پھلواری لوٹنے والے کامیاب ہو کر برات کے محاذ سے باہر نکلے تو شرابی لچوں نے اکثر کم زور عورتوں اور ضعیفوں کو چاقو دکھا کر یا محض ڈپٹ کر ان کی ساری لوٹ خود ہتھیا لی۔ کسی نے

مقاومت کی تو اسے دو ٹھوکریں اوپر سے رسید کیں۔ یقین ہے کہ گھر پہنچتے پہنچتے، اگر ان کا گھر کوئی تھا، تین چار بوڑھے عورت مرد تو یقیناً جاں بحق تسلیم ہو چکے ہوں۔

کہتے ہیں اس زمانے میں لکھنؤ جیسا متمول شہر ساری دولتِ ہند میں بلاد بنگالہ سے لے کر تا ساحلِ کرناٹک کوئی نہ تھا۔ پھر میں برات کی سج دھج کیا لکھوں۔ خیموں اور شامیانوں کا ایک محلہ تھا جو پہیوں، رتھوں، اونٹوں، اور پالکی برداروں کے سہارے تختِ سلیمانی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ برات کے ساتھ خدم و حشم بھی بے شمار تھا۔ مجھے اکبری دروازے سے ذرا ادھر ہی ایک گلی سے ہو کر خیالی گنج اپنے آبائی مکان تک پہنچنے میں کوئی ایک گھنٹا لگ گیا۔ شام اچھی طرح بھیگ چکی تھی لیکن سب لوگ وہاں میرے منتظر تھے۔ چچا چچی نے پوری آؤ بھگت کے ساتھ مجھے اتارا۔ رہنے کے لیے پرانی حویلی کے کمرے جو میرے باپ کے وقتوں سے بند پڑے تھے، پہلے ہی سے کھلوا دیے گئے تھے۔ ہر آسائش موجود تھی، لیکن چاچا کے اصرار پر وہ رات میں نے انھیں کی حویلی میں گزاری۔

صبح ہوتے ہی چاچا نے میرے باپ کی دکان کی کنجیاں، زمینات کے قبالے اور حساب کتاب کے کاغذ میرے حوالے کیے اور فرمایا:

''لو میاں! یہ سب آج سے پھر تمھارا ہے۔ بھائی مرحوم کی جائداد اور دکان سے جو نفع ہوا اس کا پائی پائی کا حساب موجود ہے۔'' وہ ذرا دیر چپ رہے، لیکن مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہ تھی۔ ''یہ ضرور ہے کہ وہ سارا نفع ہم نے اپنے اوپر صرف کیا۔ اب تم اسے ہماری نگہ داشت کا معاوضہ سمجھو یا قرض کے طور...''

اب مجھے قطعِ کلام کے سوا چارہ نہ تھا۔ ''چاچا جی، میں اسے معاوضہ سمجھوں گا نہ قرض۔ جس کا حق تھا وہ متصرّف ہوا۔ آپ میری امانت مجھے واپس دے رہے ہیں۔ مجھے اور کیا درکار ہو سکتا تھا؟''

(۳)

کسلِ راہ کو دفع کرنے، لکھنؤ میں قدم جمانے اور دکان کے معاملات سمجھ لینے کے بعد مجھے حضرت شیخ کے اعقاب کی تلاش ہوئی۔ میرے چاچا کے گھرانے میں کوئی شاعر نہ تھا اور نہ کسی کو شعر و سخن سے کوئی لگاؤ ہی تھا۔ وہ حضرت شیخ کے نام سے تو واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں، لیکن اس سے زیادہ انھیں کچھ نہ معلوم تھا۔ حسنِ اتفاق سے میری دکان میں ایک نائب منشی سالار بخش عرف سالارو میاں نکل آئے جنھیں شیخ صاحب مرحوم کے مسکن اور مدفن کا علم تھا۔ سالارو میاں نے بتایا کہ شیخ مصحفی مرحوم نے کوئی جسمانی یادگار نہیں چھوڑی۔ ان کی آخری قیام گاہ منصور نگر کے پاس کلتیا گنج کے ایک ذاتی مکان میں تھی (اب نہ وہ محلہ باقی ہے نہ وہ مکان، مرتب)۔ منصور نگر کے پاس

ہی درگاہ حضرت عباس کے پچھواڑے ایک قبرستان ہے، وہاں انھیں دفن کیا گیا۔ مکان میں اب کون رہتا ہے، یہ انھیں خبر نہ تھی۔

سلارو میاں کی رہنمائی میں مجھے کلیانہ گنج پہنچنے اور استاد مغفور کا مکان ڈھونڈنے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ ذرا نیچی کرسی کا، لیکن پختہ مکان تھا۔ صدر دروازہ بالکل سر راہ کھلتا تھا، کوئی احاطہ یا پھاٹک نہ تھا، اور نہ کوئی دالان یا سہ دری جہاں بیٹھ کر آنے جانے والے شیخ صاحب کے برآمد ہونے کا انتظار کر سکتے تھے۔ دیواروں پر چونے کی سفیدی تھی لیکن مجموعی طور پر ماحول کچھ اجڑا اجڑا لگتا تھا۔ میں نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی، خیال تھا کہ استاد مرحوم کی بیوہ یہیں رہتی ہوں گی تو کوئی ماما، دائی وغیرہ بھی ساتھ ہوگی۔

کئی بار کی دستک اور کنڈی کھٹکھٹانے کے بعد میں مایوس ہو چلا تھا کہ اندر سے کچھ پھنسی پھنسی ہانپتی سی آواز آئی، گویا بولنے والا دمے کا مریض ہو۔ ''آتے ہیں، آتے ہیں۔ کاہے کو دنگا مچاتے ہو صاحب!''

پھر دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلا، گویا بہت کم کھلتا ہو۔ ایک دبلے پتلے عمر رسیدہ بزرگ برآمد ہوئے۔ چگی ڈاڑھی، چوندھیائی ہوئی سی آنکھ، بدن میں ملگجا موٹے کپڑے کا کرتا، اسی طرح کے کپڑے کا ڈھیلا پاجامہ پہنے ہوئے، انگرکے صدری سے بے نیاز۔ ان کی آواز میں بھی دروازے کی سی چرچراہٹ تھی۔

''فرمایئے، کون صاحب ہیں؟''

''استاد مصحفی کا دولت کدہ یہی ہے؟''

''تھا تو یہی، لیکن اب یہاں ہم رہتے ہیں۔'' وہ کھیسیں نکال کر گنواروں کی سی عجب شان تفاخر سے بولے۔ ''استاد کے دن لد گئے۔''

''اور... آپ؟'' میں نے ذرا اٹک اٹک کر پوچھا۔

''میں ان کے چھوٹے بھائی غلام صمدانی مرحوم کے برادر نسبتی کا بھانجا ہوں۔ اوائل عمری سے لکھنؤ میں رہتا آیا ہوں۔ استاد کا تنہا وارث میں ہی ہوں۔''

''اور ان کی اہل خانہ محترمہ استانی بیگم...؟''

''اہل خانہ، کون اہل خانہ؟'' وہ بھڑ کر بولے۔ ''کون ہیں آپ اس مال زادی کو اہلِ خانہ بتانے والے؟ نہ نکاح نہ رخصتی نہ مانگے کا پتا نہ باپ ماں کی خبر۔'' وہ کھانسنے لگے، لیکن جوشِ بیاں میں کمی نہ آئی تھی۔

''میں نے اسے چلتا کر دیا۔ سنتے ہو میاں صاحب زادے! اور اب تم کون ہو اس کا پتا نشان ڈھونڈنے والے؟ کیا وہ تمھاری کوئی لگتی ہے؟''

میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بات کو کیسے آگے بڑھاؤں۔ یہ تو طے تھا کہ ان حضرت نے صرف اس چھوٹے سے مکان کی خاطر بے چاری بیوہ کو زبردستی بے دخل کر دیا اور دھونس یہ رکھی کہ وہ نہ نکاحی تھی نہ متاہی، اس کا کوئی حق ہی نہ تھا۔ لیکن وہ گئیں تو گئیں کہاں؟ یہاں ان کا پوچھنے والا والی وارث بھلا کون ہوگا؟ بچی ڈاڑھی والے صاحب تو کہہ رہے تھے کہ ان کے باپ ماں کا پتا نہیں۔ خدا معلوم یہ صحیح ہے یا جھوٹ۔ شاید بچارے مر ہی کھپ گئے ہوں۔ آج کل مرتے کیسے دیر لگتی ہے!؟

''لیکن آپ نے انھیں کہاں بھیج دیا؟'' میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

''بھیجتا؟ میں کیوں بھیجتا؟ چلی گئی ہوگی چوک کے کسی کوٹھے پر۔ ہم شرفا کو ان باتوں کی کچھ خبر نہیں۔'' یہ کہتے کہتے انھوں نے دروازہ جھٹکے سے بند کر لیا۔ میرے جی میں تو آئی کہ دروازہ دوبارہ اس زور سے بھڑ بھڑاؤں کہ ایک پٹ ٹوٹ ہی تو جائے اور ان ذاتِ شریف کی گردن میں ہاتھ دے کر ایک پٹخنی بتاؤں، لیکن ایک اور بزرگ جو سرِ راہ یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے، آگے آئے اور بولے:

''میاں صاحب! کیا حضرت شیخ کی بی بی کو ڈھونڈ رہے ہیں؟''

''جی، مگر یہ ولد الابلیس پتے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتا۔'' میں نے بھنا کر کہا، لیکن یہ نکتہ بھی مجھ سے پوشیدہ نہ رہا تھا کہ ان صاحب نے ''بی بی'' کہا تھا، ''بیوہ'' یا ''بیگم'' نہیں۔

''وہ کیا بتائے گا، ذات سے مجہول، نسب سے معدوم۔ خود کو شیخ صاحب کا سگا رشتہ دار بتاتا ہے۔ یہ سب ہتھکنڈے اس ذرا سے مکان کو ہتھیانے کے تھے۔ کوتوال کے گرگوں کو چاندی کے چند سکے دے کر اپنا الّو سیدھا کر لیا۔ غریب بی بی روتی ہوئی گھر سے نکلی۔''

''تو اب وہ بھلا کہاں ملیں گی؟'' میں نے تقریباً مایوس ہو کر پوچھا۔ اس کے جواب میں ان بزرگ نے گندے نالے اور راجا جھاؤ لال کے احاطے کے گھروں کا وہی پتا بتایا جس کی تلاش میں اب مجھے کئی پہر ہو چکے تھے۔

اس دن تو نہیں، لیکن دو تین دن بعد میں نے دوبارہ لکھنؤ کے گلی کوچوں کی خاک چھاننے کی ٹھانی۔ اس دن سالارو میاں ساتھ نہ تھے۔ شہر میں آشوبِ چشم کی وبا پھیلی ہوئی تھی اور سالارو میاں بھی دیدے پٹم کر کے اپنی کوٹھری میں پڑ گئے تھے۔ میں نے ایک مزدور کے سر پر تحفہ جات کا خوان دھروا لیا تھا۔ خیال تھا کہ اس سے راہ بات ڈھونڈنے میں بھی مدد ملے گی۔ لیکن وہ مجھ سے بھی زیادہ بلّلا نکلا۔ اسے شیش محل، خیالی گنج، امام باڑہ سبطین آباد، رستوگی محلے، سے زیادہ کی کچھ خبر نہ تھی۔

بالآخر راستہ مل ہی گیا اور اپنے آپ ہی ملا۔ ہوا یوں کہ کچھ تو بتانے والے کی بھول تھی اور کچھ میرا سہو۔ اصل صورت یہ تھی کہ حکیم منّن صاحب کے احاطے کے پچھواڑے نہیں بلکہ ان کے مکان اور انگی حویلی کے بیچ میں ایک پتلی سی گلی تھی، اتنی پتلی کہ اس میں دھوپ بھی شاید ہی کبھی پہنچ پاتی ہو۔ اس گلے کے پربی طرف ایک اور احاطہ تھا اور اس احاطے کے پچھواڑے وہ نالہ بہتا تھا جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔ مطلوبہ

گلی کے دہانے پر کسی نے دیر سے ایک چھکڑا کچھ یوں کھڑا کر دیا تھا کہ گلی پر نظر جاتی نہ تھی۔ جب وہ چھکڑا ہٹا تو گلی بھی نظر آئی اور باقی سارا راستہ بھی آئینہ ہو گیا۔

چھوٹا سا گھر تھا، کچھ کچا کچھ پکا۔ نالے کے اوپر ایک کم زور سی محرابی پلیا، پلیا کے سرے پر تین سیڑھیاں جو اسے گھر کے باہری برآمدے سے ملاتی تھیں۔ نالے کا پرلا کنارہ ذرا اونچائی پر تھا، اور خود وہ گھر نالے کے دوسرے کنارے سے کوئی چار پانچ ہاتھ اوپر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر اٹکا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ نالے کی بد بو، کوڑے کے ڈھیر، جن پر بھینسوں، سوروں، اور کتوں کے مسکن۔ مجھے حضرت استاد کے محبِ صادق الوداد میر حسن مرحوم کے شعر یاد آئے:

زبس یہ شہر ہے پیڑ پہ بستا
کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستہ
کسی کا آسماں پر گھر ہوا میں
کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں
ہر اک کوچہ یہاں پر تنگ تر ہے
ہوا کا بھی یہ مشکل واں گزر ہے

پلیا کی اینٹوں کو لونی لگ چکی تھی اور برآمدے کی کرسی بھی لونی اور کائی سے بد رنگ ہو رہی تھی۔ مجھے پلیا کو پار کرنے میں تکلف ہو رہا تھا کہ کہیں ڈھ ہی نہ جائے۔ لیکن پھر میں نے دل میں کہا یہ کیا احمقانہ بیان ہے۔ روز و شب یہ پلیا استعمال میں ہے، اسے گرنا ہوتا تو اب تک گر چکی ہوتی۔ اور سچ پوچھیے تو اس علاقے میں بیش تر مسکن ایسے ہی تھے، اور مجھے بہر حال اس برآمدے میں پہنچ کر دروازے پر دستک دینی تھی۔

مزدور کو پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے میں نے ذرا لپک جھپک پلیا اور سیڑھیاں طے کیں اور برآمدے میں صحیح و سالم اترا۔ دروازہ بند تو شاید نہ تھا لیکن اس پر ٹاٹ کا بھاری پردہ پڑا ہوا تھا۔ مجھے حضرت شیخ کا شعر یاد آیا:

پڑتی نہیں ہے اس پہ ترے نور کی چمک
اے ماہ رو نہ پردۂ در اپنا ٹاٹ کر

میں نے بڑھ کر دروازے پر دستک دی تو معاً ایک دس بارہ سال کا لونڈا عرقی اور صدری پہنے ہوئے، پاؤں جوتیوں سے بے نیاز، باہر آیا۔

"جی، فرمایئے!" اس کی آواز میں ہمارے مشرقی اطراف کے لہجے کی مٹھاس تھی۔

میں دبدھا میں تھا کہ غلط دروازے پر تو نہیں آ گیا، لیکن اب آ گیا تھا تو عرضِ مدعا کرنا ہی تھی۔ "وہ... مجھے... استانی جی صاحب تشریف رکھتی ہیں؟" میں نے ذرا اٹکتے ہوئے کہا۔

''جی کون، استاد شیخ مصحفی صاحب کی گھر میں سے ملنے کو تشریف لائے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ مجھے اطمینان ہوا کہ صحیح گھر پر دستک دی ہے اور یہ بھی کہ میری طرح شاید اور بھی نیاز مندوں کی آمد و رفت یہاں تھی۔ لہٰذا میرا اس طرح اچانک آجانا شاید کچھ بہت معیوب نہ تھا۔

''اگر انھیں زحمت نہ ہو تو میں ذرا سلام کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اور کوئی خاص کام نہیں ہے۔''

''کیا کہہ دوں، جناب کہاں سے تشریف لائے؟''

''بیٹا بس یہ کہہ دو کہ لالہ کانجی مل صبا مرحوم کا بیٹا درباری مل وفا علاقہ بہار سے سلام کو حاضر ہوا ہے۔''

''بہت مناسب!'' کہہ کر وہ لڑکا جھپٹ کر اندر گیا، پھر فوراً ہی باہر نکلا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بوسیدہ سی چٹائی اور دوسرے میں کچھ اتنا ہی سال خوردہ مونڈھا تھا۔ چٹائی بچھا کر اس نے مونڈھا اس کے سامنے رکھا، مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ پھر اندر گیا۔ اس بار باہر آیا تو وہ ایک چھوٹی سی تپائی لیے ہوئے تھا۔ تپائی میرے سامنے رکھ کر وہ پھر اندر گیا۔ اس بار وہ ہمارے لیے پانی لایا تھا، تانبے کے بڑے سے گلاس میں میرے لیے، اور مٹی کی چھوٹی سی گڑوی میں میرے مزدور کے لیے۔ اس کی ساری حرکات و سکنات اس قدر سدھی ہوئی تھیں کہ ان میں کسی چھوٹے سے چشمے کی لہروں جیسی روانی تھی۔

''بھئی بہت خوب،'' میں نے کہا۔ ''تم تو اپنے کاموں میں مشاق ہو۔ کیا نام ہے تمھارا، کہاں کے ہو؟''

''میرا نام محمد راجا ہے جناب،'' اس نے جواب دیا، ''میں کنتت ضلع مرزا پور کا ہوں۔'' مجھے یاد آیا کہ کنتت میں مسلمان شرفا اور اصفیا کی بڑی بستی ہے۔ جلال الدین ابو المنصور خان شجاع الدولہ بہادر اسد جنگ کے مفتیِ اعظم علامہ محمد ابراہیم بنارسی جو خان علامہ کے استادوں میں تھے، اصلاً کنتت کے تھے۔ میں ابھی محمد راجا سے کچھ اور پوچھتا لیکن جس کام سے آیا تھا اسے سرانجام دینا ابھی باقی ہی تھا۔ میں نے اپنے مزدور کو اشارہ کیا تو اس نے بڑھ کر اپنے سر سے خوان اتارا اور محمد راجا کو تھما دیا۔ خوان میں سرپوش کے تلے ایک بھاگل پوری ریشمی تھان، ایک تھیلی میں لکھنوی بادشاہی ٹکسال کے ایک سو ایک روپے، اور ایک ٹوکری میں شیخ کولی کے یہاں کی مٹھائی تھی۔ بھاگل پوری تھان میں عظیم آباد سے حضرت شیخ کے گھر پر نذر کے لیے میں بہ طور خاص لایا تھا۔

اندر سے اب حقہ تازہ ہونے کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ نہایت لطیف خمیرے کی خوش بوؤں کی لپٹ سے میری طبیعت معطر ہونے لگی تھی۔ محمد راجا نے بدقت خوان کو سنبھال کر اندر کی راہ لی، پھر لحظہ بھر بعد حقہ اٹھائے ہوئے باہر آیا۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سی آہٹ سی ہوئی۔ میں نے نگاہیں اپنی جوتیوں پر مضبوطی سے جمائے رکھیں کہ غض بصر ملحوظ تھا۔ ہلکی سی کھانسی کے بعد پردے کے

پیچھے سے آواز آئی:

''میاں صاحب زادے! آپ نے تشریف آوری کی زحمت کی، یہی بہت تھا۔ اس پر اتنے تکلفات کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو آپ کی تقدیم کا کچھ بھی بند و بست نہ کر سکوں ہوں۔ مجھے ناحق شرمندہ کیا آپ نے۔ کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں، شیخ صاحب ہی آپ کا حق ادا کر سکتے تھے۔''

آواز ہلکی سی گلوگیر تھی، جیسے بعض بہت نازک مزاج لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ صوت بلند میں کلام نہیں کر سکتے، تقریباً سرگوشی کے لہجے میں گفتگو کرتے ہیں۔ یا شاید اس وقت حضرت شیخ کی یاد میں رنج کا غلبہ ہو گیا ہو۔ بولی میں پورب کا لوچ لہریں لے رہا تھا۔ اس باعث صاحب صوت کی عمر کا بھی اندازہ نہ ہوتا تھا۔ بوڑھوں کی سی آواز تو ہرگز نہ تھی۔

میں ذرا سنبھل کر بولا، ''قبلہ استانی صاحب! شرمندہ تو میں ہوں کہ آپ پر اتنی بپتا پڑی اور میں یہاں نہ تھا کہ آپ کے کسی کام ہی آتا۔ میں چند ہی دن ہوئے اطراف عظیم آباد سے حاضر ہوا ہوں۔''

''افسوس کہ آپ کے والد میرے زمانے کے پہلے تھے۔ میں نے انھیں نہیں دیکھا، لیکن شیخ صاحب کبھی کبھی ان کا ذکر کرتے تھے۔ اس بات کو انھوں نے اکثر کہا کہ وہ ایک مدت تک آپ کے والد کے یہاں قیام پذیر رہے تھے۔'' انھوں نے اپنی بپتا کی بات بیچ سے اڑا دی۔ بہ ظاہر وہ کسی اجنبی کے سامنے اپنی ذلت کا حال زیر بحث لانا پسند نہ کرتی تھیں۔ مجھے حفظِ نفس کی یہ ادا اچھی لگی۔ میں نے بھی انھیں کی بات کا انداز اختیار کیا۔

''جی ہاں، ان کے انتقالِ پُر ملال کے وقت میں بھی بہت چھوٹا تھا۔ بیوہ ہوتے ہی میری والدہ مجھے لے کر مائکے چلی گئی تھیں۔ ابھی چند مہینے ہوئے وہ بھی جنت کو سدھاریں۔''

''انا للہ و انا الیہ راجعون۔ رہے نام اللہ کا۔'' انھوں نے اسی سرگوشی نما آواز میں کہا۔ ''تو صاحب زادے اب آپ بالکل تنہا رہ گئے، افسوس۔''

''جی اس قدر تنہا بھی نہیں۔ یہاں واپس آ کر میں نے آبائی کاروبار سنبھال لیا ہے۔ ارادہ ہے کہ یہیں رہوں گا، خواجہ آتش سے مشورۂ سخن کروں گا اور آپ کی اجازت ہو گی تو کبھی کبھی سلام کو حاضر ہو جایا کروں گا۔''

''میاں صاحب آپ جگ جگ جئیں۔ ضرور قدم رنجہ فرماتے رہیں۔ بندی پر کرم ہو گا۔''

''اماں جی مرحومہ کو حضرت شیخ اپنی بہو کی طرح سمجھتے تھے۔ وہ غالباً ان سے پردہ بھی نہ فرماتی تھیں۔ مجھے حضرت شیخ کے حالات سننے کا بہت شوق ہے۔ اگر آپ کرم ارزانی فرمائیں۔''

''لال میاں! آپ تو میرے بیٹے کی طرح ٹھہرے۔ جب جی چاہے تشریف لائیں، شیخ صاحب کے ذکر اذکار سے میرا بھی جی بہلے گا۔''

''بہتر ہے، اب میں اجازت چاہتا ہوں،'' میں اٹھتا ہوا بولا۔ ''چندے بھر قدم بوسی کو حاضر

ہوں گا۔"

"لال میاں صاحب..." لہجے میں ہلکی سی ہچکچاہٹ، کچھ شرمندگی سی جھلک رہی تھی۔ "ایک عرض سنتے جایئے۔"

میں ذرا متوحش ہوا کہ اب تک تو یہ اتنے اعتماد سے حرف زن رہی تھیں، پھر اچانک یہ عدم تیقن کیوں؟ میں مونڈھا چھوڑ چکا تھا، وہیں رک کر بولا، "ارشاد۔"

"آپ یہ اتنا قیمتی ریشمی تھان جو لائے ہیں، میں بیوہ عورت، یہ میرے کس کام کا؟ اور اس کے جوڑے بنواؤں بھی تو کہاں پہنوں..." وہ پھر ٹھہر گئیں۔

"اب رکھ ہی لیجیے، میں اسے واپس تو لے نہ جاؤں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"جی میں کچھ اور کہہ رہی تھی... اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اسے... اسے فروخت کر دوں..."

مجھے اطمینان سا محسوس ہوا کہ اور کوئی بات نہ تھی۔ "جناب عالیہ! آپ کا مال ہے۔ جس طرح چاہیں تصرف میں لائیں۔"

(۴)

شہر میں سہالگیں چل رہی تھیں۔ غربا کے گھروں میں چاندی کے زیوروں اور امرا کے یہاں چاندی کے ظروف کی خریداریوں کا بازار گرم تھا۔ مجھے حضرت شیخ کے یہاں جانے کی فرصت کوئی ایک ماہ بعد ہی مل سکی۔ شرمندگی مٹانے کے لیے اس بار بھی کچھ تحائف ساتھ لیتا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر پہلی بات یہ دکھائی دی کہ گھر پہلے کی بہ نسبت کچھ صاف ستھرا لگ رہا تھا، سفیدی بھی تازہ تازہ ہوئی تھی۔ محمد راجا نے مجھے دیکھ کر تین فرشی سلام کیے، تحفہ جات لے کر اندر گیا اور فوراً ہی باہر آ کر بولا، "بی بی صاحب آپ کو اندر بلوا رہی ہیں۔"

میں گڑبڑا گیا۔ اندر بلوا رہی ہیں؟ اچانک یہ بے تکلفی کیسی؟ مرتا کیا نہ کرتا، پردہ ہٹا کر محمد راجا کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوا۔

بہت چھوٹی سی انگنائی، اس کے ایک طرف جائے ضرور، ایک طرف باورچی خانہ۔ انگنائی سے متصل دوسرے سرے پر بہت تنگ سا دالان۔ اس میں ایک پلنگڑی بچھی ہوئی جس پر معمولی فرخ آبادی چادر کا پلنگ پوش۔ اس کے سامنے نماز کی چوکی کے برابر ایک تخت جس پر ہلکا سا قالین بچھا ہوا۔ دالان کے بعد صرف ایک تنگ سا کمرہ۔ یہی کچھ اس گھر کی بساط تھی۔ کمرے کا دروازہ بند، دالان میں کوئی نہ تھا۔ میں تھوڑے سے تذبذب کے بعد تخت پر بیٹھ گیا، اس طرح کہ میری پشت کمرے کے دروازے کی طرف تھی۔

محمد راجا حقہ تازہ کرنے میں لگا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔ میں اضطراراً

اٹھ کھڑا ہوا، مڑ کر دیکھا تو بھورا بیگم سامنے تھیں۔ میں نے جھک کر آداب کیا۔

''جیتے رہیں لال میاں، اچھے تو رہے؟ بہت دن بعد یاد کیا۔'' ان کی آواز اب بھی پہلے جیسی ذرا گلوگرفتہ پھنسی پھنسی ہوئی سی تھی۔

میری سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ نگاہ کہاں رکھوں، آنکھ اٹھائے بغیر بات کرنا بھی نامناسب تھا۔ انھوں نے شاید میری مشکل سمجھ لی۔ خود آکر پلنگ پر بیٹھ گئیں، مجھے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہوئی بولیں:

''میاں وفا صاحب، آپ کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک شیخ صاحب کے اس زمانے کو سوچتی رہی جب میں نہ تھی۔ آپ نے کہا تھا نہ کہ آپ کی والدہ کا ان سے پردہ نہ تھا۔ اور آپ نے مجھ پر اتنا احسان کیا کہ میرا اپنا بیٹا بھی اس سے زیادہ کیا کرتا...''

ان کی آنکھیں کچھ چھلکنے لگی تھیں۔ اور بات بھی تھوڑی بہت میری سمجھ میں آرہی تھی۔ انھیں کچھ سسکی سی آئی جسے روک کر وہ بولیں، ''میں بوڑھی بیوہ عورت، آپ کے باپ میرے وارث کے خاص لوگ تھے۔ آپ میرے بچے کی طرح ہیں۔ اب آپ سے پردہ کیا کروں؟''

انھوں نے دوپٹے سے آنکھیں خشک کیں۔ مجھے سر اٹھانے کی ذرا ہمت ہوئی تو میں نے انھیں بھرپور دیکھا۔

ان کا سن یہی کوئی پینتالیس چھیالیس کا رہا ہوگا۔ بوٹا سا قد، گداز بدن۔ بہت گورا رنگ، گول چہرہ، چہرے کے نقوش نازک اور چہرہ جھریوں سے عاری۔ پتلے پتلے ہونٹوں پر پان کا لاکھا جما ہوا، ناک ذرا دبی ہوئی سی، جیسی بعض نوعمر لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ سر پر دوپٹہ، لیکن خاصی بھاری چوٹی پیٹھ پر لٹکتی ہوئی۔ بالوں کا رنگ کبھی بھورا سنہرا رہا ہوگا، اب کہیں کہیں سے ملگجا ہونے لگا تھا۔ بہت بڑی بڑی سبزی مائل بھوری آنکھیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ انھیں بھورا بیگم کیوں کہتے تھے۔ چہرہ کسی خاص تاثر سے معترا، لیکن آنکھیں گویا بولتی ہوئی سی تھیں۔ دوسری بار نظر اٹھائی تو لگا کہ بائیں آنکھ کی پتلی اپنی جگہ سے تل برابر ہٹی ہوئی ہے، لیکن آنکھوں میں سخن گوئی کی شان اتنی ہے کہ یہ عیب بھی بھلا لگتا ہے۔ مجھے حضرت شیخ کی غزل یاد آئی، کیا پتا انھیں کے لیے کہی ہو:

ہیں تری سحر سامری آنکھیں
نہ کریں کیوں کہ کافری آنکھیں
زہر کھاتے ہیں ان پہ کیا کیا لوگ
ہیں جو کیری سی بس ہری آنکھیں
مصحفی کتنی زیب دیتی ہیں
گورے چہرے پہ سانوری آنکھیں

میں تو انھیں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ موٹی سفید ململ کا ڈھائی گزا دوپٹہ اوڑھے، ملاگیری رنگ

کی محمودی کا تنگ پاجامہ اور اسی کپڑے کا لمبا ڈھیلا کرتا پہنے۔ ناک کان سب زیور سے عاری، صرف دونوں سڈول کلائیوں میں سونے کی ایک ایک ہلکی چوڑی۔ اگر ان کے چہرے پر شرافت کی شان نہ ہوتی تو میں انھیں کسی رئیس زادی کی خادمہ سمجھتا۔

میرے دل میں ہزاروں سوال گونج رہے تھے۔ یہ بیگم میرے دادا استاد کی منکوحہ تھیں کہ ممتوعہ؟ حضرت شیخ تو شاید سنت جماعت تھے۔ تو کیا یہ بی بی اثنا عشری تھیں؟ اگر منکوحہ تھیں تو انھیں اس چگی ڈاڑھی والے نے اتنی آسانی سے بے دخل کیسے کر دیا؟ اور یہ مکان انھیں کہاں سے ملا؟ حضرت شیخ کے پاس یہ کتنا عرصہ رہیں؟ کہاں کی ہیں؟ بولی سے تو میرے ننہالی اطراف کی معلوم ہوتی ہیں۔ کوئی خانگی یا ڈیشیا تو ہرگز نہیں لگتیں۔ یا الٰہی معاملہ کیا ہے؟

میرے چہرے پر آتے جاتے رنگوں کو انھوں نے شاید ٹھیک پڑھ لیا۔ محمد راجا سے دوبارہ حقہ تازہ کرنے اور شربت پان حاضر کرنے کو کہہ کر وہ بولیں:

''آپ کے باپ کو میں نے نہیں دیکھا، لیکن شیخ صاحب کے تذکرے میں ان کا ذکر پڑھا ہے۔ ان کے انتقال کے وقت میں شیخ صاحب کو جانتی بھی نہ تھی۔''

میرے والد مرحوم کا ذکر کچھ اسی نہج سے وہ پہلے بھی کر چکی تھیں۔ اس وقت وہی بات چھیڑنے سے ان کی منشا غالباً یہ تھی کہ میں اسی تعلق سے سخن آغاز کروں۔

''آپ کا اور حضرت دادا استاد کا ساتھ تو بہت طویل رہا ہوگا؟'' میں نے سوچ سوچ کر یہ لفظ ادا کیے۔

''ہاں،'' انھوں نے مختصراً کہا، پھر چپ ہو گئیں۔ شاید وہ چاہتی تھیں کہ وہ خود سے کوئی بات نہ کہیں، میں کرید کرید کر معلوم کروں۔

''تو آپ کا ان سے نکاح، یا... یا... تعلق...؟'' مجھے لفظ ''متعہ'' کا تلفظ کرتے خود شرم سی آ رہی تھی۔ خدا جانے یہ سنی ہیں کہ شیعہ ہیں۔ سنی ہوں گی تو برا مان سکتی ہیں۔

ان کے چہرے پر زرد سی مسکراہٹ آئی۔ ''لال میاں! آپ تو کلیتا گنج والے مکان پر جا چکے ہیں۔''

ان کا مطلب شاید یہ تھا کہ وہاں سب کچھ سن ہی چکے ہوں گے، پھر لحاظ کیسا۔ ''جی، گیا تو تھا لیکن...''

''اچھا تو سنیے،'' ان کے لہجے میں اچانک ذرا قوت آ گئی تھی۔ ''میں شیخ صاحب کے ساتھ کوئی اٹھائیس انتیس برس رہی۔ شیخ صاحب خود سنی تھے، لیکن نام کے۔ وہ شیعوں میں شیعہ، سنیوں میں سنی، حتیٰ کہ لامذہبوں میں لامذہب تھے۔'' وہ پھر چپ ہو گئیں۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اب کون سی بات پوچھوں کہ جو سلسلۂ کلام کو دوبارہ قائم کرنے میں معاون ہو۔ پھر انھوں نے دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کیا

اور بولیں :

''اچھا، شیخ صاحب کے عقائد کے بارے میں پھر کبھی بتاؤں گی۔ لیکن میں اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتی کہ شیعہ ہوں یا سنی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ مسلمان بھی ہوں کہ نہیں۔'' میں نے کچھ کہنا چاہا، لیکن میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بھورا بیگم نے محسوس بھی نہ کیا کہ میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اب ان کی گفتگو میں روانی کچھ زیادہ تھی :

''میں سوا ڈیڑھ سال کی تھی جب میری ماں نے مجھے جنت آرام گاہ مرزا جنگلی مرحوم کی حویلی پر بیچ دیا۔ سنہ و سال مجھے یاد نہیں، لیکن اس زمانے میں وہ بنارس ہی میں تھے، نواب وزیر بننے میں دیر تھی۔ بعد میں کسی نے مجھے بتایا کہ ہم لوگ غازی پور کے ہیں۔ وہاں صاحب بہادر لوگوں نے نیل کی کاشت بڑے پیمانے پر شروع کی تو غلہ مہنگا ہوتے ہوتے قحط کی نوبت آ گئی۔ بہت سی ماؤں نے اپنے بچے بیچ دیے کہ بچے کی جگہ اپنا پیٹ پال لیں اور بچے کو بھی ایک وقت پانی ملا دودھ میسر ہو جائے۔''

''ارے، ہائے افسوس، اللہ رحم کرے۔'' میرے منھ سے بے ساختہ نکلا۔ لیکن بھورا بیگم نے سنا بھی نہیں۔

''جنت آرام گاہ کی بیگم نے میرا نام حیات النسا بی بی رکھا۔'' ان کے چہرے پر عجب دردناک سی ہنسی کی رمق آئی۔

''قدرت کے بھی کھیل نرالے ہیں۔ قحط میں فاقہ زدہ ماں کی بھوکی مرتی شیر خوار بچی اور نام حیات النسا۔'' وہ ایک لحظہ چپ رہیں۔ ''لیکن میرے بھورے بالوں اور آنکھوں کے رنگ کی بنا پر مرزا بیگم نے مجھے بھورا بیگم کہنا شروع کر دیا۔ پھر یہی نام چل نکلا۔''

''تو آپ کی تربیت اور تعلیم اثنا عشری طرز پر نواب وزیر مرحوم کی حویلی میں ہوئی؟'' میں نے کچھ کہنے کی خاطر کہا۔

''ہاں، ایک طرح سے یہ درست ہے۔ لیکن جب میں پانچ سال کی ہوئی تو مرزا جنگلی نے مجھے اپنے محافظ دستۂ ذات کے کپتان فتح علی خان اور ان کی بیگم کے سپرد کر دیا۔ وہ میاں بیوی لاولد تھے۔ ان لوگوں نے بھی میری پرورش شیعہ طرز پر کی۔ تعلیم دلوائی، مرثیہ خوانی، نوحہ خوانی کے نکات بتائے، نشست و برخاست کے آداب سکھائے۔ عام رواج کے برخلاف مجھے فارسی اور تھوڑا بہت سیاق بھی سکھایا گیا۔ میں وہاں رہی تو کپتان بیگم کی خادمہ کے طور پر، لیکن مجھے آسائشیں سب گھر کی سی حاصل تھیں۔''

''تو آپ حضرت شیخ کے نکاح میں اس وقت آئیں جب نواب سعادت علی خان یہاں مسند وزارت پر متمکن ہوئے؟''

انھوں نے کچھ روہانسا منہ بنایا، دیر تک چپ رہیں۔ پھر اور بھی دھیمی آواز میں بولیں :

''نہیں، ایسا نہیں ہوا۔'' وہ کچھ کھوسی گئیں، پھر انھوں نے بہ ظاہر غیر متعلق بات کہی۔ ''مرزا

جنگلی کو بادشاہ دہلی نے کیا کیا خطابات دیے تھے۔ اشرف الوزرا، اعظم الامرا، یمین الدولہ، مبارز جنگ۔ لیکن ان کی حکومت کا علاقہ آصف الدولہ عدن مقام کی اقالیم سے بس آدھا تھا۔''

''جی ہاں، انگریز بہادر نے وزیر علی خان سے مسند لے کر انھیں عطا کی اور قیمت پوری وصول کی۔'' میں نے تلخ لہجے میں حضرت شیخ کا شعر پڑھا:

مالک الملک نصاریٰ ہوئے کلکتے لے
یہ تو نکلی عجب اک وضع کے جنجال کی کھال

''خیر، تو مرزا جنگلی کی وزارت میں کپتان فتح علی خان کو بڑا عروج ہوا، ظفر الدولہ خطاب ملا، افواج ریاست کے کمیدان اعظم مقرر ہوئے۔ میں نے بھی اچھے ہاتھ پاؤں نکالے تھے۔ شیخ صاحب کے روابط کپتان صاحب سے تھے، آنا جانا بھی تھا، لیکن میں نے انھیں کبھی دیکھا نہ سنا تھا۔''

''تو کیا انھوں نے آپ کے لیے رقعہ بھیجا؟'' میں نے پوچھا۔ ان کے چہرے پر دوبارہ کچھ کرب، کچھ کبیدگی کے آثار ہویدا ہوئے۔ ذرا ٹھہر کر وہ بولیں:

''میں بڑی ہو چکی تھی لیکن مجھے عورت مرد کے معاملات کے بارے میں صرف اتنا معلوم تھا کہ لوگوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ کپتان بیگم کا ایک بھتیجا تھا، شفیع بیگ اس کا نام تھا۔ تھا تو بالکل نکھٹو لیکن بہت بنا ٹھنا رہتا۔ وہ جب بھی ہمارے گھر آتا، مجھے چھیڑتا۔ کبھی کولھے پر بکٹا بھر لیا، کبھی دوپٹہ کھینچ لیا، کبھی گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ میں اس کے ڈر سے بھاگی بھاگی پھرتی۔ کبھی کبھی وہ رات کا کھانا دیر میں کھا کر ہمارے یہاں ہی سونے کو ٹھہر جاتا۔ ایسی راتیں تو مجھے عاشورے کی رات ہو جاتیں۔ میں اودبدا کر کپتان بیگم کے پلنگ کے نیچے اپنا بستر لگا لیتی۔ وہ ہزار بگڑتیں کہ مردار مجھے اس طرح نیند نہ آئے گی۔ لیکن میں اور کیا کرتی۔ شفیع بیگ کی شکایت کرتی تو اپنی ہی ناک چوٹی خطرے میں پڑ جاتی۔''

میں نے بڑی ہمت کر کے پوچھا، ''تو کیا بالآخر... آپ کو اس سے کوئی لگاؤ پیدا ہو گیا، یا...؟''

''توبہ ہے۔ مجھے اس کی شکل سے نفرت تھی۔ موا خواجہ سراؤں کی طرح سجا بنا رہتا تھا۔''

''تو پھر... داوا استاد...؟'' میں نے سوالیہ لہجے میں، لیکن ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔

''وہی تو بتا رہی ہوں۔'' انھوں نے کچھ اس طرح کہا گویا بات بتانے والی نہ ہو لیکن وہ بتانا چاہتی بھی ہوں۔ ''ایک دن کپتان بیگم نے کہا کہ دروازے کے ملازم خدا جانے کہاں مر گئے ہیں۔ بھورا تو ذرا استاد مصحفی کو دیوان خانے میں یہ خاصدان تو پہنچا آئیو۔ اور دیکھ وہاں رکنا ہرگز نہیں۔''

میرے بدن میں ہلکی سی تھرتھری پیدا ہوئی۔ مجھے ایسا لگا جو کچھ ان پر ہوا یا ہونے والا تھا وہ مجھ پر بھی گزر رہا تھا۔

''وہ ۱۲۱۴ (مطابق ۱۷۹۹، مرتب) کا سال تھا، سردیوں کا موسم۔ رمضان شریف شروع ہونے والے تھے۔ چند دن پہلے ظفر الدولہ کپتان فتح علی خان کی سالگرہ کے موقعے پر مجھے اورنگ آبادی

ہمرو کا جامہ بنوا دیا گیا تھا۔ جامہ پہننے کا زندگی میں یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ وہ اس ہمرو کی ریشمی نرمی، طاؤس جیسے رنگ، مجھے اب تک یاد ہیں۔ میں خود سے زیادہ اپنے جامے کو دیکھتی رہتی تھی۔ کپتان بیگم کا حکم سن، خاصدان ہاتھ میں لے، جھٹ دہلیز پار کر، دیوان خانے کا پردہ اٹھا جھپاک سے اندر پہنچ ہی تو گئی۔

''سارے وقت میری نگاہ اپنے جامے پر تھی۔ اب جو اندر آئی ہوں تو شیخ صاحب کو وہاں بیٹھا ہوا دیکھا، گھبراہٹ اور شرم سے میری سانس پھولنے لگی تھی۔ اوئی اللہ یہاں تو کوئی ہے، بے ساختہ میرے منھ سے نکلا۔

''اس وقت ان کا حلیہ کیا بیان کروں۔ عجب سحر طراز شخصیت تھی ان کی۔ کپتان صاحب کے یہاں ایک سے ایک لوگ آتے جاتے تھے، ان میں مندراجے اور بسواڑے کے راجپوت، فرخ آباد کے لبے تڑنگے کانکج برہمن، کابل کے خان، کبھی کبھی ایران کے آغا لوگ بھی ملنے آ جاتے۔ کبھی کوچھپ چھپا جھانک تاک کر ہم لوگ دیکھ بھی لیتے تھے۔ لیکن شیخ صاحب جیسا جامہ زیب متناسب ہاتھ پاؤں والا مرد کبھی نہ دیکھا تھا۔ گورا رنگ، لمبا قد، چوڑی کلائیاں، بھرے بھرے ڈنڈ۔ عمر ان کی پچاس سے کم کیا رہی ہوگی، لیکن سر پر پٹے دار بال اور ترشی ہوئی ڈاڑھی بالکل سیاہ، بالوں میں عجب طرح کی چمک۔ ہلکی گول چکن کی ٹوپی انداز بے پروائی سے سر پر دھری ہوئی، دو چار بالوں کی لٹیں کلاہ سے نیچے اتر کر ماتھے اور کانوں پر پریشان۔ ایک ہاتھ میں حقے کی نے، دوسرے ہاتھ میں قلم، کسی موٹی سی کتاب میں کچھ لکھ رہے تھا۔ حقہ ٹھنڈا ہو چکا تھا لیکن انھیں خبر نہ تھی۔

''میری آواز سن کر انھوں نے آنکھیں اٹھائیں۔ میں منھ پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹی لیکن پاؤں قالین کی سلوٹ میں الجھ گیا۔ وہ مجھے بھرپور دیکھ رہے تھے۔ ستواں ناک، متبسم آنکھیں۔ اللہ کیا آنکھیں تھیں، بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھوں پر لمبی لمبی پلکیں کیا بھلا عورتوں کی ہوں گی۔ میں جلدی سے سلام کر کے اُلٹے پاؤں واپس آ گئی۔''

''حضرت شیخ اس وقت پچاس سے ایک ہی آدھ ماہ کم کے رہے ہوں گے۔'' میں نے لقمہ دیا۔ ''ان کی بیوی، میرا مطلب ہے منکوحہ بیوی، شاید جوانی ہی میں مر گئی تھیں۔''

''نہیں، معاملہ کچھ زیادہ پیچیدہ تھا۔ لیکن مجھے ان باتوں کی کیا خبر ہوتی، اور مجھے ان سے مطلب ہی کیا تھا۔'' وہ پھر خاموش ہو گئیں۔ ان کے دل میں اس زمانے کی یادیں شاید عام سے زیادہ ملگجی تھیں اور ان میں انبساط اور محزونی دونوں کے رنگ مل جل کر ایک جان ہو گئے تھے۔

''کچھ دن بعد میں نے سنا کہ شیخ صاحب نے مجھے ممنوعہ بنا کر گھر لے جانے کے لیے نواب ظفر الدولہ سے بات کی ہے۔ مجھے متعہ اور نکاح کا شرعی فرق کچھ نہ معلوم تھا، نہ ہی کوئی مجھ سے پوچھنے آیا کہ تو کیا چاہتی ہے۔ میری ساتھ کی بعض خواصیں بہت کچھ کھائی کھیلی تھیں، انھوں نے کبھی میری تعلیم تولا

اور عملاً مکمل کرنی چاہی تو میں انھیں جھڑک دیتی۔ اور جہاں تک متعہ نکاح کا معاملہ تھا تو ہم میں سے اکثر بس یوں ہی گھر میں ڈال لی جاتی تھیں۔ نکاح تو بڑی چیز ہے، متاہی بھی خوش نصیب شمار ہوتی تھی۔''

''آپ کے والدین پھر کبھی آپ کو دیکھنے یا آپ کو لینے واپس نہ آئے؟'' میں نے سر جھکائے ہوئے پوچھا۔ نہ معلوم کیوں اس وقت ان کو روبرو دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔

''والدین...'' انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''والدین تھے ہی نہیں۔ کپتان صاحب کے کسی نوکر نے بعد میں مجھے بتایا کہ میرے باپ نے میری ماں کو چھوڑ کر راپٹ گنج (رابرٹس گنج، ضلع مرزا پور، مرتب) کی کسی بن مانس (قبائلی، مرتب) عورت کو گھر میں ڈال لیا تھا اور وہ ادھر ہی کہیں مر کھپ بھی گیا۔ میری ماں کسی اور کے گھر پڑ رہی۔

''پھر پتا نہیں اس پر کیا بیتی؟'' ان کی آواز بالکل پست ہو گئی تھی۔ ''مجھے تو اس کی صورت بھی تھوڑے ہی دن بعد بھول گئی۔''

''تو آپ کو پتا نہ لگا کہ اصلاً آپ کس مذہب و ملت کی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اصل نقل میں نہیں جانتی۔ انسان کی پرورش جس ملت والوں میں ہو وہی اس کی بھی ملت ہے۔'' ان کے لہجے میں ذرا تیزی تھی۔ ''شیخ صاحب کہا کرتے تھے یہ سب دنیا میں جینے اور آدم کی اولاد سے باہم نباہ کرنے کے لیے ڈھکوسلے ہیں۔''

''طالب عفو ہوں۔ میں نے بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔'' میں نے شرمندگی سے کہا۔

''نہیں، کوئی بات نہیں۔'' انھوں نے بہ ظاہر دل جمعی سے کہا، لیکن ان کی آواز میں کچھ لرزش تھی۔ ''سچ تو یہ ہے کہ میری اصل ذات پات مجھ سے چھپائی گئی۔ شاید اس لیے کہ میرے والدین کسی نیچی ذات کے تھے۔ ممکن ہے مسلمان بھی نہ رہے ہوں۔''

انھوں نے محمد راجا سے پانی منگا کر ٹھہر ٹھہر کر، گھونٹ گھونٹ پیا، گویا گلے میں کچھ اٹک گیا ہو۔ ان کا تنفس برابر نہ تھا۔ میں گھبرا گیا کہ کہیں غش نہ کھا جائیں۔ میں اٹھا تھا کہ کسی طبیب یا عطار کے یہاں سے دوا کا انتظام کروں کہ وہ اچانک چک خود ہی اُٹھ کھڑی ہوئیں اور بولیں:

''اچھا لال میاں! آج میری طبیعت کچھ خراب سی ہو رہی ہے۔ اب تم جاؤ۔ جیتی رہوں گی تو میر تقی صاحب کی طرح میں بھی یہ قصہ مو بہ مو کہوں گی۔'' وہ کمرے میں چلی گئیں۔ محمد راجا نے مجھے ملامت بھری آنکھ سے دیکھا۔ اور میں خود پر نفرین کرتا ہوا گھر لوٹا۔ بھلا مجھے ان کے والدین اور مذہب و مشرب کے بارے میں پوچھنے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔

(۵)

کچھ شرمندگی اور کچھ تشویش کی بنا پر مجھے واپس جانے کی جلدی تھی۔ میں ان کی امداد بھی کرنا

چاہتا تھا کہ عسرت ان کے کلبیا بھر مسکن کے چپے چپے سے تراوش کرتی تھی۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے دادا استاد کی باتیں جاننے، ان کے طور طریقے سمجھنے کی چینک تھی۔ ان کا کلام مجھے لکھنؤ کے چوک اور بنارس کے دسا سمیدھ گھاٹ سے بھی بڑھ کر دلچسپ اور چہل پہل سے بھرپور معلوم ہوتا تھا۔ اور انھیں جگہوں کی طرح دادا استاد کا کلام بھی غیر متوقع احوال اور وقوعہ جات، خم و پیچ اور تاب و تب سے عبارت تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ خود وہ شخص کیسا ہوگا جس نے ایسا کلام لکھا ہے۔

میں نے آج تک کسی استاد شاعر کو دیکھا نہ تھا، اسے بہ خوبی جاننا تو دور کی بات تھی۔ دادا استاد کا کلام میرے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا اور بھورا بیگم کے ذریعے حضرت شیخ کی ذات و صفات کو جاننے کا جو موقع مجھے مل رہا تھا اسے گنوانا بڑی بے عقلی ہوتی۔ لیکن کار دنیا کسے تمام نہ کرد کے باوجود کار دنیا کو ہر شخص مکمل کر کے ہی اٹھنا چاہے۔ میں بھی دکان کی دنیا میں اتنا الجھا کہ کوئی مہینے سوا مہینے کے بعد ہی ادھر کا رخ کر سکا۔

اس بار جو میں پہنچا تو بھورا بیگم کو جوڑی میں مبتلا پایا۔ باری کی تپ تھی، ہر تیسرے دن چڑھتی تھی اور اس قدر ہلہلا کر چڑھتی تھی کہ جان کے لالے سے پڑ جاتے تھے۔ ایک بار آتی تو کم سے کم دو دن رہتی۔ سولہ سترہ دن سے یہی لیل و نہار تھے۔

بارشیں جا چکی تھیں اور لکھنؤ کا حابس، بخاراتی موسم شروع ہو چکا تھا۔ جدھر دیکھیے گھروں پر تپ لرزہ کی یلغار تھی۔ بھورا بیگم کا گھر تو نالے پر تھا، وہاں سے اٹھنے والے مرطوب بخارات اس پر مستزاد۔ سارے شہر میں مفلس مریضوں کے لیے کوئی شاہی شفا خانہ نہ تھا۔ ایک دو انگریز اپنے طور پر معالجہ کرتے تھے لیکن شہر کے لوگ، کیا مرفہ الحال کیا مفلوک الحال، وہاں کم جاتے تھے کہ مذہب یا ذات یا جان جانے کا خطر تھا۔ باقی رہے عام اطبا اور بید، تو وہ قاعدۂ قدیمہ کے پابند تھے، مریض کے گھر نہ جاتے تھے۔ مطب جا کر نبض دکھانا ضروری تھا۔ بھورا بیگم اکیلی کہیں جانے کے لائق تو تھیں نہیں، محمد راجا کی بیمارداری اور حکیم منن صاحب کو حال کہلا کر عطار کے یہاں سے دوا بنوا لانے پر علاج کا انحصار تھا۔

اس دن ان کی تپ کی باری تھیں۔ تقریباً بے سدھ پڑی تھیں، گورا رنگ شدت تپ سے کلونس گیا تھا۔ بار بار پانی مانگتی تھیں، لیکن شاید حکیم نے پانی کم پلانے کو کہا تھا۔ کمزوری کے باعث اٹھنا بیٹھنا دوبھر تھا۔ پلنگ کے پائینتی پیشاب کے لیے چینی رکھی ہوئی تھی اور اس کی کھراند سارے کمرے میں تھی۔ میں نے علاج کے لیے کچھ رقم ان کے سرہانے رکھ دی، محمد راجا کو بیمارداری کے طریقے سمجھائے اور یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ ضرورت پڑنے پر مجھے فوراً اور بے تکلف بلوا لینا۔ محلے کے ایک لونڈے کے ہاتھ پر میں نے ایک روپیا رکھا اور خوب سمجھا دیا کہ بھورا بیگم اگر مجھے بلوائیں تو کہاں اور کس طرح مجھے خبر کرنی ہے۔

بہت آہستہ آہستہ وہ ٹھیک ہوئیں۔ ہماری باہم سخن رانی کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ بیماری کی

نقاہت کی وجہ سے اوّل اوّل تو دیر تک بات نہ ہوسکتی، لیکن جوں جوں مجھ سے ان کی مانوسی بڑھتی گئی، ان کی جھجک بھی گھٹتی گئی اور وہ اپنے اور حضرت شیخ کے حالات زیادہ کھل کر بیان کرنے لگیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ ان کے بیان میں قصہ کہانی کا سا ربط نہ تھا۔ جس وقت جدھر چاہتیں گفتگو کا رخ موڑ دیتیں، مثلاً انھوں نے پہلا سلسلۂ کلام اس موقعے پر منقطع کیا تھا جب وہ حضرت شیخ کے یہاں متوعہ کی حیثیت سے جانے والی تھیں۔ لیکن وہاں پہنچنے کے فوراً بعد کی باتیں انھوں نے بہت بعد میں بتائیں۔ میں اب ان کی بکھری ہوئی حرف و حکایت اپنے طور پر تالیف کر کے پیش کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ تو کم و بیش سارے ان کے اپنے ہیں، لیکن ان کا ہم سخن یعنی میں، اس میں موجود نہیں ہوں۔

(۶)

رمضان شریف شروع ہو چکے تھے جب میں شیخ صاحب کی متوعہ ہو کر آئی، اسی گھر میں جہاں سے ایک عمر کے بعد مجھے نکالے جانے کے بڑے فضیحتے ہوئے۔ کپتان بیگم صاحب نے چار جوڑے میرے ساتھ کر دیے تھے اور چاندی، کندن کے وہ ہلکے پھلکے زیور جو مجھے وقتاً فوقتاً انعام میں ملتے رہے تھے۔ میرے جانے پر کوئی رویا نہ کسی نے کلیجے سے لگا کر رخصت کیا۔ بس چپ چاپ نہ ہنستی نہ روتی ڈولی پر سوار ہو گئی۔

مجھے معاملات بدن کا کچھ پتا نہ تھا۔ اتنا ضرور مجھے سمجھا دیا گیا تھا کہ عورت کے بدن کو برتنے کے لحاظ سے نکاح اور متعہ دونوں ایک ہیں۔ شیخ صاحب نے کپتان صاحب کی حویلی ہی میں متعہ کا صیغہ پڑھ دیا تھا، اس لیے میرا ان سے پردہ نہ رہا تھا۔ ڈولی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے انھوں نے ایک آدھ بار مجھ سے بات کرنی چاہی، لیکن مجھے شرم، اور شرم سے زیادہ الجھن تھی کہ اب میرا کیا ہوگا۔

میں روزے سے تھی۔ یوں تو عموماً شیعہ گھرانوں میں روزہ نماز کا ذکر اذکار کم ہوتا تھا، لیکن نصیر آباد والے سرکار (مولوی سید دلدار علی غفراں مآب، ۱۷۵۲ تا ۱۸۱۹، مرتب) کا دور دورہ جب ہوا تو اکثر وضیع و شریف لوگوں نے ان کی ہدایت پر مجلس و ماتم کے ساتھ فرائض کی طرف بھی توجہ کی۔ کپتان صاحب کے یہاں بھی ان باتوں کا اہتمام ہونے لگا۔ ان کی وجہ سے ہم لوگ بھی روزے رکھتے اور نمازیں پڑھتے تھے۔ شیخ صاحب کو جب معلوم ہوا کہ میں روزے سے ہوں تو ان کے چہرے سے کچھ ناگواری، کچھ مایوسی ظاہر ہوئی۔ شاید انھوں نے کچھ اور منصوبے بنا رکھے تھے۔ پھر بھی، انھوں نے مجھے گود میں اٹھا کر پلنگ پر لا بٹھایا، کہاروں کی چھٹی کر دی اور دست درازیاں آغاز کر دیں۔ میں انھیں بار بار پرے ہٹاتی اور وہ بار بار کچھ ظریفانہ، کچھ چھیڑ چھاڑ کے فقرے کہتے اور دوبارہ کوشش کرتے۔ ایک بار انھوں نے ذرا جھنجلا کر کچھ بلند آواز میں کہا:

''افوہ بھئی بھورا بیگم کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا۔''

میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہنسوں یا خفا ہوں۔ اچھے تو وہ مجھے بھی بہت لگتے تھے، لیکن روزے کا کفارہ کون بھرتا اور روزہ توڑنے کا گناہ کون مول لیتا۔ دفعتاً وہ ہنس کر بولے، ''لو بھئی یہ تو مصرع ہی ہو گیا:

کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

اچھا لیجیے میں آپ کی خدمت میں کچھ گہر پارے حاضر کرتا ہوں، بس ابھی حاضر کرتا ہوں۔'' وہ میری طرف پیٹھ کر کے پلنگ پر بیٹھ گئے اور کچھ گنگنانے لگے۔

ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ جائے ضرور کے پاس چھوٹا سا آب دار خانہ تھا۔ میں نے چپ چپاتے اٹھ کر وضو کیا۔ جانماز کے بارے میں پوچھنے کی ہمت نہ تھی۔ جہاں تک نگاہوں نے تلاش کیا، سارے گھر میں جا نماز کیا، تیسوں کلام بھی نہ تھے۔ میں نے انکل سے قبلہ معلوم کیا، اور زمین پر ہی، جہاں چٹائی بچھی ہوئی تھی، نماز شروع کر دی۔

جیسے تیسے میں نے سلام پھیرا ہی تھا کہ شیخ صاحب نے پیچھے سے آکر میرے رخسار میں ہلکی سی چٹکی لی، پھر اچانک میرا منھ اپنی طرف پھیر کر بوسہ لے ہی تو لیا۔ ''توبہ ہے۔'' بآواز بلند میرے منھ سے نکلا، ''میرا روزہ خراب کر دیا۔'' لیکن شیخ صاحب نے سنی ان سنی کر دی۔ ''لیجیے، ملاحظہ فرمائیے''، انھوں نے کہا۔ میں دوپٹے سے اپنا منھ اور ہونٹ رگڑ رہی تھی اور ان کی طرف سے منھ پھیرے ہوئے تھی کہ انھوں نے عجب دل فریب، لہراتی ہوئی سی آواز میں پڑھنا شروع کیا:

کیا میں فرض کہ آیا ہے سر پہ ماہِ صیام
جہاں میں پھیری ہے اس نے صلائے عصمت عام
ہماری چاہ کا دیکھیں تو ہووے کیا انجام
دلے کرے ہے یہی عرض بندگی میں غلام
اسیر رنج کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا
میں اپنے شوق کو دوں طول اب کہاں تک جان
غرض یہی ہے مری مصحفی کا کہنا مان
ترا تو اب بھی ہے قابو سمجھ نہ ہو نادان
گلے میں ڈال دے باہیں کہ نکلے تک ارمان
اسیر رنج کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

مجھے اس وقت شعر و شاعری کی مطلق سمجھ نہ تھی۔ لیکن اتنا تو میں بھی دیکھ سن رہی تھی کہ شیخ

صاحب بات بات میں بے عیب شعر کہہ دیتے ہیں۔ بہت دن بعد مجھے میر تقی صاحب کا یہ مصرع سننے کو ملا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ تو شیخ صاحب پر صادق آتا ہے:

صد رنگ مری طبع ہے میں موج رواں ہوں

اس دن انھوں نے اس نظم (مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اسے مسدس ترجیع بند کہتے ہیں) کے درجنوں بند دو تین گھڑی میں کہہ ڈالے، لیکن سب مجھے سنائے نہیں۔ مجھے بعد میں اس کی وجہ معلوم ہوئی۔ اس ترجیع بند میں میرے علاوہ اور بھی کسی کی طرف اشارے تھے۔ لیکن اس وقت تک مجھے پتا چل گیا تھا کہ شیخ صاحب گزشتہ حسینوں کو فراموش کبھی نہ کرتے تھے، اور زندگی کے ہر موقعے پر حسینوں کا جمگھٹ ان کے لیے مہیا رہتا تھا۔ اس باب میں وہ کچھ مجبور سے تھے۔ جو عورت انھیں دو چار بار دیکھ سن لیتی، ان کی گرویدہ ہو کر رہ جاتی تھی۔ ان کی حسن پرستی کے چلتے کچھ برس میں نے بڑی ذہنی اذیت میں گزارے، پھر دل پر پتھر رکھ لیا۔

بات کچھ آگے نکل گئی۔ میں دن بھر شیخ صاحب کے شعر سنتی رہی، ان کے فقروں پر دل ہی دل میں مسکراتی رہی۔ ان کی آتشِ شوق کی گرمی سے میرا بھی بدن تمتمانے لگا تھا۔ میں نے اسی رات انھیں کامیاب اور شاد و نہال ہونے دیا۔

ان دنوں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، پھر بھی میں نے بہت جلد اٹھ کر مارے باندھے آب دار خانے کے یخ پانی سے غسل کیا۔ سحر گہی کا انتظام کر رہی تھی کہ شیخ صاحب نے اچانک آکر میری پیشانی چوم لی اور یہ بند پڑھے:

حال پر اس کے ہوئی تھی لطف کی تیری نظر
ورنہ بخت ایسے کہاں رکھتا تھا یہ خستہ جگر
لیک گستاخی لگا کرنے وہ جب ہو کر نڈر
اور لگا رخ پر ترے آنے خجالت کا اثر
رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پاؤں تلک تیری بلائیں لے گیا

جب کہ پھرتا تھا بدن پر تیرے پیارے اس کا ہات
تھرتھراتی تھی پڑی جوں موج دریا تیری گات
خوش نصیبی کی کہوں اس کی وہ لے کیا تجھ سے بات
یک دگر کی کش مکش ہی میں جو آئی آدھی رات
رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پاؤں تلک تیری بلائیں لے گیا

اُف وہ اس رات کی ٹھنڈک، وہ سرد پانی سے میرا غسل اور اس پر یہ اشعار۔ شرم کے مارے مجھے کپکپی چھوٹ گئی۔ ''بس چپ رہیے''، کہہ کر میں نے اپنا بدن چرانا چاہا کہ لرزش کچھ کم ہو۔ شیخ صاحب نے اپنا دوشالہ لا کر میرے پنڈے پر ڈال دیا (مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس مسدس کی بھی محرک کوئی اور ہستی تھی اور اصل میں شیخ صاحب نے:

بے نصیبی کی کہوں اس کی و لے کیا تجھ سے بات

لکھا تھا۔ ہمارے حسب حال کرنے کے لیے انھوں نے اسے ''خوش نصیبی'' کر دیا)۔

پھر رمضان بھر یہی دستور رہا کہ رات بھر میں ان کی خدمت کرتی، سحر کے وقت سے لے کر رات تک اللہ کی بارگاہ میں روزے نماز بندگی بجا لاتی۔ لیکن ابھی میں یہ نہ سمجھ پائی تھی کہ شیخ صاحب کی متوعہ ہو کر رہنے، اور اس طرح ان کی سراسر توجہ اور لگاؤ کا مرکز ہو کر جینے کو اپنی خوش نصیبی گمان کروں یا نہ۔ کپتان صاحب کی حویلی میں مجھے یہاں سے زیادہ آسائشیں تھیں، لیکن وہاں سلامت نہ تھی، کوئی میرا والی وارث نہ تھا۔ لیکن یہ شیخ صاحب بھی کچھ ہری چک سے لگتے ہیں، جب تک میری جوانی ہے شاید مجھے اپنے سے الگ نہ کریں، یوں ہی تیل ماش ہوتے رہیں۔ لیکن کیا بھروسا جوانی کب تک کی ہے۔ میں نے بڑی بیماری یا پیٹ کے پھوڑے یا پھر اولادیں جننے اور مرد کی خدمت کرنے کی وجہ سے اچھی اچھی کھنچا کھنچا یا کسا کسایا بدن رکھنے والی لڑکیوں کو بائیس چوبیس کی عمر میں سوکھی چھوئی موئی کی ڈال سا مرجھاتے دیکھا تھا، بدن ہڈیوں کا ہار گوشت نام کو نہیں۔ اور عورت کی صورت جہاں ذرا کملائی، بدن ذرا ڈھیلا ہوا، وہاں وہ مرد کے دل سے اتری۔ پھر تو نکاحیوں تک کا اللہ حافظ ہے، ہم جیسی متاہیوں اور نگھریوں کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔

شیخ صاحب مجھے اچھے تو بہت لگتے تھے، لیکن ان میں محبوبی کی شان تو تھی ہی۔ اس کی مجھے آرزو ہی ہو سکتی تھی، امید نہیں کہ جس دل سے میں انھیں چاہوں گی اسی دل سے وہ بھی مجھے چاہیں گے۔ میں ہزار جان جی سے ان کی خدمتیں کروں، لیکن وہ اس کا صلہ دیں جب تو۔ اندھا تب پتیائے جب دو آنکھیں پائے۔

ایک بات یہ بھی تھی کہ شیخ صاحب اگرچہ بالکل قلاش نہ تھے لیکن کچھ خاص فارغ البال بھی نہ تھے۔ یہ وہ دن تھے جب صاحب عالم میرزا سلیمان شکوہ بہادر کے یہاں ان کی نوکری ختم ہو چکی تھی۔ سید انشا سے ناچاقیاں بھی اب دور ہو چکی تھیں۔ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ کی آنکھ بند ہوتے ہی سید انشا پر لکھنؤ کے دروازے کھل گئے تھے۔ خان علامہ کے توسط سے وہ نواب سعادت علی خان کے دربار تک پہنچ چکے تھے۔ ان کے دن رات نواب کا دل موہنے میں گزرتے، ایسے میں شیخ صاحب جیسے بگڑ کر بننے والے دوست کی دلداری کی فرصت انھیں کہاں ہوتی۔ اور نہ یہی ممکن تھا کہ سید انشا انھیں نواب کے دربار میں بار دلا دیں۔

میرزا سلیمان شکوہ بہادر کی ناانصافیوں سے آزردہ ہو کر شیخ صاحب ایک مدت خانہ نشین رہے تھے۔ پھر محمد عیسیٰ تنہا، نورالاسلام منتظر، حیدر علی گرم، اور پنڈت بدیا دھر کے اصرار و ترغیب سے اب وہ شہر کے باہر روشن آرا باغ میں ماہانہ مشاعروں میں شریک ہوتے۔ شاگردوں سے کچھ فتوح آجاتی، ظفرالدولہ کپتان فتح علی خان اور ایک دو نمودی رئیس تھوڑا بہت سلوک کر دیتے۔ اجلے خرچ نہ سہی، لیکن دو وقت کی روٹی آرام سے مل جاتی تھی، اوقات بسری کے لیے بہت تھا کہ میں کون سی بھونرے میں پلی ہوئی تھی۔

کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ شیخ صاحب نے اپنے افلاس کی بنا پر مجھ سے نکاح نہ کیا تھا۔ یا شاید وہ اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتے ہوں۔ لیکن ان دنوں تو سارا سارا دن گھر بیٹھے مجھ سے چہلیں کرتے، میری تعریفیں کرتے۔ کبھی مجھے بلا کا جامہ زیب بتاتے، کبھی میرے ہاتھ پاؤں کے تناسب کی بات کرتے، کبھی آنکھوں اور بالوں کی ثنا کرتے۔ لگتا تھا اب وہ میرے علاوہ کسی کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں گے۔ میرا پہلی عید کا جوڑا کپتان بیگم نے بھیجا تھا۔ میں جب اسے پہن کر ان کے یہاں جانے کو تیار ہوئی تو انھوں نے فی البدیہہ کہا:

ہم تو کبھی کہیں نہ کہ کپڑے اُتاریے
پہنا کریں گر آپ اسی وضع کا لباس

میں شرما کر کمرے کی طرف بھاگنے لگی تو انھوں نے شعر پڑھا:

چھپ کر کے دیکھ تو بھی کسی ڈھب سے مصحفی
پہنا ہے آج یار نے تیرے نیا لباس

یہ سب تو تھا، لیکن مجھے اور بھی خلشیں تھیں۔ شیخ صاحب کا مذہب مجھ پر کچھ بھی کھلتا نہ تھا، نہ وہ کبھی اس باب میں بابِ سخن وا کرنا پسند کرتے تھے۔ سارے رمضان بھر انھوں نے نہ کوئی روزہ رکھا نہ کسی وقت کی نماز پڑھی۔ حدیث، قرآن، وہ مجلس، مرثیہ، ایسی کوئی کتاب گھر میں ڈھونڈے نہ ملتی تھی۔ میں نے ان کی زبان سے کوئی فقرہ ایسا نہ سنا تھا جس سے ان کے اثنا عشری ہونے کا گمان ہوتا اور نہ کبھی کسی صحابی، کسی پیر یا اولیا اللہ کا ذکر ان کے لب پہ آتا تھا۔

عید کی نماز وہ ضرور پڑھنے گئے۔ پنڈت بدیا دھر نے انھیں ایک بڑا پیارا چلبلا سا کاٹھیاواڑی ناگن شروع رمضان میں تحفے کے طور پر دیا تھا۔ میرے دل میں شک تھا کہ وہ نماز پڑھنے سے زیادہ ناگن کی نمائش کرنے گئے ہیں۔ مجھے کپتان بیگم نے ڈولی بھیج کر بلوا لیا تھا۔ شیخ صاحب جب نماز کو نکلے تو میں ڈولی میں بیٹھ لی۔ طے پایا تھا کہ بعد نماز وہ مجھے کپتان صاحب کی حویلی سے لے لیں گے۔ لیکن انھوں نے سارا دن یار دوستوں سے ملنے ملانے میں لگا دیا۔ میں کپتان کی حویلی میں پڑی سوکھتی رہی۔ جب انھیں بہت دیر ہوئی تو مجھے رونا آنے لگا۔ اپنی ساتھی سہیلی گوئیاں کی دل جوئیوں کے باوجود میں نے رو رو کر آنکھیں سجا لیں۔ اگر میں منکوحہ ہوتی تو وہ بھلا اس طرح کا سلوک میرے

ساتھ کرتے؟

گئی رات وہ مجھے لینے آئے۔ کچھ محجوب سے تھے کہ انھیں شاید قلماقنی سے میری آزردگی کی سن گن ہوگئی تھی۔ لیکن راستے بھر میں کچھ نہ بولی اور نہ انھوں نے ہی منھ کھولا۔ گھر پہنچ کر میں نے یہ کہتے ہوئے زور سے کمرے کے پٹ اندر سے بند کر لیے کہ ''کھانا تو آپ کھا ہی چکے ہوں گے۔ مجھے نیند آرہی ہے میں اب سوتی ہوں۔'' گھر میں ایک کوٹھری سی اور تھی، شیخ صاحب وہاں سوئیں یا ٹہل کر رات کاٹیں، میری بلا سے۔ میں تو رنج اور غصے میں بھن کر کوئلہ ہو رہی تھی۔

شیخ صاحب نے ''ارے ارے، بی بی ذرا سنو تو سہی'' کہہ کر دروازے کو بند ہونے سے روکنا چاہا، لیکن میں نے دھڑام سے کنڈی لگالی۔ انھوں نے وقفے وقفے سے بار بار دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن میں نے سن کے نہ دیا۔ آنسو میری آنکھوں میں اُمڈے آرہے تھے۔ آج زندگی میں پہلی بار میں نے تمنا کی کہ کاش میرے بھی باپ ماں ہوتے۔ روتے روتے مجھے بالکل خلاف امید نیند آگئی۔ شیخ صاحب نے خدا جانے کب تک دروازہ بھڑ بھڑایا، مجھے کچھ پتا نہ چلا۔

سحر کے لیے اٹھنے کی عادت تو مجھے تھی ہی، میں کوئی چار بجے کچھ گھبرائی ہوئی سی اٹھی تو شیخ صاحب کو پلنگ پر نہ پایا۔ ایک لمحے کے لیے میں سمجھی نہیں کہ ماجرا کیا ہے۔ پھر اچانک رات کی بات یاد آئی تو شرمندگی اور خوف سے کچھ کانپتے ہوئے میں نے چپکے چپکے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ مولا کریں وہ کوٹھری میں آرام سے سو گئے ہوں۔ کہیں گھر چھوڑ کر چلے نہ گئے ہوں، میں نے سراسیمگی کے عالم میں اپنے دل میں کہا۔ میرے اندر سے خوف کی ٹھنڈی لہر یوں ابھری کہ میرے ہونٹ ایک دم میں پپڑا گئے، حلق سوکھ گیا۔

دروازہ باہر کو کھلتا تھا، لیکن میں نے اس کے پٹ ہلکے سے دھکیلنا چاہے تو وہ کھلا ہی نہیں، جیسے کوئی چیز اڑ رہی ہو۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ہائے میرے مولا مشکل کشا کوئی بد روح بھوت پریت نہ ہو جس نے مجھے اس کمرے میں بند کر دیا ہے۔ شیخ صاحب بے شک گھر چھوڑ گئے ہیں، اب میں یہیں سر ٹکرا ٹکرا کر مروں گی۔ مجھ کم بختی ماری کو اتنا غصہ کاہے کو آگیا تھا۔ مرد لوگ اِدھر اُدھر سیریں کرتے ہی رہتے ہیں۔ کیا عید کیا محرم ان کے لیے سب برابر ہیں۔ میں نے جلدی جلدی میں غلط سلط نادعلی پڑھ کر دروازے کے پٹوں کے بیچ کی جھری سے جھانکنا چاہا۔ کوئی بھاری سی چیز بے شک اڑ رہی تھی لیکن وہ کیا چیز تھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں نے دوبارہ مزید ہمت جوڑ کر دروازے کو دھکیلا تو اس بھاری چیز میں حرکت ہوئی، پھر شیخ صاحب کا مسکراتا ہوا لیکن نندا سا چہرہ نمودار ہوا۔ میں نے ہڑ بڑا کر دروازہ پورا کھول دیا۔ یااللہ وہ اسی پہلی رات والا دوشالہ اوڑھے ہوئے وہیں میری چوکھٹ پر سو گئے تھے۔

خوف اور شرمندگی سے میرے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ شیخ صاحب نے دروازہ پوری طرح

کھل جانے دیا، پھر سرو قد کھڑے ہو کر شعر پڑھا:

جب رات سر پٹکنے نے تاثیر کچھ نہ کی

ناچار میر منڈکری سی مار سو رہا

''کہیے بھورا بیگم مزاج کیسے ہیں؟'' میں دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

''یہ آپ نے کیا کیا؟ سردی لگ جاتی تو؟''

''تو کیا دروازہ توڑ ڈالتا؟'' وہ زور سے ہنسے۔ ''آپ کا کیا جاتا، میرا ہی دروازہ ٹوٹتا۔''

عجب طرح کے آدمی تھے۔ مرد ذات اور اسے غصہ نہ آئے، اچانک مجھ پر پھر جھلاہٹ کا دورہ پڑا۔

''آپ کو ہنسی سوجھی ہے اور میری جان آدھی رہ گئی۔'' میں ان سے لپٹی ہوئی بولی۔ ''دن بھر آپ کی راہ دیکھا کی۔ لیکن آپ نے تو عید اپنے ہوتوں سوتوں میں گزار دی۔ میں کون لگتی ہوں آپ کی؟'' میں نے رونا شروع کر دیا لیکن وہ ایک لفظ نہ بولے۔

''بتایئے ابھی بتایئے آپ شیعہ ہیں کہ سنی ہیں؟ آپ نے مجھ سے نکاح کیوں نہ کر لیا؟'' میں نے آنسوؤں کے ہجوم اور رنج کے جوش میں ان کے سینے پر مکے مارتے ہوئے پوچھا۔ وہ اب بھی کچھ دیر چپ رہے، پھر آہستگی سے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر بولے:

''ہاں میں پیدائشی سنی ہوں، لیکن اصلاً...''

''اصلاً کیا ہے کیا نہیں، میں نہیں جانتی۔ آپ کے مذہب میں متعہ نہیں ہوتا بس یہ جانتی ہوں۔ آپ کے یہاں متعہ حرام ہے۔''

''لیکن تمھارے یہاں تو جائز ہے۔''

''لیکن آپ جب متعہ مانتے ہی نہیں تو میں بس آپ کی رکھیل ٹھہری۔ پھر میں یہاں کیوں ٹھہروں، چوک میں جا کر بیٹھ جاؤں گی۔'' میں نے اپنے کو چھڑانا چاہا، لیکن وہ مجھے بہت مضبوط تھامے ہوئے تھے۔

''چھی ایسی بات نہیں کہتے۔'' وہ ایسے لہجے میں بولے گویا میں کوئی ننھی سی بچی ہوں۔ ''اچھا میں تم سے نکاح کر لوں گا، قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہو جناب عباس کی قسم کھاؤں، کہو جناب خدیجہ کی سوگند اٹھا لوں...''

مجھے نہ جانے کیوں ان پر پیار سا آ گیا۔ لیکن برہمی ابھی اس پر حاوی تھی۔ ''یہ سب گناہ کی باتیں ہیں۔ آپ بڑی روئی بھی ہاتھ میں لے لیں تو مجھے اعتبار نہ آئے گا۔'' مجھے ان کے چہرے پر شرمندگی کی سنولائی سی لہر دوڑتی دکھائی دی۔ شاید نکاح کی بات انھوں نے میرا دل رکھنے کے لیے کہہ دی تھی، ورنہ ان کا کوئی ارادہ ایسا نہ تھا۔ لیکن انھوں نے یہ بھی بے شک محسوس کر لیا تھا کہ میں ان کے

جھوٹ کو پا گئی ہوں۔ انھوں نے میری ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر میرا منھ اٹھایا اور بولے:

''ذرا صبر کرو۔ نکاح بھی ہو جائے گا، تم پر کوئی عیب نہیں۔ اور میں کہیں بھاگا تھوڑی جاتا ہوں۔'' مجھے ان کے لہجے میں صداقت کی خوشبو محسوس ہوئی یا شاید وہ میرا وہم تھا کہ میں تو ان پر اعتبار کرنے کے لیے دل وجاں سے راضی تھی۔ مگر وہ لفظ، وہ وعدہ، وہ تازہ کشمیری سیبوں جیسی رس ٹپکاتی آواز، وہ من موہنی مسکراہٹ، شاید انھوں نے چپکے سے مجھ پر موہنی پڑھ بھی دی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اس آواز کی مٹھاس اور اس وعدے کے دل فریب بہلاوے کی بھول بھلیاں میں گم ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

''اس وعدے سے عقب گزاری ہرگز نہ ہوگی صاحب۔ یہ خیال رہے کہ میں آپ کو تا قیامت پابند ٹھہراؤں گی۔'' میں نے کچھ اس طرح کہا گویا مجھے یقین تو تھا ہی، بس بات کی خاطر بات کہہ رہی تھی۔

پھر وہ شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ ہی کیا جو نا رضا مند سے زیادہ نا رضا مند مطلوب اور کٹھور دل سے کٹھور دل معشوق کو دار و مدار کیے بغیر ہی دم بھر میں رجھا نہ لیں۔ انھوں نے میری کمر میں ہاتھ ڈالا، سر اپنے سینے سے لگایا، پھر دھیرے قدم چلتے ہوئے اسی کمرے میں داخل ہو گئے جس کی چوکھٹ سے لگ کر انھوں نے رات گزاری تھی۔

سارا دن وہ مجھے لیے پڑے رہے۔ دروازے پر بارہا دستک ہوئی، کبھی حلال خورنی، کبھی بہشتی، کبھی کوئی شاگرد یا دوست۔ لیکن یہاں کھانے پینے تک کی سُدھ تو تھی نہیں، کنڈی کون اُتارتا اور دروازہ کون کھولتا۔ دن کب چھپا رات کب آئی مجھے پتا ہی نہ چلا۔ ٹانگن کے لیے پڑوس کا ایک اصطبل وہ پہلے سے طے کر چکے تھے، ورنہ وہ بچارہ سردی اور بھوک پیاس سے مر ہی گیا ہوتا۔

گئی رات وہ باہر نکلے۔ میں دل میں سوچی، لو اب یہ خدا جانے کب کی خبر لائیں گے۔ لیکن نہیں وہ تو اکبری دروازے سے نکلے، پکے پل کی طرف دو رویہ نانبائیوں کی معطر دوکانیں جھانکیں۔ اپنی پسند سے شیر مال اور کباب بنوائے، سید حسین خان کے کٹرے پر عبداللہ عطر فروش سے حنا کے تیل کی ایک کپی خریدی اور دم کے دم میں واپس آئے تو شعر ان کی زبان پر رواں تھے:

آدمیت سے بھرا ہو جو سراپا آدمی
کیوں بچھڑ جاوے یکایک ہائے ایسا آدمی
خوب رُو دیکھے ہزاروں گرچہ اپنی عمر میں
آج تک ہم نے و لے تجھ سا نہ دیکھا آدمی
عشق کا کوچہ وہ کوچہ ہے کہ جس میں ہم نشیں
بات کہتے وو ہیں ہو جاتا ہے رُسوا آدمی

اے زلیخا جان اس سودے کو تو سودا ے مفت
چرخ نے یوسف سا تیرے ہاتھ بیچا آدمی
خاک کو میزی بھی گر چاہے کرے باغ و بہار
وہ جو مشتِ خاک سے کرتا ہے پیدا آدمی

(۷)

نکاح تو انھوں نے مجھ سے کیا، لیکن کئی برس بعد۔ ۱۲۲۹ کے سال کا آغاز تھا اور سردی اچھی خاصی پڑ رہی تھی (آغاز ۱۲۲۹، ۲۴ دسمبر ۱۸۱۳، مرتب)۔ شیخ صاحب سویرے ہی کہیں کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ کہہ گئے تھے کہ دن کے کھانے پر ایک دو دوستوں کو بھی لاؤں گا۔ میں کھانا پکا، نہا دھو، صاف کپڑے پہن، دھوپ میں بال سکھا رہی تھی کہ کنڈی کھڑکی۔ شیخ صاحب ایک خاص انداز میں زنجیر کھڑ کاتے تھے، میں فوراً پہچان گئی کہ وہی ہیں۔ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی دوڑی، دروازہ کھولا تو کیا دیکھتی ہوں کہ شیخ صاحب آگے آگے، ان کے پیچھے شیخ ناسخ، ان کے ساتھ میاں حیدر علی۔ میں حق دق رہ گئی کہ یا اللہ ان لوگوں کو لانا تھا تو کچھ خاص اہتمام کیا ہوتا۔ اب کیا کرتی، جلدی سے دالان میں چٹائیوں کا فرش کر دیا اور خود پان بنانے میں مصروف ہوگئی۔

شیخ ناسخ اور خواجہ حیدر علی سے میرا پردہ نہ تھا۔ شیخ ناسخ کو شیخ صاحب اپنا شاگرد بھی تصور کرتے تھے اور مربی بھی۔ اور خواجہ آتش پر تو ان کی وہ ساری چاہتیں قربان تھیں جو وہ اپنی کسی اولادِ نرینہ پر صرف کرتے۔ انھوں نے مجھ سے شروع دن ہی سے کہہ دیا تھا کہ ان دونوں کو اپنا بڑا بھائی گردانو بلکہ جو بات مجھ سے بھی نہ کہہ سکو ان سے بے تکلف کہہ سکتی ہو۔

میں چوکی پر بیٹھی سر جھکائے پان لگا رہی تھی اور دل میں کچھ مشوش تھی کہ آج ان لوگوں میں وہ چہلیں، شعر و شاعری کی باتیں نہیں ہو رہی ہیں جو ان کا معمول ہیں۔ پھر میں نے انکھیوں سے دیکھا کہ تینوں ایک ایک کر کے آب دار خانے میں گئے، وضو کیا، پھر چٹائی پر دو زانو بیٹھ گئے، گویا کوئی دینی جلسہ آغاز ہونے والا ہو۔ اچانک شیخ صاحب نے قدرے بلند اور کچھ کھرکھراتی ہوئی آواز میں کہا:

"حیات النسا بی بی، آؤ یہاں ہمارے پاس بیٹھ جاؤ۔"

میں نے کان کھڑے کیے۔ وہ مجھے حیات النسا کبھی نہ کہتے تھے، کجا کہ حیات النسا بی بی۔ یا اللہ کیا ہونے والا ہے۔ کہیں یہ مجھے چھوڑ تو نہیں رہے ہیں؟ کسی اور کے تو سپرد نہیں کر رہے ہیں؟ میں خاصدان وہیں چھوڑ چھاڑ لرزتے قدموں سے آ کر شیخ صاحب کے برابر بیٹھ گئی۔

"نہیں، سامنے بیٹھو۔" انھوں نے کہا۔ چار و ناچار میں اٹھ کر چٹائی کے ایک کونے پر ان کے سامنے ٹک گئی، اس طرح کہ شیخ ناسخ اور میاں حیدر علی ایک طرف تھے، ان سے کچھ دور پر شیخ صاحب،

اور ان کے سامنے میں۔ اچانک شیخ ناسخ اٹھے اور انھوں نے ایک نہایت نفیس کامدانی کا سرخ دوپٹہ مجھے یوں اوڑھا دیا کہ گھونگھٹ سا نکل آیا۔ پھر شیخ صاحب نے سنیوں کی طرز کا خطبۂ نکاح عربی میں پڑھا۔ خطبہ ختم کر کے وہ بے حد نرم آواز میں بولے:

''حیات النسا بی بی عرف بھورا بیگم، میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی، تین سو روپے سکۂ سلطانی مہر معجل کے عوض شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کی گواہیوں کے ساتھ تم سے نکاح کرتا ہوں۔ تمھیں قبول ہے؟''

میری سسکی چھوٹ گئی اور فوراً ہی یہ سسکیاں بآواز بلند گریہ میں تبدیل ہو گئیں۔ شیخ ناسخ عورت سے نا آشنا اور میاں حیدر علی فرشتہ صفت مجھ سے آنکھ تک ملاتے ڈرتے تھے، ان کی سمجھ میں کیا خاک آتا کہ میں کیوں رو رہی ہوں؟ شیخ صاحب بھی ایک لحظے کے لیے گڑبڑا گئے۔ پھر بولے، ''گھبراؤ نہیں۔ بس یہ کہہ دو کہ نکاح تمھیں قبول ہے۔'' لیکن میں تو روئے جا رہی تھی۔ لگتا تھا ہاتھ پاؤں میں جان نہیں رہ گئی، زبان گنگ ہو گئی ہے۔ شیخ صاحب نے ہاتھ بڑھا کر میرے سر پر رکھا تو میں کچھ گھبرا کر، کچھ سہم کر پیچھے سمٹ گئی۔

''کیا ہوا، ڈرتی کیوں ہو؟'' شیخ صاحب کا لہجہ نہ تھا، کسی راہ گم کردہ بچے کے سر پر چمکار بھرا ہاتھ تھا۔ ''نہیں منظور تو کوئی بات نہیں، یوں ہی کہہ دو۔''

مگر میرے آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے۔ ''ن۔ نہیں۔ قبول ہے۔'' میں نے بہ دقت یہ لفظ ادا کیے۔

شیخ صاحب کے لہجے میں اس بار تھوڑا سا تبسم تھا۔ بولے، ''نہیں قبول کہ ہاں قبول ہے؟ کچھ صاف تو کہو۔''

''قبول ہے۔'' میں نے سسکی اور سرگوشی کے درمیان کہا۔ تینوں صاحبان نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور دیر تک عربی میں دعائیں پڑھتے رہے۔ میرا رونا کچھ ہلکا پڑا تو میں نے بڑھ کر شیخ صاحب کے پاؤں پکڑے اور ان کے شانے سے اپنا سر لگا دیا۔ شیخ صاحب نے بازو تھام کر مجھے اٹھایا اور کہا:

''آج تم پلنگ پر بیٹھو۔ ہم لوگ دسترخوان لگائیں گے اور تمھیں کھانا کھلائیں گے۔ نویلی دلہن کام نہیں کرتی۔'' پھر انھوں نے شیخ ناسخ کی طرف دیکھا۔ شیخ ناسخ نے اپنی کمر میں بندھی ہوئی مخملی تھیلی کھول کر میرے شیخ صاحب کی طرف بڑھائی۔ انھوں نے اسے آہستہ سے میرے قدموں میں رکھ دیا۔ جب یکسوئی ہوئی تو میں نے تھیلی کے پیچ کھولے۔ پورے تین سو روپے سکۂ سلطانی کے تھے، بالکل تازہ تازہ ٹکسال سے ڈھل کر نکلے ہوئے۔ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ روپے شیخ ناسخ نے بہ طور قرض حسنہ دیے تھے۔

میں نے تھیلی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کوئی کاغذ یا نکاح نامہ نہ تھا۔ مجھے خیال بھی نہ آیا کہ

پوچھوں کوئی کاغذ لکھا جائے گا کہ نہیں۔

(۸)

اس وقت تک میں شیخ صاحب کے فیض صحبت سے سخن فہمی اور سخن شناسی میں طاق ہو چکی تھی۔ تمام بڑے استادوں، شیخ صاحب کے دوستوں اور خاص شاگردوں کے نام اور کلام سے آشنائی بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ میں نے بہت سے شعر حفظ بھی کر لیے تھے۔ میرا حافظہ شروع ہی سے اچھا تھا، شیخ صاحب کے کلام سے لطف اندوزی کے موقعے ملے تو اور بھی چمک اٹھا۔ شیخ صاحب کے مضامین کی کثرت مجھے ہمیشہ متحیر کرتی، اور ان کی یہ صفت تو غیر معمولی تھی کہ وہ کسی بھی بات کو مضمون بنا سکتے تھے۔ ایک دن بڑھاپے کا ذکر نکل آیا۔ میں نے باتوں باتوں میں کہا کہ ''بوڑھے چونڈے'' کا مضمون غزل میں کسی نے نہ باندھا ہوگا۔ شیخ صاحب بولے کسی نے نہیں باندھا تو نہ سہی، ہم تو باندھ سکتے ہیں۔ پھر بس ذرا سے تامل کے بعد انھوں نے شعر پڑھا:

اگر پروانہ اس سے لگ چلے ہے پیار میں آکر
کہے ہے شمع میرے بوڑھے چونڈے پر کرم کیجیے

کمال کا شعر تھا، بے ڈھب مضمون پر معنی کی تازگی سونے پر سہاگے کا کام کر رہی تھی۔ میرے منھ سے نکل گیا، ''پہلے سے کہہ رکھا تھا کیا؟''

اس دن وہ پہلی بار مجھ پر خفا ہوئے۔ ''پہلے سے کہہ رکھنا کیا معنی؟ کیا میں کسی مضمون میں بند ہوں؟ معاف کیجیے میں آپ کے لکھنؤ کا کوئی پوچ پوچ نہیں ہوں مضمون جس کے ہاتھ نہ لگتے ہوں۔ یہ پورب کے صحرائی مضمون باندھنا کیا جانیں۔''

وہ اچانک بیٹھے بیٹھے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور پھر انھوں نے یہ شعر یوں ڈپٹ کر سنائے گویا مشاعرے میں پڑھ رہے ہوں:

جاں ڈالتا ہے مصحفی قالب میں سخن کے
مشکل ہے کہ تم اس کی طرح شعر کو ڈھالو
کو زمزمۂ دہلی و کو لہجۂ پورب
کیوں اس کی طرف ہوتے ہو ناحق کو رذالو!

میں نے گھبرا کر معافی مانگی، ''ہائے اللہ یہ میرا مطلب تھوڑی تھا۔ کون آپ کو کہے گا کہ کسی مضمون میں عاجز ہیں؟ اور لیجیے تاؤ میں آکر مجھے بھی رذالوں میں ڈال دیا۔''

میں نے آخری فقرہ انھیں چھیڑنے کو کہا تھا۔ لیکن انھیں میری بات واقعی لگ گئی تھی، وہ کچھ دیر تک مجھ سے کھنچے رہے۔ آخر انھیں خوش کرنے کے لیے میں نے وہی ترکیب استعمال کی جو کبھی خالی نہ

جاتی تھی۔

شیخ صاحب کے مزاج کا خمیر چار عناصر سے اٹھا تھا۔ اوّل تو خودنگری اور خودداری، دوسرا شعر گوئی اور سخن سنجی، تیسرا حسن پرستی، اور چوتھا خوش طبعی اور ظرافت۔ وہ اپنے آگے کسی کو گردانتے نہ تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان میں اس درجہ ظرافت نہ ہوتی تو ان کی خود بینی ناقابلِ برداشت ہو سکتی تھی۔

ہندی میں میر تقی صاحب اور فارسی میں میرزا قتیل کے سوا کسی معاصر کو وہ خاطر میں نہ لاتے تھے۔ میاں جرأت اور سید انشا کی علمیت پر انھیں شک تھا۔ وہ کہتے تھے کلاونتوں کی طرح بین کاری اور بھانڈوں کی طرح نقلیں بھرنے سے کوئی استاد نہیں بن جاتا۔ غیر ضروری فارسی عربی کی نمائش کو بھی وہ معیوب سمجھتے تھے کہ شعریت اور شے ہے ملاں پن اور شے۔ ایک بار انھوں نے کسی شخص کی فرمائش پر مفتی غلام حضرت کی تاریخ وفات کہی۔ میاں بیتاب نے وہ تاریخ دیکھی تو فرمایا کہ یوں تو مادۂ تاریخ عمدہ ہے، لیکن ''مفتی'' کی تحتانی گرتی ہے، مصرعے میں لفظ ''مفت'' پڑھا جاتا ہے۔ شیخ صاحب نے بھی یہ بات سنی لیکن ان سنی کر دی۔

اتفاق ایسا ہوا کہ ایک بار میاں بیتاب ہمارے گھر بہ غرض ملاقات تشریف لائے تو انھوں نے یہ بات دہرائی کہ لفظ ''مفتی'' کی تحتانی ساقط ہو رہی ہے، اسے ٹھیک کر دیتے تو خوب تھا۔ شیخ صاحب کی تیوری پر بل آگئے۔ انھوں نے فرمایا کہ خود میرے تخلص (مصحفی) میں تحتانی سو جگہ دبی ہوگی، کسے دماغ ہے جو درست کرے۔ بیتاب صاحب بولے، ''تو کیا آپ فارسی عربی الفاظ میں سقوط حروف علّت کو جائز سمجھتے ہیں؟'' شیخ صاحب نے فرمایا:

''فارسی عربی کوئی آہوے حرم ہے کہ اسے ہاتھ لگانا جرم ٹھہرے؟ لفظ تو لفظ ہے۔ جس طرح اچھا لگے اسی طرح باندھیے۔ یہ سید انشا کے چھوڑے ہوئے شگوفے ہیں کہ عربی فارسی لفظوں کے ساتھ کچھ خاص سلوک کیا جانا چاہیے اور یہ سب اس لیے کہ علمیت کی بے جا نمائش ہو سکے۔ فارسی والے تو دھڑلے سے اپنی زبان اور غیر زبان دونوں کے الفاظ کے حروفِ علّت دباتے ہیں، توڑ مروڑ لیتے ہیں۔'' پھر انھوں نے یہ چار مصرعے پڑھے:

اے مصحفی قدر مرغ بستاں ہرگز
رکھتا نہیں گو کہ ہووے سیانا کوا
الفاظ متین اور لغت لا لا کر
ناحق نہ بنا تو ریختے کو ہوّا

میاں بیتاب نے دل میں کچھ پیچ و تاب کھائے ہوں گے۔ لیکن شیخ صاحب کے سامنے یارائے گفتگو نہ رکھتے تھے۔ انھیں دنوں شہر میں یہ بات چل رہی تھی کہ میر تقی صاحب بہت ضعیف ہو گئے ہیں، ان کے بعد ملکِ سخن کی بادشاہی کسے ملے گی۔ یہی باتیں سن کر ایک دن شیخ صاحب گھر آئے تو مجھ

سے کہنے لگے، "یہ احمقان کوچہ کوتاہ بیناں اتنی سی بات نہیں جانتے کہ ان کے کہنے بجھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہوتا وہی ہے جو وہ ملک الخلاق طے کرے۔ ورنہ میر کیا چیز ہے سودا کیا ہے۔ مجھ کو ان لوگوں کی پروا کیا ہے۔"

پھر اچانک وہ ہنس کر بولے، "لو بھئی یہ تو مطلع ہی ہوگیا:

میر کیا چیز ہے سودا کیا ہے
مجھ کو ان لوگوں کی پروا کیا ہے

پھر انھوں نے اس پر غزل کہی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ میر تقی صاحب، اور پھر میرزا سودا کا ادب وہ بہت کرتے تھے۔ اور یہ بھی ہے کہ عزت نفس انھیں بہت پیاری تھی۔ صاحب عالم میرزا سلیمان شکوہ بہادر کی کدورت دور کرنے میں وہ اسی لیے ناکام رہے کہ کہنے کو تو عذر معذرت کے شعر انھیں لکھتے، لیکن دراصل اپنی ہی توصیف کرتے اور شہزادے سے یوں کلام کرتے جیسے وہ ناسمجھ بچہ ہو۔ ایک بار جب سید انشا والے معاملے میں مرشد زادۂ آفاق ان سے بہت برہم تھے تو شیخ صاحب نے قصیدے میں لکھا کہ آپ کان کے کچے ہیں اور آپ کے درباری سب نااہل:

مزاج میں یہ صفائی کہ کر لیا باور
کسی کے حق میں کسی نے جو کچھ کیا تقریر
مصاحب ایسے کہ گر کچھ کسی سے لغزش ہو
تو اس کی رفع کی ہرگز نہ کر سکیں تدبیر
ولے مزاجِ مقدس جو لا ابالی ہے
نہیں خیال میں آتا خیالِ حرفِ حقیر

وہ قصیدہ یوں لکھتے گویا ممدوح سے زیادہ اپنی مدح کر رہے ہوں۔ حضرت امیرالمومنین کی ثنا میں ایک قصیدہ یوں شروع کیا ہے گویا اپنی شان میں لکھ رہے ہوں:

ہو چکا دور میر اور مرزا
اب زمانے میں ہے مرا دورہ

اور انھیں میرزا سلیمان شکوہ بہادر کو مخاطب کر کے انھوں نے ذرا دیکھیے کس شان سے کہا:

مجھ کو نہ دیکھ دیکھ تو میرے کلام کو
قولِ امیر کو نہ سمجھ اتنا سرسری
مادح کو مجھ سے تجھ سا ہی ممدوح تھا ضرور
تو حیدری اگر ہے تو ہوں میں بھی قنبری

انصاف دُو تو ہاتھ سے مت دے تو وہ خدا
گر بندہ پرورا نہ گئی بندہ پروری

ان کی زندگی کا بڑا حصہ مربّی کی تلاش اور دنیاوی روزی رسانوں کی مدح میں گزرا، لیکن یہ پیشہ انھوں نے اپنی پسند سے اختیار نہ کیا تھا۔ ان کا شعر ہے، اور یہ محض مضمون نہیں، حسبِ حال ہے:

سارے حصولِ زر کے سب اسباب جل گئے
ناچار ہم نے شاعری ہی اختیار کی

انھیں عقل و دانش کی توقیر کا بہت لحاظ تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ کسی کے دامنِ دولت سے منسلک نہ ہوتے، آزاد جیتے اور آزاد رہتے۔ یہ بھی انھیں کا شعر ہے:

حیف اس کا مجھ کو آتا ہے ارسطو سا بشر
ملک دانش چھوڑ کر جاہ و حشم میں جا پھنسا

یہ غزل انھوں نے میرے سامنے کہی تھی۔ میں نے پوچھا کہ ارسطو کون تھا تو انھوں نے کہا کہ بی بی وہ ہم سب کا معلّم اور رہبر تھا۔ ہم عالم کو جتنا کچھ سمجھے ہیں اس کے اور اس کے شاگردانِ معنوی شیخ الرئیس ابنِ سینا اور ابنِ رشد اور عبد الحکیم سیالکوٹی اور ملا محمود جونپوری کی ذواتِ بابرکات کے باعث سمجھے ہیں۔ خان علامہ کو دیکھو کس مرتبے کے عالم تھے۔ درباداری نے انھیں کسی کام کا نہ رکھا۔ سعادت علی خان کو نوابی دلانے میں ان کی مساعی پیش پیش تھیں۔ لیکن مسند پر متمکّن ہوکر نواب وزیر نے خان علامہ کو کلکتہ کمپنی دربار میں یہ عہدۂ وکالت ٹالا۔ اسے ایک طرح کی جلاوطنی ہی سمجھو۔ آخر کار وہ وطن سے دور مرشد آباد میں مرے۔ ابھی چند دن کی بات ہے (خان علامہ کا انتقال ۱۲۱۶ مطابق ۱۸۰۱ میں ہوا، مرتب)۔

میں یہ باتیں کچھ سمجھی، کچھ نہ سمجھی۔ پھر بھی ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھ ہی لیا:

''دنیا کو جاننے کے لیے نبی کے احکام اور امامانِ معصوم کی حدیثیں کافی نہیں کیا؟''

وہ مسکرائے۔ ''صرف دنیا نہیں، عالم۔ اور عالَم کو سمجھنے کے لیے نقل اور عقل دونوں ضروری ہیں بھورا بیگم۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں افلا تعقلون۔ اللہ نے انسان کو قوتِ ادراک بھلا کیوں عطا کی؟ قوتِ ادراک کے زیرِ نگیں سب کچھ ہے۔ شعر سنو:

لوح و قلم و کرسی و عرش اور یہ افلاک
اونچے ہیں پہ ہیں قوتِ ادراک کے نیچے

میں کچھ سمجھی نہیں، لیکن یہ شعر مجھے بڑا ڈراؤنا لگا۔ یہ کمبخت ادراک کیا ہوا نعوذ باللہ امامانِ معصوم اور حدیث و قرآن سے بھی بڑھ گیا۔ کیا معلوم مولا اور اللہ میاں ان کے ساتھ اس شعر کی بنا پر کیا معاملہ کریں۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ ان کا مذہب مجھ پر کھلتا نہ تھا۔ کبھی امامانِ معصوم کی مدح میں

شعر کہتے تو کبھی سنیوں کے بزرگوں کی ثنا کرتے۔ کبھی سنیوں کو برا کہتے تو کبھی شیعوں کو جاہل اور گم راہ ٹھہراتے۔ رہی نماز وتلاوت وروزہ، تو یہ اعمال ان سے کبھی سرزد نہ ہوئے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے کہنے لگے:

''سنتی ہو، دنیا میں اتنی برائی، اتنی ناانصافی، اتنا ظلم ہے۔ ایمان داری اور حق پرستی کبھی کبھی ہی ظہور میں آتی ہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ اللہ میاں نے اپنے سب کام شیطان کے سپرد کر دیے ہیں۔''

پھر انھوں نے شعر پڑھا، اور شعر کیا پڑھا میری تو جان ہی لے لی:

فتنے لاکھوں یہ اسی نے تو اٹھائے جس کے
کُن کے کہنے میں ہوا عالمِ امکاں تیار

''اللہ، توبہ کیجیے توبہ۔ یہ باتیں میرے سامنے آپ بکتے ہیں اور مجھے بھی گنہ گار کرتے ہیں۔'' میں اپنے کلّوں پر ہاتھ مار کر کان پکڑتے ہوئے بولی۔ ''یہ رہ رہ کر آخر آپ کو ہو کیا جاتا ہے؟ اللہ کو منھ دکھانا نہیں ہے کیا؟''

''بھورا بیگم، اللہ کے یہاں انصاف ہوتا تو نہ یہاں فرنگی ہوتے اور نہ ٹیپو سلطان کی شہادت ہوتی۔ اور نہ مجھ سا یگانۂ روزگار نانِ شعیر اور ٹھنڈے آبخورے کی دھن میں دن رات ایک کرتا:

مصحفی میں تو تہی دست رہا کیا حاصل
گو موئے پر مرا دیوان مطلّا ہووے

ان کے لہجے میں تھوڑا بہت حرمان لیکن بہت سارا کڑواپن تھا۔

''للہ اب چپ رہیے، اللہ سب دیکھتا اور سنتا ہے اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ چاہے گا تو آپ کے در و دیوار تک کو سونے سے لپوا دے گا۔''

''اللہ میاں کو اتنی فرصت کہاں بھورا بیگم!'' وہ کچھ چیں بہ جبیں ہو کر بولے۔ ''بوعلی کہتا تھا کہ اللہ کو جزئیات کا علم نہیں....''

''خدا جانے کون موا بے حیا بے مذہب بوعلی آپ کا دوست ہے۔ ایسوں کی صحبت سے قیدِ فرنگ بھلی۔'' میں جل کر بولی۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسے۔ ''ہاں اس کی دوستی میں گم راہی ہی ہے۔'' پھر اچانک ان کے ماتھے پر شکن آئی، جیسے کسی گتھی کو سلجھانے کی کوشش میں ہوں۔ ''لیکن سوچو کہ وہ تو عالمِ تجزیہ میں قائم بالذات ہے۔ اسے تنزل کیوں کر ممکن ہے کہ بادشاہوں اور کوتوالوں کی طرح محکمۂ عدالت آراستہ کرے؟ دنیا کے کام بندے کی تدابیر سے وابستہ ہیں، اور اہلِ صفا کی تدبیریں دنیا پرستوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث پٹ پڑتی ہیں۔''

میں نے انگلیوں میں کان دے لیے۔ ''میں اب کچھ نہ سنوں گی۔ جائیے آپ بھی کلّیاں کیجیے، منھ صاف کیجیے، توبہ کیجیے کہ کفر کا زنگ آپ کے دل سے دور ہو۔''

وہ ہنستے رہے۔ اور طرفہ تماشا یہ کہ ایک طرف تو ایسی باتیں کہ شیطان سنے تو پناہ مانگ جائے، اور دوسری طرف یہ بھی کہ وہ دیانت داری، امانت داری، چھوٹوں سے محبت اور ان کی خاطر ایثار، بزرگوں کا احترام، ان باتوں میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ خواجہ حیدر علی تو خیر ان کے شاگرد ہی تھے، ان کی تعریف میں وہ مبالغہ کر سکتے تھے۔ لیکن شیخ ناسخ کے باب میں انھوں یہاں تک کہا اور لکھا کہ بایں پیرانہ سری اور ضعف، میں نے اپنا رنگِ سخن بدل کر امام بخش ناسخ کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ سید انشا سے لڑائی کے زمانے میں شاید انھوں نے سید موصوف اور ان کے حواریوں کو سخت سست کہا ہو تو مجھے اس کی خبر نہیں، لیکن میں نے اپنے پچیس تیس برس کے ساتھ میں ان کی زبان کو کسی کی غیبت سے آلودہ نہ دیکھا۔ ان میں خود بینی بہت تھی، لیکن خود نمائی نہ تھی۔ کچھ ایسا تھا کہ انھیں اپنے کمال اور حکمت دونوں پر اعتمادِ کلی تھا، لہٰذا وہ اس کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے کہ اپنے کمال کو ثابت کرنے کے لیے نمائشی انداز اختیار کریں۔

میں سمجھتی ہوں کہ وہ اگر اتنے خود دار اور خود نگر نہ ہوتے تو امیروں رئیسوں سے اچھی نباہ کر لیتے اور ہماری زندگی زیادہ آسودگی سے گزرتی۔ حق یہ ہے کہ عام شاعروں کو جیسا میں نے ظفرالدولہ کپتان فتح علی خان کے آستانے پر ناک رگڑتے، اپنے مدمقابل شعرا کی عیب جوئی کرتے اور عموماً طور پر خود کو رذیل ثابت کرتے دیکھا اور سنا تھا، اس کی بنا پر میں شاعروں کے طبقے کو ارذل کو نین ہی سمجھتی تھی۔ شیخ صاحب نے میری آنکھیں کھول دیں۔ ان کے جو شعر مجھے سب سے پہلے یاد ہوئے ان میں یہ بھی تھا، اور میں نے ہمیشہ اسے بالکل سچ مانا:

هم مصحفیؔ غنی ہیں شعر و سخن کی دولت
رتبہ ہمارے آگے رکھتا ہے سیم و زر کیا

یہ شعر انھوں نے اس وقت پڑھا تھا جب میں نے ایک بار دبی زبان سے تمنا کی تھی کہ ہم تونگر ہوتے تو میں اپنے ہونے والے بچے کے گلے میں سونے کی ہیکل ڈلواتی۔ بچہ تو خیر جاتا رہا۔ لیکن یہ شعر یادگار رہ گیا۔

رہی شعر گوئی اور سخن سنجی، تو ان کی پُر گوئی اور زود گوئی کی تو سارے زمانے میں دھوم تھی ہی۔ میں کہہ ہی چکی ہوں کہ وہ کسی مضمون، کسی صنف، میں بند نہ تھے۔ کبھی کبھی کوئی دبی زبان سے کہتا کہ مرزا رفیع کا قصیدہ اور میر تقی کا غزل میں جواب نہیں، تو کبھی وہ چپ ہو جاتے، اور کبھی کہتے:

آفتابِ زمیں ہوں میں لیکن
مجھ سے روشن ہے آسمانِ سخن
ہے غزل میری گرچہ سحرِ حلال
پر قصیدے میں دیکھ شانِ سخن

دیکھ کر رتبۂ سخن کو مرے
سجدہ کرتے ہیں سرکشانِ سخن

اور سچ یہ ہے کہ وہ میر تقی اور مرزا سودا کے قائل بھی تھے۔ یہ بھی انھیں کے شعر ہیں:

غرور شاعری اے مصحفی اچھا نہیں اتنا
تجھے کیا میر و مرزا سے ہے جب اے بے ادب نسبت

☆

گو کہ تو میر سے ہوا بہتر
مصحفی میر پھر بھی میر ہی ہے

☆

مصحفی دلّی کو لکھ بھیجی تھی میں نے یہ غزل
سچ بتا سن کر اسے درد و اثر نے کیا کہا

اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنے سے کم عمر یا کم رتبہ شاعر کو حقیر نہ سمجھتے تھے، حتی الامکان وہ نو واردوں اور نو آموزوں کا دل بڑھاتے تھے، ان کے کلیجے میں چھریاں نہ مارتے تھے۔ تنگی ترشی کے زمانے میں بھی وہ ضرورت مندوں کو سہرا، رخصتی، تہنیتی غزل وغیرہ بے اجرت ہی لکھ دیا کرتے۔ ہاں کسی نے خوشی سے کچھ نذر کیا تو انھیں تکلف بھی نہ تھا۔

زود گوئی اور پُر گوئی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ کسی کا کلام سراپا انتخاب نہیں ہوتا۔ ان کا تو ہو ہی نہ سکتا تھا کہ وہ شعر اس روانی اور بے تکلفی سے کہتے تھے جس طرح اور لوگ گفتگو کرتے ہیں۔ انھوں نے جلال الدولہ مہدی علی خان کے مشاعرے میں ایک غزل پر بڑی داد پائی تھی، اس میں دو شعر یہ تھے:

آخر تو عرش پر ہے ارواحِ شاعراں بھی
جاویں گے واں تو ان کی گرم انجمن کریں گے
بعد از فنا بھی ہم سے اے مصحفی نہ ہوگا
ہم اس زباں کے ہوتے ترکِ سخن کریں گے

مجھے خوب یاد ہے جب یہ شعر سن کر میں نے کہا، "اس زباں" سے آپ کی مراد زبانِ ریختہ بھی ہے، اور اپنے منھ کی زبان بھی، تو انھوں نے مجھے اس محبت اور استحسان سے دیکھا کہ میں مارے خوشی کے کپکپا اٹھی۔ شعر اور فنِ شعر کے بارے میں ان کی وہبی فہم ان کی اکتسابی فہم سے بھی بڑھ کر تھی۔ ایک طرف تو وہ یہ بھی کہہ گئے:

اے مصحفی مشکل ہے غزل ایک سی کہنا
اک بیت کہیں اچھی بھی ہو جاتی ہے دس میں

تو دوسری طرف انھوں نے گویا خود سے مخاطب ہو کر کہا:

کارگاہِ سخن کا فرق نہ پوچھ
جیسی جس کی ہے بافت بنتا ہے

میں کبھی کبھی سوچتی ان سے پوچھوں، آپ کون سی بافت کی کہتے ہیں، شاعر کے مزاج کی، قوتِ شعرگوئی کی، استاد کی تربیت اور تعلیم کی یا پھر تقدیر کی؟ لیکن پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اپنے شعر کا مطلب بتانے سے گریز کرتے تھے۔ اگر کسی نے بہت اصرار کیا تو کہتے، مجھ سے معنی مطلب کی بات نہ کرو۔ میں شعر میں گم ہوں اور شعر مجھ میں:

صدقے ہوں سخن کے مصحفی میں
صدقے ہے مرے سخن ہمیشہ

(۹)

ان کی حسن پرستی؟ اس باب میں اور کیا کہوں۔ آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔ بس مزید یہ سن لیجیے کہ عشق ان کی زندگی تھا اور حسن اس زندگی کا محور۔ ان کا آخری وقتوں کا شعر ہے:

شریفِ کعبہ سے لے تا فقیہِ دانش مند
رکھے ہے دل میں ہر اک چاہ خوب صورت کی

انھیں چاہے جانے سے زیادہ چاہنے کی چاہ تھی۔ ان کے گھر میں مجھے محبت اور عاشقانہ توجہ ہمیشہ ملی، لیکن میں نہیں کہہ سکتی کہ گھر کے باہر ان کے لگاؤ کس سے تھے، لاگ کہاں کہاں لگتی تھی۔ مجھ سے پہلے تو یقیناً ان کے معشوق بہت سے تھے۔ بہ یک وقت بھی کئی جگہ انھوں نے دل اٹکا رکھا تھا، ایسا بھی مجھے ان کے کلام سے شک کبھی کبھی گزرا۔ ان کی بات چیت میں رندی اور شاہد بازی ہمیشہ جھلکتی تھی لیکن تہذیب کے دائرے سے باہر وہ کبھی نہ ہوتے تھے۔ میں نے کچھ دن پہلے آپ سے کہا تھا نہ کہ شاید ہی کوئی ایسی عورت ہو جسے وہ اپنی طرف ملتفت نہ کر لیتے ہوں، کچھ دیر ہی کے لیے سہی۔ مجھے لگتا ہے مردوں، خاص کر بننے ٹھننے والے مردوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔

اشعار پر جائیے تو لگتا ہے انھوں نے شاہدانِ بازاری سے لے کر جوانانِ نوخاستہ کو وقتاً فوقتاً تاک رکھا ہوگا۔ ان کی جوانی کا شعر ہے، شاید دہلی میں کہا ہوگا:

چھوڑا نہ میاں مصحفی تم نے کوئی لونڈا
تم کام میں اپنے غرض استاد ہو کوئی

اب خدا ہی جانے سچ ہے کیا جھوٹ کیا ہے۔ ان کے بعض اور شعروں سے بالکل الٹا ہی مطلب نکلتا ہے اور ایمان کی کہوں تو اس مضمون سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں کہ انھوں نے کے عشق کیے اور

کس کس سے۔ عشق میں ان پر جو گزرتی تھی وہ میرے لیے زیادہ اہم بات ہے۔ ان کے وجود کا ایک رخ شعر تھا تو ایک رخ عشق بھی تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے کمک پہنچتی تھی۔ سید انشا سے وہ اس لیے بھی دل ہی دل میں الجھتے تھے کہ ان کے کلام میں معشوق کا جلوہ انھیں دکھائی نہ دیتا تھا۔

''عجیب شخص ہے،'' ایک دن وہ مشاعرے سے کچھ تاؤ کھائے ہوئے سے آئے اور دروازے میں داخل ہوتے ہی بولے، ''پتا نہیں کیوں اسے نہ ہاتھ پاؤں منھ دکھائی دیتے ہیں، نہ دل دکھائی دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ خود کو بھی نہیں دیکھتا، صرف محفل کو دیکھتا رہتا ہے۔'' پھر انھوں نے سید انشا کی غزل کے شعر سنائے:

مانگا جو میں نے بوسہ ان سے چمن کے اندر
بولے کہ یاں نہیں چل مچھی بھون کے اندر
کیا گھات کی جگہ ہے چمپے کے جھاڑ نیچے
مہندی کی ٹٹیوں کے اوجھل چمن کے اندر
بل بے ترا اکڑنا لے ہاتھ میں طمنچہ
اور آکے بیٹھنا یوں مجلس میں تن کے اندر

پھر وہ کہنے لگے، ''دیکھو کلام میں کیا زور ہے، کیا صفائی ہے۔ لیکن کیفیت، معنی، شورش، یہ سب نام کو نہیں۔ اس مرد آدمی نے دو غزلہ پڑھا تھا، بعض مضامین رنگیں بھی تھے۔ لیکن زیادہ تر شعر ایسے ہی تھے، واہ وا کی حد سے آگے نہ تھے۔''

یہ بحث میری استعداد سے اونچی تھی اس لیے میں کچھ نہ بولی۔ انھوں نے اپنی طرحی غزل کے شعر مجھے نہ سنائے اور نہ میں نے فرمائش کی جرأت کی۔ لیکن بعد میں ان کی بیاض میں ڈھونڈا تو وہ غزل مل گئی۔ دو شعر آپ بھی سنیں، مطلع تھا:

تھا سرخ پوش کوئی شاید چمن کے اندر
شعلہ سا شب پھرے تھا سرو و سمن کے اندر
گورے بدن کا اس کے عالم میں رات دیکھا
اک نور کا جھمکڑا تھا پیرہن کے اندر

چھوٹی سی غزل تھی، لیکن ان شعروں کو انشا صاحب کی غزل کے سامنے رکھ کر دیکھا تو میں سمجھی کہ شیخ صاحب نے جو یہ کہا کہ انشا صاحب معشوق کو بھی نہیں دیکھتے، محفل کو دیکھتے رہتے ہیں، تو اس کا کیا مطلب تھا؟ مجھے لگا کہ شیخ صاحب کی آنکھیں تو ساری عمر ہی معشوق کے نور کا جھمکڑا دیکھتی یا ڈھونڈتی رہیں تھیں۔ فارسی عربی میں نہیں جانتی، دلّی کا مجھے پتا نہیں، لیکن اتنا کہہ سکتی ہوں کہ لکھنؤ کے شعرا میں،

حتیٰ کہ خود میر تقی صاحب کے یہاں بھی میں نے ایسی تلاش اور ایسی دید نہ دیکھی:

اک بجلی کی کوند ہم نے دیکھی
اور لوگ کہیں ہیں وہ بدن تھا

☆

ہر چند کہ تھا قابلِ دیدن بدن اس کا
پر آنکھ نہ ٹھہری جو کھلا پیرہن اس کا

☆

کون آیا تھا نہانے لطف بدن سے جس کے
لہروں سے سارا دریا آغوش ہوگیا ہے

☆

برق کی طرح جلا خاک کیا مزرع دل
کر گئی ہم سے یہ دھانی تری پوشاک سلوک

☆

سینہ صافوں سے خبر عالم علوی کی تو پوچھ
عرش و کرسی ہے یہاں عکس فگن آئے میں

☆

جمنا میں کل نہا کر اس نے جو بال باندھے
ہم نے بھی جی میں اپنے کیا کیا خیال باندھے

☆

رنگینیِ بدن کا کروں کیا بیاں کہ ہائے
اک تہ گلابی سی ہے ترے پیرہن میں زور

☆

شمع کو کیا اس سے نسبت ہے فروغِ حسن میں
یعنی ہے وہ نور کا شعلہ سراپا تن چراغ

☆

مانندِ حباب لب جو جسم کہاں ہے
اک روح ہے تو جامۂ نازک بدنی میں

☆

کیا عجب ہرگز ترے حسن سپید و سرخ سے
ہو گلابی پردۂ چشمِ تماشائی کا رنگ

☆

جس وقت کہ دیکھا ہے کھلا یار کا سینہ
اے مصحفی ہم لطفِ سحر بھول گئے ہیں

☆

محتاجِ عطر کب ہیں وہ پیراہنِ بتاں
جوشِ عرق سے جن کی مہکتی ہیں چولیاں

☆

بکھری لٹوں میں اس کا یہ عالم ہے دل فریب
ہو جوں اساوری میں کٹی مار کی شبیہ
لکھنا کمر کا اس کی علاقہ سریں کے ساتھ
اک مُو سے کھینچی ہے دو کہار کی شبیہ

اتنے شعر ہیں کہ وہ پڑھیں اور سنا کرے کوئی۔ اور یہ آخری شعر تو جب بھی مجھے یاد آتا ہے، میں شرم کے مارے منھ چھپا کر دوہری ہو ہو جاتی ہوں، لیکن مسکرائے بغیر بھی نہیں بنتی۔

آپ پوچھتے ہیں کوئی تو ہوگی جس نے ان کا دل دکھایا ہوگا۔ کوئی تو ہوگی جس پر ان کا جادو نہ چلا ہوگا۔ تو سچ بات یہ ہے کہ مجھے نہیں پتا۔ اور سچ بات یہ بھی ہے کہ مجھے یہ کرید ہوتی ہی کیوں؟ ایک دو رباعیوں میں کسی مختی کا نام میں نے ضرور دیکھا۔ شیخ صاحب نے انھیں ''قصائی کی بیٹی'' کہا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے یہ مختی بی بی ان کے شاگرد سعادت یار خان رنگین کی شاگرد اور منظور نظر رہی ہوں۔ میں نے سنا ہے ایک زمانے میں رنگین صاحب کا دل جگر ایک قصائی کی بیٹی کے ہاتھوں قیمہ ہو رہا تھا۔ سارے لکھنؤ میں ان کے قصے تھے کہ ایک طرف تو قصائی کا باپ میاں رنگین کی تکا بوٹی کرنے کے در پے تھا اور دوسری طرف بیٹی پر رنگین جیسے امیر زادے کباب ہو رہے تھے۔ یا ہو سکتا ہے یہ مختی بیگما شیخ صاحب ہی کا من بھاتا کھاجا رہی ہوں۔

''ایک اور تھیں جنھیں، جو ان کے ساتھ سوا ڈیڑھ سال رہیں، لیکن شیخ صاحب کی مفلسی انھیں بہت سالتی تھی، شیخ صاحب کے لیے نہیں، اپنے لیے۔ آخر کسی کٹنی کے بہلاوے میں آکر وہ حسن جھلسی انھیں چھوڑ ہی گئی۔ ایک اور بھی تھی۔ مجھے لگتا ہے وہ کوئی خادمہ یا مہری رہی ہو۔ میں نے اپنی بہشتن سے سنا کہ شیخ صاحب نے بدنامی کے خوف سے اس کا پیٹ گروایا۔ کس کی بدنامی، کیسی بدنامی؟ شیخ صاحب کو بدنامی کا ڈر کاہے کو ہوتا؟ خیر ہوگا۔ نہ جانے آپ مرد لوگوں کو ان معاملات کی کرید کیوں رہتی ہے؟

لو آپ کو پھر عصمت کی یاد ستانے لگی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، اس کا زمانہ وہ تھا جب میں ماں کے پیٹ میں بھی نہ آئی تھی۔ میں ان بازاری آبرو باختہ چھنالوں کے بارے میں کیا جانوں؟ ویسے تو محفلوں میں وہ ضرور ہی گانے بجانے والیوں کو دیکھتے ہوں گے۔ ان کے اشعار میں گنا اور گلو جیسے نام بھی میں نے سنے ہیں۔ لیکن وہ نظرے خوش گزرے کے قائل نہ تھے۔ وہ بدن کے معاملات میں بھی دل کے لگاؤ کو اہمیت دیتے تھے۔

آپ کہتے ہیں شیخ صاحب کے بعض بہت پرانے دوستوں کی زبان سے عصمت جہاں کا نام سنا گیا ہے کہ انھوں نے واقعی شیخ صاحب کو بہت تنگ کیا تھا۔ میں تو اتنا ہی جانتی ہوں جتنا شیخ صاحب نے مجھے از خود بتایا۔ ہوا یوں کہ ایک بار تپ کی تقریباً سرسامی کیفیت میں انھوں نے رباعی کا یہ مصرع پڑھا، پڑھا کیے، بس رک رک کر زیر لب ادا کیا:

مر جاویں گے یوں ہی عصمت عصمت کرتے

اب مجھے کیا خبر یہ منھ چڑھی عصمت کون ہیں؟ الھڑپن کی گھبراہٹ میں میرے منھ سے نکلا، ''کہاں رہتی ہیں، بلوا دوں؟''

انھوں نے اچانک آنکھ کھول کر غور سے مجھے دیکھا۔ تھوڑی سرخی لیے، پر اتنی روشن آنکھیں کہ لگتا تھا بیمار ہی نہیں ہیں۔ اشارے سے پانی مانگا۔ میں کٹورا بھر کر لائی، دھیرے دھیرے کر کے تین چار گھونٹ میں نے انھیں پلائے۔ اچنبھے کی بات یہ ہوئی کہ پانی پیتے ہی وہ سو گئے۔ میں گھبرائی کہ کہیں پانی کا کانٹا تو نہیں لگ گیا، لیکن کرتی کیا۔ اکیلی اور نا تجربہ کار۔ ایک آدھ بار انھیں ہلکے ہلکے جھنجھوڑا تو ان کی آنکھ پھر کھلی تو لیکن نیم وا ہی رہی۔ میں نے دل میں شکر ادا کیا کہ سب ٹھیک ہے۔ شام ہوتے ہوتے وہ جاگے تو تپ کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ میں ان کے پاس ہی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر میری ہتھیلی پر عجب اندازِ دل ربائی سے انگلیاں پھیریں، جیسے کچھ لکھ رہے ہوں۔ پھر جو کچھ انھوں نے بتایا وہ انھیں کی زبان میں کہتی ہوں۔

(۱۰)

وہ بھی کیا دن تھے کہ بہر یک نگہ اے مصحفی

سالہا ڈھونڈا کیے دلّی میں ہم عصمت کا گھر

میرا دلّی میں شروع کا زمانہ تھا۔ تقدیر کی خوبی کہ فکر معاش اور یادِ رفتگاں کے ساتھ عشق بتاں کی علت وہاں بھی در پے آزار ہوگئی۔ میں کسی سے روٹھ کر امروہے سے آنولے کے لیے نکلا تھا۔ افسوس کہ آنولے کی صحبتوں کا چراغ سحر ہونے سے پہلے ہی گل ہوگیا۔

ذوالفقار الدولہ اور مرہٹھوں کے دستِ تطاول نے مژہ برہم زدن میں اُس سارے چمن کو

تاراج کر دیا، روہیلوں نے پچاس برس جس کی آرائش اور تقطیع کی تھی۔ وہ مجلس بہشت آئین زمہریر سے سرد تر اور مرگھٹ سے ویران تر ہوگئی۔ میں وہاں سے اٹھا اور افتاں و خیزاں لکھنؤ پہنچا۔ مرزا سودا کی خدمت میں باریابی ہوئی تو دیکھا کہ انھیں سگانِ ابریشم پشم کی مشاطگی سے فرصت نہیں۔ ویسے بھی ان کا اور میرا جوڑ ہی کیا تھا۔ وہ چار دانگ عالم کے مانے ہوئے استاد، امرا اور خود نواب وزیر کے پسندیدہ شاعر، مدح میں طاق، ہجو میں شہرۂ آفاق۔ عمر میں مجھ سے کوئی پینتالیس پچاس برس بڑے، ان کی مدتِ شعر گوئی میری اپنی عمر سے کوئی دو چنداں تھی۔ کچھ ہی دن میں لکھنؤ سے اکتا کر میں نے شاہجہاں آباد کا رخ کیا۔

امروہے کے کسی آہوئے سیہ چشم کی برہم زنی مژگاں لکھنؤ میں تو نیش زنی کرتی ہی تھی، دلّی میں بھی اس نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کچھ اس بات کا غم بھی تھا کہ میں اس کے پاس سے چلا کیوں آیا۔ اس نے میری بے کاری کی جو کہی تو وہ کوئی طعنہ نہ تھا، یہ اور بات کہ دل میں چور ہونے کے باعث مجھے وہ کلمہ طعن خنجر سے بڑھ کر لگا۔

ان دنوں میری علمی استعداد کچھ نہ تھی۔ سارا لڑکپن، ساری جوانی میں نے گولیاں کھیلنے، کنکوے اڑانے اور محلے والیوں سے آنکھیں لڑانے کے سوا کچھ نہ کیا تھا۔ لیکن جس لعلِ سخن ساز نے باتوں میں لگا کر زلف گرہ گیر کے ڈورے ڈال کر اس بار میرا رشتۂ دل صاف کاٹا تھا اور اب اپنی انگشتِ حنائی میں پیچ دے کر اسے جھولے جھلا رہی تھی، وہ چیزے دیگر تھا:

دل نذر کر چکے ہیں پری وش کے ہو سو ہو
اے مصحفی اب آگے مقدر ہے اور ہم

میرا تو جی چاہتا تھا ہر وقت اسے سامنے بٹھائے اس کا منھ دیکھتا رہوں اور وہ گھر والوں کے ہاتھوں مجبور تھی۔ چوری چھپے کی ملاقاتوں میں جی کے ارمان کہاں نکلتے ہیں۔ ایک دن میں نے باتوں باتوں میں ٹوہ لینی چاہی کہ ہم شادی کیوں نہ کر لیں۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی، ''اور کھاؤ گے کیا، کھلاؤ گے کیا؟ خالی پیٹ کے چونچلے کب تک چلیں گے؟''

مجھے ایسا لگا جیسے زنبور نے ڈنک مار دیا ہو۔ ''تو کیا تمھارا جی نہیں چاہتا...؟'' میں بات پوری نہ کر سکا۔

''ہاں، چاہتا تو ہے،'' وہ ہر کلمے پر زور دے کر بولی۔ ''لیکن میں نے ابھی کچھ سوچا نہیں۔ تم اگر کسی لائق ہوتے...''

''میں شاعر تو ہوں۔ ایک دن بڑا استاد بنوں گا۔ بڑے بڑے رئیس میرے شاگرد ہوں گے، دیکھ لینا۔''

وہ پھر ہنسی۔ ''تب آنا۔ تب دیکھیں گے۔''

میں اٹھا اور اٹھ کر چل دیا، وہ مجھے بلاتی رہی۔ ''ارے میں تو تمھیں چھیڑ رہی تھی، سنو تو سہی۔ تمھیں میری جان کی قسم۔'' لیکن مجھے زندگی میں پہلی بار غصہ آیا تھا اور ذلت محسوس ہوئی تھی۔ گھر میں مجھے روکنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ دو بھائی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، تیسرا تارک الدنیا تھا۔ میں نے بھی امروہہ ترک کیا اور بھری دنیا سے اکیلا نبرد آزما ہونے کو نکل کھڑا ہوا۔ لطف یہ کہ سامان نبرد کیا، سامان سفر بھی کچھ نہ تھا، بس یہ دل کش خود فریبی تھی کہ مجھے استاد الشعرا بننا ہے۔ کاش کہ میں مستقبل بیں ہوتا اور یہ شعر جو میں نے کوئی نصف صدی بعد کہے، انھیں اپنی سرنوشت میں لکھا دیکھ لیتا:

ہے شاعروں کی اب کے زمانے میں یہ معاش
پھرتے ہیں بیچتے ہوئے کالائے شاعری
لیتا نہیں جو مول کوئی مفت بھی اسے
خفت اٹھا کے آتے ہیں گھر وائے شاعری

لیکن تب تو حوصلے بلند تھے اور مایوسی سرنگوں۔ لکھنؤ میں ناکامی بھی امید کی ریسماں کو قطع نہ کر سکی تھی۔ اور کچھ نہیں تو مشقِ سخن کے رنگ چوکھے ہو چلے تھے۔ لوگ مجھے مشاعروں میں بلاتے، میرے گھر کے مشاعرے میں اپنے شعر سنانے کے لیے آتے۔ ایک دن سید خواجہ میر صاحب کی ایک محفل میں ان کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ ان کی صورت تو کچھ خاص نہ تھی لیکن پور پور، بوٹی بوٹی سے ڈومنی پن ٹپکتا تھا۔ ان کی نشست و برخواست، گردن کے خم، ڈھلکے ہوئے دوپٹے کو ہاتھوں سے درست کرنے کے طور، ہر چیز میں ایک ادا نکلتی تھی۔ اور ہر ادا پکار پکار کر کہتی تھی کہ ہم کلیجے میں کھبنے کے لیے بنے ہیں۔ تس پر جامہ زیبی تو اس قدر کہ بس گویا کپڑوں نے ان کا بدن پہن لیا تھا۔

میں ہمت مجتمع کر رہا تھا کہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے شخص سے ان کا نام پوچھوں کہ کسی نے کہا، ''اچھا تو آج عصمت جہاں بھی قدم رنجہ فرما ہیں۔'' مجھے وہ نام اتنا اچھا لگا کہ جی چاہا اب ساری غزلیں اسے ہی ردیف بنا کر لکھوں۔ زیور اور لباس کا سراپا تو میں نے وہیں کہنا شروع کر دیا:

کانوں میں جڑاؤ اس کے بالا
ہو جیسے ستارہ دار ہالہ

☆

بنی کی چمک جبیں پر ایسی
جو ڈانک نہ ہو نگیں پر ایسی

☆

نتھ ناک میں ہالۂ قمر تھی
یا قلزمِ حسن کی بھنور تھی

☆

کانوں میں وہ بالیاں طلائی
کرتی تھیں ادا سے کج ادائی

☆

الماسی کڑے کلائیوں میں
حل کر وہ قمر صفائیوں میں

☆

ہاتھوں میں وہ پور پور چھلّے
تھے جن سے بتوں طپاں محلّے

☆

جگنو وہ گلے میں ماہ پارہ
جوں ماہ کے پاس ہو ستارہ

☆

جوڑا وہ برنگِ زعفرانی
ہو دیکھ جسے پری دوانی

☆

پھر تن پہ وہ سینہ بند گلدوز
جو دل سے فرشتے کے چنے سوز

☆

پھر نیم تنہ وہ دامِ بلبل
کاڑھے ہوئے جس میں سیکڑوں گُل

☆

پھر کفش وہ رشکِ ماہ و خورشید
ہم پنجہ بہ تاجِ فرقِ جمشید

کس نے کیا پڑھا، خود میں نے کیا پڑھا، معلوم نہیں۔ بس میں ہر ہر بہانے سے انھیں دیکھتا رہا۔ گھر واپس آیا تو دوستوں شناساؤں سے ان کا حال پوچھا۔ لوگوں نے کہا، ''میاں غلام ہمدانی، بڑے خراب گھر میں تمھاری گوٹ اٹکی۔ یہ امرو بہ نہ باشد۔ اس آستانے پر بار پانا ہے تو سونے کے بن کر آؤ، یہ مٹی کی نوکری وہاں نہ چلے گی۔'' لوگوں کی نصیحتوں پر مجھے شیخ ابو سعید ابی الخیر کی رباعی یاد آئی، کاش میں

نے ان کی بات سن لی ہوتی:

پرسید زمن کسے کہ معشوق تو کیست
گفتم کہ فلاں کس است مقصود تو چیست
بنشست و ہائے ہائے بر من بگریست
کز دست چنیں چساں خواہی زیست

لیکن مجھے دوں سی لگ گئی تھی۔ کسی کل چین نہ تھا۔ کئی مہینے کی کھوج کے بعد میں نے عصمت جہاں کے گھر کا پتا تو لگا لیا تھا لیکن وہاں جانے کی ہمت نہ تھی۔ بہ قول میر تقی، شاہد پرستیوں کا ہم پاس زر کہاں تھا۔ جی تھا کہ اُمڈا آتا تھا۔ یہ غزل انھیں وقتوں کی ہے:

آتی ہے یہی جی میں فریاد کروں روؤں
رونے ہی سے تک اپنا دل شاد کروں روؤں
اس واسطے فرقت میں جیتا مجھے رکھا ہے
یعنی میں تری صورت جب یاد کروں روؤں

کبھی کبھی اس کی طرف جا نکلتا تو دیکھتا امرا کی سواریاں ایک سے ایک آراستہ پیراستہ گلی کے دو رویہ لگی ہیں، اور مجھ جیسے قلاش تماش بینوں کو عصمت جہاں کے شیدی اور تلنگے ڈنڈے مار مار بھگا رہے ہیں۔ میں چپ چاپ بدن چرائے سر جھکائے نکل جاتا۔ آخر ایک دن دیدار ہو ہی گیا، اگر اس کو دیدار کہیں کہ میں نے اسے دور سے دیکھا اور وہ میرے وجود سے خبر بھی نہ ہوئی:

کیا اس کی چشم مست کی دیتا نہ کچھ بھی داد
ہوتا جو کوئی مردم ہشیار درمیاں

میری خوش بختی یہ کہ اس کے شیدیوں میں ایک جو سب سے بڑھ کر جلاد صفت تھا، اس دن صدر دروازے پر نہ تھا، ورنہ اس گلی کا کتا کسی کے استخوان توڑتا نہ توڑتا، وہ کم بخت سدا اسی کام میں لطف لیتا تھا۔ خیر، میں گلی کی دوسری جانب ایک تنبولن سے جھوٹ موٹ کی چہلیں کر رہا تھا کہ ایک ذرا غل سا ہوا۔ معلوم ہوا افراسیاب خان بہادر نے خاص اپنی سواری کی رتھ بھیجی ہے، عصمت جہاں کئی بار منائی کر چکی ہیں لیکن آج تشریف لے جاویں گی۔ میں نے لپک کر گلی پار کی اور صدر دروازے سے بالکل متصل کھڑا ہو گیا۔ جب تک کہ دربان لاٹھی اٹھا کر مجھے وہاں سے کھسکائے وہ برآمد ہی تو ہو گئیں۔ اف وہ بدن اس قدر لطیف کہ ٹپکا پڑتا تھا، وہ زلف اس قدر سرکش کہ اس کے ہاتھوں سے اڑی جاتی تھی:

ز تری خواست اندامش چکیدن
ز بازی زلفش از دستش پریدن

زندہ بلند اقبالی کی خوش بو کا لطیف، بہت لطیف نفس مجھ تک پہنچا تو میں بے ہوش ہوتے

ہوتے رہ گیا۔ میاں جرأت کے شعر کا مطلب اس وقت سمجھ میں آیا:

کہاں ہے گل میں صفائی ترے بدن کی سی
بھری سہاگ کی تس پر یہ بو دلھن کی سی

میں نے جھک کر سلام کیا۔ ایک نگاہ غلط انداز تھی، خدا جانے میرے لیے یا کسی اور دریوزہ گر حسن کے لیے۔ میں تو سر جھکا کر ہی خوش تھا:

نیاز آرد کسے کو عشق باز است
کہ عشق از بے نیازاں بے نیاز است
نہ سازد عاشقی با سرفرازی
کہ بازی بر نہ تابد عشق بازی

یقین ہے کہ وہ میرے وجود سے بے خبر رہیں لیکن میرے دل میں بھڑکتے ہوئے ہوس اور شوق کے شعلوں کی گرمی شاید انھیں ضرور ہی پہنچی ہو۔ مجھے یارائے نگاہ تو تھا نہیں، یارائے گفتگو کہاں سے ہوتا۔ اس کے بعد کئی بار ایسا ہوا کہ حویلی میں آتے جاتے میں انھیں دیکھ کر دل خوش کر لیتا۔ دیکھنے سے تسلی کیا ہوتی، بس سمند شوق کو ایک اور مہمیز لگ جاتی۔ کبھی کبھی شعرا کی محفل آراستہ ہوتی تو میں خیال و خواب کے قلعے تعمیر کرتا کہ مجھے بھی بلایا جائے گا لیکن وہاں تو:

در بزم او کسم بہ بدی ہم نہ برد نام
ہر چند گوش در پس دیوار داشتم

والا رنگ تھا۔ میں نے اتنی ٹوہ لگالی تھی کہ عصمت جہاں کسی کی پابند نہیں، لیکن کسی سے ان کی ملاطفت بھی نہیں۔ سب یہی کہتے کہ میاں اس کا خیال دل سے نکال دو۔ اگر وہ تم کو سر پر بٹھائے گی بھی تو صرف اس لیے کہ اس طرح بالا خانے کے چھجے سے تمھیں نیچے پھینکنے میں آسانی ہوگی۔ اور یہاں امیدواری کی یہ محویت کہ جب بھی انھیں دور سے دیکھتا اور ان کی بے توجہی کا تیر دل پر کھاتا تو دل یہی کہتا کہ صبر کر، شاید آئندہ ان کی آنکھ تجھ پر پڑ ہی جائے:

آں بے مروتی کہ تو ہر روز می کنی
خود را وہم فریب کہ فردا نمی کند

اور آخر ایک بار سامنا ہو ہی گیا، آنکھیں چار ہونے کی نوبت آگئی۔ چھڑیوں کا میلہ تھا، میں بھی آشفتگیِ دل سے تنگ آکر، اور اس امید کے ساتھ میلے کو چلا کہ شاید وہ دکھائی دے جائیں اور اس بار سر حرف وا کرنے کا موقع ملے۔ میر محمد تقی خوب کہتے ہیں:

وا اس سے سر حرف ہو ہر چند کہ سر جائے
ہم حلق بریدہ ہی سے تقریر کریں گے

اور ہوا بھی کچھ ایسا ہی۔ وہ ایک گل فروش کی دکان پر اپنی رتھ رکوا کر گجرے خرید رہی تھیں کہ ادھر سے میں آنکلا۔ خوف اور رعب اور امید کی ایک لہر بجلی کی طرح میرے دل سے میری کمر تک دوڑ گئی۔ لگا میں آج ہی سن بلوغ کو پہنچا ہوں۔ قریب سے دیدار اور گھل مل کر گفتار اور شوق کے بے تکلف اظہار کی ہوس مجھ پر کچھ اس طرح چھا گئی جیسے کوئی بھیگی لکڑی دیر سے سلگ رہی ہو دھواں دے رہی ہو اور اچانک بھڑک اٹھے۔

قبا کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو شکر ایزدی بجالایا کہ کچھ رقم نکل آئی جس سے میں گلدستہ نہیں تو دستنبوے تو خرید کر اس دربار میں گزران سکتا تھا۔ جلد پیسہ پھینک کر مال اٹھایا، رتھ کے پاس پہنچا تو وہ پردہ گرانے ہی والی تھیں۔ میں نے جلدی سے بڑھ کر سلام کیا، پھول پیش کیا۔ سلام کا جواب ایک خفیف سی چین جبیں اور ہاتھ کے ہلکے سے اشارے سے ملا۔ دستنبو رتھ بان کے پیچھے بیٹھی ہوئی خادمہ کے ہاتھ میں گیا۔ یہی رتھ بان کو آگے بڑھنے کا اشارہ بھی تھا، ہائے اب میں کیا کروں کہاں جاؤں۔ رتھ چلنے ہی والی تھی۔ میں نے تہذیب اور احتیاط کو بالائے طاق رکھا اور ہاتھ باندھ کر باآواز بلند، اور بڑے لحن سے مولانا جمالی کا شعر پڑھا:

مارا بہ خاک کویت پیراہنیست بر تن

آں ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بہ دامن

تیر نشانے پر بیٹھا، ہونٹوں پر خفیف ولطیف مسکراہٹ آئی گو کہ آنکھوں تک نہ پہنچی۔ انھوں نے جھک کر خادمہ سے کچھ سرگوشی کی۔ خادمہ نے میری طرف کالی بھونرا سی آنکھیں اٹھائیں اور بولی:

''بی بی جی فرماتی ہیں، آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ لیکن اس وقت یہاں ٹھہر نہیں سکتیں۔ کبھی حویلی پر قدم رنجہ فرمائیں۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہوتے رتھ آگے بڑھ گئی، لیکن میرے قدم تو آسمان پر بادلوں کے ساتھ ساتھ تھے۔ گھر کا سارا راستہ میں نے ہنستے، مسکراتے، راہ چلتے بچوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے، گنگناتے گزارا:

خوش آں زماں کہ نکویاں کنند غارت شہر

مرا تو گیری و گوئی کہ ایں اسیر منست

اگلے دن کی صبح ہوئی تو نشے کچھ اترے، فکریں دامن گیر ہوئیں۔ کس طرح جاؤں، کیا لے کے جاؤں، کوئی غزل، رباعی کہہ کر پیش کروں، کپڑے کیا پہنوں؟ سوچتے سوچتے سوجھی کہ حکیم میر قدرت اللہ قاسم سے پوچھوں۔ وہ میرے کرم فرما بھی ہیں اور صاحب تجربہ بھی۔ ان کی رائے صائب ہوگی۔ حکیم صاحب سے یک گونہ بے تکلفی بھی تھی کہ میں اور حکیم صاحب دونوں مرشدنا وسندنا حضرت مولانا فخر الدین صاحب قدس سرہ العزیز کے حلقہ بگوشوں میں تھے۔ علاوہ بریں، مولوی نور احمد اور حکیم ثناء اللہ فراق کی

بھی دوستی ہم دونوں میں قدر مشترک کا حکم رکھتی تھی۔ پھر خیال کو عمل میں لانے میں کیا دیر تھی۔ حکیم صاحب کا دولت کدہ میرے گھر کے پاس ہی چیلوں کے کوچے میں تھا۔ میں بات کی بات میں وہاں جا پہنچا۔

حکیم صاحب کی ایک بات تو دل خوش کن تھی اور ایک بات دل خراش۔ انھوں نے فرمایا:

''میاں مصحفی! وہاں جانا تو کچھ مشکل نہیں۔ میں خود تمھیں لے چلوں گا۔ لیکن عصمت جہاں کے یہاں تمھاری دال گلنی ممکن نہیں۔ وہ صرف دولت کی بندی ہے، اور دولت مندوں کو بھی وہ انگلیوں پر نچاتی ہے۔ یہ تو شاہدانِ بازاری کا شیوہ ہی ہے۔ لیکن اس کی نس نس میں بے وفائی اور بے مروتی بھری ہوئی ہے۔''

ان کی بات پر مجھے کچھ زیادہ یقین نہ آیا۔ ''کیوں آخر ایسی خاص وجہ کیا ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا ایک مختصر سا فسانہ ہے،'' حکیم صاحب بولے۔ ''مدرسۂ غازی الدین خان کے ایک نوجوان مولوی تھے، خیرالدین نام کے۔ نہ جانے کیوں اور کیسے عصمت جہاں ان پر مائل ہوگئیں۔ مولوی صاحب کا بھی میلان بہ ظاہر عصمت کی طرف تھا۔ لیکن کچھ ایسا الجھاؤ پڑا کہ ان کا نخلِ امید سرسبز نہ ہوسکا۔ تب سے عصمت جہاں نے جو رنگ بدلا تو قاتلۂ عاشقانِ جہاں بن بیٹھیں۔ اب وہ ہر دولت مند کو کچھ دن منھ لگاتی ہیں پھر دھتا بتا دیتی ہیں۔''

''اللہ اللہ۔ اور وہ مولوی بچارہ؟''

''بس وہ خانہ نشین ہوگیا، عصمت تخلص رکھ کر شعر کہتا ہے۔''

میرا دل بیٹھنے لگا۔ میرے پاس وفورِ شوق اور اٹھتی جوانی کے جوش سوا کیا تھا جو عصمت جہاں مجھ پر التفات کرتیں۔ صورت شکل میری ان دنوں بہت اچھی ضرور تھی، لیکن دلّی میں ان دنوں ارمن سے لے کر خطا و ختن تک کے گبھرو موجود تھے۔ خاص کر ان کرغیزیوں کا کیا کہنا تھا جو ابدالی کے ساتھ آئے اور یہیں رہ پڑے تھے۔ لمبے تڑنگے، ہاتھ پاؤں ایسے گویا شاہ بلوط کا ٹہنا۔ فولادی صندوق سا سینہ، بادام کی سی نوک دار اور عقاب کی سی، سوئی سے بھی زیادہ تیز بھوری آنکھیں۔ پھر دولت ان کے پاس فراواں۔ مجھے کون گھاس ڈالتا اور مجھے کون پوچھتا کہ بھیّا کیستی۔

''کہو کس سوچ میں پڑ گئے میاں صاحب؟'' حکیم صاحب نے میرے خیالات میں دخل اندازی کی۔ ''جو ہوگا، ہوگا۔ کل میں تمھیں اس کے یہاں لے چلوں گا۔ پھر دیکھیں گے۔''

اگلے دن میں اپنے حسابوں لباس فاخرہ پہن کر چلنے کو تیار ہوا۔ حکیم صاحب نے مجھے دو نیم اشرفیاں شاہ عالمی بہ طور قرض عطا کیں کہ وہاں پیش کر دیجو۔ ہم ہوا دار پر بیٹھے۔ حکیم صاحب تمام راستہ لوگوں کے سلام لیتے اور دوست آشناؤں کی مزاج پرسی کرتے چلے۔ عصمت جہاں کی حویلی پر اس وقت

بھی سواریوں کا ہجوم تھا۔ میرا دشمن جانی وہ شیدی حکیم صاحب کے لیے پشہ کاہ سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا۔ اس کا ہاتھ سلام کے لیے اٹھا کا اٹھا ہی رہ گیا اور ہم اندر تھے۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اندر زینے طے کر کے بالائی منزل پر ایک اور محافظ خانہ تھا۔ وہاں ترکنوں اور حبشنوں کی عمل داری تھی۔ انھوں نے بس اشارہ کیا کہ زینوں کے ادھر اُتر جائیے۔

ہم زینوں سے اترے تو ایک وسیع و عریض صحن سامنے تھا۔ ہرا بھرا سبزہ زار، نارنگی اور لیموں، فالسے اور کھرنی، کروندے اور آموں کے چھوٹے چھوٹے پیڑ۔ رات کی رانی اور چمپا اور چاندنی کی جھاڑیاں۔ بیچ صحن میں مہتابی، مہتابی کے چاروں طرف نہر بہتی ہوئی۔ نہر کے دو رویہ رنگین فوارے۔ کچھ درختوں پر باریک جالی مڑھی ہوئی، اتنی باریک کہ بہ یک نظر دکھائی نہ دے۔ ان جالی مڑھے پیڑوں میں بلا مبالغہ ہزاروں سرخ رنگ کے لاہوری لال، ہرے رنگ کے بھوپالی لال، صندلی رنگ کے بنگالی لال اس قدر انہماک سے چہچہاتے ہوئے کہ سارا آنگن گونج رہا تھا۔ اسی میں لقا اور نقاب پوش اور ریشم پرے کبوتروں کی غٹرغوں جو سارے آنگن میں آزاد گھومتے تھے۔ ایک ملازمہ پیچھے پیچھے ان کی بیٹ اور چونچ سے گرے ہوئے تنکے اٹھاتی ہوئی۔ صحن کے پرلی طرف پر سفید جھکا جھک کرتی ہوئی بارہ دری، بارہ دری کی چھت پر آنگن جس میں مور اور سنہرے رنگ کے لمبی دُم والے کچھ پرندے ٹہلتے ہوئے، جنھیں میں پہچان نہ سکا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چینی تیتر ہیں (وہ غالباً Chinese Golden Pheasant تھے، مرتب)۔

آنگن کے ایک کونے میں ایک مرصع پردہ پڑا ہوا دروازہ تھا، اس کے پیچھے کمرہ۔ میں ہونقوں کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ حکیم صاحب نے مجھے ہلکے سے اندرون کمرہ کے کوائف پر متوجہ کیا۔

کمرہ کیا تھا پورا دیوانِ عام تھا۔ بس فرق یہ کہ لوگ جگہ جگہ قالینوں پر کھڑے نہ تھے، بیٹھے تھے۔ حقے اور پان کا دور تھا۔ ایک طرف پیڑدے اور پیڑدائیاں سازوں کی درستی میں مصروف۔ صدر میں مسند خالی تھی، لیکن پیچھے ایک خادمہ زرنگار پنکھا لیے کھڑی تھی۔ سارے میں عطرِ حنا کی لطیف خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہوش بجا ہونے پر میں نے دیکھا کہ چھت کے چاروں کونوں پر جو فانوس تھے ان میں مہین مہین سوراخ تھے اور اوپر کہیں سے کسی آلے کے ذریعہ ان سوراخوں سے پانی اور عطرِ حنا کے لطیف آمیزے کی پھوار وقفے وقفے سے برسائی جاتی تھی۔ میرا تو وہ حال تھا جو الف لیلہ میں ابوالحسن کا نہ ہوا ہوگا۔ اس پر یہ مایوسی اور یہ غم کہ ایسے آستانے پر تو مجھے جبہ سائی بھی نصیب نہ ہوگی، تا بہ وصل و وصال چہ رسد۔

میں اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ کمرے کے جس سرے پر مسند تھی اور جہاں خادمہ مروحہ جنباں تھی، اس کا پردہ ہٹا اور عصمت جہاں اندر داخل ہوئیں۔ سب کو چھوڑ کر ان کی نگاہ حکیم صاحب ہی پر پڑی۔ وہ ایک دو قدم ان کی طرف استقبال کو بڑھیں اور بولیں:

"تسلیمات عرض کرتی ہوں۔ اللہ حکیم صاحب آپ نے ہمیں بالکل ہی بھلا دیا۔"

''ایسا تو نہیں عصمت بیگم، لیکن دنیا ہے، کام لگے ہی رہتے ہیں۔ ورنہ تم سے ملنے کو کس کا جی نہ چاہے گا۔''

حکیم صاحب آگے بڑھتے بڑھتے بالکل ان کے ہم بغل کھڑے ہوگئے تھے اور میں بھی ان کے دامن سے لگا کچھ دبکا سا کھڑا تھا۔ مجھے انھوں نے دیکھا، لیکن معرفی چاہنے کی کوئی بات نہ کی۔ میں تو ان کی آواز میں گم تھا، گویا کسی اونچی جگہ ہوا میں ہچکولے کھا رہا ہوں۔ ایسی سدھی ہوئی، تھکی ہوئی لیکن سریلی آواز کیا کسی شاما کی ہوگی۔ سب زیر و بم بے حد سنبھل کر ادا ہو رہے تھے، لہجے میں خفیف سی خیر مقدمی مسکراہٹ لہریں لے رہی تھی، لیکن اس میں بے تکلفی کی دعوت نہ تھی۔ ہر چیز ایک فاصلے سے تھی۔

''اور یہ میرے دوست شیخ غلام ہمدانی ہیں۔ امروہے سے آئے ہیں، اچھے شاعر ہیں۔ مصحفی تخلص کرتے ہیں۔ تمھارے در دولت تک رسائی کے مشتاق تھے۔''

''بہت خوب۔'' اب ان کے لہجے میں گرم جوشی کا نام نہ تھا۔ انھوں نے مجھے نظر بھر کر دیکھا نہ اس بات کی ہوا لگنے دی کہ کل ہی کی بات ہے، انھوں نے مجھے حاضری کا حکم دیا تھا۔ میں نے جھک کر سلام کیا تو انھوں نے ''آداب گزارش کرتی ہوں، تشریف رکھیے'' کہا۔ اس اثنا میں خادمہ پان پھول الائچی کی کشتی لے کر آگے آگئی تھی۔ میں نے ایک گلوری اٹھائی اور دونوں نیم اشرفیاں آہستہ سے کشتی میں دھر دیں۔ حکیم صاحب نے بھی کچھ ہدیہ پیش کیا، لیکن میں اسے دیکھ نہ سکا۔

سب لوگوں کو سلام کر کے اور ان کے سلام لے کر عصمت جہاں مسند پر آئیں۔ جب تانپورا سدھ گیا تو انھوں نے خسرو کی غزل سے محفل کا آغاز کیا:

مسلماناں برفت از دست من دل
چو دیدم آنچناں شکل و شمائل
زہے صانع خدا کز لطف بنگاشت
ازینساں صورتے از آب و از گل
نہ باشد چوں جمالت مجلس افروز
اگر خورشید بنشیند بہ محفل

اب میری حماقت مآبی دیکھیے کہ میں سمجھا یہ غزل خاص کر کے میرے لیے گائی جا رہی ہے۔ آواز اور فن دونوں عروج پر تھے ہی، حق یہ ہے کہ غزل سرائی داد سے مستغنی تھی۔ لیکن میں ان اشعار کا مخاطب خود کو سمجھ کر خوش ہو رہا تھا اور مسکرا مسکرا کر عصمت جہاں کو داد دے رہا تھا۔

محفل ختم ہوئی اور سب چلنے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیوان خانہ خالی ہونے لگا۔ میں اور حکیم صاحب بھی اُٹھے، لیکن میرا جی نہ چاہتا تھا کہ وہاں سے جاؤں۔ کیا خبر انھیں مجھ سے کوئی بات کہنی ہو یا مجھے روک کر کچھ مزے مزے کی باتیں کریں۔ زیادہ تر لوگ اپنی اپنی جوتیاں خادماؤں کے ہاتھ سے پہن

کر باہر جا چکے تھے، باقی دروازے کی طرف رواں تھے۔ حکیم صاحب میری وجہ سے با دلِ ناخواستہ ٹھہرے رہے، لیکن کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہے تھے، گویا اشارہ کر رہے ہوں کہ اب چلو۔

جب عصمت جہاں نے انھیں دوبارہ تسلیمات کہی تو حکیم صاحب سے نہ رہا گیا، میری کہنی پر سختی سے ہاتھ رکھ کر انھوں نے مجھے گویا باہر کی طرف دھکیلا۔ عصمت جہاں اندر جانے کے لیے مڑیں، اور اسی وقت ایک سوداگر بچہ جو سر سے پاؤں تک الماس و مروارید میں غرق تھا، اور جس کی شخصیت سے دولت کی سخت مہک آ رہی تھی، ان کے ساتھ ساتھ پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوگیا۔ یہ بات ظاہر تھی کہ انھیں کے یہاں شب باش ہوگا۔

مجھ پر ایک طرف تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا اور دوسری طرف ایسی آگ لگی کہ محسوس ہوا میرے کپڑے سب ابھی اسی وقت جل اٹھیں گے۔ توبہ یہ بے حیائی اور یہ بے مروتی۔ کاش کہ زمین پھٹ جاتی اور میں یہیں اس میں سما جاتا۔ لیکن دیوان خانے میں اب صرف نوکر رہ گئے تھے۔ میں بھی ہڑبڑا کر حکیم صاحب کے ساتھ باہر نکلا۔ راستے بھر وہ اپنے خیالات میں گم رہے اور میں اندر ہی اندر جوش کھاتا رہا:

جاں بر ہو کس طرح تب سودائے مصحفی
ہانڈی سا کھد بدائے ہے کچھ اس جواں کا مغز

والا حال تھا۔ حکیم صاحب کو میرے حال کی کچھ خبر ہوگئی ہوگی، کہ مجھے گھر پہنچا کر ہوادار میں بیٹھتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

''میاں مصحفی! راجا چندر بھان برہمن کے ایک شعر کا لطف اٹھاؤ، کہتا ہے:

متاعِ حسن ترا طرفہ روز بازار است
کہ کس نہ یافتہ و عالمے خریدار است

اچھا خدا حافظ، پرسوں مشاعرے میں تو آؤ گے؟''

میں نے بجھی ہوئی آواز میں ''جی ہاں'' کہا اور سلام کر کے اپنے حجرے کے اندر ہوگیا۔

حکیم صاحب کی نصیحت کیا خوب نصیحت تھی، لیکن ہائے میرزا جلال اسیر کس مقام سے کہتا ہے:

دل را چگونہ منع محبت کند کسے
گیرم کہ بشنود چہ نصیحت کند کسے

ان دنوں دل پر جو گزرتی تھی اسے میں نے ان شعروں میں ادا کیا تھا:

جو پری بھی رُو بہ رُو ہو تو پری کو میں نہ دیکھوں
مری آنکھیں بند کر دو کہ کسی کو میں نہ دیکھوں

دل گرم خونِ الفت مرے بر میں رکھ دیا ہے
سوے گل تو ملتفت ہوں جو گلی کو میں نہ دیکھوں
مرا دل لگا ہے جس میں مرا جی گیا ہے جس پر
مری کیوں کہ زندگی ہو جو اسی کو میں نہ دیکھوں
مری تجھ سے زندگی ہے تو مرا جگر ہے جی ہے
کسے دیکھ کر جیوں پھر جو تجھی کو میں نہ دیکھوں

میں نے تواتر سے وہاں جانا شروع کیا۔ اکثر تو باریابی ہی نہ ہوتی، اور جو ہوتی بھی تو محفل عام میں، اور محفل کے انجام پر وہی منظر سوئی کی طرح آنکھ میں چبھتا کہ کبھی کوئی امیر زادہ، کبھی کوئی سوداگر بچہ، کبھی کوئی مراٹھا سردار، انھیں لے کر اندرون حویلی چلا جاتا۔ میں اپنی قلیل حیثیت کے مطابق تحفے تحائف بھی لے جاتا، لیکن ان کی نگاہ نہ مجھ پر کبھی ٹھہری نہ میرے حقیر تحائف پر۔ بہت ہوا تو کبھی کسی موقعے کے حسب حال فی البدیہہ شعر سنانے کا حکم ہوتا، اور وہ میرے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن کبھی شعروں کی داد بھی ٹھیک سے نہ ملی۔ ہر بار اگر نہیں تو ہر تیسرے چوتھے بے حیائی کے یہ کھیل دیکھ کر ضرور قصد کرتا کہ اب نہ جاؤں گا۔ لیکن توبہ کیجیے کیسا ارادہ اور کہاں کی نیت، ہوتا وہی کہ جہاں ذرا سا موقع لگتا، میرے قدم بس اُدھر ہی کو اٹھتے:

قول آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اس گلی
ہو کر کے بے قرار دیکھو آج پھر گیا

دو ڈھائی سال یہی لیل و نہار رہے۔ اس پوری مدت میں صرف ایک بار بوس و کنار کی لذت ملی اور وہ بھی یوں کہ بارہ دری کی سیڑھیاں اترنے میں خوش نصیبی سے میرا ان کا دو لمحے کے لیے تنہائی میں ساتھ ہو گیا تھا اور انھوں نے مجھے کچھ اس انداز سے دیکھا تھا گویا ان کا بھی جی چاہ گیا ہو۔ اس تنگ مدت میں بھلا جی کے ارمان کیا نکلتا، ذرا سی دست درازی کی ہمت کی تھی کہ سختی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا گیا۔

لیکن آہ اس ذرا سے اختلاط کی لذت میرے دل نے ہزاروں بار تو اٹھائی ہوگی۔ دن رات اٹھتے بیٹھتے اسی لمحے کو بار بار دل میں دہراتا، طرح طرح سے حافظے میں تازہ کرتا۔ میں ان چند لمحوں کو توڑ کر اور بھی مختصر پلوں میں بانٹتا اور ہر پل کا الگ لطف لیتا۔ وہ ان لبوں کی نرم تازگی، اس بیاض گردن کی ٹھنڈی لطافت، میرے ہاتھ کے نیچے اس شانے کی لطیف گرمی، اس نرم لیکن سخت گات کی میری چھاتی پر چبھن، وہ میرے منھ کے نیچے ان کے ذرا سے وا ہوتے ہوئے ہونٹوں اور زبان کی تری کا شیریں فردوسی ذائقہ، وہ میرا ہاتھ ان کی چوٹی کو چھو کر نیچے کچھ تلاش کرتا ہوا اور اس کا جھٹک دیا جانا، وہ پہلی بار نزدیکی کی گرمی اور لمس کی تھرتھری۔ میں نے اس ساری واردات کو، جو چار سیڑھیاں اترتے تمام ہو گئی تھی، دل میں

اتنی بار دوہرایا تھا کہ اس کی مدت وصل کی طویل ترین رات سے بھی طویل ہوگئی۔ اور اس پر امید کی افزائش کا لطف کہ اب تو راہ کھل گئی ہے، اب اس پر جہاں تک سفر ہو سکے گا، اپنی ہمت پر منحصر ہے۔ اس کی منزل آخر تو جنت کی بارہ دری ہی ہوگی۔

میں سب ضروری کام چھوڑ کر اگلے ہی دن وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ راجا جگل کشور کے صاحب زادے کنور مہندر کشور انھیں ابھی ابھی اپنے ساتھ لوا لے گئے۔

''کہاں، اور کیوں؟''

''کیوں سے تمھیں کیا مطلب ہے شیخ جی؟'' ان کا شیدی دربان منھ بگاڑ کر بولا۔ ''رہا سوال کہاں کا، تو قطب صاحب کے آگے کوئی جگہ ہے سلطان پور، وہاں کی جھیل میں بجرے کی سیر اور مرغابی کے شکار کی ٹھنی ہے۔''

''اور واپسی کب ہوگی؟''

''یہی کوئی پانچ سات دن لگ جاویں گے۔ امیروں کی باتیں امیروں ہی کو سہاویں۔ تم کاہے کو کرید میں پڑے ہو۔ چلو لمبے پڑو، اپنا راستہ ناپو۔''

میرے دل میں کس قدر غصہ تھا، کیا بتاؤں۔ بس یوں کہیں کہ پچھلے تمام ماہ و سال ان کے فسق و فجور اور بے شرمیوں کے تمام مناظر کی میزان کا حساب کر کر بھی اتنا غصہ نہ آتا جتنا اس وقت آیا۔ کمال بے غیرتی ہے کہ مجھ سے بوس و کنار کے بعد کسی کھتری بچے کو نوازنا پسند کیا۔ میں جلا بھنا اور تقریباً نم دیدہ گھر لوٹا۔ راستے ہی میں یہ رُباعی ہوگئی:

ہے حیف تو یہ کہ با جمال چوں حور
عصمت اور ہووے مائل فسق و فجور
یہ وہ ہے مثل کہ مصحفی کہتے ہیں
بر عکس نہند نام زنگی کافور

گھر پہنچا تو حکیم ثناء اللہ خان فراق سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیے کہ میری ملاقات کو آئے تھے۔ عصمت جہاں پر میری فریفتگی کی بات کوئی ڈھکی چھپی نہ تھی، میں نے چھوٹتے ہی اپنی رباعی پڑھ دی۔ اب وہ بچارے گویم مشکل وگرنگویم مشکل میں پڑے کہ ایسی رباعی کی داد کیا دیں۔ پھر بھی، چوتھا مصرع اس برجستگی سے چسپاں ہوا تھا کہ انھیں داد دیے ہی بنی۔ میں نے غصے کی جھونجھل میں یہ بھی نہ خیال کیا کہ اس رباعی کو نشر کر کے میں اپنے لیے گڈھا کھود رہا ہوں۔ اور حماقت بالائے حماقت یہ کہ اگلے دو چار دن میں جو بھی دوست مجھے ملا، میں نے اسے یہ رباعی سنائے بغیر نہ چھوڑا۔

ناعاقبت اندیشی اسے کہتے ہیں کہ میں یہ بھی فراموش کر گیا کہ اسی دہلی میں مجھ جیسے کتنے ہی اور تھے جو میری ہی طرح ناکامی کے باعث عصمت پر زہر کھائے ہوئے تھے۔ ان کی زبانی یہ میری رباعی

خوب مشتہر ہوئی۔

کئی دن کے انتظار اور خبر گیری کے بعد مجھے ان کی مراجعت کی خبر ملی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، وقتِ مقرر پر ان کی حویلی پر جا پہنچا۔ اس دن محفل کچھ زیادہ ہی آراستہ تھی۔ شاید اسی لیے عصمت جہاں بھی وقت سے ذرا پہلے جلوہ افروز ہوئیں۔ کہاں تو ان کی آنکھ ہی مجھ پر نہ پڑتی تھی، کہاں اب مجھے دیکھا تو فوراً بولیں:

''آئیے جناب شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی،'' انھوں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا کہ اس توجہ خاص کی تہ میں دال میں صاف کچھ کالا نظر آرہا تھا۔ ''فرمایئے، آج کل شعر گوئی تو خوب چمکی ہوئی ہے؟''

میں سر جھکائے اپنے پاؤں کے انگوٹھوں پر غور کر رہا تھا کہ وہ کس قدر بے ڈول لگ رہے تھے۔ سر جھکائے ہی جھکائے میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا، ''جی، سب کرم ہے آپ کا۔'' اب مجھے پورا پورا شک ہوگیا تھا کہ اس پُرسش کا مدعا کیا ہے، لیکن نہ جائے رفتن تھی نہ پائے ماندن۔ دل ہی دل میں اپنی حماقت اور عجولی کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔

''اور یہ رباعی جناب ہی کے کلامِ معجز نظام کا نمونہ ہے؟''

اب مجبوراً میں نے سر اٹھایا تو ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ دیکھا۔ رباعی کا کلمہ سنتے ہی میرا تو سارا لہو خشک ہوگیا تھا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا، آہستہ سے بولا، ''جی، میں سمجھا نہیں۔'' اب تک تو محفل کا ہر فرد بشر، کیا سازندے کیا تماش بین، کیا خادمائیں، حتیٰ کہ ان کی حبشی بلی بھی، مجھی پر متوجہ ہو چکے تھے۔ سب کی آنکھیں گویا مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔

''جی، یہ برعکس نہند نام زنگی کافور جناب کی ہی تصنیفِ لطیف ہے؟''

میں چپ رہا۔ اچانک انھوں نے ایک عجب ادائے قاتلانہ سے اس کاغذ کو پارہ پارہ کیا، پھر ان بے چارہ پرچہ ہائے بے قیمت کو پاؤں تلے رگڑتی ہوئی بولیں:

''اب آپ وہیں تشریف لے جائیں جہاں سے سر کے بل رینگ کر نکلے تھے۔ اب میں پھر آپ کو یہاں نہ دیکھوں۔''

میری دنیا اندھیری تو ہو ہی گئی تھی، لیکن اس وقت اس سے بھی زیادہ غم اس بے توقیری اور بے آبروئی کا تھا جو وہاں میرا مقدر بنی تھی۔ اور پھر یہ کہ یہ معاملہ تدارک پذیر بھی نہ تھا۔ میں کہتا تو کیا کہتا، ایک لمحہ یوں کھڑا رہا گویا میرے پاؤں میں جڑیں نکل آئی ہوں۔ اچانک میرے پیچھے کوئی کھانسا، بلکہ لگا کہ کھانسی کو ضبط کرنے کے لیے کسی نے دوپٹہ منھ میں ٹھونس لیا ہو۔ مجھے مڑ کر دیکھنے کا یارا نہ تھا، لیکن یہ بات صاف تھی کہ وہ کھانسی نہیں، ہنسی تھی جسے کوئی روکنے کی سعی کر رہا تھا۔

میں اس اندھے کی طرح مڑا جس کے ہاتھ کی لکڑی چھن گئی ہو۔ خدا کا شکر ہے دروازے

تک بخیریت پہنچ گیا، کسی سے ٹکرایا نہیں۔ باہر نکلا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے میری آستین کھینچی۔ میں چونک کر مڑا تو وہی بھونرا سی سیاہ آنکھوں والی خادمہ تھی۔

''بی بی جی نے فرمایا ہے کہ گلی کے دونوں سروں پر شیدی اور تلنگے آپ کو دیکھتے رہیں گے۔''

اس کا لہجہ میں نہ پڑھ سکا کہ تاسف کا تھا یا ترحم کا۔ لیکن پیغام بالکل صاف تھا، حویلی تو کیا، گلی بھی میرے لیے ارض ممنوع تھی۔ میں نے کچھ نہ کہا۔ اب کہنے کو رہا ہی کیا تھا۔

اس کے بعد میں کئی سال دلّی میں رہا لیکن عصمت جہاں کے دیدار سے آنکھیں پھر نہ روشن ہوئیں۔ اس واقعۂ فاجعہ کے کچھ دن بعد تک میں نے مختلف ذرائع سے معافی نامے بھجوائے۔ کوئی جواب نہ ملا، گویا میرا وجود ان کی دیوار پر کوئی دھبا تھا جسے انھوں نے کھرچوا کر صاف کر دیا تھا۔ عصمت بہر حال میرے دل پر نقش کالحجر کی طرح تھیں۔ دن تو جوں توں گزر جاتا لیکن رات کو جتنی بار آنکھ کھلتی، اور آنکھ بارہا کھلتی، تو زبان پر عصمت کا ہی نام ہوتا۔ دن میں بھی ان کی یاد آنے اور میرے دل کا پیمانہ بھر آنے کے بہانے ہر دم ہی مہیا رہتے۔ مجھے اپنے تئیں بڑے زعم تھے۔ میرا کہنا تھا کہ بھلا ایسا کون سا غم ہوگا جو وقت کے بہاؤ کو دریائے خوں بنا ڈالے۔ مرد سب کچھ سہ جاتے ہیں۔ لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ عشق جب گُل کھلاتا ہے تو چاروں کھونٹ آگ ہی لگتی ہے۔ مرزا رفیع نے کیا خوب کہا ہے:

داغ مت کھائیو تمیں عشق کا ہم کہتے تھے
کیوں دلا کی ہے نہ اس گُل نے بہار آخرکار

لیکن یہ بھی کب تک چلتا؟ رونے کی عادت پڑ جائے تو رونا گانا سب ایک ہو جاتے ہیں۔ یہی عشق کا سچ بھی ہے اور یہی عشق خود بہت بڑا جھوٹ بھی ہے۔ جب دل ہی پس جائے تو کچھ باقی نہیں رہتا:

دیا فشار مرے دل کو عشق نے یاں تک
کہ اس میں خون تو کیا رنگِ آرزو نہ رہا

(۱۱)

''آپ نے سیّد انشا اور حضرت شیخ کے اختلافات کا کچھ ذکر نہ کیا،'' میں نے ایک دن باتوں باتوں میں پوچھا۔

''میں کیا ذکر کرتی، ان دنوں میں ان کے ساتھ نہ تھی۔ جو کچھ ہوا وہ باتیں شیخ صاحب کے مزاج کے بہت خلاف تھیں۔ اور میرا خیال ہے سیّد انشا بھی انھیں اپنے لیے کچھ بہت موجب مباہات نہ جانتے تھے۔''

''لیکن دونوں میں باقاعدہ میل تو نہ ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، میل نہ ہوا تو دشمنی بھی نہ رہی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں حضور وزیر الممالک آصف الدولہ

حکّام مقام نے شیخ صاحب کی فریاد پر ان کی داد رسی کی اور انشا صاحب کو شہر بدر کردیا تھا۔ وہ تو اس واقعے پر کچھ ہی زمانہ گزرا تھا تھا کہ حضور وزیرالممالک کو مولا نے اٹھا لیا۔ انشا صاحب پھر بھی خوشی لکھنؤ آکر رہ بس گئے۔''

''ملاقاتیں تو ہوتی ہوں ہی گی؟ ساتھ ساتھ مشاعرے بھی پڑھتے ہوں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری دانست میں تو کبھی کوئی خاص موقع ملاقات یا ساتھ رہنے کا نہ آیا۔ ہاں انشا صاحب اور مرزا قتیل صاحب کی یاد میں شیخ صاحب نے ایک مقطع ضرور کہا تھا:

مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں
یاد ہے مرگ قتیل و مردن انشا مجھے''

''حضرت شیخ اور سید انشا صاحب میں بنائے مخاصمت کیا ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔ ''آپ تو کہتی ہیں حضرت شیخ کی ذات ایسی من موہنی تھی کہ وہ ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے؟''

وہ کچھ شرما کر مسکرائیں۔ ''ہر ایک تو میں نہیں کہتی، لیکن معشوقوں پر ضرور ان کا نقش بہت جلد چڑھتا تھا۔''

میں ان کی شرماہٹ کا لحاظ کر کے ایک لحظہ چپ رہا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بات کا سلسلہ کس طرح جاری رکھوں کہ زمین پر نگاہ جمائے جمائے وہ خود ہی بولیں۔ ''مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوا کہ شیخ صاحب کے دل میں مرزا قتیل کے لیے زیادہ جگہ ہے، سید انشا صاحب کے لیے کم۔ اور یہ بات تو ہے ہی کہ شیخ صاحب سارے لکھنؤ میں مرزا قتیل کے سوا کسی کو اپنا حریف نہ گردانتے تھے۔ ان کا شعر ہے:

اور تو ثانی کوئی اس کا نہیں
مصحفی کا ہے قتیل البتہ چوٹ

کہنے کو تو انشا صاحب اور قتیل صاحب میں بھی بہت خلا ملا تھا، لیکن وہ قتیل کو خود سے کم تر سمجھتے تھے۔ ممکن ہے انھیں یہ بات بُری لگی ہو کہ شیخ صاحب ان کے مقابلے میں قتیل کو ترجیح دیتے ہیں۔ ویسے، میں نے ظفر الدولہ بہادر کے یہاں کسی کو کہتے سنا تھا کہ سید انشا میں ہزار خوبیاں ہیں، لاکھ لیاقتیں ہیں، لیکن وہ چاہتے ہیں کہ ہر شخص ہر وقت ان کے گن گاتا پھرے۔'' وہ مسکرائیں۔ ''انھیں کا تو مصرع ہے، میری طرف تو دیکھیے میں نازنیں سہی۔''

''گویا سید مبرور کے دل میں کہیں چور تھا،'' میں نے کہا۔

''چور تو میں کیسے کہوں، لیکن ہو سکتا ہے ان کا مزاج ایسا رہا ہو کہ وہ لوگوں کو بہت جلد اپنا مخالف سمجھ لیتے ہوں۔ مجھے تفصیل تو نہیں معلوم، لیکن شاید دلی میں بھی انشا صاحب کے ساتھ ایسا کچھ معاملہ گزرا تھا۔''

''جی ہاں، ایسا کچھ ہوا تو تھا۔ لیکن مرزا صاحب مغفور اور حضرت شیخ کی دوستی زیادہ گہری

"شاید مزاجوں کی موافقت کی بنا پر بھی تھی۔" میں نے کہا۔ "اور یوں بھی ہے کہ جب حضرت شیخ دوسری بار لکھنؤ تشریف لائے اور دوبارہ بد دل ہو کر یہاں سے جانے لگے تو مرزا قتیل نے حضرت شیخ کی ہر طرح امداد اور دل جوئی کی اور انھیں لکھنؤ چھوڑنے سے روکا۔"

"جی، درست ہے۔ باہم دگر ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک قصیدے کے عنوان میں شیخ صاحب نے مرزا صاحب کو اپنا معشوق کہا ہے۔" وہ بولیں، "لیکن یہ بھی حق کی بات ہے کہ آپ کے والد صاحب نے بھی ان دنوں شیخ صاحب کی بہت خدمت کی۔ سعادت مند شاگرد ہو تو کانجی مل صبا اور رائے ٹیکا رام تسلی جیسا ہو۔"

"حضرت شیخ نے بھی تو رائے ٹیکا رام کی مدح میں قصیدہ لکھ کر اور میرے والد مرحوم کا محبت آمیز احوال اپنے تذکرے میں درج کر کے انھیں ثبات و دوام بخش دیا۔"

"لال میاں! یہ آپ کی سعادت مندی ہے۔ کیوں نہ ہو، آخر کس باپ کے بیٹے ہیں۔"

"آپ مجھے شرمندہ فرماتی ہیں۔" اب میرے سر جھکانے اور شرمندہ ہونے کی باری تھی۔ "میں نے آپ کی جو کچھ شمہ برابر خدمت کی وہ اس فیض کا عشرِ عشیر بھی نہیں جو مجھے آپ کی ملازمت سے حاصل ہوتا رہتا ہے۔"

وہ سر جھکا کر چپ ہو گئیں۔ میری بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب اصل موضوعِ سخن پر کس طرح مراجع ہوں کہ راجا میاں بول اُٹھے، "میاں صاحب، پان دوبارہ حاضر کروں؟"

مجھے سلسلۂ گفتگو دوبارہ قائم کرنے کا یہ اچھا موقع ملا۔ میں نے کہا، "پان تو نہیں، لیکن پانی پلوا دو تو لطف رہے۔ پر بیٹا ذرا ٹھنڈا پانی ہو۔"

"ابھی لیجیے جناب،" کہہ کر وہ پلک جھپکتے جالی سے ڈھکے ہوئے تھالی جوڑ گلاس میں پانی لے آیا۔ پانی پیتے پیتے میں نے استانی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا، "آپ کو حضرت شیخ کا وہ شعر یاد ہوگا، پانی کی مناسبت سے مجھے ابھی یاد آیا، وہی اختلافاتِ دین و ملت کے مضمون والا، شاید آخری کسی دیوان میں ہے۔"

واللہ حضرت استاد کے شعر انھیں خوب ہی یاد تھے۔ میرا جملہ ختم نہ ہوا تھا کہ وہ معاً بول اٹھیں، "جی، ساتویں دیوان میں فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو:

اختلافاتِ مذاہب نے صفا سب کھو دی
گر چہ صد ظرف میں تھا بر لبِ جو پانی ایک

"سبحان اللہ،" بے ساختہ میرے منھ سے نکلا، "آپ حضرت شیخ ہی کی نہیں ان کے کلام کی بھی عاشق تھیں۔"

ان کا منھ کان کی لوؤوں تک سرخ ہو گیا۔ اس وقت ان کی صورت اتنی بھلی لگ رہی تھی کہ کیا

بتاؤں۔ لیکن مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ میں حد سے بڑھ گیا ہوں۔ میں نے فوراً بات کا رخ بدل دیا، ''تو آپ کی رائے میں حضرت شیخ کی طبیعت میں کینہ اور کھوٹ بالکل نہ تھا اور وہ کسی سے خفا بھی ہوتے تو محض وقتی طور پر خفا ہوتے تھے۔''

''میرا ان کا ساتھ جتنا رہا اس کی بنا پر تو میں یہی کہتی ہوں۔'' انھوں نے ذرا رک کر جواب دیا۔

''لیکن حق یہ ہے کہ وہ شروع ہی سے بالکل صاف باطن تھے۔ شعر کہنے اور شعر پڑھنے کے سوا انھیں معاملات دنیا سے کوئی غرض نہ تھی۔ جناب امیر المومنین کی خدمت میں ان کا جوانی کا قصیدہ ہے، اس میں فرماتے ہیں:

میں مدح کروں اپنی تو کچھ غم نہیں اس کا
پر مجھ سے کبھی ہجو نہ کہوائے طبیعت
کس واسطے یہ شیوہ ہے مذموم اکابر
ہوتا ہے سخن موجب ایذائے طبیعت

''گستاخی معاف، کبھی آپ پر تو خفا ہوئے ہوں گے؟'' میں نے ہمت کر کے کہا۔

''سچ بات یہ ہے کہ شاذ ہی ایسا ہوا۔ لحظہ دو لحظہ کی خفگی کی بات اور ہے، لیکن ایک بار وہ مجھ سے دو تین پہر خفا رہے تھے۔'' وہ ذرا سا مسکرائیں، لیکن اس بار تبسم کچھ مجحوب سا تھا۔

''ارے واللہ!'' میں نے ذرا اشتیاق سے کہا۔ ''بھلا کب اور کیوں...؟''

انھوں نے میری بات پوری ہونے نہ دی۔ ''کبھی اور وہ قصہ سناؤں گی۔ اس وقت مگر یہ بتا ہی دوں کہ ایک ذات ایسی تھی جس سے انھیں دائمی پرخاش رہی۔''

''اے لیجیے،'' میں پھر ذرا بے تکلف ہو کر بولا، ''کون تھے وہ ذات شریف۔ اور اب تک ان کا ذکر آپ چھپائے کیوں رہیں؟''

وہ پھر ہنسیں، لیکن اس بار اس میں ایک لطیف سی شوخی تھی۔ ''کوئی ذات شریف نہیں، صرف ایک ذات تھی، فرنگیوں کی ذات۔ میری دانست میں تو انھیں تا زندگی فرنگیوں سے نفرت رہی۔''

''اچھا، کیوں؟ کیا اس کے پیچھے کوئی خاص بات تھی؟ ان کے زمانے کے لوگ تو فرنگیوں سے کچھ زیادہ سروکار رکھتے نہ تھے؟''

''نہیں، سروکار تو ان لوگوں کا کچھ نہ تھا۔'' ان کے ماتھے پر ہلکی سی شکن آئی۔ ''اور اگر خاص بات سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ کیا وہ کبھی کسی موئی لچی افرنگن یا لال کرتی والی پر مائل ہوئے اور مطلب برآری میں ناکام ہوئے، تو ایسی بھی کوئی بات میرے علم میں نہیں۔''

''معافی کا خواستگار ہوں،'' میں نے گڑبڑا کر کہا۔ ''حاشا یہ میرا مطلب نہ تھا۔ میں تو یہ کہہ

رہا تھا کہ شاید کبھی کسی فرنگی شاگرد سے انھیں تکلیف پہنچی ہو...''

''فرنگیوں سے وہ دور دور ہی رہتے تھے۔'' انھوں نے گویا میری بات سنی ہی نہیں۔ ''اور فرنگیوں کی صورت انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ ان کی صورت کو بے نمک اور پھیکی قرار دیتے تھے۔ ان کا شعر ہے:

مجھ کو اتنا بے نمک بھی حسن بھاتا ہی نہیں
کیا کہوں پھیکا ہے کیسا قومِ عیسائی کا رنگ''

مجھے بھی اچانک ایک شعر یاد آ گیا، ان کی بات کو کم و بیش کاٹتے ہوئے میں بول اٹھا، کہ کہیں شعر نہ بھول جاؤں یا وہ بات بھول جاؤں جسے پوچھنا مقصود تھا۔ ''واہ، سبحان اللہ، خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے حضرت استاد کے ایک شعر کے بارے میں میری ایک مشکل تو چٹکی بجاتے حل کر دی۔''

''جی میں کچھ نہیں۔''

''جی، شعر ملاحظہ ہو:

ہے یہ فلکِ سفلہ وہ پھیکا سا فرنگی
رکھتا ہے مہ و خور سے جو پاس اپنے دو بسکٹ

'پھیکا سا فرنگی' تو آپ کے اقبال سے اب سمجھ میں آ گیا، لیکن یہ 'دو بسکٹ' کیا شے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ عجب انداز سے ہنسیں، جیسے کوئی بڑی بہن چہیتے چھوٹے بھائی کے بھولے پن پر ہنسے یا جیسے کوئی مہربان خاتون ...لاحول ولاقوۃ میرا ذہن کدھر بہک گیا۔ انھوں نے فرمایا:

''صاحب کو کیا فرنگی کھانوں کا کچھ ذوق نہیں رہا؟''

''جی نہیں، فرنگی کھانے کہاں اور ہم کہاں۔ اور ہاں میرے ایک انگریزی داں دوست کے پاس شیکسپیئر صاحب کا لغت بھی ہے جس میں لغاتِ ریختہ کے معنی بزبان انگلیسی درج ہیں۔ اس میں بھی لفظ نہ ملا۔''

''ارے میاں، انھیں انگریزی ٹکیاں سمجھیے، کچھ نمکین ہوتی ہیں تو بعض میٹھی۔ فرنگیوں کے کارخانوں میں ہزاروں کی تعداد میں بنتی ہیں اور لوہے کے ڈبوں میں بھر کر صاحبانِ انگلستان کے کھانے کے لیے ولایت سے آتی ہیں۔ ان میں نہ گھی نہ زیرہ نہ سونف نہ میدہ نہ زعفران۔ ہاں ایک لطیف سی بھینی بھینی خوش بو ضرور ہوتی ہے جو کسی ولایتی پھول سے بنتی ہے۔ زیادہ ٹھہرتی نہیں، بہت جلد خراب ہو جاتی ہیں۔ کھانے میں یہ ٹکیاں کرکری اور بھربھری ہوتی ہیں۔ کھایئے تو کٹ کٹ کی آواز نکلتی ہے، شاید اسی لیے انھیں بسکٹ کہا جاتا ہے۔''

''تو کیا آپ کو یا حضرت شیخ کو ان کا ذوق تھا؟''

''اللہ، توبہ کیجیے صاحب۔ وہ تو یوں ہوا کہ اعلیٰ حضرت شاہ زمن (غازی الدین حیدر، مرتب) کے کچھ انگریز مصاحبوں نے انگریزی کھانوں کی ایک دوکان دل کشا میں کھولی تو وہاں یہ ٹکیاں بھی دستیاب تھیں۔ ایک دن شیخ صاحب ایک ڈبہ میرے لیے بھی لائے تھے۔ جیسے صاحبانِ ولایت بے رنگ ویسے ہی ان کے کھانے بھی بے رنگ۔ شہر میں ٹکیں تو نہ چلیں، ہاں یہ لفظ چل گئی۔''

''اچھا حضرت شیخ کی طبیعت انگریزوں سے شاید اس لیے بھی ابا کرتی ہوگی کہ وہ علاقۂ روہیل کھنڈ کے تھے،'' میں نے کچھ سوچ کر کہا، ''اور اس علاقے کے رؤسا اور رعایا دونوں کو فرنگی تدبیروں کے چلتے انھوں نے کٹتے مرتے بہت دیکھا تھا۔''

''ہاں یہ ممکن تو ہے،'' انھوں نے 'ہاں' کو ذرا کھینچ کر ادا کیا۔ ''انھیں یہ خیال تو خیر تھا ہی کہ یہاں کی دولت، اور خاص کر اہلِ حرفہ کی حرفت و صنعت، سب انگریزوں کے کٹے چڑھ رہی ہے یا ان کی تدبیریں ایسی ہیں کہ ملکِ ہندسارے کا سارا ان کے جال میں پھنس رہا ہے۔ ان کے شعر ہیں:

افسوس کہ لی چھین نصاریٰ کے سگوں نے
یوں ہاتھ سے اس فرقۂ اسلام کی روٹی

☆

ہندوستاں میں دولت و حشمت جو کچھ بھی تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

☆

مالک الملک نصاریٰ ہوئے کلکتہ لے
یہ تو نکلی عجب اک وضع کی جنجال کی کھال

☆

توڑ جوڑ آوے ہے کیا خوب نصاریٰ کے تئیں
فوجِ دشمن سے وہیں لیتے ہیں سردار کو توڑ

☆

تب جانوں میں کہ دینِ محمدؐ کے ہیں حریف
جب روزِ حشر ہو رخِ اہلِ فرنگ سرخ

دیکھیے ایسے شعر تو وہی کہے گا جس کے دل کو لگی ہو۔''

''ہاں، اس میں تو کوئی شک نہیں۔ لیکن حضرت شیخ نے ایک آدھ جگہ فرنگیوں کا ذکر شاید ذرا نرم لہجے میں بھی تو کیا ہے؟''

''بے شک کیا ہوگا۔ لیکن ایسے شعروں میں بھی لہجہ اگر غور سے دیکھیں تو تمسخر کا ہے۔ بھلا

اس طرح کے شعروں کو توصیفی کون کہے گا، سنیے:

اے مصحفیؔ لیلام میں کل ہم بھی گئے تھے
کر آئے ہیں اک طرفہ فرنگن کا نظارہ

☆

زخم شمشیرِ نگہ حیف کہ اچھا نہ ہوا
کرنے کو اس کی دوا ڈاکٹر انگریز آیا''

ان شعروں میں توصیف سے زیادہ طنز و تعریض کے پہلو ہیں۔'' انھوں نے منھ بنا کر کہا، ''بھلا کون شریف زادے اور شریف زادیاں اپنے گھروں کے سامان لیلام میں خریدتی یا بیچتی ہیں؟''

مجھے ایک دو شعر ایسے یاد آرہے تھے جن میں ''گوروں'' کے رنگ کا ذکر صاف توصیف کے لہجے میں تھا، لیکن میں نے سکوت بہتر جان کر ایک اور پہلو سے بات بڑھائی۔ ''تو گویا فرنگیوں کے تئیں حضرت استاد کا طرز سیّد انشا جیسا نہ تھا۔''

''میں سیّد انشا صاحب کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں'' وہ کچھ ذرا بے دلی سے بولیں۔ ''شاید آپ ٹھیک کہتے ہوں۔''

''میرا مطلب یہ ہے کہ سیّد موصوف کی طبیعت میں جو ہنسوڑ پن تھا، اس کی جھلک صاحبانِ عالی شان کے بارے میں ان کی باتوں میں ملتی ہے۔ بیلی صاحب ریزیڈنٹ تھے اور ان کے میر منشی علی نقی خان جب صاحب ریزیڈنٹ کے ساتھ دربار سے رخصت ہوتے تو سیّد انشا بڑے متین لہجے میں بآوازِ بلند کہتے، میر منشی صاحب کا اللہ بیلی۔''

''ہوگا'' وہ ذرا اکتائے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ''میں نے میر منشی صاحب کا نام پہلے کبھی نہیں سنا۔''

مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ تھک سی گئی ہیں یا شاید سیّد انشا کا ذکر انھیں کچھ خاص بھایا نہیں۔ میں نے کہا، ''اب اجازت چاہتا ہوں، لیکن پہلے وہ واقعہ سنادیں جب حضرت شیخ آپ سے پہر دو پہر ناراض رہے تھے۔ میری اس عرض کو گستاخی پر محمول نہ کریں۔ میں...''

انھوں نے پہلی بار میرا قطعِ سخن کیا۔ ''نہیں، گستاخی کی کوئی بات نہیں، لیکن کبھی اور سہی۔ آج کے لیے معافی کی درخواست قبول کریں۔'' ان کا چہرہ خدا معلوم کیوں کچھ اترا ہوا سا لگ رہا تھا۔

میں نے جھک کر آداب کیا۔ محمد راجا مجھے گلی کے نکڑ تک چھوڑنے آیا۔ میں نے اسے ایک روپیہ انعام دیا اور گھر کے لیے سوار ہوگیا۔

(۱۲)

مجھے اس بات کو جاننے کی لو لگی ہوئی تھی جس کی بنا پر حضرت شیخ کو اتنی خفگی ہوئی کہ وہ بھورا بیگم سے پہروں ناراض رہے۔ لہٰذا دوسرے ہی دن سب ضروری کام چھوڑ کر میں گندہ نالہ جا پہنچا۔ لیکن راہ میں مجھے خیال آیا کہ وہ خدا جانے کوئی بہت پردے والی بات رہی ہو اور بھورا بیگم اسے ظاہر کرنا پسند نہ کریں۔ کل ان کے چہرے پر ہلکا سا تناؤ شاید اسی باعث تو نہ تھا کہ میں ان باتوں کی کرید کر رہا تھا جنھیں وہ پوشیدہ رکھنا چاہتی ہوں؟ اور پھر حضرت شیخ کے بارے میں بہت سے سوال میرے ذہن میں اور تھے، پہلے وہی سب پوچھ لوں، پھر دیکھا جائے گا۔

یہ باتیں سوچ کر جب میں نے ان کے دروازے پر دستک دی تو جواب ملنے میں خلافِ معمول دیر ہوئی۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں کوئی نامطبوع بات نہ واقع ہو گئی ہو۔ بارے راجا میاں نے دروازہ کھولا تو پتا لگا کہ ''باجی بیگم کا جی کل رات سے کچھ ماندہ ہے، لیکن آپ اندر چلے چلیے۔ آپ سے تو کوئی تکلف نہیں۔''

میں اندر گیا تو وہ چادر اوڑھے کمرے سے باہر آئیں۔ ان کا چہرہ سُتا ہوا تھا اور بڑی بڑی آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ میرے ہزار پوچھنے پر انھوں نے اتنا ہی بتایا کہ رات ٹھیک سے نیند نہ آئی تھا۔ میں نے تفصیل پوچھی تو ہر بار ٹال گئیں، لیکن میں نے واپس جانا چاہا تو انھوں نے اس کی بھی اجازت نہ دی۔ میں نے انکھیوں سے دیکھا کہ وہ چپکے چپکے اپنا ہاتھ پیڑو اور پشت کمر پر لے جاتی ہیں اور بار بار ہلکے سے دباتی ہیں، گویا وہاں درد ہو۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ وہ کہیں کپڑوں سے نہ ہوں۔ ہر چند کہ ان کی عمر کی عورتوں کو ایامِ یاس عارض ہو جاتے ہیں، لیکن یا تو ان کے ساتھ ابھی ایسا نہ ہوا تھا یا میں نے شروع میں ان کی عمر کا اندازہ جو لگایا تھا وہ درست نہ تھا اور وہ اپنی اصل عمر سے زیادہ کی لگتی تھیں۔ بناؤ سنگار سے انھیں کوئی ربط نہ تھا یا کم سے کم اب نہ تھا۔ شاید اس وجہ سے بھی ان کی عمر اصل سے زیادہ لگتی ہو۔

یہ خیال آتے ہی میں گڑبڑا کر اٹھا اور بولا کہ آج اجازت دیجیے، پھر کبھی حاضر ہوں گا۔

''نہیں نہیں لال میاں صاحب، بیٹھیے تو سہی،'' وہ بولیں۔ ''راجا حقہ تازہ کر رہا ہے، پھر چاہ بنائے گا۔ میں نے آپ کے لیے رکاب گنج سے چاہ منگوائی ہے۔''

''اچھا، چاہ کا آپ کو شوق کب سے ہوا؟'' میرے منھ سے نکلا، پھر میں دل ہی دل میں شرمندہ ہوا کہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی۔

ان کے سوکھے ہوئے چہرے پر زندگی کی ہلکی سی رمق آئی۔ ''شیخ صاحب کبھی کبھی میرے لیے لایا کرتے تھے۔ وہ خود تو قہوہ پیتے تھے، لیکن فرماتے تھے کہ... کہ دردوں کے لیے چاہ بہت مفید ہے۔'' انھوں نے جملہ ذرا ہڑبڑاہٹ میں ختم کیا۔

''دردوں'' کا لفظ سن کے میں بھی ذرا محجوب سا ہوا، اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ ان کے ایامِ گل کے بارے میں شاید میرا اندازہ درست تھا۔ لیکن اچانک ان کے چہرے پر ہلکی سی شگفتگی دکھائی دی تو میں نے دل ہی دل میں اطمینان کا سانس لیا۔

''چاہ کے بارے میں آپ کو ایک لطیفے کی بات بتاؤں۔'' وہ بولیں۔

''بہت خوب، ماشاء اللہ۔ ارشاد ہو۔''

''کیا آپ کو معلوم ہے 'چاہ' کو 'چائے' بھی کہتے ہیں اور عربی میں اسے 'شائے' کہتے ہیں؟''

''جی نہیں، میں نے اس لفظ اور اس شے کی کبھی تحقیق نہیں کی۔''

''شیخ صاحب کے پاس طب کی ایک پرانی کتاب تھی، قرابادین معصومی سا کچھ اس کا نام تھا۔ اس کے اخیر میں بہت سے خالی ورقوں پر کتاب کے کسی پچھلے مالک نے کئی نسخے، ٹوٹکے اور مفردات کے صفات لکھ رکھے تھے۔ ایک ورق پر چاہ کے بارے میں لکھا تھا کہ ملک خطا میں کوئی لڑکی تھی۔ وہ نچلے دھڑ سے مفلوج تھی اور اس کی زبان لکنت کرتی تھی۔ ایک دن وہ یوں ہی بستر پر پڑی تھی کہ اچانک ایک کوا آیا اور اس کے بستر پر چند سبز پتیاں گرا کر چلا گیا۔ ایسا کئی بار ہوا۔''

''بڑی اعجوبہ بات ہے، سبحان اللہ۔''

''ابھی اصل بات تو آپ نے سنی ہی نہیں۔ لڑکی نے یوں ہی پانچ سات پتیاں اٹھا منھ میں ڈال لیں اور ان کو چبایا تو بالکل نیا ذائقہ لگا، کچھ کسیلا تو کچھ بنفشہ و عناب جیسا۔ دھیرے دھیرے وہ ایک دو کے سوا ساری پتیاں چبا گئی۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ چند گھڑی میں اسے اپنے پنڈے میں طاقت محسوس ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی اور اس کی لکنت بھی جاتی رہی۔''

''ارے واللہ، کرتار کے بھی کھیل نرالے ہیں۔''

''اس میں کیا شک ہے۔ خیر، تو پھر اس لڑکی کے والد اور بھائیوں نے اس کوے کا گھونسلا ڈھونڈ نکالا، اور کوے کا پیچھا کرتے ہوئے وہ ایک جنگل تک پہنچے جہاں بے شمار جھاڑیوں پر وہی پتیاں اُگ رہی تھیں۔ اس بوٹی کا نام تو انھیں معلوم نہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے اسے 'چائے' کہہ دیا، کہ زبان خطا میں 'کوے' کو 'چائے' کہتے ہیں۔''

''واللہ عجب بے نظیر قصہ ہے۔ بالکل گل بکاولی یا بدر منیر جیسا محیر العقول۔'' میں نے کہا۔

''اب حقیقت جو بھی ہو، لیکن یہ تو ہے کہ شیخ صاحب جب میری ضرورت دیکھتے تو چاہ پینے کی تلقین کرتے تھے۔''

''تو حضرت دادا استاد آپ کی ہر چیز کا خیال رکھتے تھے... تنگی حالات اس میں مانع نہ آتی تھی۔''

''وہ غریب یا مفلس تو نہ تھے، لیکن میں نے انھیں صحیح معنی میں خوش حال کبھی نہ دیکھا۔

خوشامد سے انھیں نفرت تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اصلاً تو سب انسان برابر ہیں، خاص کر اس زمانے میں، جب اولیا ہیں نہ پیغمبر نہ امام۔ اور میں بھی اپنی جگہ اپنی اقلیم کا مالک ہوں۔ پھر کسی کی خوشامد کیوں کروں؟''

اتنے میں چاہ بن کر آگئی تھی۔ یہ وہ چاہ تھی جسے لکھنؤ میں ''کشمیری چاء'' کہتے تھے، خدا معلوم کیوں۔ یا شاید اس وجہ سے کہ صاحبان انگریز کی چاہ کے برخلاف اس میں دودھ، شکر اور بعض مسالے بھی پڑتے تھے۔

''راجا میاں مجھے بھی ذرا سی چاہ دے دینا،'' کہتے ہوئے وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں، ''اور وہ سخی بھی بہت تھے۔ کسی نے کچھ مانگا تو حسب مقدور اس کو دیا ضرور۔ میں ان کی اس خصلت سے عاجز بھی ہوتی، لیکن وہ یہی کہتے کہ بھورا بیگم دینے والے ہی کو ملتا ہے۔''

''دادا استاد کے آخری برسوں کا کلام مگر کچھ بہت نہیں۔ کیا ایسا تو نہیں جو لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنا کلام بیچتے تھے...''

میں نے ان کے چہرے کا رنگ بدلتے ہوئے دیکھا اور مجھے خیال آیا کہ میں نے پھر غلط بات کہہ دی۔ بھورا بیگم صاحب کو تو بس طرارہ آگیا۔ چادر انھوں نے بدن سے الگ اتار پھینکی، دوپٹے کا بھی ہوش نہ تھا کہ ٹھیک سے سنبھالیں۔ ''جن لوگوں نے منھ سے ایسے کلام نکالے مولا کرے گا تو قبر میں ان کو دو مونہی رتی ہی ڈسے گی۔ بڑے آئے کم بخت کہنے والے کہ ان کا آخری وقتوں کا کلام سارا بک گیا...''

''میں معافی چاہتا ہوں استانی صاحب،'' میں نے کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑے اور کہا، ''میری ایسی کوئی منشا نہ تھی۔ میں تو صرف ایک بازاری بات کا ذکر کر رہا تھا۔''

''تو بھاڑ میں جائیں ایسے بازاری لوٹی کم بخت،'' وہ چہرہ اور آنسو پونچھتی ہوئی بولیں۔ ''سنیے صاحب! انھوں نے سید انشا والے واقعے کے بعد دو چار برس گوشہ نشینی ضرور اختیار کر لی، لیکن اپنی طبیعت کو کہاں لے جاتے؟ انھوں نے اسی زمانے میں اپنا دوسرا تذکرۂ شعرا مکمل کیا، نظیری کے جواب میں پورا دیوان فارسی لکھا، ایک اور دیوان فارسی جو پہلے سے زیر ترتیب تھا، اسے مکمل کیا۔ ہندی کا چوتھا اور پانچواں، دونوں دیوان اسی زمانے کے ہیں۔ ایک نثر کی کتاب فارسی میں ''مجمع الفوائد'' نام کی لکھی۔ مضمون تو ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ انھیں شعروں کی کیا کمی تھی؟''

''مجمع الفوائد'' کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ یہ کتاب تو آج تک شاید کسی نے بھی نہ دیکھی تھی۔

''یہ مجمع الفوائد کیا کوئی پند و نصائح کی کتاب ہے؟'' میں نے ان کی بات تقریباً کاٹتے ہوئے بے صبری سے پوچھا۔ لیکن انھوں نے سنی ان سنی کر دی۔

''وہ بڑے مروت والے شخص تھے۔ وہ رنجھ پچھاڑ نہ تھے اور نہ ہی اپنی پسند ناپسند ظاہر کرنے

میں انھیں کوئی تکلف تھا۔ چھوٹوں کی مرضی اور خوشی کا خیال جیسا وہ رکھتے تھے، کیا کسی اور استاد نے رکھا ہوگا۔'' وہ ذرا گرم لہجے میں بولیں۔''اگر کسی شاگرد یا حاضر باش نے ان کا کوئی شعر پسند کیا یا کسی غزل کی دل کھول کر ثنا کی تو وہ بے تکلف وہ شعر بلکہ ساری غزل اس کی نذر کر دیتے تھے۔''

وہ سانس لینے کو ذرا رکیں تو میں نے کہا، ''بے شک، میرے حضرت شیخ کی سخاوت تو ضرب المثل ہے۔'' لیکن وہ یوں بے تکان بولتی چلی گئیں گویا میں موجود ہی نہیں ہوں اور وہ کسی وقائع نویس کو اظہاریہ لکھا رہی ہوں۔

''اور لوگوں کو اپنے اشعار سے اس درجہ محبت ہوتی ہے کہ وہ انھیں اپنی اولاد معنوی کہتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے شعروں کو یوں سینے سے لگائے رہتے ہیں جیسے بندریا اپنے مردہ بچے کو چمٹائے چمٹائے گھومتی ہے۔ اور ان کا یہ عالم کہ ان کا کلام گویا دسترخوان تھا اور ساری دنیا ان کی مہمان۔ اب اگر کوئی قدردان یا شاگرد ایسے میں اظہار تشکّر کے طور پر ایک دو روپئے ان کے قدموں میں رکھ دیتا تو کیا یہ شعر بیچنا ہوا؟ کیا شاگردوں پر استاد کا اتنا بھی حق نہیں؟''

''کیوں نہیں، بے شک اس سے بھی زیادہ حق ہے۔''

''تو پھر یہ شعر بیچنے کی بات کہاں سے اڑا دی آپ لوگوں نے...؟''

''میں نے نہیں، حاشا وکلا میں نے ایسی کوئی بات خود سے نہیں کہی۔ میں تو بس سنی سنائی عرض کر رہا تھا۔'' میں نے ہاتھ ملتے ہوئے سر جھکا کر کہا، ''شرمندہ ہوں کہ ایسی بات زبان پر لایا ہی کیوں!؟''

اب ان کا طرارہ کچھ کم ہونے لگا تھا۔ کچھ لحظہ خاموش رہ کر انھوں نے ٹھنڈی سانس لی اور بولیں۔ ''صاحب! آپ میرے بچوں کی طرح ہیں۔ عمر میں نہ سہی لیکن رشتہ تو وہی ہے۔ آپ کے دادا استاد تو وہ شخص تھے کہ مانگنے والے کو تن کے کپڑے اتار کر بخش دیتے۔ اشعار کی کیا بات ہے، شعر تو وہ جب جتنے چاہتے کہہ لیتے۔ انھوں نے غلط نہیں کہا تھا:

ہے مصحفی وہ شخص جو آوے اسے لوٹا
تنخواہ میں نوکر کو یہ دیوان لگا دے

''سبحان اللہ، کیا مضمون ہے اور کیا زور کلام۔''

اب وہ ذرا اور نرم پڑیں۔ ''مجمع الفوائد میں انھوں نے اپنے خاندان کے قدیمی حالات اور اپنے افکار و سوانح بیان کیے ہیں۔ جس زمانے میں وہ یہ کتاب لکھ رہے تھے، اسی زمانے میں انھوں نے ایک غزل کہی جس کے بعض شعروں پر میں نے کچھ الٹی سیدھی بات کہہ دی تھی...''

یقیناً یہ وہی واقعہ رہا ہوگا جس پر حضرت شیخ کو ان سے خفگی ہوئی تھی، میں نے اپنے دل میں کہا۔ لیکن پوچھوں تو کیسے۔ آج تو میں انھیں کئی جنم کی ناراضگی کا سامان پہلے ہی مہیا کر چکا ہوں۔ میں

نے چپ ہی رہنے میں عافیت جانی۔ ایک دو لمحہ بعد وہ خود ہی بولیں۔ ''شیخ صاحب کے مذہبی عقائد کا میں تذکرہ کر ہی چکی ہوں...''

''جی،'' میں نے دلچسپی کا کوئی پُر جوش اظہار کیے بغیر عام سے لہجے میں کہا کہ انھیں یہ گمان نہ ہو کہ میں کسی خاص چیز کے تجسس میں ہوں۔

''کبھی کبھی وہ مجھ سے کہتے، بھورا بیگم! انسان سب سے بڑی حقیقت ہے۔ میں گھبرا کر کہتی کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ اللہ، نبی، قیامت، قرآن، کعبہ، یہ سب کچھ نہیں؟ تو وہ کہتے، بیگم صاحب! میں کسی شرعی نقطۂ نظر سے نہیں، عام انسانی نقطۂ نظر سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ انسان کو آخر اشرف المخلوقات کسی وجہ سے ہی تو کہا گیا تھا؟ میں کہتی کہ یہ باریکیاں آپ امام اور مجتہد لوگوں کے لیے چھوڑ دیں۔ ہمیں ان باتوں سے کیا لینا دینا۔ وہ ہنس کر چپ ہو جاتے۔''

میں ہمہ تن گوش سن رہا تھا۔ بیچ میں لقمہ دینے کی بھی ہمت نہ تھی کہ خدا معلوم کیا بات ان کی کیفیت کو متغیر کر دے۔

''گرمی کے دن تھے، نیند نہ انھیں ٹھیک سے آ رہی تھی نہ مجھے۔ مچھروں اور کھٹملوں کی افراط، ہوا بند، اور ہمارا چھوٹا سا گھر۔ میں انھیں پنکھا جھلتی تو وہ پنکھا میرے ہاتھ سے لے کر مجھے جھلنے لگتے۔ گرمی سے تنگ آ کر میں نے دوپٹہ الگ کر دیا تھا اور صرف اونچی چولی کا شلوکہ ململ کا اور ڈھیلا سوسی کا پائجامہ پہنے لیٹی تھی۔ پائجامے کے بھی پائینچے میں نے تھوڑے بہت اٹھا رکھے تھے۔ ایک بار انھوں نے پنکھا ذرا زور سے ہلایا تو میرا ایک پائینچہ ذرا اور اٹھ گیا۔ بس فی البدیہہ انھوں نے مطلع پڑھ ہی تو دیا:

شب پیش نظر حسن کا بازار تو رکھا
کھٹمل کا میں ممنوں ہوں کہ بیدار تو رکھا

''چلیے ہٹیے، میں نے تنگ کر منھ پھیرتے ہوئے کہا۔ آپ کو تو ہر وقت ہر مضمون پر شعر ہی سوجھتے ہیں۔ یہاں گرمی کے مارے جان جا رہی ہے... میں نے کروٹ لے کر سونے کی کوشش کی اور خدا معلوم کب مجھے نیند آ بھی گئی۔ لیکن جب جب آنکھ کھلتی تو چراغ کو روشن اور شیخ صاحب کو لکھتا ہوا دیکھتی۔ وہی موئی کھٹمل والی غزل پوری کر رہے ہوں گے، میں نے دل میں کہا۔

''صبح ہوتے ہوتے مجھے اچھی نیند آ گئی۔ فجر کی نماز بھی قضا ہوتے ہوتے رہ گئی۔ شیخ صاحب اب بے خبر سو رہے تھے، ان کے جاگنے کا وقت بھی ابھی نہ تھا۔ وہ کاغذ جس پر وہ رات غزل لکھ رہے تھے، ان کے تکیے کے نیچے سے جھانک رہا تھا۔ وہ مجھے اپنا کلام اکثر خود ہی سناتے یا پڑھنے کے لیے دے دیتے تھے، لہٰذا میں نے آہستہ سے، اس طرح کہ ان کی نیند نہ اُچٹے، وہ کاغذ ان کے سرہانے سے کھینچ لیا۔

''لمبی غزل تھی، تقریباً دو غزلے کے برابر، لیکن زمین وہ نہ تھی جس میں انھوں نے رات مطلع

کہا تھا۔''

وہ ایک لمحہ چپ رہیں، گویا اس صبح کی باتیں یاد کر رہی ہوں۔ پھر انھوں نے محمد راجا کو آواز دی کہ میرے پلنگ کے نیچے جو صندوقچہ رکھا ہے اسے اٹھا لا۔ راجا میاں نے صندوقچہ لا حاضر کیا تو انھوں نے اس میں ٹٹول کر کچھ پارینہ کاغذ نکالے۔

''اٹھارہ شعر کی غزل تھی۔ اس میں سات شعروں کا قطعہ تھا جسے پڑھ کر میری تو جان ہی نکل گئی۔''

انھوں نے پڑھنا شروع کیا۔ آواز میں خفیف سی لرزش اور مضامین اشعار کے ناپسندیدہ ہونے کا تاثر تھا:

یک شب جو اشک سے بھی میں آگے نکل گیا
اس جستجو میں دیکھوں تو ہے لا مکاں کہاں
ناگہ سروش غیب نے یہ دی مجھے ندا
آتا ہے یاں بھٹکتا ہوا اے جواں کہاں
میں نے کہا میں خانۂ صناع خلق کو
دنیا میں ڈھونڈتا نہ پھرا تھا کہاں کہاں
آخر پتا ملا تھا مجھے بر فراز عرش
پر دل کہے تھا مجھ سے تو پہنچا وہاں کہاں
ہمت دلیل بن کے لے آئی تو ہے مگر
بتلاویں تو یہ بات ہے اس کا نشاں کہاں
جھنجھلا کے تب یہ اس نے کہا مجھ سے بے شعور
کیا لا مکاں کو ڈھونڈے ہے، ہے لا مکاں کہاں
جا ملک تن کی عالم ہستی میں سیر کر
تجھ کو وہیں ملے گا نشاں یاں نشاں کہاں

وہ اشعار پڑھ کر چپ ہو گئیں، گویا سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ بات کو کس طرح آگے بڑھائیں۔ اور میں ادھر دم بخود تھا کہ اگر میں غلط نہ سمجھا تھا تو ان اشعار سے صاف خود پرستی یا مادی اشیا کو لامکانی حقائق پر ترجیح دینے کا رجحان نمایاں تھا۔ لیکن ان کی خاموشی سے یہ بات بھی ظاہر تھی کہ وہ ان اشعار کے بارے میں مجھ سے کچھ سننا چاہتی ہیں۔ مجبوراً میں نے مہر سکوت توڑی اور ٹھہر ٹھہر کر کہا:

''اگر میں غلط نہیں سمجھا تو اس قطعے میں حضرت شیخ نے مادے کو روح پر ترجیح دی ہے یا صورت کو اشیا کے اصل جوہر کا حامل قرار دیا ہے۔''

انھوں نے گہری سانس لی، جیسے انھیں کوئی الجھن تھی جو میری بات سے دور ہوئی۔ ''یہی تو اس وقت میں نے بھی اپنے دل میں کہا تھا،'' وہ بولیں۔ ''میں فیلسوفوں کی موشگافیاں کیا جانوں، لیکن میں ڈر رہی تھی کہ یہ اشعار اگر عام ہوئے تو جناب لوگ اور مولوی لوگ ان کا مطلب وہی نکالیں گے جو شیخ صاحب کے خلاف جائے گا۔ اور فرض کریں ایسا نہ بھی ہوا تو اللہ تو ہے، وہاں اس کے دربار میں شیخ صاحب کیا عذر داری کریں گے۔''

''لیکن یہ تو شاعری ہے، مضمون آفرینی ہے۔ شعرا ایسے مضامین لکھا ہی کرتے ہیں۔'' میں نے سنبھل سنبھل کر کہا۔

''بجا ہے،'' وہ بولیں۔ ''لیکن یہ شعر اس وقت تو مجھے بالکل ہیولی پرستی اور خلاف دین معلوم ہوئے۔ کلام کا زور تو دیکھیے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ...''

''یہ محض مضمون آفرینی نہیں ہے۔'' میں نے تصدیق کی۔ ''لیکن پھر بھی، شعر تو شعر ہے۔''

انھیں میری بات سے اطمینان کے بجائے کچھ اور بے چینی سی ہوئی۔ ''نہیں نہیں، ایسا ہرگز نہیں، ان کے خیالات سراسر بے دینی پر محمول ہو سکتے تھے۔'' اتنا کہہ کر وہ پھر چپ ہوگئیں، گویا اپنے اندر کسی کشمکش سے دوچار ہوں۔ اور مجھے، ظاہر ہے کچھ اور کہنے یا پوچھنے کی مجال نہ تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ اس وقت ان پر ذہنی کوفت بہت ہے اور طبیعت بھی درست نہیں، آج بات کو یہیں ختم کر دیں تو اچھا ہو۔ یہ خیال کر کے میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو انھوں نے اشارے سے مجھے بیٹھے رہنے کو کہا۔

دفعتاً ان کی آنکھ سے آنسو رواں ہو گئے۔ دونوں آنکھیں چشمے کی طرح بہ نکلیں، لیکن نہ سسکی تھی نہ آواز۔ بس سر جھکائے وہ روئے چلی جا رہی تھیں۔ میں اور بھی متوحش ہوا کہ اب کیا کروں۔ وہ دوپٹے سے آنسو خشک کرتیں اور جس تیزی سے وہ خشک ہوتے اسی تیزی سے پھر بہ نکلتے۔ محمد راجا دوڑ کر کٹورے میں پانی لایا۔ انھوں نے بہ دقت رک رک کر دو چار گھونٹ پیے۔ تھوڑا سا پانی ایک چلو میں لے کر منھ پر چھڑکا۔ میں چپ چاپ سارا منظر دیکھتا رہا۔ اچانک انھوں نے بہت دھیمی آواز میں بولنا شروع کیا۔ لہجہ اس قدر پست تھا کہ مجھے بعض اوقات کانوں پر زور دینا پڑتا تھا۔

''اس دن خدا جانے کون سی کم بختی مجھ میں سما گئی تھی۔ شیخ صاحب کے عقیدوں کی خرابی پر رنج اور غصہ تھا یا ان کو آخرت کے عذاب سے بچانے کی الجھن تھی یا اس بات کا ڈر تھا کہ ان پر مولوی مولانا لوگوں کا عتاب نازل نہ ہو۔ ان کے عقائد کا حال تو مجھے تقریباً روز اول سے معلوم تھا۔ اور جہاں تک سوال ان کے عذاب ثواب کا تھا، تو یہ معاملہ ان کے اور ان کے اللہ کے درمیان تھا۔ میں کون ہوتی تھی ان پر داروغہ ہو کر بیٹھنے والی...''

میں نے چپ رہنا مناسب سمجھا۔ ایک لمحہ بعد میں نے صرف اتنا کہا، ''مگر حضرت شیخ کی بہی خواہی تو آپ کا حق اور فرض تھی۔''

"تھی یا شاید نہیں تھی۔ وہ اچھا برا مجھ سے بہتر جانتے تھے۔ اب تو میں یہی کہتی ہوں کہ کاش اس بات کو میں نے طول نہ دیا ہوتا۔"

انھوں نے صندوقچے میں ٹٹول کر کاغذ کے دو ٹکڑے نکال کر میری طرف بڑھائے۔ میں نے اٹھ کر ان کے ہاتھ سے وہ کاغذ لیے تو دیکھا کہ نہایت پختہ خوب صورت خط شکست میں وہی غزل تھی، اور کاغذ دو نیم تھا۔ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔

"یہ... یہ حضرت شیخ کی تحریر ہے، اور آپ نے غصے کے عالم میں اس کاغذ کو..."

ان کی آنکھ میں پھر آنسو بھر آئے۔ انھوں نے سر کے اشارے سے ہاں کہی۔ میں سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ حضرت شیخ جیسا خود دار اور عالی دماغ شخص، اور اپنے کلام کا اپنی ہی بیگم کے ہاتھوں یہ حشر دیکھے۔ عیاذاً باللہ۔ وہ جتنا بھی خفا ہوتے، کم تھا۔

روہانسی آواز میں بھورا بیگم نے کہا۔ "جب وہ جاگے تو میں ان سے خوب ہی لڑی۔ پھر میں نے یہ کاغذ... یہ کاغذ... ان کے سامنے چ... چاک کر دیا۔ میں نے کہا کہ آپ کو خدا کا خوف نہ ہو، مجھے تو ہے۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا، ایک رنگ جاتا۔ لیکن انھوں نے صرف اتنا کہا، بھورا بیگم آپ کو یہ حق نہ تھا۔ نہ میری غزل پھاڑنے کا، نہ میرے عقائد پر محتسب بن کر بیٹھنے کا۔ میں انسان کو سب کچھ سمجھتا ہوں۔ اور ہمارے خیر البشر روحی فداہ بھی تو انسان تھے... قرآن میں ہے...

میں نے بات کاٹ کر کہا، "میں یہ سب باریکیاں کیا جانوں، میرے حسابوں تو اللہ کے نبی اور نبی کے بعد امام، بس یہی سچا دین ہے، یہی سب کچھ ہے۔ باقی سب ڈھکوسلے ہیں۔ خدا جانے آپ اپنا ایمان کس شیطان کے پاس گروی رکھ آئے ہیں، میں تقریباً روتی ہوئی لیکن تیز آواز میں بولی۔ شیخ صاحب اب تک پلنگ ہی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اب وہ ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے، آپ کا دماغ چل گیا ہے۔ اس وقت آپ سے بات کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے کھونٹی پر سے اپنا چغہ اتارا، دروازے کی کنڈی کھولی، اور یہ جا وہ جا۔ میں دیکھتی ہی رہ گئی۔"

"انا للہ وانا الیہ راجعون،" میرے منھ سے نکلا۔ "یہ تو بڑا برا ہوا۔"

"یہ آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں،" وہ ذرا تیز لہجے میں بولیں۔ "اس وقت جو عالم مجھ پر گزر گیا اس کا حال میں آپ سے کیا بتاؤں۔"

کچھ دیر تک سر جھکائے وہ صندوقچے میں کچھ تلاش کرتی رہیں، پھر بولیں:

"پہلے تو گم سم بیٹھی رہی، مجھے ایک احمقانہ سی امید تھی کہ وہ ابھی واپس آ جائیں گے۔ لیکن تھوڑی دیر گزرنے کے بعد میں نے اچانک دروازہ بند ہونے کی آواز گویا دوبارہ سنی۔ دروازے کا کھلنا تو میں نے خود ہی دیکھا تھا، پھر جب انھوں نے زور سے دروازہ بند کیا تو وہ آواز بھی میں نے سنی، لیکن اس وقت شاید میرے ذہن نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، میں سمجھی ہی نہ تھی کہ کیا ہوا۔ اب کوئی

ایک گھڑی بعد اس آواز کے معنی مجھ پر ظاہر ہوئے کہ شیخ صاحب باہر چلے گئے ہیں۔ اب وہ کب آئیں گے... آئیں گے بھی کہ نہیں؟ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ضرور آئیں گے، مجھے اس طرح چھوڑ کر وہ جا نہیں سکتے۔ لیکن میری عقل کہہ رہی تھی کہ شاید کئی دن تک نہ آئیں یا خدانخواستہ کبھی نہ آئیں ...تو میں کیا کروں گی؟"

ان کے آنسو پھر بہ نکلے۔ "میں گھر میں بالکل اکیلی، پاس پڑوس کے گھروں سے بھی ہمارا ملنا جلنا بہت نہ تھا۔ شیخ صاحب کو شعر سے فرصت نہ تھی، اور ہم اتنے خوش حال بھی نہ تھے کہ لوگوں کے یہاں آتے جاتے، دعوتیں کرتے، ملتے ملاتے۔ پھر ابھی تک میں متاہی ہی تھی، ایسی عورتوں کو لوگ اپنے گھروں میں بلاتے بہت کم تھے۔"

"ظفر الدولہ بہادر کے یہاں سے تو آپ کا ربط قائم رہا ہوگا،" میں نے کہا۔ "پھر خواجہ آتش تھے اور دوسرے شاگرد تھے..."

"مگر میں اکیلی جان عورت ذات گھر سے باہر کیسے نکلتی؟ اور مان لیا میں نکل بھی جاتی تو کہیں اتنی دیر میں شیخ صاحب واپس آگئے اور میں انھیں گھر میں نہ ملتی...؟"

"جی، یہ بات تو ہے۔" میں نے سر جھکائے جھکائے آہستہ سے کہا۔

"ایک دو گھڑی اور ان کی راہ میں نے صبر سے دیکھی، پھر زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ لیکن محلے والے بھی شاید بہرے تھے کہ کوئی پوچھنے کو نہ آیا کہ تجھے کیا آزار ہے۔ جب میں خوب رو چکی تو اپنے دل کو میں نے یہ کہہ کر سمجھانا شروع کیا کہ بھورا، تجھے تیری ماں کی گود سے چھڑا کر بھی مالک نے پالا جلایا، کھلا پلا کر بڑا کیا۔ مولا مشکل کشا چاہیں تو کیا نہیں ہو سکتا۔ تو نے کسی کا کچھ بگاڑا نہیں ہے اور ابھی شیخ صاحب کو گئے دیر ہی کتنی ہوئی۔ بجا تو ان کی مجرم ہے، لیکن تو نے جو کیا ان کی خیر خواہی میں کیا۔

اس طرح اپنے دل کو تسلی دے، میں نے نہا دھو کر، صاف کپڑے پہنے اور اس بیچ میں پیر دیدار کا کونڈہ، بیر بیکا یک کا روزہ، چہل کنجی کے طاق، اور خدا جانے کتنی منتیں مان ڈالیں۔ آدھی تیبی دعائے صباح جیسی مجھے یاد تھی، پڑھ ڈالی۔ پھر اچانک دل میں ایک بات آئی۔ مجھے لکھنا تو آتا تھا، لیکن خوش خط میں نہ تھی، ہاں اور لڑکیوں سے پکھ بیس ہی لکھ لیتی تھی۔ میں نے صاف کاغذ ان کے قلمدان سے نکالا، پرانے قلم کو دھو دھا کر صاف کیا، پھر مولا کا نام لے کر وہی ساری غزل کاغذ پر صاف صاف اتاری۔"

انھوں نے اپنے صندوقچے میں پھر ڈھونڈا اور اس بار ایک بڑا کاغذ، جو کئی بار کا تہ کیا ہوا اور کھولا ہوا معلوم ہوتا تھا، یوں ہی تہ کیا ہوا میری طرف بڑھایا۔ میں نے جو اسے کھولا تو وہی غزل تھی، ذرا خام لیکن دل کش شفیعا آمیز نستعلیق خط میں لکھی ہوئی۔ مقطع کے ذرا نیچے سرخ روشنائی سے لکھا تھا، معافی کی خواستگار آپ کی کنیز حیات النسا عرف بھورا۔ اور اس کے بھی نیچے حضرت شیخ کے خوب صورت خط

شکست میں لکھا تھا، لیکن ذرا مٹا مٹا سا، مصحفی تم سے خفا ہی کب تھا۔ میں سمجھ تو گیا تھا کہ یہ حرف مٹے سے کیوں ہیں، لیکن ان کی طرف دیکھ کر میں نے تصدیق چاہی تو انھوں نے کہا، ''جی ہاں۔'' پھر وہ دوپٹے سے آنکھیں خشک کرتی ہوئی بولیں:

''میں نے ظہر کی نماز کا سلام پھیرا ہی تھا کہ دروازے کی کنڈی پھر اسی انداز سے کھٹکی۔ میں تو بالکل سُن ہو کر رہ گئی، لگتا تھا میں جا نماز پر ڈھیر ہو جاؤں گی۔ پھر عقل نے آڑے ہاتھوں لیا کہ ہوش میں آ، یہ موقع دیر کرنے کا نہیں۔ میں لرزتے پاؤں سے اٹھی، جوتی پہن رہی تھی کہ بڑے زور کا چکر آیا۔ پھر میں کچھ اس طرح بے طرح گری کہ چوکی کا کونا ماتھے میں چبھ گیا اور خون بہنے لگا۔ مجھے کچھ خبر نہ ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو شیخ صاحب نے میرے چہرے کو خونم خون دیکھا اور کچھ کا کچھ سمجھ بیٹھے۔''

میں نے آج پہلی بار ان کے چہرے پر تبسم کی سچی روشنی دیکھی۔ انھوں نے آنچل ذرا سرکایا تو میں نے پیشانی کے عین بیچوں بیچ بندیا کی طرح کا گول نشان دیکھا۔ انھوں نے اس پر اس طرح ہاتھ پھیرا گویا وہی داغ ان کے لیے سارے چہرے میں سب سے پیاری چیز ہو۔

(۱۳)

۹۴۵ اور ۹۴۶ کے برس (۱۵۳۹/۱۵۴۰، مرتب) اعلیٰ حضرت محمد نصیرالدین ہمایوں بادشاہ دہلی کے لیے بڑے سخت تھے۔ ان کی افواج کو جا بجا ہزیمت ہو رہی تھی۔ سنہ ۹۴۶ کے آغاز میں ان کے لاتعداد جیوش و سرداران کو چوسا کے مقام پر شیر خان سوری شیر افگن نے شکست فاش دی۔ نہ صرف یہ کہ وہ بچے کھچے لشکر و بہیر و بنگاہ شاہی کو دھکیلتا ہوا گنگا کے اس پار بہت دور تک لے گیا بلکہ اس نے فوراً ہی شیر شاہ کے نام سے اپنی بادشاہت کا بھی اعلان کر کے دہلی و آگرہ کا رخ کیا۔ ادھر آستانۂ ہمایونی کے وفادار جیالے مجتمع ہو کر شیر خان سوری سے آخری معرکے کی خاطر اسباب و آلاتِ حرب مہیا کر رہے تھے، خزانہ اکٹھا کر رہے تھے، اور ان افغان قبائل کے سرداروں سے رابطہ قائم کر رہے تھے جو ابھی شیر خان کے تصرف اور دباؤ سے دور تھے۔

اسی سنہ ۹۴۶ کے اواخر میں محمد نصیرالدین ہمایوں کی راہیں اور فتح و نصرت کی شاہراہیں الگ الگ ہونے والی تھیں۔ قنوج کے مقام پر فیصلہ کن معرکہ گرم ہونے والا تھا۔ ملک کی رعایا عالم سراسیمگی میں تھی اور یہ سمجھنے سے قاصر تھی، مرجھاتے ہوئے تیموری طرّے کو سلام اور عقیدت کے پھول پیش کرے یا جنگ کی سرخی سے تر و تازہ ہوتے ہوئے گل سوری کو میسر چڑھائے۔

شیر خان نے ایک نیا طرز عمل اختیار کیا تھا کہ وہ جرأت مندی، وفاداری اور سپاہ سالاری کی صفت کے حامل غیر افغانوں کو بھی افغان قرار دے دیتا۔ اس موقعے پر ایک باقاعدہ اور خاصی مفصل رسم داخلہ انجام دی جاتی۔ پھر نو داخل سردار اور اس کے قبیلے کو ایک نیا افغانی نام دیا جاتا۔ یہ غیر افغان سردار یا

قبیلے صرف راجپوتوں کے نہ تھے، ان میں کئی مسلمان غیر افغان قومیں، اور غیر مسلموں میں برہمن اور ویش بھی داخل کر لیے جاتے۔ مذہب یا ذات پات کی شرط نہ تھی۔ شرط صرف یہ تھی کہ نو داخل شخص یا قبیلے میں ''افغانی'' صفات ہیں کہ نہیں۔

ان نو داخل افغانوں کی وفاداری شیر خان کے ساتھ تو بنیان مرصوص کی طرح مستحکم تھی، لیکن آپس میں ان کے تناؤ، آویزشیں اور رقابتیں ابھی ویسی کی ویسی تھیں بلکہ بعض قبائل اور سرداروں کے یہاں تو اور بھی بڑھ گئی تھیں۔ لوہانیوں میں تکبر بہت تھا، وہ اپنے آگے کسی کو سمجھتے نہ تھے۔ جنوبی بہار کے سلطان کا بیٹا جلال خان لوہانی اگرچہ نوعمر تھا، اور شیر خان اس کا اتالیق، لیکن وہ خود کو تمام افغانوں سے برتر سمجھتا تھا۔ شیر خان نے چند ہی برسوں میں اس کے بل نکال دیے۔ دوسری طرف سارنگ خانی پٹھان تھے جو اصلاً ''ترک بچے'' یعنی ترک اور غیر ترک امرا کے غلاموں کی اولاد تھے اور اپنی جواں مردیوں کے باعث فرقۂ افغاناں میں داخل ہو گئے تھے۔ سارنگ خانیوں اور فرمولیوں میں بالکل نہ بنتی تھی۔ فرمولی اصل کے اعتبار سے شیخ زادے تھے۔ لیکن فرمولیوں کی سب سے گھنی دشمنی قائم خانیوں سے تھی جو نسلاً راجپوت تھے۔

(شیر خان نے ان سب کو ایک سپہ سالار یعنی خود اپنے جھنڈے تلے کس طرح جمع کیا، یہ شیر شاہ کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے، لیکن ہمیں یہاں اس سے غرض نہیں، مرتب)۔

قنوج کی جنگ کو ابھی کچھ دن باقی تھے اور امروہہ، سنبھل، حاتم سرائے وغیرہ کے فرمولی اور قائم خانی ابھی اپنی ہی دشمنیاں نکالنے میں مصروف تھے۔ انھیں ہمایوں کا ساتھ دینا منظور نہ تھا، اور شیر شاہ کے ساتھ ہونے کے پہلے وہ بساط سلطنت پر آخری بازی کے انجام کے منتظر تھے۔

امروہہ سے کوئی پندرہ کوس کے فاصلے پر ایک طرف موضع شیخ پور ہے، جہاں فرمولیوں کا طوطی بولتا تھا۔ اس کے جنوب مشرق میں کوئی تین کوس پر موضع منجھاولی واقع ہے، جہاں کے باشندے اس وقت زیادہ تر راجپوت اور دیگر قوموں کے لوگ تھے۔ منجھاولی اور شیخ پور کو ملاتی ہوئی ایک کچی سڑک تھی جو قوس کی شکل میں دونوں مواضع کے پاس سے گزر کر ایک چھوٹے سے گاؤں پر ختم ہوتی تھی جس کا نام گھرورہ ماکانوں تھا۔ یہاں کی آبادی تمام و کمال فرمولیوں کی تھی۔ منجھاولی اور شیخ پور کو ملانے والی قوس نما سڑک سے ذرا ہٹ کر میرے اجداد کا وطن اکبر پور تھا۔ تھا میں اس لیے کہتا ہوں کہ اب وہ خطۂ زمیں صفحۂ ہستی پر محض ایک تاریک ادسر کی شکل میں ہے جس پر کہیں کہیں پلاس یا ڈھاک کے پیڑوں سے ہریالی اور موسم میں ان کے پھولوں سے کچھ خوف ناک سی سرخ روشنی نظر آنے لگتی ہے۔

یوں تو ہم لوگ بھی شیخ قوم کے تھے، لیکن فرمولی شیخ زادہ پٹھانوں کا دست تطاول ہمیں چین سے جینے نہ دیتا تھا۔ آئے دن کے جھگڑے، کسی کی زمین کو زبردستی جوت لینے کا کسی دوسرے پر سچا یا جھوٹا الزام، کسی فرمولی کی لڑکی کسی شیخ زادے کے ساتھ بھاگ گئی، تو یہ اتہام کہ اسے بھگا لیا گیا ہے، کسی کا

بیلن کسی نے بہ جبر باندھ لیا اور دعویٰ کیا کہ یہ میری زمینیں چر رہا تھا۔ یہ روز کے جھگڑے ٹنٹے تھے۔ کبھی کبھی خون خرابے کی نوبت آجاتی۔

ہم شیخ زادگان کتاب اور مزارع کے لوگ تھے، اور فرمولیان خود کو اصحاب سیف کا سرخیل سمجھتے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی وافر تھا۔ شکست اکثر ہم ہی لوگوں کی ہوتی۔ جب سے تخت و تاج کے لیے پٹھانوں اور خدیو ہند اعلیٰ حضرت نصیرالدین ہمایوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی تھی، ملکی انتظام درہم برہم تھا اور پٹھانوں کے خلاف شکایت سننے کا یوں بھی کوئی مشکل ہی سے روادار ہوتا تھا۔

شیخ قوام الدین ہمارے موضع اکبر پور کے سرکردہ لوگوں میں تھے۔ ایک دن خبر آئی کہ گھروره ماکانوں کے ایک شورہ پشت زمیں دار بلال خان کے جوان بیٹے کا پُر اسرار حالات میں قتل ہو گیا ہے۔ اس کا دھڑ کہیں ملا ہے اور سر کہیں اس پگڈنڈی پر جو گھروره ماکانوں سے شیخ پور کو ایک ذرا گھنے جنگل جلیبی اور ببول، بھٹ کٹیا اور خار دار جھڑ بیریوں کے جنگل سے ہو کر ملاتی تھی۔ اب خدا معلوم کچی غلط فہمی کی بنا پر یا موقعے کا فائدہ اٹھا کر ہم لوگوں کو نیست و نابود کر ڈالنے کے اچھے بہانے کے طور پر گھروره ماکانوں کی طرف سے افواہ اڑی کہ یہ قتل شیخ قوام کے ایک بیٹے نے بہ وجہ رقابت کیا ہے۔ اور بنائے رقابت ایک چرواہی دوشیزہ کا عشق بتائی گئی کہ دونوں ہی اس کے عنایات کے طلب گار تھے، لیکن اس کا میل طبع بلال خان کے بیٹے کی طرف زیادہ تھا۔

شیخ قوام ابھی تدابیر سوچ رہے تھے کہ کس طرح اور کس کی ایلچی گری کے ذریعے بلال خان کو باور کرایا جائے کہ میرا بیٹا اس قتل میں ہرگز ملوث نہیں کہ دوسری افواہ یہ اڑی کہ گھروره ماکانوں کی طرف سے کئی سو پٹھانوں کی جمیعت ہمارے گاؤں کو تباہ و تاراج کرنے کو چل پڑی ہے۔ شیخ قوام الدین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا سوا اس کے کہ اس افواہ کی تصدیق کے لیے کسی ہرکارے کو بھیجیں۔ شام ہوتے ہوتے ہرکارے نے آکر خبر دی کہ کچھ تیاریں سی تو ہو رہی ہیں، لیکن جو بھی ہوگا کل بلال خان کے بیٹے کی تدفین کے بعد ہوگا۔

افسوس کہ شیخ قوام الدین اور دوسرے بڑے بوڑھوں نے اب بھی کوئی حفاظتی تدابیر نہ کیں۔ اتنا بھی نہ کیا کہ اپنی عورتوں اور بچوں کو کہیں محفوظ جگہ نکال لے جاتے۔ عورتیں پکانے ریندھنے میں مصروف ہوئیں اور مرد لاٹھیاں اور دیگر ہتھیار جمع کرنے لگے، لیکن ہر چیز بڑی سستی بلکہ بے دلی سے ہو رہی تھی۔

یہاں شام کا سناٹا ذرا گہرا ہوا تو گاؤں کے چاروں طرف سے مشعلوں کی روشنیاں ہماری طرف بڑھتی دکھائی دیں۔ ہم ابھی کچھ بھی نہ پائے تھے کہ یہ ڈاکو ہیں یا پٹھان یا کوئی اور پاجی قوم کہ گھروره ماکانوں کے سارے بوڑھے جوان، حتیٰ کہ نو عمر لڑکے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے ہاتھ میں ننگی تلوار لیے ہمارے درمیان تھے۔ حملہ آوروں نے پورے انصرام و انتظام سے منصوبہ بندی کی تھی۔ مضبوط

قوی ہیکل ادھیڑ عمر کے جنگجویوں نے پورے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا تھا، کسی کو راہ فرار نہ تھی۔ ادھر گاؤں کے اندر گھس آنے والے جم غفیر نے بیک وقت بیسیوں گھروں کو آگ دے دی۔

چشم زدن میں آگ ہر گھر، ہر کھلیان، ہر دالان، ہر بنگلے تک پھیل گئی یا پھیلا دی گئی۔ شیخ قوام کی بیوی اپنے شیر خوار بچے نظام کو بھسیلے میں چھپا آئی کہ شاید اس کی جان بچ جائے۔ اس نے یہ نہ سوچا کہ بچہ اگر اس دار و گیر سے مصئون بھی رہا تو جائے گا کہاں، اور بھوسے کے ڈھیر میں اس کا دم گھٹ کر مر جانا بھی کچھ عجب نہ ہوتا۔ لیکن اس وقت کسی کو کچھ سوجھتا نہ تھا۔ مشعلوں اور جلتے ہوئے چھپروں کی سرخ لپلپاتی روشنی میں محض سائے اور دھندلی خون آلودہ لاشیں نظر آتی تھیں اور ہوا میں کچے گوشت کے جلنے کی بھیانک چراندھ پھیلی ہوئی تھی۔ شیخ قوام الدین تو پہلے ہی ہلے میں قتل ہو چکے تھے، اب ان کی بیوی کو بھی تہ تیغ کر کے حملہ آوروں نے بھسیلے میں آگ لگانے کی ٹھانی۔

بھس میں ابھی آگ پوری طرح لگی نہ تھی۔ یوں بھی اس عالم میں دھواں زیادہ تھا، آگ کہاں کتنی لگی ہے، یہ صاف نظر نہ آتا تھا۔ حملہ آوروں کو اہالیانِ اکبر پور کا قتل عام کرتے ایک پوری ساعت گزر چکی تھی۔ مظلوموں کے شور اور شعلوں کی لالی اور دھوئیں کے بھورے ملگجے بادلوں نے شیخ پور اور منجھاولی کے لوگوں میں بھی یہ بات پھیلا دی کہ یہ رات اکبر پور کے باشندوں پر آخری ہے۔ پھر کچھ تو لوٹ مار کی غرض سے، اور اکثر تماشا دیکھنے کے لیے یہ لوگ گھروں سے نکلے اور گھوڑیوں، سانڈنیوں پر سوار دھاوا مارتے ہوئے سواد اکبر پور میں پہنچے۔ بعض تو اپنی بیٹیوں اور بیویوں کو بھی موت کی تفریح سے بہرہ اندوز کرانے لائے تھے۔ انھیں میں شیخ پور کے ایک زمیں دار شیخ ممو کی بیوی بھی تھی۔ اس نے بھسیلے میں آگ لگتے دیکھی تو پکار کر کہا ارے ذرا رکو، لوگو ذرا رکو۔ کہیں اس میں کوئی بے زبان ڈھور ڈنگر نہ ہو۔ یہ کہتی ہوئی وہ بھیگا ہوا دوپٹہ منہ پر لپیٹ کر بھس خانے میں گھس پڑی۔

وہاں جانور تو کوئی نہ تھا۔ لیکن جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے خلیل کے حق میں آتش برافروختہ کو حکم دیا تھا کہ یا نار کونی برداً و سلاماً علیٰ ابراہیم، اسی طرح وہاں شیخ قوام کا بیٹا نظام پیال کے ایک ڈھیر تلے آدھا دبا ہوا چسر چسر اپنا انگوٹھا پستانِ مادر کی طرح پی رہا تھا۔ شیخ ممو کی عورت لاولد تھی۔ ممتا کی آنچ بہائم صفت انسان کی لگائی ہوئی آگ پر حاوی آ گئی۔ وہ اس آتش نمرود میں بے خطر کود کر معصوم شیر خوار کو بھیگے دوپٹے میں لپیٹتی نکال لائی۔ کشاف دقائقِ لطیف و صناعِ نکات ظریف کا ادنیٰ کرشمہ دیکھیے کہ زن شیخ نے اس مولودِ آتش ناک کا نام نظام رکھا، جب کہ اسے بالکل خبر نہ تھی کہ اس بچے کے والدین نے بھی اس کا یہی نام رکھا تھا۔

بارہ سال گزر گئے۔ نظام نے اپنی مادر مجازی کی گود میں وہ آسائشیں اور وہ الفتیں پائیں کہ اس کی مادر حقیقی بھی اس سے زیادہ کیا کرتی۔ لیکن قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ خدائے ذی القدر و اولی الامر کے بھید کون جان سکتا ہے۔ ایک دن شیخ نظام کے ہم مکتبوں نے اسے بے پدری کا طعنہ دیا۔ وہ روتا

ہوا گھر واپس آیا اور اپنی ماں سے احوالِ واقعی کے لیے مستفسر ہوا۔ بچے کی ہٹ اور اس کا درد دیکھ کر زنِ شیخ ممو بے قابو ہوگئی اور اس نے سارا حال نظام کو کہہ سنایا۔

نظام جو تا ایں دم مہدِ مباہات میں پلا تھا اور جو خود کو شیخ ممو اور ان کی بیوی کا فرزندِ حقیقی سمجھ کر دوسروں کو خود سے کم تر اور حقیر گردانتا تھا، اب اسے پتا لگا کہ میں نہ صرف یتیم و یسیر ہوں بلکہ ان لوگوں کے خانۂ تلطف میں پلا بڑھا ہوں جو کسی نہ کسی حد تک میرے والدین کی موت میں شریک تھے۔ سارا دن اور ساری رات غیرت اور غم کا زہر اس کی دیگِ دل میں کھولتے پانی کی طرح جوش مارتا رہا۔ صبح ہوتے ہوتے وہ اٹھا اور گھر والوں کی آنکھ بچا کر آوارۂ وطن ہوگیا۔

راہ کے ہرج مرج کھینچتا، کبھی فاقہ کشی کبھی محنت مزدوری کرتا، نوجوان نظام نے شبانہ روز شیخ پور کی خاک اپنے دامن سے جھاڑی اور وہاں کی تلخ یادوں کو بھی ذہن سے محو کرنے کی کوشش کرتا وہ آخر کار ملکِ دکن پہنچ گیا۔ یہاں اس نے ایک سقے کے گھر قیام کیا۔ سقے نے مہمان داری اور غریب نوازی کے تمام فرائض بہ خوشی انجام دیے، حتیٰ کہ بیگانگی کی جگہ یگانگی اور اجنبیت کی جگہ مودّت پیدا ہوگئی۔ شیخ نظام کو بے وطنی کی جگہ وطن ملا اور ایک والدِ مجازی کا نعم البدل اسے سعید سقے کی شکل میں ملا۔ سعید نے نظام کو اپنا پسر خواندہ کیا۔ چاہِ مصیبت اور دریائے مذلّت سے نکل کر اب شیخ نظام نے سعید سقے کے ساتھ ایک عالی تبار سیّد گھرانے میں سقائی اختیار کر لی۔

دن گزرتے گئے۔ نظام کے دل سے علاقۂ ہند کی تاریک یادیں محو ہونے لگی تھیں۔ کم سنی کے باعث نظام کو کبھی کبھی سیّد عالی مقدار کی محل سرا کے اندر بھی سقائی کی خدمت انجام دینے کا موقع مل جاتا تھا۔ تغیرِ حالات اور وطن اور گہوارۂ محبتِ والدین سے دوری کے باوصف لمعۂ سعادت اور نورِ شرافت نظام کی سیمائے روشن سے ہویدا تھا۔ ایک بار خاتونِ خانہ سیّدہ نے نظام کو دیکھا اور قیافے سے پہچان لیا کہ یہ گوہرِ یکدانہ صدفِ نہرِ سقائی سے نہیں نمودار ہوا۔ اور ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا کہ نظام تو کس ذات اور کس قوم کا ہے؟

میں سیّد زادہ ہوں، نظام کے منہ سے نکلا۔ یہ سنتے ہی سیّدہ خاتونِ خانہ کے تو دل کی کلی کھل اٹھی۔ اس نے بہ ہزار منت سماجت سعید سقے کو راضی کر کے نظام کو اپنے زاویۂ عاطفت میں لے کر اپنا فرزندِ خواندہ مقرر کیا۔ نظام کو لباسِ فاخرہ سے ملبّس کر کے مکتب میں بٹھایا گیا اور الگ سے بھی ایک ادیب (= استاد، مرتب) کی خدمت میں بھیجا گیا۔ بعد چندے نظام کے دل و دماغ میں شجرِ حکمت و علم و فن کی جڑیں گہرائی تک سرایت کر گئیں۔ اس کی شاخوں کی مروحہ زنی نے نظام کے چہرے کو سکون، طمانیت اور بشاشت کا وہ رنگ بخشا کہ وہ محسودِ خلائق ٹھہرا۔

مکتب سے جب فارغ ہوا تو نظام حلیۂ علم و فضل سے محلّیٰ اور ہمہ علوم و آداب اور فوائدِ تہذیب کے اسرار کا جامع ہو چکا تھا۔ سیّد عالی تبار کی ایک دختر تھی کہ جس کا حسن ماہِ تاباں کو شرماتا تھا اور

جو ہر طرح کے سگھڑ پن، اسباب جمال و زیبائی اور معاملات خانہ داری میں طاق تھی۔ سید نے وہ دختر نظام کے حبالۂ نکاح میں دے دی۔

دنیا میں حاسدوں اور بیچارہ جویوں کی کیا کمی ہے۔ اس دیار میں ایسے لوگ بھی تھے جو دختر سید کے بہ دل طلبگار تھے۔ انھوں نے نظام کے حالات میں تحقیق کی تو اس کی ذات و دودمان کا معاملہ دیگر پایا۔ رقیبوں نے جا کر سید سے لگائی بجھائی کی کہ آپ کا داماد سید نہیں، شیخ زادہ بھی نہیں، راجپوت نومسلم ہے۔ اور سوئے اتفاق یہ کہ اس کا ثبوت یوں بھی فراہم ہو گیا کہ اسی زمانے میں موضع شیخ پور کے بعض بے روزگار نوجوان تلاش معاش میں ادھر آ پہنچے تھے۔ انھوں نے جب نظام کو اس طرح محو عیش و عشرت دیکھا تو آتش حسد ان کے کانون سینہ میں موج زن ہوئی۔ انھوں نے بھی یہ خبر اس دیار میں مشتہر کر دی کہ نظام نہ سید ہے نہ شیخ، وہ راجپوت نومسلم ہے۔

سید عالی مقدار کے فرزندوں کو اپنی یہ ہتک برداشت نہ ہوئی۔ انھوں نے چاہا کہ نظام کو بغور تہ تیغ کریں اور اسے کیفر کردار کو پہنچائیں کہ اس نے ہماری بہن کو بہ فریب سیادت رشتۂ عقد میں باندھ لیا ہے۔ لیکن جناب عالیہ خاتون خانہ مانع ہوئی کہ جو ہوا، ہوا۔ کسی بھی آدم کی اولاد کو، جو ہمارا خویش بن چکا ہے، جان سے مار دینا بہت نامناسب ہے۔ ہاں یہ کرتے ہیں کہ دونوں میاں بی بی کو نظام کے وطن بھیج دیتے ہیں کہ انسان اپنے وطن ہی میں خوش رہتا ہے۔

پھر کچھ دن بعد یہی کیا گیا۔ نظام اور اس کی بی بی کو بصد تزک و احتشام ملک ہند کے لیے سوار کیا گیا۔ اثنائے راہ میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ نظام کی ثروت اور حشمت اور دبدبہ روز افزوں ہونے لگے، حتیٰ کہ اس کا توقیر و تمول دونوں دوش سلاطین سے دوش زد ہوئے۔ چار دانگ میں نظام کی امارت اور وجاہت کا غلغلہ پھیلا۔ جہاں جہاں سے اس کا قافلہ گزرتا، لوگ گمان کرتے کہ کوئی لشکر جرار کسی سلطان یا سپہ سالار کی قیادت میں یہاں سے گزر رہا ہے۔

قضائے کار اس قافلے کا گزر ایسے دیار سے ہوا جہاں رانگڑ کہ راجپوتوں کی ایک قوم ہیں، بہت حاوی تھے۔ رانگڑوں کے ایک سرکردہ شخص نے نظام کی شوکت و عظمت سے متاثر ہو کر اپنی ناکتخدا لڑکی اسے پیش کی۔ سیدۂ مخدرہ کی اجازت سے نظام نے وہ دختر قبول کر لی اور اس سے اولاد بسیار تولد ہوئی۔

لیکن بی سیدانی کی گود سونی کی سونی رہی۔ شیخ نظام کو اس بات کا بہت غم تھا۔ جب مدت مدید گزری اور اس کی امیدواری مبدل بہ یاس ہوئی تو بی سیدانی نے خود فرمایا کہ آپ کی نسل مجھ سے نہ جاری ہوگی، آپ ایک نکاح اور کریں اور اپنی ہی قوم میں کریں۔ بی سیدانی کے امتثال امر میں شیخ نظام نے ایک شیخ زادی نومسلم سے عقد مناکحت باندھا۔ ایک سال ہی گزرا تھا کہ شیخ زادی کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔ سب نے خوشیاں منائیں، لیکن شیخ زادی کے دماغ میں تکبر کا دود غلیظ پیچیدہ ہونے لگا۔ صاحب اولاد

ہونے کے زعم میں اس نے خود کو سیدانی بی بی پر راجح قرار دینا شروع کر دیا۔

جب شیخ زادی کا تبختر بہت بڑھا اور سیدانی بی بی نے اس کے ہاتھوں بہت توہین اٹھائی تو بدرجۂ مجبوری انھوں نے شیخ زادی کے لیے بد دعا کی۔ چند ہی دنوں میں شیخ زادی کا بیٹا مرا اور پھر اس نے بھی اپنی ودیعت حیات کو فرشتۂ قضا کے سپرد کر دیا۔ قریب کے دیار و امصار میں سیدانی بی بی کی کرامت کی دھاک بیٹھ گئی۔ شیخ نظام اور ان کا تمام عملہ اور متوسلین بی سیدانی سے ڈرتے اور ہر کام ان کے اشارۂ ابرو پر کرتے تھے۔

کچھ مدت بعد سیدانی بی بی نے نظام کو حکم دیا کہ اپنی ہی قوم میں ایک نکاح اور کرو۔ چناں چہ یہ نکاح ہوا اور مرضی الٰہی سے وہ زن بھی حاملہ ہوئی اور وقت مقررہ پر ولادت اولاد نرینہ سے اس کا حمل وضع ہوا۔ ماں نے بیٹے کو سیدانی کے قدموں میں لا ڈالا کہ آپ ہی اس کی ماں بھی ہیں اور باپ بھی، میں تو محض خدمت گزار ہوں۔ بی سیدانی نے نوزائیدہ کو گود میں لے کر ماں کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور کہا یہ میرا بیٹا ہے لیکن تم اس کی دایہ ہو۔ لو اسے دودھ پلاؤ، پالو، پوسو۔ پھر ایسا ہی ہوا۔

اب اس فرزند ارجمند پر بارہ پشتیں گزر چکیں اور اس کا سلسلہ مجھ مسکین پر منتہی ہوتا ہے۔ میں لاولد ہوں، میرے بھائیوں کے بھی کوئی اولاد نہیں۔ اس طرح اب اس دودمان کی بقا کا انحصار اس عاصی کے فرزندان طبیعت پر ہے۔ اللہ باقی من کل فانی ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

میں، شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی ثم دہلوی ثم لکھنوی، اپنے احوال اب و جد پر مبنی یہ تحریر اپنی اس کتاب موسوم بہ "مجمع الفوائد" میں لکھے جاتا ہوں کہ ازمنۂ آئندہ کے لوگ سبق حاصل کریں۔ اور یہ حالات میں اس لیے بھی لکھ رہا ہوں کہ لوگوں کو معلوم رہے کہ میں صاحب حسب و نسب ہوں، اس زمانے کے عوام کالانعام کی طرح مجہول الاصل نہیں ہوں۔

(۱۴)

"مجمع الفوائد" کہنے کو تو چھوٹی سی کتاب تھی، لیکن اس میں حضرت شیخ کے قدیمی خاندانی حالات (جن کی ترجمانی انھیں کی زبانی میں نے باب گزشتہ میں پیش کی) کے علاوہ ان کے ذاتی کوائف و عقائد کے بارے میں بھی بہت سی نئی اطلاعات تھیں۔ بعض باتیں مجھ پر ٹھیک سے واضح بھی نہ تھیں۔ چناں چہ جب میں یہ کتاب استانی صاحب کو واپس کرنے گیا تو یہ خیال رکھ کر کہ موقع ملے گا تو وہ باتیں پوچھ لوں گا۔

"مجمع الفوائد" میں تاریخ تصنیف درج نہ ہونے کی وجہ سے اس کی تاریخ کا اندازہ میں نے ۱۲۲۸/ ۱۲۲۹ (۱۸۱۲/ ۱۸۱۳، مرتب) لگایا تھا کہ حضرت شیخ نے اس میں لکھا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت انھیں لکھنؤ میں رہتے تیس برس ہو رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس کتاب میں جھورا بیگم کا ذکر

ان کے نام کے ساتھ نہ تھا، صرف یہ کہا گیا تھا کہ ایک ممتوعہ میرے ساتھ کوئی بارہ سال سے ہیں۔ ان سے بھی کوئی اولاد نہیں ہے۔

''اگر گراں خاطری نہ ہو تو ایک دو باتیں پوچھوں،'' میں نے عرض کیا۔ اس دن ان کا چہرہ بشاش تھا۔

''جی، لال میاں صاحب، میں آپ سے تو گراں خاطر کبھی نہ تھی۔ ضرور پوچھیے۔''

''کرم گستری اور خرد نوازی ہے آپ کی۔ میں پوچھنا یہ چاہتا تھا کہ 'مجمع الفوائد' کب مکمل ہوئی؟''

''صحیح تاریخ تو مجھے یاد نہیں، لیکن سال یہی ۱۲۲۸ کا شروع ہوا تھا، یہ ٹھیک سے دھیان میں ہے۔''

''اور اس وقت تک آپ حضرت شیخ کے حبالۂ عقد میں نہ آئی تھیں؟''

''نہیں۔ عقد جس سال ہوا وہ ۱۲۲۹ تھا مہینہ ربیع الاوّل، صحیح تاریخ پوچھیں تو یکم ربیع الاوّل، دوشنبہ کا دن ۲۱ رفروری، ۱۸۱۴، مرتب) تھا۔''

''تو آپ ان کے ساتھ کوئی پچیس برس تھیں۔''

''جی یہی سمجھ لیجیے، ایک دو مہینے کا فرق ہو سکتا ہے۔''

''افسوس کہ حضرت شیخ نے کتاب 'مجمع الفوائد' میں کوئی اضافہ نہ کیا، ورنہ شاید آپ کے ساتھ نکاح کا ذکر اس میں آ جاتا۔''

''آ بھی جاتا تو کیا تھا؟'' وہ ذرا افسردہ ہو کر بولیں، ''اصل چیز تو نکاح نامہ تھی۔ ورنہ گواہیاں تو شیخ ناسخ اور میاں حیدر علی کی تو موجود ہی تھیں۔''

''آپ کی بے دخلی کے وقت یہ لوگ کھڑے نہیں ہوئے اور ان لوگوں نے کوئی مقاومت نہ کی؟''

''انھیں وقت ہی کہاں ملا؟'' وہ اسی عالم محزونی میں بولیں۔ ''سوئم کی شیعہ مجالس، سنیوں کی قرآن خوانی، یہ سب اپنے طریقے اور وقت سے ہوئی۔ ہر انتظام میں شیخ صاحب، خواجہ صاحب، پنڈت بدیا دھر، خواجہ صاحب کے شاگرد دوست علی خلیل اور بہت سے لوگ آگے آگے تھے۔ جب تدفین اور پھر یہ رسوم انجام پا گئیں تو ذرا دم لینے کے لیے سب اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلے گئے۔ اگلے دن رات کو یہ شیاطین آ دھمکے کہ ابھی گھر خالی کرو۔'' وہ آنسو پونچھنے لگیں۔

''تو کیا آپ کو رات کی رات نکلنا پڑا؟''

''یہی سمجھیے۔'' وہ کچھ دیر تک سر جھکائے رہیں۔ ''شیخ صاحب کے آخری دنوں میں ایک بیوہ خادمہ رکھ لی گئی تھیں۔ میں اپنے بدن کے کپڑوں کے سوا ایک دو صاف جوڑوں کا بقچہ اور شیخ صاحب کے

کاغذات والا صندوقچہ لے کر انھیں بیوہ مہری کے گھر چلی گئی۔ اللہ بخشے بڑی نیک عورت تھی۔"

"افسوس، محلے والے سب دیکھا کیے؟"

"کوئی سامنے بھی نہ آیا، نہ ہی شیخ صاحب کے ان نام نہاد عزیز نے اگلے دن کچھ اور سامان لے جانے کی بات کی۔ بعد میں کپتان بیگم سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ تھانے کے داروغہ اور سپاہیوں کو پہلے ہی ہموار کر چکے تھے۔"

"ظفرالدولہ بہادر نے آپ کی کوئی مدد نہ کی؟"

"انھوں نے تفتیش کرائی تو معلوم ہوا کہ بے دخل کرنے والوں کی پشت پناہی میں بعض بڑے لوگ بھی ہیں، لہٰذا معاملہ آگے بڑھانے میں ان لوگوں کی بدنامی ہوگی۔ کپتان بیگم نے اگلے دن شیخ ناسخ کے ذریعہ یہ مکان مجھے تین سو روپے میں خریدوا دیا۔ قیمت میں نے مہر کے روپیوں سے ادا کی۔ بیگم صاحب نے اوپر سے بہت کچھ سلوک کیا، محمد راجا کو بھی انھیں نے میرے یہاں کام پر لگا یا۔ تب سے یہیں پڑی ہوں۔"

"کاش کہ حضرت شیخ نے کوئی تحریری یا زبانی ہی سہی، وصیت نامہ چھوڑا ہوتا۔ لیکن نکاح نامے کا نہ ہونا ان کی بہت بڑی بھول تھی۔" یہ آخری جملہ میرے منھ سے بالکل بے ارادہ نکل گیا۔

"بھول؟ اس میں بھول کی کیا بات ہے؟" وہ فوراً خفا ہو گئیں۔ "نکاح نامہ ہوتا بھی تو اتنے دن رکھا رہ جاتا؟ آخر کاغذ ہی تو تھا، بڑی بڑی چیزیں ادھر اُدھر ہو جاتی ہیں۔"

ان کی خفگی اپنی جگہ پر، لیکن میں اس بات پر پیچھے ہٹنے والا نہ تھا۔ آخر میرے یہاں قیمتی اشیا کا پشتینی کاروبار تھا۔ بے شک وہاں اعتبار اور پت بڑی چیز تھی، لیکن کاغذ وہاں بھی سب سے اہم تھا۔ حضرت شیخ کو نکاح نامہ ضرور ہی لکھنا تھا۔ جب میں کچھ دیر چپ رہا تو انھوں نے خود ہی بات چھیڑی:

"خیر، ہم آپ شیخ صاحب کے قول فعل پر حرف رکھنے والے کون ہوتے ہیں؟ سچی بات یہ ہے کہ میں نے بھی اصرار نہ کیا کہ اس میں مجھے ایک طرح کی بدشگونی نظر آتی تھی، گویا میں خدانخواستہ ان کے دنیا سے جانے کے بارے میں کوئی انتظام کر رہی ہوں۔ مہر تو انھوں نے اسی وقت دے ہی دیا تھا اور میں ان روپیوں کو آخر تک بینت کر رکھے رہی۔"

"اور وصیت نامہ..."

"آپ کو شاید شیخ صاحب کے مرض موت کے بارے میں کچھ خبر نہیں۔" وہ قطع کلام کر کے بڑے دکھ سے بولیں۔ اس بار ان کے لہجے میں اس قدر غم تھا کہ ان کے ہونٹ بالکل خشک اور چہرہ سنولایا ہوا لگ رہا تھا۔

"جی معافی چاہتا ہوں، اس طرف میرا خیال نہ گیا تھا۔"

"زندگی کے آخری ڈھائی تین مہینے وہ الفاظ بھول گئے تھے۔" اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو

رہی تھیں۔ "اپنے وقت کا سب سے بڑا شاعر اور اسے معمولی معمولی چیزوں کے لیے لفظ یاد نہ آئیں۔ یا اللہ یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

میں احمقوں کی طرح ان کا منھ تک رہا تھا۔ لفظ بھول گئے تھے؟ معمولی معمولی چیزوں کے لیے لفظ یاد نہ آئیں؟ یہ بیماری تھی یا کوئی آسیب؟

"وہ... وہ... پ... پڑھ تو لیتے ہوں گے، یا ش... شاید ل... لکھ... لیتے ہوں؟ یہ بیماری کیسی تھی؟ کیا اس کی کوئی دوا نہیں؟"

"حکیم، وید، سیانے، اوجھے، یہاں تک کہ ایک مُوا بے دین ناپاک خوار انگریز ڈاکٹر بھی آیا۔ کسی سے کچھ نہ ہوا۔ کوئی سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ بیماری ہے کہ بلا ہے، کیا ہے؟"

"میں ابھی سمجھا نہیں کہ لفظ بھولنے سے آپ کا کیا مطلب ہے، معافی چاہتا ہوں، آپ کے لیے یہ باتیں دکھ سے بھری ہوئی ہیں لیکن..."

"نہیں نہیں۔ جو ہو چکا جو کچھ میں بھوگ چکی، وہ میرے لیے آخرت کا سرمایہ ہے۔ اس مرض میں ان کی تیمارداری میرے لیے گونگے کے ڈراونے خواب کی طرح تھی۔ میں اندر ہی اندر سہتی تھی اور بیان نہ کر سکتی تھی۔ اللہ اسی بیماری کے صدقے ان کے اور میرے گناہ بخش دے۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں بلکہ آپ سے یہ باتیں کہہ کر کچھ دل ہی ہلکا ہوتا ہے۔" وہ اب آنسوؤں سے رو رہی تھیں۔ منھ سے ایسا لگتا تھا پرانے بخار سے اٹھی ہیں۔

"بھلا کوئی شخص اور وہ بھی ان جیسا طلیق اللسان شخص، لفظ کیسے کھو سکتا ہے؟ کیا وہ بالکل گونگے ہو گئے تھے؟"

"نہیں۔ کاش کہ گونگے ہی ہو جاتے۔ گونگے لوگ پڑھ لکھ تو سکتے ہیں۔ وہ تو حرف پہچانتے ہی نہ تھے۔ بولنے کا عالم یہ تھا کہ چیزوں کے اصل نام کی جگہ ان سے ملتی جلتی چیزوں کے نام سوچ سوچ کر وہ ٹوٹے پھوٹے جملوں میں اپنی بات ادا کرتے تھے۔ ادا کیا کرتے تھے، بس بات سمجھا دیتے تھے کہ انھیں یہ چاہیے ہے۔"

"یعنی وہ بولنے سے معذور نہ تھے؟"

"نہیں، لیکن وہ چیزوں کے نام بھول گئے تھے، مثلاً انھیں میرا نام یاد نہ تھا۔" وہ پھر رونے لگیں۔ "جب پہلی بار اس مرض کا دورہ پڑا تو وہ دیر تک مجھے اے... اے... اے مادیان... لال مادیان کہہ کر پکارتے رہے۔ میں کچھ بھی نہیں اور مجھے غصہ بھی آیا کہ یہ کون سا مذاق ہے۔ لیکن جب میں ان کے قریب گئی... جب میں ان کے قریب گئی تو... تو ڈر گئی۔"

بھورا بیگم کے بدن پر رعشہ طاری تھا۔ محمد راجا دوڑ کر خمیرۂ گاؤزبان عنبری کا مرتبان لایا۔ اس نے ان کا منھ کھول کر خمیرہ چٹانے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے منھ سختی سے بند کر رکھا تھا، جیسے دانت بھینچ

گئے ہوں۔ محمد راجا نے میری طرف ملامت بھری لیکن رحم طلب نظروں سے دیکھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ میں ان کا منھ کھول دوں تو وہ خمیرہ چٹائے۔ میں عجب گومگو میں تھا۔ پھر میں نے دل میں کہا، غیر عورت ہیں تو کیا، دادا استاد کی بیوی ہیں اور بیمار ہیں۔ میں نے بڑھ کر ایک ہاتھ سے ان کی ٹھوڑی مضبوط پکڑی اور دوسرے ہاتھ کی ایک انگلی کو دانتوں کے درمیان کسی طرح داخل کر کے ذرا سا منھ کھلوایا کہ محمد راجا نے خمیرے کی بڑی خوراک ان کے منھ اور زبان میں گویا ٹھونس دی اور اوپر سے دو چمچے پانی کے پلائے۔

بڑی دیر بعد ان کی طبیعت ٹھہری۔ پھر انھوں نے گفتگو یوں جاری کی گویا خاموش ہی نہ ہوئی ہوں۔

''ان کے چہرے پر سخت تشنج کے آثار تھے، آنکھیں ابلی آرہی تھیں۔ ماتھے پر ایک رگ نمایاں ہو کر پھڑک رہی تھی۔ ان کا سارا منھ سرخ ہو رہا تھا اور مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، جیسے کسی زبردست ذہنی اور جسمانی محنت میں مبتلا ہوں۔ مجھے دیکھ کر ان کا چہرہ ذرا سا ڈھیلا ہوا، ٹیڑھی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر آئی۔ پھر انھوں نے بارہ پندرہ مہینے کے بچے کی طرح کلکاری مارنے کی کوشش کی اور پھر انھوں نے آں... آں... کر کے بڑی مشکل یہ لفظ ادا کیے:

ت... تاپ.... آپ،... تام، توم... لال... ب... بائی... مادہ... مادیان... ب... بھائی... مادیان...

تاپ... آپ،... تام، توم... لال... ب... بھائی... مادہ... مادیان... ب... بائی... مادیان... بی... بی بی بی...

''میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہوگیا؟ انھیں ایک مہینے سے تیز بخار ضرور تھا، لیکن بات چیت میں اچھے خاصے تھے۔ سرسام وغیرہ انھیں کبھی نہ ہوا تھا۔ اور نہ یہ سرسام کی علامت ہی تھی۔ وہ تو پورے جوش سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کی عقل ساتھ نہ دے رہی تھی۔

میں گھبرا کر قرآن اٹھا لائی کہ انھیں قرآن کی ہوا دوں۔ قرآن کی ہوا دیتے میں انھوں نے میرا شانہ مضبوط پکڑا اور اسے تقریباً جھنجھوڑ کر مجھے ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا، گویا کہہ رہے ہوں، بات کو سمجھو تو سہی۔ اب اسے قرآن کا معجزہ کہیے یا مولا کا کرم کہ ان کی بات اچانک میری سمجھ میں آگئی۔ میرے دل میں کسی نے کہا کہ معاملہ یہ ہے کہ وہ لفظوں کو بھول گئے ہیں۔ جب وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو انھیں اصل لفظ نہیں، لیکن اس سے معنوی یا لفظی مشابہت والا لفظ اور وہ بھی بڑی مشکل سے، یاد آتا ہے اور وہ انھیں لفظوں پر اپنے اظہار کی دیوار کھڑی کر رہے ہیں۔''

''معاف کیجیے، جو گفتگو حضرت شیخ کی آپ نے سنائی وہ تو سراسر ہذیانی تھی۔''

انھیں پھر غصہ آگیا، ''تو پھر آپ میں اور ان نا سمجھ طبیبوں میں کوئی فرق نہیں۔ آپ ذرا سمجھیے تو سہی۔''

''جی، مجھے اپنی کم فہمی پر شرمندگی ہے۔ آپ وضاحت فرمائیں، میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''دیکھیے، وہ لفظ 'تم' ادا کرنا چاہتے ہیں، لیکن انھیں تم کی جگہ 'آپ' یاد آتا ہے اور وہ بھی ادھورا۔ لہٰذا وہ کبھی 'تاپ' کہتے ہیں، کبھی 'تام'۔ آخر انھیں 'توم' کہنا آجاتا ہے۔ پھر وہ میرا نام 'بھورا' لینا چاہتے ہیں، لیکن 'بھورا' انھیں بھول گیا ہے۔ انھیں یہ خیال ہے کہ میں عورت ہوں، لیکن یہ لفظ انھیں یاد نہیں، یہ ضرور یاد ہے کہ مرد نر ہے اور عورت مادہ۔ ان کا ذہن انھیں یہ بھی بتا رہا ہے کہ میرا نام کسی رنگ سے متعلق ہے۔ اس رنگ سے نزدیک ترین نام 'لال' ان کی سمجھ میں آتا ہے، شاید اس لیے بھی کہ میں اس وقت جاتی سردیوں کا ہلکا قرمزی دوشالہ اوڑھے ہوئے تھی۔''

بات میری سمجھ میں آنے لگی تھی، لیکن پوری طرح صاف نہ تھی۔ ''اور وہ... وہ... مادیان اور بائی، بھائی وغیرہ؟'' میں نے پوچھا۔

''عورت یا بیوی کی جگہ انھیں 'بائی، بھائی، بی' یاد آیا اور نر کے مقابل مادہ، اس کے اعتبار سے گھوڑی، جسے 'مادیان' کہتے ہیں۔'' وہ کچھ شرماتی ہوئی بولیں۔ اب انھیں خود پر کچھ قابو آچلا تھا۔

''گویا ان کی ہر بات کو سمجھنے کے بجائے اسے حل کرنا پڑتا تھا؟''

''جی ہاں اور اگر حل کرنے میں دیر ہو تو ان کی بے چارگی اور اپنی نااہلی، حلق میں گویا دو دو خنجر پیوست ہوجاتے تھے۔ لیکن کئی دن کی مشق اور ذہنی کاوش نے مجھے ان کے نئے مزاج کا تھوڑا سا مزاج شناس بھی بنا دیا تھا۔ اول تو میں کوشش کرتی کہ ہر ضروری چیز ان کے سامنے رکھی ہو، تاکہ وہ اس کی طرف اشارہ کر سکیں۔ اور ایسا اگر نہ ہو سکے تو میں خود یاد کر کے پوچھ لوں کہ انھیں کیا فلاں چیز درکار ہے؟''

''ان کے نئے مزاج کی مزاج شناس ہوجانے سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مثلاً یہی کہ اگر انھیں پانی مانگنا ہوتا تو کہتے 'تیل' کہ پانی سے نزدیک ترین لفظ ان کے ذہن میں یہی تھا۔ اگر کھانا مانگنا ہوتا تو کہتے 'چڑیا، دانہ، بوری'۔ یا یہ پورا جملہ کہنے کے لیے کہ مجھے بہت پیاس لگی ہے، پانی پلوادو، وہ عام طور پر اس طرح کے فقرے استعمال کرتے: 'دھوپ... سوکھ... نالی... ترخ... تیل... تیل... تر... ترخ... تیل... تیل... تیل... بھرو بھرو بھرو' اب میں آپ سے کیا بتاؤں ان کی زبان سے ایسی باتیں سن کر مجھے کیسا معلوم ہوتا۔

ان دنوں سب سے بڑا خوف مجھے اس بات کا رہتا کہ اگر میں ان کی بات نہ سمجھ پائی یا رات کسی وقت میری آنکھ لگ گئی اور انھیں کوئی بات کہنا ہوئی تو میں کیا کروں گی؟ اس خوف سے میں چوبیس گھنٹے میں شاید گھڑی دو گھڑی کسی مناسب موقعے سے جھپکی لے لیتی، ورنہ میرا سارا وقت ان کا منھ ہی تکتے گزرتا تھا۔''

ان پر پھر گریہ طاری ہوگیا۔ پھر وہ اپنے کو مجتمع کر کے بولیں، ''اب آپ مجھے وصیت کے

بارے میں آپ کا سوال کس قدر بے محل تھا؟''

بے محل تو نہ تھا، میں نے دل میں کہا۔ کیا ضرور کہ انسان آخری وقت ہی میں وصیت کرے۔ حضرت شیخ اگر ان کے حق میں وصیت کر جاتے تو انھیں اس طرح اپنے گھر سے نکلنا نہ پڑتا۔ لیکن ان سے بحث کا یارا مجھے کہاں تھا اور شاید کسی کو بھی نہ ہوتا۔

''واقعی آپ نے بڑی کڑی اٹھائی۔ مجھے یقین ہے حضرت شیخ آپ سے راضی گئے۔ اور جس بی بی کا شوہر اس سے راضی ہو اس کا خدا بھی اس سے راضی ہوگا، اس میں کچھ شک نہیں۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

میں کچھ دیر اور بیٹھا غیر متعلق باتیں کرتا رہا کہ شاید ان کا دل کچھ بہلے۔ اگلے ہفتے پھر حاضر ہونے کا وعدہ کر کے میں آداب بجا لایا اور راجا میاں کو انعام دے کر رخصت ہوا۔

(۱۵)

لیکن میں اگلے ہفتے وہاں نہ جا سکا، سوداگر کہنے کو کسی کا نوکر نہیں اور سچ پوچھو تو ادنیٰ ترین گاہک کا بھی وہ زر خرید ہوتا ہے۔ پھر اگلا ہفتہ اس سے بھی اگلے ہفتے میں بدلا، یہاں تک کہ دو مہینے گزر گئے۔ اس درمیان میں اپنے منشی یا دوسرے متوسلین کے ذریعہ ان کی خبر گیری کرتا رہا۔ ہر دس پندرہ دن پر میں انھیں کچھ زر نقد و جنس بھجوا دیا کرتا۔

اس سال بارشیں بہت سخت ہوئیں اور دیر تک رہیں۔ برسات کے تھمتے ہی کئی دن ایسی چلچلاتی دھوپ نکلی کہ بارش سے تر بوسیدہ مکانات بیٹھنے لگے یا ان کی دیواریں تڑخنے لگیں۔ کئی لوگ انہدام مکانات میں مرے۔ اس پر مرے پہ سو دُرّے کے مصداق بارشوں میں تر بتر پھلوں ترکاریوں اور کوٹھیوں میں بند غلے کی بوریوں کو گرم ہوا نے پھپھوند لگا کر متواتر سڑانا شروع کر دیا۔ شہر کی نالیاں، بدرو، بچے، بڑی بدروئیں پہلے ہی پانی اور غلاظت سے بھر رہی تھیں، اب جو انھیں دھوپ لگی تو وہاں کیڑے مکوڑوں اور سڑاندھ کا دور دورہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے شہر میں، خاص کر خاص کے اس طرف کے شہر میں ہیضے کی وبا پھیل گئی۔

روزانہ ہر محلے میں دو دو چار چار آدمی چھیجنے لگا۔ عورتوں اور بچوں پر اس مرض کا خاص حملہ تھا اور سب سے زیادہ مجبور یہی لوگ تھے۔ ان تک رسائی بھی آسان نہ تھی اور نہ ہی وہ اپنی بات باہر کے لوگوں کو ٹھیک سے بیان کر سکتے تھے۔ عورتیں باورچی خانوں، گھروں اور کارخانوں میں اچانک امتلا میں گرفتار ہوتیں، کام چھوڑنا ان کے لیے مشکل ہوتا۔ اکثر تو یہ سمجھ بھی نہ پاتیں کہ انھوں نے ہیضہ کیا ہے۔ بات جب تک سمجھ میں آتی، پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوتا۔ بچے باہر گلیوں باغوں میں کھیلتے کھیلتے متلی اور اسہال کی نقاہت سے ڈھیر ہو جاتے۔ انھیں فوراً گھر پہنچانے والا کوئی ملا تو ملا، ورنہ دیر تک گھٹ

گھسٹ کر رو رو کر گھر پہنچنے والے بچوں کے لیے تو موت ہی مقدر تھی۔

طبیب اور وید، چھو منتر کرنے والے پیر اور سیانے، وضیع و شریف، ہیضے نے کسی کے باب میں امتیاز نہ برتا۔ شہر میں معالج بھی گھٹنے لگے اور دوائیں بھی۔ اعلیٰ حضرت دین پناہ شاہ زمن غازی الدین حیدر بہادر نے کان پور، الہ آباد، سیتا پور سے دوائیں منگوا کر مفت تقسیم کرائیں۔ لیکن ہیضے کا علاج ہی کیا تھا؟ رفع تپ کے لیے جوشاندہ کی پڑیاں، پیٹ کا نظام درست کرنے کے لیے جوارش شاہی کی ڈبیاں۔ شاید ہی کسی کو ان سے نفع ہوا ہو۔ مرکبات جو گھر یا دواخانے میں تیار ہو سکتے تھے، ان کے اجزا نہ ملتے اور اگر ملتے بھی تو ان کے لیے قوت خرید سب میں نہ تھی۔ فرنگی معالجوں کے پاس بھی اس وبا کی کچھ دوا نہ تھی اور بہر حال اہل ہند کو انگریز ڈاکٹر کے پاس جانے میں سو طرح کے تکلف در پیش ہوتے تھے۔

ہیضہ پھیلنے کے تیسرے دن میں نے بھورا بیگم صاحب کی خبر گیری کو جانے کی ٹھانی۔ احتیاطاً کچھ دوائیں بھی ساتھ رکھ لیں۔ میں سوار ہونے ہی کو تھا کہ دو باتیں ایک ساتھ واقع ہوئیں۔ ایک تو یہ خبر تھی کہ میرے چاچا کو شاید ہیضہ لگ گیا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہوئی کہ بچارا محمد راجا ہانپتا کانپتا دوڑتا پہنچا کہ باجی بی کی طبیعت کل سے بہت خراب ہے۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے بھی ہیضہ کیا۔

میں نے پانچ سیر برف منگوا کر بگھی پر رکھی، جوارش شاہی کا ایک مرتبان اور جوشاندہ کی پڑیاں رکھوائیں۔ محمد راجا کے ہاتھ پر دس روپے رکھے کہ تو گاڑی میں بیٹھ یہ سامان لے چل، میں ابھی آیا۔ اس بیچ برف کچل کر پوٹلی بنا بنا کر استانی بیگم کے منھ میں رکھتے جائیو۔ جوارش شاہی اور جوشاندہ کی ایک خوراک بھی پلا دیجو اور اگر تپ زیادہ ہو تو برف کے پانی میں رومال بھگو کر ہلکے ہلکے بدن پونچھتے رہیو۔

بچارہ بارہ تیرہ برس کی جان، اس سے اتنے کام اور اتنی ذی دماغی ممکن بھی شاید نہ تھی۔ لیکن پردے کا معاملہ درمیان تھا، ورنہ میرا سائیس بھی مدد کر سکتا تھا۔ میں نے محمد راجا کو بگھی پر رخصت کیا اور دوسرے بوچے پر بیٹھ کر چاچا کے گھر کو روانہ ہوا۔ خیال تھا کہ انھیں دیکھ کر استانی صاحب کی طرف جلد نکل لوں گا۔ لیکن وہاں طبقۂ اناث پر گریہ کا عالم تھا۔ لڑکوں میں بھی سب کے ہاتھ پیر پھولے جا رہے تھے۔ بارے چاچا جی کی طبیعت کچھ بہت بگڑی نہ تھی، تپ کی شدت کم ہو چلی تھی اور استفراغ بھی ہلکے ہو رہے تھے۔ پھر بھی، میں ان کے پاس ایک ڈیڑھ پہر بیٹھا رہا کہ سب کو اطمینان ہو لے تو چلوں۔

شام ہوتے ہوتے میں گندہ نالہ پہنچا۔ راستے میں حکیم منن صاحب کو بضد ہو کر گاڑی میں بٹھوا لایا تھا۔ بھورا بیگم کا دروازہ کھلتے ہی اسہال اور پسینے کی بدبو اور استفراغی مادے کی تیز کھٹی مہک کے بھبکے میری ناک تک پہنچے۔ خدا کا شکر ہے کہ ناک پر رومال رکھنے کی بدتوفیقی نہ مجھے ہوئی نہ حکیم صاحب کو۔ کمرے کے اندر بھورا بیگم بے سدھ پڑی تھیں۔ ان کے کپڑے اور پلنگ کے بھی کپڑے سب آلودہ تھے۔

محمد راجا نے رو کر کہا کہ دوپہر کے بعد سے اٹھنے کا نام نہیں لیا ہے، بدن میں جان نہیں رہ

گئی۔ میں نے آپ کی دی ہوئی دوائیاں سب کھلائیں لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ ان کے کپڑے کیسے بدلوں، بستر کیسے صاف کروں؟ یہ تو میرے پکارنے پر بولتی بھی نہیں ہیں۔

حکیم صاحب نے نبض دیکھی، ان کے سر کی خفیف سی حرکت سے میں نے سمجھا کہ نبض بہت کم زور ہے۔ بھورا بیگم کا چہرہ بالکل زرد تھا، آنکھیں بند تھیں۔ میں نے بار بار پکارا تو انھوں نے آنکھیں نیم وا کیں۔ خود کو مردوں کے سامنے اس حال میں دیکھ کر ان کے منھ سے سسکی سی نکلی اور انھوں نے ہاتھوں سے اپنا منھ ڈھانپنے کی کوشش کی۔ میں نے دیکھا کہ ایک ہی ڈیڑھ دن کی بیماری میں ان کی کلائی میں چوڑی ڈھیلی ہو گئی تھی۔ ناخن بالکل سفید تھے۔ حکیم صاحب نے آنکھوں کا نچلا پپوٹا اٹھا کر دیکھا تو حدقۂ چشم کی رگوں میں خون کی ایک چھینٹ بھی نہ تھی، آنکھیں سفید ہو چلی تھیں، ان کی کریلیوں جیسی سبزی اور چمک ماند پڑ چکی تھی۔ ہر چند کہ ان کا گریبان پسینے اور شاید پانی سے تر تھا، لیکن ان کے بستر سے تپ کی گرم لہریں سی اٹھتی محسوس ہوتی تھیں، جیسے گرم مرطوب زمین سے بخارات اُٹھتے ہیں۔

حکیم صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے کہ بھورا بیگم کو زور کا استفراغ ہوا، پھر ان کے شکم میں شدید پیچش اٹھی، وہ تقریباً دوہری ہو کر کراہیں، اسہال پھر شروع ہو گیا۔

ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ حکیم صاحب نے جلد جلد حسبِ ذیل نسخہ لکھا: گل قند یاقوتی شش تولہ، سکنجبین سادہ چار تولہ، عرق گلاب ہشت تولہ، عرق بادیان یک پاؤ، باہم حل کردہ حسبِ ضرورت فرو برند۔ نسخہ انھوں نے میرے سائیس کو دیا کہ جلد میرے مطب جا کر بندھوا لا۔ پھر بہت مدھم آواز میں انھوں نے مجھ سے کہا، ''یہ نسخہ بعض حالات میں مجرب ہے۔ لیکن...''

''کوشش آپ بہر حال کریں۔ باقی مالک کے ہاتھ ہے۔ ویسے امید تو مجھے بھی نہیں۔''

''دوا کی خوراک ایک بڑا چمچہ بھر ہے۔ میں ایک خوراک خود پلا کر جاؤں گا۔ اس کے بعد ہر سوا گھڑی پر یہ خوراک دی جائے گی رات کو حال کہلا دیجیے گا۔''

''بہتر ہے،'' میں نے کہا۔ پھر میں نے اپنے سائیس کو بھیج کر محلے سے ایک سقنی اور ایک حلال خوری بلوائی۔ دونوں کے ہاتھ پر میں نے پچیس پچیس روپے رکھے کہ گھر کی دھلائی کرو، بیگم صاحب کا بستر بدلو، ان کے کپڑے تبدیل کراؤ۔

جب تک خدمت کرو گی پچیس روپے روز پاؤ گی، لیکن دل لگا کر کام کرنا۔ یہ رقم ان لوگوں کے لیے بارہ بارہ مہینے کی کمائی کے برابر تھی، دونوں بہ خوشی تیار ہو گئیں۔

تھوڑی دیر میں نسخہ بھی تیار ہو کر آ گیا۔ حکیم صاحب ایک خوراک پلا کر میری بگھی پر رخصت ہوئے۔ میں مریضہ اور گھر کی دھلائی صفائی اور تبدیلِ لباس کے انتظار میں اپنے بوچے میں ٹھہرا رہا۔ کوئی ایک ساعت بھر کے بعد سقنی نے باہر آ کر کہا کہ بی بی جی آپ کو بلا رہی ہیں۔

شاید ٹھنڈے پانی سے صفائی دھلائی اور تبدیلِ لباس و بستر کی وجہ سے یا شاید دوا کے اثر سے

یا شاید دونوں کی مجموعی تاثیر کی بنا پر ان کی حالت کچھ سنبھلی ہوئی لگتی تھی، اگرچہ منھ کی زردی ویسی ہی تھی۔ ان کی آنکھیں خفیف سی کھلی ہوئی تھیں۔ میں اندر پہنچا تو ان کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی، لرزتا ہوا ہاتھ وہ سلام کے لیے بہ دقت ماتھے تک لے گئیں۔ پھر انھوں نے پلنگ پر اپنے پہلو میں رکھے ہوئے صندوقچے کی طرف اشارہ کیا اور محمد راجا کو آنکھ کے اشارے سے پاس بلا کر التجا بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے دھیمی لیکن صاف آواز میں ٹھہر ٹھہر کر کہا کہ انھیں میرا مطلب سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو:

''میں آپ کا عندیہ سمجھ گیا بھورا بیگم صاحب۔ حضرت شیخ کے کاغذات جو اس صندوقچے میں ہیں، میں انھیں اپنی تحویل میں لے لوں گا اور محمد راجا کے لیے مناسب بندوبست بھی کردوں گا۔'' میری آنکھ چھلکنے لگی، میں نے بہ مشکل اپنی آواز قابو میں کی اور کہا، ''لیکن ابھی عجلت کیا ہے، ان شاء اللہ آپ اچھی ہو جائیں گی۔''

ان کی بھی آنکھیں بہ نکلیں۔ انھوں نے کچھ اس انداز سے مجھے دیکھا گویا میری طفل تسلیوں کے لیے متشکر، لیکن حقیقتِ حال سے باخبر ہیں۔ ''یہ... یہ... ابھی، اسی وقت...'' انھوں نے صندوقچے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''بہتر ہے، آپ جو ارشاد فرمائیں۔ میں اسے ابھی اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے محمد راجا کے سر پر ہاتھ پھیرا، دونوں عورتوں کو چوکس رہنے اور پوری خدمت کرتے رہنے کی تاکید کی۔

''میں اپنا سائیس یہاں چھوڑے جاتا ہوں۔ کوئی بھی بات ہو، کوئی ضرورت ہو، مجھے فوراً خبر کرنا۔ میں اپنے چاچا کی بیماری سے مجبور ہوں ورنہ رات یہیں رہتا۔''

یہ کہہ اور بھورا بیگم کو سلام کر، صندوقچہ اٹھا، میں نے بوچے میں بیٹھ کر چاچا کے گھر کی راہ لی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب بھورا بیگم کو زندہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ اور یہی ہوا۔ میں رات دو ڈھائی بجے چاچا کے یہاں سے واپس آیا، ابھی سونے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ محمد راجا ان کی سناونی لے کر روتا ہوا آیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میرے دل سے دعا نکلی کہ داتا کرتار انھیں وہاں بھی حضرت شیخ سے واصل رکھے:

مصحفیؔ اک جسم کا پردہ جہاں یکسو ہوا
یہ سمجھ تو درمیاں سے اٹھ گئے حائل تمام

صبح ہوتے ہی میں نے شیخ ناسخ، خواجہ حیدر علی صاحب، دیوان درگا پرشاد مضطرب، پنڈت بدیا دھر، میر مستحسن خلیق اور حضرت شیخ کے دوسرے قریبی احباب اور شاگردوں کو خبر بھجوائی۔ میر مستحسن خلیق

اور منشی مظفر علی صاحب اسیر کے گھر کی مستورات نے میت کے غسل، تجہیز اور تکفین کا انتظام کیا۔ درگاہ حضرت عباس کے قریب والے قبرستان میں حضرت شیخ کی پائنتی مدفون ہوئیں۔

سوئم کی مردانہ مجلس کے بعد میں نے حاضرین کو مطلع کیا کہ مرحومہ نے محمد راجا کی سرپرستی کا ذمہ مجھے سونپا تھا۔ اگر صاحبان اقرب کی رائے ہو تو میں ان کا مکان اور دیگر اسباب دنیاوی فروخت کر کے جو رقم حاصل ہو اس میں کچھ اور ملا کر محمد راجا کو اس کے وطن واپس بھجوادوں۔ سب نے اس تجویز پر احسنت کہا۔

وبا کے ذرا فرو ہوتے ہی میں نے بھورا بیگم کا مکان اور اثاث البیت ساڑھے تین سو روپے میں فروخت کرا دیے۔ وبا کی تباہیوں کے باعث املاک کی قیمتیں بہت گر گئی تھیں۔ میں نے ڈیڑھ سو روپے ڈال کر پانسو کی تھیلی محمد راجے کے ہاتھ میں دی۔ مرزا پور جانے والے ایک قافلے کا معتبر نگہبان دیکھ کر پورا زاد وسفر اس کے حوالے کیا اور محمد راجا کو بہت کچھ نصیحت وصیت کے ساتھ رخصت کیا۔ بھرائی ہوئی آواز اور بھیگی ہوئی آنکھ کے ساتھ محمد راجا نے لکھنؤ کو خیر باد کہا۔ مجھے حضرت شیخ کے قصیدے کا مطلع یاد آیا اور یہی راجا میاں کو میری آخری نصیحت تھی:

دم میں دم ہے جب تلک لازم ہے ہم کو پیچ وتاب
موج سے پہلو تہی ٹوٹے پہ کرتا ہے حباب

(۱۶)

زلزلے کے بارے میں کہتے ہیں کہ ایک صدمے کے چند لمحے بعد لوٹ کر آتا ہے اور دوسری بار اس کا صدمہ پہلے سے کچھ زیادہ تباہ کن ہوتا ہے۔ اس سال لکھنؤ میں ہیضے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ پچھلی وبا کو فرو ہوئے دس ہی بارہ دن ہوئے ہوں گے کہ دوسری نے آدابا۔ اس بار اس کی ضرب پہلے سے سخت تر اور زیادہ دور تک تھی۔

درباری مل وفا کے چچا تین چار دن میں ٹھیک ہو گئے تھے اور بھورا بیگم کی موت کا غم بھی اب ہلکا ہو چلا تھا۔ وفا نے بھورا بیگم سے اپنی گفتگوؤں پر مبنی جو یادداشتیں تیار کی تھیں، اب وہ انھیں مرتب کر کے کتابی شکل دینے کے لیے ذہن کو تیار کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا اپنے دادا استاد کے حالات کا ایک مبسوط اور معتبر تذکرہ لکھے، ایسا تذکرہ جس میں ان کے بارے میں تمام ضروری معلومات مثلاً شاگردوں کی فہرست، ان کے مجمل حالات اور بعض نمایاں شاگردوں کے کلام پر اصلاحوں کے نمونے بھی موجود ہوں۔ اپنے حضرت شیخ کی خانگی زندگی اور گھریلو حالات کا سب ماجرا لکھنا تو اس کے نزدیک مناسب نہ تھا، لیکن ''مجمع الفوائد'' میں مندرج حالات کو مزید تفصیل اور تحقیق کے بعد اپنے تذکرے میں شامل کرنے کا خیال اسے ضرور تھا۔

درباری مل وفا نے مصحفی کی اصلاحیں اکٹھا کرنا شروع کر دی تھیں۔ اس کام میں اسے اپنے حضرت شیخ کے بڑے شاگردوں، مثلاً خواجہ حیدر علی آتش اور منشی مظفر علی اسیر سے تو مدد ملی ہی، لیکن بعض دوسرے شاگردوں، مثلاً کنور سین مضطر، درگا پرشاد مضطرب، شاہ الفت حسین فریاد وغیرہ سے بھی مدد ملی۔

شیخ ناسخ کا مشورہ تھا کہ بھورا بیگم کے بھی کچھ خاص خاص حالات اس کتاب میں درج کیے جائیں۔ شیخ صاحب کا فرمانا تھا کہ اگرچہ مستوراتِ خانہ کی بابت کچھ زیادہ طول بیانی ایسی کتاب کے لیے ناروا ہے جس کے بارے میں توقع ہو کہ اسے باہر کے لوگ اور دور دور کے لوگ بھی پڑھیں گے، لیکن شیخ مصحفی کی ذات اور شاعرانہ کمالات دونوں کی تشکیل میں بھورا بیگم کا بھی حصہ تھا بلکہ معتد بہ حصہ تھا۔ لہذا شیخ صاحب مُصر تھے کہ بھورا بیگم کا حال بھی اس کتاب میں اگر مطولاً نہیں تو موجزاً ضرور لکھا جائے۔

کئی دن کے حیص بیص کے بعد درباری مل وفا نے شیخ ناسخ کے مشورے پر پورا پورا عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر چند شیخ ناسخ نے تا عمر عورتوں سے کوئی سروکار نہ رکھا تھا، لیکن طبقہ نسا کے مزاج و منہاج، ان کی باطنی اور نفسیاتی کیفیات، ان کی پسند ناپسند اور خوب ناخوب کے بارے میں شیخ صاحب کو فطری اور وہبی فراست تھی۔ ہر چند کہ شیخ صاحب کشتی، بنوٹ اور پنجہ کشی جیسے مردانہ فنون میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ان کا منڈا ہوا سر، نمایاں نوک دار مونچھیں اور بھاری گول سیاہ فام چہرہ ان کی پہلوانی اور مردانہ صفات پر دال تھے، لیکن درباری مل کو ان میں نسائیت کے بھی انداز نظر آتے تھے۔ درباری مل کا یہ مفروضہ غلط بھی ہو سکتا تھا، لیکن بہر حال شیخ ناسخ کو یہ فن تو خوب ہی آتا تھا کہ وہ جس بات کو لوگوں سے منوانا چاہتے تھے، اسے منوا کر چھوڑتے تھے۔

ان باتوں کے پیش نظر درباری مل وفا کو بھورا بیگم کا احوال اپنی کتاب میں شامل کیے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ اور یہ تو تھا ہی کہ وہ خود بھورا بیگم سے بے حد متاثر تھا۔ ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے اسے بھورا بیگم میں بے حد دل کشی محسوس ہوتی تھی۔ اور یہ لگاؤ اس درجہ تھا کہ اسے خوف تھا لطیف بود حکایت دراز تر گفتم کے مصداق وہ اپنے بیان میں بھورا بیگم کو غیر معمولی اہمیت نہ دے بیٹھے۔

بھورا بیگم سے اسی قلبی لگاؤ کی بنا پر درباری مل نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ شیخ مصحفی کے وصال کے بعد ان کے مکان سے بھورا بیگم کے غیر منصفانہ اور سنگ دلانہ اخراج کا بھی پورا پورا حال رقم کیا جائے، خواہ اس میں ان با اثر حضرات کی بدنامی ہی کیوں نہ ہو جو مظفر الدولہ کے بقول غاصبوں کی پشت پناہی پر تھے۔ اس بات کے ثبوت میں کہ بھورا بیگم اور شیخ مصحفی میں رشتۂ مناکحت باقاعدہ منعقد ہوا تھا، درباری مل وفا نے خواجہ آتش اور شیخ ناسخ سے دستخطی تحریر لے لی تھی کہ وہ نکاح کے وقت بہ طور گواہان موجود تھے اور شیخ مصحفی نے مہر بھی اسی وقت ادا کر دیا تھا۔

بھورا بیگم کے صندوقچے میں جو کاغذات وفا کو ملے تھے ان میں شیخ کا آٹھواں دیوان اردو اور ایک مبسوط دیوان قصائد بھی تھے۔ آٹھواں دیوان تو مرتب و مدون تھا، صرف اس کی نقلیں کرانے اور شائع

کرنے کی دیر تھی (اسی صندوقچے میں ایک تحریر ایسی بھی تھی جس میں اس بات کا اشارہ ملتا تھا کہ بھورا بیگم نے اس دیوان کی اشاعت کے لیے مہدی علی خان سے درخواست کی تھی، لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی)۔ دیوانِ قصائد مرتب و مدوّن نہ تھا اور وفاؔ کا ارادہ تھا کہ ان دونوں کو بہ یک وقت منظرِ عام پر لایا جائے۔

دیوانِ قصائد سے الگ ایک چھوٹا سا بستہ ان ہجویات کا تھا جو شیخ مصحفی اور ان کے شاگردوں نے سید انشا والے جھگڑے کے دوران لکھے تھے۔ اس بستے سے الگ ایک طومار تھا جو لپیٹ کر اور مضبوط باندھ کر رکھا گیا تھا۔ وفاؔ نے اسے کھولا تو معلوم ہوا شیخ مصحفی کے مشہور تیز مزاج شاگرد نور الاسلام منتظر کا تصنیف کردہ قصیدہ ہے۔ سرسری قیاس کے مطابق اس میں آٹھ سو سے کچھ اوپر شعر تھے۔ یہ قصیدہ میرزا رفیع سوداؔ کے جواب میں اور ہجویہ انداز میں کہا گیا تھا۔

درباری مل وفاؔ نے بہت سوچ کر فیصلہ کیا کہ سید انشا والے قضیۂ نا مرضیہ سے متعلق تمام منظومات کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے کہ ان کو شائع کرنے میں کسی کی منفعت نہ تھی۔ رہا نور الاسلام منتظر کا ہجویہ قصیدہ، تو منتظر نے عرصہ ہوا (۱۸۰۱/۱۸۰۲ کے آس پاس، مرتب) دنیائے فانی سے انتقال کر کے دار البقا کی راہ لی تھی۔ ان کے اخلاف کوئی نہ تھے یا اگر تھے تو وفاؔ کو ان سے واقفیت نہ تھی۔ لہٰذا اس کی نظر میں اس قصیدے کا اب کوئی وارث نہ تھا اور نہ وہ کچھ ایسا بلند رتبہ کلام تھا کہ اسے دنیا کے سامنے لایا جائے۔ بدیں وجوہ اس نے یہ قصیدہ بھی اسی صندوقچے میں علیٰ حالہٖ رہنے دیا۔

درباری مل کا ارادہ تھا کہ وبا کا زور فرو ہوتے ہی حضرت شیخ کے دواوین کی کتابت شروع کرادوں گا۔ اس غرض سے اس نے اس وقت کے مشہور خوش نویس حافظ محمد ابراہیم اور ان کے شاگردِ رشید منشی منسا رام کشمیری سے بات بھی کر لی تھی۔ یہ طے پایا تھا کہ تحریر تو زیادہ تر منشی منسا رام کی ہوگی، لیکن رباعیاں، قطعے اور تمام عنوانات حافظ صاحب لکھیں گے۔ علاوہ بریں، جتنے اوراق مطلا کیے جائیں گے، وہ بھی حافظ صاحب قبلہ کے ذمہ ہوں گے۔

لیکن ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال بلکہ ما در چہ خیالیم و بلا در چہ خیال کے مصداق، پچھلی آفت کے فرو ہونے پر ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ وہی وبا پھر پھوٹ پڑی۔ شہر کے بہت سے لوگ جو جان کے خوف سے اناؤ، موہان، کانپور، سنڈیلہ، سیتاپور، دریاباد، ردولی اور ہردوئی وغیرہ کو چلے گئے تھے، واپس آکر عجب مخمصے میں پڑے کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کا مضمون سامنے تھا۔ واپس آنے والوں میں بہتوں کو وبا نے سب سے پہلے دبوچا۔ اس بار حکام شاہی بھی وبا کا تدارک کرنے میں اس درجہ مستعد نہ تھے کہ گزشتہ کئی دن کی محنت نے انھیں کسل مند کر دیا تھا اور وبا کے اچانک عود کر آنے کے لیے وہ نہ ذہنی طور پر تیار تھے اور تدبیر و معالجہ کے لیے نہ ان کے پاس سامان ہی تھا۔

بھورا بیگم کی موت کے انیس دن بعد لالہ درباری مل وفاؔ نے ہیضہ کیا۔ رات کے تین بجے اسے استفراغ شروع ہوئے، صبح ہونے کے پہلے اس کی حالت غیر ہوگئی۔ دن کے ڈھائی تین کا عمل ہوگا

جب اس نے آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیں۔ دادا استاد کے کلام کو محفوظ اور شائع کرنے، خود شاعر بننے اور نام وری حاصل کرنے، اس کے یہ سارے منصوبے اور ارادے اس کے ساتھ جل کر خاک میں مل گئے:

جوہر بینش من در تہ زنگار بماند
آں کہ آئینۂ من ساخت نہ پرداخت دریغ

درباری مل وفا کی ایک روغنی تصویر اس کے چچا کے دیوان خانے میں کئی سال تک آویزاں رہی۔ ۱۸۵۸ء کی لوٹ میں یہ تصویر ایک انگریز سپاہی کے ہاتھ لگی۔ اس نے اسے ایک قدر دان فوجی افسر کے ہاتھ پندرہ روپے میں بیچ دیا۔ پھر ایک دو اور مالکوں کے ہاتھ سے گزرتی ہوئی یہ تصویر لندن کے مشہور وکٹوریہ اور البرٹ میوزیم (Victoria and Albert Museum) کی زینت بنی اور آج بھی وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ میوزیم کی وضاحتی فہرست کا اقتباس جو تصویر کے پاس اطلاعی کارڈ پر درج ہے، اس میں لکھا ہے:

A Hindoo Businessman of Lucknow, by Muhammad A'zam, circa 1825,30"x24", oil on canvas, British-Indian style.

مصور کے نام، تصویر کی تقطیع اور طرزِ مصوری کے بارے میں جو اطلاعات ہیں وہ درست ہیں۔ انگریزی طرز کی شبیہ سازی اور کینوس پر روغنی رنگوں کے استعمال کا رواج لکھنؤ میں عہدِ آصف الدولہ ہی سے ہو گیا تھا، لیکن ہندوستانی مصوروں نے کینوس اور روغنی رنگوں کا استعمال غازی الدین حیدر کے بادشاہ بننے کے بعد شروع کیا۔ ہندوستانی مصوروں کو اس طرف راغب کرنے میں غازی الدین حیدر کا شوق بھی شامل رہا ہوگا۔ بہر حال، چند ہی برسوں میں ہندوستانی مصوروں نے مغربی (یا یوں کہیں کہ برطانوی) محاورۂ شبیہ سازی میں اس قدر مہارت حاصل کر لی کہ ان کا عمل اور اس وقت کے مشہور برطانوی شبیہ سازوں، مثلاً زافنی (Zoffany) ولیم ڈینیل (William Daniel) اور ٹامس ڈینیل (Thomas Daniel)، رابرٹ ہیوم (Robert Hume) وغیرہ کے عمل سے کسی طرح کم نہ تھا۔

ہندوستان میں مغربی مصوری کی مشہور مورخ ملڈرڈ آرچر (Mildred Archer) نے مندرجہ بالا انگریز مصوروں کو "کمپنی مصور" کا نام دیا ہے، لیکن یہ بات دو طرح سے غلط ہے۔ اول تو یہ کہ یہ مصور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم یا ماتحت نہ تھے۔ دوسری بات یہ کہ ان کی بنائی ہوئی شبیہوں کا تعلق ہندوستانی مصوری کے اس "اسکول" سے نہ تھا جسے "کمپنی اسکول" کا نام دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کمپنی اسکول میں شبیہ سازی نہیں بلکہ بیانیہ مصوری اور واقعاتی مصوری پر زور دیا جاتا تھا۔

بہر حال، محمد اعظم کی شبیہوں پر زافنی اور ہیوم کے طرز کا اثر نمایاں ہے، لیکن اس معنی میں نہیں

کہ اعظم نے بس ان کی نقل کردی ہے۔ زافنی اور ہیوم کے طرز میں خاص بات یہ تھی کہ وہ صاحب شبیہ کی داخلی شخصیت پر زور نہ دیتے تھے، لیکن اسے پورے رسومیاتی وقار و متانت کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ ان کی شبیہوں میں صاحب شبیہ کے چہرے پر طمانیت کی ایسی فضا ہوتی تھی جس سے پتا لگتا تھا کہ صاحب شبیہ اپنے ماحول میں پوری طرح مستحکم اور قائم ہے۔ علاوہ بریں ان لوگوں نے مخمل، ساٹن، پوت، زربفت وغیرہ کپڑوں کی مصوری میں بھی درک حاصل کیا تھا۔

محمد اعظم نے درباری مل وفا کی جو تصویر بنائی اس میں یہ صفات نمایاں ہیں۔ وی اینڈ اے میوزیم کے فہرست ساز نے یہ سمجھا کہ تصویر چوں کہ لکھنؤ کے ایک تاجر کے گھر سے آئی تھی، اس لیے صاحب شبیہ کوئی لکھنوی تاجر ہی ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ وفا نے یہ تصویر دہلوی روپ میں کھنچوائی تھی اور اس تصویر سے اس کا مقصد اپنے علمی اور شاعرانہ شغف اور اپنی دہلوی اصل کو قائم کرنا تھا۔

محمد اعظم کی تصویروں میں کپڑے، بالخصوص مخمل، ململ، اور ساٹن کو یوں بیان کیا جاتا ہے گویا دیکھنے والا انھیں چھوکر محسوس کر رہا ہے۔ چناں چہ یہاں بھی درباری مل وفا نارنجی مخمل کی دہلوی قبا زیب تن کیے ہوئے ہے۔ اس میں اور مسلمانوں کی قبا میں صرف یہ فرق ہے کہ وفا کی قبا کے تکلے بائیں طرف ہیں اور اس کا گھیر دائیں سے بائیں آتا ہے۔ سر پر سیاہ مخمل کی دہلوی چوگوشیہ ٹوپی، جس میں جدت یہ ہے کہ پھندنے کو ذرا اونچا کر کے اس میں جیغے کی طرز پر ایک بہت بڑا سنہرا پکھراج نصب کیا گیا ہے۔ درباری مل وفا دو زانو بیٹھا ہوا ہے اور اس طرح بیٹھنے میں اس کی قبا کا دامن ذرا کھل گیا ہے، لہٰذا قبا کے نیچے ہلکے سبز ململ کے کرتے کا دامن اور اس کے اوپر آسمانی مخمل کے نیم تن کا ذرا سا کنارہ صاف نظر آتا ہے۔

صاحب تصویر کا رنگ کھلتا ہوا سانولا، ذیل دبلا لیکن کشیدہ قامت ہے۔ چہرہ ڈاڑھی سے بے نیاز ہے، متوسط گھنے پن کی ذرا چوڑی مونچھیں سیدھی ناک کے نیچے نمایاں ہیں۔ آنکھیں سیاہ، پلکیں لمبی اور چہرے کا مجموعی تاثر متین تفکر کا ہے۔

وفا کی پشت پر زربفت مڑھا ہوا گاؤ تکیہ ہے، اس کے پیچھے ایک کھڑکی کھلتی ہے جس میں سے پائیں باغ کے کچھ درخت اور باغ میں کھلتے ہوئے گلابوں کے پودے صاف نظر آتے ہیں۔ ان کے پیچھے دور پس منظر میں تاک کی دار بست ہے جس پر انگوروں کے خوشے دھندلے دکھائی دیتے ہیں۔ وفا کے سامنے خط لکھنے کا چوکی نما قلم دان ٹھوس چاندی کا اور اس کے داہنے ہاتھ میں سیہہ کے کانٹے کا قلم اور بائیں ہاتھ میں ایک کتاب ہے۔ کتاب کے سرورق پر ''عمدۃ الرسائل در احوال و فضائل رشک سحبان وائل استاد الشعرا شیخ غلام ہمدانی مصحفی دہلوی ثم لکھنوی'' صاف پڑھا جاتا ہے۔

تجارتی سامان یا سوداگری کی طرف اشارہ کرنے والی کوئی شے تصویر میں نہیں، ہاں ایک بھاری سی کنجی درباری مل وفا کے دائیں ہاتھ پر ضرور رکھی ہے۔ ممکن ہے اس کنجی کی وجہ سے بھی صاحبانِ

میوزیم کو صاحبِ شبیہ پر سوداگر ہونے کا التباس ہوا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کنجی کلیدِ گنجِ حکمت کی علامت ہے، کلیدِ گنجِ سوداگری کی نہیں:

ہر چند کہ رنگ و بوے زیباست مرا
چوں لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نہ شد کہ در طرب خانۂ خاک
نقاشِ ازل بہر چہ آراست مرا

☆

عرضِ مرتب

مندرجہ بالا بیانیہ درباری مل وفا کی یادداشتوں اور اس کے خاندانی کاغذات اور خود مصحفی کے کلامِ نظم و نثر کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے، لیکن مصحفی کے بارے میں کوئی تحریر نورالحسن نقوی کے کام سے استفادہ کیے بغیر معتبر نہیں ہو سکتی، چناں چہ پروفیسر نورالحسن نقوی کی تحریریں بھی پیشِ نظر رہی ہیں۔ یہ بات مصنف و مرتب کے اظہارِ تشکر کے طور پر عرض کی جا رہی ہے۔

☆☆☆

سفرنامہ

مسعود اشعر

میڈونا سے ملاقات

وینا کا بجو یا وینا ہوٹل دیکھ کر ہمیں پیرس کا وہ پینسیون (pension) یاد آ گیا جس میں ہم کئی سال پہلے ٹھہرے تھے۔ فرانس کا وہ سفر ہم نے اپنے خرچ پر کیا تھا اس لیے سستے سے سستے ہوٹل کی تلاش میں ہم لاطینی کوارٹرز کے ایک پینسیون پہنچ گئے تھے۔ اگست کا مہینہ تھا جو پیرس میں بلا کی گرمی اور حبس کا مہینہ ہوتا ہے۔ ہمیں ایک تنگ سی کوٹھری ملی تھی۔ اتنی تنگ کہ ایک پتلے سے پلنگ، ایک واش بیسن اور ایک بجے (bidet) کے بعد کوٹھری ختم ہو جاتی تھی۔ کوٹھری میں ہوا کا کوئی انتظام نہیں تھا، گرمی اور حبس کے مارے اگرچہ ہم اپنے پیدائش والے کپڑوں میں سوئے تھے لیکن رات بھر پسینے میں نہاتے رہے تھے اور یہ انتظار کرتے رہے تھے کہ کب ہمارا دم گھٹتا ہے اور کب ہماری روح قفسِ عنصری سے پرواز کرتی ہے۔

یہاں ہمیں ہنری ملر یاد آ گیا۔ بجے کا ذکر اپنی زندگی میں سب سے پہلے ہم نے ہنری ملر کے ناول Tropic of Cancer میں پڑھا تھا۔ وہ پچاس کی دہائی تھی۔ اس وقت ہمارے جاننے والوں میں بہت کم لوگ ہی ایسے ہوں گے جو جانتے ہوں کہ بجے کیا ہوتا ہے۔ ہنری ملر نے ایک ہندوستانی کے بارے میں لکھا ہے کہ ان صاحب نے بجے میں اپنی حاجت رفع کر دی تھی اور ان کی حاجت بجے کے پانی میں تیرتی نظر آ رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ صاحب بھی بجے کا استعمال نہیں جانتے ہوں گے۔ خیر ہم جب پیرس گئے تو اس کا استعمال جانتے تھے اس لیے ہم ہنری ملر جیسے کسی ناول نگار کا کردار بننے سے بچ گئے۔

وینا ہوٹل کا یہ کمرہ لکڑی کی چرچُوں کرتی تنگ سی سیڑھیوں پر چڑھ کر آتا ہے۔ کمرہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں مشکل سے ہی دو بستر لگے ہیں۔ دیوار کے ساتھ کوتاہ قد الماریاں یا کبڈ ہیں، وہیں پر ٹیلی وژن رکھا ہے۔ لیکن واش بیسن کمرے کے اندر ہی ہے۔ اور غسل خانہ اتنا چھوٹا کہ اگر ہمارے پاکی پسند چچا صاحب ہوتے تو ایک منٹ کو وہاں نہ ٹھہرتے کہ لاکھ احتیاط کے باوجود اِدھر کے چھینٹے اُدھر ضرور پڑ جاتے اور ان کی نماز کے کپڑے کبھی پاک نہ رہ پاتے۔

ہمیں پیرس کا پینسیون اس کے مالک اور مالک کے بیٹے کی وجہ سے پسند آیا تھا جو پورے

فرانس کے لیے ہمارے گائیڈ بن گئے تھے، تو بالی کے اس ہوٹل کا یہ کمرہ اس کی بالکنی اور پروفیسر شریف المجاہد کی وجہ سے پسند آیا۔

بزرگ سچ کہتے ہیں کہ کسی شخص کو سفر میں ہی پہچانا جا سکتا ہے۔ پروفیسر شریف المجاہد نہایت ہی عالم فاضل انسان ہیں۔ تحریک آزادی، تحریک پاکستان اور خود پاکستان کی تاریخ کے معتبر اور مستند مؤرخ ہیں۔ پاکستان اور پاکستان سے باہر کئی ملکوں کی یونی ورسٹیوں میں پڑھاتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ انڈونیشیا کے پڑوسی ملک ملائیشیا میں بھی کئی سال پڑھایا ہے۔ اتنے پڑھے لکھے آدمیوں سے ہمیں بہت ڈر لگتا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ یہ شخص انتہائی متین، نہایت بُردبار اور سنگینی کی حد تک سنجیدہ بلکہ بور ہوگا۔ جب ہمیں پتا چلا کہ ہم اور پروفیسر صاحب ایک ہی کمرے میں ٹھہریں گے تو ہماری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ کہاں ہم اُول جلول انسان کہ نہ اپنی چیزیں سلیقے سے رکھنے کی پروا، نہ سونے جاگنے کا کوئی وقت اور کہاں دنیا بھر میں پہچانے جانے والا پروفیسر۔ وہ یقیناً انتہائی منظم انسان ہوں گے، ہم نے سوچا۔ اور پہلی شام یا یوں کہیے کہ پہلی رات اس کا تھوڑا سا تجربہ بھی ہوا، جس سے ہم اور بھی ڈر گئے۔

ہم بالی کے وقت کے مطابق ساڑھے چار بجے سہ پہر دین پسار پہنچے تھے۔ بالی کا سمندر دیکھنے کا ایسا شوق تھا کہ کمرے میں سامان رکھتے ہی ساحل کی طرف بھاگے تھے۔ پھر ساری شام ایک لمحے کے لیے بھی تھکن کا احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن رات گئے ہری بھری بیلوں کے منڈوے تلے کھانا کھا کر ہوٹل پہنچے تو لگا کہ تھکن کے مارے سارا بدن پھوڑا بنا ہوا ہے۔ جلدی سے غسل خانے میں گھس گئے۔ عمر بھر کا تجربہ ہے کہ تھکن کا بہترین علاج اچھا اور لمبا غسل ہے۔ نہا کے نکلے تو پروفیسر صاحب اپنا سامان سلیقے سے رکھ چکے تھے اور ہمارے بکھرے ہوئے کپڑوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہم جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے لگے۔

''دیکھیے!'' پروفیسر صاحب شاید ہمیں بہت زیادہ پریشان دیکھ کر ہم سے مخاطب ہوئے۔ ''بہت زیادہ تھکن کے بعد بھی آرام سے نیند نہیں آتی۔ رات بھر بے چینی رہتی ہے۔''

''جی۔'' ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے تھے۔

''ایسا کیجیے! ایک ویلیم کھا لیجے۔ اچھی نیند آجائے گی۔''

ہم نہ کہتے تھے کہ پروفیسر صاحب بہت منظم اور منتظم انسان ہوں گے۔ اب ہمیں بہت لیے دیے رہنا ہوگا، ہم نے دل میں کہا۔ لیکن پروفیسر صاحب سے نہایت لجاجت کے ساتھ کہا، ''ہمارے پاس تو نہیں ہے ویلیم۔''

''یہ لیجے۔ ایک گولی کھا لیجے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے اپنے پاؤچ سے ایک گولی نکالی اور ہمیں دے دی۔ اس کے ساتھ ہی مشورہ دیا کہ سفر میں ایسی تمام ضروری چیزیں ساتھ رکھا کرو۔

ہم نے ان کا مشورہ پلّو میں باندھا اور ویلیم کی پوری گولی نگل لی۔ پھر تو ایسے سوئے کہ صبح کی

ہی خبر لی۔ ہماری صبح ساڑھے پانچ پونے چھ بجے ہو جاتی ہے، یہ عادت کم بخت ایسی پڑی ہے کہ پوری گولی کھا جانے کے باوجود اپنے وقت پر آنکھ کھل گئی۔

پروفیسر صاحب گہری نیند میں تھے۔ ہم چپکے سے اٹھے، آہستہ سے کمرے کا پچھلا دروازہ کھولا اور دبے پاؤں باہر بالکنی پر نکل گئے۔ باہر نکلتے ہی ہم نے اس کمرے اور اس ہوٹل کی ساری خرابیاں معاف کر دیں۔ آج کل کے تین چار اور پانچ ستاروں والے ہوٹلوں میں بالکنی بنانے کا رواج ہی ختم ہو گیا ہے۔ وہ بند کمروں سے باہر نکلنے کی اجازت ہی نہیں دیتے کہ باہر نکلو تو راہ داری میں اور راہ داری سے لابی میں۔ لیکن یہاں کمرے کے پیچھے باقاعدہ بالکنی ہے۔ آپ اسے چھجا یا شہ نشین کہہ لیجیے۔ اس شہ نشین پر بید کی دو آرام کرسیاں بلکہ ڈیک چیئرز اور بید کی ہی ایک میز پڑی ہے کہ آپ آرام سے یہاں بیٹھ کر سامنے کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ اور سامنے سوئمنگ پول ہے۔ سامنے نہیں بالکل آپ کے نیچے۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ بائیں جانب سائبان والا ڈائننگ ہال اور دائیں طرف والا برآمدہ بھی خالی پڑا تھا۔

ہم کرسی پر پسر گئے اور لمبی لمبی اور گہری گہری سانسیں لینا شروع کر دیں۔ ہاں، ہم بالی میں ہیں اور یہ بالی کی تر و تازہ ہوا ہے۔ ہم نے کہاں سوچا تھا کہ ہمیں کبھی بالی آنے کا موقع بھی ملے گا۔

یہ مارچ کی صبح تھی سورج ابھی ابھی نکلا تھا۔ سامنے تالاب پر اور تالاب کے ساتھ چٹان سے جھانکتی مورتی پر اور ارد گرد سارے آنگن پر ابھی فاختئی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ پیڑوں میں چھپی چڑیاں اپنی آفاقی زبان میں چہچہا رہی تھیں۔ ہم نے ادھر اُدھر دیکھا کہ شاید کوئی چڑیا نظر آ جائے اور ہم اسے پہچان لیں۔ لیکن وہ سب گھنے پیڑوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ آواز سب کی جانی پہچانی تھی۔ خوشی ہوئی کہ ان آوازوں میں کوّے کی آواز نہیں تھی۔ وہ سمع خراش اور دل نگار آواز جو اپنے شہر کے اپنے گھر میں ہر صبح منہ اندھیرے ہمیں جگاتی ہے۔ اور ہر صبح ہم اپنے پڑوسی کی شان میں دو تین قصیدے پڑھتے ہیں جس نے اپنی دیوار کے باہر ایک نہیں پورے چار سفیدے کے پیڑ لگا دیے ہیں۔ وہ خود تو زیادہ سرسبز علاقے (یہ ترجمہ ہے greener pasture کا) کی طرف جا چکے ہیں لیکن ہمارے لیے کوّے اور چیلیں چھوڑ گئے ہیں۔ سفیدے اب آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور ان کی پھنگیوں پر چیلیں، کوّے اور کبھی کبھی گدھ بھی بسیرا کرتے ہیں۔ کوّے منہ اندھیرے اپنی کائیں کائیں سے ہماری نیند حرام کرتے ہیں اور چیلیں گرمیوں کی ٹیکا ٹیک دوپہری میں جب اپنی چیخیاتی آواز میں لمبی تان لگاتی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے ساتھ ہمارے پلنگ کو بھی چیرتی چلی جا رہی ہیں۔ پتا نہیں بزرگوں نے کیسے کہہ دیا ہے کہ چیل چیخ نہیں مارتی بلکہ وہ کہتی ہے کنتی السجل للکتب۔ اگر وہ کہتی بھی ہے تو کم سے کم اس آواز میں اسے نہیں کہنا چاہیے۔

شکر ہے بالی میں کوّے نام کا کوئی پرندہ نہیں ہے۔ بالی میں ہی نہیں ہم انڈونیشیا کے جس شہر بھی گئے وہاں ہمیں کوّے دکھائی نہیں دیے۔ ہم آرام کرسی پر بیٹھے سامنے پیڑوں کی شاخوں میں چھپے

پرندے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ویلیم نے پھر اثر دکھانا شروع کر دیا۔ نیند کا ایسا جھونکا آیا کہ سر سامنے میز سے جا ٹکرایا۔ آنکھیں بند کیے کیے کمرے میں واپس گئے اور بستر پر ڈھیر ہو گئے۔

اب آنکھ کھلی تو دس بجے تھے۔ پروفیسر صاحب خدا جانے کب اٹھے تھے، کب تیار ہوئے تھے اور کب باہر چلے گئے تھے۔ ہمارے تو فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلا۔ اب ہم بھی جلدی جلدی نہائے دھوئے، تیار ہوئے اور نیچے پہنچے۔ لیکن ناشتا ندارد۔ ناشتے کے لیے جو بوفے سجایا جاتا ہے وہ بڑھایا جا چکا تھا۔

''ناشتا تو نو بجے ختم ہو جاتا ہے۔'' سوئمنگ پول کے ساتھ سائبان کے نیچے پھیلے ریستوراں کے بیرے نے اطلاع دی۔

''پھر کیا ہوگا؟''

''اب تو آرڈر پر ناشتا بنے گا۔''

''تو بھائی آرڈر پر ہی لے آؤ۔''

آرڈر دیا اور یہاں سے وہاں تک پڑی خالی میز کرسیوں میں سے ایک ایسی میز کا انتخاب کر کے اس کرسی پر بیٹھ گئے جس کا رخ تالاب کی طرف تھا۔ سوچا کوئی اور ساتھی نہیں ہے تو تالاب میں تیرنے اور نہانے والوں کو ہی ساتھی بنالیا جائے۔ سات آٹھ تیرنے والے اور تیرنے والیاں غوطے لگا رہی تھیں۔ تالاب کے پرلی طرف دیوار کے ساتھ پیڑ کے نیچے ایک اونچی سی میز یا بستر پڑا تھا، ایسا بستر جس پر ڈاکٹر اپنے مریض کو لٹاتے ہیں۔ اس پر ایک صاحب صرف جانگیہ پہنے اوندھے لیٹے تھے اور ایک عورت ان کی مالش کر رہی تھی۔ ہم نے غور سے دیکھا کہ شاید یہ وہی عورت ہو جس نے ہمیں مالش کی دعوت دی تھی لیکن ہم اسے پہچان نہ سکے کہ وہ عورتیں سب ایک جیسی ہی ہوتی ہیں، ادھر تالاب کی منڈیروں کے ساتھ کئی ننگے بدن اوندھے پڑے دھوپ سینک رہے تھے۔

''لابسٹر۔'' ہمارے کانوں میں آواز آئی۔

لیکن یہ آواز بالی کے اس ہوٹل میں اور اس تالاب کے کنارے سے نہیں آئی تھی۔ یہ آواز آئی تھی کولمبو کے اس ہوٹل سے جو ٹھیک ساحل پر ہے۔ اور جہاں پام کے پیڑوں کے نیچے بیٹھے ہم کافی پی رہے تھے۔ بالی کے ہوٹل میں تالاب کے کنارے بیٹھے بیٹھے ہم کولمبو پہنچ گئے تھے اور اب چھپر نما سائبانوں کے نیچے ریت پر بچھی کرسیوں پر بیٹھے زہرا سے آنکھ بچا کر ان لال لال جسموں کو دیکھ رہے تھے جو سری لنکا کی جھلسا دینے والی تیز دھوپ میں یہاں سے وہاں تک اوندھے پڑے تھے۔

''تم نے زندہ لابسٹر دیکھے ہیں نا۔ ایسے ہی لال لال ہوتے ہیں جیسے یہ ننگے جسم سامنے پڑے ہیں۔''

ہم نے زہرا سے کہا تھا اور انھوں نے ہمیں ڈانٹ دیا تھا۔ ''بری بات۔''

اور پھر یوں ہوا تھا کہ ہمارے نزدیک ہی ایک مادہ لابسٹر نے اوندھے پڑے پڑے ہی

دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف اٹھائے تھے اور پیٹھ پر بندھے انگیہ کے بند کھولنا شروع کر دیے تھے۔ مگر لگ رہا تھا کہ اس حالت میں لیٹے لیٹے بند کھولنے میں اسے خاصی دقت پیش آ رہی ہے۔ ہم نے سوچا یہی وقت ہے شولری دکھانے کا۔ پھر زہرا کی طرف ڈرتے ڈرتے دیکھا اور نہایت لجاجت سے کہا، ''بے چاری بہت پریشان لگ رہی ہے۔ کیا خیال ہے میں جا کر نہ کھول دوں۔''

''جا کر تو دیکھو۔ ایسی لات مارے گی کہ بتیا کھانے کے سارے دانت ٹوٹ جائیں گے۔'' ہمیں جواب ملا تھا۔

ایسے مذاق بیویوں کے ساتھ ہی کیے جا سکتے ہیں، لیکن ایک عمر کے بعد۔

اتنے میں وہ مادہ لابسٹر اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اب اس کی سنولائی ہوئی پیٹھ پر (جو خدا جانے کتنی تیز دھوپوں اور کتنی ننگی آنکھوں کی تمازت میں سنولائی ہوگی اور وہ بھی کتنی سنولا سکتی تھی) دائیں سے بائیں ایک سفید پٹی نظر آ رہی تھی۔ ''اگر یہ پٹی بھی سنولا گئی تب بھی چتکبری تو وہ رہے گی۔ آخر کہاں کہاں کے بند کھولے گی۔'' ہم نے کہا اور زہرا نے ایسا گھورا کہ ہم دھپ ہو گئے۔

خیر، وہ کولمبو تھا اور یہ بالی کا ہوٹل جو ساحل پر نہیں تھا۔ اور بھلا تیرنے والے تالاب میں یا تالاب کے گرد کتنے لابسٹر نظر آ سکتے ہیں۔ لیکن ایکا ایک ہی یوں لگا جیسے تالاب کے نیلے پانی سے ایک شعلۂ جوالہ نکلا۔ شعلہ یا آرزو لکھنوی کا آگ کا لوکا یا پنجابی کی سلگتے کی لاٹ۔

''ارے۔ یہ کہاں سے آ گئی؟'' بے ساختہ ہمارے منھ سے نکلا۔ ''یہ انگرڈ برگمن یہاں کیسے؟''

ہمارے سامنے تالاب کے نیلے پانی سے جو یونانی مجسمہ برآمد ہوا تھا وہ ہوبہو انگرڈ برگمن کا جسم تھا۔ ہمیں یاد تھا کہ انگرڈ کو مرے کئی سال ہو چکے ہیں لیکن اس وقت ہم یہ سب بھول چکے تھے اور حیرت سے اس مجسمے کو دیکھ رہے تھے۔ ہمارے اوپر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔

''ہات تیرے کی۔ یہ کیا ہوا۔؟'' اب وہ خاتون مڑ گئی تھی اور اس کا چہرہ ہمارے سامنے تھا۔ لیجیے سارا طلسم ہی ٹوٹ گیا۔ ان خاتون کا جسم تو اسکینڈے نیویا والا تھا لیکن چہرہ خالص آسٹریلیا والا۔ وہی جرائم پیشہ خاندانوں والا چہرہ جو آسٹریلیا اور شاید نیوزی لینڈ میں پایا جاتا ہے۔

اب آپ پوچھیں گے کہ تمھیں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے چہروں کا کیا پتا۔ تم نیوزی لینڈ یا آسٹریلیا گئے ہو؟ درست فرمایا آپ نے، ہم نہیں گئے ان ملکوں میں لیکن پیرس سے لندن یا یوں کہیے کہ کالے سے ڈوَر جاتے ہوئے ریل گاڑی اور انگلش چینل کی فیری (اس وقت تک رودبار انگلستان میں سرنگ نہیں بنی تھی اور اس سرنگ سے ریل گاڑیاں چلنا شروع نہیں ہوئی تھیں) میں آسٹریلیا کی عورتوں سے ہمارا واسطہ پڑ چکا تھا۔ یہ نہ پوچھیے کہ ان کے اور ہمارے درمیان کیسا رن پڑا تھا۔ یہاں بس اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ جب ان عورتوں کو معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی ہیں تو وہ یہودی بن گئی تھیں اور ہمارے ساتھ جلی کٹی باتیں شروع کر دی تھیں۔ ہم بھی جان گئے تھے کہ وہ محض ہمیں چڑانے کے لیے یہودن بن

گئی ہیں... اس لیے ہم بھی ان کی کج بحثی کا جواب کج بحثی سے ہی دیتے رہے تھے۔

لیکن اب ہمیں قاہرہ یاد آرہا ہے۔ قاہرہ اور قاہرہ کا وہ ٹیکسی ڈرائیور جو ہمیں شارع جمہوریہ سے الجیزہ اور اہرام لے گیا تھا۔ وہ ہمیں ہندوستانی سمجھ رہا تھا۔ ہم نے بتایا کہ ہم ہندوستانی نہیں پاکستانی ہیں تو فوراً بولا، ''میں اسرائیلی ہوں۔'' وہ سادات کی حکومت کا نیا نیا زمانہ تھا اور مصر اسرائیل سے دوستی کر رہا تھا۔ لیکن پاکستانی ابھی تک ناصر اور اسرائیل دشمنی کو یاد کر رہے تھے۔ ہم نے اس سے تو مذاق میں کہا تھا کہ بڑی خوشی ہوئی ایک یہودی سے مل کر، لیکن سوچا تھا کہ دیکھ لو، دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے پاکستانیوں کی اندھی محبت ہمیں کہاں کہاں خوار نہیں کرتی۔

اب قاہرہ یاد آہی گیا ہے تو وہاں کا ایک اور عبرت ناک واقعہ بھی سن لیجیے۔ قاہرہ میں ہم ٹھہرے تو ایک سستے سے ہوٹل میں تھے کہ وہاں بھی اپنے خرچے پر گئے تھے اور اسی لیے رات بھر غسل خانے کے نل سے ٹپکتے پانی کی آواز سنتے رہتے تھے، لیکن سیر کرنے بڑے بڑے ہوٹلوں میں چلے جاتے تھے۔ ایک دن ایسے ہی سیر کرتے ہوئے ہم شیرٹن چلے گئے۔ یہ ہوٹل دریائے نیل کے پل پر ہے کہ دریا اس کے ساتھ بہتا ہے۔ ہوٹل کے اندر سے گھوم گھام کے نکلے تو سامنے دریا اور اس کا پل تھا۔ سوچا کیوں نہ اس کی تصویر کھینچ لی جائے۔ پل کے قریب جا کر ایک اچھا سا منظر تلاش کیا اور کیمرہ سیدھا کر کے بٹن دبانے لگے۔ ابھی بٹن پر انگلی رکھی ہی تھی کہ ایک زور کی آواز آئی جیسے ہمیں کوئی ڈانٹ رہا ہو۔ مڑ کے دیکھا تو ایک باوردی آدمی ہاتھ سے اشارے کرتا ہماری طرف دوڑا چلا آرہا تھا۔ قریب آکر بولا، یہاں تصویر لینا منع ہے۔ ہم نے فوراً اس کی بات مان لی اور کیمرہ بند کر کے واپس مڑے۔ ہوٹل کے قریب پہنچے تو سوٹ بوٹ میں ملبوس ایک معتبر شخص ہماری طرف ہنستا ہوا ایسے بڑھا جیسے معذرت کرنے آرہا ہو کہ اس سپاہی سے غلطی ہوگئی ہے۔ بہت ہی پُرجوش سلام کیا اور ہم سے پوچھا سپاہی کیا کہہ رہا تھا؟ ہم نے بتایا تو کہنے لگا، کوئی بات نہیں، بازار میں اس کی بہت سی تصویریں مل جائیں گی۔ آپ کہاں جارہے ہیں؟ ہم نے کہا یہاں سے ہم جامع محمد علی (جسے مصر والے گاما محمد علی کہتے ہیں کہ وہ ج کو گ بولتے ہیں) جانا چاہتے ہیں کہ وہ تاریخی مسجد ہے اور ہم اسے دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ کہنے لگا، میں بھی ادھر ہی جارہا ہوں آپ میرے ساتھ چلیے۔ فوراً اپنی گاڑی نکال کر لایا اور ہم روانہ ہوگئے۔

ہم حیران و پریشاں تھے کہ ان صاحب کو ہمارے ساتھ اتنی محبت یا اتنی ہمدردی کیوں ہوگئی ہے؟ کیا مصر کے لوگ اتنے مہمان نواز اور اتنے ملنسار ہوتے ہیں کہ جان نہ پہچان اور خدمت پر آمادہ؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں کچھ زیادہ دور جانا نہیں پڑا۔ گاڑی چلی تو ہم نے اخلاقاً ان کا شکریہ ادا کیا اور معلوم کیا کہ آپ کا شغل کیا ہے؟ فرمایا کاروبار کرتے ہیں۔ ہندوستان کے ساتھ خاصی بڑی تجارت ہے اور اس کاروبار کو وہ اور بھی بڑھانا چاہتے ہیں۔ اب انھوں نے ہم سے پوچھا کہ ہم کیا کرتے ہیں؟ ہم نے انھیں اپنا پیشہ بتایا اور ساتھ میں یہ بھی بتا دیا کہ ہم آپ کے شہر میں فلاں ہوٹل میں

ٹھہرے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ انھیں اچانک ایک کام یاد آگیا۔ فوراً گاڑی روکی اور بولے، ''مجھے تو ضروری کام سے جانا ہے وہ سامنے جو سڑک ہے وہ بسوں کے اڈے کی طرف جاتی ہے۔ وہاں سے جامع محمد علی کے لیے بس مل جائے گی۔'' ہم فوراً گاڑی سے اتر گئے۔ ہمیں ان صاحب پر غصہ بالکل نہیں آیا۔ غصہ آیا اپنے آپ پر کہ ہماری شکل اکثر لوگوں کو دھوکا دیتی ہے۔ وہ صاحب سمجھے تھے کہ ہم کوئی بزنس ٹائی کون ہیں اور شیرٹن میں ٹھہرے ہیں۔ ہاں، اگر ہمارے پاکستانی بھائی ناراض نہ ہوں تو ایک بات اور بھی بتا دیں۔ وہ صاحب ہندوستان کے ساتھ کاروبار بڑھانے کے خواہش مند تھے۔ ہم نے ان سے سوال کیا تھا کہ وہ پاکستان کے ساتھ تجارت کیوں نہیں کرتے تو انھوں اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا اور آئیں بائیں شائیں کر دی تھی۔ اور پھر تو انھیں ضروری کام ہی یاد آگیا تھا۔

انگرڈ برگمن نما خاتون کے سلسلے میں ابھی ابھی ہمیں کچھ اور یاد آیا۔ ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ اگر کوئی چیز اتنی پسند آنے لگے کہ اس کے ساتھ الجھ جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے تو اس کے اندر خامیاں تلاش کرنا شروع کر دو کہ ان کانٹوں میں الجھ گئے تو پھر کہاں اپنا دامن چھڑاتے پھرو گے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی خامی تو ہر انسان میں ہوتی ہے۔ تو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس انگرڈ برگمن نما خاتون کو ہمارے تحت الشعور نے جرائم پیشہ بنا دیا ہوگا۔

ابھی ہم انگرڈ برگمن اور اس لمبی چوڑی خاتون کا موازنہ کر ہی رہے تھے کہ سامنے سے ہماری کراماً کاتبین آتی دکھائی دیں۔ ہم نے فوراً ادھر سے نظر ہٹالی۔

ناشتا کرتے دوپہر تو ہو ہی چکی تھی۔ طے ہوا کہ کیوں نہ آج ہی کتا سے باہر جزیرۂ بالی کی سیر کر لی جائے۔ آج کا دن خالی ہے کل سے تو کانفرنس شروع ہو جائے گی۔ سیاحت والے کاؤنٹر پر پہنچے اور سیاحوں کو لبھانے اور للچانے والے رنگ برنگے کتابچے دیکھے تو پتا چلا کہ ہر جگہ کی سیر کرانے والا پروگرام صبح سویرے شروع ہوتا ہے۔ ہم نے بہت دیر کر دی ہے۔

''ہم کیوں گائیڈ ٹور کے محتاج بنیں۔ کتابچے ہمارے پاس ہیں ٹیکسی پکڑتے ہیں اور چلتے ہیں۔'' یہ ڈاکٹر ذرے تھیں جو ہمیشہ صحیح رہنمائی کرتی ہیں۔ اسی کاؤنٹر والے کے ذریعے ٹیکسی کی گئی اور ہم روانہ ہو گئے بیساکھی دیکھنے۔

لیجیے، ہم پروفیسر شریف الجاہد کو تو بھول ہی گئے۔ چلے تھے ہم پروفیسر صاحب کے بارے میں بتانے اور یہ ثابت کرنے کہ انسان کی صحیح پہچان سفر میں ہی ہوتی ہے، اور بھانت بھانت کی عورتوں کی باتیں شروع کر دیں۔ ہم نے اوپر ان کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس سے آپ سمجھے ہوں گے کہ پروفیسر صاحب واقعی بہت خشک اور یبوست زدہ انسان ہوں گے۔ بیساکھی کی سیر کرانے سے پہلے ہم یہ تاثر دور کرنا چاہتے ہیں بلکہ ہم تو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میڈونا سے ہماری اصل ملاقات پروفیسر صاحب نے ہی کرائی۔ میڈونا کے گانوں اور اس کی فلموں کے ذریعے اس سے ہماری ملاقات تو پہلے سے تھی مگر

پروفیسر صاحب نے جو ملاقات کرائی اس کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔

یہ دوسری رات کی بات ہے۔ ہم گھوم گھام کر کمرے میں واپس آئے تو پروفیسر صاحب غسل خانے میں تھے۔ ہم نے ٹیلی وژن کھولا اور ایم ٹی وی پر گانے سننا بلکہ دیکھنا شروع کر دیے۔ ان دنوں اس چینل پر سنگر آف دامنتھ کے سلسلے میں میڈونا کے گانے دکھائے جا رہے تھے۔ پورے ایک گھنٹے کا پروگرام ہوتا تھا۔ انھی دنوں میڈونا کا البم Frozen Ray of Light بھی آیا تھا۔ ہم اسے پاکستان سے دیکھتے چلے آ رہے تھے۔

ساری دنیا کی طرح ہم بھی اس پر فریفتہ تھے۔ ہماری فریفتگی کی وجہ یہ تھی اور یہ ہے کہ اس گانے کی دُھن میں مشرق اور مغرب کو جس طرح ملایا گیا ہے اور میڈونا نے اوم شانتی کا جاپ کرتے ہوئے اپنے رقص میں انکش مدرا اور ابھے مدرا سے جو کام لیا ہے اس نے ہمیں دیوانہ بنا رکھا تھا۔ پھر سیاہ لباس، ''سیاہ کوّے''، سیاہ کتے اور دور تک پھیلا ہوا سیاہ اور خاکی لینڈ اسکیپ ایک ایسی خواب ناک کیفیت پیدا کرتا ہے کہ دیکھنے اور سننے والے اپنے آپ کو اس دنیا سے اوپر ہواؤں میں کہیں اور ہی تیرتا ہوا پاتے ہیں۔ یہ گانا پاکستان سے ہمارے ساتھ چلا آ رہا تھا۔

بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ ہندوستان میں کچھ لوگوں نے اس گانے پر احتجاج کیا ہے اور کہا ہے کہ میڈونا نے ہمارے دھارمک سنسکاروں کی توہین کی ہے تو ہمیں بہت افسوس ہوا۔ کیا ہتھیلی پر ''اوم'' لکھ دینے سے مذہب کی توہین ہو جاتی ہے؟ دیکھیے تو تنگ نظری اب کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ اور مغرب والوں کا حال یہ ہے کہ وہ ذرا ذرا سی چیز میں روحانیت تلاش کر رہے ہیں۔ میڈونا کے بارے میں تو کہا جا رہا ہے کہ کلیسا میں جو روحانی ترفع غائب ہو گیا تھا اسے میڈونا نے پھر کھود نکالا ہے۔ اور دوسرے ہزاریے اور بیسویں صدی کے اختتام یا fin-de-siecle کی اصل روح کو تو میڈونا ہی پیش کر رہی ہے۔ ایک خاتون نے تو اس پر پوری کتاب لکھ دی ہے۔ اسی طرح ایلوس پریسلی کے ناچ گانے میں بھی روحانیت تلاش کر لی گئی ہے۔

ہم میڈونا میں ایسے کھوئے ہوئے تھے کہ ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ پروفیسر صاحب غسل خانے سے کب نکلے اور کب اپنے بستر کے پاس جا کر کپڑے درست کرنے لگے۔ ہم تو ان کی آواز سے چونکے۔ انھوں نے ٹی وی پر میڈونا کو دیکھ لیا تھا اور جھپٹ کر ٹی وی کے سامنے آ گئے تھے۔

''ارے بھائی آپ میڈونا کو سن رہے ہیں؟''

''جی!'' ہم نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا، جیسے ہماری چوری پکڑی گئی ہو... ''آج کل ہر رات ایک گھنٹا میڈونا کے نام ہوتا ہے۔'' ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''بھئی آپ نے ہمیں بتایا ہی نہیں۔ ہمیں تو وہ بہت پسند ہے۔'' پروفیسر صاحب ٹی وی کی طرف رخ کر کے بستر پر بیٹھ گئے تھے۔

ہم نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا۔ پھر یاد آیا کہ فلم جناح کے لیے جو مشاورتی بورڈ بنا تھا، پروفیسر صاحب اس کے سب سے اہم رکن تھے اور جب اس فلم پر ہنگامہ ہوا تو پروفیسر صاحب نے ہی اس فلم کا دفاع کیا تھا۔ اب انھوں نے بتانا شروع کیا کہ وہ اس وقت سے میڈونا کو دیکھ اور سن رہے ہیں جب اس نے گانا شروع ہی کیا تھا۔ قریب قریب اس کا ہر البم سنا ہے اور اس کی ہر فلم دیکھی ہے۔ پھر دوسرے گانے والوں اور گانے والیوں کی باتیں شروع ہوگئیں۔ ہم خوش ہو رہے تھے کہ پروفیسر صاحب کو تو ہم سے بھی زیادہ معلومات ہیں۔ اور یہ جان کر اور بھی خوشی ہوئی کہ پروفیسر صاحب کسی زمانے میں اردو میں شاعری بھی کرتے رہے ہیں۔

پروفیسر صاحب صرف مؤرخ نہیں ہیں صاحب ذوق انسان بھی ہیں ...اب پروفیسر صاحب اچھے لگنے لگے۔ اور اچھا لگنے لگا وہ کمرہ بھی جو ابھی تک تنگ اور گھٹا گھٹا لگتا تھا۔ پھر باتیں شروع ہوگئیں قومی کلچر اور گلوبل کلچر کی۔ ہم نے کہا گلوبل کلچر چھوٹی قوموں کی ثقافت کو کھا جائے گا۔ اگر ہم ماحول کی رنگا رنگی یا بایوڈائیورسٹی کے لیے مہمیں چلاتے ہیں تو کلچرل ڈائیورسٹی کے لیے بھی مہم چلانا چاہیے۔ ورنہ ہم سب یک رنگی کا شکار ہو جائیں گے۔ پروفیسر صاحب نے میڈونا کو دیکھا اور اطمینان سے جواب دیا۔ قومی عصبیت اور عدم تحفظ کا احساس ایسا نہیں ہونے دے گا۔ یہ سب آنے جانے والی چیزیں ہیں۔ ہم پھر بھی مطمئن نہیں تھے۔

اب میڈونا کا ذکر آیا ہے تو ہم آپ کو یہ بھی بتا دیں کہ ٹیلی وژن پر گانے پیش کرنے کی نئی تکنیک کراؤکے (Kraoke) سے بھی ہم بالی میں ہی واقف ہوئے۔ اس کے بارے میں ہم نے سنا تو بہت تھا لیکن اسے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بالی میں وہ بھی دیکھ لیا۔

ایک شام تالاب کے کنارے ڈائننگ ہال میں ہم کھانا کھا رہے تھے۔ سامنے رکھے ٹی وی پر ناچ گانے دکھائے جا رہے تھے۔ یہ تو یاد نہیں کہ کون سا گروپ گا رہا تھا البتہ ہم نے دیکھا کہ گانے کے بول بھی ساتھ ساتھ اسکرین پر آ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہی تو کراؤکے ہے یعنی جو گایا جا رہا ہے اسے آپ پڑھتے بھی جائیں اور ساتھ ساتھ گاتے بھی جائیں۔ چاہیں تو آپ ناچ بھی سکتے ہیں۔ ذرا دیکھیے تو ناچنے گانے کے شوقین نوجوانوں کے لیے کتنی سہولت ہوگئی ہے۔ کوئی لاکھ دعویٰ کرے کہ وہ مائیکل جیکسن کے گانوں کے سارے بول سمجھ رہا ہے تو آپ بالکل اس کا یقین نہ کیجیے۔ ہم جانتے ہیں کہ بہت سے الفاظ اس کے سر پر سے گزر جاتے ہیں۔ اب آپ عیش سے سارے گانے گا سکتے ہیں۔

بالی کی سیر کرتے ہوئے یہ ساری باتیں ہمیں اس لیے یاد آ رہی ہیں کہ یہ سب چیزیں ہم نے بالی میں ہی دیکھیں۔

(سفرنامہ انڈونیشیا کا ایک باب)

☆☆☆

غزلیں

ظفر اقبال

جہاں نہیں کوئی اس خاکداں کے چاروں طرف
کہ آسماں ہے کبھی آسماں کے چاروں طرف

میں اُس کی کوئی نشانی بتا نہیں سکتا
مکاں تھے اور بہت اُس مکاں کے چاروں طرف

کہیں مرا کوئی کردار تو نہیں، لیکن
دھڑک رہا ہوں میں اِس داستاں کے چاروں طرف

لپک رہی ہیں کسی اور کے لیے شاید
یہ بجلیاں سی مرے آشیاں کے چاروں طرف

یہیں کہیں سے ملے گا کبھی سراغ اُس کا
بھٹک رہا ہوں میں اک بے نشاں کے چاروں طرف

شفق پڑی ہوئی راہوں پہ دُور دُور، کہیں
شجر کھڑے ہوئے خوابِ رواں کے چاروں طرف

اس ایک میں ہیں کئی اور طرح کے اطراف
یہ کوئی اور طرف ہے، کہاں کے چاروں طرف

کچھ اور ہے جسے یہ شکل دی گئی، ورنہ
کچھ اور تھا مرے وہم و گماں کے چاروں طرف

پڑا ہوں اُس کے مضافات میں، جدھر دیکھو
سو، میں ہی میں ہوں ظفرؔ! درمیاں کے چاروں طرف

ظفر اقبال

دھوئیں میں لتھڑی ہوئی گفتگو زیادہ ہے اب کے
فضائے شہر میں ڈیزل کی بو زیادہ ہے اب کے

ضروریات ہی اتنی سمٹ گئی ہیں کہ دیکھو
ہوائے تشنہ کو ایک آبجو زیادہ ہے اب کے

ہر ایک چیز میں ایک اور طرح کی ہے ملاوٹ
کہ میں تو ہوں ہی، مگر، مجھ میں تُو زیادہ ہے اب کے

کچھ اپنی شکل و شباہت ہی اور ہوگئی، اس پر
جو آئنہ ہی نہیں، رُو بہ رُو زیادہ ہے اب کے

کہاں سے آئی ہے بہتات اِس نواح میں اتنی
کبھی جو کم تھا وہی سُو بہ سُو زیادہ ہے اب کے

میں اس کو آپ ہی پہچانتا نہیں ہوں، وگرنہ
یہ تھرتھری تو وہی ہُو بہ ہُو زیادہ ہے اب کے

یہ آگ پھیلتی جاتی ہے اور بھی مرے اندر
یہ شور اٹھتا ہوا کُو بہ کُو زیادہ ہے اب کے

لہو میں معرکہ برپا ہے کوئی اور ہی شاید
اگر یہ خواب سخن دُو بہ دُو زیادہ ہے اب کے

ظفرؔ! میں اپنا توازن ہی کھو چکا ہوں سراسر
کہ میرے دل میں کوئی آرزو زیادہ ہے اب کے

افتخار عارف

ملے گی داد فغاں کیا، ہمیں نہیں معلوم
کہیں گے اہلِ جہاں کیا، ہمیں نہیں معلوم

ہمیں تو بس یونہی جلنا ہے خاک ہونا ہے
چراغ کیا ہے دُھواں کیا، ہمیں نہیں معلوم

ہمیں تو ایک ہی موسم ہے راس موسمِ درد
بہار کیا ہے خزاں کیا، ہمیں نہیں معلوم

بجا کہ حاصلِ حسنِ کلام کچھ بھی نہیں
کریں گے سنگ و سناں کیا، ہمیں نہیں معلوم

پسِ غبار ہے کیا کچھ خبر نہیں ہم کو
عیاں ہے کون، نہاں کیا، ہمیں نہیں معلوم

وہ جن کی تیغ بھی دامن بھی آستیں بھی ہے سرخ
وہیں ملے گی اماں کیا، ہمیں نہیں معلوم

یہ عہدِ سنگ سرشتاں ہے، اس زمانے میں
جوازِ شیشہ گراں کیا، ہمیں نہیں معلوم

محسن احسان

مصرعِ زلفِ مسلسل میں گرفتار ہے دل
صبحِ روشن میں پرستارِ شبِ تار ہے دل

ہر نئی صبح نئے کام کا آغاز کروں
ہر نئے کام کے آغاز میں دیوار ہے دل

مجھ کو اک روز بھی آرام سے جینے نہ دیا
کبھی میرا تو کبھی تیرا طرف دار ہے دل

مرکبِ عمر کی رخصت کی گھڑی آ پہنچی
آسمانوں کے سفر کے لیے تیار ہے دل

میں نے کب کشتِ محبت کی نہ سیرابی کی
کیوں مرے آنسوؤں کے درپئے آزار ہے دل

ہم اُسی دائرۂ صوت و صدا کے ہیں اسیر
جس میں اک عمر سے آمادۂ اظہار ہے دل

دیدنی ہے یہ تضادِ دل و دیدہ محسنؔ
میں تو سویا ہوں مگر سینے میں بیدار ہے دل

جمال پانی پتی

پھر ہر اک موجِ ہوا پر ہے گماں زنجیر کا
پھر وہی ہم اور وہی موسم ہے دار و گیر کا

اس خطا پر لائقِ تعزیر ٹھہرے ہیں کہ ہم
خواب آنکھوں میں لیے پھرتے ہیں کیوں تعبیر کا

کون اس عہدِ زیاں میں اب ہو منصب دارِ عشق
کوئی خواہاں ہی نہیں ہے درد کی جاگیر کا

ہر نفس اک دام اندر دام نکلی زندگی
اک نیا حلقہ بڑھا ہر گام اس زنجیر کا

آندھیوں میں کیا جلائے سے جلے کوئی چراغ
پانیوں پر نقش کیا ٹھہرے کسی تحریر کا

جاتے موسم کو کرے زنجیر کوئی کس طرح
کیا ہواؤں پر چلے افسوں کسی تدبیر کا

حرف کیا کرتا رقم بے گرمیِ سوزِ دروں
کیا سرِ محفل جلانا شمعِ بے تنویر کا

دیکھ اندر جھانک کر مجھ کو مرے شعروں میں دیکھ
دیکھنا باہر سے کیا چہرہ مری تصویر کا

جمال پانی پتی

وہ لہو روئی ہیں آنکھیں کہ بتانا مشکل
اب کوئی خواب ان آنکھوں میں سجانا مشکل

کتنی یادیں تھیں کہ گردِ رہِ ایام ہوئیں
کتنے چہروں کا ہوا دھیان میں لانا مشکل

کتنے شب خوں تھے اُجالوں پہ جو مارے نہ گئے
کتنی شمعیں تھیں ہوا جن کا جلانا مشکل

کتنے دروازے دلوں کے تھے جو دیوار بنے
ایسی دیوار کہ ہے در جس میں بنانا مشکل

رنگ جتنے تھے بہاروں میں، بہاروں سے گئے
اس چمن زار میں اب جی کا لگانا مشکل

وہ بھی اے شہرِ نگاراں تھا کوئی موسمِ خواب
بیت جانے پہ بھی ہے جس کو بھلانا مشکل

رقص کرتے ہوئے کانٹوں پہ چلے ہم ورنہ
ہر قدم راہ میں تھا پھول کھلانا مشکل

یونہی چڑھتا رہا گر درد کا دریا تو جمالؔ
کشتیِ جاں کو کنارے سے لگانا مشکل

سحرؔ انصاری

مرحلے زیست کے دُشوار ابھی ہو جائیں
تاکہ ہم جینے کو تیار ابھی ہو جائیں

یہ جو کچھ لوگ مرے چار طرف ہیں ہر وقت
یار ہو جائیں کہ اغیار، ابھی ہو جائیں

جس کی تعبیر ہے اک خواب میں چلتے رہنا
کیوں نہ اُس خواب سے بیدار ابھی ہو جائیں

جانے پھر کوئی ضرورت بھی رہے یا نہ رہے
جن کو ہونا ہے وہ غم خوار ابھی ہو جائیں

کوئی تصویر سجا لے گا تو کوئی تحریر
کیوں نہ ہم نقش بہ دیوار ابھی ہو جائیں

زندگی، خود کو بچانا ہے کہ جاں دینا ہے
فیصلے یہ بھی سرِ دار ابھی ہو جائیں

ایک لمحے میں بدل سکتے ہیں حالات سحرؔ
آپ اگر شاملِ دربار ابھی ہو جائیں

خواجہ رضی حیدر

جب ذہن میں تصویر ہوں ایّام پُرانے
پھر کیسے بُھلا دوں میں در و بام پُرانے

کچھ آنکھ بھی نم ناک ہوئی رات سے پہلے
کچھ عکس بھی لہرائے سرِ شام پُرانے

حیرت ہے شبِ ہجر کوئی میرے سوا بھی
لکھ جاتا ہے دیوار پہ کچھ نام پُرانے

اک تازہ تھکن چیختی پھرتی ہے بدن میں
اور روح میں خاموش ہیں آرام پُرانے

تبدیلیِ احوال کی خواہش میں رہا ہوں
بنیادِ عداوت رہے الزام پُرانے

وہ کیسی مراسم کی گھڑی تھی کہ مسلسل
معلوم ہوئے مجھ کو نئے نام پرانے

اک عمر ہوئی تجھ کو رضی بزمِ سخن میں
پھر بھی ہیں سخن میں ترے ابہام پُرانے

صابر وسیم

اک پھول سا کھلتا کسی محراب میں دیکھا
پھر ایک جہاں عالمِ گرداب میں دیکھا

دن بھر تو مرے دل کے چمن زار سے گزرا
رات آئی تو میں نے اسے مہتاب میں دیکھا

اک دشت کو ڈوبا ہوا افسوس میں پایا
اک شہر کو بہتا ہوا سیلاب میں دیکھا

آثار برآمد ہوئے اک محل سرا کے
سوکھا ہوا اک پھول بھی اسباب میں دیکھا

برسات ہوئی دور کسی خواب سرا میں
طوفان سا اک دجلۂ پایاب میں دیکھا

دربار میں تنہائی کے دکھ جھیل رہا تھا
اک شاہِ زماں قصۂ نایاب میں دیکھا

مغموم ہے شہزادیِ گل رنگ کہیں دور
شہزادۂ دل گیر نے یہ خواب میں دیکھا

تشویش کی اک لہر مرے پاس سے گزری
اس بار اُسے ریشم و کم خواب میں دیکھا

اک چاند تھا چڑھتا ہوا اُس بام پہ صابرؔ
اک چاند اُترتا ہوا تالاب میں دیکھا

شوکت عابد

یہ مت پوچھو کدھر جاتی ہے دُنیا
چلو تم بھی جدھر جاتی ہے دُنیا

کبھی تاریک سیّارے کی صورت
کبھی رنگوں سے بھر جاتی ہے دُنیا

اُترتی ہے بہت چپکے سے دل میں
اور اپنا کام کر جاتی ہے دُنیا

بنا دیتی ہے اک بُت خانہ دل کو
رگوں میں جب اُتر جاتی ہے دُنیا

کسی صورت سنبھلتی ہی نہیں ہے
سمیٹو تو بکھر جاتی ہے دُنیا

نہیں کرتے جو اس دُنیا کی پروا
اُنھی لوگوں سے ڈر جاتی ہے دُنیا

چلو اک روز چل کر دیکھ آئیں
نہ جانے کیوں اُدھر جاتی ہے دُنیا

اجمل سراج

سخت مشکل ہے زندگی کرنا
اور پھر سعیِ راستی کرنا

یاد کرنا ہماری باتوں کو
تم ہمیں یاد گر کبھی کرنا

ہم سمجھتے تھے کچھ محال نہیں
مگر اس دہر میں خوشی کرنا

اس خرابے میں، اس زمانے میں
کیا تمنائے زندگی کرنا

بھول جانا، جو ہوسکے تم سے
یاد آئیں تو یاد بھی کرنا

کیا ہے گر دل اُداس ہے اجملؔ
یہ شکایت نہ پھر کبھی کرنا

عرفان ستار

میری کم مائگی کو ترے ذوق نے دولتِ حرفِ تازہ بیاں سونپ دی
میں کہ ٹھہرا گدائے دیارِ سخن مجھ کو یہ ذمّہ داری کہاں سونپ دی

قاصدِ شہرِ دل نے مرے خیمۂ خواب میں آ کے مجھ سے کہا، جاگ جا
بادشاہِ جنوں نے تجھے آج سے لشکرِ اہلِ غم کی کماں سونپ دی

میرا ذوقِ سفر یوں بھی منزل سے بڑھ کر کسی ہمرہی کا طلب گار تھا
اس لیے وصل کے موڑ پر ہجر کو اُس نے رہوارِ دل کی عناں سونپ دی

تشنگی کو مرے شوق کی لہر نے کس سرابِ نظر کے حوالے کیا
کیسے بنجر یقیں کو مرے خواب نے اپنی سرسبز فصلِ گماں سونپ دی

احتیاطِ نظر اور وضعِ خرد کے تقاضوں کی تفصیل رہنے ہی دے
یہ مجھے بھی خبر ہے کہ میں نے تجھے اپنی وارفتگی رائگاں سونپ دی

اپنے ذوقِ نظر سے تری چشمِ حیراں کو تازہ بہ تازہ مناظر دیے
تیرے پہلو میں دھڑکن جگانے کی خاطر ترے جسم کو اپنی جاں سونپ دی

راز داری کی مہلت زیادہ نہ ملنے پہ احباب سب مجھ سے ناراض ہیں
قصّہ گو مجھ سے خوش ہیں کہ میں نے انھیں ایک پُر ماجرا داستاں سونپ دی

میری وحشت پسندی کو آرائشِ زلف و رخسار و ابرو کی فرصت کہاں
تُو نے کس بے خودی سے یہ اُمید کی یہ کسے خدمتِ مہ وشاں سونپ دی

دل پہ جب گل رُخوں اور عشوہ طرازوں کی یلغار کا زور بڑھنے لگا
میں نے گھبرا کے آخر تری یاد کو اپنی خلوت گہِ بے اماں سونپ دی

کارگاہِ زمانہ میں جی کو لگانے سے آخر خسارہ ہی مقدور تھا
یہ بھی اچھا ہوا میں نے یہ زندگی تیرے غم کو برائے زیاں سونپ دی

اُس نے ذوقِ تماشا دیا عشق کو، خوشبوؤں کو صبا کے حوالے کیا
مجھ بگولا صفت کو نگہبانیِ دشتِ وحشت کراں تا کراں سونپ دی

مجھ میں میرے سوا کوئی تھا جو ہوس کے تقاضے نبھانے پہ مائل بھی تھا
میں نے بھی تنگ آ کر اُسی شخص کو ناز برداریِ دلبراں سونپ دی

ایک امکان کیا گنگنایا مرے چند اشعار میں حرفِ اظہار میں
میں یہ سمجھا خدائے سخن نے مجھے مسندِ بزمِ آئندگاں سونپ دی

خاکے / یادیں

ابوالفضل صدّیقی

پاؤں کی ڈھول

اپنی کالج کی اصطلاح میں درجہ بندی کے تحت سینئر گرانڈیز سے اوپر پہنچے ہوئے "بڑے بھائی" لاحقہ سابقہ خطاب۔ نہ معلوم کتنے پیچھے چلے قافلے آگے نکل کر کبھی کے آسودۂ منزل ہوگئے۔ سب کے سب سوچتے رہے کہ بھائی ظریف الدین پکّی بارک کے کمرہ نمبر ۵۵ کے اندر ہی بقیہ عمر یادِ الٰہی میں بسر کرنے کا تہیّہ کیے ہوئے ہیں، اور یہ بات نہیں موصوف کو بھی ڈائننگ ہال کے سرسیّد احمد مسالے جوڑے، اب نمک درست مخصوص خوش بو والے قورمے اور کاغذی چپاتی کا ایسا مزہ پڑ گیا تھا، جیسے انھیں پر زندگی کاٹنے کے طور ہیں۔ اور یہ کوئی بات نہ تھی۔ شروع ہی سے کچّی اور پکّی نامی دونوں بارکوں کے دو ایک ایسے ہی تھیکے دارقسم کے بانی چلے آرہے تھے، اور اب کالج کی روایت کے امین بھائی ظریف الدین تھے کہ ان کے ساتھی پنشن پا کر نکل گئے اور یہ کمروں سے نہ نکلے۔ اور ڈول بھائی ظریف الدین نے بھی ایسے ہی ڈال دیے کہ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ناگاہ ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کی دعوت پر، سیاسی سفارتی دورے پر امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان تشریف لائے۔ وائسرائے اور گورنروں نے مشورے سے بڑے شہروں کے دورے کا پروگرام مرتب کیا۔ سر ولیم میسٹن گورنر یوپی اور نواب محسن الملک سیکریٹری ایم او کالج علی گڑھ میں کچھ رنجشیں تھیں۔ گورنر نے خاموشی سے علی گڑھ کو دورے سے حذف رکھا۔ لیکن یہ پروگرام جب خود بادشاہ کے سامنے پیش ہوا تو بادشاہ نے اس عظیم بین الاقوامی شہرت کے مسلمان ادارے کو دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو ترمیم کرنا پڑی۔ علی گڑھ کالج میں اپنے مسلمان بادشاہ کا فقید المثال استقبال ہوا۔ مقتدر اساتذہ اور طلبہ نے اسٹیشن سے کالج تک گاڑی کھینچی۔ لیکن مسلمان بادشاہ تو اس اسلامی ادارے سے سوئے ظن میں مبتلا تھا کہ انگریز نے اس کو مسخ کر کے اپنے ڈھب کا عیسائی سیاسی مشنری ادارہ بنالیا ہے اور اسی لیے شاید لحمِ خنزیر خوری وغیرہ کے خوف اور خارج اسلام ہوجانے کے وسوسے میں مبتلا، کالج کی دعوتِ طعام مسترد کردی۔ اور شاید سوئے ظن کی تصدیق یا اللہ جانے پر چول، نواب محسن الملک سے پانچ سات طلبہ کا ایک وفد طلب کیا۔ ظاہر بات ہے باضابطہ سرکاری نہیں بدانندی میں ہی یوں بھی بڑے بھائی

ظریف الدین پیش پیش تو تھے ہی، نواب صاحب نے اس نوع کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر انھیں انتخاب کیا۔ اور پانچ میں سے ایک سوار ہوتے ہوئے، پانچویں سربلند و شہ سوار وفد کے لیڈر خود ہی بن گئے۔ دو دو ساتھی دائیں بائیں اور درمیان میں خود پیش ہوئے۔ آدابِ شاہی بادشاہ کے ساتھی پروٹوکول سے سیکھ لیے۔ سامنے پہنچ کر ماواجبات ادا کرنے کی کامیاب ایکٹنگ کی۔ بادشاہ نے بھی سمجھ لیا کہ ظریف الدین وفد کے لیڈر ہیں۔ رُو بہ رُو درمیان میں نشست دی۔ اگرچہ اسمائے گرامی پہنچ چکے تھے، لیکن بادشاہ نے فرداً فرداً نام دریافت کیے۔ لاحقے سابقے میں محمد لگا ہوا سن کر ذرا سکون ہوا۔ اپنائیت کا انداز نظر آیا۔ سامنے بیچ میں ظریف الدین تھے، ان کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا ''کلامِ پاک کی کوئی سورۃ سناؤ۔''

اس زمانے تک مسجد کے مکتب کا دم توڑتا نظام باقی تھا۔ ختنے اور مونچھوں کے کونڈے کے درمیان مکتب کی رسم ہوتی تھی، اور لڈو بٹتے تھے۔ اور مسجد کے مکتب کے میاں جی قاعدۂ بغدادی سے شروع کرا کر آٹھ نو سال کی عمر تک کلام اللہ ختم کرا دیا کرتے تھے، اور اس دوران، حافظے اور نئی عمر کے طفیل نماز اور بالعموم کلامِ مجید کی مخصوص سورتیں آپوں آپ حفظ ہوجایا کرتی تھیں، اور میاں جی خوش الحان ہوں نہ ہوں، ہر بچے کو قاری بنانے کی بھی کوشش کیا کرتے تھے۔ اگرچہ مکتب کا شروع کیا ہوا، نشرے کا گردان کیا ہوا قرآن شریف، ادھر اٹھارہ برس کھول کر بھی نہ دیکھا تھا، تاہم وہ بچپن کی سورتیں یادوں میں محفوظ تھیں اور خوش نصیبی سے ظریف الدین بھائی اک ذرا خوش آواز بھی تھے۔ قاری نہ سہی، قرأت میں شُد بُد تھی، جواب تو کالج کی مخصوص دعوت میں '' میری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا''.... کے گیت کے کام آیا کرتی تھی۔ بادشاہ کے اندازِ تخاطب کو اپنی جانب لے کر، حلق سنبھال، سورۂ رحمٰن کا ایک رکوع پڑھا تو جیسے برکت ہی سے، اپنی، اپنی قوم کی اور اپنی درس گاہ کی ہوا باندھ دی۔ بادشاہ پر رقت طاری کردی اور رعب بھی گانٹھ دیا کہ یہاں سب کے سب طلبہ و اساتذہ ایسے ہی ہیں، حافظ و قاری پکے مومن! اور پھر اسٹریچی ہال میں خاص خاص طلبہ اور اساتذہ کا جو جلسہ مخاطب کیا، اُس میں اپنی بدگمانی پر شاہانہ اظہارِ ندامت اور خسروانہ قبولِ ضیافت سے پہلے، اپنی جانب سے پچاس اساتذۂ کرام اور ان پانچ طلبہ کو شریکِ طعام ہونے کی دعوت دی اور پھر کالج کی جانب سے رد کردہ جوابی ضیافت قبول فرمانے کا اظہار کیا۔ ظاہر بات ہے دونوں ہی جانب سے یہ پانچوں شریکِ طعامِ شاہی رہے اور مقربینِ خاص نہیں تو بادشاہ کی نگاہوں میں تو آ گئے۔ سب کے سب کُنچن کندن بن گئے۔ رائڈنگ کلب کے ممبر بغیر ہوئے شہ سواروں میں تو تھے ہی، بادشاہ کے پانچوں سواروں میں آ گئے۔ کالج کی عزت آبرو، سونے پر سہاگا بادشاہ کے ممدوح، جہاں داری کی تاریخ میں علی گڑھ سے عجوبہ بنے۔

اُس زمانے میں خاندانی گریجویٹ پرنسپلوں اور دیسی سربراہوں کی نامزدگی کے ذریعے بالعموم نائب تحصیل دار کے پھٹے ڈیسک کی پہلی خالی سیٹ پر فائز ہوجایا کرتے تھے اور کارکردگی اور خوشنودیِ مزاج کلکٹر صاحب کے ذریعے تحصیل دار کی چھوٹی سی کرسی سے گزرتے ڈپٹی کلکٹری کے سدرۂ منتہا پر پہنچ

کر ریٹائر ہوجایا کرتے، اور ہندوستان کے اندر ان عہدوں کے مختلف مقام تھے۔ تاہم کرۂ ارض پر مضبوط شاہی نظام تھا اور فرد و افراد کی زندگی بادشاہ کی نظر کرم کے کچے دھاگوں پر ڈولتی اور مضبوط فولادی تاروں پر جھولتی ــــ بھائی ظریف الدین خیر بی اے پاس ہونے سے ابھی کالے کوسوں دور، ایف اے میں بھی ایک سال فیل، ایک سال حاضریاں کم ڈی تین دس بارہ سال نہ معلوم کتنے سال ٹھیکے داری میں بتا چکے تھے، لیکن اب بین الاقوامی آکسفورڈ کیمبرج جیسی قربِ سلطانی کی سند پیٹھ پر تھی، ساتھ ہی ساتھ کالج کی ناک اونچی رکھنے کا سرٹیفکیٹ ہاتھ میں اور پھر صوبائی گزٹ تو خر (خان بہادر کا مخفف) کو ایک تاؤ میں ''نواب'' بنا دیتا اور اچھے بھلے رات کو سونے والے صبح کو اٹھتے تو لارڈ بائرن کی طرح خود کو مشہور پاتے اور گزٹ پڑھواتے تو گفتنی تو گفتنی ناگفتنی بھی درج گزٹ ہو کر اعزازی حاکم عدالت آنریری مجسٹریٹ نامی کرسی گھر بیٹھے سجاتے۔ اور ظریف الدین بھائی خیر گریجویٹ نہ بھی سہی، جانے دیجیے، ایف اے انٹر نہ ہوں، تاہم مڈل میٹرک پاس تو تھے ہی، اور نائب تحصیل داری کا پھٹا ڈیسک ان کے سفارشی بادشاہ کی توہین تھا۔ پانچ انگری منٹ یک دم دے کر تحصیل داری کی کرسی دے دی گئی۔ ویسے تو یک دم ویک قلم بھی ڈپٹی کلکٹری بھی گورنر کے اک اشارۂ قلم میں ممکن تھی لیکن اس زمانے میں خالص ریشم کے گھوڑا مارکہ بوسکی کے تھانوں کی طرح خاندانی گورے افسر ولایت سے امپورٹ ہوتے اور یک دم ڈپٹی کلکٹر، جوائنٹ مجسٹریٹ چکردار کرسیوں کے اڑ پھیر میں ''میری گو راؤنڈ'' کی طرح گھوم گھام کر کلکٹر صاحب بہادر ہوجایا کرتے۔ پانچ سال کی نائب تحصیل داری کا پھٹا ڈیسک کلموا تو پانچ انگری منٹ کے ذریعے پیچھے چھوٹا، سینئر تحصیل دار ہو کر ڈپٹی کلکٹری کے دوش بہ دوش اک ذرا ہاتھ بھر پیچھے کرسی بچھ گئی۔ تاہم تحصیل داری سے لے کر کالج والا لاحقہ سابقہ ''بھائی'' تو خیر حذف ہوگیا، تحصیل دار ہوتے ہوئے ڈپٹی صاحب باجے اور تحصیل داری کے پانچ سال سکندرانہ جلال اور قلندرانہ جمال میں کانے اور تاریخی میدان لپیٹ گئے۔ خوب پتا تھا ظلم کے پیٹ سے احسان نکلا ہے اور ڈنڈے ڈگڈگی کے بل پر بندری تو بندری ریچھ ناچتا ہے۔ ڈپٹی صاحب آدمیوں پر یہ عمل داری جمایا کرتے اور جو جو فروگزاشتیں بابائے قانون سولنِ اعظم اور پاپائے قانون لارڈ میکالے سے ہوگئی ہیں، اُن کا ازالہ کرتے رہتے۔ طبعی شوخی نے ساتھ نہ چھوڑا۔ قانونی پروسیجروں کی ترکیبوں میں ترمیمیں فرماتے رہتے۔ ضابطۂ فوج داری اور لینڈ ریونیو ایکٹ میں ضرورت، ضرورت سے ترمیمیں فرمانے میں بے ڈھب ہوجاتے، اور ڈھب ڈھب سے ریڈی جسٹس فرما لیا کرتے اور اس سلسلے میں نہایت متین اور سنجیدہ بھی تھے۔ سیکنڈ کلاس مجسٹریٹی اور درجۂ دوم کی عدالت قانونِ مال کے مقدمے فیصل کرتے ہوئے درمیان درمیان، بابائے قانون سولنِ اعظم اور پاپائے تعزیراتِ ہند لارڈ میکالے دونوں ہی کی فکرِ رسا سے آگے پرواز کر کے اوپر جا پہنچتے۔ عجیب النوع نظائر سازی کا مظاہرہ کرتے۔ قانونِ فوج داری اور قانونِ مال ہر دو میں اپنی تیسری خود ساختہ ترمیم کر لیتے اور عدل گستری کی ترنگ آجاتی تو فردِ جرم لگی ہو یا نہ لگی ہو، مدعی ہو یا مدعا علیہ، مستغیث فریادی ہو یا ملزم، کسی ہونے نہ

ہونے پر منحصر نہیں، حتیٰ کہ توتے کی طرح پڑھے (P.W) گواہ یا (D.W) گواہ صفائی، گواہ چست مدعی سست، قسم کے مٹھی گرم چرب دست وترزباں گویا انھیں پہچان کر ڈپٹی صاحب عدلِ نوشیروانی میں اپنا فوری حکم ریڈی جسٹس کے انداز میں جاری کر ہی دیتے اور اس نوعیت کی مداری اور بندر قسم کی اضطراری حرکتیں آئے دن سرِ اجلاس تماشا ہوتی رہتیں۔ مکتب کے میاں جی کی پڑھی پڑھائی اور یقیناً بھری بھگتی بھی، مرغا سازی، کن پچی، اُٹھک بیٹھک، حتیٰ کہ بید بازی، بلا اندراج رجسٹر سرِ عدالت دیکھنے میں آتی رہتیں اور قانونی نظیریں بنتی رہتیں۔ توتے کی طرح پڑھے، چھوٹی لائن ریل کے انجن کی بھاپ کی طرح چھ چھ پیسے دو دو آنہ آواز میں بولتے، مدعی ساختہ پرداختہ ہوں یا مدعا علیہ کے آوردے ثبوت صفائی والے گواہ بھی بلاتخصیص اس قانون کی زد میں آجاتے۔ دروغ حلفی کا کیس چلانا، ڈپٹی صاحب کا شیوہ نہ تھا، کیوں کہ اس میں خود گواہ بن کر کسی دوسری عدالت کے رُو بہ رُو پیش ہونے کا رقّت کا بند شاہنامہ فردوسی والا ہفت خواں طے کرنا پڑتا تھا۔ لہٰذا قضیہ زمین برسرِ زمین اپنی ہی عدالت کے اندر طے کرتے رہتے تھے اور زبان کے ساتھ کبھی کبھی اگرچہ آدمی تھے لیکن دانتوں سے بھی کام لے لیتے تھے۔

علی گڑھ درس گاہ تو خیر تھی ہی، جیسا کہ ہر کالج ہوا کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ مخصوص مزاج کی تربیت گاہ بھی واقع ہوئی تھی۔ ''سینیارٹی'' جونیارٹی'' اصطلاحوں میں ماڈرن مغربی انداز اور مشرقی خوردانہ بزرگانہ روایات کا خوب صورت امتزاج ملحوظ خاطر رہتا۔ سینئر اور جونیئر طلبہ بات کرتے ہوئے ''آپ'' اور ''تم'' اور ''بھائی'' اور ''میاں'' کا تخاطب بالالتزام رکھتے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے کے رُو بہ رُو بھیگی بلی نہ ہوتے۔ آزادی کے ساتھ دُو بہ دُو اختلافِ رائے کرنے اور اپنا موقف پیش کرنے میں برابر کی سطح پر رہتے۔ بڑے امیر کبیر گھرانے کے بیٹے اور نہایت غریب خاندانوں کے لڑکے یک قطار و یک سطح جمع ہوتے۔ سو پہلے تو پتا ہی نہ چلتا کہ کالی شیروانی اور لال ٹوپی میں کون کتنے پانی میں ہے، حتیٰ کہ درس گاہ کی جانب سے جو مالی امداد ملتی وہ بھی صیغۂ راز میں رہتی۔ فوقیت اگر ہوتی تو کسی نوعیت کی ذاتی ذہانت یا دوسرے میرٹس کی بنیاد پر، ورنہ سبھی ہم نوالہ و ہم پیالہ رہتے۔ منشیوں، کلرکوں، چپراسیوں کے لڑکے اور افسروں رئیسوں کے فرزند و صاحب زادے ایک کمرے میں چارپائی سے چارپائی ملا کر رہتے۔ البتہ تربیت میں بنیادی چیز حکومت کے ساتھ تعاون اور تمام اساتذہ سے خواہ اپنے شعبے کے ہوں یا نہ ہوں، مکتب کے بچوں اور میاں جی کی طرح ڈرتے رہنے کا انداز سلیقہ سکھایا جاتا۔ سو اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ انگریز حکومت کے سب سے بڑے مخالف علی برادران، مولانا حسرت، مولانا ظفر علی خاں، راجا مہندر پرتاپ سنگھ، ڈاکٹر ذاکر، سیف الدین کچلو اور کون کون اسی درس گاہ کی تربیت سے اٹھان اٹھے اور سرسیّد کی تصنیف ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' سے سبق لے کر اپنا رخ اختیار کیا، انگریز کے خلاف راستہ چلے اور آخر آخر انھیں نے انگریز کو چلتا کیا۔ یہاں صداقت کے اظہار میں استاد شاگرد، سینئر جونیئر کی مُرو رعایت نہ تھی، ہم جماعتوں میں برابری کا اصول کارفرما رہتا۔ البتہ مزاج مزاج کے مطابق ٹکڑیاں بن جاتیں، سنجیدہ اور

گہرا مطالعہ کرنے والوں کا ذرا لحاظ رکھا جاتا اور یہ لوگ خود ہی خوردانہ بزرگانہ سی فضا باندھ لیتے۔ اپنا حالِ زبوں ایک دوسرے کے رُو بہ رُو بیان کرنے میں سگے بھائیوں والا سلیقہ ہوتا۔ گردن جھکانے میں ٹریڈیشنل سلیقہ برتتے، ذرا نہ شرماتے فخر سمجھتے۔

اور ڈپٹی صاحب تو ہر پہلو سے سینئر سے اوپر گرانڈیز اور خلیفے قسم کی گرانڈیز سکہ بند ہستی واقع ہوئے تھے اور طبعاً مزاج میں شوخی بھی تھی، لہٰذا ''جھینپ پروف'' تھے۔ نینی تال میں یوپی گورنمنٹ کا سول سروس ویک منایا جا رہا تھا۔ ٹھاٹھیں مارتی جھیل کے کنارے، بینڈ اسٹینڈ کے قریب پولو گراؤنڈ کے ساتھ پڑی بینچوں پر علی گڑھ والوں کی چکڑی جمع تھی اور تقریباً سب کے سب جونیئر بنے ہوئے تھے، جو تھے وہ تو خیر تھے ہی اور جو نہیں تھے وہ بھی پاسِ ادب نہ سہی ٹریڈیشن کے رکھ رکھاؤ میں لبادہ چڑھائے ہوئے تھے۔ ڈپٹی صاحب کا انداز تھا کہ ایسے مجمعے میں منتظر قسم کی بولتی خاموشی سے اپنی جانب مجمعے کو متوجہ کرتے اور پھر ایک باجماعت قسم کے قہقہے کے کورس سے بات شروع کرتے لیکن آج روہانسی آواز نکلی:

''بھائیوں، نائیوں، قصائیوں اور یکے والوں ہم جھینپے۔''

اور کئی ایک حیرت بھری آوازیں سنائی دیں۔

''ایں آپ جھینپے، گویا ہم سب کی ناک ہی تو کٹ گئی۔''

''ہاں میاں ہم جھینپے''۔ڈپٹی صاحب نے جھینپ پروف ہوتے ہوئے فراخ دلی اور کھلی آواز سے اعتراف کیا اور اپنے اعترافِ شکست اور خود کم تری کی مزاحیہ فضا باندھ دی۔ اگرچہ عمر میں یہ مواقع شاذ و نادر ہی آئے ہوں گے ورنہ ڈپٹی صاحب اس پہلو سے کالج سے سروس تک شکست ناآشنا ہی رہے تھے اور اب سب کوئی لطیفہ سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوگئے۔ ڈپٹی صاحب کے چہرے پر سینیارٹی جونیارٹی کے گرگھنٹال والے انداز اور بھی ابھر آئے۔ ایک لمبا گھونٹ لے کر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے:

''دیکھ رہے ہو ریڈیوس (reduce) ہو رہی ہیں، بارہ چودہ پونڈ گھٹ گئے اور اب تو خیر بہت کچھ ٹھیک ہوکر کھا پی کر دو تین پونڈ بنا لیے'' اور پھر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فضا باندھی:

''مارچ بھر ٹائی فائڈ فیور میں پڑے تپتے رہے۔ کلورین مکسچر پی پی کر اور دودھ کی چسکیاں بھر بھر کے پہلے ہفتے دو ہفتے فاقہ مستی میں قلابازیاں کھائیں پھر دو ہفتے کروٹیں بدلتے رہے (اور پھر پیٹ پر ہاتھ پھیرا) دیکھ لو نا، پٹخے ہوئے ہیں، انگلی پر ڈالنے کو ہوگئے تھے۔ ابھی پچھلے اپریل میں بخار اترا تو پڑے پڑے اوب گئے تھے۔ چاہتے تو میڈیکل لیو (medical leave) اور بڑھا لیتے، مگر گھر میں چارپائی پر پڑے رہنے کی گنجائش نہ تھی، بستر اور بے کاری کاٹتے تھے، جوائن کر لیا، پچھلا کام بہت پڑا ہوا تھا، پارٹ ہرڈ (Part Heard) دو ایک کیسیز نبٹائے تو اندازہ ہوا کہ یہ بک بک جھک جھک سردست اپنے بوتے کا روگ نہیں ہے۔ پہلے ایک لالہ بھائی، منشی آدمی، سینئر کو لیگ ڈپٹی صاحب سے اٹھا سٹھا ملایا، پھر کلکٹر صاحب سے ملے اور انھیں خوب صورتی کے ساتھ راضی کیا کہ بڑے اور کمٹمنگ قسم کے چالو مقدمات اُن

بکے ہاں منتقل کرا دیں اور ہلکا کام میرے ذمے رکھ دیں۔ انھوں نے اجازت دے دی اور میں نے بڑے مقدموں کی سب مسلیں ان ڈپٹی صاحب کے ہاں بھیج دیں اور محکمہ کورٹ والوں کو ہدایت کی کہ صرف ٹریفک کے چالانی مقدمے میرے یہاں بھیجا کریں۔ دس گیارہ بجے سے ایک ڈیڑھ بجے تک سارے کے سارے تاریخ لگے چالانی مقدمے ایک سطری تجویز اور دوسطری اقبالی بیان میں طے، اور پانچ روپے جرمانہ ہر مسل پر لکھتے چلے جاؤ اور جانتے ہی ہیں آپ سب لوگ ایک ایک مقدمہ نمٹانے میں جو دن بھر کی تنخواہ ملتی ہے، اُس کے پیسے پیسے کو کتنے تاؤ لگتے ہیں، تو فی دستخط دھیلا چھدام وصول کر ملتا ہے۔

ابھی اُس روز جو گھر پہنچے تو یاد آیا کہ دوپہر کے کھانے سے قبل والی دوا ختم ہوگئی ہے۔ دونوں اردلی اور ڈرائیور بھی چلے گئے تھے اور تم جانتے ہوگے بلکہ تم کیا دل ہی جانتا ہوگا وہ جو ہماری ''جوزہ'' ہیں اور ہماری کیا تم سبھی کی یارو ''زبرزورو'' واقع ہوتی چلی آئی ہیں اور میاں اپنی اور بھی سمجھ لو تایا ابا کی چھوٹی بیٹی واقع ہوئی ہیں اور قانونی ملزم تو حلف، جرح معاف ہوتا ہے مگر ہم معاف نہ ہوتے۔ سرہی تو ہوجاتیں۔

''ابھی چپراسی سے کیوں نہ منگائی؟''... ''ڈرائیور ذرا دیر میں لا دیتا''... ''مجھ سے صبح کیوں نہ کہہ کر گئے، منگا کر رکھتی''، ''کل رات جو آخری خوراک لی تھی تو کیوں نہ خیال رہا''... وہ تو اُدھر باورچی خانے میں گئیں اور میں نے سوالات کی زد سے بچ کر چپکے سے چور کی طرح اپنی ربع صدی پرانی ملگجی علی گڑھ والی شیروانی ڈالی اور بٹن لگاتا گیٹ پر آگیا۔ ایک یکّہ نظر آیا، اشارے سے بلایا اور سوار ہوگیا۔

''حضرت گنج چلو'' اور مرے کمپنی کے سامنے پہنچ کر روک کر کہا:

''ٹھہرو۔'' سو میاں علی گڑھ میں تو کالی شیروانی تو جرنیلی وردی ہوا کرتی تھی اور چون و چرا کی گنجائش نہ ہوتی تھی، یکّہ والے نے کہا:

''میاں، یہاں نہیں وہاں، شیڈ میں مجر کے پاس'' اور مسخرے نے سڑک کے اُس پار فرلانگ بھر دور اشارہ کیا اور پھر آہستہ سے بولا:

''میاں یہاں حکم نہیں ہے، وہ ٹریفک والا کھڑا ہے۔''

''ایں، واں! نہیں۔'' بے اختیار مرے منہ سے نکلا۔ سڑک پار کر کے جانا مجھے ہفت خواں طے کرنا معلوم ہوا۔ کولتار کی تپتی سڑک کانٹا کالے کوسوں نظر آئی۔ صبح کا ہلکا ناشتا کیے، دوپہر تک میز کرسی کے مارے لتاڑے خالی پیٹ۔ جھلّا کر پندرہ سال پیچھے اُلٹی قلابازی کھا کر شاید لکھنؤ کے بجائے علی گڑھ میں پھول چوراہے اوپر کوٹ میں کہیں جا پہنچے، جہاں کالی شیروانی کپتانی وردی ہوا کرتی تھی اور ٹریفک والا اگر تین کی جگہ تیرہ بھی بھری ہوں تو یکّہ روکنے کی بجائے دبک جایا کرتا تھا اور یکّہ والے سے جہاں کہتے وہاں، خواہ ہوا میں معلق ہو، جایا کرتا تھا۔ میں نے راسیں اُس کے ہاتھ سے کھینچ لیں۔ ''ابے ٹھہر یہیں، کھڑا رہ ابھی آتا ہوں۔''

اور وہ بڑبڑایا...

''نہیں نہیں میاں یہاں نہیں، وہ چالان کردے گا (سپاہی کو گالی) اور وہ جو ڈپٹی جرف الدین (گالی) سالا پانچ روپے سے کم جریمانہ کرتا نہیں ہے، آج کل سب خود طے کرتا ہے (گالی) اور یارو مزہ پہلا تو یہیں پر آ گیا، اُس کے بڑبڑانے میں دل ہی دل میں قہقہہ لگا کر رہ گیا۔ تاہم یکّہ میں نے روک ہی لیا اور کھڑا رہ یہیں کہتا ہوا اندر گیا اور دوا لے کر پھر اُچھل کر یکّے میں آ بیٹھا اور یکّہ چل پڑا اور اب جتنی گالیاں اُدھر سے آتے ہوئے گھوڑے کی ہمشیرہ عزیزہ اور مادر مشفقہ کو پڑتی آئی تھیں اُتنی ہی ڈپٹی جرف الدین کو کوڑے کے شڑاقوں کے ساز پر اور اُن کی ماں بہن اور جورو کو ترنم میں گاتا چلا۔

''پانچ روپے، پانچ روپے۔ میاں چالان لکھ لیا اُس ٹریفک والے نے اور پانچ روپے جریمانہ بولتا ہے (گالی) ۔ پانچ دن گھوڑا اور بچے سب کے سب بھوکے مریں گے۔'' اور ہر گالی کی تان ''ڈپٹی جرف الدین بڑا حرامی ہے، بڑا حرامی ہے'' پر ٹوٹتی رہی اور پانچ روپے جریمانہ اور ''وہ حرامی بچہ پانچ روپے سے کم جریمانہ بولنا جانتا نہیں ہے۔''

''پھر یارو جنگل کا مور تھا، ناچا کس نے دیکھا۔ تم میں سے کوئی دو ایک ہوتے تو مزہ آ جاتا۔ بہر حال میں اکیلا ہی مزہ لوٹتا چلا آیا۔ اب یہ اندازہ نہیں کہ ٹریفک والے کانسٹیبل نے مجھے پہچانا یا نہیں اور کالی شیروانی میں وہ بھی بے چارہ کیا پہچانتا۔ دور سے نمبر لکھ لیا اور تیسرے روز یکّہ اگزیبٹ اے (A) اور یکّے والا ملزم نمبرا عدالت کے اندر کٹہرے میں کھڑا تھا اور میاں تھرتھرا رہا تھا۔ یقیناً اُس نے مجھے پہچان لیا تھا کہ یہی وہ ڈپٹی جرف الدین حرام زادہ ہے جو پانچ روپے سے کم جریمانہ نہیں کرتا یا کیسے ہی نہ کیسے پتا چل گیا تھا کہ اُس روز جو سواری لے گیا تھا وہ ڈپٹی جرف الدین کالی شیروانی کا بہروپ بھرے ہوئے تھا اور میاں ہم چوکے یہاں بھی نہیں۔ مگر جھینپ اتاری پر اتری نہیں۔'' ملزم سے مخاطب ہو کر کہا، ''ڈپٹی جرف الدین بڑا حرام زادہ ہے۔ پانچ روپے سے کم جریمانہ نہیں بولتا۔'' اور پھر حکم سنایا، ''اچھا تم پر ہم پانچ روپے جرمانہ کرتے ہیں۔'' اور حکم سنا کر پانچ روپے کا نوٹ جیب سے نکال کر بڑھاتے ہوئے پیش کار سے کہا، ''خزانے کا چالان بھر کے بھیج دو۔''

''پیش کار ذرا چونکا اور کچھ نہ سمجھا کہ ڈپٹی صاحب اپنی جیب سے جرمانہ کیوں بھر رہے ہیں۔ ویسے گا ہے گا ہے ایسے جیسچر (Gesture) دیکھتا ہی رہتا ہے اور سنے تو بہتیرے ہیں اہل کاروں میں زبان زد خاص و عام ہیں۔

''تو پھر آپ نے کیا کیا، یکے تانگے والوں کے مقدمے فیصل کرنا چھوڑ دیے؟'' کوئی بولا۔

''توبہ کرو میاں۔'' ڈپٹی صاحب نے برجستہ کہا، ''البتہ اتنا کیا کہ پانچ روپے کے بجائے پانچ آنہ بولنے سے بھی توبہ کرلی، اب تو اور چوانی چوانی جرمانہ کرتا ہوں۔''

مجمع میں سے ایک بیرسٹر صاحب بولے:

''انگلستان میں تو قانون سازی ہی انھیں خطوط پر ہوتی ہے اور جرائم، جرائم کی فہرست سے

خارج کرکے جواز بنا دیے جاتے ہیں، جہانگیر شہنشاہ کی طرح شاید وہاں مجسٹریٹ اور جارج پنجم شہنشاہ دونوں اندھیری راتوں میں پھیری لگایا کرتے ہوں گے۔'' اور ایک قہقہہ پڑا اور ڈپٹی صاحب نے جیسے بات آئی گئی کرتے ہوئے موضوع بدلا اور کچھ سنجیدہ لہجے اور تیوروں سے بات جاری رکھی:

''اور بھائیو! میرے اپنے نجی ذرائع سے ایک مدت پہلے سے اطلاع مل رہی تھی کہ کانگریس پارٹی میں ملک گیر نمک سازی کا اندولن زیرِغور ہے اور پھر ہفتہ عشرہ قبل اپنے خفیہ سرکاری ذرائع سے بھی باضابطہ اطلاع ملی، پھر چند ہی روز بعد اخباروں سے خبر کے طور پر اس چیلنج کا اعلان آ گیا، اور میاں ملک کے سب سے بڑے رقبے اور گھنی آبادی صوبہ یوپی کے صدر مقام لکھنؤ سے شروعات اور مہاتما گووند بلبھ پنتھ اندولن لیڈ کرنے والے، ملک گیر سطح کے کانگریسی لیڈر اور سید ظریف الدین ڈپٹی کلکٹری مجسٹریٹی کی نوکری کرکے روکنے والے ایڈمنسٹریٹر اور جہاں ان دنوں انگریز بیوروکریٹ خصوصاً پرانے سولین کالونائیزیشن کی ،سوچنے والے اب الٹی انڈنائیزیشن کی پالیسی کارفرما پا کر اپنے وجود اور مستقبل سے فکرمند تھے، میں اپنے ڈپٹی کمشنر منرو صاحب اور ڈویژنل کمشنر نکلسن صاحب دونوں سے فرداً فرداً بھی بہ یک وقت دونوں کو یک جا کرکے بھی ملا اور کہا کہ یہ نمک سازی اسکیم قانون شکنی کی بچکانہ ماکری (Mockery) اور طفلانہ چھیڑ ہے۔ سیر بھر نمک بنانے سے سالٹ ٹیکس اویژن (Tax Evasion) نہیں ہوا کرتا اور پرانی اپچیس کھرچ کرمٹی پکا لینے سے نمک ہاتھ نہیں آیا کرتا۔ کہتے ہیں کیمیکلی، کروڈ شورہ بنتا ہے اور آج دیسی دواؤں میں پڑتا ہے یا آئس کریم جمانے کی مشین میں برف کے ٹکڑوں کے ساتھ ڈال کر گھماتے ہیں۔ دونوں نے میرے مواجہ ہی میں مشورہ کیا، ذکی الحس ہو رہے تھے۔ ورنہ میرا خیال تھا اور جس کا میں نے اظہار بھی کیا کہ بھونکنے دیں۔ ''نمک قانون توڑ دو سرکار کا بھانڈا پھوڑ دو۔'' جیکاروں سے کیا ہوتا ہے، نہ نمک قانون ٹوٹتا ہے نہ سرکار کا بھانڈا! مگر میری ایک پیش نہ گئی۔ فیصلہ دیا:

''لا (law) لا ہے، قانون شکنی چھوٹی ہو یا بڑی، قانون شکنی ہے۔ نمک بنے یا شورہ، قانون مقصد دیکھتا ہے تم ایکشن لو...''

اُن سے مرضی اور حکم پا کر ایس پی سے ملا، وہ بھی انگریز تھے۔ بہ سر و چشم حاضر پائے۔ یوں بھی تمام پولیس مجسٹریسی کے حکم پر رہتی ہے اور مظاہروں کے وقت کسی مجسٹریٹ کے، جو ساتھ ہوتا ہے، تابع ہوتی ہے۔ میں نے سٹی کوتوال کو طلب کیا۔ پرانا تھانہ داری کا چڑھا گرگ باراں دیدہ ڈی ایس پی رینک کا آدمی، لکھنؤ شہر کا کوتوال، تجربہ کار کائستھ بچہ۔ مشورہ کیا تو وہ مجھ سے متفق تو تھا کہ ہم اُن کے چڑانے کیوں چڑیں، مگر اوپر کا حکم۔ تاہم اُس نے رائے دی کہ آپ دفعہ ۱۴۴ لگا دیں اور اس سے بھی میں متفق نہ تھا اور نہ لگائی اور پھر کئی کئی جمع کرکے بھی اور ایک ایک کرکے بھی سرکل انسپکٹر اور تھانا انچارج طلب کیے۔ ریزرو پولیس لائنس انسپکٹر کو طلب کیا اور تھانے دار انچارجوں سے اپنے اپنے تھانے کے مانے ہوئے شائستہ اور بارد مزاج ہیڈ کانسٹیبل، کانسٹیبل اور ایسے ہی تجربے کار نیچے کے چڑھے،

اے ایس آئی جو ہر تھانے میں ایک دو رہتے ہی ہیں، اسپیشل ڈیوٹی میں تعینات کرنے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا اور وردی کے پیچھے کمر پر صرف پرانی چال کے دس دس گرہ والے خراوی ڈنڈے لٹکائے ہونے کا آرڈر دیا۔ مگر سول پولیس والوں کو یہ بھی نہیں۔ پون پون انچ موٹے گز گز بھر کے بید بازار سے خریدوائے۔ بجائے موٹی لمبی لاٹھی کے یہ بید لے کر چلنے اور وقت پڑنے پر انھیں سے بید چارج کر کے دھکے چوٹ کی بجائے مجمعے کو ڈپٹ کر منتشر کرنے کی تاکید کی۔ وہ بھی بہ مجبوری، ورنہ بھڑ کر اور دھکم پیل کر کے ہی کام چلانے کا حکم دیا۔ کوتوال شہر کے پسندیدہ پسندیدہ ساتھی انسپکٹروں، تھانے داروں کو سمجھایا کہ دیکھو نہ تو ڈاکوؤں رہزنوں سے مقابلہ ان کاؤنٹر (Encounter) ہے، نہ جوئے خانے یا کچی شراب کی بھٹی پر چھاپا مارنا ہے۔ ہم تم جیسے پڑھے لکھوں سے پالا ہے، جو احمق شانتی اور عدم تشدد سے ہندوستان فتح کر لینے اور گھر بیٹھے چرخے سے لندن اڑا دینے کے جہل مرکب میں بارہ برس سے مبتلا ہیں اور ہنستے ہیں، لہٰذا ہنستے ہی اُن سے نبٹا جائے۔ ہتھکڑی رسی نہ ڈالی جائے۔ مجمع مقررہ کھنڈر پر پہنچنے سے قبل ہی راستے ہی میں منتشر کر دیا جائے اور میں تو سوچتا تھا کہ پولیس کے سر پر خول بھی نہ ہوں کہ اُس کو اوڑھ کر پولیس والا تحفظ کے احساس میں خودسر ہو جاتا ہے، حدود کو تجاوز کر جاتا ہے۔ تاہم اندیشہ خشت باری کا بھی تھا اور موقع کھنڈر کا، لہٰذا بہ نظرِ احتیاط ایشو کرا دیے۔ البتہ تھانے دار کو بغیر سروس ریوالور لٹکائے جانے کے احکامات صادر کیے۔ نیز یہ کہ بہرصورت مقررہ کھنڈر تک پہنچنے ہی نہ دیں۔ راستوں پر نگاہ رکھیں، پولیس تعینات رہے اور بہتر تو یہ ہے کہ دھرم شالہ پر ہی سے جلوس کو بڑھنے نہ دیں۔ ساتھ ہی ہاتھاپائی سے گریز کیا جائے اور صرف بید چارج کے شڑاقوں ہی سے ڈرا کر منتشر کر دیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے مخصوص نجی ذرائع سے مہاشے جی کے ساتھ خفیہ پیام سلام چلائے اور بالمشافہ ملاقات کرنے کی بات چلائی۔ ایک دو مرتبہ کی عدالت اور وکیل والی دور کی صاحب سلامت بھی تھی، لیکن صورت شناس وکیل، ملاقات بھی نہیں۔

دھرم شالہ پر میرا پہنچنا نامناسب ہی تھا۔ غریب خانہ یا کسی اور مناسب جگہ جو ہم دونوں کو قابلِ پذیرائی ہو مل لیں۔ مگر انھوں نے کورا انکار کیا اور اس منطق کے ساتھ کہ وہ برٹش حکومت کو ہی تسلیم نہیں کرتے، لہٰذا مجھے حاکمِ مجاز تصور نہیں کرتے شاید غاصب، قابض، مداخلت کار اور کیا کہوں میاں۔ غرض میاں! اجڑ ہی کٹ گئی نخلِ آرزو کی۔ قصہ مختصر یہ کہ صدی بھر سے یہ سب غصب، مداخلتِ بے جا اور دھاندلی، بددیانتی وغیرہ ہو رہی ہے اور آخر آخر قانوناً ایسے نازک موقعے پر پولیس پارٹی کے ساتھ ایک دو مجسٹریٹ ہونا بھی لازمی ہے۔ اس کے لیے میں نے اپنے ریگولر تنخواہ دار مجسٹریٹ کے بجائے، رات گئے شہر کے ذی عزت وذی اثر آنریری مجسٹریٹ کو بنگلے پر بلوایا۔ ہرچند اُن کی نوعیت خالصتاً عدالتی نوعیت کی ہوتی ہے اور نہ کام ہی بے چاروں کا ایڈمنسٹریشن کا ہوتا، ہم سب جانتے ہیں، عدالتی کام ، نہ ساز قسم کا قانونی ہوتا ہے۔ تاہم لارڈ میکالے آنجہانی بڑی بے عذر مخلوق پیدا کر گئے ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ کے بن

داموں خطان غلام، ہفت پشتی اور مفتی" قہقہہ پڑا اور کوئی بولا:

"اجی مفتی اور ایسے قاضی مفتی کہ سرکاری مدات میں بنیے سے سود پر قرضہ لے کر چندہ دیں اور یوں اعزاز عزت خریدیں۔"

"جی ہاں، جی ہاں، اور کیا کیا نہ کریں گفتنی درج گزٹ اور ناگفتنی کا ادخال اور اگر کلکٹر صاحب اک ذرا طبیعت کے شوقین ہوں تو اندراجِ خلوت... میں نے تجویز پیش کی کہ دو آنریری مجسٹریٹ شہر کے باا‌ثر روسا، پولیس کے دست راست بنے دائیں بائیں چلیں اور دو عقب میں رہیں اور سینے پر کالی مخمل پر کلابتونی جھلملاتا "مجسٹریٹ" کا بیج آویزاں کیے رہیں تو پہلے تو چار مجسٹریٹوں کے انتخاب پر میرے رُو بہ رُو ہی رد و کد ہوئی کہ کون زیادہ بااثر اور جانا پہچانا سرکاری لیڈر ہے اور وہی اس اعزاز کا حق دار ہے۔ سب کے سب ایک سے ایک بڑھ کر کارگزار، وفادار سرکار برطانیہ ہونے کے دعوے دار اور اس اعزاز کے حق دار تھے۔ تاہم مجھے چار کی جگہ چھ کا انتخاب کرنا پڑا اور بقیہ کو آئندہ کسی اعزاز کے وعدے پر ٹرخانا پڑا۔ اب شام کا وقت تھا اور بیجوں کی تیاری کا سوال۔ سو یہ سب کے سب ایسے شوقین کارگزار تھے کہ اگر جرنیلی وردیاں سلوانے کا موقع ہوتا، تو یہ راتوں رات درزیوں کی دکانیں کھلوا کر سلوا سکتے تھے۔ مجسٹریٹ کے کلابتونی بیج بازار میں بکا نہیں کرتے، لیکن انھوں نے راتوں رات کیسے ہی نہ کیسے، اپنے سرسری حکم کے مطابق، کار چوبوں سے دونی چوگنی اجرت پر تیار کرائے اور صبح تڑکے سب سے پہلے سینوں پر آویزاں کیے بنگلوں پر یہی ذی عزت حضرات حاضر تھے، جیسے لندن سے وکٹوریہ کراس ملا ہے اور یہ سٹی مجسٹریٹ صاحب بہادر کے درِ دولت پر سلام کو حاضر ہوئے ہیں۔" بھائی ظریف الدین نے اک ذرا کی ذرا گھونٹ سا لیا، سب لوگوں پر اک نگاہ ڈالی جیسے اندازہ کر رہے ہوں کہ طول طویل قصہ سنتے سنتے کہیں بور تو نہیں ہو گئے، مگر سب کو ہمہ اشتیاق اور کل توجہ پا کر بات کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

"ادھر میں نے انھیں ہدایت کی کہ آپ لوگ شہر کے داداگیروں اور مقامی لوکل گاندھی قسم کے لوفر گاندھی نسل نیتاؤں کو شہرداری کے تعلقات اور مربیانہ انداز سے ڈانٹ ڈپٹ کر کے قابو کریں اور بھگا دیں۔ ساتھ ہی یہ اطمینان بھی دلایا کہ مار دھاڑ کا مطلق خطرہ نہیں ہے۔ لاٹھیاں لے کر پولیس والے ہی نہ نکلیں گے۔ پتلے بید ہوں گے۔ ادھر تھانا انچارجوں کو ہدایت کر دی کہ اپنے حلقے کے داداؤں، دس نمبریوں اور ہسٹری شیٹر پہلوانوں، بٹے باز استادوں کو خاص طور پر اور یوں سفید پوش شریف بدمعاشوں اور خلیفوں بدانندوں کو بلا کر باعزت تھانے میں بٹھالیں اور جو دو چار بھیڑ کے ساتھ بے ٹکٹ تماشبین ہوں گے وہ پولیس کو دیکھ کر ہی بھاگ جائیں گے اور میاں انتظاماً قانونی طور پر مجھے بھی پولیس کے ساتھ سڑک پر مجمعے میں ہونا چاہیے تھا، لیکن مہاشے جی نے حکومت کو غاصب ٹھہرایا تھا اور مجھے غاصب حاکم۔ لہٰذا چیلنج کا جواب دندان شکن چیلنج سے دیا اور اُن کو اتنا حقیر باغی تصور کیا کہ اُن کا مقابلہ ادنیٰ اہل کاروں

سے کرا دیا۔ یہ میری ملاقات سے انکار کی انا تھی۔ دفعہ ۱۴۴ بھی نہ لگائی، تاہم شاہ مینا صاحب کی زیارت کے ایک حجرے میں بیٹھا رہا۔ اگرچہ پنتھ جی سے اندیشہ تھا۔ ویسے نیتاؤں کی اول قطار کے لیڈر تھے اور یوں ایسے اندولنوں مظاہروں میں اُن کا مقام قاعدے سے سب سے پیچھے ہونا چاہیے تھا، مگر تجربہ تھا کہ ہر اندولن میں موصوف کلاک ٹاور کے کلارک ٹاور سوا چھ فٹے سر پر ذرا اونچی باڑھ والی، گاندھی کیپ اوڑھے دور سے نظر آجاتے ہیں اور پھر سب سے آگے والے کانسٹیبل کی لاٹھی بھی موصوف ہی کے سر پر پڑتی چلی آئی ہے اور سب سے پہلے آپ ہی سڑک پر کوروں کا لمبا سا دراز ہوجاتے ہیں۔ اور میرا تو پہلا واسطہ تھا، تاہم رہے نہ بانس، بجے نہ بانسری۔ میں نے لاٹھی مال خانے سے باہر آنے ہی نہ دی تھی۔ سخت ہدایت تھی کہ مہاشے جی کو جہاں تک ہو سکے بغیر بید بھی چھوائے گرفتار کیا جائے اور ایسا ہی ہوا۔ ایک پہلوان اور پٹے باز آرام پولیس والے کانسٹیبل نے مہاشے جی پینترا کاٹ کر نہایت آرام کے ساتھ قابو کر لیے اور پابدستے دیگرے، دست بدستے دیگرے گھسیٹنے اور لے جانے کے بین بین قیصر باغ تھانے میں لے جا کر دھر دیے۔ اس وقت میرا ایکشن لفظ بہ لفظ میری تدبیر اور حکمتِ عملی کے مطابق تھا اور میرے نزدیک کامیاب! اور میرے دونوں باسوں کی نظر میں ایڈمنسٹریشن کا نہایت اچھا کارنامہ، چناں چہ آج یہ پرجوش اور خطاب اسی کارنامے کی یادگار ہے۔''

بھائی ظریف الدین نے ایک بار رک کر پھر مجمعے پر ایک نظر ڈالی۔ وہ سنجیدگی اور مزاح کے مثبت منفی انداز میں بار بار مخاطب ہو کر بات کر رہے تھے۔ ایک شوخ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر کھیلی اور لہجے میں بھی ایک گونا شوخی سی ابھر آئی:

''اور میاں! تم سب جانتے ہو شراب تو پی نہیں بلکہ باپ کو بھی نصیب نہ ہوئی ورنہ خمار کے دردِ سر کا مزہ یاد ہوتا، البتہ آج چھٹی کا دودھ یاد آگیا، خیر دلے بہ خیر گزشت، میں شاہ مینا صاحب سے اٹھ کر گھر چلا آیا۔ شام کو قریب مغرب تھانا قیصر باغ پہنچا۔ شہر بھر کے تمام تھانوں کے انچارج یہاں الرٹ جمع تھے۔ اور ڈی ایس پی کوتوال شہر بھی حاضر موقع۔ نیم تلے صحن میں مونڈھوں پر مجمع تھا۔ تھانے داروں کے حلقے میں مجمع کے بیچوں بیچ حراست میں مہاشے جی آرام کرسی پر بھرے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر جیسے اور بھی بھیل چھوٹ کر پسر گئے۔ خیر میں تو شروع ہی سے نرم گوشہ لیے ہوئے تھا۔ کوئی بات نہ تھی، کل سے بالمشافہ ملاقات ہی سے انکار کر رہے تھے۔ چلو ایک ایسا بھی سہی۔ تھانے داروں اور برابر کے افسر کوتوال شہر ڈی ایس پی نے بھی کھڑے ہو کر باضابطہ سلیوٹ دیا۔ اور تم سب جانتے ہو کہ کھسیانا، چڑ نا، غصہ کرنا میں اپنی توہین اور کم زوری تصور کرتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی توہین برداشت بھی نہیں کر سکتا۔ مہاشے جی پر کل سے انکار ملاقات کی منطق پر تپا ہوا تھا اور اس توجیہ کے ساتھ کہ مجھ سے لے کر جارج پنجم تک سب کو ناقابلِ اعتبار غاصب تصور کیے ہوئے تھے اور یوں پیام سلام میں منھ کی کھا رہا تھا۔ مہاشے جی کی اس نازیبا، غیر مہذب حرکت پر کہ کرسی سے نہ ہلے، مجھے تاؤ آگیا۔ مگر غصہ ضبط کرتے ہوئے،

ضابطے کے اندر میں قیصر باغ تھانے کے انچارج سے سوال کیا:

''یہ کہاں بٹھالا ہے تم نے اس چنکیا کو'' حالاں کہ میرے کچھ احکام تھے کہ حوالات میں بند نہ کیا جائے، ہتھکڑی نہ چڑھائی جائے، عزت سے بٹھالا جائے۔ تھانے دار تو ذرا ذرا ہو گیا۔ تاہم سمجھ گیا، مخاطب صحیح میں نہیں، مہاشے جی ہیں اور مہاشے جی بہر حال طویل القامت ہیں۔ میری آمد اور موجودگی کو جیسے گاؤ آمد خر رفت انداز میں اگنور (ignore) کر کے اور بھی ڈھیلے ڈھالے ہو کر پسر گئے۔ اور میاں، مانتا ہوں یہاں پر میری ایڈمنسٹریٹو غلطی ہوئی۔ اپنی پالیسی اور پوزیشن کے منافی کسی پولیس والے کی طرح میں خود مہاشے جی سے بالمشافہ ڈو بہ ڈو ہو گیا:

''ابے کہاں بیٹھا ہے 'چنکیا' دو کوڑی کا آدمی۔'' اور نیچے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''بیٹھ اپنی اوقات سے۔'' مگر میاں وہ تو ٹس سے مس ہی نہ ہوئے، بیٹھے رہے جیسے اپنے تیاجی کی چوپال میں ٹھاکر چوپالی بنے اور حقارت کے ساتھ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے میری جانب دیکھا۔ بھائیوں اس وقت میرا پارہ درحقیقت چڑھ گیا۔ ایک فیت والے دو نوجوان ہیڈ کانسٹیبلوں کو جو ڈھب کے نظر آتے تھے، نیچے زمین کی جانب اشارہ کیا:

''بٹھاؤ تو اس سالے چنکیا کو اوقات سے'' اور جب ہیڈ کانسٹیبل ذرا جھکے تو مہاشے جی خود ہی اٹھ کر نیچے زمین پر بیٹھ گئے، لیکن آلتی پالتی مار کر جیسے کوئی راجا صاحب اپنے سنگھاسن پر براجمان ہیں اور پھر ذرا سنبھل کر بولے:

''پھر ڈپٹی صاحب! آپ مجھے یہاں نیچے بٹھال کر نیچا کر بھی سکتے ہیں۔'' اور بھائیو اپنے اپنے کلیجے پر ہاتھ دھر کر بتاؤ تم میں سے کوئی ایک ملزم کی ایسی بات سن کر کیا کرتا۔

''اوں سالا شاعری کر رہا ہے، اونچ نیچ بتا رہا ہے۔'' میں بڑبڑایا، اور انھیں دو ہیڈ کانسٹیبلوں کو زیر لب حکم دیا:

''لگاؤ تو سالے کے بیس بیس جوتے، وہ کدھر ہے تمھارے تھانے کا من سکھ رائے'' اور تھانے کا من سکھ رائے تو کہیں کسی کونے میں اندر پڑا ہوگا، ہیڈ کانسٹیبلوں نے اپنی اپنی کچے چمڑے کی پولیس والی ہلکی جوتیاں اتار کر بیس بیس، چالیس کی چالیس پٹا پٹ آواز میں زیادہ چوٹ میں کم اُتار دیں اور مہاشے جی منھ پر ہاتھ رکھے گھٹنوں میں سر دیے کھاتے رہے۔ جب پوری ہو گئیں تو سر گھٹنوں سے نکلا۔ منھ پر اچھی طرح ہاتھ پھیرے اور ترچھے ہو کر میری آنکھوں سے آنکھیں چار کرتے ہوئے بولے:

''پھر ڈپٹی صاحب! ان جوتیوں کے زور سے آپ وہ سودا اس سر سے نکال سکتے ہیں!'' اور اپنی کنپٹی پر انگلی رکھی۔

''ابے سالے شاعری سی شاعری کر رہا ہے۔'' میں بڑبڑایا۔ ''اجی سودا تو سودا، میں سودا صفرا، بلغم خون سبھی نکال سکتا ہوں سالے، حکمت چھانٹ رہا ہے چنکیا کہیں کا۔''

اور میاں میں تو گھر سے سوچ کر آیا تھا کہ ان کو باعزت طریقے سے اپنے یہاں سے بارہ پتھر باہر کروں گا، اپنی جیل حوالات میں بھی نہ رکھوں گا یہ وبال، تاہم سب چھوٹے بڑوں سے مشورہ کر کے، لیکن شخصی بادشاہ کی طرح اس وقت نادری حکم دیا اور انھیں جوتے کار دونوں نوجوان ہیڈ کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا اور ایک ایک لفظ واضح کرتے ہوئے کہا:

''انھیں گھسیٹ کر پولیس وین میں ڈال دو'' اور گیٹ کے قریب تیار کھڑی پولیس وین کی جانب اشارہ کیا، ''اور سب کپڑے اور چپل، اور یہ گاندھی ٹوپی کا تاج بھی اتار پھینکو، ہوں، حکومت کا سودا بھرا ہے۔ اور مہاشے جی کو ہمارے ضلعے سے باہر ستیاپور ضلع میں آٹھ میل اندر جنگل کی سروس روڈ پر اُتار آؤ اور ہمیں لوٹ کر اطلاع دو۔'' اور درحقیقت مہاشے جی یاں سے واں تک دھکوں اور گھسیلن ہی کے ذریعے پولیس وین میں ڈالے گئے۔ حکم نادری اور بے ڈھب اور وقت ناوقت تھا۔ ویسے تو تم سب جانتے ہو کہ میں بے ڈھب آدمی نہیں ہوں، تاہم شدنی ہوئی اور وین کے اندر کی تو دھینگا مشتی میں نے سنی نہیں، مگر دور سے دیکھا، وین کے اندر سے اونی پٹو کی پھتوئیں، کھدر کی موٹی دھوتی اور کرتے کی دھجیاں اور گاندھی کیپ اور ستلی کے تلے کی شدہ چپلیں باہر گریں اور گاڑی اسٹارٹ ہوگئی اور میں دھک سے ہوگیا، ایں یہ کیا ہوا؟

سیتاپور کا ڈپٹی کمشنر کالا انگریز اور کالا برہمن مسٹر دوبے، مہاشے جی کا ہم قوم ہونے کے باوجود دل کا کالا تھا۔ اور اس کا ساتھی پولیس والا خیر کھال سے ہڈی تک امپورٹڈ گورا ایس پی تھا۔ میں نے سوچا دونوں ان سے اچھے نمٹیں گے۔ مگر دل کو سمجھایا ہی، سچی بات یہ ہے کہ دل کی گہرائیوں سے انفعال ابھر رہا تھا، تاہم ادائے فرض اور کار منصبی کے بہانے کھینچ تان کر دبا لیا اور کچھ نہیں تو بندر کی بلا طویلے کے سر کر دینے کے انتقامی جذبے کا سہارا لیا۔ یہ مسٹر دوبے دیسی آئی سی ایس دوچار مرتبہ ضلعے کے فروعی سرحدی معاملات میں ملاقات ہوئی تھی تو اس جناب کے ساتھ وکٹورین دور کے سویلین انگریزوں کی طرح پیش آئے، جیسے کسی زمانے میں اپنے اہل کاروں سے معاملات میں آتے ہوں گے۔ نائب تحصیل داروں، قانون گویوں، چک تراشوں جیسے نری انگریزی بولتے رہے اور وہ انداز رکھا جسے ایٹ آرمز لینتھ (at arms length) کہتے ہیں۔ ضابطے ضابطے کی بات کی۔ میرے اپنے اصل نسلی انگریز دونوں باس بھی اس سے زیادہ انسانیت سے پیش آتے ہیں۔ اب آج بندۂ درگاہ نے بھی یہ بلا نازل کر دی۔ چچا کے پوت بھیے سے نمٹیں گے۔ بہتیرا دل کو سمجھایا، مگر دلِ منفعل سمجھے نہ سمجھا۔ بات اچھی نہ ہوئی۔''

روداد ستم کی تلخی اور سرگزشت کی ترشی اتنی شدید تھی کہ ایسے انداز اور یوں سوچ میں پناہ نہ مل سکتی تھی۔ ڈپٹی صاحب کا موڈ مائل بہ قنوطیت ہوتے دیکھ کر ایک صاحب نے بات بدلی بلکہ کاٹی اور رخ موڑتے ہوئے بولے، ''ظریف الدین بھائی یہ آج جو ہمارے وزیراعلیٰ کا سر ڈولتا ہے اس کی کیا تاریخ ہے؟'' اور بات کٹ گئی۔ ڈپٹی صاحب پھر فارم میں آگئے۔

''ہاں میاں! یہ تو تاریخ ساز ہستیاں ہیں اور یہ بھی خاکسار کی آنکھوں دیکھی ہے۔ میاں! ہم مرادآباد کی تحصیل حسن پور میں اُس زمانے میں تحصیل دار تھے اور اُس دن کسی کام کے سلسلے میں مرادآباد آئے تھے اور اس اکھاڑے کا بھی بے ٹکٹ کشتی کا تماشا، آنکھوں دیکھا، دیکھنے کو ملا، اور یہ بھی مہاشے جی کے ایک ہم قوم برہمن کی کارگزاری، کارستانی ہے۔ میاں! ہم تم سب جانتے ہیں، یہ جو شہر شہر، شہر کے قریب میں ریزرو پولیس لائن ہیں، یہ سرکاری بے کاروں اور راشی معتوبین معطلوں کے اڈے ہیں اور آرم پولیس نیم فوجی کانسٹبلری والی ہو تو مفت خوروں کے بھی ٹھکانے سرکاری چولھے کی پکی کھاتے ہیں اور مزے کرتے ہیں، خواہ مخواہ کی بلا بندوق برداری چاند ماری، اور بلاتقریب شادی باجا بجانا، بے وقت کی شہنائی۔ یوں بھی رائٹ لیفٹ ورزش ہوتی ہے، ساتھ ہی ساتھ دیسی ورزشوں کی ہمت افزائی بھی قواعد میں نہ ہو، تاہم ہوتی ہی ہے۔ اُن دنوں اپنی خوش نصیبی اور مہاشے کی بدنصیبی ایک اُن کا ہم قوم نائک، متھرا کا چوبے پہلوان کہیں سے تبادلہ ہوکر آمرا۔ آرم پولیس کا نائک۔ آپ سب جانتے ہوں گے بقیہ سب برہمن قومیتیں تو دھان پان ہوتی ہیں، لیکن متھرا کے چوبے پیدائشی خالصتی لمبے تڑنگے ہوتے ہیں، سوا چھ فٹے، ڈیل ڈول والے۔ پھر کھانے کا پیشہ کرتے ہیں اور سبھی ہندو جاتیوں میں نروان، بخشش کا لین دین کرانے کے ٹھیکے دار ہوتے ہیں۔ چناں چہ دھڑیوں دودھ، منوں پوری کچوری، لڈو پیڑے ربڑی، غرض اپنے وزن برابر تلا ہوا روزانہ کھا جاتے ہیں۔ پرلے درجے کے خوش خوراک اور پُرخور بھی اور بلا کے ہاضمہ درست۔ ایک دو ڈکاروں، اخراجوں میں سب ہضم۔ چناں چہ بالعموم سب کے سب پہلوان ہوتے ہیں۔ چوبے برہمن حوالدار نے پولیس لائن میں اکھاڑا کھولیا اور ریزرو پولیس کے جوانوں میں پہلوانی کا شوق بیدار ہوگیا اور اپنے یہاں ہر کام میں استادی شاگردی چلتی ہے اور کشتی پٹے بازی میں تو خاص طور پر۔ حوالدار استاد ہوگیا اور یوں پاپائے روم کی طرح ہترا تاج زیب فرق ہوگیا۔ برہمن، حوال دار اور پولیس لائن کا استاد۔ ریزرو پولیس انسپکٹر صاحب بہادر کہئیں نیم چہارم جیسے کے ہوتے ہیں اینگلوانڈین یوریشین وغیرہ، فوج کے نکلے ہوئے کارپورل، پی کیپ والے، اُنھیں تو جوتا مار کہ کھٹ سے سپاہی سیلوٹ دیتے، مگر استاد چوبے جی پہلوان کو پالاگن مہاراج ہوتی، پاؤں چھوئے جاتے اور مہینے کے مہینے دچھنا چڑھتی سو علاحدہ۔ یہ رنگ محفل دیکھ کر لائن انسپکٹر کے اندر انگریز خون کی بوندیں لہرا اٹھیں۔ جلنے لگا اور انگریز کے ہی رخ سے سوچنے لگا۔

اُن دنوں مہاشے جی چھوٹے سے، نابالغ سے نیتا تھے اور المورہ پہاڑ کے بریف لیس وکیل۔ اُدھر موتی لال جی نہرو، ۱۹۲۰ء والی کانگریس کے سکریٹری بن کر آئے تھے۔ خلافت کانگریس الحاق اور ہندو مسلم اتحاد کے زوردار حامی تھے، جو اُس زمانے میں گاندھی جی کا، گاندھی کیپ کی طرح فیشن تھا۔ تحریک چلانے کے لیے اُنھیں بے کاری کے مارے، رزق نہ موت، زندگی بیزار ایسے نوجوان نیتا کی ضرورت تھی، جیسے اُن دنوں ہمارے آج کے وزیراعلیٰ رہے ہوں گے۔ بھرابھر اُٹھتی جوانی، نوجوانی کے نوحہ کناں۔

چناں چہ ملک گیر دورے میں الموڑہ پہاڑ پر بھی پہنچے اور موتی لال جی پنتھ جی سے ٹکر گئے۔ بریف لیس وکیل کو الموڑہ سے اُتار لائے اور مراد آباد کے کسی اندولن مظاہرے میں دھانس دیا، جو کانگریس کے آئے دن کے معمول تھے۔ مراد آباد کے کلکٹر صاحب بہادر موصوف ہمارے بھی حسن پور تحصیل واری کے زمانے میں بگ باس رہے۔ اسکاٹ نسل انگریز آرم لاٹ صاحب۔ قابلِ رحم حد تک کور دماغ، ایڈمنسٹریشن کورے واقع ہوئے تھے، جیسے اپنے سرحدی پٹھان بھائی اپنے وڑے میں رہتے ہیں۔ مقدر کے کلکٹر صاحب بہادر نے ''کر'' آگے آگے اور ''دیکھ'' پیچھے پیچھے، سیدھا سادہ آرم پولیس کو حکم دیا کہ جلوس نکلنے دو اور دفعہ ۱۴۴ لگا دی۔ ادھر آرم پولیس کا انسپکٹر اینگلو انڈین، مگر پورے انگریز سے اور ڈیڑھ انگریز اوپر، گنگا جمنا اور ٹیمز تین دھاروں کا سنگم اور انگریز خون تو آج تک اٹھارویں صدی سے کہیں چوکا نہیں۔ انسپکٹر نے اپنے سپرنٹنڈنٹ اور کلکٹر صاحب بہادر کے مشترکہ حکم کے ساتھ فوراً چوبے جی کے اسکواڈ کی ڈیوٹی لگا دی۔ شاید اس میں سانپ مرے یا نہ مرے پر لاٹھی ٹوٹ جانے کی حکمتِ عملی زیرِ نظر تھی۔ اور بھائیو! ہم سب جانتے ہیں آرم پولیس کا ہر سپاہی، تین خون معاف، سنگین چڑھی بندوق باندھ کر دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھے بغیر، سنگین کی نوک سے گولی کے توڑ تک دیکھتا ہے اور پھر حوالدار، ہفت ہزاری راجپوت کی طرح سات خون معاف ننگی سنگین کی نوک سے آگے نہیں دیکھ سکتا اور حوالدار بھی کوئی ایسا ویسا للّو پنجو نہیں، پولیس لائن بھر شاگرد پہلوانوں کا استاد اکھاڑے کا پہلوان۔ سنگین کی نوک اور میگزین بھری بندوق سے آراستہ، شہنشاہ جارج پنجم کے تخت کی دھوک لگائے۔ الموڑہ بار کے نکالے، کمایوں ڈویژن کی عدالت عدالت کے لتاڑے بریف لیس پنتھ وکیل اور ایسے چوبے پہلوان کا بھلا کیا جوڑ، تاہم ولولے اور قوت کا مقابلہ تھا۔ شانتی عدم تشدد اور تشدد شانتی آمنے سامنے تھے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ قانون تو کتابوں میں لکھا ہوا تھا مگر قوت پہنچوں اور بازوؤں میں تھی اور قانون پولیس والے کے ہاتھوں میں۔ آمنا سامنا ہوا۔ چوبے حوالدار کے اندر برہمن بابر ہمن برادرانہ روایتی چشمک چمک کر بروئے کار آئی۔ سنگین پر میان چڑھایا اور بندوق پیٹھ پر لادی۔ ادھر کوئی ٹھاکر جاٹ راجپوت ہوتا تو کچھ چوبے جی کا نہ سہی حکومت کا لحاظ ملاحظہ کر کے اکاڑی بچا جاتا، مگر پنتھ جی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہے اور چوبے جی نے جھپٹ کر دبوچ لیے اور دبوچ کر ایک دو اکھیڑیں جو دیں تو پسلیاں چرچرا دیں اور اک دو رڑے جو جمائے تو نیتا جی لمبے لمبے دراز ہو گئے۔ اتنے میں ایک نوجوان بولا:

''ظریف الدین بھائی یہ رڑے کیا بلا ہوتی ہے؟...''

''میاں یہ ہوتی نہیں، ہوتا ہے اور کشتی اکھاڑے کا فاؤل ہوتا ہے۔ گردن کے زیریں اور ریڑھ کے بالائی گریوں پر رگڑ دیتی ہوئی ضرب کی صورت رسید کیا جاتا ہے۔ اُس جوڑ پر جو ٹکسالی بولی میں چھپا کہلاتا ہے اور چھوٹی سی نوک کی صورت گردن کے زیریں حصے پر ہوتا ہے۔ پہلوان با پہلوان بہ مشکل ایک آدھ اُٹھاتا ہے۔ ویسے گھونسے، مکے، لپوٹے وغیرہ تو اسکول کے زمانے ہم سبھوں کے کھائے پچھائے

یاد نہیں، لیکن رڈا خالص پہلوانی اصطلاح اور اکھاڑے میں زیرِ استعمال ہے۔ سڑک سے گھسیٹ کر جیل حوالات کے شفاخانے میں ڈال دیا۔ تین دن تو سنتے ہیں بے ہوش رہے اور تیرھویں دن چونکے۔ ضربِ شدید، اٹھارہ دن ہسپتال کے بستر پر پڑے رہنے میں بنتی ہے۔ سترھویں روز ڈاکٹر نے اُٹھا کر کھڑے کر دیے۔ کچا اندراج تھا، ڈسچارج کیا نکال باہر کیا۔ کھڑے تو خیر ہو گئے، لیکن گردن ہلتی ہے اور سر ڈولتا ہے۔ گویا ماں کے پیٹ سے دوبارہ جنبش اور ست ماسے اور وہ دن آج کا دن گردن اور سر نفی میں ڈول رہے ہیں۔'' کسی نے کہا:

''گویا منع کر رہے ہیں، انگریز کو نکال کر دم لوں گا اور انگریز حکومت نہیں مانوں گا، اگرچہ آج عمل داری بھی اپنی قائم کر لی۔''

اور کوئی دوسرا شوخ بولا:

''پتا نہیں غاصب انگریز کو یا حملہ آور غاصب مسلمان کو۔ اُن ہی کا ایک گروہ جس سے یہ متفق ہیں مسلمان کو حملہ آور غاصب بھی تو کہتا ہے اور انگریز سے پرانا...''

ایک نوجوان جو سنجیدگی کے ساتھ سن رہا تھا اور اُن کے قہقہوں میں صرف ہلکی مسکراہٹ ملائے ہوئے خاموش تھا بولا:

''یہ آپ بھائیوں کا ذرا بے تکا سا غپ شپ کا انداز ہے۔ بات میزان پر پہنچتے پہنچتے بھٹکا دیتے ہیں۔ اب ۳۲، قیصر باغ تھانے کی نمک توڑ قانون کی چلی، سیتاپور ضلعے کے جنگل میں گم ہوئی اور ۴۲، مراد آباد پولیس لائن چوبے حوالدار کے گرد الٹی قلابازی کھا کر گھومی اور اب آج ۳۲، میں آ پہنچی گئی۔ بھائی وہاں جنگل میں کیا گزری اور آج آپ پر کیا بیتی؟''

''ہاں! ہاں! میاں! معاف کرنا۔ پھر آج تو یہ معمولی سا سیاسی مرحلہ ہے اور اُسی ملک کے اندر جس کو ہم نے ایک کلچر دیا، تاریخ نے ہم پر کیا کیا ستم نہیں ڈھائے۔ حملہ آور، قابض، غاصب، کن کن تہمتوں القاب سے نوازا گیا اور ایسی الزام تراشیاں تاریخ ساز تاریخ کے محسنوں پر ہوتی چلی آئی ہیں۔ لیکن تاریخ ہی یہ بھی بتاتی ہے کہ ملک خدا کا ہے، زمین اُسی کی ہے، جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور جس سے چاہے لے لیتا ہے۔ یہی کچھ عزت و ذلت کا بھی حساب کتاب ہے، مگر مکافاتِ عمل ہیں اور شاید اس ملک میں ہم بدکرداری کے مرتکب نہیں ہیں۔ بلاشبہ آج اپنا گروہ بن سرا ہے، لیکن تاریخ کا عام طور پر اور اپنی تاریخ کا خاص طور پر مزاج ہے کہ اپنا راہنما اپنوں کے اندر سے تلاش کر کے آگے آگے کر لیتی ہے اور پیچھے پیچھے ڈھکیلتی ہو لیتی ہے اور ناامیدی ہمارے یہاں بہ منزلۂ ارتداد ہے اور تم تو تاریخ کے اسکالر ہو۔ تلخ گھڑیوں کو شکر کی گولیوں کی طرح چوستے رہنا اپنا شعار و معمول رہا ہے۔ طوفان اور آندھی مسلسل اور متواتر نہیں رہتے۔'' اور ڈپٹی صاحب ایک بار پھر شگفتہ موڈ میں آ گئے اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''اب دیکھونا 'آپ بیتی' سمجھو یا 'مہابھارتی بیتی' کل کے رہزن ہیں آج کے رہبر۔ نقطۂ بحران

پر ہوں اور المیے کی منتہائے بلندی پر، یقین مانو جی آج پانچ سال بعد بھی کڑھ رہا ہے۔ اگر آج وزیر اعلیٰ کی سیاسی منافقت کا سہارا نہ ہوتا تو انفعال کے پسینے میں عرق عرق ہوتا۔''

اور سرڈولنے کے غپ شپ والے جملہ معترضہ سے خوش باش ڈپٹی صاحب ۲۲-۱۹۲۰ء سے دس سال اور آگے ترکِ موالات تحریک سے نمک قانون توڑ دو، سرکار بھانڈا پھوڑ دو کے جیکارے اور پھر ۳۳،۳۲ء میں آپڑے۔ ''یہاں رکھنا تو مجھے مہاشے جی کو قانوناً انتظاماً اپنے زیرِ حراست لکھنؤ جیل حوالات میں چاہیے تھا۔ لیکن جیسا کہ میں نے اپنے اور مسٹر پرکاش دوبے کے تعلقات ارتباط اور ساتھ ہی مہاشے جی کے نازیبا رویے سے بھی، انھیں قیصر باغ تھانے سے ہی باعزت طور پر رخصت کر دیا اور کہنے کو بندر کی بلا طویلے کے سر کی، مسٹر پرکاش دوبے صاحب کلکٹر بہادر کے رویے بہادری کے جواب میں۔ ورنہ کان پور ضلع اور بھی قریب تھا، اُدھر پرتاب گڑھ تھا۔ پورب پچھم، اُتر دکھن کہیں بھی دفان کر سکتا تھا۔ رات کو کھانے کے بعد بستر پر پہنچ کر افسوس ہوا، اور افسوس ملال اور ملال قلق ہو گیا۔ لحاف تان کر جو پاؤں پھیلائے تو ایک بڑے دانش ور لیڈر کا (غالباً علامہ شبلی نعمانی کا) قول یاد آیا کہ جاڑوں کی لمبی راتوں میں لحاف کے نیچے جنت ہوتی ہے، مگر مجھے دوزخ معلوم ہونے لگی اور دوزخ کا بھی طبقۂ زمہریر۔ چہ چہ چہ، اپنا قانون پیشہ بھائی وکیل، عزت دار، اگرچہ شئے لطیف سے خیر عاری سہی، تاہم... اور تم جانتے ہی ہو غصہ مجھے آتا نہیں اور چڑنا میں اپنی شکست، توہین تصور کرتا ہوں۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ غصہ یہ خلیفے قسم کے تھانے دار بھی پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔ صرف گالیوں کے مکالمے میں مار دھاڑ کی ایکٹنگ کرتے ہیں ورنہ ایک ہی تفتیش کے ہو کے رہ جائیں۔ لیکن یہاں وقت کی بات یہ حرام کام اُس وقت آ ہی گیا سچ مچ۔ اُس میں بہت کچھ اُس انکار کا بھی دخل تھا جو مہاشے جی پہلے روز سے مجھ سے ملنے سے کترا رہے تھے۔ لیکن بھائی سیاست میں توہین کوئی چیز نہیں ہوا کرتی اور ایسی ہی صورت کچھ، کبھی مونچھیں اونچی، کبھی نیچی نظامت ایڈمنسٹریشن میں بھی ہونی چاہیے۔ چناں چہ آج شکست اندر شکست سے دوچار ہوا، پانچ سال بعد۔ مقدر کی بات، اوں، آں ہوں۔ وہ میاں تم سب جانتے ہو، دیہات جنگلوں میں پولیس کے مسائل دوسرے ہوتے ہیں، اپنے شہروں سے مختلف۔ جنگل رہزنوں کی بارگاہ ہوتے ہیں اور ڈاکوؤں مفرور مجرموں کی پناہ گاہ۔ یہاں تھانوں میں آرم گارڈ کی چوکیاں مضبوط، اور پہرہ گشت مربوط رہتا ہے۔ مہاشے جی میرے حکم کے بہ موجب قیصر باغ تھانے سے الف ننگے، اور تو اور ننگے پاؤں سیتاپور کے جنگل میں کٹیلی جھاڑیوں میں ڈھکیل دیے گئے۔ مجھے شروع رات میں بنگلے کے گیٹ پر واپس آکر وین ڈرائیور اور ہیڈ کانسٹیبلوں نے تعمیلِ حکم کی رپورٹ دی۔ یقین مانیں سن کر لحاف کے اندر بھی جھرجھری آ گئی۔ سُن ہو کر رہ گیا۔ چودہ گھنٹے طویل* رات کاٹے نہ کٹی۔ یہاں جنوری کا پہلا ہفتہ، جب مہاشے جی کے وطن مالوف سے اور ۲۵ ہزار گز اونچے کی، نندا دیوی دھولا گری کنچن جنگا کہاں کہاں کی ۲۷ ہزار گز اونچی ہوائیں، سیتاپور، کان پور، لکھنؤ تو خیر دامن کے لپٹے مقام ہیں، بحرِ عرب اور بحرِ ہند تک کو بحرِ منجمد بنا دیتی ہیں۔ عقل حیران

ہے میری تو کیسے اُٹھا گئے کھال پر، ہائی لینڈر جو ہیں شاید! اپنی تو السٹر سویٹر میں قلفی جم جاتی۔ رات البتہ چاندنی تھی۔ مگر گھنے جنگل میں دن دھاڑے دھوپ نہیں پہنچتی۔ چاندنی کے پتے ہونا نہ ہونا برابر۔ تاہم انکل سے کٹیلے جنگل سے ہاتھ پاؤں، از سرتا پا لہولہان، کیسے ہی نہ کیسے سروس روڈ پکڑ لی اور سروس روڈ پر چلتے چلتے کیا، لڑھکتے لڑھکاتے جنگل کے کنارے لگے ہوئے گنّے کے رقبے پر جا پہنچے اور یہاں ایک کولھو کے چھپر پر جا نکلے۔ کسان گڑ بنا کر شروع رات سے گئے تھے، بھٹی بجھ گئی تھی، تاہم بھوبھل گنگنی تھی۔ تلی پر راکھ میں گرمی سی تھی۔ بھٹی میں کو اتر کر اُسی کے سہارے دبک گئے۔''

اور کوئی شوخ بھائی ظریف الدین کی بات کاٹ کر بولا:

• ''کولھو کے چھپروں کے اردگرد لگے کتے بھی چاک اور کولھو چاٹ کر ایسا ہی کرتے ہیں۔''

''لاحول ولاقوۃ، بے کار بکواس، ہرزہ گوئی'' کسی نے تمسخرانہ انداز میں گھڑکا اور کہا، ''ہاں میاں! ایسا ہی سمجھ لو، خیر توبہ کرو آج قوم پر کڑا وقت پڑا ہے اور ہم یہ مستی قلندری کر رہے ہیں۔''

اور کسی برابر والے بوڑھے بھائی نے کہا، ''بھائی ہم ننگے قوم کے ہیں، سر مونڈھ کر گھٹنا تو مونڈھ ہی نہ لیں گے، ہرچہ بادا باد''۔ تاہم ڈپٹی صاحب نے مذاق میں حصہ نہ لیا اور بولے:

''میاں! ہمیں تو اُس تھانے دار انچارج نے سنائی روداد ستم۔ جو اسی سال سروس سے بتیس سال اور پانچ سال اور اوپر توسیع لیے، اسی کارگزاری میں کنگ پولیس میڈل اور کارکردگی کا سرٹیفکیٹ لے کر پنشن پر چلے تھے اور بقیہ عمر رام رام نام کی مالا جپنے کا تہیہ کر چکے تھے کہ ایک مرتبہ ہمیں مل گئے۔ ہم تو کیا پہچانتے ہماری تحصیل داری اور اپنی کانسٹیبلی کے زمانے کے کہیں کے ہمارے پہچاننے والوں میں تھے۔ خود ہی تعارف کرایا اور ہمارے استفسار پر شوخی اور بے حیائی کے ساتھ پوری روئداد سنائی:

''ہاں میاں صبح نکلی تو آرم پولیس کی ایک گشتی پارٹی واپس آ رہی تھی۔ سروس روڈ پر آس پاس جھاڑیوں کے اوپر اوس کے قطروں سے اور جگہ جگہ مٹی اور گھاس پر پاؤں کے نشان سے نامانوس سراغ پایا اور شبہے میں پڑ گئے۔ پارٹی کھوج لیتی کولھو کے جھونپڑے پر جا پہنچی۔ صبح تڑکے مہاشے جی کو دریافت کر کے بھٹی کے اندر سے برآمد کر لیا۔ پہلے تو سمجھے کوئی سادھو ملنگ بھبھوت ملے ہوئے ہے۔ اُدھر مہاشے جی بھی ایک ہی آپ جانیں، چپی سادھ گئے۔ آرم پولیس والے کائیاں ہوتے ہیں، بلنٹ سولجر۔ تحقیقات تفتیش میں کورے ہوتے ہیں۔ وہیں سے تپائی کی لنگوٹی لگا کر یا پتا نہیں ڈھاک کے پتوں کی کوپین چڑھا کر، الٹی سیدھی ستر پوشی کر کے تھانے میں لا کر دھر دیا۔ ادھر نمک قانون توڑنے کی گشتی چٹھی ملک بھر میں ہی تھانے تھانے گھوم چکی تھی اور شہر و مضافات کے تھانے دار چوکنے ہو رہے تھے۔ ویسے میاں تھانے دار انچارج کو دور دور اندیشہ نہ تھا، یہ تو روز روشن کا مجرم اور شہر کی پولیس کا دردِ سر تھا۔ تاہم برہمن بابا برہمن کنوجیا شرما تھانے دار انچارج اور جتھہ جی پہاڑی بامن، دونوں ہی ایک دوسرے کو پہچان گئے۔ وہ جو کہاوت ہے چور کو چوکیدار اور چوکیدار کو چور فوراً دور سے سوجھ جایا کرتا ہے اور یہاں تو مہاشے جی اور

داروغہ جی آمنے سامنے تھے۔ بیدار مغز تھانے دار نے دو چار سوالوں میں قبلوا لیا کہ مہاشے جی ہیں۔ انھیں تو یہیں حوالات کے سینخچوں کے پیچھے چھوڑا، آمد روانگی رجسٹر پر روانگی لکھی اور گھوڑی پر سوار ہوکر روانہ ہوگیا۔

اوراب سونے کی چڑیا مٹھی میں تھی، جو پرقینچ تھانے کے پنجرے میں چھوڑی۔ تیز رفتار گھوڑی ران تلے تھی اور ایسے میں قوتِ تصنیف و صلاحیتِ تالیف بڑھ جانا لازمی امر ہے، گو کہ بات اس وقت پولیس اصطلاح میں ''سوکھی'' تھی اور ''دستِ غیب'' کا دور دور امکان نہ تھا، جس کی درازی رسائی تھانے تھانے کے دفتر سے کپتان صاحب بہادر کے بنگلے کے بیک ڈور تک روز کے روز ہوتی رہتی ہے اور حسابِ دوستاں در دل ہوتا رہتا ہے۔ اور تھانے دار بے چارے تو برملا، کھلے منہ کہتے ہیں کہ ایک سچ کو سچ ثابت کرنے کے لیے ایک سو ایک جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور کچھ گڑھنے پڑتے ہیں اور میزانِ کُل اپنے حق میں کچھ یوں لگاتے، اپنے کپتان صاحب بہادر کے بنگلے پر پہنچ کر سیلوٹ کھٹ کھٹایا کہ کس طرح فدوی نے لکھنؤ ضلعے سے اپنے ضلعے کی سرحد میں مسمی گووند بلبھ پنتھ کانگریسی کے نمک قانون توڑنے کی نیت سے داخل ہونے کا سراغ لگایا اور داخل ہوتے ہی اپنی جان کو وغیرہ کو خطرے میں ڈال کر بہ کمال بہادری و کمال فراست وغیرہ گرفتار کرلیا وغیرہ وغیرہ۔ چلتے وقت محرر تھانا دیوان جی روزنامچۂ عام اور روزنامچۂ خاص کا ایک ایک ورق سادہ رکھنے کی ہدایت کی۔ ایس پی چوکنا ہو رہا تھا اور ایڈمنسٹریشن بھی سب کا سب۔ ضلع ضلع اپنے تھانوں، تحصیلوں کو انچارجوں اور چھوٹے مجسٹریٹ، تحصیل داروں کو گشتی چٹھیاں گھما دیں تھیں کہ حسبِ صواب دید خود تدارک کریں۔ مہاشے جی کے فساد کا کسی وقت بھی اور کسی تھانے میں ٹپک پڑنے کا اندیشہ تھا۔ بات نہ گاندھی چرخے سے لندن اڑائے دے گا، ڈھولک پر عورتوں کے گیت والی تھی اور نہ ترکِ موالات نان کوآپریشن کر کے، گھر بیٹھ پیٹ پر پتھر باندھ کر بیوی کی طرح اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہو قسم کی حماقت۔''

بھائی ظریف الدین ایک ذرا رکے، چہرے بشرے سے ایسا لگا جیسے اندازہ لگا رہے ہوں کہ سننے والے بور تو نہیں ہو رہے، مگر سب کو ہمہ اشتیاق و توجہ دیکھ کر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''نمک قانون توڑنا تو میرے نزدیک چھیڑنے چڑانے والی بات تھی۔ میں نے تو اپنے باسوں سے روزِ اوّل ہی کہا تھا کہ اگنور (ignore) کریں۔ مگر بھائی دونوں انگریز تھے اور میں نے تو ۱۹۱۹ء والی چپقلش میں اندازہ کیا تھا کہ انگریز ۱۸۵۷ء کی تکرار سے وسوسے میں مبتلا ہوجاتا ہے، نمک قانون توڑنا تو ٹیکس کے ایک معمولی حصے حد کا اویژن (evasion) تھا۔ ویسے اتنی بات ہے کہ ٹیکس ویژن کرنے والا طبقہ استری کیے ہوئے کلف دار کھڑکھڑاتے سفید کپڑے پہنتا ہے اور اُسے بلا خوش بودار بھی ڈکار لیے ٹیکس ہضم کرنا شیرِ مادر ہوتا ہے۔ مگر یہ ظالم نمک توڑ قانون اندولن دن دہاڑے اور ٹیکس دفتروں

کے سامنے کر رہے تھے۔" ڈپٹی صاحب پھر اک ذرا رکے اور جیسے کچھ سوچتے ہوئے بولے:

"ہاں خیر یہ بات تو ہے، ریت پڑتی تھی، نمک قانون توڑنے اور نمک ٹیکس اویژن (evasion) کرنے کے بعد، لینڈ ریونیو ایکٹ توڑنے اور انکم ٹیکس وغیرہ تک اقدام ہوتا۔" ڈپٹی صاحب اک ذرا رکے بلکہ شاید یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ لوگ میری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہے۔ مگر انھیں گفتگو چاہے کتنی ہی طویل اور قصہ طولانی کیوں نہ ہو، بات کو اپنی دلچسپ بنائے رکھنے کا ملکہ حاصل تھا، چناں چہ یہ محسوس کر کے سب کے سب بقیہ داستان سننے کے لیے متوجہ ہیں، اپنی بات جاری رکھی:

"سیتاپور جنگل تھانے کے انچارج کے مژدے پر انگریز ایس پی بہت خوش ہوا۔ فوراً مسٹر پرکاش دوبے کلکٹر صاحب بہادر کو فون پر اطلاع دی۔ انھوں نے فوراً مع تھانے دار انچارج کے اپنے پاس بلالیا۔ کلکٹر صاحب بہادر نے مزید ہمت افزائی سے نوازا، اور کنگ پولیس میڈل کی سفارش کی تجویز ایس پی کے سامنے رکھی۔ اپنا چھپا ہوا پولیس سرٹیفکیٹ بھی خانہ پری کر کے عطا کیا اور نقد نقرئی نہ سہی، کاغذی تعریفی انعام اور طلائی بہادری کے تمغے کی امید سے سینہ سجا کر واپس کیا۔ واپسی میں منشی برج گیان نے گنگا جلی اٹھا کر مجھ سے قسمیہ بیان کیا۔ اب دروغ برگردنِ راوی کہ انھوں نے جو کچھ ایکشن لیا، وہ کلکٹر صاحب بہادر اور مسٹر پرکاش دوبے کی تجویز اور ہدایت کے مطابق تھا۔ بہرحال وہ شہر سے پلٹے تو ڈھائی سیر لال نئی مرچوں کا پڑا مسالہ منڈی سے لے کر تھانے پہنچے۔ اُن کا اپنا سامنا تو صبح ہی صبح ذرا بس ایک جھلک گشتی گارڈ والوں سے چارج میں لیتے ہوئے ہوا تھا اور حوالات میں بند کر دیا تھا۔ واپسی میں انھوں نے مرچیں تو تھانے میں ہمہ وقت چار حاضر دس نمبریوں کے حوالے، ترکیبِ استعمال بتا کر کیں اور خود عقبی دروازے سے اپنے کوارٹر میں گھس گئے، اور پھر سامنے نہ پڑے۔ ان پانچ مستعد مسٹنڈوں نے، ناک منھ پر کپڑے کے چیتھڑے لپیٹ کر، سل پتھر پر مرچیں نہایت باریک پیس کر کپڑ چھن کیں اور دو بالٹیوں میں گاڑھا گاڑھا لیپ بنایا۔ مہاشے جی کو حوالات کے سینخوں سے باہر نکلوایا اور برآمدے میں پچھاڑ کر دبا لیا۔ ایک بالٹی کا گاڑھا گاڑھا پلاسٹر گھٹنوں سے ناف تک آگے اور ایک بالٹی پنڈلیوں ایڑی سے کمر تک پیچھے چڑھا کر، چیتھڑوں سے پٹیاں باندھ دیں۔ چھکڑا بیگار میں پہلے تیار کر رکھا تھا۔ ایک کچی پرچی کے ساتھ، سادہ کپڑوں میں ایک کانسٹیبل جو اُسی حلقے کا تھا، جس میں آگے گھنے جنگل کے اندر ایک ڈسپنسری قسم کا شفاخانہ واقع تھا اور کمپاؤنڈر ڈسپنسر کے انچارج میں تھا، چلتا کر دیا اور میاں یوں نمک توڑ قانون کا توڑ مرچ کاری کرا کر کر دیا۔"

"سی سی سی" کچھ آوازیں مجمعے میں سے سنائی دیں اور کہا:

"یارو! ہم تو خیر یوں ہی اپنے پاؤں چڑھے ہوئے ہیں، ان سول سروس کے چڑھے اور اسٹاف ایڈمنسٹریشن کے پڑھائے ہوؤں کی جودتِ طبع کی داد دینی پڑتی ہے۔"

"نہیں میاں! یہ بھی برہمن بہ برہمن روایتی چشمک والی بات تھی، یہاں دوبے تھا، وہاں

مراد آباد میں چوبے اور پنتھ سے معالمت تھی۔ لکھنؤ کے بعد پنتھ کا شیڈول پروگرام تو فیض آباد تھا، اور جا پہنچے مخالف سمت، راتوں رات سیتاپور جنگل میں، وہ ڈھونڈتے پھرے کہ جنازہ کدھر گیا، یوں نکالنے کو جلوس، مظاہرے اندولن نکالے مگر بات بنی نہیں۔ نمک قانون اسکیم مشہور بات ہے، ناکام رہی۔ یوپی صوبے کی لتاڑی ملک بھر میں فیل ہوئی اور اس کا سہرا میرے دونوں باسوں کے سر بندھا اور اُن دونوں نے میرے سر چڑھایا۔ کریکٹر رول میں اندراج اور خان بہادر کا خطاب عطا کیا۔ اُن کی رپورٹ پر مجھے سکریٹریٹ نے طلب کیا، ترقی کا مژدہ سنایا اور اس عنایت کے ساتھ کہ میری رائے اور پسند طلب کی۔ تین چیزیں مجھے پیش کیں۔ کسی ضلعے کا انچارج ڈپٹی کمشنر کلکٹر، سینٹر میں ڈپٹی سکریٹری یا صوبے میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف اسٹامپس۔ مگر ایڈمنسٹریشن سے بھر پایا تھا۔ حاکم ضلع بننے سے یوں بھی پہلوتہی کی اور پھر جھنجھٹ تھی اور پھر آگے امکانات اور سیاست کاروں کے رخ بھی ترچھے ہی ترچھے تھے۔ اس چکر میں نہ پڑا۔ فتنے اٹھنے کے اندیشے تھے۔ دفتر کی نوکری اور میز کرسی سینٹر میں بیٹھ کر کلرکی کرنا میرے بس کا روگ نہ تھا۔ یہ مال کی جگہ ٹھیک تھی۔ چناں چہ ایک سال ڈپٹی انسپکٹر جنرل اسٹامپس رہا اور سال اندر پانچ انکری منٹ دے کر دوسرے سال ہی صوبائی چارج دے دیا۔ اب چار سال سے انسپکٹر جنرل آف اسٹامپس ہوں اور سروس کا آخری سال ہے۔ ریٹائرمنٹ پر جا رہا ہوں۔ ادھر مہاشے جی سیتاپور والی جنگل کی ڈسپنسری نکل کر، بھلے چنگے ہو وزیراعلیٰ کے عہدے پر جا پہنچے اور اڑی دھڑی قاضی کے سر پڑی۔ جوتے کاری سے لے کر مرچ کاری تک سب کا سب، مجھ ہی کو کرتا دھرتا سمجھتے رہے ہوں گے۔''

اور کسی نے آہستہ سے کہا، ''ہاں سامنا بھی تو آپ ہی کا ہوا تھا۔ وہ حاکمِ اعلیٰ دوبے اور انگریز ایس پی تو بہت دور رہے تھے۔''

اور ڈپٹی صاحب جواب میں بولے:

''اجی وہ تو تھانے دار بھی اک جھلک نظر پڑا تھا جس کے ہاتھوں سب کرم ہوئے تھے۔ اور وہ تو جب ہی سے کنگ پولیس میڈل پا کر، ریٹائر ہو کر گھر بیٹھا پنشن کھا رہا ہے اور میاں مجھے ریٹائر ہوتے ہوتے اپنے عہدے کے زیرِنظر ایک کرنسی کال کرنا ہی تھی، جو میں ادھر آٹھ نو مہینے سے ٹال رہا تھا۔ ویسے لیو فار ریٹائرمنٹ بھی ڈیو تھی، چاہتا تو گھر بھی بیٹھتا لیکن میں میدان نہ چھوڑنا چاہتا تھا، جب تک کہ پنشن کے کاغذ دستخط ہو کر نہ آجائیں اور ہمارے وزیراعلیٰ وکیل آدمی ہیں۔ کاغذ کو دستخط کرتے کرتے الٹ پلٹ کر رخ سے جانچتے ہیں۔ یوں تو دعویٰ ہے کہ ہمارا اصول ماضی فراموشی ہے، حتیٰ کہ جیل کی مدت بھی اپنی عمر سے نکال کر بتاتے ہیں اور کچھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔''

اور کوئی بولا، ''یوں کہیے ملک الموت کو بھی ٹجل دیتے ہیں۔'' قہقہہ پڑا۔ لیکن ڈپٹی صاحب خلافِ معمول سنجیدہ رہے اور کہا:

''ہاں میاں! یہ بھی منافقت کاری ہے، لیکن آج وہ میرے محسن ہیں اور میزبان بھی ورنہ ابھی

کل کی سی چار پانچ سال کی بات مجھے یاد ہے، اور ان کی تو نس نس کو یاد ہوگی اور میاں میں تو اپنی روزی کے اندیشے میں گیا تھا اور قاضی جی شہر کے اندیشے میں دُبلے تھے۔ پیشہ ور سیاست داں ہیں اور یہاں نوکر پیشہ، ۳۰ برس عمر بتائی ہے اور حلال کی کما کر کھائی ہے۔ اور میاں عقیدہ یہ ہے کہ روزی آسمان پر ہے، زمین پر نہیں، رزاق مطلق کے ہاتھوں میں ہے۔ پتھر کے اندر کیڑے کو پہنچاتے ہیں۔ ویسے شاد ناشاد اور بات ہے۔ انگریز کا چھپر سر پر سے سرکتا لگ رہا ہے، اب تم اپنی اپنی سوچ لو۔ یوں بھی سروسز میں انڈیانائزیشن اسکیم کے بعد، کوٹے اور مسلمان حصے کے تناسب سے نظر آتے ہو، اب ان سے پالا ہے۔ اور نسلوں کا۔ عزت، ذلت، زمین ملک کے متعلق تو کھلے لفظوں صاف صاف کہہ دیا ہے اور تفسیر کیجیے تو فتح شکست بھی جسے چاہتے ہیں دیتے ہیں اور جس سے چاہتے ہیں چھین لیتے ہیں۔ کافر مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں۔ عمل اور رویتے پر منحصر ہے ورنہ مغل فرماں روا ہرات غزنی سے آسام بنگال برما کی سرحد تک کے مالک تھے۔ موٹی بات ہے ڈھکی چھپی نہیں۔'' ظریف الدین بھائی کی بات اس گھڑی اُن کے مسلک اور معمول کے خلاف قنوطی ہو رہی تھی، ورنہ وہ تو موت کے تلخ ذکر میں بھی شوخی اور مزاح کی چاشنی ملا دیتے تھے۔ انھوں نے ایک گھونٹ لیا۔ لوگ سمجھے پینترا بدلیں گے، لیکن چاشنی کے بجائے کھسیا نپٹ سے بولے:

''اپنے عہدے اور عمر پنشن پر پہنچنے کی اہمیت و نزاکت کے تحت، وزارتِ اعلیٰ کا قلم دان سنبھالتے ہی دم ہلاتا اُن کے حضور پہنچنا چاہیے تھا۔ اپنی اُفتادِ طبع، خواہ مخواہ کا مبہم خوف اور انتشار چل رہا تھا اور آج تک منتشر رہا اور ایں ہمہ آوردۂ تست کے وسوسے میں مبتلا۔ کیوں کہ تمام المیہ ڈرامے میں ہیرو اور ولن کا نمایاں کردار میں ہی چلا آ رہا تھا اور اندولن کے وقت تو لکھنؤ کے اندر کہیں سڑک پر بھی نظر نہ آیا تھا، شاہ مینا صاحب کی زیارت کے حجرے میں چھپا بیٹھا رہا تھا۔ شام کو بھی زیرِ حراست مہاشے جی کو رُو براہ کرنے اور تواضع کے ساتھ اپنے گھر لا کر بات کرنے کے ارادے سے گیا تھا، مگر انھوں نے وہاں بات کرنے سے بھی انکار کیا بلکہ الٹی کج اخلاقی دکھلائی۔ گھر لانا تو درکنار، وہاں تھانے میں ہی سلام دعا نہ ہوئی۔ ان کا مقام جیل حوالات تھا اور میں نے انتظامی طور پر ضلع بدر کیا جو ایڈمنسٹریشن میں نامناسب عمل ہے۔ اور اس میں اُن کا ہم قوم کالا ایڈمنسٹریٹر، گورا امپورٹڈ ایس پی، حتیٰ کہ اُس کا ادنیٰ ماتحت تھانے دار کوئی بھی بکھیڑ میں نہ آئے۔ اڑی دھڑی قاضی کے سر پڑی، الکھیڑ پچھاڑ، مرچ مالش، یہاں قیصر باغ تھانے کی مار پیٹ کے کھاتے میں پڑی۔ ایک اکیلا پورے ڈرامے کا میں ہی ہیرو بنا اور آج نادم ہو کر سوچتا ہوں کہ ایں ہمہ آوردۂ تست۔ پھر آج وزیرِ اعلیٰ سے بہ ایں تاریخ کس منہ سے آنکھیں چار کرتا۔ اور صفائی معافی تلافی ہوں بھی تو کس طرح اور کن خطوط پر۔ اور بھئی ہم بھی کرُسی کال لیتے اور کبھی کبھی دیتے بھی ہیں۔ اس کا حساب یہ ہے کہ آنے والے خواہ ذہن سے محو ہو جائیں، پر نہ آنے والا ذہن کی بلیک بک پر ضرور اندراج ہو جاتا ہے جو کریکٹر رول سے بھی زیادہ پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ چہ کنم میں مبتلا

رہا۔ یہ ڈیوٹی فرائضِ منصبی میں سب سے زیادہ اہم تھی۔ چناں چہ انھیں قلم دان سنبھالے سال ہونے آیا، لکھنؤ سے آج نینی تال تک "طوافِ کوئے ملامت" ناتما رہا۔ آنکھیں چار ہونے کے لیے الرٹ نہ ہوسکیں۔ اب اسی عرصے میں پنشن کے کاغذات سامنے پہنچنے کا وقت آ لگا۔ ذرا سی پچڑ میں، اجی سرخ فیتے کے چکر میں ہی اگر سال ڈیڑھ سال اور لپٹ گیا تو مرغی کو ٹکلے کا گھاؤ۔ ادھر آدابِ عاشقی برتتے ہوئے، عزتِ سادات کے ضیاع کا ڈر، سوچا گھر بیٹھے اٹھ کر پہنچوں۔ آبیل مجھے مار۔ آپ لوگ جانتے ہیں، ہر سال مئی جون میں ہمیشہ سے تین چار ہفتے یہاں ہوا کھانے کے لیے آتا ہوں۔ نواب محمد یوسف کے ہاں ٹھہرتا ہوں۔ اہلیہ ساتھ ہوتی ہیں اور نواب صاحب ڈرانگ روم پالیٹیشن، استاذالاساتذہ۔ تقریباً رات کو روزانہ ہی نواب صاحب سے ڈس کس ہوتی۔ انگلش ہاؤس ظہور وارڈ کے زمانے والے علیگ۔ مولانا ظفرعلی خاں بھائی کے جونیئر۔ بڑے سلجھے ہوئے اور اہل الرائے پالیٹیشن، مگر شیر قالین، تاہم عاقل! انھوں نے رائے دی کہ کرٹسی کال لازمی ہے، لیکن تنہائی میں اور جو میرے امکان میں یوں آسانی سے نہ تھا۔ ویسے پتا چلا تھا کہ میرا ایک ابھی انھیں پچھلے سالوں کا شاگرد نوجوان پراونشنل سروس کا چھوٹا مجسٹریٹ، نیا نیا وزیراعلیٰ کے پرسنل اسٹاف میں لگا ہے، جسے میں نے ٹریننگ سے نکلنے کے بعد لکھنؤ کے زمانے میں ساتھ اجلاس کے اندر بٹھال کر کام سکھلایا تھا۔ اتفاق سے ابھی اُس روز جھیل کے کنارے سڑک پر سامنا ہوگیا۔ اور بھی سکریٹریٹ والے ساتھ تھے۔ دست بستہ آداب کیا، پاؤں چھوئے اور ساتھیوں کو چھوڑ کر ساتھ ہولیا۔ پیارا سا لڑکا ہے، کائستھ بچہ۔ اُس کی سعادت مندی کے زیرِنظر میں بوٹ ہاؤس والے کیفے میں لے گیا۔ اندازہ ہوا کہ پرسنل اسٹاف کا بارسوخ افسر ہے۔ اُس کا سعادت مندانہ انداز دیکھ کر میں نے وزیراعلیٰ سے ملاقات کرانے کی فرمائش کی۔ ساتھ ہی از قیصر باغ لکھنؤ تا جنگل تھانا و شفاخانہ سیتاپور یہاں سے وہاں تک اپنی اور اُن کے دونوں ہی کے ایامِ جہالت کی مفصل روداد سنائی تو خیر افسر ذرا متعجب ضرور ہوا۔ میرے متعلق باپ جیسا حسنِ ظن رکھتا تھا اور مجھے اندازہ ہوا کہ پرسنل اسٹاف میں قابو یافتہ آدمی ہے، خود وزیراعلیٰ کے اندر پورا اُترا ہوا ہے لہٰذا کام کا ہے۔ بڑے نیازمندانہ انداز میں بولا:

"بسروچشم، ایشور چاہے گا تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر کے خوب صورتی سے کرادوں گا۔"

اور میں لکھنؤ سے یہاں تک پنتھ جی کے ملنے ملانے، پروگراموں کے طریقے معلوم کرتا رہا تھا اور وہی کم و بیش میرے نوجوان شاگرد نے بتائے کہ موڈ پر منحصر ہے اور اندازہ ہوا کہ موڈ سازی بہت کچھ اس نوجوان کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ نوجوان شاگرد نے ایک ذرا سوچ اور گھونٹ سا لے کر مجھ سے پوچھا:

"پھر آپ ملاقات کیسی چاہتے ہیں۔ وہ آپ کے رتبے کے مسلمان ملازمین سے ان دنوں مخصوص انداز سے ملتے ہیں، ورنہ تو کمشنروں اور دوسرے بڑے بیوروکریٹوں سے کبھی دفتر میں کھڑے کھڑے خود ہی متعارف ہوکر ہاتھ ملاتے ہیں، کبھی باہر پویلین میں بینچوں پر دو چار چھ کے درمیان آ بیٹھتے ہیں اور محکمے کے متعلق دریافتِ حال گپ شپ ہوتی ہے۔ کسی کو اکیلے میں کچھ کہنا سننا ہوں تو اکیلے میں

ارینج (arrange) کر دیتا ہوں اور ویسے موڈ پر بھی ہے۔ بنیادی طور پر پرانے ناکام وکیل اور آج بہ فضلہ نئے کامیاب سیاست داں ہیں، یوں سمجھیے سرد وگرم چکھے ہوئے۔ اور اب عملی طور پر نہ سہی لیکن ذہنی طور پر نہایت مصروف! اور آپ جانتے ہیں اونچے سیاست داں اگلے دس سال کی سوچتے ہیں۔ اب دیکھیے نا سروسز میں انڈیانائیزیشن کی پالیسی کے بعد ایڈمنسٹریشن سے گورے انگریز افسر گدھے کے سینگ ہو گئے اور اپنے صوبے کی اور اسی طرح پورے ملک سے عدلیہ سے اوپر تک مدتوں پہلے سر تیج، ڈاکٹر سین، سر اقبال اور حافظ مشتاق ہائی کورٹ بدر کر دیے تھے اور ایسا ہی تمام ملک میں ہوا ہے۔''

نوجوان بہ کمال نیازمندی کہتا رہا کہ اپنے پاس تو جو کچھ ہے آپ ہی کا عطیہ ہے، آپ جیسا کہیں ویسا انٹرویو کرا دوں اور یہاں مجھے اندازہ ہوا کہ یہ نوجوان جیسا کہ ہوتا چلا آیا ہے، اپنے بوڑھے باس کا عقلِ کُل ہو رہا ہے۔ اُس نے بتایا کہ دس سال اندر اندر یہ لوگ ہندوستان کے اندر سے برطانیہ کا پتّا کاٹنے کی سوچ رہے ہیں اور جیسا کہ میں نے مثالیں دے کر عرض کیا ایڈمنسٹریشن اور جوڈیشلی جیسے اہم اداروں کو تو انگریزوں سے خالی کرا ہی لیا ہے۔

اور میاں! یہ بہت چھوٹا اور کم عمر بھی آدمی تھا اور نواب صاحب بہت بڑے، پختہ کار، جہاں دیدہ اہل الرائے۔ بات اس سے اس وقت ہوٹل میں اور چائے کی میز پر ہو رہی تھی۔ اور ان سے رات کو بعدِ طعام ڈرائنگ روم میں، البتہ اس کام میں یہ کچھ مددگار ثابت ہونے کی پوزیشن میں تھا۔ نواب صاحب نے ہمیشہ اور رات بھی یہ رائے دی تھی کہ بہ نظرِ احتیاط تنہائی میں ملوں۔ نیز اُس نے اک ذرا کھٹکتی ہوئی اور مبہم سی بات بر سبیلِ گفتگو یہ کہی تھی کہ پنتھ جی آپ جیسے رینک کے لوگوں سے خاص نہج سے بات کرتے ہیں۔ جو میں نہ سمجھ پایا تھا۔ تاہم میں نے تنہائی میں اور معمولی کرٹسی کال کرا دینے کے انتظام کے لیے کہا۔'' بھائی ظریف الدین نے بولتے بولتے اک ذرا توقف کیا، مگر ہم سب کی دلچسپی اور انہماک دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولے:

''جیسا کہ بتلایا مستقل طور پر خصوصاً روزانہ کھانے کے بعد نشست میں نواب صاحب سے 'کرٹسی کال' کے متعلق مختلف پہلوؤں سے بات ہوتی رہتی۔ وہ ہر صورت سے تالیفِ قلب کرتے رہتے۔ ان لوگوں کے حزبِ اختلاف قسم کے رفیقِ کار تھے اور نفسیاتی طور پر خوب محرمِ راز۔ لیکن مشورے کا میزان یہی لگتا کہ تنہائی میں ملوں، اسی پر بحث رہتی اور اسی مشورے کے بہ موجب میں نے وشنوسہائے کو ہدایت کر دی۔ اگرچہ اُس نے اطمینان تو ہر پہلو سے دلایا، لیکن اس بات پر چپ سا ہو گیا جیسے متفق نہیں ہے اور خلافِ امید آج تیسرے روز ہی ارینج ہو گیا اور کل ہی شام وہ کان پور ہاؤس میں آکر بتا گیا کہ مجھے دس بجے کے بعد سات منٹ وقت دیا گیا ہے۔'' سکون سے سننے والوں کے چہروں پر اک ذرا کی ذرا بے چینی اور پرچول کی نشانیاں ابھریں، مگر ڈپٹی صاحب نے اُسی روانی کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی:

''سو میاں! رات تو بُرے بُرے خواب دیکھے۔ اُچھلوں ڈوبوں نیند میں گزری۔ صبح فجر پڑھ کر

بیوی سے کہا کہ تم اور نواب بیگم دونوں ایک مصلّے پر بیٹھ کر دعائے ردِ بلا پڑھ کر ساعت گھیرو، آج دس بجے قسمت کا فیصلہ ہے۔ پونے دس بجے تک میں خود درود شریف پڑھتا رہا، اور ابھی دس بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے، نواب صاحب کی چھوٹی لیمبا پر سوار ہو کر گورنمنٹ ہاؤس گیٹ پر پہنچ گیا۔ پہلے تو پیش دروازے کا سنّاٹا دیکھ کر ماتھا ٹھنکا۔ اکیلی ایک اپنی گاڑی ورنہ اس وقت میلا لگا ہوتا۔ اندر بڑھا تو اندازہ ہوا جیسے دربان کو کچھ میرے متعلق ہدایت ہے۔ پرچہ پاس نہ مانگا۔ سیکورٹی پر پہنچا تو لق و دق کمپاؤنڈ کا سکوت دیکھ کر اور بھی پرچول ہوئی۔ سیکورٹی کے کمرے میں دو اردلی اور ایک اکیلا چھوٹا سا اہل کار، ٹنڑوں ٹوں۔ باہر کا سناٹا کمپاؤنڈ کے سکون کی حیرت پرچول سب کی سب، کھٹکے دغدغے میں ڈھل گئی۔ شبہ ہوا کہ جیسے وزیراعلیٰ صاحب کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ نائب تحصیل دار رینک کا ماتحت سیکورٹی آفیسر سلام کرتا ہوا کھڑا ہو گیا اور الفاظ اور عذر تو یاد نہیں، تاہم اُس نے وشنو سہائے کی جانب سے معذرت خواہی کا پیغام پہنچایا، ورنہ کان پور ہاؤس سے چلتے وقت میرا خیال تھا کہ وشنو سہائے باہر مجھے گیٹ پر کھڑا ملے گا۔ ماتحت سیکورٹی آفیسر جسے بولتے ہیں ہاتھوں ہاتھ لے کر چلا۔ نہ وزیراعلیٰ والے دفتر کی جانب، نہ پویلین ہی کی طرف۔ وہ تو پورٹیکو کی سمت میدان پار کرتا ہوا بڑھا۔ باہر گیٹ کے سناٹے کمپاؤنڈ کے سکوت اور اس سیکورٹی آفیسر ہی کے خاص انداز اور عام رویّے کے برتاؤ ہی نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ یہ یک نہ شد دو شد۔ قدم قدم پر حیرت سے دوچار ہوتا رہا، جو شاید باوجود اس کھدر پوشی اور عریاں فقیری کی ریاکاری کے، نشست کے لیے مقدر تھا صوبائی گورنروں کا یا پھر ہائی کمانڈ پالیسی ساز نیتا مہاشوں کی محفلِ مشورت کا، 'رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند کے لیے۔' اور میں تو مدت سے ملاقات کی تفصیل معلوم کرتا رہا تھا اور اس سلسلے میں گاہے گاہے حاضر اردلیوں سے ملاقاتیوں کی تقاریب ملاقات اور شانِ نزول کے چھوٹے چھوٹے راز بھی ضمناً علم میں آجاتے، جو مجھ سے غیر متعلق تھے۔ میاں لکھنؤ سے یہاں تک سال بھر سے کیا ہی کیا تھا۔ لال خاں نے اونٹ ہی بٹھائے تھے۔ ایک ایک اردلی گانٹھ رکھا تھا...''

ڈپٹی صاحب نے ایک ذرا پھر سکوت کیا، وہ پہروں اس انداز میں بولنے اور ایسی گپ شپ کو اپنے اندازِ خاص سے دلچسپ بنانے میں طاق تھے۔ سننے والوں کی دلچسپی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ لمحہ بھر بعد ڈپٹی صاحب پھر بولے:

''اس وقت جو قدم بڑھا، بھاری ہوتا گیا اور پورٹیکو میں پہنچ کر سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے حیرت اور تلاشِ تحقیق کی پوٹ بن کر رہ گیا۔ برآمدے میں پاؤں من من بھر کے ہو گئے اور سیکورٹی آفیسر نے مجھے وکٹورین دور کی تعمیر اور اسی انداز سے مرتب لق و دق ڈرائنگ روم میں کھڑا کر دیا اور یہ پاؤں قالین پر پہنچ کر بالکل ہی دھنس گئے، جیسے رنگین دلدل میں پھنس کر رہ گیا اور اس نے تو شاید کسی نشست کی جانب بیٹھنے کا اشارہ بھی کیا، مگر میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر ڈر سے ذرا سنبھلا۔ ہوں، عقل بروئے کار آئی۔ وزیراعلیٰ آئیں تو کھڑا نہ ملوں بلکہ تعظیماً اپنی نشست سے کھڑا ہو کر استقبال کروں۔ چناں چہ ایاز قدر

خود نہ شناس، ایک پونے نام کا گدے دار مونڈھا تلاش کر لیا اور دبک گیا۔ ہوں آج سنبھال کے بدلے چکائیں گے اور کسی مسخرے شاعر کا مصرع وسوسے میں گزرا:

بیٹھالا چارپائی پہ اور فرش کر دیا

اور میں آج کے سناٹے، سکون اور تنہائی باہر سے اندر تک کڑیاں ملانے لگا۔ وشنو سہائے اپنے شاگردِ رشید کے استادِ مکرم کی درگت بنتے نہ دیکھ سکے۔ سین سے غائب ہونے کی سعادت مندی کا اندازہ کیا اور یہ کہ آج خیریت نہیں ہے۔ لیلائے سول سروس کے عشق اور حصولِ وصل کے بعد لنگوٹی سونٹھی مقدر ہونے کا جاتے جاتے تجربہ دیکھا۔ جیل کے مغرور والی کیفیت کا کچھ کچھ اندازہ ہوا۔ درود شریف تو پڑھتا راستے بھر آیا تھا، اس گھڑی کثرتِ ورد اور واردات نے زبان خشک کر دی۔ اگرچہ بڑا محیط اور مکمل سناٹا تھا، تاہم جیسے کھوپڑی کے اندر ہی سے جوتیوں جیسی پھٹ پھٹاہٹ آوازیں اٹھ اٹھ کر کانوں میں اتر رہی تھیں اور قیصر باغ تھانے کے کاغذات میں تو اندراج نہ تھا، تاہم نوشتۂ دیوار سامنے تھا۔ میاں سنگین دیوار پر اینٹ مارو تو دیوار پر چھوٹا سا لال گیرو کا دھبا چھوڑ کر کبھی الٹی اپنے منہ پر بھی پڑتی ہے اور نکسیر پھوڑ دیتی ہے۔ چاروں ہی سمت سے آتے ہوئے کوریڈروں پر کان لگے ہوئے تھے، کیوں کہ شدہ تلی کے تلے والی چپلوں میں چرمرتو کیا ہلکی چاپ بھی نہیں ہوتی، جو وزیرِ اعلیٰ کے زیب پا زیرِ پائی ہوتی تھی۔ یکایک آپڑنے کا دھڑکا لگا ہوا تھا اور میرے کان پوری ذکی الحسی کے ساتھ چاپ پر اور سیدھے جانب والی کوریڈر کی چاپ سے تشریف آوری کا سراغ ملا اور ابھی کئی گز اُدھر ہی تھے کہ میں اپنے داخلی اضطراب کو دبا کر اٹھ کھڑا ہوا اور وہ اپنے مخصوص مہاشوں والے انداز میں دونوں ہاتھ جڑا، عاجزی کے ساتھ ہونٹ اور دانت کھلا، ترکیب تو یاد نہیں (تاہم آداب عرض ہرگز نہیں) جو ہندو مسلمانوں میں مروج پرانا سلام ہے، شاید نوتصنیف "جے ہند" ادا کرتے بڑھے۔ میں نے بھی ڈرتے ڈرتے اک ذرا سرنگوں سے ماوجبات ادا کیے۔ لیکن اللہ گواہ ہے نوکِ زباں سے اور وہ مزاج پرسی اور مصافحے کے نرم انداز میں اثبات ہی اثبات! اور مزاج پرسی میں گہرا خلوص، سب کچھ۔ لیکن بے چارے سر کو کیا کرتے، وہ تو نفی ہی میں ڈول رہا تھا اور عاجزی کے ساتھ سکڑے، مسکراتے سے ذہن کے ساتھ سب کچھ انمل بے جوڑ سا تھا۔ تمام کا تمام نفی میں پانی پھیرتا ہوا۔ مثبت منفی کامیڈی بنے، وزیرِ اعلیٰ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا، گویا کہا ہم تم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر فارس (farce) ہی فارس، فراڈ ہی فراڈ ہیں۔ تم برابر بیٹھ کے میرے برابر نہیں ہوسکتے اور نہ اپنی جوتیوں کے زور سے میرے سر کا سودا نکال سکے۔ دیکھ لو نا، آج میاں کا جوتا میاں کا سر ہے۔ تم میرے نہیں قابضِ طاقتِ برطانیہ کے جرنیل ہو اور ساتھ ہی ساتھ عاجزی کے ساتھ فرمایا:

"ڈپٹی صاحب! مجاز تو اچھی طرح ہیں۔"

اور میں ڈپٹی صاحب کی ترکیبِ استعمال پر چونکا۔ ڈپٹی صاحب ادا کرتے ہوئے لہجے میں مجھے مخصوص اور تحصیل داری کے زمانے کے پرانے عہدے کی آواز کا اور لکھنؤ سٹی مجسٹریٹی والا قیصر باغ

تھانے کا جھٹکا سا سنائی دیا اور تمام کی نمایاں، نمائندگی کا اظہار، مصافحے والا ہاتھ اپنے کرخت جیل کے مشقتی والے پنجے میں دبائے ہی دبائے، رسان رسان کھینچتے سے ذرا اک جانب کو لے چلے اور اپنے برابر صوفے پر دھر لیا۔ ادھر میں نے چلتے چلتے صحت کی:

''جی سرکار! انسپکٹر جنرل آف اسٹامپس ہوں ان دنوں...''

''ہاں، ہاں وہ تو مجھے معلوم، ہوں... اور آپ کو ریونیو میں لگا دیا، ایں... پھر آپ تو بڑے اچھے ایڈمنسٹریٹر تھے... خیر ہاں... ہے نا...''

انداز سوالیہ سا ہو گیا اور میں نے گرے ہاؤنڈ کی بو پائے خرگوش کی طرح کان کھڑے کیے اور جھکا کر چپکے سے جیسے دبک سا گیا۔ اُن کی تواضع خاطر اور اپنے جور و ستم کے زیر و بم، اُن کے اندازِ مشفقانہ کے، یوں کہیے جوابی منتقمانہ ظلم و جور کے انداز ستم میں نرم صوفے اور لچک دار اسپرنگوں میں جہاں کا تہاں جیسے متھرا کر رہ گیا۔ دل ہی دل میں دعائے ردِّ بلا بڑھی، یا اللہ تو بڑا کریم و کارساز ہے۔'' بھائی ظریف الدین کے ہونٹوں پر وہ مخصوص تبسم جو دورانِ گفتگو اک ذرا کی ذرا کھیلتا اور خود ہی ختم ہو جاتا، ایک بار پھر نمایاں ہوا، ایک عجیب سا ہلکا سا ہنکارا سا ابھرا اور پھر اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولے:

''نیتا جی نے بڑے اچھے ایڈمنسٹریٹر کی تعریف کا جوتا رسید کرتے ہوئے پتا نہیں، اپنے ایامِ جرائم یا میرے دورِ حکومت کی نشان دہی کی، لیکن بہرحال چوٹ مجھ ہی کو سہلانی پڑی۔ اور تم لوگ سب شاید نہ جانتے ہو، لیکن پتا نہیں کیسے اُن کے علم میں تھا کہ میں یونی ورسٹی کورٹ کا ممبر بھی ہوں اور ڈاکٹر ضیاء الدین کا خاص آدمی ہوں۔ چناں چہ موصوف نے ڈاکٹر صاحب کے اور اپنے ذاتی خصوصی تعلقات کا ذکر چھیڑا۔ ویسے صاحب زادے آفتاب احمد خاں اور سر راس وغیرہ سے بھی دوستی کا دم بھرا۔ اندازہ ہوا کہ خصوصی نہ ہوں عمومی تعلقات ان سب سے ضرور ہیں۔ جان پہچان یاد اللہ سی ہے۔ گھما پھرا کر بات ابھی اسی سال چند ماہ پیش تر منعقد ہونے والے ضمنی صوبائی الیکشن بجنور تک لے گئے جو حافظ محمد ابراہیم اور مولوی محمد سمیع وکیل کے درمیان ہوا تھا اور انڈیا ایکٹ ۳۵ء کے ذریعے کانگریس اور مسلم لیگ کا پہلا پارٹی لائن پر مقابلہ تھا، جس کے متعلق ہنوز ہم بھی ہندوستانی مسلمان گومگو میں ہیں، کیا انڈیا ایکٹ ۳۵ء کی مراعات کے ذریعے ہونے والی نیابت میں ہندوستان کی سیاست کوئی نیا موڑ لے گی؟ اور اس میں مسلمان اقلیت کا کیا رول کیا حصہ رہے گا؟ اس ضمنی الیکشن میں مولانا آزاد، گاندھی جی، پنڈت نہرو، رفیع احمد قدوائی اور شاید آج کے اپنے وزیراعلیٰ مہاشے جی بھی کانگریس کو ملک کی واحد نمائندہ جماعت ثابت کر دکھانے کے لیے، مسلم لیگ کے سامنے مقابلے کے لیے صف آرا ہوئے تھے اور جناح صاحب، علمائے فرنگی محل، مولانا ظفر علی خاں، چودھری خلیق الزماں، نواب صدیق علی خاں اور کون کون صفِ اول کی مسلمان ہستیاں مسلم لیگ کے جھنڈے تلے سینہ سپر تھیں۔ ابھی اسی سال کے اوائل کی بات ہے۔ حالاں کہ اس میں مسلم لیگ کے امیدوار کو تھوڑے سے ووٹوں سے شکست ہوئی، اس کی کئی وجوہ ہیں۔ پہلی

چیز تو کانگریس کے کینڈیڈیٹ نے وزارت سے استعفیٰ دے کر چیلنج کیا تھا اور کانگریس پارٹی کے مالی وسائل کے ساتھ ساتھ سرکاری اثرات پوری طرح کارفرما تھے اور یہ بھی کہتے ہیں مسلم لیگ کا اُن کا مدِمقابل امیدوار غیر ہر دل عزیز سا آدمی تھا۔ اس الیکشن میں جناح صاحب علی گڑھ ہوتے ہوئے بجنور پہنچے تھے۔ یونی ورسٹی نے بڑا جوشیلا استقبال کیا تھا۔ طلبہ و اساتذہ اور علی گڑھ کے رؤسا اشرافیہ نے اسٹیشن سے اسٹریچی ہال اور اولڈ بوائز لاج تک بگھی اپنے کندھوں پر کھینچی تھی۔ دو ایک روز قیام کر کے جب الیکشن کیمپین کے لیے بجنور پہنچے، تو علی گڑھ والے قائداعظم کا لقب دے کر یونی ورسٹی کے پسندیدہ پسندیدہ سنجیدہ طلبہ، پوری یونین کی کیبنٹ اور یونین کا وائس پریزیڈنٹ، یونی ورسٹی کے خاص خاص اساتذہ بھی ساتھ تھے۔ کنویسنگ کے سلسلے میں جو تقریریں کیں، اُس میں انگریز حکومت کے خلاف تو خیر بولے ہی بولے، لیکن کانگریس پارٹی اور نوزائیدہ کانگریس حکومت کے متعلق خوب خوب پول کھولے اور مسلمانوں کے ساتھ کانگریس کا معاندانہ رویہ بے نقاب کیا۔ یہ یونی ورسٹی کا پہلا سیاسی عمل تھا، اور آج ہمارے وزیرِاعلیٰ آئندہ کے لیے یونی ورسٹی کے سیاسی رویے کی پرچول میں تھے۔ بڑے سیاست داں ہیں۔ یہ ہندو کانگریس کو من مانی کرنے اور ہندوستانی مسلمانوں کو غلام بنا کر دوسرے درجے کا شہری بنا رکھنے کے راستے میں سب سے بڑا روڑا مسلم لیگ، قائداعظم اور علی گڑھ یونی ورسٹی کو سمجھتے ہیں۔ لیکن بھائی میں پتے پر نہ آیا۔ وہی پیٹنٹ سرکاری نوکری والا عذر لنگ کہ سیاست میں حصہ لینے کا مجاز نہیں، کرتا رہا۔ اندازہ ہوا کہ میرا شاگرد جونیئر دوست وشنو سہائے مجھ سے کم اپنے ان بگ باس سے مانوس اور قریب نہیں ہے اور اُسی نے یہ تمام معلومات بہم پہنچائی ہوں گی۔ نیز یہ بھی اندازہ ہوا کہ موصوف کے علم میں ہے اُن کی میز پر میری پنشن کے کاغذات ہیں۔ نیز یہ کہ ابھی حال ہی میں سنا تھا کہ کانگریس اپنا ایک ذیلی سیاسی ادارہ ماس کنٹریکٹ موومنٹ (Mass Contract Movement) ترتیب دے رہی ہے، جس میں باصلاحیت مسلمانوں کو تنخواہ دار ملازم بنا کر، عام مسلمانوں میں کانگریس میں شامل ہونے کی ترغیب کا پروپیگنڈا اور تمام ہتھکنڈے استعمال ہوں گے۔ اور مجھے تو ایسا لگا کہ موصوف پنشن کے ساتھ ریٹائر کر کے، کانگریس پارٹی کی تنخواہ پر میری صلاحیتوں کو اس رخ سے استعمال کرنے کے جہلِ مرکب میں گرفتار ہیں۔ ویسے میرے اندیشوں کے مطابق آہستہ سے تالی بجاری اور میں دھک سے ہوگیا اور چونک کر دیکھا کہ جوتے کاری کرنے والے نیم سرکاری مسٹنڈے کدھر سے نازل ہوتے ہیں اور مرچ مالش والے دس نمبریے کدھر سے۔'' بھائی ظریف الدین کہ یہ باتیں سن کر ہم سب کے دل بھی دھک دھک کر اُٹھے، ہمارے چہروں بشروں سے ہماری داخلی کیفیات کا اندازہ کر کے، وہ اپنے مخصوص انداز میں پھر مسکرائے اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے:

''لیکن ٹرالی کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ سے سکون ہوا اور اتنے میں ایک وردی پوش بیرا تین منزلہ انواع و اقسام کی نعمتوں سے بھری ٹرالی لے کر آیا، اور سامنے لگا کر فوراً الٹے پاؤں پلٹ گیا۔ من و

سلویٰ اُترا۔ پھر بھی عذاب نازل ہونے کا اندیشہ رہا۔ وزیر اعلیٰ نے بہ کمال تواضع فرمایا:

''ڈپٹی صاحب ایک پیالی چائے پی لیجیے۔''

اور دوسرا تیسرا نمایاں جوتا طرزِ تخاطب اور طرزِ تواضع کا رسید کیا۔ ویسے بولتے ہوئے روانی میں ''ڈپٹی صاحب'' منھ سے معصومیت کے ساتھ نکلتا رہا تھا، لیکن اس وقت چائے کی تواضع کے ساتھ اور بھی کھلا۔ اور جب انیسویں صدی والا گورنمنٹ ہاؤس کے انگریز کے زمانے بلوریں کٹ گلاس چینی کی ساخت کا ٹوکری نما آڑوؤں سے بھرا ہوا برتن اس تفصیل کے ساتھ بڑھایا۔

''یہ لیجیے، یہ آڑو ہمارے ایک انگریز گورنر صاحب نے کبھی اسپین اٹلی کہیں یورپ سے چند پودے لا کر نصب کیے تھے، سو سنا ہے وہاں سے اپنے ہاں سرکاری بغیچے میں اور بھی اچھے پھلے۔'' میں نے ایک آڑو اٹھا لیا اور انھوں نے چائے کی پیالی بنائی۔ تراش کر آڑو کھایا، مگر اب جو کھاتا ہوں، تو قاش اُتارتا نیچے کو ہوں اور الٹی اوپر کو ہے اور کھایا گیا، تھوڑا نگلا۔ یہ جوتیاں کھانے کے جواب میں جوابی تواضع تھی اور اُن کے پندار میں یہ روغنِ قاز شاید مرچ مالش کے جواب میں جوابی مالش تھی اور اتنے میں چائے کی پیالی بڑھا دی، میں نے کہا آپ لیجیے تو فرمایا:

''میں صبح کو ایک پیالی پیتا ہوں۔ اب شام کو دوسری۔''

اور چائے کے گھونٹ بھی استفراغ کو اُبکائی کی طرح الٹتے رہے، مگر میں پیتا ہی رہا، اور اُتار ہی لی۔ اور میاں! اب تک کنکھیوں سے اپنی گھڑی چور کی طرح دیکھ رہا تھا، یوں بھی بار بار آنکھ پہنچتی تھی، تاہم اطمینان تھا۔ وہ وکیل کی طرح اپنا کیس سیٹ اپ کرتے ہوئے ابتدائی بحث کر رہے تھے، لیکن خطرہ ٹل گیا تھا۔ اور میاں! بات یہ ہے کہ ایک چپ سو کو ہراتی ہے۔ وہ تو اکیلے تھے اور میں چپ چھنال بنا سر جھکائے سنتا رہا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے مثبت میں بولتے رہے اور میں بزاخفش کی طرح مثبت ہی مثبت سر ہلاتا رہا:

''جی سر، جی جناب، جی یور آنر!''

اب اسے کیا کروں کم بخت اسپینی آڑو کی قاشیں اور میٹھی رسیلی پچو برانڈ چائے کے خوش گوار گھونٹ اتارتا تو نیچے کو تھا، الٹتے اوپر کو تھے۔ وزیر اعلیٰ علی گڑھ کو مستقبل کا سیاسی فتنہ تصور کرتے ہوئے ٹٹول ٹٹول کر بات کر رہے تھے۔ اُن کی بات کا تمام تر محور یہی تھا اور تم جانتے ہو ظہور وارڈ سے علی گڑھ میں دخیل رہا اور آج بھی ننھیال ددھیال سا سب کچھ علی گڑھ ہے، وہیں بسوں گا، پلاٹ لے لیا ہے میرس روڈ پر اور ستواہی میں دفن ہوں گا۔ میرے لیے تو بیت المقدس ہے علی گڑھ۔ اور آج بھی مجلسِ عاملہ کا رکن ہوں اور بہ فضلہ چلتا ہوا پرزہ اور وزیر اعلیٰ کے خیال میں بڑا اہم کردار ادا کرنے والا۔''

اور ایک سینئر ساتھی بولے:

''یار تم ظہور وارڈ سے تحصیل داری تک یک نہ شد دو شد تھے۔ اب انسپکٹر جنرلی سے ریٹائر

ہوتے ہوتے سہ شد ہوتے نظر آتے ہو۔ دراصل ایسا پتا چلتا ہے کہ وزیراعلیٰ تمھاری ذات کو دل ہی دل میں مستقبل کا فتنہ تصور کرتے ہوئے بات کر رہے تھے۔"

"ہاں یار! کیا بتاؤں، ابھی پچھلے سال کی بات ہے، وہ حافظ ابراہیم کے الیکشن والا واقعہ، تفصیل تو ابھی بتا چکا کہ کس طرح یونی ورسٹی میں قائداعظم کا استقبال ہوا۔ یوں تو قائداعظم نے اپنے مٹھی بھر جلیسوں کے ساتھ بہ ظاہر تو شکست کھائی، لیکن وزیراعلیٰ یزید کا حشر اور شمر کا انجام ساڑھے تیرہ سو برس سے دیکھ رہے ہیں اور مستقبل کی فکر ہے۔ علی گڑھ والوں کے جوہر کھل گئے، چناں چہ آج یونی ورسٹی کے سیاسی رویّے کی پرچول میں تھے۔ اور یہاں میں تو صوبے کی ریونیو پالیسی پر اپ ٹو ڈیٹ ہو کر گیا تھا، وہ لے بیٹھے علی گڑھ کی بات۔ ریونیو پر تو انھوں نے سوال ہی نہیں کیا۔ اندازہ ہوا کہ کوئی پارٹی ادارہ کانگریس پروپیگنڈے کا کھولنے والے ہیں اور جیسے مجھے اُس میں دھانسنا چاہتے ہیں۔ اور یہاں مجھے تو اب اللہ اللہ کرنا ہے، ساٹھ کے پیٹے میں ہوں۔ اور بھائیوں چودہ تک تو خیر میں نے اپنی گھڑی انکھیوں سے دیکھی، لیکن جب سات کے سترہ اور سترہ سے اکیس پر نوبت پہنچتے دیکھی تو کلائی نمایاں کرتے ہوئے تخفیف تصدیہ کا انداز بنایا۔ اور بات نہ صوبے کی اسٹامپ پالیسی کورٹ فیس پر ہوئی اور ۳۲ والے ڈپٹی صاحب اور نمک قانون توڑ دو سرکار کا بھانڈا پھوڑ دو کے مرغِ بے ہنگام جیکارے تک رہ گئی اور صرف علی گڑھ کے سیاسی رویّے کے غمِ جاناں غمِ دوراں میں گونجتی رہی، تو میرے تخفیف تصدیہ اور "الوَمتی" چاہنے کے انداز کے جواب میں انھوں نے بھی پھتوئیں کی جیب سے گھڑی نکال کر دیکھی اور فیرویل کے طور تیوروں میں نمایاں ہوگئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ گورنمنٹ ہاؤس کا صحرائے راجستھان والا سناٹا، نہ اتفاقی امر تھا اور نہ ہو سکتا ہی ہے۔ یہاں تو باون گزے افسر ہوں یا نیتا، میلا ہی لگا رہتا ہے اور آج نہ دفتر نہ پویلین، یہ پورٹیکو برآمدہ پار کر کے خاکسار کو جو ڈرائنگ روم کی خاص نشست سے اور باہر سے اندر تک مکمل تخلیے سے نوازا گیا، یہ رموزِ مملکت خویش پر بحث تمحیص اور معلومات حاصل کرنے کے لیے تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹا جتنی نشست رہی اور سب کچھ جو بیتی سو بیتی، آؤ بھگت، نشست برخاست میں قدم قدم پر منھ پر جوتے کاری، چلتے چلتے اپنی تلی کے تلے والی شدھ چپل، موچی کے ادھوڑی استر جوتے کی طرح میرے منھ ایک اور رسید کی اور مخصوص منفی انداز اور مثبت زبان بروئے کار رہی۔ گویا سب کچھ کہہ کر کچھ کہنے اور تمام تر کر کے معصومیت کے ساتھ کچھ نہ کرنے کا انکار کر کے مجھے رُو براہ کیا اور شاید ہدایت کی کہ یونی ورسٹی میں دخیل ہوتے ہوئے، یونین اور طلبہ کو راہِ راست پر رہنے میں ہماری پارٹی کا خیال رکھیں۔ چلو خیر یہی سہی، ورنہ تم سب جانتے ہو میں ڈاکٹر صاحب کا آدمی ہوں، اور ڈاکٹر صاحب ہی کیا ساری جڑ بنیاد ہی اینٹی کانگریشین ہے اور ابھی تو دھوبی کے کتے ہیں گھر کے نہ گھاٹ کے۔ بن سرے، ہمارے رہنما مر گئے یا بیٹھ رہے۔ اب یہ جناح صاحب اک جھلک یاں بجنور میں دکھلا گئے ہیں۔ خدا انھیں زندہ رکھے اور اُن کی لیڈری کو ثبات بخشے، اسی سلسلے میں آج اپنی یہ مدارات ہوئی اور آج میں یہ سب اُن کے کھاتے

میں ڈالتا ہوں۔''

اور ڈپٹی صاحب کے چہرے پر یہ کہتے ہوئے عجب سے تاثرات نمایاں ہوئے، پھر چہرہ ہموار ہوگیا اور اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولے:

''پھر میاں! مہاشے جی اٹھ کھڑے ہوئے، رخصتی مصافحہ کیا اور پہلے کی طرح میرا نرم ہاتھ اپنے کرخت پنجے میں دبائے ہی دبائے، چکی کے ہیڑے اور مونجھ کی یاد دلاتے دروازے کی جانب بڑھے، اور بڑھے بھی برآمدہ پورٹیکو کی جانب والے دروازے پر، ساتھ ہی مجھ سے استفساریہ انداز میں دریافت کیا:

''اوں ڈپٹی صاحب! آپ کی گاڑی؟'' پھر جیسے دربان مخاطب ہوتے ہوئے، ''ارے ڈپٹی صاحب کے لیے سواری۔''

میں نے دبی زبان سے عرض کیا:

''اوں، وہ واں، سڑک پر، نواب یوسف صاحب کی گاڑی لایا ہوں۔''

''ارے اچھا، منگاؤ۔''

اور دربان نے دوسرے اور دوسرے نے تیسرے سے تن تین فرلانگ کے کمپاؤنڈ میں جب تک گاڑی اندر پورٹیکو میں لانے کے احکامات قصرِ وزارت سے جاری کیے اور گاڑی جب تک پہنچے وزارت پناہ نے سوال کیا:

''اوں، وہ ایں آپ واں ٹھہرے ہیں کان پور ہاؤس میں... پھر اپنا سرکاری گیسٹ ہاؤس بھی تو۔ ایں...؟''

اور موقع ملتے ہی میں نے برجستہ چپکائی۔

''وہ پہلے آنا ہوتا تو سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ہی قیام کرتا تھا، اور اب تو اپنی قومی گورنمنٹ ہے ڈی اے، ٹی اے لیتا نہیں اور نواب صاحب بڑے مہربان، بڑے متواضع، پرانے علیگ سٹیز۔ دسترخوان پر دس پانچ دوپہر میں لنچ پر اور پندرہ بیس رات کو کھانے پر جمع ہوتے ہیں۔'' مہاشے جی نے نواب صاحب کے نام پر جیسے آپا سنبھالا اور سنبھل کر بولے:

''ابھی پچھلے سے پچھلے دنوں ترکی کے خیرسگالی وفد کے ری سیپشن میں ملاقات ہوئی تھی۔ بڑے اچھے بڑے میاں لوگ اور صاحب بہادر، ایک اکیلے میں جمع۔ انڈو مسلم کلچر اور مغربی تہذیب کا خوب صورت نمونہ!۔ ہوں، میرا سلام پہنچا دیں۔''

اتنے میں گاڑی پورٹیکو میں آگئی۔ جیسے میرا مصافحے کی گرفت میں دبا ہوا ہاتھ، اپنے کرخت جیل کے محنتی والے پُرخلوص پنجے سے چھوڑنا نہ چاہتے تھے، جس پر مونجھ کوٹنے کی موگل اور باندھ بٹنے کی ٹھیٹھوں کے بدچلنی کے سرٹیفکیٹ ابھی محفوظ تھے اور میں جان چھڑا کر سیڑھی سے لڑھکتا ہوا سا گاڑی میں آپڑا۔ اور وہ دونوں ہاتھ جڑا ادھر چند سال کا نوگرفتہ سلام 'جے ہند' اپنی معمول کی عاجزی والے بھیڑ

بکرتی تیوروں سے کرتے نظر آئے۔"

ڈپٹی صاحب کے شوخی سے مسکراتی ساخت کے چہرے پر ہزیمت خوردگی کی نشانیاں ابھری ہوئی تھیں جو شاید سوتے میں بھی ہموار نہ ہوتا تھا اور شوخی اُچھلی سی رہتی تھی۔ تاہم وہ سنبھلے، ہزیمت جھینپ، جملہ کھا جانا اُن کی شانِ جبلت کے منافی تھا اور ہمہ وقت ہشاش بشاش رہنا اور نظر آنا عینِ فطرت تھا۔ ذرا گھونٹ لے کر پھر چست درست ہوئے اور تمسخرانہ انداز سے اپنے تیوروں سے ابھی کے موڈ کی نفی معذرت سی کرتے ہوئے بولے:

"بھائیو! اگر بڈھا اپنے گھر میں گھیر کر میرے ساتھ بدفعلی بھی کرتا، تو خیر میں تم سب کے سامنے بتا تو دیتا ہی اس وقت، مگر اتنا خفیف نہ ہوتا... بھائیو... (قہقہہ پڑا)... لیکن دنیا بھر پر عمر بھر کے پھبکے جملے اور کسی پھبتیاں آج الٹی ہو کر منہ پر پڑیں۔ اگر قیصر باغ تھانے سے آغا میر کی ڈیوڑھی تک اور عالم نگر چوکی سے چار باغ اسٹیشن تک، ظالم ننگا کر کے اور کالا منھ کرا کے گدھے پر سوار جلسے میں نکالتا اور مرچ مالش کرا کے، ظاہر بات ہے وہ جنگل کی ڈسپنسری تو دور تھی، میڈیکل کالج کے وارڈ میں ڈلوا دیتا تو نہ اتنی غیرت آتی، نہ ایسی تکلیف ہوتی۔ لیکن آج تو اس ظالم نے سب پر پانی پھیر دیا اور بھئی ہم جھینپے اقرار کرتے ہیں جھینپے۔"

سب کے سب بوجھ بجھکو جمع تھے اور علی گڑھ والے تلخ سے تلخ موضوع میں مزاح کی چاشنی اور شکر کی تہ جمانے کے فن خوب جانتے ہیں، چناں چہ باجماعت قہقہوں میں ہی بات چلتی رہی تھی، تاہم ایک نوجوان خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ یہ ایک علیگ آئی سی ایس کے امتحان مقابلہ اور پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو گزرا پروبیشنری سویلین تھا۔ ذرا بھرائی سی آواز میں سنجیدگی سے بولا:

"ظریف الدین بھائی! آپ سب بزرگ اور ہمارے اساتذۂ کرام اور گھر والے بھی، ابھی یاں سے واں تک، ہماری تربیت ان خطوط پر کرتے رہے ہیں اور ہمیں انھیں لائنس پر ہشیار رہنے کی تلقین کی ہے کہ حرف شناس برادرانِ وطن اور اُن کے مفکرین، سب کے سب ہندو اپنی اپنی فکر و استعداد کے مطابق پچھتر سال سے تاریخِ اسپین کا تحقیقی مطالعہ کر رہے ہیں اور وہ عوامل سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آٹھ سو برس حکومت کر کے اسپین کے فاتح مسلمان اس حد تک کیسے ملک بدر ہوئے کہ آج کے دن قیصر الحمرا اور مسجد قرطبہ میں سایہ نظر نہیں آتا اور انھیں خطوط پر آج ہندوستان کی تاریخ دوہرانے اور ہندوستان میں چلنے کی سوچ رہے ہیں۔ میں آپ کا برادرِ خورد تاریخ اسلام کا ادنیٰ سا طالب علم ہوں اور ابھی عارضی سی نوکری کی ہے اور آپ کی آج کی آپ بیتی سے اس نتیجے پر پہنچا کہ تاریخ اسپین کے محقق نہیں، یہ تاریخ اسلام کے تابعین اور تبع تابعین کے ادوار سے روشنی لے رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ جو رویّہ اختیار کیا، اس میں مجھے تاریخ اسلام کی جھلک کے شاہکار واقعات یاد آئے۔"

ایک بوڑھے بیرسٹر صاحب نے بات کاٹ دی:

"اماں لاحول ولاقوۃ! عزیز القدر ذرا یادوں پر قابو پائے رہو۔ بھیا یہی تو گم راہ کن ہتھکنڈے

ہیں، یوں کہونا، تاریخ اسلام کے بہروپے ہیں۔ سنا نہیں آپ نے وزیر دانا کو پرچول کیا تھا۔ ہوں، آج وہ آں مسلمان بے چارے رہنما کی تلاش میں ٹاک مار رہے ہیں نا، لیکن وزیر دانا بھی ٹٹول میں ہیں کہ کہیں یہ سرپھرے تراش نہ لیں۔ علی گڑھ اسٹیشن سے جناح صاحب کی گاڑی کندھوں پر کھینچ کر لے گئے اور اسٹریچی ہال سے "قائداعظم" کا نعرہ گونجا اور قائداعظم زندہ باد کا نعرہ ایجاد کر کے اُن کا بایاں بازو اور دایاں بازو دونوں حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف ایک غول اور یک دل لے کر جناح صاحب بجنور پر چڑھے، جو گریجویٹ ہوتے ہوتے سفارت کار، سیاست کار اور کچھ نہیں تو الیکشن کاربن کر نکھر جاتا ہے۔ دیکھا نہیں معلومات کتنی پراپٹ اور صحیح ہیں۔ ممکن ہے کہ کیبنٹ والوں کے نام تک معلوم ہوں۔ یہاں بجنور کا ضمنی انتخاب ہندوستان کی تاریخ کا عجوبہ تھا اور فیصلہ کن عمل۔ تم نے تو میاں دیکھا نہیں، میں تو شریک رہا۔ اندازہ لگایئے، ایک وزیر نے اپنا قلم دان پھینک کر اور پارٹی پر ٹھوکر مار کر اور دوسری مخالف پارٹی جوائن کر کے، اپنی سابقہ پارٹی کو چیلنج کیا تھا۔ اسی سال اندر کی تو بات ہے، اسی مارچ کی اور دوبارہ سیٹ حاصل کرنے کا دعویٰ کیا۔ درحقیقت بڑا خود اعتمادانہ اقدام تھا اور صرف ایک وکیل کا، کوئی پشتینی خاندانی رئیس نہیں، کوئی مرشد پیر نہیں۔ تاہم پچھلی استعفیٰ دی ہوئی وزارت کے اثرات، پھر گاندھی جی، مولانا آزاد، پنڈت نہرو، علمائے دیوبند کا پورا گروہ۔ ہائی کمانڈ اور وزیر داخلہ قدوائی مع اپنی کیبنٹ کے اہم وزرا کے وارد بجنور تھے اور اُن کے زیرِ اثر ڈویژن بھر کے چھیوں ڈپٹی کمشنر، کلکٹر صاحب اور کمشنر بہادران پانچوں ہتھیار سجائے مسلح الرٹ، دست بستہ تھے۔ اور پوری پولیس فورس اشارے کی منتظر۔ مقطعے میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات۔ سیاسی، مذہبی اور نوکرشاہی ہر سہ پہلوان یک قطار اینڈتے پھرتے تھے اور جناح اکیلا دائیں بائیں دونوں بازوؤں سے علی گڑھ یونی ورسٹی یونین کے حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف لگائے۔ پھر کانگریس کی تجوریوں کے ساتھ سرکاری خزانہ بھی کھلا تھا میرے علم میں ہے، سابقہ وزیر زراعت و آب پاشی حافظ محمد ابراہیم کی پچھلی مراعات ہی کیا کم تھیں، دورانِ الیکشن کونیسنگ، وزیر داخلہ نے درجنوں اونچی سروس کے دستی پروانے تقسیم کیے اور یوں برادریوں اور قابو یافتہ لوگوں میں پرے کے پرے الٹ دیے۔ اور وعدے وعید مزید برآں۔ پھر بھی ہاتھی کی ہاتھی سے ٹکر تھی۔ ٹکر کا سماں بندھا۔ (دبی زبان سے) اور پھر مسلم لیگ الیکشن بورڈ کا انتخاب بھی غلط تھا۔ میرے علم میں ہے، کینڈیڈیٹ بندھا غیر ہردل عزیز و غیر پسندیدہ تھا۔ میں جانتا ہوں، میرا ہم پیشہ وکیل ہے، تاہم بہت تھوڑے مارجن سے ہار جیت ہوئی، اور میاں یہی الیکشن کانگریس کو جہلِ مرکب میں مبتلا کر گیا۔ اس کے بعد ایسا ہی ضمنی الیکشن اسی ڈویژن کے شہر بدایوں میں ہوا، اور یہی تمام طاقتیں آمنے سامنے ہوئیں، اگرچہ قائداعظم نہ پہنچ سکے، لیکن علی گڑھ یونی ورسٹی والوں نے پورے پورے گروہ کے ساتھ حصہ لیا اور کانگریس کا کینڈیڈیٹ بُری طرح ہارا۔ لیکن حکومت اور تعداد کا نشہ کانگریس کے دماغ سے نہ اترا۔ اور میاں طاقت کا جہلِ مرکب ذہنِ انسانی سے بڑی مشکل سے اُترا کرتا ہے، بہ قول مولانا ظفر علی خاں کے، یہ ہمارا ہزار سالہ طولِ غلامی کا ستایا اور پانچ سو سالہ سیاست پڑھایا شاگرد، کودکِ خام کار نکلا۔ ابھی تک ہندوستان

میں کانگریس حکومت کے جتنے ضمنی انتخابات ہوئے ہیں، سب میں بجز ایک کے، بے بھاؤ پٹتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن طاقت اور تعداد نے ایسا اندھلایا کہ ٹھوکر کھا کر گرتا، اور پھر اسی راستے پر بڑھتا ہے۔ فیل چشم رہ گئے، آہو چشم اللہ کو پیارے ہوئے یا اکثریت کے ایسے ہی رویوں سے رم دیدہ ہوگئے، ورنہ کانگریس محمد علی شوکت علی کی کانگریس تھی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری کی کانگریس تھی، مولانا حسرت، مولانا ظفر علی خاں کی کانگریس تھی اور علامہ اقبال اور محمد علی کی کانگریس تھی اور سب تو جیتی زندگی، برادرانِ وطن کے رویوں اور دراندازیوں سے متنفر ہو کر خیرباد کہہ گئے، ساتھ ہی ساتھ پول کھولتے گئے کہ انتہا پسند ہندو جماعت ہے، لیکن عمرت دراز یہ موسمِ بہار کا آخری گلاب باقی ہے اور تروتازہ ہے اور خزاں کے جھونکے جھونکے کا آشنا اور طوفان کے بھنور بھنور کا شناور اور آج اسی تناور چھتناور درخت کے اوپر موسمِ بہار کے گلاب کھلتے نظر آ رہے ہیں اور شاخوں میں ہما آشیاں بندی کر رہا ہے۔''

مایوس سا نوجوان علیگ بولا:

''بھائی صاحب! ہم دس کروڑ کیا چیز ہیں، یہاں اقلیت ملک کی سب سے بڑی اکثریت کو ماوراالتاریخ سے ہڑپ کیے پڑی ہے، اور ازلی و ابدی غلامی کے طور ہیں۔ وہ تو احمد شاہ ابدالی، حضرت شاہ ولی اللہ کے خط پر پھیرا نہ مار جاتا تو ڈیڑھ صدی قبل ہی ہضم ہو چکے ہوتے اور اسپین کی تاریخ ہندوستان پر دوہرائی گئی ہوتی۔''

''میاں! اس راستے میں آج علی گڑھ سب سے بڑا روڑا ہے، جہاں آپ نے اسٹیشن سے اسٹریچی ہال تک محمد علی جناح کی گاڑی کھینچی اور قائداعظم زندہ باد کا نعرہ لگایا اور مولانا ابوالکلام آزاد کی گاڑی روکی، گو بیگ کی آواز بلند کر کے رخ پھیرنے کی جدوجہد کی اور یہاں ابھی تو بہت سویرا ہے، پچھلے آٹھ نو مہینے تو وزارتیں تشکیل ہونے اور تُو تُو میں میں کٹے، کون کس کا ہے اور کیا ہے؟ اور اسی کوکھ سے دو قومی و یک قومی نظریہ نکلا، اور یہی طے ہوتا ہے۔ لیکن اندیشہ مجھے اس آج کے رویّے سے ہوتا ہے، یہ سب سے اہم فرنٹ ہے۔ زہر سے نہ مار سکے تو گڑ سے مارو۔ مگر ہمارے لیڈر کے حواسِ خمسہ نہایت تیز ہیں۔ ستارۂ بلندی اور مردے از غیب اسی میں پلتا نظر آتا ہے۔ ذرا انتظار تو کرو، تمھاری سروس کے تو تیس پینتیس ہیں اور زندگی کے نو سو کٹ چکے اور قیامت تک کی مدت باقی ہے۔ تم اس کھیل کے سینٹر فارورڈ ہو اور گول کا سرکل بھی ابھی سامنے نہیں ہے۔ خدا خیر کرے جیسا کہ تم نے ابھی بیان کیا کہ تاریخِ اسپین دوہرانے کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ موسیٰ کی دعا تو دریا کنارے قبول نہ ہوئی کیوں کہ اس کے اردگرد کوئی سیّد اعظم یا قائداعظم نہ تھا، لیکن راوی کنارے والے اقبال کی دعا اللہ قبول کرے گا کہ اللہ محمد علی جناح کو مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کی توفیق دے اور پھر ویران مسجد قرطبہ کے بجائے دعائے خلیل و نوید مسیحا مسجد شاہ جہانی سے گونج اُٹھے گی...''

☆☆☆

اسد محمد خاں

اپنے لکھنے والے... ۴۷ء سے اب تک

(ایک 'تقریباً ذاتی' رائے)

قیامِ پاکستان سے پہلے سے... بہت پہلے سے، لاہور شہر کو جنوبی ایشیا میں طباعت و اشاعت کا سب سے بڑا مرکز ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اردو پڑھنے والے منشی نول کشور کے نام سے خوب واقف ہیں۔ سو برس ہوئے کہ یہ صاحب لاہور ہی سے لکھنؤ گئے تھے اور وہاں چھاپا خانہ کھولا تھا۔ علمی، ادبی اور دینی کتابوں کے ایک معتبر، مشہور و ممتاز طابع و ناشر کی حیثیت سے منشی نول کشور نے بہت نیک نامیاں کمائیں۔ گمان غالب ہے کہ یہ بہت ہشیار آدمی ہوں گے۔ انھوں نے صرف پیسے کمانے پر اکتفا نہیں کی... جو آج کل ہمارے اٹھانوے فی صد ناشر کر رہے ہیں۔

میں اس مختصر جائزے کا آغاز ذرا خوش دلانہ کرنا چاہتا ہوں اس لیے بات امنگوں بھرے شہر لاہور سے شروع کی ہے اور ''یادش بخیر'' کے انداز میں کی ہے۔ وہاں جو مسائل ہیں وہ اپنی جگہ۔ تو حضرات جہاں اتنی کتابیں چھپ رہی ہوں وہیں کہیں لکھنے لکھانے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ لاہور میں بھی ہمیشہ ہی ادیبوں، شاعروں، قلم کاروں کا جماؤ رہا ہے۔

اس جائزے کی حد تک اگر ۱۹۴۷ء کو آغاز کا سال طے کیا جائے تو قیامِ پاکستان کے وقت ہی سے وہاں اردو نظم و نثر کے مقبولِ عوام ناموں کا اجتماع نظر آتا ہے۔ مقبول مصنفوں میں میاں ایم اسلم، شفیق الرحمن، شوکت تھانوی، اے حمید وغیرہم کی کتابیں پے در پے چھاپی جا رہی تھیں اور ''پھول''، ''ادبی دنیا''، ''نیرنگِ خیال''، ''ہمایوں''، ''عالمگیر'' اور ''ادبِ لطیف'' یہاں سے نکلتے تھے۔ ''نقوش'' جیسے بڑے موقر جریدے اور ''سویرا'' سے ''فنون'' کی شروعات یہیں سے ہوئی تھی (یہیں سے آگے چل کر حکومتی مشینری حرکت میں آئے گی اور جواں سال احمد ندیم قاسمی کے رسالے اور چھاپا خانے کو معتوب قرار دے گی تو رسالہ بند ہونے کے بعد قاسمی صاحب اور دوسرے معتبر شاعر و ادیب و مدیر لاہور کی میکلوڈ روڈ پر احتجاجاً کتابوں کی دکان کھولیں گے)۔

یادوں کا در کھلا ہے تو کتابوں کی خرید و فروخت کے حوالے سے تقسیم سے پہلے کی ایک آنکھوں دیکھی صورت حال بیان کرتا چلوں کہ وسطی ہندوستان کے ایک "اردو شہر" میں جہاں صرافے کی چالیس دکانیں تھیں اور مسلمانوں کے تین ٹھیک ٹھاک بڑے بارونق ہوٹل موجود تھے، وہاں آٹھ معتبر بک سیلرز کامیابی سے اپنا کاروبار کر رہے تھے۔ یہ کتب فروش لاہور، دلی اور لکھنؤ سے اردو کتابوں کی بلٹیاں منگاتے تھے۔ جس دن شوکت تھانوی، شفیق الرحمٰن، ایم اسلم، اے حمید وغیرہم میں سے کسی کی کتاب کی کھیپ شہر میں پہنچتی تھی آٹھوں دکانوں پہ پرچا لگ جاتا تھا کہ فلاں کتاب کی بلٹی آ گئی ہے اور پڑھنے والے دوڑ پڑتے تھے۔

پچاس پچپن برس پہلے کی یہ ایک بڑی خوب صورت بات یاد آ گئی تھی جسے میں نے سن دو ہزار عیسوی کے قارئین کے ساتھ share کرنا چاہا، اس لیے یہاں درج کر دیا۔

یہ وہ وقت تھا کہ ترقی پسند تحریک برصغیر کے اردو ادیبوں شاعروں میں مقبول ہو رہی تھی۔ انھیں ایک تازہ اسلوب بیاں عطا کر رہی تھی۔ نئے موضوعات کے انتخاب میں مدد دے رہی تھی، نئی راہ دکھلا رہی تھی۔ خود پاکستان کی جغرافیائی حدوں میں پشاور لاہور میں اور سندھ میں بھی اس ادبی تحریک کے ساتھ نئے پرانے نام اُبھر رہے تھے۔

ترقی پسندوں کا کہنا تھا کہ ہم ایسی تحریروں کو عام کرنا چاہتے ہیں جن سے سماجی ترقی میں مدد ملے۔ اور یہ کہ ادب نئے فنی معیار پر اُسی وقت پورا اُتر سکتا ہے کہ جب زمانے اور ماحول میں صحت مند تبدیلی لائی جائے، جمہوریت پھلے پھولے، صنعتی ترقی ہو، تعلیم عام ہو اور مجموعی طور پر خوش حالی آئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ماضی کے تمام ثقافتی ادبی ورثے کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اسے تنقید و تحقیق کی روشنی میں پرکھا جائے گا اور آگے یہ کہ ادب میں "تجربۂ محض" سے کچھ حاصل نہیں ہونے کا۔

تاہم ترقی پسندوں نے کہا کہ ہم ہر اس نئے ادبی تجربے کا خیر مقدم کریں گے جو ہماری ادبی روایات اور زندگی کو نئے مطالبات سے ہم آہنگ کرتا ہو اور جس سے ہمارے شعر و ادب میں حسن، پُرمائگی، گیرائی اور گہرائی بڑھے۔

اس تحریک نے اقبال، ٹیگور اور بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسے نام ور لوگوں کو متاثر کیا تھا۔ پاکستان میں فیض صاحب، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، سبطِ حسن، ظہیر کاشمیری، ابراہیم جلیس، فارغ بخاری، رضا ہمدانی وغیرہ اور اُبھرتی ہوئی کتنی ہی شخصیتیں اسی تحریک کے سائے میں پروان چڑھیں۔

ن م راشد، محمد حسن عسکری، منٹو اور میراجی کے سلسلے سے ایک تنازع پیدا ہوا اور سوالات اٹھائے گئے کہ آیا یہ ادیب، شاعر و دانش ور ترقی پسندوں کے کھاتے میں ڈالے جا سکتے ہیں؟ بہت سوں نے کہا کہ نہیں۔ بہرحال اوّل الذکر اور آخرالذکر مشاہیر نے زندگی اور ادب کو جو کچھ دیا اُسے دیکھتے

ہوئے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ترقی پسند ہوں یا نہ ہوں ان بڑوں نے ہمارے اردو شعر و ادب کے افق کو پھیلایا، زبان و بیان کو پُر مایہ کیا۔ اردو کا مان بڑھایا۔

یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر ادبی تحریک ایک بڑی تعداد کو یا اکثریت کو متوجہ کر پائے۔ بہت سے لوگ ترقی پسندوں سے متفق نہیں تھے یا ان کے طریقہ کار کو، اُن کے ''ہدایات'' جاری کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔ گویا ترقی پسندوں کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اور متوازی ایک اتنی ہی توانا ادبی علمی سرگرمی جاری رہی۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جن کی شعری ادبی زندگی کا آغاز پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں میں ہوا تھا اور وہ بھی جو تقسیم کے ساتھ پچھلا گھر چھوڑ کے اپنا نیا گھر آباد کرنے آرہے تھے۔

سرحد کی دوسری جانب سے ملکِ عزیز میں اردو کے مضبوط ادبی جرائد کے مدیران و مالکان کی آمد ہو رہی تھی۔ ''نگار'' کے ساتھ علامہ نیاز فتح پوری، ''ساقی'' کے ساتھ شاہد احمد دہلوی، ''افکار'' کے ساتھ صہبا لکھنوی اور بہت سے مضبوط اور امنگ بھرے لوگ پاکستان آئے، اپنے ممتاز اور مشہور (یا کم مشہور) جرائد ساتھ لائے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق آئے، اختر حسین رائے پوری، ممتاز حسین، محمد حسن عسکری آئے۔

کسی نے یہ واقعہ سنایا ہے کہ شاہد احمد دہلوی کو ان کے دوست ناول نگار میاں ایم اسلم لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر لینے پہنچے تو immigration حکام نے کہا کہ یہ فیملی جس گاڑی میں سوار ہے وہ نان ایگریڈ ایریا سے آرہی ہے۔ یہ لوگ تو براہِ راست دارالحکومت کراچی جائیں گے کہ جو non-agred ایریا سے آنے والوں کی منزل ہے۔ انھیں لاہور میں نہیں اتارا جاسکتا۔ تس پر میاں ایم اسلم بولے کہ ہم ایگریڈ، نان ایگریڈ نہیں جانتے بھئی شاہد احمد دہلوی ہمارے دوست ہیں، یہ اور ان کی فیملی لاہور میں ہمارے گھر اُترے گی۔ حکام دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور میاں صاحب، شاہد بھائی کو لاہور اتار اپنے گھر لے گئے۔

پاکستان آتے ہوئے ایسا ہی کچھ شاعر، نقاد، پلے رائٹ سلیم احمد اور ناولسٹ، کہانی کار، صحافی انتظار حسین کے ساتھ ہوا تھا۔ خیر ابتدائی سوال و جواب اور ایگریڈ، نان ایگریڈ کی تفہیم (یا عدم تفہیم) کے بعد دونوں کو لاہور اترنے کی اجازت مل گئی مگر صرف انتظار صاحب اُترے، سلیم احمد نے براہِ راست کراچی آنے کا فیصلہ کیا۔

برسوں بعد انتظار حسین کو لاہور کے پاک ٹی ہاؤس میں ادبی بحث مباحثے کرتے ہوئے ایک تہذیبی شہر کی روایت کو آگے بڑھانا تھا اور سلیم احمد کو بہار کالونی (مسان روڈ) کے ایک بے قلعی کمرے سے کراچی کی اُن اُجلی جگمگاتی علمی ادبی محفلوں کی شروعات کرنی تھی جو تقریباً تین دہائیوں تک (سلیم احمد کے جیتے جی) ایف بی ایریا میں جاری رہیں۔

اردو ادب و شعر وغیرہ کے حوالے سے کراچی میں اُن دنوں تقریباً، سناٹا سا ہوگا۔ گمان غالب

ہے کہ خُلد آشیانی مولانا عبیداللہ سندھی کے پسندیدہ ادارے مظہرالعلوم (کھدہ نوآباد) کے چند دوستوں اور سندھ مدرسۃ الاسلام (جہاں نوعمر محمد علی جناح کی ابتدائی تعلیم ہوئی) کے اسکالروں کے سوا یا دارالارشاد گوٹھ پیر جھنڈا سے آنے والے صاحب العلم راشدیوں پھر تالپروں، ہارونوں، آفندیوں کے اور پیرالٰہی بخش اور بعض دوسرے بزرگوں کے گرد و پیش کے سوا یہاں اردو شعر و ادب کا چرچا نہیں ہوگا۔ کس لیے کہ یہ تو زیادہ تر تجارتی سرگرمی کا شہر تھا۔ تاہم پکی پکی بہار کالونی (مسان روڈ) آباد ہو رہی تھی۔ پی آئی بی کالونی کی تعمیر جاری تھی۔ لائنز ایریا میں مہاجروں کے لیے بین الاقوامی امداد وصول ہونے والے خیمے نصب کر دیے گئے تھے (ایک خیمے میں کنور اطہر علی خان اطہر نفیس علی گڑھ سے آئے ہوئے اپنے بزرگوں، خوردوں کے ساتھ فروکش تھے)۔ بستی دھیرے دھیرے بس رہی تھی۔ شہر کے مختلف علاقوں میں سکہ بند ادیب اور نئے نویلے شاعر اور کہانی کار راستے کی دھول جھاڑ کر شعر کہہ رہے تھے، کہانیاں لکھ رہے تھے، ادبی بحثیں کر رہے تھے۔ انھی میں کہیں ایک بہت مشہور و معروف تصنیف، ''چالیس کروڑ بھکاری'' کا مصنف، طے شدہ ترقی پسند ابراہیم جلیس بھی تھا۔ پھر اور بھی بہت سے ادیب، صحافی، شاعر نقاد تھے... کتنے ہی باہمت من موہنے لوگ جنھیں اردو زبان و بیان کو پروان چڑھانا تھا، بہت کچھ لکھنا تھا۔ اب یاد آیا کہ یہاں سے دور ڈھاکے میں ساقی فاروقی بھی آن وارد ہوا تھا... جسے ابھی کراچی پہنچنا اور پھر لندن چلے جانا تھا۔ اور تقسیم سے پہلے ایک ماہرِ تعلیم ریاض صاحب کو خیر کے مشن پر کہیں یوپی سے چلتے ہوئے حیدرآباد آنا تھا جہاں اُن کی بٹیا فہمیدہ کو شاعری کرنی تھی جسے آگے بہت کچھ لکھنا بہت کچھ بننا ہوگا۔ پھر ایک سرتا سر شاعر ایک صاحب علم شیخ ایاز اردو زبان میں بھی کمال شاعری کرتا آئے گا اور بعض نادہند لوگوں کے قصباتی اُتھلے پن سے برہم ہو کر اس زبان سے بیزار ہوا اپنے گھر لوٹ جائے گا اور آخر آخر سندھی زبان و بیان کو اور مالامال کرے گا وغیرہ...

اس وقت لاہور میں سربرآوردہ شاعروں، ادیبوں، دانش وروں کا ایک بزرگ گروپ تھا نسبتاً امن و عافیت کی ایک علمی ادبی فضا میں تربیت پایا ہوا، ایک تہذیبی جرگہ جسے ''نیازمندانِ لاہور'' کا نام دیا گیا تھا۔ مولانا عبدالمجید سالک، پطرس بخاری، سید امتیاز علی تاج، ڈاکٹر تاثیر، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، مولانا چراغ حسن حسرت، مجید ملک، نام ور مصوّر عبدالرحمٰن چغتائی اور دوسرے قدآور لوگ۔ ان بزرگوں کے زیرِ سایہ ن م راشد، فیض احمد فیض اور غلام عباس جیسے نوجوان ادیب و شاعر پھل پھول رہے تھے۔

اردو کے ادیبوں شاعروں کو تقسیم سے بہت پہلے سے ریڈیو کے محکمے نے دلّی کھینچ لیا تھا۔ اس وقت چند ہی نام یاد آ رہے ہیں۔ پطرس بخاری، ذوالفقار علی بخاری، منٹو، میراجی، شوکت تھانوی ریڈیو سے وابستہ رہے یا آگے نکل گئے۔ ایسے کتنے ہی لکھنے والوں کا دلّی میں جماؤ ہوا تھا۔ زیڈ اے بخاری ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے تو انھوں نے بہت سے لکھنے والوں کو کراچی اور لاہور ریڈیو اسٹیشنوں پر مصروف کر دیا۔

بعد میں بھی یہ ادارہ ادیبوں شاعروں کو اپنی طرف کھینچتا رہا۔ عزیز حامد مدنی، سلیم احمد، حفیظ ہوشیار پوری، حمید نسیم، محشر بدایونی اور قمر جمیل اور بعد میں رضی اختر شوق، محمد رئیس فروغ بھی کراچی اسٹیشن سے وابستہ رہے۔ اس طرح ریڈیو سے وابستہ ادیبوں کے حوالے سے تمثیل کی ایک نئی صنف ریڈیو ڈرامے پر بھی کچھ کام ہوا۔ مگر بات وہیں تک رہی آگے نہ بڑھ سکی۔

ریڈیو کی طرح بہت پہلے سے فوج کے ایجوکیشن اور پبلک ری لیشنز (relations) کے شعبے بھی بعض نام ور شاعروں ادیبوں کی خدمات حاصل کرتے رہے۔ فیض صاحب فوج کے تعلیم کے شعبے میں رہے، کرنل مجید ملک بھی۔ برطانوی راج کے زمانے سے فوج کے پراپیگنڈے کے شعبے میں حفیظ جالندھری، اعظم کریوی جیسے کہنہ مشق شاعر اور افسانہ نگار نے خدمات انجام دی ہیں، بعد میں یہ صاحبان پاکستانی فوج کے لیے بھی فعال رہے۔ یادش بہ خیر برسوں پہلے (آزادی سے پہلے) حفیظ صاحب نے لوگوں کو بھرتی پر آمادہ کرنے کے لیے ایک گیت لکھا تھا جسے ملکہ پکھراج نے گایا تھا:

یہ اڑوسن پڑوسن کہے سو کہے
میں تو چھورے کو بھرتی کر آئی رے

ان کے ایک اور گیت ''ابھی تو میں جوان ہوں'' کو بہت مقبولیت ملی۔

بری بحری فضائی فوج سے وابستہ کتنے ہی لوگوں نے طنز و مزاح، شعر و ادب اور تحقیق کے شعبوں میں نام کمایا۔ شفیق الرحمن، (کرنل) محمد خاں، مسعود مفتی، سید انور، ضمیر جعفری، مظفر علی سید، امداد باقر رضوی (فہیم اعظمی) وغیرہ۔

مگر ادیب و شاعر سب سے زیادہ جس شعبے سے متعلق رہے وہ تعلیم کا شعبہ ہے، پھر ریڈیو، ٹیلی وژن ہیں۔ ریڈیو کا ذکر کرتے ہوئے میں نے صوتی تمثیل کے ضمن میں بعض معروف لوگوں کی کاوشوں کا ذکر کیا تھا۔ شوکت تھانوی، سید سلیم احمد، آغا ناصر وغیرہ نے اس طرف توجہ کی اور بہت سے ریڈیو ڈرامے تحریر کیے۔ تاہم زیادہ تر سناٹا ہی رہا۔ آگے کوئی قابلِ ذکر کام نہ ہو پایا۔ اسٹیج ڈرامے کی صنف پر اردو میں تاحال چند ہی لوگوں نے توجہ کی ہے۔ پرانوں میں خواجہ معین الدین اور علی احمد مرحومین ہیں۔ آج کے لوگوں میں کمال احمد رضوی، کراچی والے خالد احمد اور سرمد صہبائی ہیں۔ مگر یہ صاحبان جو کرتے رہے ہیں وہ درون خانہ ہی رہا ہے۔ عامۃ المسلمین اس سے فیض یاب نہ ہو سکے۔

ایک خاص صنفِ ادب جسے ''ادبی ڈرامے'' کا نام دیا گیا، اردو کے سوا شاید ہی کسی اور زبان میں موجود ہو۔ کیوں کہ ڈراما جہاں بھی لکھا گیا اسٹیج پر کھیلے جانے کے لیے لکھا گیا ہے۔ تاہم میرزا ادیب نے بہت سے ادبی ڈرامے تحریر کیے۔ اس صنف کا سب سے اہم نمائندہ ڈراما سید امتیاز علی تاج کا ''انارکلی'' ہے۔ جہاں تک میرے علم میں ہے۔ پہلے بھی بعض تبدیلیوں کے ساتھ اسے صرف تعلیمی اداروں میں شوقیہ اداکار، ہدایت کار ہی اسٹیج کر پائے ہیں۔ ویسے اس مشہور ڈرامے کی اثر انگیزی کے قائل بھی

ہیں یہ خود امتیاز علی تاج مرحوم نے ''انار کلی'' کے دیباچے میں لکھا ہے، ''تھیٹروں نے اسے قبول نہیں کیا اور جو مشورے ترمیم کے لیے انھوں نے پیش کیے انھیں قبول کرنا مجھے گوارا نہ ہوا۔''

مشہور ماہرِ تعلیم، محقق اور نقاد ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ اگر ''انار کلی'' کا مقابلہ ان ڈراموں سے کیا جائے جو اسٹیج کے لیے لکھے گئے اور اسٹیج پر کامیاب ہوکر بعد میں کتابی شکل میں چھپے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی وہ خوبیاں جو غور اور اطمینان سے پڑھنے والوں کے سامنے آتی ہیں، اسٹیج پر پیش ہونے کی روا روی میں بالکل غائب ہو جاتیں۔ مجھ ناچیز کے خیال میں یہ ایک دور دراز اندیشہ ہے۔ اگر ''انار کلی'' اسٹیج کے لیے لکھا جاتا تو کہیں زیادہ مقبول اور اثر انگیز ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ ''انار کلی'' پڑھنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ ناول بھی ہوسکتا تھا مگر ناول کے فن کے بجائے اسے ڈرامے کے فن میں لکھا گیا ہے اور اسے اس معیار سے دیکھنا چاہیے۔ بہرحال اردو نثر میں یہ ڈراما ہمیشہ اہمیت کا حامل رہے گا اور اپنی خوب صورت اور شستہ نثر کی وجہ سے ہمیشہ ادبی نظر آتا رہے گا۔ پھر یہ بھی ہے، ڈراموں کے کھاتوں میں اسے اس لیے ڈالا جاتا ہے کہ اس ٹائم zone کی تو ایک ہی تحریر مہیا ہے جیسے ناولوں میں پہلی ناول ''امراؤ جان ادا'' خود اپنی نمائندگی کرتی رہتی ہے۔

جغرافیائی حدوں میں متعین کی گئی کسی سیاسی entity کا آغاز وقت کے طے شدہ مرحلے سے سوچا اور بیان کیا جاسکتا ہے جیسے ۱۹۴۷ء میں چودھویں پندرھویں اگست کی درمیانی شب میں ٹھیک بارہ بجے (زیرو آور پر) ایک ملک پاکستان وجود میں آیا۔ لیکن جسے اپنے جوہر میں پاکستان کہا اور پہچانا گیا وہ تو ہمیشہ سے تھا۔ اس کے لوگ، ان کی خوشیاں، غم، رشتے ناتے... ان کے رقص، گیت، کہانیاں، تاریخ، تصویریں، ہاتھوں کا ہنر اور انسانوں کا وہ ریلا جسے یہ سب کرنے بالآخر ان جغرافیائی حدوں میں آنا تھا، یہاں پیدا ہونا تھا، وہ بھی... وقت کے اس طے شدہ مرحلے پر وہ بھی اپنے essence میں یہاں موجود تھے۔ لوگ اسی طرح گا رہے تھے، تصویریں بنا رہے تھے، کہانیاں لکھتے اور شعر کہتے تھے اور جنھیں آگے بھی یہ سب کرنا تھا اگست کی اس مبارک پیدائش کے وقت بھی کہیں نہ کہیں وہ اپنا وجود رکھتے تھے۔

جی ہاں، پچاس برس آگے کا فن کار اور میں اور وہ جس نے پچاس برس پہلے کچھ لکھا، گایا، paint کیا، اپنی زمین کے جوہر میں موجود تھے... بس یوں تھا کہ صحیح وقت پر ہم میں سے ہر ایک کو اپنا اپنا اظہار کرنا تھا اور یہ کہنا تھا کہ ''او میں آ گیا۔''

میں فنون کے اور فن کار کے لازمانی تسلسل کو اسی طرح سمجھتا ہوں۔ مگر... یہ بات مجھے اس مختصر جائزے کے آغاز ہی میں کہہ دینی چاہیے تھی۔

اب آگے چلتے ہیں۔ اس دور کے ایک عظیم شاعر اور نقاد ٹی ایس ایلیٹ نے کہا ہے کہ اچھے تنقیدی شعور کے بغیر اچھی تخلیق وجود میں نہیں آسکتی۔ یہ ہم غالب کے مختصر دیوان پر نظر ڈال کر آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ بڑا تخلیق کار جب تخلیق کی گرمی اور سرشاری سے گزر چکتا ہے تو پھر وہ ایک اچھے نقاد

کے روپ میں اپنے کیے ہوئے اور بنائے ہوئے کا کڑا حساب بھی لیتا ہے۔ اُسے اُجاتا ہے یا کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ غالب کا مختصر اور بے مثال دیوان اُس بے مثال احتساب کا ثبوت ہے جو غالب نقاد نے غالب تخلیق کار کے لیے روا رکھا۔

صاحب! میں تو یہی سمجھا ہوں کہ اپنا حساب لیتے رہنا ضروری ہے۔ مگر غالب کا ذکرِ خیر کر چکنے کے بعد خیال ہوا کہ یہ کوئی کلیہ نہیں بن سکتا کیوں کہ میر کے دواوین ہمارے سامنے ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کا بلند درجۂ کمال تک ہے اور پست، غایت درجہ پست ہے۔ پھر بھی میر خدائے سخن ہیں اور اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

خواتین و حضرات! ان تمام برسوں میں نئے پرانے نقادوں کی ایک کھیپ مستعدی سے اپنا کام کرتی رہی۔ لکھنے والے بھی جم کے لکھتے رہے۔ بہت سے لکھنے والوں نے منصوبہ کاری کے ساتھ رتی ماشہ ناپ تول کے، گن گن کے، نقادوں سے منظوری لے لے کے کام کیا ہوگا۔ بعضے اللہ توکل لگے رہے... وہ جو کہتے ہیں کہ:

تلسی اپنے پیو کو بھجو ریجھ یا کھیج
بھوم پڑے سب اُپجیں گے الٹے سیدھے بیج

یعنی ایک انہماک اور استغراق سے (ریجھ کے) یا شرما حضوری میں (کھسیا کھسیا کے، کھیج کے) اپنے محبوب کا نام جپتے رہو، جو بیج زمین پر الٹے سیدھے بھی بکھرا دیے تو مالک چاہے گا وہ بھی پھوٹیں گے۔

میں کتنوں کو جانتا ہوں جنھوں نے اسی طرح اللہ توکل لکھا، بے خوف ہو کے لکھا۔ کوئی لابی تیار نہیں کی۔ نقادوں کی حویلیوں پہ "ڈالیاں" لے لے کر نہیں پہنچے (پرانا لفظ ہے: مزارع لینڈ لارڈ کی خوشنودی کے لیے کھیت کی پہلی فصل ٹوکروں میں سجا کے لے جایا کرتے تھے) اُنھوں نے کسی سے نہیں پوچھا کہ باس! حکم کرو، کیا لکھوں؟ اور اُن کے الٹے سیدھے بیج اکھوے لے آئے۔ اب لہلہاتے ہیں۔ ایسے بے دریغ لکھنے والے کم ہیں۔ مگر ہیں ضرور۔ قاری نے اُن پہ توجہ کی ہے۔ اُن سے پیار کیا ہے۔ انھیں پڑھا جا رہا ہے اور پڑھا جائے گا۔

دوسری طرف وہ لوگ بھی تھے کہ بڑے تام جھام کے ساتھ اپنے پیکر سازوں کے جلو میں ہٹو بچو کراتے ہوئے نکلے تھے۔ ضرورت مند ادبی پرچوں نے انھیں اٹھائیس اٹھائیس صفحوں کا پروٹوکول دیا تھا مگر اب تلاش کرنا چاہو بھی تو وہ "گم گشتے" دستیاب نہیں۔ اللہ ہی اللہ ہے۔

اور خدا جانتا ہے کتنے ہی سنجیدہ نقادوں نے کسی بھی طرح کی اور ہر طرح کی وڈیرا گیری سے حذر کیا ہے۔ صرف وہی لکھا جو اُن کے خدا نے، اُن کے ادبی ضمیر نے اُن سے لکھوایا۔ اب نام کیا گنوانا۔ وہ آج بھی محترم ہیں، کل بھی محترم رہیں گے۔

نقادوں کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے ایک تیز و تند قلم والے استاد و نقاد شمیم احمد کی چند سطریں

پڑھوانا ضروری خیال کرتا ہوں۔ وہ میرے پسندیدہ شاعر عزیز حامد مدنی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ ایک بدنصیبی کی بات ہے کہ اختر الایمان اور عزیز حامد مدنی والی نسل کو ایسے نقاد بھی میسر نہ آسکے جو مجاز، میراجی اور راشد کو حاصل ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے اس نسل میں اختر الایمان، عزیز حامد مدنی اور مختار صدیقی سے لے کر مجید امجد تک کسی شاعر کو کوئی توجہ حاصل نہ ہوسکی اور ہمارا جدید تنقیدی ادب کوتاہیِ داماں کا شکار ہوگیا۔ اسی بنا پر مدنی صاحب پر بھی وہ کچھ نہیں لکھا جاسکا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔

اس بے توجہی کے دو تین بنیادی وجوہ ہیں جن کا ذکر کرنا یہاں ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ان کے ہم عصر، ہم خیال نقادوں کو اپنے شاعرانہ ذوق اور تنقیدی رائے پر وہ اعتماد نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے عہد کے نئے شاعروں کے بارے میں کوئی پیش گوئی کرنے کا خطرہ مول لے سکتے اور دوسری بات یہ تھی کہ تقسیمِ ہند کے وقت ادب کی اجتماعی فضا تبدیل ہوکر ایک ایسے موڑ پر آگئی تھی جہاں ہندوستان اور پاکستان کی ادبی سرحدیں سکڑ گئی تھیں اور تقسیمِ ہند کے بعد ابھرتے ہوئے شاعروں اور نقادوں نے مذکورہ نسل کو نظرانداز کرکے اپنے اپنے گروہ اور "لابیز" بنا کر اپنی شخصیت سازی کی مہم بھی شروع کر دی تھی۔ حالاں کہ ابھی تو اُن کے شعری خدوخال بھی واضح نہ ہوسکے تھے۔ خودستائی اور اپنے اپنے گروہ کی غیر معتبر مدح سرائی کے لیے ان "لابیز" کے نئے نئے آرگن نکالنے اور رسالوں پر قبضہ جمانے کی روش ہی کی وجہ سے ادب میں ایک ایسا منفی رجحان پیدا ہوا جو آگے چل کر کتابوں کی تقریبات کی ایک ناپاک اور بے معنی سرگرمی میں تبدیل ہوگیا۔ غالباً اسی وجہ سے ۱۹۳۶ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان ابھرنے والے شعرا پر وہ کام نہ ہوسکا جو ہمارے موجودہ ادب کی گم شدہ کڑیوں کو ملا سکتا۔ اس صورتِ حال کو اور زیادہ سنگین مدنی صاحب کے اپنے رویّے نے بھی بنا دیا تھا۔ وہ ادب کی اُن اقدار کے نمائندے تھے جس کی رُو سے اپنے بارے میں سوچنا یا اپنے حوالے سے بات کرنا معیوب بات سمجھی جاتی تھی۔

آگے چل کر شمیم احمد لکھتے ہیں کہ "مدنی صاحب نے اس بارے میں ایک بے نیازی کا رویّہ برتا اور اُس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ مگر یہی رویّہ ہماری تخلیقی اقدار کی سچائی اور بڑائی کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔"

تو گویا مدنی جیسی بچی تخلیقی قدروں کے پاس دار دو چار اور بیبے بندے ہیں مختار صدیقی اور مجید امجد وغیرہ، یہ بھی اہلِ نظر کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ان کا مسئلہ وہی وضع داری تھی یعنی اپنے بارے میں یا اپنے حوالے سے بات کرنا ہلکا پن ہے۔ اس لیے خاموشی... کوئی اور بات کرو میاں...!

پچھلے دنوں ایک سمعی بصری پروگرام میں بائیس تیئس سال کے ایک خوش لباس کمپوزڈ شخص کو دیکھا جسے گلوکاری کا دعویٰ بھی تھا۔ وہ پورے یقین سے کیمرے کے آگے اپنا گھونسا لہرا کے کہہ رہا تھا کہ میں best ہوں، میرا ہم سر کوئی اور نہیں... مجھے خیال گائکی کے استاد عاشق علی خاں بے طرح یاد آئے۔ ان کی تعریف ہوتی (اور تعریف بھی کون کر رہا ہوتا... رفیق غزنوی سا واقفِ حال) تو عاشق استاد کی آنکھیں بھیگ جاتیں، کہتے، ''ننگِ اسلاف ہوں۔ بڑوں نے بہت کچھ عطا کرنا چاہا تھا۔ میں ٹوٹا پھوٹا بس اتنا ہی کر پایا۔''

میں ان دوستوں مجید امجد اور مختار صدیقی سے کبھی نہیں ملا۔ دونوں ہی بہت پہلے رخصت ہوگئے تھے۔ ناصر کاظمی صاحب کی طرح وہ دونوں بھی میرے سینئر تھے۔ ناصر صاحب سے تو دوستوں نے کرنچ میں ایک دو بار ملوایا تھا۔ بڑے سایہ دار آدمی تھے۔ انھوں نے سراہا تھا، مجھے شاباش دی تھی جیسا کہ بڑوں کا طریقہ ہوتا ہے۔ اُس وقت میں شہر سے بار بار نکلنے کے قابل ہوتا تو ناصر صاحب سے اور مجید صاحب سے ملنے ضرور جایا کرتا۔

مجید امجد کی بنائی ہوئی ایک تصویر مجھے haunt کرتی ہے:

مست چرواہا چراگاہ کی اک چوٹی سے
جب اترتا ہے تو زیتون کی لانبی سوٹی
کسی جلتی ہوئی بدلی میں اٹک جاتی ہے

میرے ایک شاعر دوست نے کہا، ''اس میں صوتی اکراہ ہے... سوٹی اور اٹک'' میں نے کہا، ''ہے بھلا! منظور ہے، پینٹنگ اچھی ہے اور تازہ ہے۔ کینوس سے ابھی تارپین کے تیل کی مہک آتی ہے۔ پروا نہیں mellow ہو جائے گی تو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

ڈاکٹر محمد حسن نے مجید امجد پر ایک مختصر مضمون لکھا تھا، ان کی نظموں کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ مجید امجد شہروں کی تہذیب کے شاعر ہیں جو شہر کہ کارخانوں دفتروں نے اور مارکیٹ اکونومی نے پیدا کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مجید کی شاعری سے اگر کوئی تصویر بنائی جائے گی تو وہ ایک نچلے متوسط طبقے کے نوجوان کی ہوگی جس کے ساتھ شہر کی دنیا ہر ہر قدم پر موجود ہے... یہ نچلے متوسط طبقے کا نوجوان اپنی قصباتی زندگی کا اجتماعی آہنگ چھوڑ کر آیا ہے اور اب اُسے پروا بھی نہیں کہ کیا چھوڑ آیا ہے۔ وہ فلم ایکٹروں، ٹیسٹ کھلاڑیوں کی طرح ڈھیروں پیسے کمانے کے ہوائی قلعے بنانے لگا ہے۔ وہ قصبے میں رہ نہیں پایا اور شہر اُسے اپناتا نہیں۔ اچھی نوکری نہیں ملتی۔ کام کر کر کے مرا جاتا ہے بے چارہ۔

نیست کھلاڑیوں، شاعروں، ایکٹروں کا ذکر چل رہا ہے تو اُس دور کے بہت سے روشن طبع چمک دار لوگ یاد آ رہے ہیں۔ اُن کا گلیمر (glamour) ہم ایسے نوواردوں کے لیے رشک کی چکاچوند پیدا کرنے والا تھا۔ اُن کا فزیکل گلیمر بھی، ذہنی گلیمر بھی۔

ایک چھوٹا سا واقعہ:

یونی ورسٹی کے نئے کیمپس تک ہم طالبِ علم جس طرح پہنچتے تھے وہ خود اپنی جگہ ایک قابلِ ذکر اور مستقل عذاب تھا۔ اس عمر کے اکثر طالب علموں کے لیے اب بھی ہوگا (کیوں کہ کہیں کوئی بنیادی تبدیلی تو ہوئی نہیں ہے۔ سرخ سبز یا کسی بھی رنگ کا سویرا تک نہیں آیا ہے) دوڑ کے بس پکڑنا تو شاید لہو گرم رکھنے کا بہانہ ہوگا مگر کنڈیکٹروں، ڈرائیوروں کے انداز، اُن کے طنز آمیز فقرے، دھکم پیل وغیرہ، ان سب سے الجھن رہتی تھی تو ہم اور ہمارے ہم عصر لفظوں میں تصویریں نہ بناتے ہوئے خاموشی سے ایک خواب دیکھا کرتے تھے کہ ایک کار... اور کار نہیں تو بی ایس اے موٹر بائک ہے، ہم اُڑے چلے آ رہے ہیں۔ نکٹائی (نکٹائی کہنا اچھا لگتا تھا۔ پطرس بھی یہی کہتے ہوں گے) تو نکٹائی شانے پر سے ہوکر پشت پر لہراتی ہوئی۔ کیمپس آجاتا ہے۔ ہم اترتے ہیں نکٹائی سیدھی کرتے ہیں اور سب ہمیں دیکھ رہے ہیں... لڑکے لڑکیاں سب۔

پھر ایک روز ہم نے بالکل اسی طرح ہوتے ہوئے دیکھا... کسی اور لڑکے کے ساتھ۔ وہ لڑکا نئی گاڑی سے اترا تھا۔ اُس کی نکٹائی لہرا نہیں رہی تھی۔ ایئرفورس کے بہترین تراش کے grey یونی فارم میں پوری طرح سٹ تھی۔ اُس کی آستینوں پر چھوٹے چھوٹے شرمیلے ربن لگے تھے اور سینے پر wings۔ وہ نپے تلے قدموں سے فارم جمع کرانے والی کھڑکی تک گیا۔ فارم جمع کرایا اور پھر واپس نئی گاڑی میں، بہترین تراش کے نئے یونی فارم میں... نکٹائی لگائے۔

ہم نے دیکھا، اُسے سب دیکھ رہے تھے، لڑکے لڑکیاں سب۔

ہم نے بہت دنوں تک دلیلیں دیں خود کو قائل کرتے رہے کہ وہ set نکٹائی ونگز ربن والا اپنا کام کر رہا ہے، تم اپنا کام کیے جاؤ اس لیے کہ تمھیں تو کسی اور شعبے میں کام کرنا ہے۔

پھر برسوں بعد ہم نے اپنے جیسے نوجوانوں کو دیکھا، شاعری کر رہے ہیں۔ اچھی خاصی۔ خیر وہ ہم بھی کر رہے تھے۔ مگر وہ سب مسکراتے ہوئے اسٹیج پر جاتے، وہاں بیٹھے، سینئر شاعروں کو اُن کے firstname سے بلاتے، اُن کے کلام کی تعریف ایسے کرتے جیسے ہم عصروں کی کاوشوں کو اکناج کیا جاتا ہے۔ وہ فیض صاحب کے ساتھ کوک پیتے، ان کے سامنے چہکتے ہوئے قہقہے لگاتے اور وقت آنے پر گلڈوں اکادمیوں کے ریزیڈنٹ بہادر ہوجاتے۔

ہم نے دلیلیں دیں، خود کو قائل کیا کہ بھئی وہ اپنا کام کر رہے ہیں، تم اپنا کام کیے جاؤ۔ پھر ہم نے دیکھا اور دیکھتے رہے... اس کے بعد سے اور بھی بہت کچھ دیکھ رہے ہیں۔

ابھی ابھی ہم نے مدنی صاحب، مجید امجد، مختار صدیقی، الف الخراث وغیرہ کو دیکھا ہے (آخری تین دوستوں سے نہ مل سکنے کا ملال پھر تازہ کرتا ہوں) تو یہ دیکھا ہے کہ وہ کام کر رہے ہیں اور بہت سی باتوں سے بے نیاز ہیں اور ہم نے خود سے کہا ہے کہ میاں! یہ صحیح ہے، کام کیے جاؤ۔ کسی بھی طرح کے گلیمر میں کیا رکھا ہے۔

تاہم اندر کہیں گہرائی میں ایک خواہش اب بھی سر اٹھاتی رہتی ہے... ہم نے دیکھا تھا حفیظ جالندھری صاحب نے بہت مفید... مفید اُن کی اپنی ذات کے لیے... اور شان دار زندگی گزاری تھی۔ اللہ نے خاتمہ بھی انھیں شان دار دیا۔ آرام بھی کہاں کر رہے ہیں۔ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے برابر۔ تو کبھی کبھی ایک آخری... ایک دم آخری امیج آنکھوں کے آگے بن جاتی ہے کہ وہیں کہیں بادشاہی مسجد کی سیڑھیوں کے پاس اپنا بھی ایک مزار ہے سنگِ مرمر کا... سادہ سا... اور ایک ٹکٹائی ہے شانے پر سے ہو کر پشت پر لہراتی ہوئی۔ اور سب دیکھ رہے ہیں۔

چوتھا کام کرنے والوں اور قبولِ عام حاصل کرنے والوں میں اردو نثر کے دو نام ایسے ہیں جنھیں بار بار دوہرایا جائے تو بھی وہ کانوں کو بھلے لگتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی صاحب اور قرۃ العین حیدر صاحبہ۔ یوسفی صاحب discriminating تک چڑھے قاری کا اور عام پُرشوق پڑھنے والوں کا دل جیتنے والے مصنف ہیں۔ قرۃ العین صاحبہ بھی کم و بیش ایسی ہی تھیں مگر سنا ہے وہ اب slip کرنے لگی ہیں۔ لوگ عقیدت و محبت سے ملنے جائیں تو بھی چڑچڑاتی ہیں۔ خیر ہم تو یہ جانتے ہیں کہ کلاس کے ساتھ مقبولیت بھی نصیب ہو تو اسے عطیۂ خداوندی سمجھنا چاہیے، موڈ نہیں بگاڑنا چاہیے۔ راقم مس حیدر سے کبھی نہیں ملا۔ خدا کرے کہ ان کے بارے میں جو یہ کہا جا رہا ہے، غلط ہو۔ وہ بہرحال اردو نثر میں ایک لیجنڈ بن چکی ہیں... خدا انھیں سلامت رکھے۔

ایسا ہے کہ ہم اساطیر سے باہر نہیں جی سکتے۔

اور اچھی کہانیاں سننے والے اور اچھی کہانیاں گھڑنے والے (یا گڑھنے والے) جانتے ہیں کہ legened، روایت اور اسطور سننے میں اچھی اور سنانے میں کہیں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ بڑی سنسنی اور ڈراما ہوتا ہے اُن میں۔

اور ہر چیز کی طرح اساطیر کی شروعات کہیں نہ کہیں سے تو ہوتی ہوگی۔

اُس پہلے آدمی کا تصور کیجیے جس نے محمود غزنوی، فردوسی اور شاہنامے کے حوالے سے فی شعر ایک اشرفی منظور کر لینے کے بعد بادشاہ کے زبان سے پھر جانے کا قصہ سوچا ہوگا۔ وہ آدمی کس بات پر بادشاہ سے خفا ہوگا اور حساب چکتا کرنے کو اُس نے یہ کہانی بنائی ہوگی... یا جو بھی ہو، کتنا لطف آیا ہوگا اُسے یہ سب گھڑتے (یا گڑھتے) ہوئے۔ اُس نے کیسی سنسنی اور ٹنگ لنگ (tingling) محسوس کی ہوگی۔ وہ راتوں کو اٹھتا اور بستر پر بیٹھ بیٹھ جاتا اور ٹہلنے لگتا ہوگا... وہ چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کتنی بار

. ہوں ہوں کر کے سر ہلاتا اور ہوا میں گھونسا چلاتا ہوگا اور اپنی اس اختراع کی اثر انگیزی پر بہت خاموشی سے ایک زبردست ''یا ہوو'' (yahoo) وسپر کرتا ہوگا۔

اور خواتین وحضرات! اُس پہلے آدمی سے کہیں زیادہ لطف اُس دوسرے کو آیا ہوگا جس نے اس شاہی بددیانتی کی کہانی کو فنشنگ ٹچ دیا۔ وہ دوسرا کلائی میکس ساز آدمی کمال کی چیز ہوگا جس نے کہانی یوں آگے بڑھائی کہ فردوسی کو ''منع'' کر دینے کے بعد محمود غزنوی نے بعد میں سوچا تو اُسے خفت ہوئی اور پشیمان ہو کے اُس نے اشرفیوں کی تھیلیاں فردوسی کو بھیج دیں۔ مگر...

...اور خواتین وحضرات! اس مگر کے بعد کہانی کا کلائی میکس آتا ہے۔ مگر اشرفیاں پہنچیں تو حال یہ تھا کہ ایک دروازے سے موعودہ اشرفیاں لے جائی جارہی تھیں اور دوسرے دروازے سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا۔ واویلا، واویلا۔ واحسرتا!

یہ bang ہے کہانی کا جس پر سننے والے کا پورا وجود جھنجھنا اٹھتا ہے۔ اسے کہتے ہیں پرفیکٹ ڈراما۔

یہ اتنا مکمل کلائی میکس ہے کہ میں نے پہلی بار سن کے ہی کہہ دیا تھا کہ دوست! لکھ لو، تاریخ نہیں یہ فکشن ہے۔ تاریخ اتنی اچھی طرح set اور trim کی ہوئی نہیں ہوتی وہ تو زندہ انسانوں کا احوال سناتی ہے، جو دیوتاؤں کی طرح اچھی ٹائمنگ پلان نہیں کر سکتے... یا پلان نہیں کر پاتے... بے چارے اکثر وبیشتر سلپ کر جاتے ہیں۔

معاصر تاریخ (جب گزر رہی ہوتی ہے اُس وقت بھی وہ زندگی ہی ہوتی ہے) اپنے بے ساختہ پن میں اکثر ایک بھدی غیر ڈرامائی رفتار سے کسی بھی قابلِ ذکر event کے بغیر گزرتی ہے۔ کبھی کبھی تو اس کے بارے میں سوچنا بھی خفت اور اُداسی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

یعنی مثلاً ''شامِ اودھ'' والے ڈاکٹر احسن فاروقی کا یہ واقعہ کہ جب وہ ایک آسودہ حال شاعر کے گھر بس میں سوار ہو کے کراچی کی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی پہنچے (ڈاکٹر احسن فاروقی ''شامِ اودھ'' والے بسوں میں بیٹھتے تھے) تو جیسا کہ بھلے لوگوں کا طریقہ ہے، میزبان کے وہاں اُن کی بے حد تواضع کی گئی۔ وضع دار لوگ مہمان کو اچھا ہی کھلاتے ہیں۔ خیر، بہت دیر بعد جب ڈاکٹر صاحب کو رخصت کیا گیا تو صاحبِ خانہ نے شاید ٹیکسی بلا دی اور ٹیکسی والے کو خاموش سے پیشگی ادائی کر دی یا احسن فاروقی کو لفافے میں نوٹ رکھ کے پیش کر دیے کہ حضرت! یہ ٹیکسی والے کو دے دیجیے گا جس پر فاروقی صاحب حد درجہ مسرور ہوئے اور آب دیدہ ہو کر انھوں نے کہا... مگر نہیں۔ میں quote نہیں کروں گا۔

کسی اہم آدمی کو quote کرنا بڑی ذمہ داری کی بات ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ انھوں نے بے پناہ احسان مندی... گریہ ناک احسان مندی کا اظہار کیا اور میزبان اپنی بھل منسی میں اداس ہوگیا وغیرہ۔

ڈاکٹر احسن فاروقی نادہندنہیں تھے، انھوں نے زندگی کو پُرمایہ کیا تھا، لکھ لکھ کے۔ وہ استاد بھی تھے، وہ چھوٹے آدمی نہیں تھے۔ اور ہوتے بھی تو کیا۔

دُکھ یہ ہے کہ زندگی نے ایک ایسے آدمی کو جو خود اردو نثر کا ایک ''واقعہ'' تھا، میرے شہر کی سڑکوں پر un-eventful بنا دیا۔

سنا تھا، ایک سے زیادہ مرتبہ ڈاکٹر فاروقی سمندر میں ڈوبنے بھی گئے تھے مگر ڈوب نہ سکے۔ بچالیے گئے تھے یا خود ہی بھیگے ہوئے، بیمار، شرمندہ سے لوٹ آئے تھے۔ پتلون پر پھٹی ہوئی جیبوں میں چھوٹے گھونگھے اور ریت بھری ہوئی، جوتے پانی سے غرچ غرچ کرتے ہوئے... اجهوں نہ نکلے پران کٹھور۔

یہ ایک بھیانک مایوسی کا اینٹی کلائی میکس ہے جسے زندگی نے اپنی روایتی بے حسی سے پلان کیا تھا... یا بالکل بھی پلان نہیں کیا تھا... یعنی وہ احسن فاروقی صاحب کو یونانی حزیے کا bang والا خاتمہ بھی نہ دے سکی۔ شیکسپیئر کی اوفیلیا جیسا (جسے ڈاکٹر فاروقی ساری زندگی پڑھاتے رہے) grand finale نہ دے سکی۔

بعد میں وہ کہنے لگے، سمندر نے مجھے قبول نہیں کیا، ابھی ''یہ'' راہ و رسم نہیں ہے اس سے۔ گومتی میں اُترتا تو قبول کر لیتی۔

دیکھا آپ نے؟ یہاں گرد و پیش میں ایک بے دردانہ روٹین اور بدصورتی ہے جو کسی بھی وقت ایک جگمگاتے ہوئے luminary کو گہنا سکتی ہے اور ایدھی سینٹر کے سردخانے میں نمبر لگوا کے ڈال سکتی ہے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ یہ چیز کہ جس کے انگوٹھے سے دفتی کے ٹکڑے پر لکھا نمبر بندھا ہوا ہے، ایک واقعی زندہ اور متحرک آدمی تھا۔ اور یہ زندہ تھا تو ادب کی، شاعری کی یا مصوری اور راگ راگنیوں کی جان کاری کی اور کسی بھی تہذیب یافتہ فن کی تکمیل اس کے ہاتھ میں تھی یا یہ بہت اچھی منجھیاں گھڑتا تھا، یا چاک پر کوزے بناتا تھا... کچھ بھی اچھا اچھا کرتا تھا یہ اور اس کا نام فلاں تھا۔

یہ زندگی کی طے شدہ بدصورتی ہے کہ شبلی نعمانی اور اپنے علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی دوست، مصور فیضی رحمین کی محبوبہ بیگم عطیہ فیضی عمر کے آخری حصے میں کسی بھی پارٹی سے لوٹتے ہوئے خاموشی سے اپنے شولڈر بیگ میں cookies اور کیک اور نرم پکے پکے پھل ڈال لیتی تھیں تاکہ بعد میں رات میں آنکھ کھلنے پر اور دن میں بھی انھیں کھاتی رہیں۔ یہ کسی قسم کا خبط، جھک یا عمر رسیدگی سے وابستہ کوئی ذہنی رو نہیں تھی۔ سادہ سی بات تھی، ایک بوڑھے آدمی کو قوت بخش غذا کی ہر وقت ضرورت ہوتی ہے سو عطیہ جو اکیلی تھیں، خود ہی اپنی پروا کر رہی تھیں۔ میری پٹھان logic دھیرے سے مجھ سے کہہ رہی ہے کہ خانا! جس کے سب مر جاتے ہوں اُس کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔

ان باتوں سے میں کسی طرح کی بے ثباتی یا گرد و پیش کے لوگوں کی بے حسی وغیرہ کا پوائنٹ

نہیں بنانا چاہتا۔ صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ زندگی کبھی اتنی بھدی بھی نظر آنے لگتی ہے اور ایسا کتا سلوک بھی کرتی ہے آپ کے ساتھ، خاص طور پر جب spotlight آپ پر سے ہٹ گئی ہو۔

اور جن پر اسپاٹ لائٹ کبھی پڑی ہی نہ ہو... اُن کا تو رب راکھا ہے۔

لاہور میں ایک صاحب تھے الف الحراث (یہ قلمی نام ہے، زمین توڑنے والے ہل کے پھل کو کہتے ہیں) سنا ہے کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ ساری زندگی لغت پر کام کرتے رہے (بہت سے لوگوں کو اُن کی بنائی تراکیب مضحکہ خیز لگتی ہیں۔ لگتی ہوں گی، مگر وہ ایک الگ معاملہ ہے)۔ اُن کا یہ کوئی اسائن منٹ نہیں تھا۔ بس اپنے لیے اور اللہ واسطے کر رہے تھے۔ رائٹ آنریبل امجد اسلام نے بتایا ہے کہ وہ انھیں جانتا تھا... بڑی بات ہے۔ لوگوں نے کوشش کر کے اکادمی ادبیات اسلام آباد سے الف الحراث کا وظیفہ لگوا دیا تھا، تین سو روپے ماہوار۔ الف صاحب نے دس روپے زور میں زندہ رہنے کی صورت یہ نکالی تھی کہ ایک خالی دکان میں اپنا بستر لگا لیا تھا، بھوک لگتی تو چائے بن کھا لیا کرتے تھے۔ چوبیس گھنٹوں کے دورانیے میں جب تک جاگتے لغت کا کام کرتے تھے۔ بُرا بھلا جیسا بھی مگر کام وہ لغت اور علوم سے ہی متعلق تھا۔ ہمسائے کے ایک گوجر نے (گجر شیر نر ہندے نیں) الف صاحب کی خدمت کی یہ صورت نکالی تھی کہ دن میں کتنی ہی بار گرم دودھ کا پیالہ میٹھا ڈال کے پیش کر دیا کرتا تھا یقیناً وہ گوجر لغت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

(اکادمی نے بھی کچھ بُرا نہیں کیا، وظیفہ پھر وظیفہ ہوتا ہے)

☆

بڑے لوگوں کی باتیں ہو چکیں۔ اب میں کچھ اپنے بارے میں لکھوں گا۔ بیزار نہ ہوئیے، یہ ضروری ہے۔ ایک اور point بنانا چاہتا ہوں ورنہ تو اپنے بارے میں اس طرح لکھتے چلے جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

میں سال ۱۹۶۰ء سے لکھ رہا ہوں۔ لکھنے والوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا، چلتا پھرتا تھا۔ اب کچھ برسوں سے خانہ نشین سا ہو گیا ہوں۔ بڑوں میں بس ن م راشد صاحب سے نہ مل سکا باقی سب کی زیارت کی ہے۔ اور وہ جو اپنی معاشرت ہے کہ بڑوں سے احترام سے ملو اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آؤ تو یہی سب سیکھا تھا میں نے، یہی سب کیا ہے۔ میرے لیے سڑک کنارے سائیکل پنکچر مرمت والی خستہ حال جھگی دکان میں استاد قمر جلالوی سے ملنے کی بھی اتنی ہی اہمیت تھی جتنی سرکاری خرچ پر راولپنڈی کے پانچ ستارہ ہوٹل میں قیام کے دوران مثلاً انیس ناگی سے ملاقات کی۔ دونوں سے مل کر میں نے خود کو زیادہ معزز محسوس کیا تھا۔ آج تک زمانۂ طالب علمی کی اُس ملاقات اور سن ترانوے کی اس دوسری ملاقات کو پیار اور احترام سے یاد کرتا ہوں۔

ویسے تو لکھنے والا مجھے کاغذ ہی پر اچھا لگتا ہے بہت کم کہیں جاتا ہوں یا مجھ سے ملنے اپنی محبت

میں کوئی چلا آئے تو چشم ما روشن، دلِ ما شاد۔ بساط بھر وقت دیتا ہوں، تواضع کرتا ہوں اور دل میں کہتا ہوں کہ یہ وقت تو بھجری کس کا ہوا۔ ملاقاتی رخصت ہولے تو پھر کچھ لکھ پڑھ لوں گا۔

یہ نہیں کہ میں پڑھنے لکھنے کا اتنا دیوانہ ہوں۔ بس شوق ہے اور اپنے مطلب کی چیزیں پڑھنے کی ایک ٹیکنک میں نے وضع کرلی ہے۔ وہ یہ کہ کسی اہتمام یا شعوری کوشش کے بغیر سانس لینے کی طرح آسانی سے پڑھتا چلا جاتا ہوں، جتنا میرے مطلب کا ہے skim کرتا جاتا ہوں۔ اور لکھنا میں نے اپنے دوست سلیم احمد سے سیکھا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے۔ غلط نہ سمجھیے۔ لکھتا میں دائیں ہاتھ سے ہوں مگر سلیم بھائی کی طرح میں نے اپنی لکھت دو خانوں میں بانٹ دی ہے۔ میرا ''دایاں ہاتھ'' وہ لکھتا ہے جسے میں اپنے لیے لکھنا سمجھتا ہوں۔ اس کے لیے میں اپنے ادبی ضمیر کے سامنے جواب دہ ہوں۔ ''بایاں ہاتھ'' سیٹھ کے لیے لکھتا ہے۔ سیٹھ کے لیے بھی میں جی جان سے لکھتا ہوں تا کہ میرا گاہک بندھا رہے۔ بار بار میرے ہی پاس آئے کیوں کہ لفظ سے میری روزی بندھی ہوئی ہے۔ اور ساری زندگی اسپارٹن سادگی سے بسر کرنے کے بعد اب میں خود کو تھوڑی آسائش بھی دینا چاہتا ہوں تو اُس آسائش کے لیے کچھ فالتو کمائی کر لیتا ہوں۔ ٹیلی وژن سے، فکشن میگزینز سے، کبھی اخباروں سے (اُن اخباروں سے جو payment کرنا پسند فرماتے ہوں)۔

اور میں کسی سے ناراض نہیں۔

بس ایک بات سے خفا اور ملول ہوں (خیال رہے بات سے خفا ہوں... شخص سے نہیں) وہ بات یہ کہ ہیہات! مرحوم زیڈ اے بھٹو نے ہمیں بہت جلد پیٹرو ڈالر سے متعارف یا expose کرا دیا۔ سال ۶۵ء سے پہلے مجھ ایسے لوئر مڈل کلاس کے عام سے آدمی کے ''قلبِ مطمئنہ'' میں لگژری چیزوں کے لیے اتنی چاہت نہیں تھی جتنی بعد کو خلیج میں مزدوری کر کر کے، جہازوں میں بھر بھر کے لائے گئے الیکٹرونکس سامان اور مہنگے کپڑوں کی ریل پیل اور چوہا دوڑ کے نتیجے میں پیدا ہوئی (یا جس چاہت کا نتیجہ یہ چوہا دوڑ تھی)۔

یہ تیسری دنیا میں سب جگہ ہوا ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ چیزوں کی چاہت میں سب سے زیادہ ہم مبتلا ہوئے ہیں... ہم پاکستانی۔

عمرانیات کے ماہر میرے اس قصباتی ٹائپ کے over-simplification پر مسکرائیں گے۔ مگر مسئلہ کھلی کھلا کے جہاں اور جتنا نظر آتا ہے، وہ یہی ہے۔ ''۶۵ء کے بعد'' ٹھاٹ دار سامانِ زندگی کی ایک مصنوعی احتیاج ہماری مڈل اور لوئر مڈل کلاس نے اپنی جان کو لگالی۔

ہاں اگر ہمارے سو فی صد لوگ لکھ پڑھ سکتے، کتاب کے بعد آڈیو وژول کھیل تفریح ہماری زندگیوں میں آتی تو اس شعبے میں سب خیریت رہتی۔ پینسٹھ سے ننانوے آگیا۔ سال ۶۵ء میں بیٹری کے کھلونوں سے کھیلنے والے منے اب چونتیس پینتیس سال کے shrewd دنیادار بن چکے ہیں۔ وہ مجھ ایسے

بکرم کتابی کی دلیل پڑھ کے اور سن کے مسکرا رہے ہوں گے۔ میں کیا کروں۔ اپنے اندرون میں محسوس کرتا رہتا ہوں کہ ہمارے ساتھ وہ ہوا ہے جو کیمیکل میں پکائے گئے پپیتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ مارکیٹ کے تقاضوں، مطالبوں کو پورا کرنے کے لیے فی الفور ایک زرد فصل تیار کرلی گئی اور اُسے بازار دکھا دیا گیا۔ اب یہ ہے کہ بے مزہ پپیتوں کا ڈھیر بنے ہم بیٹھے ہیں اور سامنے سے دنیا گزری چلی جا رہی ہے اور... وقت گزرا چلا جا رہا ہے۔ اکیسویں صدی آگئی۔

میں نے بہت زیادہ سفر نہیں کیا۔ دو بار یورپ گیا ہوں، ایک بار مشرق بعید اور بار بار ہمسائے میں گیا ہوں، یعنی ہندوستان۔

وہ ہم ہی جیسے ہیں۔ ہندوستان والے... مگر اُن کے وہاں خواندگی کی شرح ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ تین وسیع وعریض علاقے تو ایسے ہیں جہاں خواندگی سو فی صد یا اس کے قریب ہے۔

تاہم میں اُن کے جس علاقے کی بات سنانے جا رہا ہوں وہ بھیانک misery، غربت، جہالت، مذہبی black mail شدت پرستی اور جنس کی فروخت کا بدنام علاقہ ہے۔ بے آسرا لوگ addiction کی حد تک ایک ایسی تفریح (escape) میں مبتلا ہیں جسے سستے غیر حقیقی بہلاووں کے overtones سے سجایا گیا ہے یعنی ہندوستانی کمرشل فلم۔ وہ ہر وقت فلم دیکھتے، فلم سوچتے اور فلم سنتے ہیں۔ وہ فلم جیتے ہیں اُن کے dream merchants اس پورے منطقے میں اڈکشن فروخت کر رہے ہیں۔

میں بامبے یا مومبائی کی بات سنانے جا رہا ہوں۔ ایک بیمار میگاسٹی کی۔

عجیب بات ہے کہ میں نے اس بیماری کے شہر میں ایک انوکھا صحت مند منظر دیکھا جس نے مجھے حوصلہ دیا۔ زندگی (اور علاقے) کو سمجھنے میں مدد دی۔ میں نے دیکھا وہاں ایک مصنف کی (ہندی کے مصنف کی، جو اردو بھی جانتا ہے) کتابیں millions میں بک رہی ہیں۔ یہ جاننا ایک عجیب تجربہ تھا کہ فلم زدگی کے اُس شہر سے اٹھنے والے رائٹر کی اتنی تعداد میں کتابیں خریدی اور پڑھی جاتی ہیں۔ اگر میں اپنے تجربے میں آپ کو شریک کرسکا تو خود کو مبارک باد دوں گا۔

یہ آج کی بات نہیں ہے۔ کوئی بارہ پندرہ سال ہوگئے اب تو وہاں ایسے اور بھی لکھنے والے ہوں گے... اور بھی کتابیں ہوں گی۔

میں مصنف جگدمبا پرساد دیکشت کے ناول "مردہ گھر" کے اپنے تجربے کی بات سنا رہا ہوں۔

یہ کتاب میں نے یہاں ہندی اسکرپٹ میں پڑھی تھی۔ بیانیہ رواں ہندوستانی میں ہے (یعنی اردو میں)۔ کہانی ایک "جھونپڑپٹی" کی ہے۔ جس کے لیے ہماری اصطلاح "کچی آبادی" ہے۔ ناول کسی غیر ضروری سجاوٹ کے بغیر عام سے لوگوں کی عام سی زندگی کو غیر معمولی insight اور دردمندی کے ساتھ اور دہشت زدہ کیے بغیر... تقریباً پریم چند کی سی سادگی اور طاقت سے بیان کردیتی ہے۔

مگر ٹھہریے۔ میں یہاں وطنِ عزیز کے شاعروں ادیبوں کے بارے میں باتیں کرنے بیٹھا

ہوں۔ یہ SAARC تنظیم کے ملکوں کا کوئی جائزہ نہیں ہے۔

تاہم خواتین وحضرات! میں آپ سے ذرا سے تحمل کی گزارش کروں گا... میں پھر اپنا point بنانے جا رہا ہوں۔ یہ سطریں ختم ہونے سے پہلے آپ کو اور خود کو مطمئن کر دوں گا۔ ان شاء اللہ۔

باہے میں جس دوست کے گھر ہم میاں بیوی ٹھیرے تھے وہ کمرشیل آرٹسٹ ہیں۔ اہلیہ اُن کی پڑھاتی ہیں۔ میں نے جگد مبا پرساد دیکشت کا ذکر کیا تو دونوں نے خوش ہو کے بتایا کہ وہ اس سے مل چکے ہیں۔ کہنے لگے کہ دیکشت مزے کے آدمی ہیں اور آسان بھی۔ سینٹ زیویرز کالج میں ہندی ادب پڑھاتے ہیں۔ جاؤ تمھارے پاس آج وقت ہے، مل لو۔

دوست کو کسی کلائنٹ سے لمبی میٹنگ کرنی تھی، کہنے لگا، ''تمھیں سینٹ زیویرز چھوڑتا نکل جاؤں گا۔ مل لو تو ٹیکسی پکڑ لینا، گھر آجانا۔''

میری بیوی کو اور دوست کی اہلیہ کو ضروری شاپنگ کرنی تھی۔ وہ دونوں روانہ ہوگئیں۔ دوست مجھے اپنی بائک پر سینٹ زیویرز لے گیا۔ گیٹ پر خدا حافظ کہہ کے روانہ ہوا۔

اور یہاں سے اس تجربے کا آغاز ہوتا ہے جس نے میرے لیے کہیں کچھ نہیں بدلا مگر جو مجھے سرمایہ کر گیا... جس نے مجھے تھکا بھی دیا۔

سینٹ زیویرز کالج ایک شان دار کلونیل عمارت ہے، یوں سمجھیے کہ جیسے اپنا فریئر ہال بلکہ اس طرح ہے کہ فریئر ہال کی اصل عمارت کو نہ تبدیل کیا جائے ہاں اس کے باغ کو بہت ہی trim کرنے کے بعد کراچی صدر میں کہیں بھی... مثلاً زینب مارکیٹ پر یا پریس کلب کے قریب کہیں بھی عمارت اور باغ دونوں کو نصب کر دیا جائے۔

میں پام کی طرح کے اور دوسرے بہت سے exotic ٹروپیکل درختوں جھاڑیوں پودوں سے گزرتا، بارش سے ہرے ہو چکے زرد سینڈ اسٹون سے بنی اس عمارت میں گھسا تو دیکھا بہت سے سنجیدہ نظر آتے، مناسب اور کاٹن لباس پہنے لڑکا لڑکی اِدھر اُدھر آجا رہے ہیں، برآمدوں میں کھڑے ہیں یا ستونوں سے ٹیک لگائے، پتھر کے فرش پر پھسکڑے مارے پڑھنے کی تیاری میں یعنی باتیں کرنے میں مصروف ہیں۔

یہ کراوڈ اُن مفروضہ ہنگر فلمی لڑکے لڑکیوں کے اس فضول گروہوں سے بالکل مختلف تھا جسے چالیس ہزار بہتا فلموں میں خرمستیاں کرتے دکھایا گیا ہے۔ یہ تو تقریباً کراچی گرییر اسکول کے بچوں جیسے لڑکا لڑکی تھے مگر ذرا سانولے اور بے خوف۔

ایک دو سے پوچھتا میں دیکشت صاحب کے کمرے تک پہنچا۔ کمرہ بند تھا۔ لڑکے لڑکیوں نے مشورہ دیا کہ پلیز اوپر جاؤ، استادوں کے مشترک کمرے میں جا کے دیکھو۔ وہاں گیا۔ چار چھ خواتین و حضرات پختہ عمر کے بھی اور جواں سال بھی بیٹھے تھے۔ سب نے ایک لڑکی ار خاتون کی طرف اشارہ کر دیا۔

مگر وہ ڈیکشت نہیں تھیں۔ ان کی کولیگ تھیں۔ وہیں انگریزی ادبیات کی جونیئر استاد تھیں۔ کہنے لگیں کہ وہ چلا گیا۔ تمھیں کوئی کام ہو تو کل آنا یا نمبر لے لو ابھی گھر فون کر دو۔ شاید مل جائے۔

میں نے کہا، ''میں غیر ملکی ہوں نہیں جانتا کہاں سے فون کیا جا سکے گا۔''

بولیں، ''پاکستان سے آئے ہو گے؟ وہ گریٹ پیپل ہیں۔ حماقت اور بدمعاشی سے اپنی لڑائی لڑنا جانتے ہیں۔''

میں نے کہا، ''شکریہ!... اندرا ایمرجنسی دور میں تم نے بھی ایک بار ان سب چیزوں سے لڑ کے دکھایا ہے۔''

پوچھنے لگیں، ''Dixit تمھیں جانتا ہے؟''

میں نے کہا، ''معلوم نہیں۔ شاید نام سنا ہو۔ میں بھی کہانیاں وغیرہ لکھتا ہوں۔''

خوش ہو گئیں، بولیں، ''بہت خوب! بیٹھنا چاہو تو بیٹھو... ان ساتھیوں سے ملو۔'' پھر انھوں نے پکار کے سب کو بتا دیا کہ میں لکھتا ہوں۔ میں نے اپنا نام بتایا اور یہ کہ کیا کیا لکھتا ہوں۔

ایک نوجوان استاد ہنس کے بولا، ''میں تمھارے ایک رائٹر پوئٹ کو جانتا ہوں فائض احمد فائض کو۔''

میں نے ہنس کے کہا، ''میں تمھارے شعرا کے چالیس (یہ شاید زیادہ کہہ گیا تھا) ادیبوں شاعروں کو جانتا ہوں وندا کرندیکر سے لے کے گریش ڈھنیا تک۔ کہو تو اُن کی نظموں کہانیوں کے ٹائٹل سنانا شروع کروں؟''

سب ہنسنے لگے۔ اٹھ اٹھ کے میری طرف آنے لگے۔ چائے منگوالی گئی۔ وہ جو فیض صاحب کو جانتا تھا، کیمسٹری کا استاد تھا۔ بتانے لگا کہ اُسے انگریزی میں دو چار نظمیں فیض صاحب کی پڑھنے کو ملی تھیں اور کہنے لگا، ''ڈیکشت ہوتا تو تم کو اردو کے بیس شاعروں کے نام بتا دیتا بلکہ شعر بھی سناتا۔'' پھر فوراً ہی یاد کر کے بولا، ''ہاں میں پراوین شکیر کا نام بھی جانتا ہوں۔''

میں نے نوٹ کر لیا تھا کہ جب بھی ملیں پروین شاکر تو یہ اچھی بات انھیں ضرور سناؤں گا۔ مگر اس عزیزہ کو جانے کی بہت جلدی تھی۔

خیر، تو وہ سب چلے گئے کچھ اور آ بیٹھے۔ لڑکی/ خاتون نے ڈیکشت کے گھر فون کیا، معلوم ہوا کہ وہ کالج سے آ کر کہیں نکل گئے ہیں۔

میں نے message دے دیا اور انگریزی کی استاد سے اجازت چاہی۔ چلتے چلتے یہ پوچھا کہ کیا جگدمبا پرساد ڈیکشت کا ناول ''مردہ گھر'' ملیلز میں بک رہا ہے؟

وہ بولیں، ''ہاں... یہ اچھی بات ہے نا؟''

میں نے کہا، ''یقیناً'' پھر اُن سے چند منٹ رکنے کی درخواست کی۔ اپنے اس ناولسٹ کے

بارے میں اور پوچھا۔ لوگوں کی پڑھنے کی عادات کے بارے میں، عام لٹریری سرگرمی کے بارے میں۔

معلوم ہوا دیکشت کی ''مردہ گھر'' بے شک best seller ہے۔ مگر اس کے علاوہ اور بھی لوگوں کی کتابیں ملینز میں بکتی ہیں اور کوئی بھی کتاب زیادہ سے زیادہ چار پانچ روپے قیمت کی ہوتی ہے۔

میں نے کہا، ''مطلب یہ کہ دیکشت ملینے نیئر تو ہوں گے؟ لاکھوں کی اسامی؟''

بولیں، ''پتا نہیں۔ ہو بھی سکتا ہے۔ مگر وہ وشس (vicious) آدمی نہیں ہے، فالتو ٹائم میں جھونپڑ پٹیوں کے چکر لگاتا ہے۔ وہاں اُس کے دوست ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ گپ مارتا، تاڑی پیتا ہے۔ لوگ اس کو پیار بھی بہت کرتے ہیں۔ کوئی تو ادھر کالج آجاتے ہیں، مگر دیکشت teaching time خراب نہیں کرتا۔ اُن کو باہر بیٹھنے کو کہتا ہے۔ تو باہر فٹ پاتھ پہ بیٹھ کے دو دو گھنٹے وہ لوگ اُس کا انتظار کرتے ہیں... دیکشت کا... کہ کب وہ باہر آئے گا۔ پھر جو وہ نکلتا ہے تو اُس کے ساتھ پیدل، ڈبل ڈیکر بس میں، سبزی اناج کے ٹرک پہ... ہاتھ گاڑیوں تک پہ بیٹھ کے یہ لوگ گھومنے نکل جاتے ہیں... جھونپڑ پٹی والے اور وہ... دیکشت۔''

میں منھ کھولے، آنکھیں پھاڑے سن رہا تھا۔

لڑکی/خاتون ہنس کے بولی، ''اُس کے گھر والے کبھی کبھی irritate ضرور ہوتے ہیں جب وہ اپنے fans کے ساتھ لمبی شام گزار کے دیر سے گھر پہنچتا ہے اور اُس کے پیر زمین پہ سیدھے نہیں پڑتے ہوتے۔ اتنا ٹُن ہوتا ہے وہ۔ میں کبھی کہتی ہوں، دیکشت صاحب! تم وہیں سی سائڈ پہ اپنے جھونپڑ پٹی fans کے ساتھ ریت پہ پڑ جایا کرو یا اُن کے کمپاؤنڈ میں مٹی پہ چٹائی ڈال کر سو جایا کرو۔ اتنی رات میں جاجا کے گھر والوں کو کیوں ستاتے ہو؟''

میں دیکشت کے لیے لڑکی/خاتون کے پاس اپنی کہانیوں نظموں کی کتاب چھوڑ کر آ گیا۔

نہ مل کے بھی میں اس ناولسٹ سے مل چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں میری اپنی زبان کے کہانی کار، ناولسٹ، ادب کے استاد اُس سے ملیں... کم سے کم اس کی کتابیں تو پڑھیں۔

☆☆☆

نذر الحسن صدّیقی

ضیائے محبت

کہاں کھو گئی تو کہاں کھو گئی
تجھے ڈھونڈ ہاری کنول نین بھور
مٹی سانجھ کی آس اندھیرا ہے گھور
کوئی راہ جاتی نہیں تیری اور
تو کن بیتی گھڑیوں میں گم ہو گئی
کہاں کھو گئی، تو کہاں کھو گئی

یہ میری اُن کی معنوی شخصیت سے پہلی ملاقات تھی۔

''نئی تحریریں'' کا ۵۵ء کا ادبی انتخاب میرے ہاتھ میں تھا۔ اُس انتخاب میں اُن کی طویل نظم ''زمہریر'' بھی شامل تھی، جس کا یہ پہلا بند تھا۔ اس نظم نے مجھے اتنا متاثر کیا تھا کہ تقریباً چوالیس برس کا طویل عرصہ بیت جانے کے باوجود یہ بند میری یادوں میں آج بھی تر و تازہ ہے۔ اُن دنوں میں آج کے فیصل آباد اور جب کے لائل پور کے گورنمنٹ کالج میں بی اے میں پڑھ رہا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ میرا ادبی شعور اُس وقت اتنا پختہ ہرگز نہیں ہوا تھا کہ میں اس معرکتہ الآرا بلیغ شعری تخلیق کا ٹھیک ٹھیک اور صحیح معنوں میں ادراک کر سکوں۔ مگر اس نظم کے پڑھنے کے بعد اُن کی ''معنوی شخصیت'' سے ایک ایسا احساسِ قرب پیدا ہو گیا تھا کہ جب کبھی کسی ادبی جریدے میں اُن کی کوئی تخلیق نظر سے گزرتی، بڑے ذوق و شوق سے اُسے پڑھا کرتا اور جیسے جیسے اُن کی تخلیقات پڑھتا گیا، اُن سے ملنے اور ملاقات کرنے کی تڑپ بڑھتی گئی۔ ۵۶ء، ۵۷ء میں فیصل آباد سے کراچی منتقل ہو گیا۔ یہاں آ کر اردو کے کئی نامی گرامی ادیبوں شاعروں سے ملنے اور انھیں قریب سے دیکھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اُن میں شان الحق حقی، رفیق خاور، جمیل جالبی، سید انور، سلیم احمد، شمیم احمد، ممتاز حسن اور ممتاز حسین، ضیا جالندھری بھی شامل تھے۔ ضیا بھائی اُن دنوں کراچی میں محکمۂ ڈاک میں اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ اُن کا دفتر مسجد خضرا کے سامنے

سرکاری دفاتر کے لیے استعمال ہونے والی بیرکوں میں واقع تھا۔ مہینہ اور تاریخ تو اب یاد نہیں غالباً ۵۸ء یا ۵۹ء میں ایک روز اپنے تایا ابوالفضل صدیقی کے ساتھ اُن کے دفتر جانے کا اتفاق ہوا۔ یوں اُن سے بالمشافہ ملنے کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ اُن کی معنوی شخصیت سے جتنا متاثر ہوا تھا، اُس سے کم اُن کی صوری شخصیت سے بھی نہیں ہوا۔ بھرا بھرا گداز جسم، درمیانہ قد، متبسم گلابی گلابی ہونٹ، بھاری چہرہ اور دونوں عارضوں پر جیسے بڑے تر و تازہ شاداب گلاب کھلے ہوئے۔ بلند و بالا اقبال مندی کی نشانی پیشانی، غلافی بڑی بڑی سی آنکھوں میں مسکراہٹ سی تیرتی ہوئی، انتہائی شگفتہ، خلیق اور خوش مزاج و خوش گفتار۔ گرویدہ کرنے والا مسحور کن انداز، بات چیت وہ جسے لوگ محفل میں چھا جانے والا کہتے ہیں، بس اُس کی مجسم تشکیل۔ پہلی ہی ملاقات میں بڑے پیار اور شفقت سے پیش آئے۔ اس ملاقات کے بعد کچھ تو تعلیمی سرگرمیوں اور کچھ تلاشِ روزگار کے باعث ایسا مصروف ہوگیا کہ اُن سے تفصیلی ملاقات کی تمنا مدتوں پوری نہ ہوسکی۔ گاہے گاہے میں حلقۂ اربابِ ذوق کی نشستوں میں شریک ہوا کرتا تھا، وہاں نشست کے بعد ملاقات کا شرف ضرور حاصل ہوتا، مگر مختصر ملاقاتوں سے تشنگی کچھ اور بڑھ جاتی اور اُن کی شخصیت کے سحر کے باعث اُن سے تواتر سے ملاقاتوں اور قرب کی آرزو و تمنا فزوں تر ہوتی رہتی۔ گو کئی سالوں بعد ہی سہی قدرت نے اس آرزو کی تکمیل کی بھی سبیل پیدا کردی۔

ہوا یوں کہ ۶۷ء میں لڑکپن سے وجود میں پلتا بڑھتا ادبی ذوق دو تخلیقی کاوشوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دو افسانے قلم سے نکلے۔ ابتدا ہی میں جو حوصلہ افزائی مجھے اپنی ان تخلیقی کاوشوں کے سلسلے میں حاصل ہوئی اس نے مجھے باقاعدگی سے ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے اور سنجیدگی سے افسانہ نگاری کی طرف توجہ دینے پر مائل کیا۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی ہفتہ وار تنقیدی نشستیں اُن دنوں آرٹس کونسل کراچی میں اتوار کے اتوار منعقد ہوتی تھیں۔ میں اپنے تایا ابوالفضل صدیقی کے ساتھ پابندی سے ان میں شرکت کرنے لگا۔ دو تین ہفتے بعد ہی مجھے بھی حلقے جیسے معروف ادبی ادارے کی تنقیدی نشست میں افسانہ پڑھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنا افسانہ ''لال ذرّوں کا سفر'' تنقید کے لیے پیش کیا تھا۔ صدارت مجتبیٰ حسین مرحوم کر رہے تھے۔ نشست کے اختتام پر میں نے دیکھا کہ ضیا بھائی، صدیقی صاحب اور نسیم دُرّانی الگ ایک جگہ کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد صدیقی صاحب نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا کہ ضیا اور نسیم چاہتے ہیں کہ حلقے کے جوائنٹ سیکریٹری کے فرائض تم سنبھال لو۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس کی توقع تھی اور نہ اُمید ہی۔ میں تو میدانِ ادب میں بالکل ہی نو وارد تھا۔ کسی طور خود کو اس کا اہل گردانتا تھا اور نہ حلقے جیسے ادارے کا عہدہ سنبھالنے پر آمادہ تھا۔ ابھی گومگو میں ہی تھا اور کوئی جواب صدیقی صاحب کو نہ دے پایا تھا کہ ضیا بھائی شاید دور سے ہی میرے تذبذب کا اندازہ کرکے ہمارے پاس آگئے اور اس پیار و محبت سے یہ ذمّہ داری قبول کرنے کو مجھ سے کہا کہ انکار کرتے بن نہ پڑا۔ معتمد حلقہ اُن دنوں اطہر نفیس تھے اور ایک نائب معتمد قمر احمد تھے جو شاعری بھی کرتے اور افسانے بھی

لکھتے تھے، مگر اب مدتِ دراز سے گردشِ روزگار میں پھنس کر اُفقِ ادب سے ایسے غائب ہوئے ہیں کہ بالکل ہی مفقود الخبر ہوگئے ہیں۔

صدیقی صاحب کبھی کبھی حلقے کی نشست سے پہلے ضیا بھائی کے گھر جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ضیا بھائی آئی آئی چندریگر روڈ پر جی پی او سے متصل کمپاؤنڈ میں محکمۂ ڈاک کے اعلیٰ عہدے داروں کے لیے مختص رہائش گاہوں میں سے ایک مکان میں اقامت گزیں تھے۔ یہ جگہ آرٹس کونسل سے زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ ہم لوگ تقریباً نشست سے گھنٹا پون گھنٹا پہلے چار پونے چار بجے کے قریب اُن کے گھر پہنچ جایا کرتے تھے۔ اتوار کا دن ہوتا تھا، مگر چھٹی کا دن ہونے کے باوجود میں نے انھیں کبھی سوتے یا آرام کرتے نہیں پایا۔ ہمیشہ کوئی کتاب ہاتھ میں لیے بڑی خندہ پیشانی اور اپنی مخصوص محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ پیش دروازہ پر استقبال کرنے پہنچتے۔ بات چیت سے اندازہ ہوتا کہ کئی گھنٹوں سے مصروفِ مطالعہ ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ زیرِ مطالعہ کتاب کے بارے میں ہی اپنے مخصوص انداز میں بات کرنے لگتے۔ ابھی ہم مصروفِ گفتگو ہی ہوتے کہ ہماری شفقت بھابی چائے کی میز سجا دیتیں یا ٹرالی کے ساتھ آتیں اور شریکِ گفتگو بھی ہوجاتیں۔ وہ خود اعلیٰ تعلیم یافتہ کانونیٹ کی پڑھی خاتون ہیں۔ انگریزی ادب میں ماسٹرز کیا ہے۔ اُن کی گفتگو سے اندازہ ہواکہ وہ اُن خواتین میں سے نہیں جو گھر بار کی ذمّہ داریوں میں گھر کر پڑھا پڑھایا سب کچھ بھلا بیٹھتی ہیں اور کتابوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لپیٹ لپٹا کر طاقِ نسیاں کر دیتی ہیں۔ کہنے کو تو لوگ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک بڑے شاعر اور دانش ور کی اہلیہ ہیں اس سبب ایسا ہے، مگر یہ کوئی کلیہ تو نہیں! کتنے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی ایسی تعلیم یافتہ بیویاں ہیں جو اس طرح سے ادب سے شغف اور لگاؤ رکھتی ہیں اور اب تو انھوں نے کئی افسانے تخلیق کر کے اپنے ادبی ذوق اور تخلیقی صلاحیتوں کا جیتا جاگتا ثبوت بھی دے دیا ہے۔ وہ انتہائی مخلص، ملنسار، حسنِ اخلاق کا پیکر بڑی سوشیل خاتون ہیں۔ ضیا بھائی کی دونوں بچیاں نین تارا اور صبا اس زمانے میں اسکول میں پڑھتی تھیں اور عمر کے اُس حصے میں تھیں جب لڑکیاں عموماً فطری طور پر ذرا لجائی لجائی اور شرمائی شرمائی سی رہتی ہیں، مگر تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی صدیقی صاحب کے پاس آ کر ضرور بیٹھا کرتیں اور اگر اُن کے آنے میں دیر ہوجاتی تو صدیقی صاحب خود ہی اُن کے بارے میں بھابی سے استفسار کرتے، ''دلھن! (وہ شفقت بھابی کو ''دلھن'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے) بھئی بچیاں کہاں ہیں؟'' بھابی یا تو آواز دے کر دونوں کو بلا لیتیں یا پھر یہ کہتی ہوئی جلدی سے اُٹھ جاتیں، ''جی صدیقی صاحب ابھی بھیجتی ہوں۔''

کچھ عرصے بعد ضیا بھائی آئی آئی چندریگر روڈ کے اس مکان سے بہادر آباد محکمۂ ڈاک کے اعلیٰ افسران کے لیے مختص ایک مکان میں منتقل ہوگئے، یہاں سے آرٹس کونسل کا فاصلہ کافی تھا، مگر اس کے باوجود کبھی حلقے کی نشست سے پہلے اور کبھی بعد ہمارا اُن کے ہاں آنا جانا جاری رہا۔ کچھ عرصے بعد چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر آرٹس کونسل میں حلقے کے جلسوں کا انعقاد ممکن نہ رہا۔ ہم لوگ مناسب جگہ کی تلاش

میں سرگرداں اور تگ و دو میں تھے۔ اُن دنوں میری اہلیہ طلعت عثمانیہ گرلز کالج ناظم آباد کی پرنسپل تھیں۔ ضیا بھائی سے مشورے کے بعد میں نے طلعت کے ذریعے کالج کی انتظامیہ سے جلسوں کے انعقاد کے سلسلے میں رجوع کیا اور انتظامیہ سے اجازت ملنے کے بعد حلقے کی نشستیں عثمانیہ کالج میں باقاعدگی سے منعقد ہونے لگیں، مگر ۷۲ء میں کالج گورنمنٹ کی تحویل میں آجانے کے باعث حلقے کے جلسوں کا انعقاد یہاں بھی ممکن نہ رہا، چناں چہ علامہ اقبال لائبریری میں نشستیں منعقد ہونے لگیں۔ ان چند سالوں میں ضیا بھائی سے ذاتی مراسم بڑھ کر خاندانی سطح پر پہنچ گئے تھے۔ شفقت بھابی سے صدیقی صاحب کی بہو زینت، اُن کی بیٹی عذرا اور میری اہلیہ طلعت سے خصوصی اور قریبی تعلقات کی ابتدا انھیں چند سالوں میں ہوئی جو آج بھی بفضلہٖ اتنی مدت گزر جانے اور باوجود اتنی دوری اور فاصلوں کے اسی محبت اور خلوص سے قائم ہیں۔

حلقۂ اربابِ ذوق کی نشستوں میں پڑھی جانے والی غزل، نظم، افسانے یا مقالے پر جو تنقید کی جاتی تھی یا مہینے کی پہلی نشست میں کسی بھی فی البدیہہ موضوع پر جو ''گفتگو'' ہوتی تھی وہ بڑی معرکے کی چیزیں ہوتی تھیں، سچ تو یہ ہے کہ ایسی منفرد ادبی تنقید حلقے کا ہی خاصہ تھی، جس کے روح و رواں ضیا بھائی، سلیم احمد، سجاد میر، جمال پانی پتی، احمد ہمدانی، اطہر نفیس، احمد جاوید وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ ان تنقیدی بحثوں اور گفتگو کو جو حلقے کے نائب معتمد کے پاس رپورٹ کی شکل میں محفوظ ہوتی تھیں، اگر یک جا کر کے شائع کرانے کا اہتمام کیا جاتا تو یہ بڑی وقیع تاریخی دستاویز ثابت ہوسکتی تھی، جس سے ہمارے محققین کو ادب کی مختلف اصناف کے ارتقا اور بدلتے ہوئے رجحانات کے بارے میں بڑی اہم اور مفید معلومات حاصل ہوسکتی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ لاہور، راول پنڈی کی حلقے کی شاخوں نے اس اہم کام کی طرف کوئی پیش رفت کی یا نہیں، تاہم کراچی تو اس کام کے سلسلے میں بالکل ہی کورا رہ گیا، جس میں میں خود کو بھی تھوڑا بہت قصور وار اور ''ادبی مجرم'' گردانتا ہوں۔ رپورٹنگ کا کام میں اور قمر احمد مل کر کیا کرتے تھے، مگر زیادہ تر یہ فریضہ قمر احمد ہی انجام دیتے رہے۔ قمر پاکستان سے شارجہ جاتے وقت حلقے کی کارروائی کا ایک رجسٹر مجھے دے گئے تھے۔ چند سال پیش تر میں نے اُسے دیکھا تھا تو محسوس ہوا تھا کہ واقعی اس میں حلقے کی چند معرکۃ الآرا نشستوں کی روداد میری اور قمر احمد کی تیار کی ہوئی موجود ہیں۔ میں نے سوچا بھی تھا کہ اس میں سے چیدہ چیدہ روداد کہیں شائع کرادوں مگر میری حماقت اور شامت کہ میں نے ایک روداد جس میں ن م راشد نے ابوالفضل صدیقی کے افسانے ''انصاف'' پر بڑی پُر مغز گفتگو کی تھی ایک ''شیدائی ادب'' کو سنا دی، وہ اصرار کر کے بقیہ نشستوں کی روداد پڑھنے کے لیے رجسٹر مجھ سے لے گئے۔ کراچی کی مصروف زندگی میں ملنا ملانا ذرا کم ہی ہوتا ہے، چناں چہ ان سے بھی کافی دنوں ملاقات نہ ہوسکی اور جب ملے اور میں نے رجسٹر کی واپسی کا مطالبہ کیا تو صاف منکر ہوگئے۔ بہر حال اُن کے کہے پر اعتبار کیا اور صبر کرلیا۔ یہ بات یوں ہی جملۂ معترضہ کے طور پر یہاں آگئی اور شاید اس لیے کہ ضیا بھائی کو حلقے

ہے جو والہانہ لگاؤ ہے، ویسا اب شاید معدودے چند ہستیوں کو ہی ہوگا۔

ضیا بھائی کا تعلق ہمارے ادب کی اُس نسل اور دور سے ہے جسے بجا طور پر ہمارے شعر و ادب کی نشاۃِ ثانیہ کہا جاسکتا ہے کہ اسی دور میں شعر و ادب اور علم و فضل کے کتنے ہی قافلے برِّصغیر کے تمام چھوٹے بڑے شہروں، دلّی، لکھنؤ، لاہور، علی گڑھ، ندوہ، جالندھر، امرتسر، کاکوری، امروہہ، بدایوں وغیرہ سے اُٹھے اور ہمارے تہذیبی و تمدنی اور ثقافتی و ادبی سرمائے میں لازوال اضافے کر گئے۔ ضیا جالندھری بھی اسی سنہری دور کے شعر و ادب کے بطنِ صدف سے نکلے بڑے ہی آب دار موتی ہیں۔ انھوں نے ۲ر فروری ۱۹۲۳ء کو جالندھر کے ایک متمول سیّد گھرانے میں آنکھ کھولی۔ والد کا نام سیّد سردار احمد شاہ تھا۔ نانہیال والوں نے نام اُن کا ضیا رکھا اور دادیہال والوں نے نثار احمد۔ بڑے ہوکر ضیا بھائی نے نانہیالی اور دادیہالی دونوں کا دل رکھا اور یوں ضیا نثار احمد بن گئے، تاہم سرکاری طور پر ضیا نثار احمد تو ضرور رہے مگر دنیائے شعر و ادب کو اپنی تخلیقات کی ''ضیا'' سے ہمیشہ منور کرتے رہے اور بفضلہٖ آج بھی خدا انھیں عمرِ نوح عطا کرے ان کے شعر و ادب کے فروزاں کیے ہوئے چراغ کی بتی تیز ہے۔ یوں تو اُن کی شعر گوئی کا آغاز جالندھر کی شعر و ادب کی فضا کے زیرِ اثر کے ایامِ لڑکپن ہی میں ہو چکا تھا، مگر اُن کے تخلیقی جوہر کی جلا بخشی صحیح معنوں میں لاہور کی شعر و ادب کی فضا میں ہوئی۔ خوش بختی سے درس گاہ ایسی نصیب ہوئی جو علم و ادب کا مرکز و گہوارہ تھی، جہاں سے اُن سے پہلے اور اُن کی بعد والی نسل سے بھی غرض کہ ہر دور میں مفکروں، دانش وروں، صاحبِ علم و ادب اور شعرا کی ایسی کھیپ کی کھیپ تیار ہوکر نکلتی رہی جو ہمارے چمنستانِ شعر و ادب کو ہمیشہ سیراب کرتی رہی، میری مراد یقیناً گورنمنٹ کالج لاہور سے ہے۔

لاہور کی تابندہ ادبی فضا سے اکتسابِ ضیا کے باعث، ضیا بھائی کے تخلیقی جوہر میں جو نکھار پیدا ہوا اُس کو انگریزی ادب کی اعلیٰ تعلیم نے دوسرے رُخ سے جلا بخشی۔ جدید خیالات ہیئت اور تکنیک کا فنی التزام، ساتھ ہی اردو فارسی کی شعری کلاسیکیت کے خوب صورت سنگم اور نادر امتزاج کی بہترین مثالیں ہمیں اُن کی نظموں میں ملتی ہیں۔ اسی طرح اُن کی غزلیں بھی اپنی فکر، خیال آفرینی، جمالیاتی، تاثر، نئے آہنگ اور لہجے کی گوناگوں خوبیوں کے سبب انفرادی حیثیت کی حامل ہیں، مگر اس کے باوجود حلقے کے بیش تر غزل گویوں کی طرح انھوں نے بھی اردو غزل کی کلاسیکی روایت سے کسی نہ کسی نوع اپنا رشتہ برقرار رکھا ہے۔ اپنی شعری تخلیقات کے ابتدائی دور میں ہی انھیں جو پذیرائی نصیب ہوئی اُس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ۱۹۴۲ء سے ہی اُن کی نظمیں ''ہمایوں''، ''ادبی دنیا''، ''ادبِ لطیف'' (لاہور) اور ساقی (دلّی) جیسے مؤقر رسائل میں شائع ہونے لگی تھیں۔ ۱۹۴۲ء سے لے کر آج تک کا یہ تخلیقی سفر ضیا بھائی نے جس کامیابی سے طے کیا ہے، اُس کے متعلق کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے، تاہم مجھ جیسا کم سوادِ ادب بھی ضیا بھائی کی شاعری کے متعلق یہ بات بلا تأمل اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہہ سکتا ہے کہ اُن کی شاعری کی ہر صنف خواہ نظم، غزل ہو یا گیت، سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ اُن کی شاعری

میں محض الفاظ کی شعبدہ بازی نہیں کہ سننے والے نے سنا تو بے اختیار منہ سے واہ وا نکل گئی، مگر پھر چند لمحوں بعد ہی ذہن بالکل سپاٹ ہوگیا کیوں کہ ایسی شاعری انسانی دماغ و ذہن کی فکری سطح کو متاثر کرتی ہے نہ قلب و جذبات اور احساسات میں کوئی دیرپا ہلچل یا مدوجزر پیدا کرتی ہے۔ نظم کو تو خیر چھوڑیے کیوں کہ میری ناچیز رائے میں یہ صنف سننے سے زیادہ سنجیدہ مطالعے کا تقاضا کرتی ہے، مگر اُن کی غزلوں پر بھی باوجود روایت سے رشتہ استوار رکھنے اور اردو فارسی کے الفاظ کے خوب صورت حسین امتزاج کے یہی بات صادق آتی ہے کہ اُن میں افکار و معنی کی نہ معلوم کتنی دنیائیں آباد ہیں، مگر جذبوں کے ان نو بہ نو اور تہ دار اظہار میں اُن کا منفرد لہجہ اور آہنگ ہر ہر شعر میں صاف بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ مثالیں زیادہ دینے کا میرا ارادہ ہے اور نہ یہ مختصر سی تحریر ہی اس کی متحمل ہو سکتی ہے، پھر میری کوشش بھی یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اسے ضیا بھائی کی شخصیت تک ہی محدود رکھوں، کیوں کہ اُن جیسے بلیغ فکر و نظر کے حامل شاعر کے متعلق بھلا میری بات کی اہمیت اور وقعت بھی کیا! تاہم ادب کے ایک ادنیٰ اور معمولی قاری کی حیثیت سے اپنی متذکرہ بات کی تائید میں اُن کے بھرپور وقیع شعری سرمائے سے محض چند مثالیں دینے کی کوشش کروں گا:

دل بجھا ہو تو گلِ نغمہ بھی نشتر ہے ضیاؔ
شدتِ غم کا علاج انجمن آرائی نہیں

☆

رنگ باتیں کریں اور پھولوں سے خوشبو آئے
درد پھولوں کی طرح مہکے اگر تُو آئے
بھیگ جاتی ہیں اس اُمید پہ آنکھیں ہر شام
شاید اس رات وہ مہتاب لبِ جُو آئے

☆

اتنا پاس آ تجھے محسوس کروں اپنی طرح
راہ میں رنگ کا آواز کا پردہ کیا ہے
ورقِ غنچہ پہ ہے کس کے لہو کی تحریر
دل پریشاں ہے کہ آج آنکھ نے دیکھا کیا ہے

☆

دریا کنارے جس کا بھرم مدتوں سے تھا
اس کوہ قد کو موجۂ پایاب لے گیا
وہ جس کے دم سے رونقِ شب تھی گیا تو ساتھ
طشتِ نجوم و ساغرِ مہتاب لے گیا

کیا زندگی کا قصّہ سنائیں ضیاؔ کہ وقت
جو حاصلِ کتاب تھا وہ باب لے گیا

☆

ٹھہر گیا ہے مرے دل میں اک زمانے سے
وہ وقت جس کی سحر بھی نہیں ہے شب بھی نہیں

ضیا بھائی کی عملی زندگی کا آغاز ۱۹۴۵ء سے ہوا جب انھوں نے جون تا دسمبر اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی زبان و ادب کے استاد کی حیثیت سے ملازمت کی۔ ۱۹۴۵ء میں ہی ان کا تقرر بہ حیثیت پروگرام اسسٹنٹ آل انڈیا ریڈیو دلّی میں ہوگیا۔ ملازمت کا یہ سلسلہ دلّی میں اگست ۴۷ء تک یعنی قیامِ پاکستان تک چلا۔ ریڈیو کی ملازمت قیامِ پاکستان کے بعد بھی قائم رہی اور وہ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء ریڈیو پاکستان لاہور اور کراچی سے بہ طور پروگرام اسسٹنٹ وابستہ رہے۔ ۱۹۴۹ء میں انھوں نے اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی جس کے بعد اُن کی پہلی تقرری محکمۂ ڈاک میں اعلیٰ عہدے پر ۱۹۵۰ء میں ہوئی اور اسی محکمے میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر ۱۹۶۵ء تک وہ فائز رہے۔ ۱۹۶۵ء میں ضیا بھائی کا تبادلہ قومی یک جہتی کونسل میں بہ طور ڈائریکٹر اور وائس چیئرمین کر دیا گیا، جہاں وہ یہ فریضہ ۱۹۶۷ء تک ادا کرتے رہے، جس کے بعد اُن کی خدمات ایک بار پھر محکمۂ ڈاک کے سپرد کر دی گئیں۔ ۱۹۶۷ء سے لے کر ۱۹۷۶ء تک کی طویل مدت انھوں نے کراچی میں پوسٹ ماسٹر جنرل اور ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل پوسٹ آفیسز کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر گزاری۔ اس دوران ضیا بھائی کی ذات کراچی میں ادبی سرگرمیوں کا محور بنی رہی، بالخصوص حلقۂ اربابِ ذوق کی کراچی میں پابندی سے کامیاب اور بھرپور نشستوں کا انعقاد انھیں کے دم قدم سے تھا۔ ۱۹۷۶ء میں جب اُن کا تقرر وفاقی انسپکشن ٹیم کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے ہوگیا اور وہ کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوگئے تو جیسے حلقے کی روح بھی ساتھ لے گئے۔ عجب اتفاق تھا کہ چند ماہ پیش تر ہی میں بھی چند ذاتی وجوہات کی بنا پر حلقے کے نائب معتمد کے عہدے سے مستعفی ہو چکا تھا، مگر ضیا بھائی کے جانے کے چند ماہ کے اندر ہی تمام کا تمام شیرازہ بکھر گیا۔ یہ صرف اور صرف اُن کی سحرانگیز شخصیت کا طلسم تھا جو حلقۂ اربابِ ذوق کی پابندی سے کامیاب نشستوں کے انعقاد کا سبب بنا ہوا تھا۔ اُن میں سے بعض انتہائی کامیاب اور یادگار نشستوں کی بازگشت آج بھی کراچی کے ادبی حلقوں میں سنائی پڑتی ہے، مگر وہ اب کراچی ہی رہا نہ وہ ادبی ہنگامے ہی! اب تو صرف اُن دنوں کی یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔

جب وہ کراچی سے رخصت ہو کر جا رہے تھے تو میں، صدیقی صاحب، میری اہلیہ طلعت، صدیقی صاحب کی بڑی بیٹی عذرا، داماد سرفراز، بہو زینت اور بیٹا شاہد سب اُن سے، بھابی شفقت اور دونوں بچیوں سے ملنے اُن کے گھر گئے تھے۔ ہم سب پر وہ کیفیت طاری تھی جو کسی قریبی عزیز کے

دُور دراز فاصلوں پر جا کر آباد ہو جانے پر لامحالہ قلب و دماغ پر طاری ہو جاتی ہے، عجیب سی کسک، میٹھا میٹھا سا درد جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ رات گئے تک نشست رہی تھی اور ضیا بھائی نے شہر کراچی سے رخصت ہوتے وقت ''بڑا شہر'' کے عنوان سے جو نظم کہی تھی وہ ہمارے اصرار پر مکرر سنائی تھی۔ کراچی سے وقتِ رخصت ''اس شہر کی درانتی سی بانہوں کے دندانے تو ان کے رگ و پے میں اترے ہوئے تھے'' مگر ہم سب کو تو اس وقت ان کی، شفقت بھابی اور بچیوں کی جدائی کی درانتی کے دندانے اپنے رگ و پے میں اترتے محسوس ہو رہے تھے، آنکھوں میں نمی اور دل گرفتگی کے ساتھ ان سے رخصت ہوئے تھے۔

کراچی سے جانے کے بعد کبھی کبھار ضیا بھائی سے فون پر بات ہو جایا کرتی۔ وفاقی انسپکشن ٹیم کے ایک سال تک ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز رہنے کے بعد وہ ۱۹۷۷ء میں پاکستان ٹیلی وژن کے مینیجنگ ڈائریکٹر مقرر ہو گئے۔ اپنی ملازمت کے ابتدائی سالوں میں انھیں ریڈیو کا تجربہ تو ضرور حاصل ہوا تھا، مگر میرے خیال میں ٹیلی وژن کی ملازمت اور وہ بھی ایسے اعلیٰ عہدے پر اُن کے لیے ایک نیا تجربہ ضرور تھی، تاہم اس محکمے میں بھی اُن کی بے مثل کامیابی اور نمایاں کارکردگی بلاشبہ ان کی اعلیٰ ذہانت، قابلِ رشک قابلیت اور انتظامی صلاحیتوں کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ پاکستان ٹیلی وژن کی ترقی کا دورِ زرّیں تھا تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اس زمانے میں ہمارے ٹیلی وژن کے بعض پروگراموں کو بین الاقوامی سطح پر پذیرائی نصیب ہوئی اور کئی اعزازات اور انعامات سے بھی نوازا گیا۔ ٹیلی وژن سے وابستگی کے دوران ضیا بھائی کا کراچی بھی گاہے گاہے آنا جانا رہتا اور کبھی کبھی بیرونِ ملک دوروں پر جاتے وقت بھی کراچی آیا کرتے اور جب بھی کراچی آتے تو باوجود تمام تر مصروفیات کے تھوڑا وقت صدیقی صاحب سے ملاقات کے لیے ضرور نکالا کرتے اور مجھے بھی اپنی آمد سے مطلع کر دیتے یوں اُن سے ملاقاتیں چھٹے چھ ماہے ہی سہی، ہو جایا کرتیں۔

اگر آپ ضیا بھائی کے طویل دورِ ملازمت پر غور کریں تو بہ آسانی اندازہ ہو جائے گا کہ انھوں نے اپنی ملازمت کا کم و بیش پینتیس سال کا عرصہ حکومتِ پاکستان کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر یعنی ایک بڑے ''بیوروکریٹ'' کی حیثیت میں گزارا ہے، مگر ''افسرانہ شان'' یا بیوروکریسی کا ہلکا سا پرچھاوا بھی اُن کی شخصیت پر محسوس نہیں ہوتا۔ گھر کے علاوہ مجھے بارہا اُن کے دفتر جانے اور دفتری اوقات میں ان سے ملنے کا بھی شرف حاصل رہا، مگر وہاں بھی مجھے یہ مطلق احساس نہیں ہوا کہ میں ایک بڑے افسر سے اُس کے گرانڈیل دفتر میں بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہوں۔ اُن کی من موہنی شخصیت تو وہاں بھی ہمہ انکسار اور مجسّم پیکرِ محبت نظر آتی۔ اور یہ کچھ میرا ہی خیال نہیں ضیا بھائی سے جن لوگوں کو بھی قربت حاصل رہی ہے وہ ان کی شخصیت کے اس پہلو کے معترف رہے ہیں۔ میں نے انھیں گھر پر یا نجی محفلوں میں کبھی اپنے دفتری معاملات اور امور پر گفتگو کرتے نہیں پایا، جب کہ بیش تر اعلیٰ افسران اور عہدے داران کی گفتگو کا

محور زیادہ تر اپنی افسرانہ لن ترانیاں ہی رہتی ہیں اور بیورو کریٹ کا خول ہمہ وقت اُن پر چڑھا رہتا ہے، مگر ضیا بھائی ہمیشہ دفتری معاملات اور کام کو وہیں تک محدود رکھنے اور دفتر ہی میں چھوڑ آنے کے عادی رہے۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو کا دوسرا نمایاں رُخ یہ ہے کہ بعض شاعروں کی طرح انھوں نے کبھی دفتری اوقات میں محفلِ شعر و سخن نہیں سجائیں۔ انھوں نے کبھی اپنی شاعری کو حکومتوں کی نظروں میں خود کو ممیز کرنے، اثر و رسوخ حاصل کرنے اور شہرت کا ذریعہ بھی نہیں بنایا، اور نہ اپنی شعر و ادب کی سرگرمیوں کو اپنے کارِ منصبی اور سرکاری فرائض کی بجا آوری میں حائل اور حارج ہونے دیا۔ ان کی شخصیت کے یہ رخ ان کی مثبت فکر کے آئنہ دار ہیں اور ایک طویل عرصے تک اُن کا التزام، ان کی مضبوط قوتِ ارادی اور خود اعتمادی کا مظہر ہے۔

انتظامی امور میں بالخصوص حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے دار کے لیے کبھی کبھی اپنے ماتحت، اہل کاروں کے ساتھ سختی برتنا ناگزیر ہو جاتا ہے، میں یقین سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ضیا بھائی کی طویل مدتِ ملازمت میں کبھی کوئی ایسا موقع ہی نہیں آیا، تاہم یہ بات میں بڑے تیقن سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنے ماتحتوں وغیرہ کے ساتھ سختی برتنا اور بے جا دباؤ اُن کے مزاج اور فطرت کے منافی ہے۔ وہ نہایت نرم و گداز دل کے مالک ہیں۔ اُن کی خلقی نرمی اور انسانی ہمدردی کا ایک واقعہ آج تک دل پر نقش ہے۔ غالباً ۱۹۶۸،۶۹ کی بات ہے میں حبیب بینک ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل برانچ میں سیکنڈ آفیسر تھا، میرے چچا ابو مسلم صدیقی نے بہ ذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ ایک ڈرافٹ برانچ کے پتے پر بھیجا، جو نواب شاہ اس ریمارک کے ساتھ واپس کر دیا گیا کہ اس نام کی کوئی جگہ کراچی میں نہیں۔ انھوں نے یہ لفافہ مجھے گھر کے پتے پر واپس بھیجا۔ میں یہ لفافہ لے کر ضیا بھائی کے دفتر گیا۔ ضیا بھائی ریمارک پڑھ کر بڑے محظوظ ہوئے، فوراً ہی متعلقہ افسر کو فون پر کُل بات بتلائی اور کہا کہ صدیقی صاحب اسے اخبار میں دینے جا رہے ہیں، پھر فون رکھ کر مجھ سے کہا:

''مسٹر اویل کہتے ہیں، اگر آپ چاہیں تو اخبار میں دے دیں'' پھر چند سیکنڈ توقف کیا اور ان چند سیکنڈ میں اُن کے انداز، چہرے، بُشرے سب پر ترحم کی نشانیاں ابھریں، بڑے پُر تاثیر انداز میں کہا، ''مگر صدیقی صاحب مارا وہ بے چارہ غریب پوسٹ مین جائے گا۔''

''جی ضیا بھائی صحیح کہا آپ نے'' میں نے اُن کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور خاموشی سے اُٹھ کر چلا آیا۔

ضیا بھائی کی شخصیت میں عجیب سی مقناطیسیت والی کشش ہے۔ آدمی اُن کی شخصیت سے متاثر ہو کر بے اختیار اُن کی طرف کھنچنے لگتا ہے اور جب اُن سے بات کرنے بلکہ اُن کی باتیں سننے کا موقع ملتا ہے تو اُن کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اُن کی بات چیت کے انداز، حرکات و سکنات، لب و لہجہ سے یہ احساس و تاثر ابھرتا ہے کہ اُن کے اندر بڑی توانا اور بھرپور زندگی کے چشمے موجزن ہیں، بالخصوص جب وہ شعر و

ادب کے کسی موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو سامعین پر چھا جاتے ہیں اور بلا تکان بولے ہی چلے جاتے ہیں، حالاں کہ اُن کے اس اندازِ گفتگو سے بعض اوقات نجی محفلوں میں یہ تاثر بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو بولنے اور بات کرنے کے کم مواقع دیتے ہیں۔ وہ اُن معدودے چند ہستیوں میں سے ہیں جنھیں قدرت قلم اور نطق جیسی دونوں صلاحیتوں سے بڑی فیاضی سے نوازتی ہے۔ ان چند شخصیات میں سے جو اب تک میرے رابطے میں آئیں، سلیم بھائی مرحوم اور محمد صلاح الدین مرحوم (مدیر تکبیر) بھی شامل تھے، جو قلم اور زبان دونوں ہی کے غازی تھے۔ ایک ایسی ہی بہت ہی قدر آور شخصیت مولانا صلاح الدین احمد کو صرف ایک بار سننے کا اعزاز بھی حاصل ہوا، جب غالباً ۵۷،۱۹۵۶ء میں اپنے تایا ابوالفضل صدیقی کے ساتھ حلقۂ اربابِ ذوق لاہور میں ''میراجی ڈے'' پر شرکت کرنے گیا تھا۔ مولانا محترم کی حلقے میں تقریر اور بعد میں پاک ٹی ہاؤس میں صدیقی صاحب کے ساتھ ہونے والی نجی گفتگو کا سحر آج بھی ذہن و دماغ پر طاری ہے۔ ضیا بھائی کو سننے کا اتفاق تو تقریباً ہر ہفتے ہی حلقے کی نشستوں میں ہوتا رہتا مگر بعض اوقات دیگر ادبی نشستوں اور تقاریب میں بھی ان کی بڑی متاثر کن فی البدیہہ تقاریر سننے کا اتفاق ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ نبی باغ کالج کراچی میں ایک بار یوم اقبال کے موقع پر ایک مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ضیا بھائی اسٹیج کے عین سامنے اگلی نشست پر تشریف فرما تھے، منتظمین مذاکرہ نے ان سے استدعا کی کہ وہ علاقے کی شاعری کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالیں۔ ضیا بھائی نے فی الفور اُٹھ کر جو فی البدیہہ تقریر کی وہ حاصلِ تقریب ٹھہری۔ اب شعر گوئی کے علاوہ ادھر چند سالوں سے ''علامت'' لاہور کے اداریوں میں انھوں نے اپنی نثر نگاری کے جو نمونے پیش کیے ہیں وہ ناقدینِ فن کی نظر میں بلیغ و فکر انگیز نثر کے نہایت دل کش اور خوب صورت مرقعے ہیں۔

جب میں نے ادب کی دنیا میں قدم رکھا تو کراچی کے ادبی حلقوں میں بعض کو سرگوشیوں اور بعض کو کھلے بندوں اُن منفی معنوں میں جس سے عام طور پر آج کل ''عصبیت'' اور تعصب کا مفہوم لیا جاتا ہے، ضیا بھائی کی ذات سے منسوب کرتے ہوئے سنا۔ یہ بات میرے لیے خاصی حیرت کا باعث تھی، کیوں کہ گو مجھے اس وقت تک ضیا بھائی سے اتنا قرب حاصل نہ ہوا تھا کہ میں ان کی ذات یا شخصیت کے کسی ایسے پہلو کے متعلق کوئی رائے قائم کرسکوں، تاہم میرے تایا ابوالفضل صدیقی کے ان سے بڑے قریبی مثلِ عزیزوں جیسے دیرینہ تعلقات رہے تھے اور میں نے کبھی ان کی زبان سے ضیا بھائی کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں سنی تھی، حالاں کہ وہ ''آدمی پڑھنے'' میں بڑا ملکہ رکھتے تھے اور بے لاگ تجزیہ کر دیا کرتے تھے۔ جب مجھے خود ضیا بھائی کا قرب نصیب ہوا اور انھیں قریب سے دیکھنے، پرکھنے اور سمجھنے کا موقع نصیب ہوا تو مجھے ان کی شخصیت کے کسی پہلو سے ہی ایسی منفی بات کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اگر وہ کبھی علاقائی زبانوں کی تائید و حمایت میں کوئی بات کہتے بھی ہیں تو اس میں ان کا بڑا پُر وزن استدلال یہ شامل ہوتا ہے کہ قومی زبان کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع ملنا چاہیے کہ یہ عمل

خود قومی زبان کی ترقی و ترویج کے لیے ضروری ہے۔ اس میں بھلا کون سی ایسی منفی اور تعصب والی بات ہے، یہ تو بڑا مثبت رویہ اور طرزِ فکر ہے! بہرحال میں ضیا بھائی کے متعلق بعض اذہانوں پر ورش اور پلنے والی اس بات کے محرکات پر غور کرتا رہا اور اس پر چول میں رہا کہ اصل صورتِ حال سے واقف ہوسکوں۔ مجھے خوشی ہے کہ اصل حقیقتِ حال کا مجھے علم ہوگیا جو اس تحریر کے ذریعے ریکارڈ پر لانا، میں اپنا ادبی فریضہ سمجھتا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ضیا بھائی زندگی کے تمام تر معمولات میں نہایت کھرے، سچے اور صاف گو آدمی ہیں، منافقانہ طرزِ عمل اختیار کرنا ایسے انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ عام زندگی کے علاوہ اُن کا یہ طرزِ عمل ادب کے معاملے میں بھی برقرار رہتا ہے۔ غالباً ساٹھ کی دہائی کی بات ہے کہ ضیا بھائی ریڈیو پاکستان سے ہر مہینے اردو میں ادبی کتابوں پر تبصرہ نشر کیا کرتے تھے، جس کا انتخاب وہ خود کیا کرتے تھے۔ ارم لکھنوی نے ضیا بھائی سے اصرار کیا کہ ایک مہینے سیّد آلِ رضا کی کتاب ''غزل معلّی'' پر تبصرہ کردیں۔ کتاب پڑھنے کے بعد ضیا بھائی نے ارم لکھنوی سے معذرت کرلی، مگر انھوں نے یہ کہہ کر ضیا بھائی کو تبصرہ کرنے پر مجبور کردیا کہ ''ہم سیّد آلِ رضا سے وعدہ کرچکے ہیں، آپ ہماری بات رکھ لیں۔'' تبصرے سے معذرت ضیا بھائی نے اس لیے کی تھی کہ ایک تو اُن کا کلام ان کو بہت زیادہ متاثر نہ کرسکا تھا، دوسرے پیشِ لفظ میں انھوں نے اپنے کلام کے بارے میں جس قسم کی تعلّی سے کام لیا تھا، اُن کی غزلیں اس معیار پر ہرگز پوری نہ اترتی تھیں، پھر انھوں نے جدید شاعری کو بھی بہت رگیدا تھا اور ہدفِ تنقید بنایا تھا اور جدید شاعری سے ضیا بھائی کا جس قسم کا تعلق ہے، اُس سے ہم سب ہی بہ خوبی واقف و آگاہ ہیں۔ چناں چہ ریڈیو پر ''غزل معلّی'' پر ضیا بھائی نے جو تبصرہ کیا اس میں کچھ باتیں ایسی تھی جو سیّد آلِ رضا صاحب کو پسند نہ آئیں۔ وہ تو خیر شہر بھر میں ان کو بُرا بھلا کہتے ہی تھے، مگر ستم یہ ہوا کہ کراچی کے ایک فعال اور اہم شاعر نے ضیا بھائی کے خلاف پورا ایک محاذ بنالیا، جس میں کچھ دوستوں اور ادیبوں کو ضیا بھائی کے خلاف مسلسل اُکسایا جاتا اور اشتعال دلایا جاتا۔ اس تبصرے کو بنیاد بنا کر ضیا بھائی کے خلاف یہ مذموم بے بنیاد پروپیگنڈا کیا گیا کہ ضیا بھائی نے یوپی کے ایک بزرگ شاعر کی پگڑی اس لیے اچھالی کہ ان کا تعلق دوسرے صوبے سے تھا۔ اس وقت ضیا بھائی کے خلاف کراچی میں جو محاذ بنایا گیا تھا، ان میں سلیم بھائی مرحوم بھی شامل تھے اور بعد میں سلیم بھائی نے ہی پوری تفصیل ضیا بھائی کو بتلائی تھی۔ اس بات کی اتنی ہوا خیزی کی گئی کہ بعض ''برادری'' والوں نے ان پر ''تعصب'' کا بے بنیاد الزام لگانے سے بھی گُریز نہیں کیا، مگر جھوٹ اور دروغ کو ثبات کہاں! یہ بات آپوں آپ دم توڑتی گئی اور وہ تمام لوگ جنھیں میری طرح ضیا بھائی کے قرب کا شرف حاصل رہا ہے، وہ میری تائید کریں گے کہ بحمد اللہ ان کی شخصیت میں ایسے کسی منفی پہلو کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

پچھلے پچیس تیس سال کے دوران ہمارے معاشرے میں جن نت نئی معاشرتی برائیوں نے جنم لیا ہے اور اخلاقی انحطاط اور زوال جس جس انداز سے نمایاں ہوا ہے، اس سے آج ہر ذی شعور پاکستانی

اچھی طرح واقف اور آگاہ ہے، چناں چہ اس کی تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ تاہم ایک بڑا المیہ اور تلخ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ادبی برادری بھی خود کو اس اخلاقی گراوٹ اور انحطاط سے محفوظ نہ رکھ سکی۔ ویسے پیٹھ پیچھے برائیاں کرنا، دوسروں کے فن و ذات میں کیڑے نکالنا، ایک دوسرے کو آپس میں بدظن کرنے جیسے منافقانہ طرزِ عمل کی مثالیں پہلے بھی اس برادری میں مل جایا کرتی تھیں، مگر ہمارا معاشرہ جیسے جیسے زیادہ زوال پذیر ہوتا گیا، اس قسم کے واقعات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ غالباً اسی کی دہائی کے بالکل شروع کے کسی سال کی بات ہے کہ حکومتِ پاکستان کے ایک ادارے نے سلیم احمد سے علامہ اقبال پر ایک فلم لکھوائی۔ فلم تیاری کے بعد ماہرین کی ایک کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی۔ اس کمیٹی میں ضیا بھائی بھی شامل تھے۔ فلم دیکھنے کے بعد اس کے کچھ حصوں پر بعض اراکین معترض ہوئے۔ کسی صاحب نے اس واقعے کے بعد سلیم بھائی کے، ضیا بھائی کے خلاف کان بھرے اور کہا کہ تمھارے دوست ضیا نے کہا، یہ فلم سلیم احمد سے نہیں لکھوانا چاہیے تھی۔ سلیم بھائی آزردہ خاطر ہوئے، جو ایک فطری امر تھا، کیوں کہ دونوں ہی ایک دوسرے کو اپنا قریبی، عزیز دوست سمجھتے تھے۔ خود ضیا بھائی نے ابوالفضل صدیقی پر جو مضمون لکھا ہے جو ''مجسّم محبت... ابوالفضل صدیقی'' کے زیرِ عنوان ''مکالمہ'' کراچی، شمارہ ۲، دسمبر ۱۹۹۷ء میں چھپا ہے اس میں خود اس قربت اور دوستی کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

> کراچی میں کم و بیش میں نے بیس برس گزارے تھے۔ اس شہر میں میری جڑیں کتنی دور تک چلی گئی تھیں، اس کا احساس تو اس وقت ہوا جب ان جڑوں کو وہاں سے اُکھیڑنا پڑا۔ کتنے دوست تھے جن سے مدتوں ملاقات نہ ہوتی تھی تو یہ خیال رہتا تھا کہ جب چاہیں گے مل لیں گے، مگر اب اُن سے ملنا گاہے گاہے ہوسکے گا اور وہ بھی یقینی نہیں، گہرے ملال کا باعث بنا ہوا تھا۔ جن شخصیتوں کے ساتھ صبح و شام اٹھنا بیٹھنا تھا، اُن میں سے تین کم از کم ایسے اشخاص ضرور تھے جن کو چھوڑنے کا رنج برداشت کرنا واقعی بڑی ہمت کا کام تھا۔ ان میں میرے پرانے دوست اور دم ساز حمید نسیم تھے، ادبی محفلوں کی جان اور میرے نہایت ہی محبوب دوست سلیم احمد تھے اور صدیقی صاحب... ص ۱۵۹۔

اب اگر ایسے ''محبوب دوست'' کو ضیا بھائی سے کوئی شکایت ہوئی ہوگی تو لامحالہ ضیا بھائی کو دلی دکھ اور ملال ہوا ہوگا۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس جہان سے رخصت اور ضیا بھائی سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے سے پہلے بات صاف ہوگئی اور اُن کے محبوب دوست کا دل اُن سے صاف ہوگیا۔ مجھ سے خود سلیم بھائی نے اس کا اعتراف کیا تھا۔ پھر ضیا بھائی سے جب میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے بھی مجھے بتلایا تھا کہ فلم دیکھنے کے بعد جب کچھ اراکین اس پر معترض ہوئے تھے، تو اُن لوگوں کے اعتراض کے جواب میں، میں نے کہا تھا: ''سلیم احمد نہایت کھرا لکھنے والا ادیب ہے، اگر سب کچھ اپنی مرضی کا ہی لکھوانا تھا تو

سلیم احمد جیسے کھرے لکھنے والے سے یہ فلم نہیں لکھوانی چاہیے تھی۔"

اب اس بات کو توڑ مروڑ کر سلیم بھائی کے کان بھرے گئے اور یوں دو "کھرے دوستوں" کو ایک دوسرے سے بدظن اور برگشتہ خاطر کرنے کی مذموم کوشش کی گئی۔ ہے نا عبرت کا مقام! فاعتبرو یااولی الابصار۔

آج جب ضیا بھائی کے متعلق لکھنے بیٹھا تو ندامت کی ایک خلش نے رہ رہ کر میرے قلب و ذہن کو ایک بار پھر کریدنا شروع کر دیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن حلقے کی نشست کے بعد ضیا بھائی کے گھر جا بیٹھے۔ بات چیت تو یوں ہمیشہ ہی شعر و ادب کے گرد گھوما کرتی تھی، مگر اُس وقت نہ معلوم کیسے پھسل کر سیاست کے گرد چکر کھانے لگی اور کچھ بحث و تکرار کا رُوپ دھار گئی۔ ایک بڑے قومی رہنما کا دیگر سیاست کاروں سے تقابل شروع ہوگیا۔ ضیا بھائی بھی اُس وقت خلافِ معمول اور اپنی اُفتادِ طبع کے برعکس جذباتی سے ہوگئے اور میں تو بالکل نیچے گھروں پر آ گیا۔ اُس دور کے سیاسی رہنماؤں کے تدبّر اور سوجھ بوجھ کا اُن قومی رہنما سے تقابل کرتے ہوئے یہاں تک کہہ گیا کہ ایسے سیاسی شعور کے مالک تو اُن "بڑے رہنما" کے ہاں کارندے اور سائیں ہوتے تھے۔ ضیا بھائی بھی کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوگئے مجھ سے کہا:

"آپ تو بالکل ہی ایرانی ہوٹلوں میں بیٹھنے والے لوگوں جیسی باتیں کر رہے ہیں" اور پھر ایک مرتبہ یہ بھی کہا کہ "آپ ابھی تک وہیں بدایوں وغیرہ میں رہتے ہیں۔"

جس پر میں نے اُن سے کہا:

"ضیا بھائی آپ بھی تو اپنے نام کے ساتھ اب تک جالندھری لگاتے ہیں۔" غرضے کہ میرے اُن کے درمیان اُس روز گفتگو اس نہج پر ہوئی جو ہونا نہیں چاہیے تھی، مگر وہ جب دوسرے ہفتے ملے تو اُسی تپاک، شفقت، محبت اور شگفتگیِ مزاج کے ساتھ پیش آئے جو اُن کی طبیعت اور طینت کا خاصّہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اب یہ بات اُن کو بالکل ہی یاد نہ ہو اور مجھے بھی یوں یاد رہ گئی کہ آج تک مجھے اپنے اُس رویّے پر بے انتہا ندامت اور خجالت ہے کہ میں ہر لحاظ سے اُن کے "خوردوں" میں تھا اور ہوں اور کم از کم مجھے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے تھا، مگر بعض اوقات انسان جذبات سے مغلوب ہو کر ایسی باتیں کہہ جاتا ہے کہ اُس پر تمام عمر کا پچھتاوا رہ جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بتا چکا ہوں کہ ضیا بھائی جب بھی کراچی آتے ان سے ملاقات ضرور ہوتی تھی۔ غالباً ۱۹۸۶ء کی بات ہے کہ میں اہلِ قلم کانفرنس میں شرکت کے لیے اسلام آباد گیا۔ ہمارے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی اس ہوٹل میں جہاں ہمارا قیام تھا، ضیا بھائی اور شفقت بھابی، صدیقی صاحب اور مجھ سے ملنے پہنچ گئے اور فوراً ہی اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ پہلی مرتبہ ان کا ذاتی مکان دیکھا تو بڑی مسرت ہوئی۔ اہلِ قلم کانفرنس میں قیام کی مدت دو تین روز سے زیادہ نہیں ہوتی تھی، مگر اس قلیل مدت قیام کے

باوجود ضیا بھائی اور شفقت بھابی نے گھر پر میرے اور صدیقی صاحب کے لیے انتہائی محبت سے بڑے پُرتکلف کھانے کا اہتمام کیا۔ ضیا بھائی اب نانا اور شفقت بھابی نانی بن چکی تھیں۔ ان کی گود میں اس وقت پھول سی بچی دیکھ کر (جواب تو ماشاء اللہ خیر سے خوب بڑی اور سیانی ہوں گی) عجیب سی خوشی محسوس ہوئی تھی، ایسی خوشی جو کسی اپنے کی آئندہ نسل کو پروان چڑھتے دیکھ کر ہی ہوتی ہے۔ ۲۹، مارچ ۸۷ء کو ایک مختصر سی ملاقات اُن سے نیا آڈیٹوریم کراچی میں ہوئی تھی، جب وہ اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود، صدیقی صاحب کے اعزاز اور اُن کی پچاس سالہ خدمات اردو کے اعتراف میں انجمنِ ترقیِ اردو کراچی کے منعقدہ جلسے میں شرکت کے لیے خصوصیت سے پہنچے تھے، مگر اپنی مصروفیت کے باعث جلسے کے اختتام تک نہیں بیٹھ سکے تھے۔ مجھے یاد ہے وہ اسٹیج کے عین سامنے والی اگلی صف میں بیٹھے تھے اور جب جلسے کے دوران جانے لگے تھے تو صدیقی صاحب نے اسٹیج پر سے اور انھوں نے اپنی نشست سے اٹھ کر ایک دوسرے کو بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھا تھا اور پھر ہاتھ ہلاتے ہوئے گویا الوداع کہتے ہوئے صدیقی صاحب سے رخصت ہوئے تھے، مگر شاید اُن کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ صدیقی صاحب پر آخری الوداعی نظریں ڈال رہے ہیں اور اب وہ کبھی اُن کو نہ دیکھ سکیں گے۔

۳ ستمبر ۸۷ء کی دوپہر جب ابوالفضل صدیقی پر اپنا آخری افسانہ ”شاہ زادہ محی الدین“ (عالمگیر اورنگ زیب) ختم کرنے کے فوراً بعد ہی فالج کا حملہ ہوا، جو جان لیوا بھی ثابت ہوا تو میں نے ان کی علالت کی خبر ضیا بھائی کو دینے کے لیے اسلام آباد فون کیا۔ ان کے گھر پر اس وقت شفقت بھابی کی ہمشیرہ تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ ضیا بھائی اور شفقت بھابی، ضیا بھائی کے بائی پاس کے سلسلے میں لندن گئے ہوئے ہیں۔ ان کے عارضۂ قلب کے بارے میں اطلاع تو تھی اور گاہے گاہے فون پر شفقت بھابی سے اور خود ضیا بھائی سے بھی ان کی طبیعت کے بارے میں معلوم کرتا رہتا تھا، مگر بائی پاس اور لندن روانگی کے متعلق خبر نہ تھی۔ شفقت بھابی کی ہمشیرہ نے انھیں لندن صدیقی صاحب کی علالت کے بارے میں مطلع کردیا تھا، کیوں کہ ضیا بھائی کی دونوں بچیاں نین تارا اور صبا اور اُن کے داماد صدیقی صاحب کو دیکھنے میری موجودگی میں حنیف ہسپتال پہنچے تھے۔ پھر ۱۶، ستمبر ۸۷ء کو صدیقی صاحب کی رحلت کے کچھ دن بعد ہی ان کا ایک تعزیتی خط صدیقی صاحب کے بڑے بیٹے شاہد حسن کے نام پہنچا تھا، جس میں لکھا تھا کہ وہ لندن میں، ایک مشاعرے میں شریک تھے کہ اپنا تک اسٹیج سے ابوالفضل صدیقی کے انتقال کا اعلان کیا گیا اور احتراماً دو منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ غالباً دسمبر ۱۹۸۷ء میں، میں دوسری مرتبہ اہلِ قلم کانفرنس میں شرکت کے لیے اسلام آباد گیا، مگر اس دفعہ ضیا بھائی سے ملاقات نہ ہوسکی، کیوں کہ وہ لندن ہی میں تھے۔ اس کے بعد جب وہ کراچی تشریف لائے تو مجھے اپنی آمد سے مطلع کیا اور صدیقی صاحب کے گھر تعزیت کے لیے گئے، بہت ہی افسردہ اور ملول تھے، ایسا یاد پڑتا ہے کہ شفقت بھابی بھی ساتھ تھیں۔ بڑی ٹھنڈی سی سسکی، مغموم انداز اور پُرنم آنکھوں کے ساتھ بھائی جان سے مخاطب ہو کر بولے تھے، ”شاہد بھائی یہ کیا

ہوگیا!'' پھر دیر تک بھائی جان، باجی جان (زینت) اور مجھ سے صدیقی صاحب کی ہی باتیں کرتے رہے تھے، باتیں جو چالیس سال کے محبت بھرے تعلقات کی یادوں پر محیط تھیں۔

۱۹۹۰ء کے جون یا جولائی میں میرا اپنے بیٹے شہریار مرحوم کے گردے کی منتقلی کے سلسلے میں سرجن مختار سے مشورے کے لیے اسلام آباد جانا ہوا۔ میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے ہاں ٹھہرا تھا، صرف دو ایک دن کا مختصر پروگرام تھا۔ جانے کے بعد پورا دوسرا دن تو راول پنڈی جا کر ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے میں نکل گیا، مگر پھر بھی شام کو جمیل بھائی کے ڈرائیور کو ساتھ لے کر ضیا بھائی سے ملنے ان کے گھر گیا۔ وہ گھر پر نہ تھے، شفقت بھابی اور وہ واک پر گئے ہوئے تھے۔ پیغام چھوڑ آیا کہ حاضر ہوا تھا اور شاید کل صبح ہی کراچی واپسی ہوجائے گی۔ رات کو ضیا بھائی ملنے آئے اور اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں بڑے پیار محبت سے بولے، ''یہ کیا آپ جوگی والا پھیرا لگانے آئے ہیں!''۔

میں نے ان کو اپنی مجبوری بتائی۔ وہ رات گئے تک میرے اور جمیل بھائی کے پاس بیٹھے رہے، شیری مرحوم کی علالت کی تمام تفصیل معلوم کی اور ٹرانس پلانٹ کے امکانات اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے رہے۔

ضیا بھائی کو حلقۂ اربابِ ذوق کی نشستوں اور دیگر ادبی تقاریب میں سننے کے بہت مواقع ملے۔ ان کے مسحور کن اندازِ گفتگو اور مدلل بات کہنے کا تذکرہ کرچکا ہوں، مگر اس سلسلے میں ان کی شخصیت کے ایک اور نمایاں پہلو کا بھی تجربہ ہوا۔ وہ حلقے میں ہونے والی بحث کو متوازن اور حدِ اعتدال میں رکھنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ کئی بار ایسے مواقع بھی آئے کہ بحث اتنی حدت پذیر اور جذباتی ہوگئی کہ نوبت ذاتیات تک پہنچ گئی، مگر ضیا بھائی نے انتہائی تدبر اور ماہرانہ انداز میں اسے ذاتی چپقلش ہونے سے بچایا اور بحث کو دوبارہ صحیح سمت اور خطوط پر استوار کیا۔ اِس وقت بھی دو ایسے ہی واقعات ذہن میں ابھر رہے ہیں اور عجب اتفاق ہے کہ دونوں ہی کا تعلق ابوالفضل صدیقی مرحوم کی ذات سے ہے۔ عثمانیہ کالج کراچی میں حلقے کی ایک نشست میں ابوالفضل صدیقی مرحوم نے ایک مضمون پڑھا جو روس کے کمیونسٹ لیڈروں اسٹالن وغیرہ کی ان سرگرمیوں سے متعلق تھا، جس کے ذریعے انھوں نے مختلف نامناسب ذرائع اور ہتھکنڈوں سے پارٹی کے لیے فنڈ جمع کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ صدیقی صاحب کے مخصوص انداز میں تیز کاٹ دار مضمون تھا۔ بس قیامت آگئی، بعض ترقی پسند ادیب جو اس نشست میں موجود تھے، طیش میں آگئے۔ احمد ہمدانی اور صادق مدہوش وغیرہ تو غصے میں پورے جسم سے کانپتے ہوئے آستینیں چڑھا کر صدیقی صاحب کی طرف جھپٹنے لگے، مگر ضیا بھائی اور ان کے ساتھ سلیم بھائی نے بھی محض اپنی گفتگو کے ذریعے صورتِ حال کو زیادہ خراب ہونے اور مزید بدمزگی سے بچالیا۔ دوسرا واقعہ بھی صدیقی صاحب کے ساتھ ہی پیش آیا تھا، جب انھوں نے اقبال لائبریری میں حلقے کی نشست میں اپنا مضمون ''بنّے بھیّا... سجاد ظہیر'' پڑھا تھا، جس کو سن کر ایک بار پھر ترقی پسند ادیب مشتعل ہوگئے۔ بحث میں دونوں جانب

سے آستینیں چڑھ گئیں اور ہاتھ بس گریبانوں تک پہنچنے والے تھے کہ ضیا بھائی نے انتہائی تحمل کے ساتھ ایسی مدلل گفتگو کی کہ طرفین کے جذبات کا چڑھا ہوا دھارا بہت حد تک مدھا گیا۔

جون ۱۹۹۲ء میں شیری کے انتقال کے بعد کافی عرصے تک ضیا بھائی سے ملاقات ہی ہوسکی اور نہ فون پر کوئی رابطہ ہی۔ اس کے شاید دو ایک سال بعد مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ حمید نسیم مرحوم کے اعزاز میں انجمن ترقی اردو کراچی نے جو جلسہ کیا تھا، اس میں مضمون پڑھنے کے لیے آئے تھے، مگر نہ معلوم کیوں انھوں نے اپنی آمد کی کوئی اطلاع ہی نہیں دی جس پر مجھے کافی تعجب بھی ہوا اور قلق بھی، کیوں کہ ان سے ملے کئی برس گزر چکے تھے۔ حمید نسیم صاحب سے جب بھی ملاقات ہوتی تو ضیا بھائی کے متعلق ضرور بات ہوتی۔ غالباً ۱۹۹۶ء کی بات ہے کہ حمید نسیم صاحب سے فضلی سنز میں ملاقات ہوئی تو میں نے انھیں بتلایا کہ میں کئی دن سے تواتر سے ضیا بھائی کو خواب میں دیکھ رہا ہوں۔ انھوں نے چونک کر مجھے دیکھا اور عجیب انداز سے کہا، ''آپ کا خون بڑھ کر رہا ہے۔ آپ کو اور ضیا کو جو ایک دوسرے سے قربت ہے، اس کے باعث ایسا ہو رہا ہے۔ دراصل ضیا آج کل بیمار ہیں...'' میں نے تفصیل پوچھی تو شاید کچھ ایسا بتلایا کہ بائی پاس کے لیے جہاں سے رگوں کو جراحت کی گئی تھی وہاں کچھ (تکلیف) انفیکشن وغیرہ ہوگیا ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا گھر آ کر فوراً اسلام آباد فون کیا، شفقت بھابی سے بات ہوئی، ضیا بھائی اس وقت گھر پر نہ تھے، مگر تھوڑی دیر بعد خود ضیا بھائی کا فون آیا۔ کافی دیر بات کرتے رہے، بڑی محبت اور پیار سے سب کو پوچھتے رہے۔ اس دوران صدیقی صاحب کے بڑے داماد (بڑی بیٹی عذرا کے شوہر) محمد میاں، سرفراز علی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس سانحے کی انھیں اطلاع تھی۔ انتقال کی تمام تفصیل پوچھی، بڑا افسوس کرتے رہے اور آپا جان (عذرا) کا نیا فون نمبر وغیرہ پوچھا اور پھر فوراً ہی شفقت بھابی اور انھوں نے ان سے فون پر تعزیت بھی کی۔

۱۹۹۷ء کے اواخر جولائی یا اوائل اگست میں ایک روز تقریباً سات سوا سات بجے صبح جب میں بینک جانے کی تیاری کر رہا تھا، فون کی گھنٹی بجی۔ میرے والد صاحب نے فون اٹھایا اور مجھ سے آواز دے کر کہا، ''نذرا ضیا جالندھری صاحب بات کریں گے۔'' میں اتنی صبح ان کا فون آنے پر تھوڑا گھبرایا سا، مگر جب ان سے بات ہوئی تو اطمینان ہوگیا۔ وہ کراچی سے بول رہے تھے، بتلایا کہ ریڈیو پاکستان کے مشاعرے میں شرکت کے لیے جو قیام پاکستان کی پچاس سالہ تقریبات کے سلسلے میں منعقد کیا جا رہا ہے، کراچی آئے ہوئے ہیں، صدر کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ دفتر پہنچتے ہی ان سے ملنے فوراً ہوٹل گیا، منتظر بیٹھے تھے۔ کئی سال بعد ملنا ہوا تھا، وہی پیار اور گرم جوشی تھی۔ گھنٹا آدھ گھنٹا ہی وہاں بیٹھ سکا، کیوں کہ مجھے واپس دفتر پہنچنا تھا اور انھیں ریڈیو جانا تھا، مگر دوسرے دن ہی وہ میرے دفتر بھی تشریف لائے۔ میں ان دنوں حبیب بینک کراچی کا ریجنل آڈٹ چیف تھا اور میرا دفتر سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کے چوراہے پر تھا۔ ہوٹل میں ضیا بھائی کا دو ایک دن ہی قیام رہا، کیوں کہ مشاعرے کے بعد وہ وہاں

سرکاری خرچ پر ٹھہرنے کے مجاز نہ تھے۔ ان دنوں انھیں کچھ پروسٹیٹ کی تکلیف چل رہی تھی اور ان کے عزیز دوست حمید نسیم بہ ضد تھے کہ وہ کراچی میں اپنا قیام بڑھا لیں تا کہ وہ مشہور سرجن ادیب رضوی کو انھیں دکھا سکیں، چناں چہ وہ بہادر آباد محکمۂ ڈاک کے اعلیٰ افسران کے لیے مخصوص رہائش گاہ میں منتقل ہوگئے۔ اس ہی مکان کی نیچے کی منزل میں ضیا بھائی کراچی میں کئی برس تک رہائش پذیر رہے تھے۔ وہاں ان سے ملنے پہنچا تو نہ معلوم کیا کیا یاد آگیا، طویل لمبی لمبی نشستیں، گرمیِ محفل اور گرمیِ محبت، سب ہی کچھ تو۔ وہ خود بھی ان دنوں کی یادوں میں کھو کھو جاتے، اکثر اس زمانے کی باتیں کرتے۔ وہاں پہنچنے کے دوسرے دن ہی مجھ سے کہا، آپ مجھے عذرا بہن (ابوالفضل صدیقی کی بڑی صاحب زادی) کے پاس تعزیت کے لیے لے چلیں۔'' شام کو میں ان کو ساتھ لے کر طارق روڈ پر واقع آپا جان کے گھر گیا۔ بھیا صاحب (محمد میاں، سرفراز) کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے ڈاکٹر شایان نے اپنے مرحوم والد کے نام پر مکان کی نچلی منزل میں ہسپتال کھول لیا ہے۔ ہسپتال کے بڑے گیٹ سے اندر کے پیش دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے، ضیا بھائی یکایک ٹھٹھک کر رُک گئے، جیسے اچانک کسی نے قدم ان کے تھام لیے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بھیا صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے، جو اپنی ہنستی آنکھوں اور لبوں پر کھیلتی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ پیش دروازے کے اوپر سے ان کا استقبال کر رہے تھے۔ ضیا بھائی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے جیسے وہ بھیا صاحب کی دروازے کے اوپر آویزاں تصویر سے ہم کلام ہوں، نہ معلوم کیا کیا باتیں اُن سے کرنا چاہتے تھے پھر چند منٹ بعد ایک ہلکی سی، سسکی سی لی ٹھنڈی سانس بھری سرِ مژگاں لرزتے ہوئے موتی کے قطروں کو پینے کی ناکام کوشش کی اور بوجھل قدموں سے زینہ چڑھنے لگے۔ کافی دیر آپا جان اور شایان کے پاس بیٹھے بھیا صاحب کی باتیں کرتے رہے، پھر فاتحہ پڑھ کر وہاں سے رخصت ہوئے۔ کراچی میں ان کا قیام کئی دن رہا کیوں کہ میڈیکل ٹیسٹوں اور ان کی رپورٹس کے حصول میں کافی وقت لگ گیا۔ اس دوران وہ ایک دن میرے گھر بھی تشریف لائے۔ جب تک وہ کراچی میں قیام پذیر رہے تقریباً روزانہ ہی ان سے ملاقات ہوتی رہی اور جس شب وہ اسلام آباد روانہ ہو رہے تھے تو میں اپنے بیٹے خرم کے ساتھ ان سے الوداعی ملاقات کرنے بہادر آباد بھی گیا۔

کراچی سے جانے کے چند دن بعد ان کی طبیعت پوچھنے کے لیے فون کیا تو انھوں نے کہا، ''شفقت مجھ سے بہت ناراض ہے کہ میں صدیقی صاحب کے گھر کیوں نہیں گیا اور زینت بہن سے بغیر ملے کیسے چلا آیا۔'' میں نے کہا، ''ضیا بھائی اس میں میری بھی تو کوتاہی ہے، مجھے آپ کو وہاں لے جانا چاہیے تھا، بھابی سے میری طرف سے معذرت کر دیں۔''

۲۳ر اگست ۹۷ء کو پاکستان کی تاریخ انصاف میں ایک نہایت ہی نادر، زرّیں، اعلیٰ ترین اور ''شوکت ترین'' باب کا اضافہ کیا گیا، جب حبیب بینک کی انتظامیہ نے مجھے اور مجھ جیسے تقریباً گیارہ سو ایگزیکٹو کو اپنی مدتِ ملازمت ختم ہونے سے کئی سال پہلے، بہ یک جنبشِ قلم محض اس پاداش میں ریٹائر کر دیا

کہ وہ ۲۳؍ اگست ۷۰ء کی تاریخ کو پچپن سال یا اس سے زائد عمر کے ہو چکے ہیں اور اپنی مدتِ ملازمت کے پچیس سال یا اس سے زیادہ کا عرصہ پورا کر چکے ہیں اور طرفہ تماشا یہ تھا کہ ۲۴؍ اگست ۷۰ء یا اس کے بعد والے ایسے تمام ایگزیکٹو اس عجوبہ روزگار، نادر شاہی حکم سے مستثنیٰ قرار پائے اور آج تک بینک کے فیوض و برکات سے بہرہ مند ہو رہے ہیں، جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے! بچپن سے اب تک ''اندھیر نگری چوپٹ راج'' والی مقبولِ عام کہانی سنتے چلے آئے تھے، سو اس کا عملی مظاہرہ آج کی جدید متمدن دنیا میں خود اپنی گردن پر ہوتے بھی دیکھ لیا، ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے! ضیا بھائی کو جب اس کا علم ہوا تو مجھے فون کیا۔ بہت آزردہ اور ملول تھے۔ دیر تک اپنے دکھ کا اظہار کرتے رہے، وہ اس قدر دکھی تھے کہ اگر میرا کوئی سگا بڑا بھائی ہوتا تو شاید وہ ہی اس سانحے کو اس سطح پر محسوس کر سکتا۔ دیر تک اسی موضوع پر بات کرتے رہے، ہمدردی کے ساتھ مفید مشوروں سے بھی نوازا، بات انصاف کا دروازہ کھٹکھٹانے کی بھی ہوئی۔ اب میں کیا کہتا کہ ہمارے آج کے متمدن جمہوری انصاف پسند دور میں کوئی نوشیرواں عادل یا جہانگیر جیسا عدل گستر شہنشاہ تو ہے نہیں کہ زنجیرِ عدل ہلائی اور بس فی الفور انصاف مل گیا۔ یہاں تو بس آپ اللہ سے ہی لو لگائیں اور اس کی ذات پر ہی بھروسا کریں، بندوں سے تو کسی قسم کے خیر اور انصاف کی توقع ہی عبث ہے کہ ہماری آج کی دنیا میں تو اب یہ چیزیں عنقا ہی ہوتی جا رہی ہیں۔ ضیا بھائی کی بات کرتے کرتے میں اپنی بپتا سنانے بیٹھ گیا، مگر یہ بات نوکِ قلم پر آپوں آپ یوں آ گئی کیوں کہ ضیا بھائی دوسروں کی تکالیف، غم اور دکھوں پر قلب کی گہرائیوں سے متاثر ہوتے ہیں، جو ان کی شخصیت کا ایک اور نمایاں مثبت پہلو ہے۔

خوش فکر، خوش ذوق اور شگفتہ خاطر ہونے کے علاوہ، ضیا بھائی خوش پوش بھی ہیں، مگر ان کی خوش پوشی میں ستھرے پن اور سادگی کا انداز نمایاں رہتا ہے۔ نہایت ستھرا اور اچھا سلا ہوا لباس پہنتے ہیں۔ ماشاء اللہ اچھی وجیہہ اور پُروقار پرسنالٹی کے مالک ہیں، یوں جامہ زیب بھی ہیں، ہر لباس ان پر خوب جچتا ہے۔ جاڑوں میں سوٹ اور گرمیوں میں عموماً بش شرٹ پینٹ پہنتے ہیں، مگر میں نے انھیں کبھی شیروانی پہنے نہیں دیکھا، شاید جب دولھا بنے ہوں تو پہنی ہو، حتیٰ کہ ضیا الحق مرحوم سے دو ایک بار انھیں ٹیلی وژن پر ملاقات کرتے دیکھا، مگر اس وقت بھی وہ شیروانی میں نہیں بلکہ دوسرے قومی لباس یعنی شلوار قمیص اور واسکٹ میں نظر آئے۔ شیروانی کے ذکر پر ان کے اندازِ گفتگو میں کبھی کبھی ایک گونہ مذاق کا پہلو سا جھلکنے لگتا ہے، جس میں میرے خیال میں کسی سنجیدگی کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ اپنی افتادِ طبع کے تحت ازراہِ تفنن ہی ایسا کرتے ہیں۔

ضیا بھائی کی ازدواجی اور گھریلو زندگی بڑی مثالی گزری ہے، پیار محبت، یگانگت اور ہم خیالی کا جیتا جاگتا نمونہ! ماشاء اللہ خوب صورت، خوش خلق، خوش فکر، کھلے ذہن اور دل کی مالک، زندگی میں ہر ہر گام ساتھ دینے والی، ہر لحاظ سے مثالی ہی مثالی شریکِ حیات! گو کبھی کبھی دونوں میں پُر مذاق جملوں کا

تبادلہ بھی ہوجاتا ہے اور بڑی لطیف، پیار بھری ہلکی پھلکی نوک جھونک بھی، مگر یہ سب کی سب ضیا بھائی اور شفقت بھابی کے درمیان پیار محبت کے پاک رشتے کو قوی سے قوی اور مضبوط سے مضبوط تر بناتی رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بات یاد آگئی۔ کچھ دن پہلے میں نے ضیا بھائی کو فون پر بھائی جان شاہد حسن صدیقی (ابوالفضل صدیقی کے بڑے صاحب زادے) کے انتقال کی خبر دی جن کا پچھلے سال ۱۱رنومبر کو اچانک گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے حرکتِ قلب بند ہوجانے کے سبب انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے چند روز بعد جب میں بھائی جان مرحوم کے گھر گیا تو باجی جان (شاہد حسن مرحوم کی اہلیہ زینت) نے بتلایا کہ ضیا بھائی اور شفقت بھابی کا تعزیت کے لیے فون آیا تھا۔ وہ کافی دیر تک شفقت بھابی اور ضیا بھائی کے متعلق ہی بات کرتی رہیں، دورانِ گفتگو بتلایا کہ ماموں صاحب (ابوالفضل صدیقی) کا ضیا بھائی سے بڑا پُرلطف مذاق بھی چلتا رہتا تھا۔ ایک بار کافی دن تک ضیا بھائی کا کوئی خط نہیں آیا تو ماموں صاحب کے مزاج کی شوخی ابھر آئی اور رگِ شرارت پھڑک اٹھی۔ ایک کارڈ ضیا بھائی کے نام بغیر اپنا نام لکھے اور اندازِ تحریر بدل کر صرف یہ شعر لکھ کر پوسٹ کردیا:

کیا سبب ہے مدتوں سے خط کا آنا بند ہے
بھول بیٹھے وہ مجھے، یا ڈاک خانہ بند ہے

باجی جان نے بتایا کہ کارڈ پہلے شفقت بھابی کے ہاتھ میں پہنچا اور وہ ضیا بھائی کے سر ہوگئیں، بتاؤ یہ کارڈ تمھیں کس نے لکھا ہے؟ ضیا بھائی نے سمجھایا کہ کسی نے مذاق کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ صدیقی صاحب نے ایسا کیا ہے۔ شفقت بھابی نے کہا، ''میں صدیقی صاحب کی مخصوص تحریر پہچانتی ہوں، یہ ان کی تحریر ہرگز نہیں۔'' ضیا بھائی نے کہا، ''گو انھوں نے اپنا خط بدل کر لکھا ہے، مگر پھر بھی میں پہچان گیا ہوں، یہ انھیں کا لکھا ہوا کارڈ ہے۔'' پھر ایک کارڈ ضیا بھائی نے صدیقی صاحب کے نام اس شعری مذاق کا جواب شعر ہی کے ذریعے لکھ کر دیا۔ باجی جان نے کہا پورا شعر مجھے یاد نہیں تاہم کچھ یوں تھا:

ڈاک خانہ تو کھلا ہے ڈاکیہ پابند ہے

کافی دن تک شفقت بھابی اور ضیا بھائی کے درمیان اس موضوع پر مذاق کا سلسلہ چلتا رہا اور جب وہ دونوں کراچی آئے تو ضیا بھائی نے صدیقی صاحب سے کارڈ پر تحریر مذکورہ شعر کو پڑھ کر کہا ''شفقت کو آپ خود بتلائیں کہ یہ کارڈ آپ نے ہی مجھے لکھا تھا اور جواب میں جو شعر میں نے لکھا تھا وہ کارڈ بھی آپ کو مل گیا تھا۔'' صدیقی صاحب نے نہایت ہی سوکھا منھ بنا کر شفقت بھابی کی طرف دیکھ کر کہا، ''نہ معلوم کون ایسے خطوط ضیا کو لکھتا رہتا ہے؟ نہیں دلھن ہرگز نہیں، میں نے کوئی ایسا کارڈ ضیا کو نہیں لکھا، نہ مجھے کوئی ایسا کارڈ ضیا کا ملا'' مگر جب اپنی مخصوص شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ ضیا بھائی کی طرف دیکھا تو بات کھل گئی اور یہ پُرلطف مذاق قہقہوں کی گونج میں ختم ہوگیا۔

ضیا بھائی نے ہر لحاظ سے بڑی کامیاب، بھرپور اور متوازن زندگی گزاری ہے۔ عزت، شہرت، فن کی معراج، پذیرائی اور ہر قسم کی آسودگی سے عبارت زندگی۔ اس کامیابی میں ان کی مثبت سوچ، زندگی اور اس کے رویوں کے متعلق ان کے مثبت اندازِ فکر اور طرزِ عمل کا بڑا ہاتھ ہے۔ کسی نوع کے منفی طرزِ احساس اور اندازِ فکر کا ان کی شخصیت میں کسی پہلو اور طور کوئی سراغ نہیں ملتا بلکہ ایک قسم کا رجائی عنصر کارفرما نظر آتا ہے جو ان کی بعض نظموں میں کم از کم مجھے ضرور جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ ایسے مثبت طرزِ فکر اور رجائی احساس کے حامل انسان زندگی میں کسی مرحلے پر مایوسی کا شکار نہیں ہوتے بلکہ زندگی تمام تر کامیابیوں، کامرانیوں کے ساتھ خود انھیں آگے بڑھ کر گلے لگاتی ہے:

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و ماہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے
(میر)

☆☆☆

یونس جاوید

درد الولڑا سائیں

میں کیسے کہہ دوں کہ وہ یہاں سے جا چکا ہے؟ کیسے مانوں کہ وہ کبھی نہیں آئے گا؟ کیسے یقین کرلوں کہ اب کبھی وہ میرا استقبال نہیں کرے گا... اٹھ کر، ٹائی کی کھلی گرہ سے، کھلے بازوؤں کے ساتھ کھلے دل کے ساتھ۔ میں نہیں مانتا۔ مان ہی نہیں سکتا۔ اصل میں مجھے ابھی تک یقین ہی نہیں آرہا کہ وہ جو میرے اندر بس رہا ہے، لہو میں سرسرا رہا ہے، دل میں دھڑکتا ہے، وہ مجھ سے جدا بھی ہوسکتا ہے۔ وہ تو میری سنجیدگی کو قہقہوں میں بدل دیتا تھا۔ محبوباؤں کے نام لے لے کر جلاتا تھا۔ ترلے کرکرے بلاتا تھا... کیسے جدا ہوسکتا ہے؟ لاٹھی مارنے سے پانی جدا نہیں ہوسکتا۔

میں ہمیشہ یہ بھول جاتا ہوں کہ یہ لاٹھی موت کی ہے جو ایک ضد کی طرح ہے، جسے کوئی دلیل نہیں کاٹ کرسکتی:

موت نے کر دیا لاچار وگرنہ انساں
ہے وہ خودبیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

مگر میرا ایمان ہے... کہ اچھے لوگ... دلوں میں بسنے والے، محبت بانٹنے والے، منافقت سے بچنے والے... اور غیبت سن کر تحیر کا شکار ہوجانے والے... کھلے ڈلے لوگ، مرتے نہیں... اوجھل ہوجاتے ہیں۔ صوفیہ کا وتیرہ بھی یہی ہے، دنیا میں رہیں تو تحیر میں رہتے ہیں... ان کا وصال بھی اوجھل ہوجانا ہے۔ دلوں سے الگ نہیں ہوتے، ہو ہی نہیں سکتے۔

وسیم گوہر، جس سے میرے بہت سے رشتے تھے: دوست، بھائی، اداکار، صحافی، ہم قلم اور محبوب کا... بھائی وہ بعد میں بنا پہلے دوست بن گیا۔ شاید اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کا مقولہ سن رکھا تھا کہ بھائی وہی اچھا جو دوست بھی ہو۔ یوں بھی ہم دونوں کو ایک بھائی کی ضرورت تھی جو دوست بھی ہو۔

وہ برادرانِ یوسف میں ہوتا... تو بھائی بن کر دوست نہ بنتا... وہ دوست ہی نہیں، غم گسار بھی بنا... دل دار بھی... اس کے بعد میں نے اسے اداکار بنا دیا۔ مگر صدا کار نہ بنا سکا۔ پنجابی مکالمے میں

''دال چول'' کو ہمیشہ ''دال چول'' کہتا... بالکل کشمیری ہاتو کی طرح... تلفظ میں میری اس کی ٹھنی رہتی مگر ہم دونوں مزہ لے رہے ہوتے۔

وہ بڑے حوصلے کا آدمی تھا... کرائسس کتنے زور کا ہو یا اندر کا طوفان کسی قدر شدید... چہرے پر نخلستان ہی نخلستان، صحرا میں گہری چھاؤں، آنکھیں بالکل چشمہ، اندر کی دھوپ پہ میری نگاہ ٹھہرتی مگر وہ تسلیم ہی نہ کرتا... الٹا میرے ملال کو جمال میں بدل ڈالتا۔ وہ بڑے سے بڑے مسئلے کو انگوٹھا چوس کر گھلا دیتا تھا۔

کوئی مسئلہ صدمے کی شکل اختیار کر لیتا تو اسے قہقہہ بنا کر اچھالتے ہوئے گھومنے والی کرسی کو گھما دیتا۔ جیسے مسئلہ محض کرسی کو گھما دینا ہی تھا۔ یہ سچ بھی ہے، میرے وطن میں کرسی گھما دینا ہی اصل مسئلہ ہے مگر وہ کرسی جس کے پایوں پہ سیروں سونا چڑھا ہو، جس پر بیٹھنے والے پلاٹینم کے چمچ استعمال کرتے ہوں... جس کا ہلنا، بیٹھنے والوں کے نزدیک عرشِ معلیٰ کا ہل جانا ہے... مگر وسیم کی کرسی اس کے انگوٹھا چوسنے سے گھومتی تھی... اور اس کا گزارا ہو جاتا تھا۔

ہر چند کہ اس کے پاس وسائل کم اور مسائل زیادہ تھے تب بھی وہ گردن اٹھا کر جیا طمطراق اور طنطنے سے، اعتماد کے ساتھ...

میں نے کہا، ''ذرا دھیمے چلو... سانس پھول بھی جایا کرتا ہے۔''

اس نے کہا، ''مجھ سے سسک سسک کر نہیں جیا جاتا۔''

میں نے سمجھایا، ''زندگی گزارنا ایک آرٹ ہے...''

وہ کہنے لگا، ''میں بھی زندگی گزارنا چاہتا ہوں... زندگی مجھے گزارے، مناسب ہے نہ مجھے پسند۔''

میں نے بین السطور میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اسے اچھا نہیں لگا وہ sagittarius بھی تھا اور یوں بھی تبلیغ ڈس لیتی ہے۔ پھر بھی... میں نے سگریٹ سے پرہیز کے لیے اصرار کر دیا۔ وہ چپ رہا تو میں سمجھ گیا نیم رضامند ہے اور یہی ہوا، چند دن بعد تو میں اسے سگریٹ کو ہاتھ لگاتے دیکھ کر ڈانٹنے بھی لگا۔ جس میں ڈانٹ کم اور پیار زیادہ تھا، وہ بھی سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی جب میں باہر سے آتا اور اس کے ہاتھ میں سلگا ہوا سگریٹ دیکھ کر جھپٹ کر چھین لیتا تو وہ ''ایک پف بس ایک پف'' کہتا رہتا اور میری تسلی کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا، ''میں دھواں اندر نہیں لے جاتا۔'' مگر دھواں اندر جا رہا تھا۔ دکھ کا دھواں، مسائل کا دھواں، دوسروں کی وعدہ خلافیوں کا دھواں... یہ سمجھتے ہوئے بھی میں نے اس کے لیے سگریٹ چھوڑ دیے۔ اس کا اثر اتنا ہوا کہ وہ مجھ سے چھپ کر سگریٹ پی لیتا، مگر کبھی کبھی۔

پروین ملک اسے ڈانٹتی نہیں تھی... صرف گھورتی تھی۔ اُس کی نگاہوں میں غصہ اور التجا دونوں ہوتے تھے جو وسیم کو معذرت کرنے پر مجبور کر دیتے اور وہ ایک آدھ کش کے بعد ہی سگریٹ مسل دیتا۔ یہ

سب اس لیے تھا کہ ڈاکٹر نے اسے سگریٹ سے پرہیز بتایا تھا۔ ورنہ ہم لوگ بچ بچا کر بھی ہزار سگریٹوں سے زیادہ دھواں اپنے پھیپھڑوں میں بھرے پھرتے ہیں اور خود کو ہر قدم پر چھلنی کرتے رہتے ہیں، ماحولیات کی پوری وزارت ہونے کے باوجود۔

سب سے زیادہ مظلوم میری نگاہ میں ٹریفک کا سپاہی ہے جو ہزاروں گاڑیوں کے دھوئیں کو اپنے نصیب میں لکھتا چلا جاتا ہے۔

وسیم گوہر بھی مجھے ٹریفک کا سپاہی لگتا تھا۔ ہر کوئی اپنے دکھ، اپنی اذیت، غصے اور کرائسز کا دھواں لے کر "سارنگ" آجاتا اور اُس کے کانوں میں انڈیل دیتا۔ وہ سب کو حوصلہ دیتا، "گل ای کوئی نئیں۔" اس کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔ وہ اپنے پیاروں کے سارے دکھوں کو ایک کش یا ایک "گلاس" میں گھول کر تحلیل کر دیتا تھا۔ قصور بھی اُسی کا تھا... خود فون پہ اصرار کر کے سب دکھیاروں کو بلاتا کہ "آ بیل مجھے مار..." اپنے دُکھڑے... غمِ فراق کے قصے سنا، غمِ روزگار کی ناآسودگی کے دھوئیں بکھیر، اور میری کہانیوں میں رنگ بھر... اور پھر میرے قہقہے میں شامل ہو کر اپنے سارے غم بھلا دے۔ میں ایک دن ناغہ کرتا تو فون آتا... "سر جی! کتھے او..." جب میں اسے ملنے "سارنگ" جاتا بلکہ کچھ مہینوں سے تو روزانہ جانے لگا تھا... وہ مجھے دیکھتے ہی آہستہ سے آواز دیتا... "اکبر... اکبر!" اکبر آکر مؤدب کھڑا ہو جاتا۔ وسیم نگاہوں میں توقیر بھر کر میری طرف دیکھتا اور اکبر سے کہتا، "یونس جی آئے ہیں اعلیٰ نسل کی چائے لاؤ... سب کے لیے..." یوں محسوس ہوتا کہ چائے میری خاطر منگوائی گئی ہے۔ مگر ہوتی سب کے لیے تھی... یہ ہر روز ہونے لگا۔ میں چائے نہیں پینا چاہتا تھا... اس لیے نہیں کہ اس کی نسل بہت ہی بُری تھی، اخراجات بھی تو تھے۔ کچھ کہنے لگتا تو میرا انکار اٹک اٹک جاتا کیوں کہ جس خلوص، جس محبت اور جس اصرار سے وہ چائے منگواتا تھا اور جس میں پروین ملک کا اصرار بھی برابر شامل ہوتا تھا، اس سے انکار گناہ تھا۔ اس پیار، خلوص اور توقیر سے تو زہر بھی پی لینے کو جی چاہتا ہے۔

حضرت بابا گرونانک کا فرمان ہے، "جو دُگنا جھکتا ہے وہ مجرم ہے..."

میں نے وسیم کو پرکھنا چاہا... وہ کبھی دُگنا نہیں جھکا... اس نے مجھے اور سب دوستوں کو عزت دی، بہت زیادہ، احترام کیا، باوقار پیار دیا قرینے سے۔ مگر جس کا جتنا حق تھا... اتنا ہی۔ کسی کی capacity سے زیادہ نہیں... خوشامد نہیں کی، محبت کی۔ سیّد ریحان بے کار تھا... (افسوس اب اس کا بھی انتقال اچانک ہو گیا ہے) کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ کوئی کمی نہیں ہے مگر وہ اکثر تنہائی میں اس کی بے کاری اور بیزاری کا تذکرہ دُکھ سے کرتا۔ میں نے کہا بھی، "کوئی بات نہیں... گھر میں بھی کچھ ہے، فکر کی کیا بات ہے۔"

وہ تڑپ جاتا... "سر جی! اپنی کمائی پہ بڑا فخر ہوتا ہے۔ طاقت اور اعتماد ملتا ہے... بے کار آدمی کی بیزاری اس کے لیے عذاب بن جاتی ہے، کبھی معاشرے کے لیے..."

پھر بشیر تھا جس کا ذکر ہمیشہ اس نے محبت سے کیا۔ ''شام ہوتے ہی اس کی تلاش اس کے بیجر کے تھرو شروع ہو جاتی۔ اکبر کا مسئلہ، نوی کے مسائل، شائستہ کا تذکرہ اور دیگر ملازموں کی بات، سب دردمندی سے ہوتی۔ اس لیے وہ باوجود اپنی کم عمری اور اس کے بار بار تذکرے کے کبھی کبھی مجھے مدبر اور بزرگ بھی لگا۔

عجیب بات یہ ہے کہ جب وہ کسی زیادہ اچھے موڈ میں ہوتا مجھے میرے ڈراموں کے مکالمے سناتا۔ اسے میرے وہ مکالمے بھی یاد تھے جو مجھے بھول چکے تھے۔ خصوصاً ایسے مکالمے جن میں ریت کا استعارہ استعمال ہوا تھا۔

''وادیٔ پُرخار'' کا یہ مکالمہ وہ مجھے اکثر سناتا جس میں خالدہ ریاست اپنے میاں عثمان پیرزادہ سے اپنی ساس بیگم خورشید شاہد کے بارے میں یوں احتجاج کرتی ہے کہ ''آتی ہیں... اور ریت سی اُڑا جاتی ہیں سانسوں میں...'' واقعی مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ وسیم نے اوجھل ہو کر میرے سانسوں میں سچ مچ ریت سی اُڑا دی ہے۔ یہ مکالمہ میں نے ۱۹۸۳ء میں لکھا تھا۔ مگر اس مکالمے میں اڑتی ریت کی اذیت جتنی آج محسوس ہوتی ہے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔

وسیم گوہر نے ''وادیٔ پُرخار'' میں کام بھی کیا تھا۔ وہ اپنے دوست (عثمان پیرزادہ) جو ''لنکن ان'' میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، کی اچانک موت پر اس کی لاش لے کر پاکستان آتا ہے اور اس کی ماں کو اس کے آخری لمحات کی کہانی سناتا ہے... جس طرح میں آج اس کی کہانی بیان کر رہا ہوں۔

اس نے فخر سے اعلان کر رکھا تھا کہ جس دن میرے سیریل ''خواب عذاب'' کا پہلا اپی سوڈ ٹیلی کاسٹ ہوگا، مکتبہ ''سارنگ'' میں اسپیشل شو ہوگا۔ سب دوست جمع ہوں گے ٹی وی یہاں لایا جائے گا اور زبردست دعوت ہوگی۔ پتا نہیں وہ یہ کیوں کرنا چاہتا تھا... اصل میں اسے خوشی بہت ہوتی تھی... دوسروں کے تخلیقی کام دیکھ کر... رشک کرتا تھا حسد نہیں۔ اور وہ وعدہ خلاف بھی نہ تھا۔ دیر سویر کر دیتا تھا مگر پابند ضرور تھا وعدے کا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ وہ مجھے وعدے کا پاس کرتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا... میرا اُس پر سے اعتبار اٹھتا جا رہا ہے۔ جس دن ''خواب عذاب'' چلے گا میں کیا کروں گا... کیا سوچوں گا؟ شاید پہلا اپی سوڈ دیکھ ہی نہ پاؤں۔ جس جشن کا اعلان اور اہتمام اُس نے سوچ رکھا تھا، اسے تنہائی کی کرچیاں چننے سے تو پورا نہیں کیا جا سکے گا۔

مجھے اپنی بے ترتیبی کا احساس ہو رہا ہے، ہاں شاید میں بکھر گیا ہوں۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے، فریاد کی کوئی لے نہیں ہوتی۔ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے بس اتنا ہی یک جا ہوں جتنا کوئی بھی صحرا ہو سکتا ہے یعنی یک جا ہوتے ہوئے بھی ہر ذرہ الگ... علاحدہ۔ یہی میری کیفیت ہے۔ اس کے دھیان میں سلسلۂ تکلم ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔

چاہتا کچھ ہوں، لکھتا کچھ ہوں۔ ہاں جیسا کہ میں نے ذکر کیا وہ دگنا کبھی نہیں جھکا جس کا

جتنا بنا ادا کیا۔ عزت میں، خوشی میں بلے گلے میں، روٹھنے اور منانے میں۔

وہ مجھ سے بھی روٹھا تھا... بلکہ میں اس سے روٹھ گیا تھا۔ جب سب دوست جمع ہوتے تو وہ کبھی کبھی جذبات کے بند توڑ کر بے قابو ہو جاتا، کوئی نہ کوئی لفظ اس کی زبان سے پھسل بھی جاتا جو ناگوار تو ہوتا مگر برداشت بھی ہو جاتا۔ خصوصاً ان سب خواتین کے سامنے جنھیں میں اور وہ ''کڑیاں چڑیاں'' کہتے نہ تھکتے تھے۔ اور جس کو سب ہی نے انجوائے بھی کیا تھا۔ ان میں سلمیٰ اعوان، پروین ملک، سیما، نیلم بشیر، بشریٰ رحمن وغیرہ شامل تھیں۔ حتیٰ کہ آخری دنوں میں بیگم پروین عاطف بھی اس گروپ میں شامل ہو چکی تھیں... اور ''کڑیوں چڑیوں'' کے الفاظ پر بے حد محظوظ ہو رہی تھیں۔

ایسی ہی کسی محفل میں... جس کی گفتگو تو مجھے بھول گئی... مگر ملال نہ گیا۔ دل صاف تھا، مگر اچانک مجھے بخار آگیا اور میں بہت دن تک ''سارنگ'' نہ جا سکا۔ ایک روز نرگس نے مجھے طعنہ دیا، کدھر گیا وہ وسیم گوہر اور ملک صاحب... جن کی اٹھتے بیٹھتے مالا جپتے تھے، کسی نے فون پر بھی خیریت نہیں پوچھی۔ نرگس کا غصہ بجا تھا۔ واقعی کسی نے نہ پوچھا تھا کہ میاں کدھر ہو، جیسے اس پورے اسٹیج پر میری ضرورت نہیں تھی، نرگس کا تیر نشانے پہ بیٹھا تھا، میرے دل میں واقعی ملال آگیا میں کئی دن بعد صحت مند ہو کر دفتر آیا تب بھی ''سارنگ'' گیا نہ ہی فون کیا۔ دوسری طرف کسی طریقے سے معلوم کیا تو پتا چلا کہ وسیم اپنے تئیں بہت زیادہ ناراض ہے... زیادہ ناراض زیادہ involve ہوتا ہے۔ جی خوش اور کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا اور میں بے چینی سے اس کے فون کا انتظار کرنے لگا۔ تاہم اس نے فون نہیں کیا۔

البتہ پروین ملک سے گلہ کرتا رہا، ''یونس نے مجھے فون نہیں کیا۔ میں ہی ہمیشہ فون کروں، مناؤں۔'' پروین ملک گواہ ہیں کہ اندر سے وسیم بھی میری طرح بے قرار تھا۔ پہلے تو سوچا.. غور کیا اور اپنا محاسبہ کیا کہ کوتاہی کہاں ہوگئی ہے۔ کچھ نہ ملا تو فردِ جرم مجھ پہ لگا دی مگر مجھ تک پہنچانے کے لیے کہ فردِ جرم لگ چکی ہے ملک صاحب سے فون کرایا (پروین ملک جس کو میں ملک صاحب کہہ کر بلاتا ہوں اور انھوں نے اسے گوارا کر رکھا ہے)۔ ملک صاحب کے فون پر میں پھٹ پڑا۔ اپنی بیماری اور بیوی کا طعنہ سنایا تو وسیم کو اپنی غلطی کا یا غلط فہمی کا احساس ہو گیا۔ فوراً فون کا چونگا پکڑا... اور پھر... کیا کہوں، پہلے فون پر اور پھر ''سارنگ'' میں، اتنے قہقہے ابل پڑے کہ گھنٹا بھر پورا ''سارنگ'' قہقہوں میں نہاتا رہا۔ اور وسیم سب کے درمیان گویا بنا ہوا تھا۔ البتہ اس کی ذات کا زیادہ حصہ میری ہی جھولی میں تھا... خصوصاً اس دن اور پھر یوں ہونے لگا کہ:

''یار بشریٰ رحمن کے بیٹے کا ولیمہ ہے۔''
''میں آپ کو گھر سے لیتا جاؤں گا۔''
''نیلم کے ہاں دعوت ہے۔''
''ساتھ ساتھ تو چلیں گے مگر میں پک کراوں گا۔''

''مظفر علی سید صاحب کی مزاج پرسی کے لیے...''

''میں بھی چلوں گا... بلکہ میری گاڑی میں سب چلیں گے۔''

اسے اپنی ڈرائیونگ پہ بڑا ناز تھا۔ اسی ناز پر وہ خود ساختہ خدمت کمیٹی کا چیئرمین بن بیٹھا تھا... مجھے ہی نہیں... کوئی پنڈی سے آئے یا اسلام آباد سے یا ملتان سے، اس کی گاڑی اسٹارٹ رہتی۔ بشیر سیفی، انعام الحق جاوید، طاہر تونسوی... اور بہت سے دوسروں کے لیے۔ کسی کو ایئرپورٹ سے لینا ہوتا کسی کو چھوڑنا مگر بشیر سیفی صاحب پنڈی سے آئے تو اردو بازار سے ہوتے ہوئے بانساں والا بازار تک پہنچ گئے اور فون پہ فون کیا، ''گاڑی پہ مجھے لے جاؤ۔ میں راستہ بھول گیا ہوں۔'' انھیں لاکھ راستہ سمجھایا مگر پھر وسیم کو ہی جانا پڑا کہ بانساں والے بازار سے گاڑی گزار لے جانا پل صراط سے بچ کر نکل جانا ہے۔ وہ اس طرح کے کئی پل صراط سے گزر چکا تھا مگر پیشانی پر کبھی بل نہ آیا۔

ایک روز معلوم ہوا افتخار مجاز کو ہارٹ اٹیک ہوگیا ہے۔ ''سارنگ'' میں کھلبلی مچ گئی۔ پروگرام بنا کہ پروین ملک صاحبہ کو وسیم گھر چھوڑ کر مجھے میرے گھر سے لے لے گا۔ اور ہم دونوں مجاز کے ہاں پہنچیں گے۔ ہم اس کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا شیخ زید ہسپتال جانا ہوگا۔ پہنچے... افتخار Intansive Care میں تھا۔ باہر اس کی بیگم اور بھابی پریشان کھڑی تھیں کہ اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ ایک نوجوان نماز پڑھ رہا تھا جو شاید مجاز کا بھتیجا تھا۔ ایک سہم سا ہمارے دلوں میں اتر گیا۔ میں نے وسیم کو اندر جانے کے لیے کہا، ''ایک وقت میں دو کی اجازت نہ تھی۔ وہ اندر چلا گیا۔ کھڑکی کے شیشے سے میں دیکھ رہا تھا۔ وسیم، مجاز کے بیڈ کے پاس پنجوں کے بل چل کر پہنچا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ مجاز نے سنا تو اس کے دانت ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار کی طرح نمایاں ہوگئے، میری ڈھارس بندھ گئی۔ قانون توڑ کر میں بھی اندر چلا گیا اور اُسے ہنستا دیکھ کر پھٹ پڑا۔ ''بھلے آدمی!'' میں نے اس سے کہا، ''تم تو بھلے چنگے ہو... ہمارا دل اتھل پتھل کیوں کر دیا؟'' وہ بولا، ''اس نے بات ہی کچھ ایسی کی ہے، دل مچل سا گیا ہے۔'' وہ برابر ہنس رہا تھا۔

''ہم مطمئن باہر آگئے۔ راستے میں، میں نے وسیم سے پوچھا، ''سید نسیم الحسن شاہ (اصل نام) کیا بات کی تھی جو مریض کی بتیسی نکل آئی تھی؟''

وہ بولا، ''یہی کہا تھا... آدھی رات کو ڈیس لگاتے ہو... بندے کا پتر بن اور گھر چل...''

صبح افتخار صحت مندی سے گھر پہنچ گیا۔

مگر وسیم گوہر... سید نسیم الحسن شاہ... میں کس سے پوچھوں کہ آدھی رات کو تم نے جو ڈیس... ہم سے، اپنوں پرایوں سے، بابل، طلال، فریال اور حمیدہ سے اور خود سے لگایا ہے، اس کی سزا، اس کا جہنم، اس کی اذیت، کس کھاتے میں جائے گی؟ یہ مذاق دردناک بھی ہے... ناقابل برداشت بھی۔ بندے کے

پتر بنو اور گھر چلو... مگر اُس دیوار کے پار اتر جانے والے، دلوں میں اتر بھی جائیں، واپس نہیں لوٹ سکتے:
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

۲۷راگست کی رات ہم سب پریس کلب میں تھے۔ ہم سب مل کر بیگم پروین عاطف کی سیریل ''دروازہ کھلا رکھنا'' کا شو کر رہے تھے اور ہم سب بہت خوش تھے۔ میرے کان میں پوچھنے لگا... ''چہرے پر زیادہ ہی رونق ہے... کیا چکر ہے؟''

''جیسا عشق مجھے احمد بشیر سے ہے ویسا ہی اس کی بہن سے بھی ہے کہ پروین عاطف کھرا بولتی ہے کھرا لکھتی ہے...'' میں نے کہا تو وسیم گوہر ذرا زور سے بولا، ''کلّے کلّے عشق نہ کرنے دوں گا سر جی... میرا حصہ بھی ہے...'' وہ اور میں، ہم واقعی بہت خوش تھے۔ ایک خوشی فنکشن کی کامیابی اور دوسری ایک نئے دوست کی تھی۔

ابوحمزہ مبشر احمد نے انوارالحق خان کا بہ طور خاص تعارف کرایا... تو وہ ہمیں اچھا لگا۔ میں نے کہا اس شخص کی آنکھ میں دوستی کی چھاؤں ہے۔ ''ایگزکٹلی''۔ وہ پھڑک گیا۔ دوسرے دن یعنی ۲۸راگست کو بھی وسیم نے فنکشن کی تصویریں دکھائیں تو انوارالحق کے ساتھ تنہا اپنی تصویر میرے لیے بھی الگ کر دی... طے یوں ہوا کہ تمام تصویروں کے بہت سے پرنٹس بنوائے جائیں گے... میں ۲۸راگست کو ساڑھے پانچ بجے ''سارنگ'' پہنچا تھا۔ ٹیلی فون کا چونگا اس کے ہاتھ میں تھا... میرے داخل ہوتے ہی مخاطب کو بتانے لگا کہ کون آیا ہے اور یہ کہ اب فون بند۔ میرے ہاتھ میں میری تازہ کتاب ''ایک چہرہ یہ بھی ہے'' تھی جو دوست پبلی کیشنز اسلام آباد نے چھاپی تھی اور میں اس کے لیے لایا تھا۔ دوسرے ناشر کی کتاب دیکھ کر بھی وہ بہت خوش تھا۔ کہنے لگا، ''کتاب بھی اچھی ہے اور شائع بھی اچھی ہوئی ہے۔'' گویا وسیم نے سوکن کے حسن کی تعریف کر دی۔ تعریف کرنے میں وہ تنگ نظر نہیں تھا۔ اُس کتاب پر میں نے لکھا... ''اپنے پیارے بھائی، دوست، اداکار، کہانی کار اور اپنے یارگڑ بنّے کے لیے...'' وہ پڑھ کر جھوم اٹھا اور کتاب کو سینے سے لگا کر انگوٹھا چوسنے لگا۔ زیادہ دکھ یا زیادہ خوشی کی پیمائش وہ انگوٹھے کے تھرمامیٹر سے کیا کرتا... وہ اس لیے بھی خوش تھا کہ اس کے علاوہ میں نے وہاں کسی بھی دوسرے کو کتاب نہ دی تھی۔ کیوں کہ چند روز پیش تر وہ گلہ کر رہا تھا... کہ جب سے میں ناشر ہوا ہوں دوستوں نے مجھے کتابیں دینا بند کر دی ہیں۔ میں نے ۲۸راگست کو پروین ملک صاحبہ اور دوسرے دوستوں کی موجودگی میں صرف اُسے کتاب پیش کی تو وہ اور بھی کھل اٹھا۔ پروین ملک نے فوراً گواہ بنتے ہوئے ڈیسک کیلنڈر پر کتاب وصول کرنے کی گواہی اور وقت لکھا کہ وسیم اگر بھول جائے تو اُسے دکھایا جا سکے۔ وقت ''چھ بجنے میں پانچ منٹ'' آج بھی وہاں درج ہے۔

پونے آٹھ بجے تک ہم نے اتنے قہقہے لگائے کہ میرے تو قہقہے ہی ختم ہو گئے مگر وہ ہنستا چلا جا رہا تھا۔ شاید اس کے قہقہے بچ رہے تھے۔ جو اسے اس دنیا میں پورے کرنا تھے... پھر ملک صاحب اور وسیم کو

ڈنر پہ جانا تھا۔ پروین عاطف صاحبہ نے ۲۷ اگست کے شو کی کامیابی پر چند لوگوں کو بلا رکھا تھا۔

میں نکلا تو وہ میرے پیچھے پیچھے اوپر تک آ گیا۔ ایک مرتبہ مجھے ڈنر پر ساتھ جانے کے لیے کہا اور پھر گاڑی تبدیل کرنے کے بارے میں ایک مشورہ کیا اور شگفتہ انداز میں بات لٹکاتا چلا گیا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ''سارنگ'' کو لاک اپ کرنے کے بعد بھی ہم رکے ہوں یا اسی طرح سڑک پر کھڑے کھڑے بات لٹکائی ہو۔ کبھی نہیں۔ ایک مرتبہ میرا بازو پکڑ کر پھر کہا، ''گاڑی کی بات رہ ہی گئی کیا کروں؟'' میں نے یاد دلایا، ''بتایا تو ہے... پرانی بیچ ڈالو اور نئی لے لو، خواہ قسطوں پر۔'' اصل میں اُسے میری تجویز بھا چکی تھی، وہ اس کی تکرار چاہتا تھا۔ فوراً انگوٹھا منھ میں ڈال لینا ہی اس بات کا ثبوت تھا کہ گاڑی کا مسئلہ حل ہو چکا ہے۔

میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے اسے مڑ کر نہیں دیکھا۔ بچھڑتے ہوئے، جہاز پر سوار ہوتے یا گاڑی میں سوار یا اوجھل ہوتے ہوئے دوستوں کے چہرے مجھ سے دیکھے جاتے ہیں نہ برداشت ہوتے ہیں۔ اگر کسی پیارے، کسی رانجھن کا فون بھی آ جائے کہ وہ آج لاہور سے باہر جا رہا ہے پرسوں، ترسوں یا اگلے ہفتے تک آئے گا تو میں اداس ہو جاتا ہوں۔ دل کے اندر بسنے والوں سے کہہ رکھا ہے۔ اطلاع ضرور دو، جانے کی نہیں آنے کی۔ سو میں نے وسیم کو نہیں دیکھا اور تیزی سے ٹی ہاؤس چلا آیا۔ چائے پی، زاہد سراج سے گپ لگائی اور گھر چلا گیا۔

آدھی رات تک کسی شخص نے فون پہ اتنا تنگ کیا کہ مجھے غصہ آ گیا۔ میں فون اٹھاتا... ہیلو کہتا تو وہ یہ جان کر بھی کہ یہ میل وائس ہے کہتا... ''کیسی ہیں آپ؟''

میں نے زور سے کئی مرتبہ کہا، ''یار کیا بکواس ہے۔ سونے دو نا۔''

وہ اطمینان سے کہتا، ''نتاشا جی! غصہ مت کریں، میں شہر میں نہیں تھا۔''

''شرم کرو بھائی...''

اس نے میری بات کاٹی، اطمینان سے بولا، ''ٹھیک ہے، صبح ملاقات ہوگی...'' اس سے پہلے کہ میں چونگا پٹخ دیتا اس کے ساتھیوں کی آواز اور قہقہہ ابل پڑا... ''ہماری بھی بات کراؤ یار...''

میں نے فون بند کر دیا۔ ''عورت کو کہاں کہاں داؤ پر نہیں لگایا جاتا۔ چھچھورے...'' میں غصے میں بڑبڑاتا رہا... دیر تک جاگتا رہا۔ گھنٹی بجتی میں فون اٹھا کر بند کر دیتا۔ تین چار مرتبہ کے بعد سوچا کہ انگیج کر دوں... مگر پھر پتا نہیں کیوں، نہیں کیا۔ پھر آنکھ لگ گئی۔ اور مجھے یوں لگا کہ میرے خواب میں گھنٹیاں بج رہی ہیں... مسلسل... مجھے ہوش آنے لگا پوری طرح جاگ گیا تو سارے واقعات ذہن میں پلٹ آئے۔ وقت دیکھا... ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ غصے سے چونگا اٹھایا اور چاہتا تھا کہ ابل پڑوں کہ پروین ملک کی آواز سے دہل گیا۔ اس لیے کہ زندگی میں پروین ملک کا یہ پہلا فون تھا جو گھر پہ صبح ساڑھے پانچ بجے مل رہا تھا۔ میں نے چیخ کر کہا، ''ملک صاحب کوئی بری خبر نہ سنانا۔''

پروین رو دی، ''اچھی خبر کہاں سے لاؤں؟'' اس نے کہا۔

میں شاید چیخنے لگا تھا۔ ''نہیں.. نہیں.. نو...'' میرا خیال تھا اسے ہارٹ اٹیک پھر ہو گیا ہے۔ میری چیخ سے نرگس نے چونگا میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ ''آپ کون ہیں، کیا کہہ دیا ہے؟'' وہ بھی چیخی پھر اس نے نابرابر سانس سے جواب سنا اور سسک پڑی۔

میں نے نم آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں اور مجسّم سوال بن کر اس کی طرف دیکھا، اس کے لب نہ ہلے مگر آواز آ گئی۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون''

جب جنازہ اٹھا... تو میں نے اپنی روایت کے مطابق اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ میں دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔ پھر جب اُسے قبر میں اتار دیا گیا تو سب نے آوازیں دیں... ''تین مٹھیاں، تین مٹھیاں وہ جو ایک ذرّہ اپنے کپڑوں پر برداشت نہ کرتا تھا... میں نے اُسے اپنے ہاتھوں سے مٹی دی۔ تین مٹھیاں اور مجھے امیر مینائی یاد آئے۔ اور یہ شعر اندر سے ابل کر جیسے سامنے آ گیا:

لاش پر عبرت یہ کہتی تھی امیر
آئے تھے دنیا میں اس دن کے لیے!

☆☆☆

محمد حسن عسکری ایک مطالعہ

محمد حسن عسکری

ازمنۂ وسطیٰ کا تصور☆

یورپ کے لوگ اپنی تہذیب کی تاریخ یونانیوں سے شروع کرتے ہیں۔ یونانیوں کے بعد رومیوں کا دور آتا ہے۔ ان دو تہذیبوں کو یورپ والے اپنی تہذیب کی بنیاد سمجھتے ہیں۔اس لیے انھیں ''کلاسکی'' (Classical) دور کہا جاتا ہے۔

جب جنوبی یورپ کے لوگ عیسائی ہوگئے تو روم کی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک علاقے کا مرکز تو بہ ذات خود روم تھا۔ دوسری مشرقی سلطنت تھی جسے ''بازنطینی سلطنت'' (Byzantine Empire) کہا جاتا ہے۔ یہ سلطنت یونان اور قرب و جوار کے علاقوں پر مشتمل تھی اور اس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ تھا۔ قرآن شریف میں جس ''روم'' کا ذکر آیا ہے اُس سے مراد بازنطینی سلطنت ہی ہے اور عرب اسی علاقے کو ''روم'' کہتے تھے... یعنی جہاں آج کل ترکی واقع ہے۔

ضروری تاریخیں یوں ہیں... قدیم یونان کی تاریخ دو ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ عموماً پانچویں صدی قبل مسیح کو یونان کا زریں دور سمجھا جاتا ہے۔ یہ سقراط کا زمانہ ہے لیکن اس صدی کے آخر سے خانہ جنگیوں کی وجہ سے یونان کا زوال شروع ہوگیا۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندر اعظم نے اپنی سلطنت قائم کی جو زیادہ دن نہ چل سکی۔ سقراط کے شاگرد افلاطون اور پھر اُس کے شاگرد ارسطو کے دور

☆۔ اس مضمون کی بابت وثوق سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے لکھتے ہوئے عسکری صاحب کے پیشِ نظر ادب اور نقدِ ادب کے عام قارئین تھے یا وہ لوگ جو مغربی ادب اور فلسفے کے سیاق و سباق سے واقفیت نہیں رکھتے۔ ممکن ہے کہ یہ مضمون عسکری صاحب نے اپنے تلامذہ یا دینی مدارس کے طلبہ کے لیے لکھا ہو۔ اس لیے کہ اُن کے بعض قریبی احباب روایت کرتے ہیں کہ زندگی کے آخری چند برسوں میں اُن کے بعض مقالات اسی مقصد اور ضرورت کے پیشِ نظر معرضِ تحریر میں آئے تھے۔ علاوہ ازیں اسی حوالے سے انھوں نے فرانسیسی سے انگریزی میں کچھ ترجمے بھی کیے تھے۔ تاہم ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس کی بنیاد پر یہ طے کیا جا سکے کہ زیرِ نظر مضمون فلاں زمانے میں لکھا گیا تھا۔ گو کہ اس مضمون کے اختتام پر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بات کو ابھی جاری رہنا تھا لیکن مضمون جہاں رکا سو پھر وہاں سے آگے نہ بڑھ سکا، سبب نہ معلوم۔ اس کے باوجود اپنے مواد اور اسلوب کے اعتبار سے یہ مضمون بھی اسی طرح توجہ کا طالب ہے جیسے عسکری صاحب کی دوسری تحریریں۔ (ادارہ)

سے انحطاطی دور کا آغاز ہوگیا تھا۔ دوسری صدی قبل مسیح میں روم نے یونان پر قبضہ کرلیا۔

روم کا عروج پانچویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے اور رومی سلطنت سنہ ۳۰ قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ اگلے دو تین سو سال روم کا زرّیں دور ہیں۔ شہنشاہ قسطنطین (Constentine) ۳۲۴ء میں اپنا دارالخلافہ روم سے اٹھا کر بازنطین لے گیا اور اس شہر کا نام قسطنطنیہ رکھا۔

۳۹۵ء میں یہ سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی، ایک تو مشرقی یا بازنطینی سلطنت اور دوسری مغربی سلطنت جس کا مرکز روم تھا۔

اس طرح قدیم یونان کے علاقے میں بازنطینی سلطنت قائم ہوئی، جس کی ایک الگ تہذیب ہے۔ اس سلطنت کے باقی یورپ سے اختلافات بڑھتے ہی گئے اور اس علاقے کا ایک الگ کلیسا Eastern Orthodox Church کے نام سے قائم ہوگیا۔ مذہبی اختلافات نے اتنی شدت اختیار کی کہ چوتھی صلیبی جنگ ۱۲۰۴ء میں بازنطین ہی کے خلاف ہوئی۔ اس علاقے کو ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے فتح کرلیا۔

جس زمانے میں بازنطینی سلطنت ترقی کر رہی تھی، روم کی سلطنت زوال پذیر تھی۔ پانچویں صدی میں وحشی قبائل گوتھ (Goths) اور وینڈال (Vandals) نے روم کو برباد کر دیا اور ۴۷۶ء میں یہاں کے آخری شہنشاہ کو تخت سے اُتار دیا۔

''ازمنۂ وسطیٰ'' کو ۴۷۶ء سے شروع کیا جاتا ہے۔

(یہ ساری تاریخی تفصیلات The Penguin Encyclopaedia, 1965 سے لی گئی ہیں)

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ ''نشاۃ ثانیہ'' کی تحریک ۱۴۵۳ء سے شروع ہوئی اور یہی دور جدید کا نقطۂ آغاز ہے۔

چناں چہ ۴۷۶ء سے لے کر ۱۴۵۳ء کے درمیانی زمانے کو ''ازمنۂ وسطیٰ'' کہا جاتا ہے۔ اس اصطلاح میں بھی تعصب جھلکتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تہذیب کا ایک دور تو یونان اور روم کی ''کلاسیکی تہذیب'' کا ہے اور دوسرا دور جدید تہذیب کا ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو زمانہ ہے وہ گویا ایک وقفہ یا تہذیبی خلا ہے۔ بیسویں صدی سے پہلے عام طور سے لوگوں کا یہی خیال تھا اور ازمنۂ وسطیٰ کو ''ظلماتی دور'' (Dark Ages) کہا جاتا تھا لیکن اب تک جو تحقیق ہوئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دور کی تہذیب نہایت شان دار تھی اور یونان و روم کی تہذیب سے اس کا علاقہ ختم نہیں ہوا تھا۔ اب ''ظلماتی دور'' کی اصطلاح تقریباً ترک کر دی گئی ہے، زیادہ سے زیادہ اس کا اطلاق روم کی سلطنت کے خاتمے (۴۷۶ء) سے لے کر فرانس کے بادشاہ شارلیمن (Charlemagne) کی تخت نشینی (۷۶۸ء) تک کے درمیانی زمانے میں ہوتا ہے اور اس کا مطلب صرف یہ لیا جاتا ہے کہ اس دور کے بارے میں معلومات کم حاصل ہیں۔ اب یہ بات تسلیم نہیں کی جاتی کہ تہذیبی تسلسل منقطع ہوگیا تھا۔

اس سلسلے میں جو تحقیقات ہوئی ہیں اُن کا خلاصہ Penguin Encyclopaedia میں "ظلماتی دور" (Dark Ages) کے عنوان کے ماتحت صفحہ نمبر ۱۲۶ پر یوں پیش کیا گیا ہے:

> Roughly the period of European history from the fall of the Western Empire in 476 A.D. until the rise of Charlemagne in 768 A.D. An imprecise term, now largely fallen into disfavour, since while it correctly implies that little is known about the period, it suggests a break in the continuity of European civilization which in fact did not occur.

ازمنۂ وسطیٰ کی شاعری کے متعلق فرانسیسی میں ایک کتاب "Les Troubadours" کے نام سے آں ری داواں سون (Henri Davenson) نے ۱۹۶۱ء میں لکھی ہے۔ اس نے تو صفحہ نمبر ۲۰ پر یہاں تک کہا ہے کہ "ازمنۂ وسطیٰ کی ظلمت کا ذکر تیقن کے ساتھ کرنے کے لیے نہ صرف جہالت بلکہ اندھا پن بھی درکار ہے۔" اصلی فرانسیسی عبارت درج ذیل ہے:

> It fallait etre, je ne dispas ignorant, mais avengle... pour parler once assurance des tenebres du Mayen Age.

اسی طرح "نشاۃِ ثانیہ" کی اصطلاح میں بھی ذہنی تعصب صاف ظاہر ہے اور اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ علم و ادب مر گیا تھا، اب دوبارہ پیدا ہوا ہے۔ پندرھویں اور سولھویں صدی میں بھی بعض لوگوں کو شدید احساس تھا کہ ہم ایک نئی دنیا میں زندہ ہیں مگر پورے دور کے لیے یہ اصطلاح انیسویں صدی میں استعمال ہوئی ہے۔ Dictionary of French Literature میں جسے ۱۹۵۸ء میں امریکا کے ناشر Philosophical Liberery نے شائع کیا ہے۔ اس میں نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے عنوان کے ماتحت یہ تصریحات دی گئی ہیں: پندرھویں اور سولھویں صدی میں بھی بعض لوگوں نے "نشاۃِ ثانیہ" اور "احیا" کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اس کا اطلاق پورے دور پر نہیں ہوتا تھا، مثلاً ۱۵۲۲ء میں فرانس کے عالم بودے (Bude) نے علم و ادب کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance of Letters) کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس پورے دور کو ایک الگ تہذیب اور معاشرہ سمجھ کر اس اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے فرانس کے مؤرخ میشلے (Michelet) نے ۱۸۵۵ء میں کیا، پھر اسے مقبولیت دی جرمنی کے مؤرخ اور مفکر جیکب بورک ہارٹ (Jacob Burckhardt) نے جس کی "تاریخ نشاۃِ ثانیہ" ۱۸۶۰ء میں شائع ہوئی۔ لیکن جدید تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ اور نشاۃِ ثانیہ کے درمیان ایک منطقی تسلسل ہے اور جس زمانے کو نشاۃِ ثانیہ کہا جاتا ہے اُس سے پہلے بھی کئی دفعہ نشاۃِ ثانیہ کا واقعہ پیش آ چکا ہے۔ جن مؤرخوں نے یہ نیا تصور پیش کیا ہے اُن میں نمایاں کام ان مصنفین کا ہے... Burdach, Thode, Hoskins, Huizinga (یہاں Dictionary of French Literature کا بیان ختم ہوا)۔

ان نئی تحقیقات کا اثر یہ ہوا کہ اب تو بعض لوگ ''ازمنۂ وسطیٰ'' کی اصطلاح کو ہی بے معنی سمجھنے لگے ہیں۔ چناں چہ "Middle Ages" یا "Medieval Ages" کا عنوان ہی نہ تو Dictionary of French Literature میں قائم کیا گیا ہے نہ Penguin Encyclopaedia میں۔

اب یہ بیان ہوتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے خلاف تعصب کیسے پیدا ہوا اور اس کے خلاف ردِّ عمل کس طرح ہوا؟

کہا جاتا ہے کہ نشاۃِ ثانیہ کے زمانے میں یونانیوں کے علم و ادب کا احیا ہوا۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ بازنطینی سلطنت کی سیاسی اور مذہبی جنگ مغربی ممالک سے چلتی رہتی تھی اس لیے دونوں علاقوں کے درمیان تہذیبی رشتہ بڑی حد تک منقطع ہوگیا۔ یونانی کتابیں زیادہ تر قسطنطنیہ میں تھیں۔ ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کیا تو یونانی اپنی کتابیں لے کر وہاں سے بھاگے اور اٹلی پہنچے۔ اس طرح بہت سی یونانی کتابیں مغرب کے لوگوں نے پہلی دفعہ پڑھیں۔ لیکن ''احیائے علوم'' کا اصل مطلب یہ ہے کہ اس دور کے عالم جنھیں ''انسان پرست'' (Humanists) کہا جاتا ہے، یہ دعویٰ کرنے لگے کہ یونانی علوم عیسوی الٰہیات پر فوقیت رکھتے ہیں، چناں چہ وہ دینی علوم سے آزادی کے خواست گار تھے۔ سولھویں صدی کے آغاز میں مارٹن لوتھر نے ''اصلاحِ دین'' کی تحریک (Reformation) شروع کی تو پرانے رومن کیتھلک عالموں یعنی ازمنۂ وسطیٰ کے عالموں کو تنگ نظری، جہالت وغیرہ کا الزام دیا جانے لگا۔ چناں چہ سولھویں صدی میں بعض مصنف پرانے زمانے کو "Gothic Night" کہنے لگے۔ یہ Gothic کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا کہ گوتھ نسل کے وحشی قبائل نے روم کی سلطنت کو برباد کیا تھا۔ حالاں کہ یہ لوگ عیسائی ہوگئے اور انھوں نے مغربی تہذیب میں بڑے اضافے کیے، خصوصاً تعمیرات میں، لیکن لفظ Gothic وحشت اور بربریت کے مترادف بن گیا اور اس کا اطلاق پورے ہزار سال کے دور پر کر دیا گیا۔

سترھویں صدی کے وسط میں ''عقلیت پرستی'' کی تحریک شروع ہوئی تو ازمنۂ وسطیٰ کو اور بھی زیادہ مطعون کیا جانے لگا۔ اب دو باتوں پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔ ایک تو یہ کہ کلیسا نے اور پادریوں نے فکر کے دروازے بالکل بند کر دیے تھے اور مذہب کے نام پر عوام کو لوٹتے کھسوٹتے رہتے تھے، دوسرے یہ کہ جاگیرداروں اور نوابوں نے جبر و تشدد کا نظام قائم کر رکھا تھا اور کسانوں کی حیثیت جانوروں کی بنا دی تھی۔

ازمنۂ وسطیٰ کے اس تصور کو مقبول کرنے میں بہت بڑا ہاتھ اٹھارویں صدی کے فرانس کے مفکر اور ادیب والٹیئر (Voltaire) کا ہے۔ یہی کام انگلستان میں اٹھارویں صدی کے مؤرخ گبن (Gibbon) کی کتاب The Decline and Fall of the Roman Empire کا ہے۔ اٹھارویں صدی تک

ازمنۂ وسطیٰ کا جو تصور ذہنوں میں قائم ہوگیا تھا اُس کا خلاصہ انگریز شاعر پوپ (Pope) کی اس لائن میں ملتا ہے:

The Monks finished what the Goths begun

(جو کام گوتھ لوگوں نے شروع کیا تھا اُسے راہبوں نے تکمیل تک پہنچا دیا۔)

لیکن اٹھارویں صدی کے شروع ہی میں ایک دوسرا نقطۂ نظر پیدا ہونے لگا۔ جرمنی کے بعض ادیبوں نے بھوتوں اور جادوگروں کے متعلق داستانیں لکھیں جن کا پس منظر ازمنۂ وسطیٰ ہوتا تھا۔ ان ہیبت ناک داستانوں کو Horror Novels کہتے ہیں۔ یہ داستانیں سارے یورپ میں اتنی مقبول ہوئیں کہ لوگ ازمنۂ وسطیٰ کو دل کش اور پُراسرار زمانہ سمجھنے لگے۔ اسی طرح لفظ "Gothic" اور "Romantic" کا مفہوم بھی بدلنے لگا اور اس کا مطلب اٹھارویں صدی کے وسط سے ہی دل کش، حسین اور پُراسرار چیز کا سمجھا جانے لگا۔

پھر اٹھارویں صدی کے دوسرے حصے میں جرمنی کے مؤرّخوں، ادیبوں اور مفکروں نے ازمنۂ وسطیٰ کی تعریف سیاسی وجوہ سے شروع کر دی۔ ازمنۂ وسطیٰ میں جرمنی بہت بڑی سیاسی اور فوجی طاقت تھا لیکن بعد میں چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں میں بٹ کر کم زور ہوگیا تھا۔ اب قومی وحدت کا خیال پیدا ہوا تو جرمنوں نے اپنے ماضی کی قصیدہ خوانی شروع کر دی۔ چناں چہ وہاں شعر و ادب میں رومانی تحریک (Romanticism) پیدا ہوئی جو اٹھارویں صدی کے آخری پچیس سال میں انگلستان پہنچ گئی اور انیسویں صدی کے پہلے تیس سال تک مغربی ادب پر حاوی رہی۔ یہ ''رومانی'' شاعر اور ادیب ازمنۂ وسطیٰ کو پریوں کی سرزمین یا خواب کی حسین دنیا بنا کر پیش کرتے تھے (بیسویں صدی میں جرمن مصنف Beers نے کئی جلدوں میں رومانی تحریک کی تاریخ لکھی ہے جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ تحریک دراصل ازمنۂ وسطیٰ کا احیا ہے۔ اس ساری بحث کا خلاصہ انگریز نقاد F.L.Lucas کی کتاب The Decline and Fall of the Romantic Ideal میں ملتا ہے)۔

انیسویں صدی میں جہاں تک عام لوگوں کا تعلق ہے، ازمنۂ وسطیٰ کا پرانا تصور اور یہ ''رومانی'' تصور دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ان دونوں کو ملا کر یہ تصویر بنتی ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ ''ظلماتی دور'' تو ضرور تھا لیکن اُس زمانے کی زندگی بڑی شاعرانہ تھی۔

مگر جہاں تک مفکرین اور ادیبوں کا تعلق ہے اُنھوں نے ازمنۂ وسطیٰ کو سمجھنے میں ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ سائنس یا مذہب کے معاملے میں تو ازمنۂ وسطیٰ کو ظلماتی دور کہنا آسان تھا کیوں کہ یہاں مذہبی تعصبات کام کر رہے تھے لیکن تہذیبی معاملات میں مشکل یہ تھی کہ آخر اُس زمانے کی عمارتیں، خصوصاً گرجا باقی تھے اور پرانے ادیبوں میں سے کم سے کم ڈانٹے کا کلام زندہ تھا جو ازمنۂ وسطیٰ کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس لیے انیسویں صدی میں ازمنۂ وسطیٰ کے فنِ تعمیرات اور مصوّری کو بھی ایک بڑا کارنامہ خیال

کیا جانے لگا۔ اس ضمن میں انگلستان کی حد تک رسکن (Ruskin) اور ولیم مورس (William Morris) نے بڑا کام کیا۔ چناں چہ انگلستان میں گوتھک انداز کی عمارتیں بننے لگیں۔ ''غدر'' ۱۸۵۷ء کے بعد سے انگریزوں نے ہمارے یہاں بھی اس طرز کی عمارتیں بنائیں جو ابھی تک موجود ہیں۔ خصوصاً مورس نے اس بات پر بہت زور دیا کہ ازمنۂ وسطیٰ کے کاری گروں نے صنعت کا جو معیار قائم کیا تھا، صنعتی دور میں بالکل غائب ہوگیا۔

ان مصنفوں میں خامی یہ تھی کہ ازمنۂ وسطیٰ کی تہذیب کی تو تعریف کرتے تھے، لیکن اس زمانے کی الٰہیات کو قابلِ اعتنا نہ سمجھتے تھے۔ تاہم انیسویں صدی میں ہی ایک بڑے انگریز مفکر Newman نے یہ پہلو بھی پیش کیا۔

انیسویں صدی ''صنعتی انقلاب'' کا دور ہے۔ اسی زمانے میں سرمایہ دار اور مزدور کے جھگڑے شروع ہوئے اور معاشرتی انتشار پھیلا۔ ان حالات پر غور کرتے ہوئے بعض مفکر صنعتی نظام سے ازمنۂ وسطیٰ کے معاشی اور معاشرتی نظام کا بھی موازنہ کرنے لگے اور انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اس زمانے میں معاشی اور معاشرتی نظام کی بنیاد اخلاقیات پر تھی اور انسانی رشتوں کا پورا احترام ہوتا تھا۔ اس نقطۂ نظر کی نمایاں مثال کارلائل (Carlyle) کی کتاب ''ماضی اور حال'' (Past and Present، مطبوعہ ۱۸۴۳ء) ہے۔

فرانس چوں کہ رومن کیتھلک ملک ہے، اس لیے وہاں تو انیسویں صدی کے ادب میں مذہبی نقطۂ نظر آسانی سے نمایاں ہونے لگا اور مشہور شاعر بودلیئر Baudelaire کے زیرِ اثر یہ رومن کیتھلک عقیدہ پیش کیا جانے لگا کہ انسان کی فطرت معصوم نہیں بلکہ گناہِ آدم میں گرفتار ہے۔ اس رجحان کے ماتحت ازمنۂ وسطیٰ کی دینیات کے لیے راستہ ہموار ہونے لگا۔

ازمنۂ وسطیٰ کے معاشی نظام خصوصاً پنچایتی نظام (Guild System) کے متعلق بھی تحقیق ہونے لگی، خود کمیونزم کے بانی کارل مارکس نے اس کی تعریف کی۔ اوّل تو ''تاریخ کے مادّی نظریے'' کی رُو سے بھی ہر نظام ایک خاص دور میں ''ترقی پسندانہ'' ہوتا ہے۔ چناں چہ مارکس یہ تو کہتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کا معاشی اور معاشرتی نظام اس زمانے کے لیے ترقی پسندانہ تھا لیکن ازمنۂ وسطیٰ اور سرمایہ دارانہ نظام کا موازنہ کرتے ہوئے وہ بھی اس بات پر زور دیتا ہے کہ ظلم و ستم کے باوجود جاگیردارانہ نظام میں انسانی رشتوں کا بڑا احترام تھا، جو سرمایہ دارانہ دور میں ختم ہوگیا۔

بیسویں صدی میں ازمنۂ وسطیٰ کے معاشی اور معاشرتی نظام پر تفصیلی تحقیقات ہوئی ہیں۔ انگریز مؤرخ خاتون آئیلین پاور (Eileen Power) نے تو ازمنۂ وسطیٰ میں انگلستان کے عام آدمی کی زندگی کے بارے میں ذرا ذرا سی تفصیلات فراہم کر دی ہیں۔ اس نئی تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ جاگیرداروں کا ظلم و ستم حقیقت تو ضرور ہے لیکن اس سلسلے میں افسانہ طرازی بہت کی گئی ہے اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ

ازمنۂ وسطیٰ کا پورا معاشرتی نظام واضح اصولوں پر قائم تھا جو مذہب سے اخذ کیے گئے تھے۔

چناں چہ بیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں اشتراکیوں کی ایک جماعت نے انگلستان میں یہی منصوبہ پیش کیا تھا کہ معاشرتی اور معاشی نظام کو ازمنۂ وسطیٰ کے پنچایتی نظام کے نمونے پر ترتیب دیا جائے۔ اس نظریے کا نام ''پنچایتی اشتراکیت'' (Guild Socialism) ہے اور اس جماعت کا سربرآوردہ نمائندہ کول (G.D.H.Cole) ہے۔

کلیسا اور پادریوں کی آمریت، لُوٹ کھسوٹ اور تنگ نظری کے متعلق جو افسانے مشہور تھے وہ بھی مبالغہ آرائی پر مبنی ہیں۔ اس سلسلے میں بھی کافی تحقیق ہوئی ہے۔ فرانس کے ماہر الٰہیات ژاک ماری تیں (Jaques Maritain) نے ایک کتاب میں پوپ کے فرامین اور ایسی دستاویزیں فراہم کر دی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں پوپ اپنی خرابیوں کے باوجود عوام کے حقوق کی نگہداشت کرتے رہے اور بادشاہوں کو آمریت سے روکتے رہے۔ فرانسیسی میں اس کتاب کا نام "Primante du Spirituel" ہے اور اس کا ترجمہ انگریزی میں J.F.Scanlan نے ۱۹۳۰ء میں "The Things That Are Not Caesar's" کے نام سے کیا ہے اور Sheed & Ward نے شائع کیا ہے۔

علاوہ ازیں، انگریزی مصنف ٹونی R.H. Touney نے اپنی مشہور کتاب ''مذہب اور سرمایہ داری کا آغاز'' (Religion and The Rise of Capitalism) میں پوری شہادتیں فراہم کی ہیں کہ سرمایہ داری کے ابتدائی دور میں کلیسا نے سرمایہ داری کی خرابیوں کی روک تھام کرنے کی کیا کوششیں کیں؟

بیسویں صدی میں ازمنۂ وسطیٰ کی الٰہیات اور فلسفے پر بھی بہت کام ہوا ہے جس سے اُس دور کے مفکرین کی بالغ نظری اور وسعت اور گہرائی نمایاں ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے مشہور کتابیں فرانس کے دو مصنفوں ژاک ماری تیں (Jaques Maritain) اور اے تی این ژل سوں (Etienne Gilson) کی ہیں۔ انگلستان میں ازمنۂ وسطیٰ کے فلسفے، دینیات اور ادب پر نمایاں تحقیق سی ایس لوئس (C.S. Lewis) نے کی ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کا پرانا تصور بدلنے میں سب سے بڑا حصہ ادیبوں اور شاعروں اور ادبی نقادوں کا ہے۔ چوں کہ ازمنۂ وسطیٰ کے بعض شاعروں کا کلام لوگ برابر پڑھتے چلے آئے تھے اس لیے لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ ایسے اچھے شاعر خلا میں تو پیدا ہو نہیں سکتے، آخر ان سے پہلے بھی کچھ معقول شاعر ہوئے ہوں گے۔ اس تحریک کے ماتحت لوگوں نے انیسویں صدی کے وسط میں ہی پرانے ادب کی تفتیش شروع کر دی تھی۔ اس سلسلے میں سب سے گراں قدر کام انیسویں صدی کے آخری حصے اور بیسویں صدی کے شروع میں فرانس کے عالم گاستوں پاری (Gaston Paris) اور انگلستان کے ڈبلیو پی کر (W.P. Ker) نے سرانجام دیا ہے۔ Ker کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ ادب میں ظلمانی دور کوئی نہیں ہے۔ ان

محققوں نے روم کے خاتمے سے لے کر نشاۃ ثانیہ تک مغربی تہذیب کا تسلسل پوری طرح ثابت کر دیا بلکہ یہ بھی دکھا دیا کہ ازمنۂ وسطیٰ کا ادب نہایت لطیف اور شائستہ ہے۔ انھیں تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض لوگ تو اب یہ کہنے لگے ہیں کہ "ازمنۂ وسطیٰ" کی اصطلاح ہی غلط اور بے معنی ہے۔

بیسویں صدی کے مغربی ادیبوں نے ازمنۂ وسطیٰ کے ادب اور تہذیب کی طرف نہ صرف خاص توجہ کی ہے بلکہ شعوری طور پر اُس زمانے کی شاعری کا تتبع کیا ہے، مثلاً انگریزی زبان کا مشہور شاعر ایذرا پاؤنڈ...(Ezra Pound)۔ اسی طرح جیمز جوئس (James Joyce) جس کا شمار اس صدی کے سب سے بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے، یہ دعویٰ کرتا تھا کہ اُس نے اپنے بنیادی ادبی اصول سینٹ ٹامس اکوائناس (Aquinas) سے اخذ کیے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بیسویں صدی میں مذہب کا احیا ہو رہا ہے، دکھانا صرف یہ مقصود ہے کہ آج کل ازمنۂ وسطیٰ کے متعلق رویہ کیا ہے؟ ورنہ دراصل ایسے ادیب اور مفکر جدید خیالات کو ازمنۂ وسطیٰ کے سر منڈھتے ہیں۔

ازمنۂ وسطیٰ کے متعلق رویے میں ایسا انقلاب آیا ہے کہ آج کل جو سنجیدہ اور علمی کتابیں لکھی جا رہی ہیں اُن میں تو یہ سراغ لگانا بھی مشکل ہے کہ ایک زمانے میں اس دور کو "ظلماتی دور" بھی کہا جاتا تھا بلکہ اب تو بعض مصنف ایسے ہیں جو شکایت کرتے ہیں کہ ازمنۂ وسطیٰ کی تہذیب اور فکر کو لوگ اتنا منضبط اور مرتکز بتانے لگے ہیں جتنا وہ اصل میں نہیں تھا۔ اس کے برخلاف یہ لوگ ازمنۂ وسطیٰ میں افکار کی کش مکش اور تضاد ڈھونڈتے ہیں یعنی ازمنۂ وسطیٰ کو بالکل بیسویں صدی بنائے دے رہے ہیں۔ اس رجحان کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں، ایک تو فرانسیسی مصنف پال وی نیو (Paul Vignaux) جس کی کتاب کا انگریزی ترجمہ ۱۹۵۹ء میں "Philosophy in The Middle Ages" کے نام سے شائع ہوا ہے، دوسرے انگریز مصنف گورڈن لیف (Gordon Leff) جس کی کتاب "Medieval Thought" ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کی "بحالی" کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ آج کل مغرب کے بعض مفکر یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ مغرب نے جتنی مادّی ترقی کی اور سائنس میں جو انقلاب برپا کیا ہے وہ براہ راست عیسائیت کا فیضان ہے اور اس ترقی کا سلسلہ ازمنۂ وسطیٰ کے دوران بھی جاری رہا ہے، مثلاً سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا اور فرانسیسی میں لکھنے والا ایک مصنف ہے دنی دَروژمون (Denis de Rougemant)، اُس نے ایک ضخیم کتاب اس موضوع پر لکھی ہے۔ یہ شخص اسلام کا بھی سخت دشمن ہے اور کہتا ہے کہ اسلام سائنس اور انسان کی ترقی کا شروع سے مخالف رہا ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کو آج کل جو قبول کیا جا رہا ہے اس کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ پہلے تو جدیدیت نے ازمنۂ وسطیٰ کی ایک غلط تصویر پیش کی اور اسے طرح طرح سے بدنام کیا۔ اس حربے کو استعمال کیے بغیر جدیدیت جڑ نہیں پکڑ سکتی تھی لیکن اب جدیدیت فتح مند ہو چکی ہے اور ازمنۂ وسطیٰ کے مذہبی تصورات

سے نہیں ڈرتی۔ اس لیے ازمنۂ وسطی کی تعریف کرنے میں فیاضی سے کام لے رہی ہے بلکہ ازمنۂ وسطی کو بھی اپنے اندر مدغم کرنا چاہتی ہے تاکہ پرانے مذہبی تصورات کا نام ہی مٹ جائے۔

لیکن اس پرانے حربے کو بھی جدیدیت نے پوری طرح ترک نہیں کیا۔ بچوں کے لیے یا عام لوگوں کے لیے جو معلوماتی کتابیں لکھی جاتی ہیں اُن میں ازمنۂ وسطی کی وہ پرانی تصویر ابھی تک چلی آ رہی ہے، پھر مشرقی ممالک میں یہ حربہ اب بھی بہت اچھا کام دے رہا ہے جیسے ہمارے یہاں علما کو یہ الزام دیا جاتا ہے کہ اُن کی ذہنیت ازمنۂ وسطی کی ہے یا یہ کہا جاتا ہے کہ علما نے بھی پاپائیت قائم کرلی ہے۔ اس قسم کے الزامات مستشرقین کی طرف سے آج بھی لگائے جا رہے ہیں... یا تو یہ لوگ جاہل ہیں اور ازمنۂ وسطی کے متعلق جو تحقیقی کام ہوا ہے اُس سے بے خبر ہیں یا جان بوجھ کر مسلمانوں میں گم راہی پھیلانے کے لیے ایسی حرکت کرتے ہیں۔

ازمنۂ وسطی کے متعلق جو تحقیقی کام بیسویں صدی میں ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے اُس کا ایک خوش گوار پہلو بھی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک تو یہی کہا جاتا تھا کہ عربوں نے یونانیوں کے علوم کو زندہ رکھا اور مغرب تک پہنچایا۔ عربوں کا کام بس اتنا ہی بتایا جاتا تھا لیکن نئی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ازمنۂ وسطی کی مغربی تہذیب کا ہر گوشہ عربوں کا مرہونِ منت ہے۔ اس سلسلے میں اسپین کے عالم Mignet Asin Palacios نے نمایاں کام کیا ہے۔ انھوں نے ایک کتاب تو مغربی افکار پر ابنِ رُشد کے اثرات کے متعلق لکھی ہے، دوسری کتاب حضرت ابنِ عربیؒ کے بارے میں لکھی ہے جس میں یہ کہا ہے کہ حضرت ابنِ عربیؒ نے اسلام کو عیسایت کا رنگ دے دیا۔ یہ تو خیر مہمل بات ہے لیکن ۱۹۲۶ء کے قریب انھوں نے ایک کتاب Islam and The Divine Comedy کے نام سے لکھی ہے جس میں پورے شرح و بسط کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ ازمنۂ وسطی کے سب سے بڑے شاعر اور ادب کے دائرے میں عیسائیت کے سب سے بڑے نمائندے ڈانٹے (Dante) نے اپنی نظم (Divine Comedy) کا سارا نقشہ "فتوحاتِ مکیہ" سے لیا ہے۔ اس مسئلے پر جتنی بحث بعد میں ہوئی اُس کا خلاصہ انھوں نے ۱۹۴۳ء میں ایک کتاب میں پیش کر دیا ہے جس کا ترجمہ ابھی انگریزی میں نہیں ہوا۔ کتاب کا اسپینی نام یہ ہے:

La Escatologia musulmana en la Divina Comedia. segnida de la historia y critica de una polemica.

ڈانٹے پر حضرت ابنِ عربیؒ کے اثر کا مسئلہ اب عموماً تسلیم کر لیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں، گیارھویں اور بارھویں صدی کی مغربی شاعری پر عربی شاعری کے اثرات کا بھی وسیع مطالعہ ہو چکا ہے۔ اس تحقیق سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعری، موسیقی، طرزِ تعمیر، رسم و رواج ہر معاملے میں ازمنۂ وسطی کے مغربی لوگ عربوں کے شاگرد رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک کتاب انگریزی

زبان میں بھی موجود ہے:

Hispano- Arabic Poetry and its Relations with the Old Provensal Troubadours.

مصنف کا نام ہے H.R.Nykl، یہ کتاب ۱۹۴۶ء میں امریکا سے شائع ہوئی ہے۔

اور بھی تازہ تر تحقیق یہ ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں مغرب کے لوگ عربوں سے تصوف کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک فرانسیسی مصنف پیئر پوں سوا(Pierre Pousoye) کی کتاب "L' Islam et be Graal" (۱۹۵۷ء) خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اب تک تو یہی سمجھا جاتا تھا کہ مغربی تہذیب پر عربوں کا اثر گیارھویں صدی عیسوی سے ظاہر ہوا لیکن انگریز شاعر رابرٹ گریوز (Robert Graves) کے بیان کے مطابق یہ اثر نویں صدی عیسوی سے شروع ہوگیا تھا اور آئرلینڈ تک جا پہنچا تھا۔

☆☆☆

شودرلو دِلاکلو/ محمد حسن عسکری

مخدوش رابطے

عرضِ ناشر☆[1]

قارئین کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ کتاب کے نام اور مرتب نے دیباچے میں جو کچھ کہا ہے اس کے باوجود ہم اس بات کا ذمہ نہیں لیتے کہ اس مجموعے میں جو خط شامل ہیں وہ اصلی ہیں بلکہ ہم تو یہ سمجھنے میں حق بہ جانب ہیں کہ یہ کتاب محض ایک ناول ہے۔

علاوہ ازیں ہمارا خیال ہے کہ مصنف نے حقیقت کا رنگ پیدا کرنے کی فکر میں خود ہی حقیقت کو بڑے بے ڈھنگے پن سے ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ کیوں کہ جن واقعات کو الم نشرح کیا ہے اُن کے لیے زمانہ بالکل غلط چھانٹا ہے۔ مصنف نے جو کردار پیش کیے ہیں اُن میں سے بعض کا اخلاق تو اتنا گھناؤنا ہے کہ یہ بات قیاس میں آ ہی نہیں سکتی کہ ہماری صدی میں ایسے لوگ بھی ہوں گے۔ یہ زمانہ تو فلسفے کا ہے۔ عقل کی روشنی ہر طرف پھیل چکی ہے اور جیسا ہر شخص کو معلوم ہے، مرد نیک اور شریف بن گئے ہیں، عورتیں باحیا اور محتاط ہوگئی ہیں۔

چناں چہ ہماری رائے تو یہ ہے کہ اس کتاب میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں اگر اُن میں تھوڑی بہت صداقت ہے تو وہ کسی اور ملک یا کسی اور زمانے میں پیش آئے ہوں گے۔ ہم اس معاملے میں مصنف کو قصور وار گردانتے ہیں۔ غالباً اُسے امید تھی کہ اگر اپنے ملک اور اپنے زمانے کا ذکر ہوا تو قصے میں زیادہ دلچسپی پیدا ہوجائے گی، لہٰذا اس لالچ میں آکر اُس نے بڑی جسارت سے کام لیا ہے اور جن عادات و اطوار کا ہم سے ذرا بھی علاقہ نہیں، انھیں ہمارے زمانے کے لباس میں پیش کیا ہے۔ سادہ دل قارئین کو حتی الامکان اس معاملے میں غلط فہمی سے بچانے کے لیے ہم اپنے خیال کی تائید میں ایک دلیل پیش کرتے ہیں اور پورے اعتماد کے ساتھ، کیوں کہ یہ دلیل بڑی زوردار اور مسکت معلوم ہوتی ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ اگر اسباب ایک سے ہوں تو نتائج بھی ایک سے ہوں گے۔ یہ کلیہ غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ آج ہمیں یہ چیز کہیں نظر نہیں آتی کہ ایک نوجوان خاتون جس کی آمدنی ساٹھ ہزار لیور ہو راہبہ بن جائے یا کسی صدر عدالت کی بیوی جو ابھی جوان اور حسین ہو، غم سے مر جائے۔

☆[1] یہ طنزیہ نوٹ خود مصنف نے لکھا ہے۔

عرضِ مرتب

یہ کتاب بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ مجموعہ شاید قارئین کو ضرورت سے زیادہ ضخیم معلوم ہوگا لیکن جس خط و کتابت کا انتخاب یہاں پیش کیا جا رہا ہے وہ تو اصل میں بڑی لمبی چوڑی تھی، اس مجموعے میں تو بہت ہی تھوڑے خط شامل کیے گئے ہیں۔ یہ خط جن حضرات کے ہاتھ لگے انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ انھیں ترتیب دے دو۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس خط و کتابت کو شائع کرنا چاہتے ہیں۔ چناں چہ میں نے اپنی محنت کا صرف یہ معاوضہ طلب کیا کہ جو باتیں مجھے غیر ضروری معلوم ہوں، انھیں قلم زد کرنے کی اجازت مل جائے۔ میں نے صرف وہی خط اس مجموعے میں شامل کیے ہیں جو واقعات کو سمجھنے یا کردار کو ظاہر کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوئے، ایک چھوٹا سا کام تو میں نے یہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ جو خط انتخاب کیے ہیں انھیں تاریخوں کے حساب سے ازسرِنو ترتیب دے دیا ہے۔ کہیں کہیں مختصر سے حاشیوں کا اضافہ بھی کیا ہے جن کا مقصد بالعموم صرف اتنا رہا ہے کہ اقتباسات کا ماخذ بتا دیا جائے یا جو عبارت حذف ہوئی ہے اس کی وضاحت کر دی جائے۔ اگر اس کتاب میں میرا کوئی حصہ ہے تو بس اتنا۔ اس سے آگے میرا کوئی دخل نہیں رہا۔☆۲

ان خطوط کا اندازِ بیاں اور اسلوب بڑا ناقص معلوم ہوگا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس اعتبار سے بھی بہت سی تبدیلیاں کروں۔ میں نے یہ اجازت بھی مانگی تھی کہ جو خط ضرورت سے زیادہ طویل ہیں انھیں کاٹ کے چھوٹا کر دوں کیوں کہ بعض خطوں میں ایسے بکھرے بکھرے واقعات کا ذکر ہے جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں، پھر ان میں نہ تو ربط ہے نہ تسلسل مگر میری یہ درخواست منظور ہی نہ ہوئی۔ اس محنت سے کتاب کی قدر و قیمت میں تو واقعی کوئی اضافہ نہ ہوتا لیکن کم سے کم چند نقائص دور ہو جاتے۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ ان خطوں کی مدد سے ایک نئی کتاب تصنیف کرنا مقصود نہیں بلکہ خود ان خطوں کا شائع کرنا۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی سمجھایا گیا کہ اس خط و کتابت میں جن آٹھ دس آدمیوں نے حصہ لیا ہے اگر ان سب کے اندازِ بیاں میں ایک ہی سی روانی اور صفائی ہوئی تو یہ بات خلافِ حقیقت بھی ہوگی

☆۲۔ یہ انتباہ بھی ضروری ہے کہ ان خطوں میں جن اشخاص کا ذکر ہے میں نے سب کے نام یا تو حذف کر دیے ہیں یا بدل دیے ہیں۔ ان بدلے ہوئے ناموں میں اگر کسی اصل آدمی کا نام نکل آئے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے اور اس بات سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے۔

اور خلاف قیاس بھی۔ میں نے کہا کہ یہ چیز تو در کنار، ان لکھنے والوں میں ایک بھی تو ایسا نہیں جس سے نہایت فاش قسم کی غلطیاں سرزد نہ ہوئی ہوں اور جس پر نکتہ چینی نہ ہو سکے۔ مجھے جواب ملا کہ یہ خط تو بجی قسم کے ہیں اور چند معمولی آدمیوں نے لکھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے مجموعے میں تو ہر معقول پڑھنے والے کو غلطیوں کی توقع ہوگی کیوں کہ اب تک کئی ممتاز مصنفوں بلکہ اکادمی کے چند اراکین نے بھی اس طرح کے جو مجموعے شائع کیے ہیں اُن میں ایک بھی تو ایسا نہیں جس پر حرف گیری نہ ہو سکے۔ یہ دلیلیں مجھے قائل نہ کر سکیں۔ اس وقت بھی میری یہی رائے تھی اور اب بھی یہی رائے ہے کہ ایسی دلیلیں ڈھونڈ نکالنا آسان ہے لیکن انھیں قبول کرنا مشکل ہے، مگر میرا اختیار ہی کیا تھا، مجھے ہار ماننی پڑی۔ بہر حال میں نے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کرنے اور یہ بتانے کا حق محفوظ رکھا کہ مجھے اس رائے سے اختلاف ہے۔ چناں چہ میں یہاں اپنے حق کا استعمال کر رہا ہوں۔

رہی یہ بات کہ اس کتاب کی قدر و قیمت کیا ہے تو اس معاملے میں کوئی رائے دینا میرا کام نہیں کیوں نہ تو میں کسی کی رائے پر اثر انداز ہو سکتا ہوں نہ مجھے ایسی کوشش کرنی چاہیے۔ بہر حال جو حضرات کتاب شروع کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کتاب کیسی ہوگی؟ وہ چاہیں تو اس دیباچے کو آخر تک پڑھ لیں۔ باقی اصحاب کے لیے یہی مناسب ہے کہ سیدھے سجاؤ اصلی کتاب پڑھنی شروع کر دیں۔ ضروری باتیں انھیں معلوم ہو ہی گئیں۔

پہلی بات تو مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ جیسا میں تسلیم کر چکا ہوں، میرا مشورہ یہی تھا کہ ان خطوں کو شائع کر دیا جائے، لیکن مجھے ان کے مقبول ہونے کی ذرا امید نہیں۔ مگر میرے اس خلوص کو ادیبوں والی مصنوعی خاکساری نہ سمجھیے۔ میں اتنی ہی صاف گوئی کے ساتھ یہ بھی عرض کیے دیتا ہوں کہ اگر مجھے یہ مجموعہ قارئین کے سامنے پیش کرنے کے لائق نظر نہ آتا تو میں یہ زحمت کبھی گوارا نہ کرتا۔ ظاہر میں یہ دو بیانات بالکل متضاد معلوم ہوتے ہیں۔ آیئے اس مشکل کو حل کریں۔

کسی کتاب کی قدر و قیمت اس کی افادیت یا اُس سے حاصل ہونے والے لطف پر موقوف ہوتی ہے، اور اگر ممکن ہو سکے تو دونوں باتوں پر۔ محض مقبولیت سے کتاب کی خوبی ثابت نہیں ہوتی۔ مقبولیت تو عموماً موضوع کے انتخاب سے حاصل ہوتی ہے، انداز بیاں سے نہیں۔ لوگ تو یہ دیکھتے ہیں کہ چیزیں کون سی پیش کی گئی ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ پیش کس طرح کی گئی ہیں۔ جیسا کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس مجموعے میں ایک پورے گروہ کے خط شامل ہیں۔ اس سے دلچسپی میں تنوع تو پیدا ہوتا ہے مگر پڑھنے والے کی دلچسپی کم زور پڑ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں یہاں جتنے جذبات کا اظہار ہوا ہے وہ تقریباً سارے کے سارے بناوٹی اور مصنوعی ہیں۔ ان سے جو دلچسپی پیدا ہوگی وہ صرف تجسس کی ہوگی اور یہ دلچسپی جذبات سے پیدا ہونے والی دلچسپی سے ہمیشہ کم تر ہوتی ہے۔ پھر یہاں پڑھنے والے اتنی رعایت بھی نہیں برتتے اور تفصیلات کی خامیاں انھیں بڑی جلدی نظر آ جاتی ہیں۔ کیوں کہ یہ تفصیلات ہمہ وقت

اُس اکیلی خواہش سے نبرد آزما رہتی ہیں جس کی تسکین پڑھنے والے چاہتے ہیں۔

ان خامیوں کا تھوڑا بہت کفارہ ایک ایسی خوبی ادا کر دیتی ہے جو خود کتاب کی نوعیت میں پنہاں ہے یعنی انداز بیان کا تنوع۔ یہ وہ خوبی ہے جو کسی مصنف کو بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے مگر یہاں خود بہ خود پیدا ہوگئی ہے اور کتاب یک رنگی اور بے کیفی کا شکار ہونے سے بچ گئی ہے۔ بعض پڑھنے والے شاید اسے بھی ایک خوبی کی بات سمجھیں گے کہ ان خطوں میں جابہ جا بالکل نئے یا غیر معروف مشاہدات بکھرے پڑے ہیں۔ ان خطوں کو جانچنے میں بڑی رعایت سے کام لیا جائے تو بھی میرا خیال ہے کہ ان سے بس اتنا ہی لطف حاصل ہوسکتا ہے۔

شاید اس کتاب کی افادیت پر لوگوں کو زیادہ اعتراض ہوگا لیکن میرے خیال میں یہ بات بڑی آسانی سے ثابت کی جاسکتی ہے۔ کم سے کم میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ بدکردار لوگ نیک لوگوں کو بگاڑنے کے لیے جو طریقے استعمال کرتے ہیں اُن کا پردہ چاک کرنا ایک اخلاقی خدمت ہے اور میری رائے میں ان خطوں سے یہ مقصد بدرجۂ اتم پورا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں دو اہم حقائق کا ثبوت بھی ملے گا اور مثال بھی۔ چوں کہ ان دونوں باتوں پر بالکل غور ہی نہیں کیا جاتا اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ لوگ ابھی تک ان سے ناواقف ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو عورت کسی بدکردار آدمی کو اپنے پاس بٹھائے وہ آخر میں اُس کا شکار بن جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ جو ماں کسی اور کو اپنی بیٹی کا ہم راز بن جانے دے وہ کم از کم ناعاقبت اندیش ضرور ہے۔ نوجوان مرد اور نوجوان عورتیں اس کتاب سے یہ سبق بھی سیکھ سکتی ہیں کہ بدکردار لوگ دوست تو بڑی آسانی سے بن جاتے ہیں لیکن یہ دوستی ہمیشہ ایک خطرناک جال ثابت ہوتی ہے اور اس میں پھنسنے کے بعد نہ تو آدمی کی نیکی صحیح سلامت رہ سکتی ہے نہ خوشی، لیکن اچھی چیز بری طرح بھی استعمال ہوسکتی ہے۔ اس کتاب کی طرف سے مجھے یہی بڑا ڈر ہے۔ نوجوانوں کو یہ کتاب پڑھنے کا مشورہ دینا تو الگ رہا میں تو کہتا ہوں کہ انھیں اس قسم کی کتابوں کے پاس بھی نہیں پھٹکنے دینا چاہیے۔ یہ کتاب کس زمانے میں خطرناک نہیں رہتی بلکہ فائدہ مند بن جاتی ہے، یہ بات جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے میرے خیال میں بس ایک نیک اور پرہیزگار ماں نے خوب سمجھی ہے جو صرف ذہین ہی نہیں بلکہ جس کی ذہانت اچھائی کی طرف مائل ہے۔ کتاب کا مسودہ پڑھنے کے بعد ان خاتون نے مجھ سے کہا، ''میں سمجھتی ہوں کہ اپنی بیٹی کو شادی کے دن یہ کتاب تحفے میں دے کر میں اُس کے ساتھ بڑی بھلائی کروں گی۔'' اگر بال بچوں والی سبھی ماؤں کی یہی رائے ہوئی تو اس کتاب کی اشاعت پر میں اپنے آپ کو ہمیشہ مبارک باد دیتا رہوں گا۔

یہ مفروضہ ہے تو خوش آئند لیکن اس کے باوجود مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت سے بہت ہی کم لوگ خوش ہوں گے۔ اخلاق باختہ مرد اور عورتیں اپنے مفاد کی خاطر اس کتاب کی سخت مذمت کریں گی، کیوں کہ اس سے انھیں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوگا۔ چوں کہ اس قسم کے لوگ

بہت ہوشیار ہوتے ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ وہ چالاکی سے کام لے کر سخت گیر اور اخلاق پرست لوگوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیں، کیوں کہ اس کتاب میں اخلاقی بدعنوانیوں کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، اسے دیکھ کر تو یہ حضرات گھبرا اٹھیں گے۔

جو لوگ لامذہبی کے دعوے دار ہیں انھیں ایک دین دار عورت سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی کیوں کہ وہ تو اتنی ہی بات پر اُسے احمق سمجھنے لگیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ دین دار لوگ اس بات پر بگڑیں گے کہ نیکی اور پرہیزگاری کو شکست ہوئی ہے۔ انھیں شکایت ہوگی کہ مذہب کو اس طرح پیش کیا گیا ہے جیسے اس میں کچھ طاقت ہی نہیں ہوتی۔

اس کے برخلاف خوش مذاق حضرات بعض خطوں کے سیدھے سادے اور ناقص اندازِ بیان سے بیزار ہو جائیں گے۔ دوسری طرف پڑھنے والوں کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ جو چیز بھی چھاپے خانے سے نکلے وہ محنت اور دیدہ ریزی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انھیں بعض دوسرے خطوں میں کسی مصنف کی کاوشِ فکر جھلکتی نظر آئے گی اور وہ سمجھیں گے کہ دراصل خود مصنف اپنے کردار کی زبان سے بول رہا ہے۔

غرض اس کتاب کے متعلق عام رائے شاید یہ ہوگی کہ ہر چیز بس اپنی جگہ ٹھیک ہوتی ہے۔ اگر بے تکلفانہ خط و کتابت میں مصنفوں کی سی احتیاط اور چھان پھٹک برتی جائے تو نفاست باقی نہیں رہتی، اس کے برخلاف اگر سچ مچ کے ذاتی خطوط شائع کر دیے جائیں تو زبان و بیان کی بے احتیاطیاں عیوب میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور سخت ناگوار گزرتی ہیں۔

یہ تسلیم کرنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ یہ سارے اعتراضات مجھے نہایت معقول معلوم ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ان کا جواب بھی دے سکتا ہوں اور دیباچے کی حدود سے تجاوز کیے بغیر۔ لیکن یہ تو آپ بھی مانیں گے کہ اگر ہر بات کا جواب دینے کی ضرورت پیش آئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کتاب اپنی توضیح خود نہیں کر سکتی۔ اگر میں کتاب کو ایسا ہی سمجھتا تو دیباچے اور کتاب دونوں کو دریا برد کر دیتا۔

☆☆

پہلا حصّہ

خط نمبرا

از سے سیل وولانژ بنام سوفی کارنے، اور سولین کانونٹ، بمقام...

پیاری سوفی، دیکھو میں بات کی پکی نکلی، میرا سارا وقت کپڑوں اور ٹوپیوں ہی کی فکر میں نہیں گزرتا، تمھارے لیے تو میں کہیں نہ کہیں سے وقت نکال ہی لوں گی۔ لیکن آج ایک دن کے اندر میں نے اتنے کپڑے دیکھے ہیں کہ اُن چار سال میں بھی نہ دیکھے ہوں گے جب ہم دونوں ساتھ رہا کرتے تھے۔ جب وہ اکڑ باز تاں ویل (اسی مدرسے کی ایک لڑکی) اپنے بہترین کپڑے پہن کے ہم سے ملنے آئی تھی تو سمجھی کہ ہم چڑ گئے۔ اب میں اُس سے پہلی دفعہ ملنے جاؤں گی تو وہ ہم سے بھی زیادہ چڑے گی۔ خیال ہے کہ اُسے بھی اپنے یہاں بلاؤں۔ اماں ہر بات میں مجھ سے صلاح لیتی ہیں، اب وہ پہلے کی طرح مجھے اسکول کی لڑکی نہیں سمجھتیں۔ مجھے ایک ملازمہ بھی مل گئی ہے۔ میرا سونے کا کمرہ بھی الگ ہے اور لکھنے پڑھنے کا کمرہ بھی الگ۔ میں تمھیں یہ خط ایک بڑی، خوب صورت میز کے سامنے بیٹھی لکھ رہی ہوں۔ مجھے اس کی کنجی بھی مل گئی ہے تاکہ جو چیز چاہوں اس میں بند کر کے رکھ دوں۔ اماں کہتی ہیں کہ جب وہ صبح کو اٹھیں تو میں روز سلام کرنے آؤں۔ اُنھوں نے اجازت دے دی ہے کہ دوپہر کے کھانے سے پہلے بال بنانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس وقت تک ملنے جلنے والے تو آتے نہیں۔ وہ ہر روز مجھے بتا دیا کریں گی کہ تیسرے پہر کو اُن کے پاس کس وقت جا کے بیٹھوں۔ باقی وقت میں جو چاہوں کروں، اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ کبھی کوئی ساز لے بیٹھتی ہوں، کبھی تصویریں بناتی ہوں، کبھی کتابیں پڑھتی ہوں یعنی جیسے کانونٹ میں کرتی تھی۔ بس فرق ہے تو یہ کہ یہاں ہماری استانی جی نہیں جو ہر وقت ڈانٹا ڈپٹا کریں اور میرا جی نہ چاہے تو کام کرنا کچھ لازمی نہیں۔ لیکن میری سوفی تو یہاں ہے نہیں جو اُس کے ساتھ بیٹھ کے باتیں کروں اور قہقہے لگاؤں چناں چہ کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی ہوں۔

ابھی تو پانچ بھی نہیں بجے۔ اماں کے پاس میں سات بجے سے پہلے نہیں جاتی۔ اگر تمھیں کوئی بات سنانی ہوتی تو اس کے لیے کافی وقت تھا۔ لیکن ابھی تک تو اس بات کا ذکر ہی نہیں آیا۔ کچھ تیاریاں تو ضرور ہو رہی ہیں، درجنوں کپڑے سینے والیاں میرے پاس آتی رہتی ہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ابھی میرے بیاہ کا ارادہ نہیں ہوا۔ ژوزفین (مدرسے کی ایک خادمہ) بیچاری سیدھی سادی ہے، بات ہمیشہ الٹی سمجھتی ہے۔ اسے دھوکا ہوا۔ لیکن اماں نے مجھ سے کئی بار کہا ہے کہ جب تک لڑکی کا بیاہ نہ ہو اُسے کانونٹ میں رہنا چاہیے۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ژوزفین کی بات ٹھیک ہے، کیوں کہ اماں نے

مجھے گھر بلا لیا ہے۔

ایک گاڑی ابھی ابھی دروازے پہ آ کے رکی ہے اور اماں نے مجھے فوراً اپنے پاس بلوایا ہے۔ کہیں یہ "وہی" تو نہیں ہیں؟ میں نے تو ابھی کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔ میرا ہاتھ تھر تھر کانپ رہا ہے اور دل دھڑک رہا ہے۔ میں نے ملازمہ سے پوچھا کہ تمھیں معلوم ہے اماں کے پاس کون صاحب آئے ہیں؟ وہ کہنے لگی، "ارے، وہی م، ک ہیں ..." پھر وہ ہنس پڑی۔ ہاں، میرا خیال ہے کہ "وہی" ہیں! اب میں واپس آ کے تمھیں بتاؤں گی کہ کیا ہوا۔ بہر حال "اُن کا" نام تو معلوم ہو ہی گیا۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہوں گے، اب میں چلوں۔ اچھا، تھوڑی دیر کے لیے خدا حافظ...

تمھیں اپنی پگلی سے سیل پر کتنی ہنسی آئے گی! مجھے بڑی شرم آ رہی تھی لیکن تم میری جگہ ہوتیں تو تمھارا بھی یہی حال ہوتا۔ میں اماں کے کمرے میں پہنچی تو دیکھا کہ ایک صاحب سیاہ لباس پہنے اُن کے پاس کھڑے ہیں۔ جس طرح بھی بن پڑا میں نے اُنھیں سلام کیا اور وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی، ایسا معلوم ہوا جیسے زمین نے پیر پکڑ لیے ہوں۔ تم خود سمجھ سکتی ہو کہ میں نے اُن صاحب کی طرف کس طرح دیکھا ہوگا! اُنھوں نے سر جھکا کے میرے سلام کا جواب دیا اور اماں سے بولے، "مادام! آپ کی صاحب زادی تو چندے آفتاب چندے ماہتاب ہیں۔ آپ نے مجھ پر جو نوازش فرمائی ہے اب تو اس کی قدر میرے دل میں اور بڑھ گئی۔" یہ سیدھی سادی بات سن کے مجھے تو ایسی کپکپی چھوٹی کہ کھڑا رہنا مشکل ہوگیا۔ میں ایک آرام کرسی ڈھونڈ کے اُس پہ دھم سے گر پڑی۔ شرم کے مارے چہرہ سرخ ہوگیا اور اوسان ٹھیک نہ رہے۔ میں کرسی پہ بیٹھی ہی تھی کہ یہ صاحب میرے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گئے۔ تمھاری پگلی سے سیل کے تو ہوش و حواس غائب ہوگئے۔ بہ قول اماں کے میں تو سہم کے رہ گئی جیسے طوفان والے دن ہوا تھا، میں چیخ مار کے اُچھل پڑی۔ اماں نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور بولیں... "کیوں! تمھیں یہ ہوا کیا؟ ٹھیک طرح بیٹھ جاؤ اور ان صاحب کو اپنا پیر دکھاؤ۔" میری پیاری سوفی! یہ "صاحب" جوتے والے تھے! اب میں تمھیں کیا بتاؤں کہ مجھے کتنی شرم آئی ہے۔ چلو یہ اچھی بات ہوئی کہ اماں کے سوا کوئی اور وہاں نہیں تھا۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ میرا بیاہ ہوجائے گا تو اس آدمی سے اپنے جوتے کبھی نہیں بنواؤں گی۔

تمھیں یہ بات ماننی پڑے گی کہ ہم دونوں بھی پورے لال بجھکڑ ہیں! اچھا، خدا حافظ۔ اب چھ بجنے کو ہیں، میری خادمہ کہتی ہے کہ کپڑے بدل لینے چاہئیں۔ پیاری سوفی، خدا حافظ۔ مجھے تم سے اتنی محبت ہے جیسے ابھی تک تمھارے ساتھ کانونٹ میں رہتی ہوں۔

ہاں ایک بات اور۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ خط کس کے ہاتھ بھجواؤں اس لیے ژوزفین کے آنے کا ہی انتظار کرنا پڑے گا۔

پیرس، ۳؍اگست ۱۷ء

خط نمبر ۲

از مارکیز درتی بنام وائی کاؤنٹ دوال موں بمقام شاتو د...

واپس آ جاؤ، میرے پیارے کاؤنٹ، بس اب چلے آؤ۔ تم کر کیا رہے ہو؟ بڈھی خالہ کی جائداد ملنے کا تو یقین ہو ہی گیا، اب وہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ فوراً آؤ۔ مجھے تمھاری بڑی ضرورت ہے۔ مجھے ایک بڑی عجیب بات سوجھی ہے، تمھیں اسے پورا کر کے دکھانا پڑے گا۔ تھوڑے لکھے کو بہت سمجھو۔ اس کام کے لیے میں نے تمھیں چنا ہے، اس میں تمھاری عزت افزائی ہے۔ دوڑے دوڑے آؤ اور میرے قدموں پر جھک کے میرے احکام سنو۔ لیکن جب سے تم نے میری نوازشیں قبول کرنا چھوڑا ہے تم ان سے غلط قسم کا فائدہ اٹھاتے ہو۔ اب دو ہی باتیں ممکن ہیں یا تو میں تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نفرت کرنے لگوں یا پھر تمھیں ڈھیل دیے رکھوں۔ خیر، تمھاری خوش قسمتی ہے کہ آج میدان دوستی کے ہاتھ رہا اور میں مائل بہ کرم ہوں۔ چناں چہ میں تمھیں بتاتی ہوں کہ میں نے کیا مسودہ گانٹھا ہے۔ لیکن جان نثار عاشق کی طرح قسم کھاؤ کہ جب تک اس بات میں کامیابی نہ ہو کسی اور "معاملے" میں نہیں پڑو گے۔ وہ لڑکی تو اس لائق ہے کہ کسی جاں باز اور دلیر آدمی کے ہاتھ لگے۔ تم نے اس کام کا ذمہ لیا تو محبت کی محبت رہے گی انتقام کا انتقام۔ تمھاری "تزک" میں ایک "عیاری" کا اضافہ یوں ہی لبھاؤ میں ہو جائے گا۔ ہاں تمھاری تزک میں، کیوں کہ میں چاہتی ہوں کہ تمھارے کارنامے ایک دن شائع ضرور ہوں اور یہ کتاب لکھنے کا خود ذمہ لیتی ہوں۔ خیر، یہ باتیں چھوڑو اور اس وقت جو معاملہ درپیش ہے اُس کی فکر کرو۔

مادام دوولانژ اپنی بیٹی کا بیاہ کر رہی ہیں۔ ابھی یہ بات صیغۂ راز میں ہے مگر کل اُنھوں نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ بھلا بتاؤ تو اُنھوں نے داماد کون سا چنا ہے؟ کاؤنٹ دژرکور۔ یہ بات کسی کے خیال میں بھی آسکتی تھی کہ ایک دن میں ژرکور کی رشتے دار بن جاؤں گی؟ مجھے بڑا غصہ آ رہا ہے۔... تم سمجھے نہیں کیوں؟ بڑے بیوقوف ہو! اس نے جو جنرل کی بیوی کے ساتھ عشق لڑایا تھا، کیا تم نے وہ بات معاف کر دی؟ تم تو خیر نرے جانور ہو لیکن کیا مجھے بھی اُس سے شکایت نہ ہو؟[☆۳] بہرحال میں چپ ہوں اور یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیتی ہوں کہ ایک نہ ایک دن میرا انتقام پورا ہو کے رہے گا۔

ژرکور بیں نخرے بگھارتا ہے کہ میری بیوی ایسی ہونی چاہیے، ویسی ہونی چاہیے۔ اُس احمق کو اپنے بارے میں بڑی خوش فہمیاں ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اُس بات سے بچ نکلوں گا جو ہر شوہر کے

☆۳۔ یہ عبارت سمجھنے کے لیے قارئین کو معلوم ہونا چاہیے کہ کاؤنٹ دژرکور مارکیز درتی کو چھوڑ کر جنرل کی بیوی سے عشق لڑانے لگا تھا اور جنرل کی بیوی نے اُس کی خاطر وائی کاؤنٹ دوال موں کو قربان کر دیا تھا۔ اُس وقت مارکیز اور وائی کاؤنٹ کا میل ہوا۔ ان خطوں میں جن واقعات کا ذکر ہے یہ معاشقہ اُن سے بہت پہلے کا ہے۔ چناں چہ جو خط اس معاملے سے متعلق تھے وہ مجموعے میں شامل نہیں کیے گئے۔

مقدر میں لکھی ہے۔ اُس کی یہ باتیں سیکڑوں دفعہ تمھیں بھی بری لگی ہیں اور مجھے بھی۔ تم جانتے ہو یہ ایک مضحکہ انگیز خیال اُس کے دل میں بیٹھ گیا ہے کہ بیوی نے دنیا سے الگ تھلگ کسی کانونٹ میں تعلیم پائی ہو اور اس سے بھی زیادہ مہمل خوش فہمی اسے یہ ہے کہ سنہرے سے بالوں والی عورتیں باحیا ہوتی ہیں۔ وولانژ کی بچی کے ساتھ ساتھ ساٹھ ہزار لیور کی آمدنی تو ضرور بھتیجے چڑھتی ہے لیکن میں شرط لگاتی ہوں کہ اس کے باوجود اگر لڑکی کے بال سیاہ ہوتے یا اُس نے کانونٹ میں تعلیم نہ پائی ہوتی تو وہ اُس سے کبھی شادی نہ کرتا۔ آؤ ہم اُسے ثابت کر دکھائیں کہ وہ نرا احمق ہے۔ خیر ایک نہ ایک دن بیوقوف تو وہ بن ہی جائے گا، اس کی تو مجھے فکر نہیں لیکن اگر ہم کچھ ایسا کریں کہ اُس کی شروعات ہی بیوقوفی سے ہو تو کیسی دل لگی رہے۔ شادی کے اگلے دن جب وہ شیخی بگھارے گا (کیوں کہ اس سے تو وہ باز نہیں رہ سکتا) تو ہمیں اُس کی باتیں سن کے کتنا مزہ آئے گا۔ اگر تم نے اس لڑکی کو ایک دفعہ اپنے سانچے میں ڈھال لیا تو بھلا مجال ہے کہ ہر خاوند کی طرح ژرکور بھی پیرس میں ایک افسانہ بن کے نہ رہ جائے۔

علاوہ ازیں اس نئی مہم کی ہیروئن ہر طرح اس لائق ہے کہ تم اس پر پوری توجہ صرف کرو۔ یہ لڑکی بالکل پری زاد ہے اور عمر بس پندرہ سال۔ ابھی کچی کلی ہے۔ بناوٹ نام کو نہیں، ایسی ویسی باتوں سے بالکل ناواقف لیکن تم مرد لوگ اس چیز سے نہیں ڈرتے۔ پھر آنکھوں میں کچھ ایسا خمار ہے جس سے بڑی امیدیں بندھتی ہیں اور یہ بات کیا کم ہے کہ میں تم سے اُس کی سفارش کر رہی ہوں۔ تمھارا کام بس اتنا ہے کہ میرا شکریہ ادا کرو اور جو حکم دوں اُسے بجالاؤ۔

یہ خط تمھیں کل صبح ملے گا۔ میرا حکم ہے کہ کل شام سات بجے میرے پاس پہنچ جاؤ۔ آٹھ بجے تک میں کسی سے نہیں ملوں گی یہاں تک کہ اپنے تازہ ''جاں نثار'' سے بھی نہیں۔ ایسے اہم معاملات میں اُس کا دماغ کام نہیں کرتا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں محبت میں اندھی نہیں ہو جاتی۔ آٹھ بجے میں تمھیں رہا کر دوں گی۔ دس بجے واپس آ کے اُس حسینہ کے ساتھ کھانے میں شریک ہونا کیوں کہ وہ اور اُس کی ماں دونوں کل میرے یہاں کھانا کھائیں گی۔ اچھا، خدا حافظ۔ لو دوپہر ڈھل چکی۔ بس اب وہ زمانہ قریب ہے کہ جب مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہ رہے گی۔

پیرس ۴ راگست ۱۷ء

خط نمبر ۳

از سے سیل۔ وولانژ بنام سوفی کارنے

پیاری! مجھے ابھی تک کچھ معلوم ہی نہیں ہو سکا۔ کل اماں نے چند لوگوں کی دعوت کی تھی۔ مجھے چاہیے تو یہ تھا کہ ان سب کو غور سے دیکھوں خصوصاً مردوں کو لیکن اُس وقت مجھے بڑی اکتاہٹ ہو رہی تھی۔ مرد اور عورتیں، غرض سب کے سب میری طرف گھور گھور کے دیکھ رہے تھے اور ایک دوسرے سے

کھسر پسر کرتے جاتے تھے۔ میں سمجھ گئی کہ میرے متعلق باتیں ہو رہی ہیں۔ شرم کے بارے میرا چہرہ سرخ ہوگیا۔ کوشش تو یہی کر رہی تھی کہ نہ شرماؤں لیکن یہ کوئی میرے بس کی بات تھوڑی تھی۔ پھر بھی جی چاہتا ہے کہ مجھے اتنی شرم نہ آئی ہوتی کیوں کہ مجھے پتا چلا کہ جب لوگ دوسری عورتوں کی طرف دیکھتے ہیں تو اُن کا چہرہ سرخ نہیں ہوتا یا پھر یہ بات ہوگی کہ چہرے پر جو سرخی لگی ہوئی تھی اُس کی وجہ سے گھبراہٹ کی یہ نشانی نظر نہ آتی ہوگی کیوں کہ یہ تو بڑی مشکل چیز ہے کہ کوئی مرد تمھاری طرف تکے جائے اور تمھیں شرم نہ آئے۔

سب سے زیادہ بے چینی مجھے اس بات سے ہوئی کہ مجھے معلوم ہی نہ تھا، یہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟ شاید دو تین دفعہ میں نے ایک لفظ ''خوب صورت'' تو سنا مگر صاف صاف تو بس ''بے ڈھنگی'' کا لفظ سننے میں آیا۔ یہی بات درست بھی ہوگی کیوں کہ جنھوں نے یہ بات کہی تھی وہ اماں کی رشتے دار بھی ہیں اور سہیلی بھی بلکہ اُنھیں تو ایکا ایکی میرے اوپر پیار سا آنے لگا۔ یہ لوگ جتنی دیر بھی ہمارے یہاں رہے اس عرصے میں بس ایک اُنھیں نے مجھ سے بات چیت کی۔ کل اُن کے یہاں ہماری دعوت ہے۔

کھانے کے بعد میں نے سنا کہ ایک آدمی کسی اور آدمی سے کہہ رہا تھا، ''ذرا اسے پک تو جانے دو، جاڑوں میں دیکھیں گے۔'' مجھے یقین ہے کہ میرا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ شاید اُنھیں صاحب سے میرا بیاہ ہونے والا ہے۔ لیکن اس کا مطلب تو یہ ہے کہ بات چار مہینے کو گئی! کاش مجھے یہ پتا چل جاتا کہ ہوگا کیا؟

لوژورفین آگئی۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے جلدی جانا ہے لیکن میں تمھیں اپنے ''بے ڈھنگے پن'' کا ایک اور قصہ ضرور سناؤں گی۔ ہاں، میں سمجھتی ہوں کہ وہ خاتون ٹھیک ہی کہتی ہیں!

کھانے کے بعد جوئے بازی شروع ہوئی۔ میں اماں کے پاس بیٹھی تھی۔ پتا نہیں یہ ہوا کیسے لیکن مجھے فوراً ہی نیند آگئی۔ اتنے میں ایک زور کے قہقہے کی آواز آئی تو میری آنکھ کھلی۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ لوگ میرے اوپر ہی ہنس رہے تھے یا کسی اور بات پر لیکن خیال یہی ہوتا ہے۔ اماں نے مجھے وہاں سے اُٹھ آنے کی اجازت دے دی، اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ ذرا سوچو تو سہی، گیارہ بج چکے تھے۔ اچھا پیاری سوفی، خدا حافظ۔ اپنی سے سیل کو ہمیشہ ہمیشہ پیار سے یاد کرتی رہنا۔ میں سچ کہتی ہوں دنیا اتنی مزے دار نہیں جتنی ہم سمجھتے تھے۔

پیرس، ۴ر اگست ۷۱ء

خط نمبر ۴

از وائی کاؤنٹ دوال موں بنام مارکیز دمرتی بمقام پیرس

آپ کے احکامات نہایت دل فریب ہیں۔ پھر جس انداز سے آپ نے احکامات صادر فرمائے ہیں وہ تو اور بھی دل پذیر ہے۔ آپ تو اُن لوگوں میں ہیں جو ظلم و ستم کو بھی حسین بنا دیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کی غلامی کا شرف حاصل کیوں نہ رہا۔ آپ جانتی ہیں کہ اس سے پہلے بھی کئی بار مجھے یہی رنج ہو چکا ہے۔ آپ مجھے جانور کہیں یا جو چاہیں کہیں، لیکن میں تو وہ زمانہ یاد کر کے خوش ہوتا رہتا ہوں جب آپ مجھے پیارے پیارے ناموں سے سرفراز فرماتی تھیں۔ بعض دفعہ تو مجھے امید ہونے لگتی ہے کہ میں پھر انھیں ناموں کا مستحق ٹھہروں گا اور آخر میں آپ کے پاس پہنچ کے دنیا کو دکھا دوں گا کہ وفا شعاری کس چیز کا نام ہے لیکن فی الحال تو ہمیں جو زیادہ اہم امور درپیش ہیں اُن کی فکر کرنی چاہیے۔ کامرانیاں حاصل کرتے رہنا ہماری قسمت میں لکھا ہے اور قسمت کے آگے سر جھکائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ شاید اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ہم ایک دوسرے سے پھر آملیں۔ حسینوں کی سرتاج مارکیز! اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو عرض کروں کہ آپ میرے قدم بہ قدم چل رہی ہیں۔ دنیا کے مزے لوٹنے کے لیے ہم ایک دوسرے سے الگ تو ہو گئے لیکن ہم دونوں ایک ہی دین کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ محبت کا مذہب پھیلانے میں آپ نے بھی بڑی سرگرمی دکھائی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ہاتھ پر بھی اتنے ہی لوگوں نے بیعت کی ہے جتنے لوگوں نے میرے ہاتھ پر۔ مجھے آپ کے جوش و خروش اور حرارتِ ایمانی کا حال اچھی طرح معلوم ہے۔ اگر محبت کے دیوتا نے ہمیں ہمارے اعمال کے اعتبار سے جانچا تو ایک دن آپ کسی بہت بڑے شہر کی سرپرست قرار پائیں گی اور آپ کا یہ جاں نثار بھی اور کچھ نہیں تو کسی گاؤں کا ولی تو بن ہی جائے گا۔ اس اندازِ بیاں پر آپ کو حیرت ہوئی ہوگی۔ ٹھیک ہے نا؟ لیکن پچھلے آٹھ دن سے میں بس اسی قسم کی باتیں سن رہا ہوں اور خود بھی اسی طرح بول رہا ہوں۔ میں اس ہنر میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہوں لہٰذا آپ کی حکم عدولی کرنی پڑ رہی ہے۔

بگڑیے نہیں، ذرا میری بات سنیے۔ میں نے آج تک آپ سے اپنے دل کی بات نہیں چھپائی، اب میں آپ کو اپنا ایک منصوبہ بتاتا ہوں جس سے بڑا منصوبہ میں نے کبھی نہیں باندھا۔ آپ نے وہ کیا تجویز پیش کی ہے؟ ایک ایسی لڑکی کو اپنے بس میں لاؤں جس نے دنیا میں ابھی نہ تو کچھ دیکھا ہے نہ کچھ جانتی ہے، جو اپنا بچاؤ تک نہیں کر سکتی، یوں ہی سیدھے سبھاؤ میرے ہاتھ آ جائے گی، جو اتنی بھولی بھالی ہے کہ جہاں کسی مرد نے پہلی دفعہ اُس کی طرف توجہ کی اور وہ سرمست ہوئی اور جو شاید محبت نہیں بلکہ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کے فوراً کھنچی چلی آئے گی۔ میں کیا، بیس اور آدمی اتنی ہی آسانی سے

کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن میں آج کل جس مہم میں لگا ہوا ہوں اُس کا یہ معاملہ نہیں ہے۔ اس میں کامیاب رہا تو شہرت بھی حاصل ہوگی اور لذت بھی۔ محبت کا دیوتا میرے سر پر بقائے دوام کا تاج رکھنے کی تیاری کر رہا ہے۔ میری حسین کرم فرما! اس کامیابی پر تو خود آپ کا سر عقیدت کے ساتھ میرے سامنے جھک جائے گا اور آپ خوش ہو کے فرمائیں گی... ''آدمی ہو تو ایسا ہو۔''

آپ مادام دترووبل کو جانتی ہیں۔ اُن کی دین داری، پاک بازی، طہارت پسندی اور شوہر سے محبت کا حال بھی آپ کو معلوم ہے۔ میرے حملے کا رخ تو اس طرف ہے۔ میرے مقابلے میں تو کوئی ایسا حریف ہونا چاہیے۔ یہ ہے وہ منزل جس کی طرف میں گام زن ہوں۔

''اگر اپنی جدوجہد کے صلے میں وہ مجھے حاصل نہ ہوگی۔

تو یہی عزت کیا کم ہے کہ میں نے اپنی سی کوشش تو کر دیکھی۔'' (لافوں تین)

شعر برا سہی لیکن کسی بڑے شاعر کا ہو تو نقل کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ان خاتون کے شوہر نام دار کسی زبردست مقدمے کے سلسلے میں برگنڈی تشریف لے گئے ہیں۔ (امید ہے کہ میں انھیں اس سے بھی بڑے مقدمے میں ہراؤں گا)۔ اُن کی اہلیہ کو اتنی پریشانی ہے جیسے بیوہ ہوگئی ہوں، کسی طرح چین ہی نہیں آتا۔ مفارقت کا زمانہ مجبوراً یہاں بسر کر رہی ہیں۔ ہر روز گرجا میں دعا کراتی ہیں۔ غریبوں کی دیکھ بھال کے لیے دن میں دو تین بار جاتی ہیں۔ صبح شام نماز پڑھتی ہیں، گھنٹوں اکیلے چہل قدمی فرماتی ہیں، میری بڈھی خالہ کے پاس بیٹھ کے دینی باتیں کرتی ہیں، کبھی کبھی تاش بھی کھیل لیتی ہیں جس میں اُنھیں ذرا لطف نہیں آتا۔ بس یہ ہیں اُن کی تفریحات۔ اب میں اُنھیں ذرا زیادہ مؤثر قسم کی تفریحات فراہم کرنے کی فکر میں ہوں۔ میرا نیکی کا فرشتہ مجھے یہاں اس لیے لایا تھا کہ اُنھیں بھی خوشی حاصل ہو اور مجھے بھی۔ میں بھی کیسا پگلا ہوں! مجھے افسوس ہے کہ چوبیس گھنٹے یوں ہی تکلفات میں ضائع کیے۔ اگر مجھے پیرس واپس جانا پڑا تو یہ اچھی خاصی سزا کے برابر ہوگا۔ خوش قسمتی سے تاش کی باری میں چار آدمیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہاں مقامی پادری کے علاوہ اور کوئی آدمی ہے نہیں۔ چناں چہ میری لازوال خالہ نے مجھے مجبور کیا کہ اُن کی خاطر دو چار دن قربان کر دوں۔ آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ میں فوراً مان گیا۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتیں کہ اُس دن سے میری کتنی خاطر مدارات ہو رہی ہے اور خصوصاً مجھے گرجا جاتے دیکھ کر وہ کتنی خوش ہوتی ہیں۔ اُنھیں یہ پتا نہیں کہ میں کس بت کی پوجا کرتا ہوں۔

پچھلے چار دن سے محبت کا بھوت میرے سر پر سوار ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ میری محبت ہمیشہ بڑے زور شور کی ہوتی ہے اور میں رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ لیکن آپ کو اس بات کی کیا خبر کہ آدمی اکیلا ہو تو اُس کی طلب کتنی بڑھ جاتی ہے۔ مجھے ہر وقت بس یہی دھن لگی رہتی ہے۔ دن ہو تو وہی خیال، رات ہو تو وہی خیال۔ خواب میں بھی تو پیچھا نہیں چھوٹتا۔ محبت بھی ایک مضحکہ خیز چیز ہے، اس سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لیے اس عورت کو قابو میں لانا ضروری ہے کیوں کہ خواہش کی تکمیل نہ ہو تو آدمی

خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچتا ہے۔ حصول کی لذتیں بھی نرالی ہیں! اپنی خوشی اور خاص طور سے اپنے ذہنی سکون کے لیے اب مجھے اسی کی ضرورت ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ عورتیں اپنی مدافعت میں بڑی کم زور واقع ہوئی ہیں ورنہ ہماری حیثیت تو اُن کے زرخرید غلاموں سے زیادہ نہ ہوتی۔ اس وقت سہل الحصول عورتوں کی طرف سے میرے دل میں جذبۂ تشکر پیدا ہورہا ہے۔ چناں چہ ظاہر ہے کہ میں آپ کی قدم بوسی کو حاضر ہوں۔ میں ایسی تمام عورتوں کے پیروں پہ سر رکھ کے معافی مانگتا ہوں اور یہ لمبا چوڑا خط ختم کرتا ہو۔ اچھا، حسینۂ دل نواز، خدا حافظ۔ بندے پر اپنی نگاہ کرم رکھیے گا۔

از شاتو د... ۵ر اگست ۱۷ء

خط نمبر ۵

از مارکیز دمرتی بنام وائی کاؤنٹ دوال موں

وائی کاؤنٹ! تمھیں کچھ اندازہ ہے کہ تمھارا خط کیسا گستاخانہ ہے اور مجھے تم سے ناراض ہو جانا چاہیے؟ لیکن خط سے پتا چلتا ہے کہ تم تو آج کل عقل سے عاری ہو۔ چلو، اس بات نے تمھیں میری خفگی سے بچا لیا۔ میں بڑی نرم دل اور فیاض دوست ہوں۔ اپنی توہین بھول کر تمھیں خطرے سے آگاہ کرتی ہوں۔ بحث میں الجھنے سے مجھے کوفت ہوتی ہے لیکن تمھیں اس کی ضرورت ہے تو چلو یہ بھی گوارا ہے۔

مادام دتر وویل کو قابو میں لاؤ گے! تمھیں بھی کیا حماقت سوجھی ہے۔ تم ہو ہی سرپھرے۔ ہمیشہ وہی چیز چاہتے ہو جس کا ملنا محال ہو۔ بھلا سوچو تو وہ ہے کس قسم کی عورت؟ چلو ناک نقشہ درست سہی مگر چہرے سے ذرا بھی تو پتا نہیں چلتا کہ اس میں جذبات بھی ہوں گے۔ بدن بھرا بھرا ہے لیکن لطافت نام کو نہیں۔ کپڑے بالکل بے ڈھنگے پہنتی ہے۔ گریبان ٹھوڑی تک، سینے کے اوپر رومالوں کی تہیں۔ ایک دوست کی حیثیت سے میں تمھیں آگاہ کیے دیتی ہیں کہ اگر تم نے دو ایسی عورتوں سے عشق لڑایا تو تمھاری شہرت ختم ہو کے رہ جائے گی۔ ذرا وہ دن یاد کرو جب وہ سیں روش کے گرجا میں چندہ جمع کر رہی تھی۔ تم نے بار بار میرا شکریہ ادا کیا تھا کہ میں نے تمھیں ایسا مزے دار تماشا دکھایا۔ وہ منظر ابھی تک میری نگاہوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ ایک لمبے لمبے بالوں والے اونٹ جیسے آدمی نے اُس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا، قدم قدم پہ گری پڑ رہی تھی، چار گز چوڑا دامن بار بار کسی نہ کسی کے سر پر آ پڑتا تھا، کسی کو سلام کرتی تو منہ لال ہو جاتا تھا۔ بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ تم ایسی عورت کو چاہو گے؟ چلو، وائی کاؤنٹ، بس اب جانے دو۔ اپنے کیے پر شرماؤ اور ہوش میں آؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ یہ بات کسی سے نہ کہوں گی۔

اور ہاں، یہ تو سوچو کہ تمھیں جھنجلاہٹ کتنی ہوگی۔ تمھیں کس رقیب کا مقابلہ کرنا پڑے گا؟

. ایک شوہر کا! کیا یہ لفظ سن کر تمھیں اپنی ہتک محسوس نہیں ہوتی؟ اگر ناکام رہے تو کیسی بے عزتی ہوگی! کامیاب ہوئے تو اس میں کون سی بڑے فخر کی بات ہے! میں تو ایک اس سے بھی بڑی بات کہوں گی۔ اس عورت سے تمھیں کسی لطف کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ طہارت پسند عورتوں سے بھلا کوئی لطف حاصل ہوسکتا ہے؟ میرا مطلب اُن عورتوں سے ہے جو حقیقت میں ایسی ہوں۔ وہ لطف اندوزی کے دوران میں بھی اپنا رکھ رکھاؤ اُسی طرح قائم رکھتی ہیں۔ اُن سے لطف حاصل ہوتا بھی ہے تو آدھا تہائی۔ وہ مکمل خود فراموشی، سپردگی اور سرمستی جہاں لذت اپنی انتہا کو پہنچ کے پاک وصاف بن جاتی ہے اور محبت کی ایسی ہی دوسری نعمتیں ان عورتوں کے پاس بھی نہیں پھٹکتیں۔ میں تمھیں ابھی سے آگاہ کیے دیتی ہوں۔ فرض کرو حالات اچھے سے اچھے رہے تو بھی مادام دتردویل تم سے اپنے شوہر کی طرح پیش آنے کے بعد سمجھے گی کہ وہ تمھارے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ شوہر اور بیوی میں کتنا ہی پیار کیوں نہ ہو، تخلیے میں وہ رہتے ہیں اُسی طرح الگ کے الگ۔ یہاں تو معاملہ اور بھی خراب ہے۔ تمھاری یہ طہارت پسند محبوبہ بڑی دین دار ہے اور اُس کا مذہب کچھ اس قسم کا ہے جس کے ہاتھوں عورت ہمیشہ بچی بنی رہتی ہے۔ شاید تم یہ مرحلہ بھی طے کرلو گے لیکن اس خوش فہمی میں نہ پڑو کہ تم اس مذہبیت کو ختم کرسکتے ہو۔ خدا کی محبت پر تو شاید تم غالب آ جاؤ لیکن شیطان کا خوف تمھارے بس میں نہیں آسکتا۔ جب تم اپنی محبوبہ کو آغوش میں لوگے اور اُس کا دل دھڑکتے محسوس کروگے تو اُس کی وجہ محبت نہیں ہوگی بلکہ خوف۔ اگر اس عورت سے تمھاری جان پہچان کچھ دن پہلے ہوئی ہوتی تو شاید تم اُسے آدمی بنا لیتے لیکن اُس کی عمر بائیس سال کی ہے اور شادی کو بھی دو برس ہوگئے۔ وائی کاؤنٹ! سچ کہتی ہوں، جب عورت ایسی کھڑنگ ہوجائے تو اُسے بس اُس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے، وہ کبھی کسی مطلب کی نہیں ہوسکتی۔

اور تم ایسی محبوبہ کی خاطر میری اطاعت سے گریز کر رہے ہو۔ اپنی خالہ کے مقبرے میں جا کے دفن ہوگئے ہو۔ ایک انتہائی لذیذ معرکہ چھوڑے دے رہے ہو، جس سے تمھاری شہرت میں چار چاند لگ جائیں گے۔ یہ کیا بات ہے کہ ژرکور ہمیشہ تم سے بڑھ چڑھ کے رہتا ہے؟ دیکھو، ویسے تو میں ہنسی مذاق کر رہی ہوں لیکن اس وقت تو یہی سمجھنے کو جی چاہتا ہے کہ تم اس شہرت کے مستحق نہیں ہو اور خیال ہوتا ہے کہ اب تم پر اعتماد نہ رکھوں۔ مادام دتردویل کے عاشق کو اپنا محرمِ راز بنانے کی عادت مجھے کبھی نہیں پڑسکتی۔

ہاں، یہ بھی بتاتی چلوں کہ وولانژ کی بیٹی ایک آدمی کے تو ہوش وحواس خراب کرچکی ہے۔ وہ لڑکا داں سنی اُس کی محبت میں دیوانہ ہورہا ہے۔ ایک دفعہ وہ دونوں مل کر گانا سنا چکے ہیں۔ واقعی وہ اتنا اچھا گاتی ہے کہ جو لڑکی ابھی ابھی کانونٹ سے آئی ہو اُس سے تو ایسی توقع ہو نہیں سکتی۔ یہ دونوں اکثر مل کے گایا کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ خوب پر گت ملے گی لیکن داں سنی ابھی بالکل بچہ ہے۔ وہ اس عشق بازی میں فضول وقت ضائع کرے گا اور کر دھر کے کچھ نہیں دے گا۔ لڑکی خود بھی بڑی شرمیلی ہے اور

فی الجملہ اس معاشقے میں اتنا لطف نہیں آئے گا جتنا تمھاری وجہ سے پیدا ہوتا۔ اس وقت میں جھنجلائی بیٹھی ہوں اور یقین ہے کہ میرا جاں نثار شوالیے آئے گا تو میں اُس سے ضرور لڑ پڑوں گی۔ میں اُسے مشورہ دیتی ہوں کہ مجھ سے ذرا ملائمت کے ساتھ پیش آئے ورنہ فی الحال تو مجھے اُس سے الگ ہو جانے میں بھی تامل نہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں نے اس وقت عقل مندی سے کام لیا اور اُسے چھوڑ دیا تو اُسے بڑی مایوسی ہوگی۔ کسی عاشق کو مایوس کرنے سے زیادہ مزہ مجھے کسی بات میں نہیں آتا۔ وہ مجھے بے وفا کہے گا، اور یہ لفظ ''بے وفا'' سن کے مجھے ہمیشہ بڑی لذت حاصل ہوتی ہے۔ لفظ ''بے رحم'' کے بعد عورت کو اور کوئی لفظ اس سے زیادہ شیریں نہیں لگتا۔ پھر اس کا استحقاق حاصل کرنے میں بھی دشواری پیش نہیں آتی۔ واقعی میں سنجیدگی سے کہتی ہوں کہ اب تو یہ تعلق ختم کرنا ہی پڑے گا۔ ذرا دیکھو تمھاری بہ دولت کیا ہو رہا ہے! اس کی اخلاقی ذمہ داری تمھارے اوپر ہے۔ خدا حافظ۔ مادام دتر وویل سے سفارش کر دو کہ میرے لیے بھی دعائے خیر کریں۔

پیرس، ۷ راگست ۷۱ء

خط نمبر۶

از وائی کاؤنٹ دوال موں بنام مارکیز دمرتئی

تو گویا دنیا میں ایک عورت بھی ایسی نہیں جو اپنی طاقت کا غلط استعمال نہ کرے! میں نے بارہا آپ کو ''فیاض دوست'' کا لقب دیا ہے لیکن آپ بھی اب ویسی نہیں رہیں۔ آپ میری محبوبہ کا نام لے کر مجھ پر حملہ کرنے سے بھی نہیں چوکتیں! آپ نے مادام دتر وویل کا کیسا عجیب نقشہ کھینچا ہے! کوئی مرد ہوتا تو اس گستاخی کے بدلے اُسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑتے اور آپ کے سوا کوئی دوسری عورت ہوتی تو اسے بھی کم از کم انتقام کا مزہ تو چکھنا ہی پڑتا۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ میرا اتنا سخت امتحان نہ لیا کیجیے۔ میں اس میں پورا اترنے کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ میں آپ کو دوستی کا واسطہ دیتا ہوں کہ اگر آپ کو اس بچاری عورت کی بدگوئی کرنی ہے تو کم از کم اتنا تو انتظار کیجیے کہ میں اُسے حاصل کر لوں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ محبت کی آنکھوں پر سے پٹیاں کھولنے کا حق تو صرف لذت کو حاصل ہے؟

لیکن میں کہہ کیا رہا ہوں؟ مادام دتر وویل کو کسی کی خوش فہمیوں کی کیا ضرورت؟ نہیں، اس کے لیے تو بس اتنا کافی ہے کہ جیسی ہے ویسی ہی رہے، یہی اُس کا حسن ہے۔ آپ کو اعتراض ہے کہ وہ کپڑے بہت برے پہنتی ہے۔ اس بارے میں مجھے بھی آپ سے اتفاق ہے۔ اصل میں وہ تو کپڑے پہن کے اپنے ساتھ ظلم کرتی ہے۔ اُس کا جسم چھپ جائے تو اُس کا حسن غارت ہو جاتا ہے۔ صبح کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں وہ بڑی زوردار لگتی ہے۔ آج کل یہاں گرمی سخت پڑ رہی ہے۔ اس موسم کا بھلا

ہو، صبح کے وقت ململ کے سیدھے سادے لباس میں اُس کا ڈھلا ہوا گداز بدن خوب جھلکتا ہے۔ اُس کے سینے پر کپڑے کی بس ایک تہہ ہوتی ہے۔ میری تیز نگاہوں نے چوری چوری اُس کی ساری دل فریبیاں بھانپ لی ہیں۔ آپ کہتی ہیں کہ اُس کا چہرہ خالی خالی سا ہے۔ آج کل اُس کے دل پر اثر ڈالنے والی کوئی چیز ہی نہیں تو اس کے چہرے سے کیا ظاہر ہو؟ یہ ٹھیک ہے کہ وہ پیرس کی عورتوں کی طرح چلتر باز نہیں۔ اُس کے پاس وہ فریبی نظریں نہیں جو بعض وقت دل تو موہ لیتی ہیں مگر دھوکا دینے سے کبھی باز نہیں آتیں۔ خالی خولی فقروں کو وہ جھوٹی مسکراہٹ سے نہیں ڈھک سکتی۔ اُس کے دانت بے مثال ہیں مگر وہ صرف اُس بات پہ ہنستی ہے جو اُسے واقعی مزے دار معلوم ہوئی ہو لیکن آپ اُسے ذرا اُس وقت دیکھیے جب اُس کی طبیعت جولانی پر ہو، بے لاگ اور فطری زندہ دلی کی تصویر بن جاتی ہے! جب وہ غریبوں کی دست گیری کرنے کے لیے جا رہی ہو تو اُس کی نگاہوں سے کیسی پاکیزہ خوشی، رحم دلی اور نیکی ٹپکتی ہے! اُسے تو خصوصاً اُس وقت دیکھنا چاہیے کہ جب تعریف یا خوشامد کا ذرا سا لفظ سنتے ہی جھینپ کے مارے اُس کا نورانی چہرہ ایک دم سے سرخ ہو جاتا ہے! اس شرمیلے پن میں ذرا بناوٹ نہیں ہوتی۔ وہ باعصمت اور دین دار ہے۔ شاید اسی لیے آپ اسے بے جان اور سرد مزاج سمجھتی ہیں؟ لیکن مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ اُس کا احساس کتنا شدید اور بے پایاں ہوگا جو وہ اُسے اپنے شوہر تک پہ صرف کر سکتی ہے۔ جو آدمی مسلسل غائب رہتا ہو اُس سے مسلسل محبت کیے چلی جاتی ہے! اس سے بڑا ثبوت آپ اور کیا چاہتی ہیں؟ خیر مجھے ایک اور ثبوت بھی مل گیا ہے۔

ہم سیر کو نکلے تو میں نے ایسا ڈول ڈالا کہ راستے میں ایک خندق ملی جسے پھلانگ کے پار کرنا لازمی تھا۔ وہ ہے تو بہت چست چالاک مگر شرمیلی اس سے بھی زیادہ ہے۔ آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ طہارت پسند عورت کو پھلانگنے میں کتنا ڈر لگتا ہے۔ اُسے مجبوراً میری مدد قبول کرنی پڑی۔ چناں چہ میں اس حیادار عورت کو بازوؤں میں لے کر بھینچ چکا ہوں! ہماری تیاریاں اور میری بڈھی خالہ کا چھلانگ لگانا دیکھ کر اس دین دار لیکن زندہ دل عورت نے خوب زور زور سے قہقہے لگائے مگر جب میں نے اسے اٹھایا تو جان بوجھ کے ایسی بے دھیانی سے کام لیا کہ ہم دونوں کے بازو آپس میں الجھ گئے۔ میں نے اُس کا سینہ اپنے سینے سے لگا کے بھینچ لیا اور اُس ایک ذرا سے لمحے کے اندر میں نے محسوس کیا کہ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی ہے۔ شرم کے مارے اُس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اُس کا یہ شرمیلا پن اور جھینپ دیکھ کر مجھے پتا چل گیا کہ اُس کا دل ڈر کی وجہ سے نہیں بلکہ محبت کے سبب دھڑکا تھا۔ اس کے باوجود میری خالہ کو بھی وہی غلط فہمی ہوئی جو آپ کو ہوئی ہے یعنی انھوں نے کہا، ''بچاری بچی ڈر گئی۔'' لیکن اس بچی نے صاف گوئی بھی بلا کی پائی ہے۔ وہ جھوٹ نہ بول سکی اور بڑے بھولے پن سے کہنے لگی، ''نہیں تو مگر...'' اس ایک لفظ نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ اُس وقت سے میرا سنگین اضطراب ایک خوش گوار امید میں تبدیل ہو گیا۔ اب مجھے یہ عورت مل جائے گی۔ اپنے شوہر کے پاس رہتا تو اس کی ہتک ہے۔ میں اُسے شوہر کے پنجے سے

نکال لوں گا بلکہ ہمت کر کے خدا سے بھی چھڑا لوں گا جس کی وہ متوالی ہے۔ میں اُسے ندامت میں گرفتار بھی کروں گا اور اُس کی ندامت پر فتح بھی پاؤں گا، اس میں کتنا مزہ آئے گا! جن تعصبات نے اُس کی جان ضیق میں ڈال رکھی ہے، اُنھیں ختم کرنے کی مجھے ذرا خواہش نہیں! ان سے تو میری مسرت اور میری شہرت میں اضافہ ہی ہوگا۔ اگر وہ پاک بازی کی قائل ہے تو کوئی ہرج نہیں، اسے بس میری خاطر قربان کر دے۔ اگر وہ لغزشوں سے ڈرتی ہے تو ڈرا کرے البتہ یہ چیز میرے راستے میں حائل نہ ہونی چاہیے۔ اگر ہزاروں قسم کے خوف اُسے ہیجان میں مبتلا رکھتے ہیں اور وہ اُنھیں بھول نہیں سکتی تو ٹھیک ہے۔ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ وہ اُنھیں بھولے تو بس میری آغوش میں آئے۔ پھر میں اُسے یہ کہنے کی اجازت بھی دے سکتا ہوں کہ میں تمھاری متوالی ہوں اور دراصل عورتوں میں سے بس ایک اُسی کو یہ کہنے کا حق بھی پہنچے گا۔ میں تو گویا ایک دیوتا ہوں گا اور وہ میری پجارن۔

اب میں صاف صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں، ہم لوگوں کے معاملات سہل تو ہوتے ہیں لیکن برف کی طرح ٹھنڈے۔ جس چیز کو ہم خوشی کہتے ہیں اُس میں لذت نام کو نہیں ہوتی۔ آپ کے سامنے اعتراف کر ہی لوں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ میرا دل ہی بجھ گیا اور نفسانی خواہشات کے سوا اب میرے پاس کچھ نہیں رہا۔ مجھے تو اپنے اوپر رحم آ رہا تھا کہ وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا۔ مادام دتر ودیل کی یہ دولت مجھے جوانی کی خوش فہمیاں واپس مل گئی ہیں۔ اُس کے پاس بیٹھ کے مجھے اتنی مسرت ہوتی ہے کہ اُس سے لذت حاصل کرنا لازمی نہیں رہتا۔ بس مجھے ڈر ہے تو یہ کہ اس معاشقے میں وقت بہت لگے گا کیوں کہ میں کوئی چیز اتفاقات کے بھروسے پر نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے بیسیوں دفعہ بڑی جسارت سے کام لیا ہے اور ایسے موقعوں پر قسمت نے بھی میرا ساتھ دیا ہے۔ مجھے یہ باتیں یاد تو آتی رہتی ہیں لیکن ان پر عمل کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ میں اصل میں تو اُسی وقت خوش ہوں گا کہ جب وہ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دے۔ یہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ امید ہے کہ آپ کو میری دُور اندیشی پسند آئے گی۔ ''محبت'' کا لفظ تو میں نے ابھی تک زبان سے نہیں نکالا مگر ہم ''اعتماد'' اور ''دلچسپی'' تک تو پہنچ چکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے اُسے دھوکے میں نہ رکھوں۔ پھر مختلف قسم کی افواہیں تو کسی نہ کسی طرح اُس کے کانوں تک پہنچ ہی جائیں گی۔ چناں چہ پیش بندی کے لیے میں نے اپنے کئی مشہور معرکے اُسے خود سنا دیے ہیں جیسے خود اپنے اوپر الزام لگا رہا ہوں۔ وہ بڑے بھولے پن اور صاف دلی سے مجھے ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی ہے۔ آپ اُسے دیکھیں تو آپ کو بڑی ہنسی آئے۔ وہ کہتی ہے کہ میں تمھیں مشرف بہ ایمان کرنا چاہتی ہوں۔ اُسے یہ پتا نہیں کہ اس کوشش کی قیمت کیا دینی پڑے گی؟ وہ کہتی ہے کہ تم نے جن بدنصیب عورتوں کو تباہ کیا ہے میں تو اُن کی طرف سے وکالت کر رہی ہوں۔ اسے یہ خبر نہیں کہ خود اپنی طرف سے پیشگی وکالت کر رہی ہے۔ کل اُس کا وعظ جاری تھا کہ مجھے یکایک یہ بات سوجھی۔ میں ایسی دل لگی کا موقع ہاتھ سے کب جانے دیتا ہوں۔ میں نے اُس کی بات کاٹ کے کہا کہ آپ تو اس طرح بول رہی

ہیں جیسے مستقبل کا حال جانتی ہوں۔ اچھا میری حسینۂ دل نواز خدا حافظ! آپ دیکھتی ہیں کہ میں ابھی تک راندۂ درگاہ نہیں ہوا۔

ہاں، ایک بات اور یاد آئی۔ کیا اس بچارے شوالیے نے مایوس ہو کے خودکشی کر لی؟ واقعی میں تو آپ کے سامنے پانی بھرتا ہوں۔ اگر میں آپ سے اکڑوں تو آپ مجھے بھی ذلیل کر کے چھوڑیں۔

شاتودو... ۹ر اگست ۱۷ء

خط نمبر ۷

از سے سیل وولانژ بنام سوفی کارنے[☆۴]

میں نے اپنی شادی کے بارے میں تمھیں کوئی اطلاع نہیں دی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سے یہاں آئی ہوں اس دن سے لے کر آج تک مجھے خود کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ اب تو میں اس کے بارے میں سوچتی بھی نہیں، اب تو عادت سی پڑ چلی ہے۔ بس جیسے دن گزر رہے ہیں وہی ٹھیک ہے۔ گانے بجانے میں خاصا وقت صرف کرتی ہوں۔ مجھے گانا بجانا پہلے سے زیادہ پسند آنے لگا ہے کیوں کہ اب میرا کوئی استاد نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اب مجھے ایک اور اچھا استاد مل گیا ہے۔ میں نے ایک دفعہ خط میں شوالیے داں سنی کا ذکر کیا تھا نا؟ وہی جن کے ساتھ مل کے میں نے مادام دمرتئی کے یہاں گانا سنایا تھا۔ وہ مجھ پر اتنے مہربان ہیں کہ روز ہمارے یہاں آتے ہیں اور گھنٹوں میرے ساتھ مل کے گاتے ہیں۔ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ نور کا گلا پایا ہے۔ بڑی پیاری پیاری دُھنیں بناتے ہیں اور بول بھی خود ہی لکھتے ہیں مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ نائٹ آف مالٹا ہیں، ابھی انھیں شادی کی اجازت نہیں! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اگر اُنھوں نے شادی کی تو اُن کی بیوی بڑی خوش رہے گی... بات چیت بڑی نرمی اور سلیقے سے کرتے ہیں۔ یہ تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ تعریف کر رہے ہیں لیکن جو بات بھی کہیں ہن کے دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔ گانے بجانے میں بھی اور دوسری باتوں میں بھی وہ برابر میری غلطیاں درست کرتے رہتے ہیں۔ اعتراض بھی کرتے ہیں تو ہنس ہنس کے اور ایسی دلچسپی کے ساتھ کہ الٹا شکریہ ادا کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہاں، اگر نظروں سے نظریں مل جائیں تب پتا چلتا ہے کہ میٹھی میٹھی باتیں کر رہے ہیں۔ پھر اُن میں خودغرضی تو نام کو نہیں، مثلاً کل ہی کی بات ہے، کسی بڑے آدمی کے یہاں گانے بجانے کی محفل تھی، انھیں بھی بلایا گیا تھا لیکن وہ ہمارے یہاں بیٹھے رہے۔ اُن کے بیٹھنے سے میرا خوب دل لگا رہا کیوں کہ جب وہ یہاں نہیں ہوتے تو مجھ سے کوئی بات ہی نہیں کرتا اور مجھے خالی بیٹھے بیٹھے جمائیاں آنے لگتی ہیں لیکن وہ

☆۴۔ یہ خط وکتابت تو روز ہورہی تھی، اگر سارے خط شامل کیے جاتے تو قارئین کو خواہ مخواہ کوفت ہوتی۔ چناں چہ بہت سے خط چھوڑ دیے گئے ہیں۔ صرف وہی خط لیے گئے ہیں جو واقعات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سوفی کارنے کے سارے خط اور ان واقعات میں حصہ لینے والوں کے کئی خط حذف ہوگئے ہیں۔

یہاں ہوں تو ہم دونوں مل کے گاتے ہیں اور آپس میں خوب باتیں کرتے ہیں۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور سناتے ہیں۔ مجھے تو یہاں بس دو آدمی پسند آئے ہیں، ایک تو وہ اور ایک مادام دمرتی۔ اچھا، پیاری کیلی خدا حافظ۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ آج ایک راگ اور ایک بڑا مشکل گیت یاد کرکے رکھوں گی۔ میں وعدہ خلافی نہیں کرنا چاہتی۔ اُن کے آنے تک بس اسی کی مشق کرتی رہوں گی۔

از... ۷ر اگست ۱۷ء

خط نمبر ۸

از مادام دتروویل بنام مادام دوولانژ

مادام! آپ میرے اوپر جتنا اعتبار کرتی ہیں میں تہ دل سے اُس کی احسان مند ہوں۔ مادموازیل دوولانژ کے مستقبل سے اتنی دلچسپی کسے ہوگی جتنی مجھے ہے۔ میں سچے دل سے دعا کرتی ہوں کہ خدا اُنھیں طرح طرح کی خوشیاں دکھائے۔ اُن کی نیکیوں کا صلہ اُنھیں ملنا ہی چاہیے۔ پھر آپ جیسی دُور اندیش ماں کے ہوتے ہوئے فکر ہی کس بات کی ہے؟ میں کاؤنٹ دژرکور سے تو واقف نہیں ہوں لیکن جب آپ نے اپنے انتخاب سے اُنھیں سرفراز فرمایا تو میرے دل میں اُن کی قدر اور عزت ہونی ہی چاہیے۔ زیادہ کیا عرض کروں، بس میری تو یہی دعا ہے کہ یہ شادی بھی ایسی ہی کامیاب رہے جیسی میری شادی رہی۔ میرا بیاہ بھی تو آپ ہی کی عنایت سے ہوا۔ آپ کا یہ احسان مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ آپ کی بہ دولت مجھے خوشی نصیب ہوئی۔ خدا کرے اس کے صلے میں آپ کی بیٹی کو بھی ایسی ہی خوشی نصیب ہو اور جس ماں نے میرے ساتھ ایسی بھلائی کی وہ بھی اپنی بیٹی کا سکھ دیکھے!

مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی دعائیں لے کر خود آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکی۔ مادموازیل دوولانژ کو دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں مگر مجبور ہوں۔ آپ نے میرے ساتھ بالکل ماں کا سا سلوک کیا ہے اس لیے امید ہوتی ہے کہ وہ بھی بہنوں کی طرح پیش آئیں گی۔ آپ سے درخواست ہے کہ اُنھیں میرا سلامِ محبت پہنچا دیجیے۔ ایک دن میں اُنھیں دکھا دوں گی کہ میں اُن کی محبت کی حق دار ہوں۔

جب تک موسیو دتروویل باہر ہیں، میں دیہات میں رہوں گی۔ یہاں مجھے ایک قابلِ احترام خاتون مادام دروزموند کی صحبت میسر آگئی ہے۔ ہم خرما و ہم ثواب کا مضمون ہے۔ اُن سے بیسیوں باتیں سیکھتی ہوں اور دن بھی اچھی طرح کٹ جاتا ہے۔ بڑھاپے سے بھی اُن کے اندر کسی بات کی کمی نہیں آئی، سیرت کا حسن ابھی تک قائم ہے۔ نہ حافظہ خراب ہوا ہے نہ زندہ دلی میں فرق پڑا ہے۔ یوں عمر تو اسّی سال ہے مگر دل بیس سال کے جوانوں کا سا ہے۔

اس تنہائی میں بھی اُن کے بھانجے والی کاؤنٹ دوال موں کی وجہ سے اچھی خاصی چہل پہل

رہتی ہے۔ یہ اُن کی مہربانی ہے کہ ہماری خاطر وہ دو چار دن کے لیے ٹھہر گئے ہیں۔ میں پہلے اُن سے واقف نہ تھی، اُن کے بارے میں کچھ سنا سنایا ضرور تھا اور جو کچھ سنا تھا اُس کے بعد اُن سے واقفیت پیدا کرنے کی ذرا بھی خواہش میرے دل میں نہ تھی لیکن اب میری رائے ہے کہ وہ اتنے بُرے نہیں جتنا لوگ کہتے ہیں۔ یہاں وہ اپنے پیرس والے ہم جلیسوں کے بُرے اثر سے محفوظ ہیں۔ یہاں تو وہ خاصی عقل و ہوش کی باتیں کرتے ہیں اور اپنی برائیوں کے اعتراف میں بھی اُنھیں تامل نہیں ہوتا۔ اُنھیں میرے اوپر پورا اعتماد ہے اور نہایت صاف گوئی سے باتیں کرتے ہیں۔ میں اُنھیں بڑی سختی سے نصیحتیں کرتی رہتی ہوں۔ آپ تو اُن سے واقف ہیں۔ یہ تو آپ بھی مانیں گی کہ اگر میری بہ دولت اُن کی اصلاح ہوگئی تو یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ وعدے تو اُنھوں نے بہت کیے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ پیرس میں ہفتہ بھر رہ کے میرے سارے وعظ و نصائح بھول جائیں گے۔ خیر، یہاں رہنے سے یہ فائدہ تو ہوا ہے کہ اتنی دیر اپنی حرکتوں سے باز رہے۔ یہاں اُنھوں نے جس طرح دن گزارے ہیں اُس کے بعد تو میں سمجھتی ہوں کہ اُن کے لیے بہترین بات یہ ہے کہ کچھ بھی نہ کیا کریں۔ اُنھیں معلوم ہے کہ میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں آپ کی خدمت میں اُن کا سلام عرض کر دوں، ساتھ ساتھ میرا سلام بھی قبول فرمائیے۔ آپ کی نوازشات ہمیشہ میرے شاملِ حال رہی ہیں۔ میرے خلوص میں بھی فرق نہ آنے پائے گا۔ بصد نیاز۔

از شاتود... ۹/ اگست ۱۷ء

خط نمبر ۹

از مادام دوولانژ بنام مادام دتر دویل

عزیزہ! مجھے تمھارے خلوص اور تمھاری دوستی پر کبھی شک نہیں ہوا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میرے معاملات سے کتنی دلچسپی رکھتی ہو۔ یہ بات تو ہمارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے طے ہو چکی ہے۔ میں تمھارے جواب کا جواب دے رہی ہوں تو اس کا مقصد یہ نہیں کہ اس موضوع پر بحث کروں۔ البتہ وائی کاؤنٹ دوال موں کے بارے میں ضرور کچھ کہنا ہے۔

میں صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ مجھے تمھارے خط میں یہ نام دیکھنے کی ذرا توقع نہیں تھی۔ آخر تمھارے اور اُس کے درمیان کیا چیز مشترک ہو سکتی ہے؟ تم اس شخص سے واقف نہیں ہو۔ تمھیں کیا معلوم کہ عیاش آدمی کیا ہوتا ہے؟ تم کہتی ہو کہ اُس کی صاف گوئی بے مثال ہے۔ ہاں، ٹھیک ہے، وال موں کی صاف گوئی واقعی بے مثال ہوگی۔ اس شخص کا انداز جتنا ملائم اور دل فریب ہو اُسے اُتنا ہی خطرناک اور مکار سمجھو۔ نوجوانی کے زمانے سے لے کر اب تک اُس نے ایک قدم ایسا نہیں اٹھایا اور ایک لفظ ایسا نہیں

کہا جس میں کوئی نہ کوئی خاص مقصد پوشیدہ نہ ہو اور نہ کبھی ایسا ہوا کہ اُس کے مقصد میں بدمعاشی اور مجرمانہ ارادہ شامل نہ ہو۔ عزیزہ، تم مجھ سے اچھی طرح واقف ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں نے اپنے اندر جتنی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مجھے اُن میں بردباری سب سے گراں قدر معلوم ہوتی ہے۔ چناں چہ اگر وال موں اپنے ہیجان انگیز جذبات سے مغلوب ہو جائے یا ہزاروں اور آدمیوں کی طرح اپنے زمانے کی بدکاریوں میں مبتلا ہو جائے تو میں اُس کے چال چلن پر اعتراض تو کروں گی لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے اُس پر رحم آئے گا اور میں چپ چاپ اس انتظار میں رہوں گی کہ شاید اُس میں خوش قسمتی سے کوئی تبدیلی واقع ہو جائے اور وہ نیک لوگوں کی عزت کا مستحق بن جائے لیکن وال موں اس قسم کا آدمی ہی نہیں، اُس کا چال چلن تو اُس کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اُس نے اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے کہ آدمی مصیبت میں مبتلا ہوئے بغیر کیا کیا بدمعاشیاں کرسکتا ہے۔ اُس کی چال یہ ہے کہ بے رحمی اور بدمعاشی سے بھی کام لوں اور خطرے میں بھی نہ پڑوں۔ چناں چہ اُس نے عورتوں کو اپنا شکار بنا رکھا ہے۔ وہ جتنی عورتوں کو بے عزت کرچکا ہے اُن کا تو کوئی شمار ہی نہیں لیکن کتنی ہی عورتیں ایسی ہیں جنھیں اُس نے بالکل برباد کر کے چھوڑا ہے۔

تم تو سکون اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتی ہو، ایسے معاملات کی خبریں تم تک نہیں پہنچتیں۔ میں تمھیں ایسے ایسے قصے سنا سکتی ہوں کہ تم لرز اٹھو لیکن تمھاری روح کی طرح تمھاری نظریں بھی پاک و صاف ہیں۔ میں ایسی تصویریں پیش کر کے انھیں آلودہ نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے یقین ہے کہ وال موں تمھیں کبھی زک نہیں دے سکتا، تمھیں اپنی مدافعت کے لیے ایسے ہتھیاروں کی ضرورت نہیں۔ بس اتنی بات ضرور کہوں گی کہ چاہے وہ کامیاب ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن جتنی عورتوں کی طرف اُس نے توجہ کی ہے اُن میں ایک بھی ایسی نہیں جو اُس کی شکایت نہ کرتی ہو۔ اس کلیے میں اگر کوئی استثنیٰ ہے تو صرف مارکیز دمرتئی۔ بس یہ ایک عورت ہے جس نے اپنے آپ کو اُس سے بچائے رکھا اور اُس کی بدکاریوں کو روکا۔ میں سچ کہتی ہوں، اُس کی زندگی کا یہ واقعہ ایسا ہے جس کی وجہ سے میرے دل میں اُس کی بڑی عزت ہے۔ جب وہ بیوہ ہوئی ہے تو شروع شروع میں کئی لغزشوں کی وجہ سے اُس کے نام پر حرف آیا لیکن اس ایک واقعے نے اُسے دنیا کی نظروں میں سچا ثابت کر دکھایا ہے۔☆۵

بہرحال میری عمر، میرا تجربہ اور سب سے زیادہ میری دوستی مجھے یہ حق دیتی ہے کہ تمھیں خبردار کر دوں۔ پیرس میں لوگ وال موں کو غائب پا کر چوکنے ہو گئے ہیں۔ اگر لوگوں کو پتا چل گیا کہ وہ کچھ عرصے تمھارے اور اپنی خالہ کے ساتھ اکیلا رہا ہے تو تمھاری نیک نامی اُس کے رحم و کرم پر ہوگی۔ کسی

☆۵۔ مادام دوولانژ کی اس غلطی سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ دوسرے بدمعاشوں کی طرح دوال موں بھی اپنے ساتھیوں کا راز فاش نہیں کرتا تھا۔

عورت کی اس سے زیادہ بدنصیبی اور کیا ہوسکتی ہے؟ میں تمھیں صلاح دیتی ہوں کہ اُس کی خالہ کو پٹی پڑھاؤ کہ اُسے اور زیادہ دن نہ روکیں۔ اگر وہ اس پر بھی نہ ٹلے تو میں سمجھتی ہوں کہ تم وہاں سے فوراً چلی آؤ۔ آخر وہ کیوں ٹھہرا ہوا ہے؟ وہاں کر کیا رہا ہے؟ اگر تم اُس کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھو تو مجھے یقین ہے تمھیں پتا چل جائے گا کہ اس علاقے میں وہ کسی بُری نیت سے آیا ہے اور اپنی خالہ کے یہاں مناسب موقع دیکھ کر رہ پڑا ہے لیکن کسی کے دل میں بُرائی ہو تو ہم اُسے دُور تو کر نہیں سکتے۔ ہمارے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے آپ کو اُس سے محفوظ رکھیں۔

اچھا، خدا حافظ۔ میری بیٹی کی شادی کچھ دن کے لیے ملتوی ہوگئی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ کاؤنٹ دژرکور آج کل میں آیا ہی چاہتے ہیں لیکن اُنھوں نے لکھا ہے کہ اُن کی رجمنٹ کو کورسیکا جانے کا حکم ملا ہے۔ جنگ ابھی جاری ہے، اس لیے جاڑوں سے پہلے اُن کی رہائی مشکل ہے۔ اس دیر سے اُلجھن تو بہت ہو رہی ہے لیکن خیر، اب امید ہوتی ہے کہ شادی کے موقعے پر تم سے ملنا ہو جائے گا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ تم شادی میں شریک نہ ہوسکوگی۔ خدا حافظ۔ میں باتیں نہیں بناتی، میں سچے دل سے تمھاری ہوں۔

ہاں، مادام دروز موندے سے میرا سلام کہنا۔ مجھے اُن سے بڑی محبت ہے اور وہ ہیں بھی اسی لائق۔

از... ۱۱؍اگست ۱۷ء

خط نمبر ۱۰

از مارکیز دمرتئی بنام وائی کاؤنٹ دوال موں

وائی کاؤنٹ! کیا روٹھ گئے؟ یا بالکل مر ہی گئے؟ یا صرف اپنی مادام دتروویل کے لیے زندہ ہو جو مرنے ہی کے برابر ہے؟ اُس عورت نے تمھیں جوانی کی خوش فہمیاں تو عطا کر دیں، اب وہ جوانی کے مضحکہ خیز تعصبات بھی جلدی ہی بخش دے گی؟ تم ڈرپوک تو بن ہی گئے ہو، ذہنیت غلامانہ ہو چکی ہے، اس سے تو محبت ہی کرنے لگو۔ تم نے اپنی وہ جسارت مندیاں چھوڑ ہی دیں جن کی وجہ سے قسمت تمھارا ساتھ دیتی تھی۔ تم بے اصولے پن سے کام کر رہے ہو، سارا معاملہ اتفاقات بلکہ محبوبہ کے رحم و کرم پر چھوڑ بیٹھے ہو۔ کیا تم یہ بات بھول گئے کہ دوا کی طرح محبت کا کام بھی بس فطرت کی مدد کرنا ہے؟ دیکھو میں تمھارے ہی ہتھیاروں سے تمھارے اوپر حملہ کر رہی ہوں لیکن مجھے اس پر کوئی فخر نہیں۔ جو خود ہی مر رہا ہو اُسے مارا تو کیا مارا! تم کہتے ہو کہ وہ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دے۔ یہ تو خیر ہوگا ہی! دوسری عورتوں کی طرح وہ بھی اپنے آپ کو حوالے کر دے گی، بس فرق اتنا ہوگا کہ بے ڈھنگے پن سے حوالے کرے گی لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ وہ آخر اپنے آپ کو حوالے کر دے تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم اُسے اپنے

قبضے میں لانا شروع کر دو۔ یہ جو مضحکہ خیز امتیاز تم نے پیدا کیا ہے یہ تو محبت کے متوالوں کی بہکی بہکی باتیں ہیں۔ میں نے محبت کا نام اس وجہ سے لیا کہ تم محبت میں مبتلا ہو۔ اگر میں کسی اور طرح بات کرتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ تمھیں دھوکا دے رہی ہوں اور تمھارا مرض تم سے چھپا رہی ہوں لیکن، عاشقِ ناتواں! ذرا ایک بات تو بتاؤ۔ تمھیں جو دوسری عورتیں ملی ہیں، کیا تم سمجھتے ہو کہ انھیں تم نے بہ جبر حاصل کیا ہے؟ چاہے کوئی عورت اپنے آپ کو حوالے ہی کرنا چاہتی ہو، چاہے وہ کتنی ہی جلدی میں کیوں نہ ہو، کسی نہ کسی قسم کا بہانہ تو لازمی ہوتا ہے اور ہمیں اس سے اچھا بہانہ کون سا ملے گا، جس سے یہ معلوم ہو کہ ہم جبر سے مغلوب ہوگئے؟ جہاں تک میرا سوال ہے، میں تو صاف اقرار کرتی ہوں کہ جن چیزوں سے مجھے خاص خوشی ہوتی ہے اُن میں سے ایک یہ ہے کہ حملہ نہایت باقاعدہ اور تیز ہو۔ ہر بات سلیقے سے ہونی چاہیے لیکن عجلت کے ساتھ۔ مرد کے بے ڈھنگے پن سے ہمیں فائدہ تو پہنچ سکتا ہے لیکن ایسا بھی نہ ہو کہ ہمیں خود اُس کے بُرے اثرات دُور کرنے کی زحمت اور تکلیف گوارا کرنی پڑے۔ حملہ ایسا ہونا چاہیے کہ جو چیزیں ہم نے خود عطا کی ہیں اُن میں بھی جبر کا انداز برقرار رہے اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ ہمارے دو دل پسند جذبات کو تسکین پہنچائے یعنی ایک تو مدافعت کا فخر، دوسرے شکست کی لذت۔ لوگوں کو اندازہ نہیں کہ یہ ہنر کتنا کم یاب ہے۔ بہر حال مجھے اعتراف ہے کہ چاہے اس کمال کا میرے دل پر کوئی اثر نہ ہوا ہو لیکن اس سے لذت ہمیشہ ملی ہے۔ بعض دفعہ تو میں نے محض انعام دینے کی خاطر اپنے آپ کو حوالے کر دیا جیسے پرانے زمانے میں فنونِ سپہ گری کے مقابلے میں ہوتا تھا۔ دلاوری اور ہنرمندی کا انعام حسن کی طرف سے مل گیا۔

لیکن جہاں تک تمھارا سوال ہے، تم تو اب وہ رہے ہی نہیں جو پہلے تھے۔ تمھارے عمل سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے جیسے کامیاب ہونے سے ڈر لگتا ہو۔ یہ تم نے کچھوے کی چال اور پگڈنڈیوں کے راستے کب سے چلنا شروع کیا ہے؟ میرے دوست، اگر تم اپنی منزل پر پہنچنا چاہتے ہو تو گھوڑا لو اور سیدھی سڑک پکڑو!

خیر، اب یہ موضوع چھوڑو۔ مجھے اس سے یوں اور چڑ ہوتی ہے کہ میں اس کی بہ دولت تمھارے دیدار سے محروم ہوں۔ کم سے کم خط ہی زیادہ لکھا کرو اور مجھے بتایا کرو کہ تم نے کتنی ترقی کر لی۔ تمھیں کچھ خبر ہے کہ پندرہ دن سے زیادہ ہوگئے تم اس مہمل معاشقے میں پڑے ہو اور سب کو چھوڑ رکھا ہے؟

اب ذرا اپنی تغافل شعاری کا حال بھی سنو۔ تم اُن لوگوں کی طرح ہو جو خط میں اپنے بیمار دوستوں کی خبر تو برابر پوچھتے رہتے ہیں لیکن اس کی پروا نہیں کرتے کہ جواب کیا آیا۔ پچھلے خط کے آخر میں تم نے دریافت کیا تھا کہ کہیں شوالیے مر تو نہیں گیا؟ میں نے جواب نہیں دیا اور تم نے بھی دوبارہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ کیا تم بھول گئے کہ شوالیے تمھارا جگری دوست ہے؟ خیر، پریشان مت ہو،

وہ مرا نہیں۔ اگر مرتا بھی تو شادی مرگ کا معاملہ ہوتا۔ بچارا شوالیے بھی بڑا پیارا آدمی ہے! عاشق ہو تو ایسا ہو! اُسے مجھ سے کتنی شدید محبت ہوگئی ہے، مجھے تو یہ دیکھ دیکھ کے چکر سا آتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے۔ اس خیال سے اُسے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ سچ کہتی ہوں مجھے تو اُس سے ایک لگاؤ سا ہوگیا ہے۔

جس دن میں نے تمھیں لکھا تھا کہ میں اُس سے لڑائی کرنے کو سوچ رہی ہوں، اُسی دن میں نے اُسے دنیا بھر کی خوشیاں عطا کر دیں! میں بیٹھی یہی سوچ رہی تھی کہ اسے غم و اندوہ کی گہرائیوں میں کیسے دھکیلوں کہ نوکر نے اُس کے آنے کی اطلاع دی۔ یا تو یہ من کی موج تھی یا پھر اُس نے عقل سے کام لیا تھا بہرحال وہ اتنا اچھا کبھی نہیں لگا تھا۔ خیر، میں اُس سے ایسے ملی جیسے جلی بھنی بیٹھی ہوں۔ اُسے امید تھی کہ دوسرے لوگوں کے اندر آنے سے پہلے وہ دو گھنٹے میرے ساتھ تنہائی میں گزارے گا۔ میں نے کہا مجھے تو کہیں جانا ہے۔ اُس نے پوچھا کہاں جا رہی ہو۔ میں نے بتانے سے انکار کر دیا۔ اُس نے بہ اصرار پوچھا۔ میں نے کڑوے پن سے جواب دیا، ''جہاں تم نہ ہو۔'' یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ میرا جواب سن کے وہ ہکا بکا رہ گیا۔ کیوں کہ اگر اُس کے منھ سے ایک لفظ بھی نکلتا تو فوراً لڑائی ٹھن جاتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جیسا میں نے سوچا تھا ہم دونوں میں علاحدگی ہو جاتی۔ مجھے اُس کی خاموشی پر بڑا تعجب ہوا اور میں نے اُسے نظر اٹھا کے دیکھا۔ میں قسم کھا کے کہتی ہوں کہ میں بس یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اُس کے چہرے کا رنگ کیا ہے؟ میں نے اُس کے حسین چہرے پر وہ پیاری پیاری افسردگی پائی جس کا مقابلہ کرنا خود تمھارے قول کے مطابق، آسان کام نہیں۔ سبب ایک جیسا تھا تو نتیجہ بھی ایک جیسا رہا، میں ایک بار پھر مغلوب ہوگئی۔ اب میں اُس کے دل سے یہ خیال مٹانے کی فکر میں پڑ گئی کہ میں اُس کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئی تھی۔ میں نے ذرا نرمی کے ساتھ کہا، ''مجھے ایک کام سے باہر جانا ہے۔ اس معاملے کا تھوڑا سا تعلق تم سے بھی ہے لیکن مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔ کھانا گھر ہی کھاؤں گی۔ کھانے کے وقت واپس آ جانا پھر تمھیں سب پتا چل جائے گا۔'' یہ سن کر اُس کی جان میں جان آئی اور اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اُسے بولنے ہی نہ دیا۔ میں ایک سانس میں کہے چلی گئی، ''اس وقت مجھے جلدی ہے۔ اب تم جاؤ، شام کو آنا۔'' اُس نے میرا ہاتھ چوما اور چل دیا۔

پھر اُس کے یا شاید خود اپنے نقصان کی تلافی کے لیے میں نے فوراً ارادہ کیا کہ اُسے وہ مکان دکھا دوں جو میں نے اپنے معاشقوں کے لیے رکھا ہے اور جس کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں۔ میں نے اپنی وفادار خادمہ وکتوار کو بلایا۔ مجھے حسبِ معمول سر کے درد کا دورہ پڑ گیا تھا۔ چناں چہ ملازموں سے کہہ دیا گیا کہ میں سو رہی ہوں۔ جب میں اپنی جاں نثار خادمہ کے ساتھ اکیلی رہ گئی تو میں نے نوکرانیوں کے سے کپڑے پہنے اور اُس نے خدمت گار کا بھیس بھرا۔ وہ ایک گاڑی کرائے کر کے باغ کے دروازے پر لے آئی اور ہم چپ چاپ چل دیے۔ جب ہم پریم کے مندر میں پہنچے تو میں نے ایسے

ادھ کھلے کپڑے پہنے کہ آدمی دیکھ کر بھونچکا رہ جائے۔ یہ لباس واقعی بڑے زور کا تھا۔ خود میری ایجاد ہے نا۔ اس میں دکھائی تو کچھ نہیں دیتا مگر اندازہ ہر چیز کا ہو جاتا ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمھاری مادام دتر دویل کو بھی اس کا نمونہ دے دوں گی مگر پہلے اُسے ایسا لباس پہننے کے لائق تو بناؤ۔

یہ تیاریاں ختم ہوئیں تو وکتوار تو چھوٹے موٹے کاموں میں لگ گئی اور میں نے بیٹھ کے ''سوفا'' کا ایک باب ''ایلوایز'' کا ایک خط اور لافوں تین کے دو قصے پڑھے۔ مجھے مختلف لہجوں سے کام لینا تھا، چناں چہ میں ان کی مشق کرنا چاہتی تھی۔ اس دوران میں میرا شوالیے حسبِ معمول اسی بے تابی کے ساتھ میرے گھر پہنچا۔ میرے دربان نے اسے دروازے پر روکا اور بتایا کہ بیگم صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ شوالیے کو یہ بات پہلی دفعہ پیش آئی تھی لیکن دربان نے ساتھ ہی ساتھ اُسے میرا خط بھی دیا۔ میں نے جو ایک دور اندیشانہ اصول بنا رکھا ہے اُس کے مطابق یہ خط میرے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں تھا۔ اُس نے لفافہ کھولا تو وکتوار کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ فقرہ ملا، ''ٹھیک نو بجے، بولوار میں کیفے کے سامنے۔'' وہ مقررہ وقت پر وہاں پہنچا۔ اب اُسے ایک خدمت گار ملا جسے وہ نہیں جانتا (کم سے کم وہ یہی سمجھتا ہے کہ میں نہیں جانتا کیوں کہ یہ تو وکتوار تھی)۔ خدمت گار نے کہا کہ اپنی گاڑی واپس کر دیجیے اور میرے ساتھ آیئے۔ یہ سیر بھی عجب رومانی قسم کی تھی، اُس کے دماغ میں ایک تلاطم برپا ہوگیا۔ خیر، اس سے آدمی کو ایسا نقصان نہیں پہنچتا۔ آخر کار وہ میرے پاس آ پہنچا۔ تعجب اور محبت کے جوش میں وہ تو واقعی مسحور ہو کے رہ گیا۔ اس خیال سے کہ اُس کے ہوش ذرا ٹھکانے آ جائیں، ہم دونوں باغیچے میں ٹہلنے نکل گئے۔ پھر میں اُسے مکان میں واپس لے آئی۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ میز پر دو آدمیوں کے لیے کھانا چُنا رکھا ہے اور بستر بھی تیار ہے۔ پھر ہم نشست گاہ میں گئے جو دلھن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ کچھ تو میں نے پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا اور کچھ میں جذبات کی رو میں بہہ گئی۔ غرض وہاں میں نے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اُس کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ میں نے کہا، ''تمھیں اس وقت تعجب تو بہت ہو رہا ہوگا لیکن ٹھہرو، میں بتاتی ہوں۔ صبح میں تمھارے ساتھ بہ ظاہر بڑی بدتمیزی سے پیش آئی اور لمحے بھر کے لیے میں نے اپنے دلی جذبات کو تمھاری نظروں سے چھپا لیا۔ تمھیں اس سے بڑی تکلیف پہنچی ہوگی۔ میں جب سے اپنے آپ کو لعنت ملامت کر رہی ہوں۔ میرا قصور معاف کر دو۔ میں اپنی محبت سے اس کا کفارہ ادا کر دوں گی۔'' تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اس جذباتی تقریر کا اثر کیا ہوا ہوگا! شوالیے نے خوش ہو کے مجھے اٹھا لیا اور جس صوفے پر تم نے اور میں نے ہنس ہنس کے اور بالکل اسی طریقے سے دائمی مفارقت کا حلف اٹھایا تھا وہیں میری معافی کے محضر نامے پر مہر ثبت ہوئی۔

ہمیں چھ گھنٹے ایک دوسرے کی صحبت میں گزارنے تھے اور میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اُس کے لیے یہ سارا وقت ایک ہی جیسا پُرلطف ہونا چاہیے۔ چناں چہ میں اُس کے جوش و خروش کو ذرا اعتدال پر لے آئی اور میرا پیار نازنخروں میں تبدیل ہو گیا لیکن التفات میں کمی نہیں آنے پائی۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں

نے کسی کا دل خوش کرنے کے لیے اتنی زحمت کبھی نہیں اٹھائی اور نہ میں اپنے آپ سے کبھی اتنی مطمئن ہوئی۔ کھانے کے بعد یہ حال ہوا کہ ابھی تو جوانی کا جوش دکھا رہی ہوں اور ابھی عقل کی باتیں کرنے لگی، کبھی چنچل بن گئی کبھی جذباتی بلکہ بعض دفعہ تو کھلاڑ پن پر اتر آئی۔ مجھے دل لگی جو سوجھی تو میں نے یہ فرض کر لیا کہ وہ تو سلطان ہے اور میں باری باری سے حرم سرا کی مختلف کنیزوں کے بھیس میں اُس کے سامنے آ رہی ہوں۔ اُس کے التفات شروع سے آخر تک اُسی ایک عورت پر صرف ہوتے رہے لیکن دراصل محبوبہ ہر دفعہ نئی ہوتی تھی۔

آخر صبح ہوئی تو ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑا۔ وہ ابھی جدا نہیں ہونا چاہتا تھا اور مجھے سمجھانے کی غرض سے اُس نے بہت کچھ کہا اور بہت کچھ کیا مگر اُسے اب ضرورت اسی بات کی تھی۔ رخصت ہوتے وقت الوداع کے طور پر میں نے اس عشرت کدے کی کنجی اٹھا کے اسے دے دی، اور کہا، ''یہ مکان تو میں نے بس تمھاری خاطر لیا تھا۔ مناسب یہی ہے کہ اب یہ مکان تمھارے ہی پاس رہے۔ مندر تو پجاری کے ہی قبضے میں رہنا چاہیے۔'' اس قسم کا چھوٹا سا مکان کسی کے پاس ہو تو ہمیشہ طرح طرح کے شبہے پیدا ہوتے ہیں۔ اُسے بھی میرے بارے میں نہ معلوم کیا کیا گمان گزرتے، میں نے یہ چال چل کے پیش بندی کر دی۔ میں اُسے اچھی طرح جانتی ہوں، مجھے یقین ہے کہ وہ اس مکان کو صرف میرے لیے ہی استعمال کرے گا۔ اگر کبھی مجھے اُس کے بغیر وہاں جانے کی سوجھی تو میرے پاس ایک اور کنجی موجود ہے۔ بہرحال وہ چاہتا تھا کہ اسی مکان میں ملاقات کا ایک اور دن مقرر ہو جائے لیکن یہ شخص مجھے ابھی تک بہت پسند ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اُسے اتنی جلدی ختم کر کے رکھ دوں۔ افراط و تفریط تو اُنھیں لوگوں کے ساتھ جائز ہے جنھیں جلدی ہی چھوڑنے کا ارادہ ہو۔ اُسے یہ اصول معلوم نہیں۔ خیر، اُس کی خوش قسمتی ہے کہ میں اپنے دونوں کے بدلے اس بات سے خوب واقف ہوں۔

لو، رات کے تین بج گئے۔ میں ایک سطر لکھنے بیٹھی تھی اور لکھ گئی کتاب کی کتاب۔ اپنے ہم راز دوست سے باتیں کرتے ہوئے آدمی اسی طرح کھو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے تو تم ابھی تک مجھے سب سے زیادہ پسند ہو لیکن سچی بات یہ ہے کہ لطف شوالیے ہی کی صحبت میں زیادہ آتا ہے۔

از... ۱۲ر اگست ۷۱ء

خط نمبر ۱۱

از مادام دتر دویل بنام مادام دوولانژ

آپ نے اتنا سخت خط لکھا ہے مادام کہ میں تو واقعی اسے پڑھ کے سہم جاتی لیکن خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ آپ کے پاس ڈرنے کی وجوہات کتنی بھی سہی میرے پاس اعتماد کرنے کی وجوہات اُن

سے بھی زیادہ ہیں۔ یہ موسیو دال موں خطرناک آدمی ضرور ہوں گے، عورتیں ان کے نام سے کانپتی بھی ہوں گی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے وہ اپنے خونیں ہتھیار کہیں پھینک آئے۔ چالیں چلنا تو الگ رہا، یہاں تو اُن کا تصنّع بھی غائب ہوگیا۔ اُن میں جو ایک دل کشی کی صفت ہے وہ تو اُن کے دشمنوں کو بھی تسلیم ہے لیکن یہاں تو وہ بھی اُن کا ساتھ چھوڑ گئی۔ بس اب تو اُن کی نیک دلی باقی رہ گئی۔ غالباً یہ دیہات کی ہوا کا کرشمہ ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ وہ حالاں کہ برابر میرے ساتھ رہتے ہیں اور اس میں انھیں لطف بھی آتا ہے لیکن اُن کی زبان سے ایک لفظ ایسا نہیں نکلا جس میں محبت کا شائبہ ہو۔ انھوں نے ایک بات ایسی نہیں کہی جیسی مرد عام طور سے کہا کرتے ہیں حالاں کہ دال موں کی طرح اُن میں تو وہ چیز بھی نہیں ہوتی جس کی بہ دولت آدمی ایسی بات کہتا ہوا اچھا لگے۔ آج کل تو ہر شریف عورت کو اپنے یہاں آنے جانے والے مردوں کے ساتھ ذرا لیے دیے رہنا پڑتا ہے، لیکن وہ کبھی ایسی بات ہی نہیں کرتے کہ اس کی ضرورت پیش آئے۔ اُن کے دم سے ہنسی مذاق اور چہل بازی تو خوب رہتی ہے لیکن وہ اس سے ناجائز فائدہ کبھی نہیں اٹھاتے۔ اس کا ڈھنگ انھیں خوب آتا ہے۔ شاید وہ تعریف کرنے میں تو ذرا مبالغے سے کام لیتے ہیں لیکن اس میں ایسی نفاست ہوتی ہے کہ شرمیلی سے شرمیلی عورت کو بھی یہ قصیدہ خوانیاں بری نہ لگیں۔ واقعی میرا کوئی بھائی ہوتا تو میں تو یہی چاہتی کہ وہ ایسا ہو جیسے موسیو دال موں یہاں نظر آئے ہیں۔ شاید بہت سی عورتیں اُن سے کچھ اور واضح توجہات کی طالب ہوں لیکن میں تو اُن کی بڑی احسان مند ہوں کہ انھوں نے میری طبیعت کا ٹھیک اندازہ لگا لیا اور مجھے ایسی عورتوں میں شامل نہیں سمجھا۔

میں مانتی ہوں کہ یہ تصویر آپ کی پیش کردہ تصویر سے بالکل مختلف ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ موقعے موقعے کے لحاظ سے دونوں ہی اصل کے مطابق ہوں۔ وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ اُن میں بہت سی خامیاں ہیں اور بہت سے عیب لوگوں نے اُن کے سر تھوپ رکھے ہیں لیکن میں نے ایسے مرد شاذ و نادر ہی دیکھے ہیں جو پاک باز عورتوں کا ذکر اتنی عزت بلکہ اتنے جوش کے ساتھ کرتے ہوں۔ آپ نے مجھے جو باتیں بتائیں ہیں اُن سے پتا چلتا ہے کہ کم سے کم اس معاملے میں وہ مکار نہیں ہیں۔ مادام دمرتی کے ساتھ اُن کا جو رویہ رہا ہے وہی اس کا ثبوت ہے۔ وہ اکثر اُن کا ذکر کرتے ہیں اور ہمیشہ ایسی تعریف اور سچے لگاؤ کے ساتھ کہ آپ کا خط آنے سے پہلے میں تو سمجھی تھی کہ جس چیز کو وہ اپنی اور اُن کی دوستی کہتے ہیں وہ دراصل محبت ہے۔ مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے کہ میں نے اس معاملے میں بڑی جلدی ایک رائے قائم کرلی۔ میں اس وجہ سے اور بھی قصوروار ہوں کہ خود انھوں نے بار بار مادام دمرتی کی صفائی پیش کرنے کی زحمت اٹھائی ہے۔ میں کبھی یہ سب بناوٹی باتیں ہیں اور وہ دراصل ایمان داری اور خلوص سے کام لے رہے تھے۔ میں اور تو کچھ نہیں جانتی البتہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ جو آدمی ایسی قابلِ احترام عورت کے ساتھ اتنی وفاداری اور دوستی برت سکے وہ عیاش اور اخلاق باختہ نہیں ہوسکتا۔ آپ کا خیال ہے کہ اگر وہ

یہاں ایسے نیک بنے ہوئے ہیں تو آس پاس میں ضرور کوئی معاشقہ چل رہا ہوگا۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اصل بات کیا ہے؟ اس نواح میں دو چار حسین عورتیں تو ضرور ہیں لیکن صبح کے علاوہ تو وہ شاذ و نادر ہی گھر سے نکلتے ہیں اور اُس وقت بھی وہ کہتے ہیں کہ شکار کھیلنے جا رہا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ کبھی اتفاق ہی سے شکار مار کے لاتے ہیں لیکن وہ مجھے یقین دلاتے ہیں کہ اس معاملے میں وہ بالکل اناڑی ہیں۔ بہرحال مجھے اس بات کی کوئی تشویش نہیں کہ وہ گھر سے باہر نکل کے کیا کرتے ہیں۔ اگر مجھے یہ بات معلوم کرنے کی خواہش ہو بھی تو صرف اس وجہ سے ہوگی کہ آپ کی رائے قبول کر لینے یا آپ کو قائل کر دینے کے لیے ایک اور دلیل ہاتھ آ جائے۔

رہی آپ کی یہ تجویز کہ میں کوئی ایسی تدبیر کروں جو موسیو دوال موں یہاں زیادہ دن نہ ٹھیر سکیں تو یہ بات بڑی مشکل اور نامناسب معلوم ہوتی ہے کہ میں اُن کی خالہ سے کہوں کہ اپنے بھانجے کو اپنے گھر نہ رکھیے۔ پھر یہ چیز اس وجہ سے اور بھی بُری ہے کہ خالہ کو بھانجے سے بڑا لگاؤ ہے۔ بہرحال کسی مجبوری سے نہیں بلکہ محض آپ کے احترام کے سبب وعدہ کرتی ہوں کہ موقع ملتے ہی اُن کی خالہ یا خود موسیو دوال موں کے سامنے یہ درخواست پیش کروں گی۔ رہی میں تو موسیو ترودیل جانتے ہیں کہ میں نے اُن کی واپسی تک یہیں رہنے کا بندوبست کیا ہے۔ اگر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا تو ظاہر ہے انھیں میری غیر مستقل مزاجی پر تعجب ہوگا۔

یہ بیان بے حد طول طویل ہوگیا لیکن میں نے سوچا حق گوئی کا تقاضا یہی ہے کہ موسیو دوال موں کی اچھی تصویر پیش کروں۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے، انھیں اس کی ضرورت بھی بہت معلوم ہوتی ہے۔ بہرصورت مجھے آپ کی دوستی کا پورا پورا احساس ہے جس کے ہاتھوں مجبور ہو کے آپ نے مجھے یہ مشورہ دیا۔ صاحب زادی کا بیاہ ملتوی ہو جانے کے بارے میں جو عنایت آمیز باتیں آپ نے مجھے لکھی ہیں، وہ بھی اسی دوستی کے طفیل ہیں۔ میں بڑے خلوص کے ساتھ آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ شادی کے موقعے پر آپ سے نیاز حاصل کر کے مجھے بڑی مسرت ہوگی لیکن میں اپنی یہ مسرت بڑی خوشی سے قربان کرنے کو تیار ہوں کیوں کہ میری آرزو تو یہ ہے کہ مادموازیل دوولانژ جلدی سے جلدی اپنے گھر کا سکھ دیکھیں۔ ویسے یہی سکھ کیا کم ہے کہ وہ ایک ایسی ماں کے زیرِ سایہ رہتی ہیں جو ہر طرح سے محبت اور عزت کی مستحق ہیں۔ یقین مانیے میں بھی ان دو جذبات میں اُن کی شریک ہوں اور مجھے آپ سے اتنی ہی عقیدت ہے۔

آپ کی نیازکیش

از... ۱۳؍اگست ۱۷ء

خط نمبر ۱۲

از سے سیل وولانژ بنام مارکیز دمرتی۔

مادام! آج اماں کی طبیعت ناساز ہے۔ وہ آج کہیں نہ جائیں گی اور مجھے بھی اُن کے پاس ہی بیٹھنا چاہیے۔ چناں چہ میں آپ کے ساتھ آپیرا جانے کا شرف حاصل نہ کرسکوں گی۔ یقین مانیے، مجھے کھیل نہ دیکھ سکنے کا اتنا افسوس نہیں جتنا آپ کی ملاقات سے محروم رہنے کا ہے۔ امید ہے آپ میری بات سچ سمجھیں گی۔ آپ مجھے بہت ہی پسند آئی ہیں! کیا آپ مہربانی فرما کر موسیو لا شوالیے داں سنی سے اتنی بات کہہ دیں گی کہ انھوں نے جس البم کا ذکر کیا تھا وہ میرے پاس نہیں ہے اور اگر وہ کل البم لیتے آئیں تو مجھے بڑی مسرت ہوگی؟ اگر وہ آج آئے تو ملازم اُن سے کہہ دیں گے کہ ہم لوگ گھر نہیں ہیں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ آج اماں کسی سے ملنا نہیں چاہتیں۔ امید ہے کل تک اُن کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔

آپ کی نیاز کیش

از... ۱۳ر اگست ۱۷

خط نمبر ۱۳

از مارکیز دمرتی بنام سے سیل وولانژ۔

عزیزہ! مجھے تمھاری ملاقات سے محروم رہنے کا بڑا افسوس ہے اور اس محرومی کی وجہ کا بھی۔ خیر، امید ہے ایسا موقع پھر آئے گا۔ میں شوالیے داں سنی کو تمھارا پیغام پہنچا دوں گی۔ تمھاری اماں کی علالت کی خبر سن کر انھیں بھی بڑا افسوس ہوگا۔ اگر تمھاری اماں مجھے کل آنے کی اجازت دیں تو اُن کا دل بہلانے کے لیے میں تھوڑی دیر کو آ بیٹھوں گی، تاش کی دو چار بازیاں رہیں گی۔ تمھاری اماں اور میں دونوں مل کر شوالیے دبیل روش[٦] کی خبر لیں گے۔ ایک طرف تو ہم شوالیے کے پیسے جیتیں گے، دوسری طرف ہمیں ایک مزید لطف یہ حاصل ہوگا کہ تمھیں اپنے حسین استاد کے ساتھ مل کر گاتے ہوئے سنیں گے۔ تمھارے استاد کے سامنے میں یہی تجویز پیش کروں گی۔ اگر تمھاری اماں کو اور تمھیں یہ خیال پسند آئے تو اپنا اور اپنے ان دو آدمیوں کا ذمہ میں لیتی ہوں۔ اچھا، عزیزہ! خدا حافظ۔ مادام دوولانژ سے میرا سلام کہنا۔ بہت بہت پیار۔

از... ۱۳ر اگست ۱۷ء

٦۔ یہ وہ شوالیے ہے جس کا ذکر مادام دمرتی کے خطوں میں ہوا ہے۔

خط نمبر ۱۴

از سے سیل دو ولانژ بنام سوفی کارنے

پیاری سوفی! میں کل تمھیں خط نہ لکھ سکی لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ میں اپنی دلچسپیوں میں لگی رہی۔ میری بات سچ سمجھنا۔ اماں کی طبیعت خراب تھی اور میں سارے دن ان کے پاس سے ہلی تک نہیں۔ رات کو وہاں سے اٹھی تو کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ فوراً بستر پہ جا کے پڑ رہی کہ یہ کم بخت دن تو کسی طرح ختم ہو۔ ایسا لمبا دن آج تک کبھی نہیں گزرا۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے اماں سے محبت نہیں۔ خدا ہی جانے بات کیا تھی۔ آج میں مادام دمرتیٔ کے ساتھ اوپیرا جانے والی تھی۔ شوالیے داں سنی بھی وہاں آ رہے تھے۔ تم جانتی ہو یہ دو آدمی مجھے سب سے زیادہ پسند ہیں۔ جب وہ وقت آیا کہ میں بھی اوپیرا میں بیٹھی ہوتی تو ضبط کے باوجود میرا دل ڈوبنے سا لگا۔ مجھے ہر چیز بُری لگنے لگی اور میں ایسی پھوٹ پھوٹ کے روئی کہ آنسو کسی طرح رکنے ہی میں نہ آتے تھے۔ چلو یہ اچھا ہوا کہ اماں سو رہی تھیں اور انھوں نے مجھے روتے نہیں دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ شوالیے داں سنی کو بھی افسوس ہوا ہوگا لیکن اُن کا دل بہلانے کے لیے کھیل تو تھا، اوپیرا میں آنے والے سیکڑوں لوگ تو تھے... یہ چیز ہی دوسری تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ آج اماں کی طبیعت ٹھیک ہے اور مادام دمرتیٔ، شوالیے داں سنی اور ایک کسی دوسرے آدمی کے ساتھ آ رہی ہیں لیکن مادام دمرتیٔ ہمیشہ بڑی دیر میں آتی ہیں اور یہاں گھنٹوں اکیلے بیٹھے بیٹھے جی اُلٹنے لگتا ہے۔ ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے ساز پر مشق بھی کرنی ہے۔ پھر کپڑے پہننے میں بھی تھوڑا سا وقت لگے گا کیوں کہ میں چاہتی ہوں کہ آج میرے بال بہت اچھے بنے ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہماری استانی ٹھیک ہی کہتی تھیں، کانونٹ سے نکل کر دنیا میں پہنچتے ہی ہم نازنخروں میں پڑ جاتے ہیں۔ پچھلے چند دن سے خوب صورت بننے کی جتنی آرزو مجھے ہو رہی ہے اتنی پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ اب تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اتنی خوب صورت نہیں ہوں جتنا خود کو سمجھتی تھی۔ پھر جو عورتیں سرخی لگاتی ہیں اُن سے یوں بھی مقابلہ نہیں ہو سکتا، مثلاً مادام دمرتیٔ کو ہی لو۔ میں جانتی ہوں کہ سارے ہی مرد انھیں مجھ سے زیادہ حسین سمجھتے ہیں لیکن مجھے اس سے جلن نہیں ہوتی کیوں کہ وہ مجھے بہت پسند کرتی ہیں، پھر انھوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ شوالیے داں سنی مجھے اُن سے زیادہ خوب صورت سمجھتے ہیں۔ یہ اُن کی بڑی مہربانی ہے کہ انھوں نے مجھے یہ بات بتا دی! بلکہ وہ تو اس بات سے خوش بھی معلوم ہوتی تھیں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں مجھ سے واقعی محبت ہے! اور وہ... میں تمھیں کیا بتاؤں کہ مجھے کیسی خوشی ہوئی ہے! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ خوب صورت بننے کے لیے بس اُن کی طرف دیکھنا ہی کافی ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ اُن کی طرف دیکھتی

ہی رہوں لیکن ڈر یہ رہتا ہے کہ کہیں نظریں نہ مل جائیں کیوں کہ جب یہ واقعہ پیش آتا ہے تو ہر دفعہ میں بوکھلا جاتی ہوں اور ایک چوٹ سی لگتی ہے لیکن خیر، کوئی بات نہیں۔

اچھا، پیاری سہیلی، خدا حافظ۔ اب کپڑے پہننے چلتی ہوں۔ بہت بہت پیار۔

پیرس، ۱۴/ اگست ۱۷ء

خط نمبر ۱۵

از وائی کاؤنٹ دوال موں بنام مارکیز دمرتئی

یہ آپ کی بڑی نوازش ہے کہ آپ نے مجھے میرے حال پر نہیں چھوڑا۔ یہاں جس قسم کی زندگی گزر رہی ہے میں تو اُس سے اکتا گیا۔ نہ کچھ کرنے کو نہ دھرنے کو، بس آرام ہی آرام ہے۔ پھر اوپر سے یکسانی اور بے رنگی۔ جب میں نے آپ کے خط میں پوری تفصیلات پڑھیں کہ آپ کا دن کیسا اچھا گزرا تو میرا جی لوٹنے لگا کہ کوئی بہانہ بنا کے یہاں سے بھاگ لوں اور آپ کے قدموں پر آ گروں اور آپ سے درخواست کروں کہ میری خاطر ایک دفعہ اپنے شوالیے سے بے وفائی برت ڈالیے۔ آخر وہ اتنی خوشی کا مستحق بھی تو نہیں ہے۔ آپ کو کچھ معلوم ہے؟ آپ نے ایک ایسی بات لکھ دی ہے کہ میں تو اُس سے جلنے لگا۔ یہ آپ نے جو ہماری ''دائمی جدائی'' کا ذکر کیا ہے اس کے کیا معنی ہیں؟ وہ قسم تو میں نے ہذیان کی حالت میں کھائی تھی، میں اسے تسلیم ہی نہیں کرتا۔ ہم لوگ اس طرح قسم پوری کرنے لگے تو ہمارے اوپر چار حرف۔ شوالیے کو خوش دیکھ کر مجھے خواہ مخواہ چڑ ہوتی ہے۔ خدا کرے میں ایک دن آپ کی آغوش میں آ کر اپنا بدلہ لے سکوں! میں سچ کہتا ہوں، بعض وقت یہ سوچ کر غصے کے مارے کھولنے لگتا ہوں کہ اس شخص کو ذرا بھی زحمت نہیں اٹھانی پڑی، اس نے کچھ سوچا نہ سمجھا، بس احمقوں کی طرح جو دل میں آیا وہی کیا اور پھر بھی وہ مسرت حاصل کر لی جو مجھے حاصل نہیں ہو سکتی، لیکن میں بھی کھنڈت ڈال کے رہوں گا... وعدہ کیجیے کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہ ہو کر رہے گا۔ کیا آپ کو اپنی تحقیر محسوس نہیں ہوتی؟ آپ تو اُسے چکمہ دینے کی زحمت اٹھا رہی ہیں اور وہ آپ سے زیادہ خوش ہے۔ آپ سمجھتی ہیں کہ وہ آپ کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، دراصل آپ اُس کی قید میں ہیں۔ وہ اطمینان سے ٹانگیں پھیلا کے سوتا ہے اور آپ اُس کی لطف اندوزی کی خاطر جاگتی ہیں۔ اُس کی کوئی کنیز بھی اس سے زیادہ اور کیا کرتی؟

میری دل نواز دوست! ذرا غور سے سنیے۔ اگر آپ کی نوازشیں بہ یک وقت ایک سے زیادہ آدمیوں پر ہوں تو مجھے ذرا بھی جلن نہیں ہوتی۔ آپ کے ایسے عاشقوں کو تو میں سکندرِ اعظم کے جانشینوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ جس سلطنت پر میں نے اکیلے حکمرانی کی ہو اُسے وہ سب مل کر بھی اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکتے لیکن آپ اُن میں سے کسی ایک کی ہو کے رہ جائیں! کسی اور کو بھی وہی مسرت حاصل ہو جو

مجھے حاصل تھی، یہ بات میں نہیں برداشت کروں گا۔ ایسا خیال بھی دل میں نہ لائیے گا کہ میں یہ بات سہہ لوں گا... یا تو مجھے واپس بلا لیجیے ورنہ پھر کسی اور کو بھی ساتھ لگا لیجیے۔ ہم نے قسم کھائی ہے کہ ہماری دوستی میں کبھی فرق نہ آئے گا۔ لیکن اب آپ کو یہ نئی سوجھی ہے کہ بس ایک آدمی کی ہو رہیں۔ دیکھیے، یہ بدعہدی ہے۔

آپ کی تنبیہ کے لیے یہی کافی ہے کہ آج میں محبت کا رونا لے کر بیٹھا ہوں۔ میں آپ کے خیالات سے متفق ہوں اور اپنی خامیوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ اگر محبت کے معنی یہ ہیں کہ جس پر دل آجائے اُسے حاصل کیے بغیر آدمی زندہ نہ رہ سکے، اُس کی خاطر اپنا وقت، اپنی تفریحات، اپنی زندگی تک قربان کر دے تو مجھے واقعی محبت ہوگئی ہے۔ لیکن کامرانی ابھی کوسوں دور ہے۔ اس سلسلے میں کوئی نئی بات لکھنے کی تھی ہی نہیں۔ لیکن ایک ایسا واقعہ پیش آیا ہے جس پر میں نے بہت غور و خوض کیا ہے اور ابھی یہ طے نہیں کر سکا کہ اس سے امید بندھتی ہے یا ٹوٹتی ہے۔

آپ میرے خادم سے تو واقف ہی ہیں۔ بڑا چلتا پرزہ ہے، سانٹھ گانٹھ میں جواب نہیں رکھتا۔ آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ میں نے من جملہ اور باتوں کے اسے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ خادمہ سے عشق لڑا لو اور ملازموں کو اتنی شراب پلاؤ کہ انٹا غفیل ہو جائیں۔ یہ بدمعاش مجھ سے زیادہ خوش قسمت نکلا۔ اُس نے تو اپنی مراد بھی پالی۔ اُسے ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ مادام دتورویل نے اپنے ایک ملازم کو حکم دیا ہے کہ میرے چال چلن کے بارے میں تحقیقات کرے اور میں صبح کے وقت سیر کو نکلوں تو میرے پیچھے پیچھے اس طرح جائے کہ مجھے خبر نہ ہونے پائے۔ کیا مطلب ہے اس عورت کا؟ یعنی اتنی حیادار عورت میں بھی یہ ہمت ہے کہ وہ بات کر گزری جس سے ہم بھی گھبراتے! خدا کی قسم، غضب ہے!... خیر، اس تریا چلتر کا بدلہ تو میں لوں گا ہی لیکن پہلے یہ سوچ لوں کہ اس سے مجھے فائدہ کس طرح پہنچ سکتا ہے۔ میری مشتبہ ہوا خوری کا ابھی تک تو کوئی مقصد نہیں تھا لیکن اب تو کوئی نہ کوئی مقصد پیدا کرنا ہی پڑے گا۔ اس معاملے پر میری پوری توجہ صرف ہونی چاہیے۔ اب آپ سے رخصت چاہتا ہوں اور بیٹھ کے یہ بات سوچتا ہوں۔ اچھا، میری عزیز دوست، خدا حافظ۔

حسبِ دستور از شاتو د... ۱۵ر اگست ۷۱ء

خط نمبر ۱۶

از سے سیل وولانژ بنام سوفی کارنے

لے، میری پیاری سوفی، ایک خبر سن! شاید مجھے یہ بات تم سے کہنی نہیں چاہیے لیکن کسی نہ کسی سے کہے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ بات ہی کچھ ایسی ہے کہ منہ سے نکلی پڑتی ہے۔ شوالیے داں سنی... دماغ

میں ایسی کھلبلی مچی ہوئی ہے کہ لکھا بھی تو نہیں جاتا۔ سمجھ ہی میں نہیں آ رہا کہ شروع کہاں سے کروں۔ ایک دفعہ میں نے تمھیں بتایا تھا کہ اُن کے اور مادام دمرتیٔ کے ساتھ شام کیسی اچھی طرح گزری۔☆ے اس کے بعد پھر میں نے تم سے اُن کا ذکر نہیں کیا۔ وجہ یہ تھی کہ میں کسی سے بھی اُن کا ذکر کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ لیکن میں برابر انھیں کے بارے میں سوچتی رہی۔ اُس شام کے بعد وہ اتنے افسردہ، اتنے زیادہ افسردہ ہوگئے کہ مجھے دکھ ہونے لگا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ ایسے کیوں ہو رہے ہیں تو انھوں نے کہا کہ نہیں، میں تو افسردہ نہیں ہوں۔ لیکن مجھے تو نظر آ رہا تھا کہ اُن کی کیا گت بن رہی ہے۔ کل تو اُن کی حالت پہلے سے بھی خراب تھی لیکن اس کے باوجود وہ اسی مہربانی سے پیش آئے اور ہمیشہ کی طرح میرے ساتھ مل کے گانا گایا لیکن جب وہ میری طرف نظر اٹھاتے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی میرا کلیجہ مسوس رہا ہے۔ جب ہمارا گانا ختم ہوگیا تو وہ میرا ساز خود لے جا کے الماری میں رکھ آئے۔ مجھے کنجی واپس لا کے دینے لگے تو گڑگڑا کے بولے کہ رات کو کمرے میں اکیلی رہ جاؤ تو ساز دوبارہ بجانا۔ مجھے سان گمان بھی نہ تھا کہ بات کیا ہے۔ میں تو ساز بجانا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن انھوں نے ایسی عاجزی سے کہا کہ میں نے ہاں کرلی۔ اُن کی اس درخواست کا بھی ایک خاص سبب تھا۔ جب میں اپنے کمرے میں پہنچی اور خادمہ چلی گئی تو میں نے جا کے الماری میں سے ساز نکالا، ساز کے تاروں میں اُن کا خط تہ کیا ہوا رکھا تھا مگر لفافے میں بند نہیں تھا۔ ہائے، میں تمھیں کیا بتاؤں کہ انھوں نے مجھے کیا کیا لکھا ہے! اُن کا خط پڑھ کے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ جب سے کسی اور بات کا خیال ہی نہیں آ رہا۔ میں نے اسے متواتر چار دفعہ پڑھا اور پھر اپنی میز میں بند کر کے تالا لگا دیا۔ مجھے سارا خط زبانی یاد ہوگیا تھا۔ جب میں بستر پہ لیٹی تو میں نے خط اتنی دفعہ دوہرایا کہ نیند کوسوں دور اڑ گئی۔ آنکھیں بند کرتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ وہ میرے پاس بیٹھے ہیں اور جو باتیں میں نے ابھی ابھی پڑھی تھیں وہ اپنی زبان سے کہہ رہے ہیں۔ مجھے نیند بڑی دیر میں آئی اور پھر آنکھ بھی بڑے سویرے کھل گئی۔ میں نے فوراً اٹھ کے خط نکالا، اور دوبارہ پڑھا۔ پھر میں اسے لے کر بستر پر لیٹ گئی اور بار بار چومنے لگی جیسے... شاید کسی خط کو اس طرح چومنا ٹھیک نہیں ہے، لیکن مجھ سے رہا ہی نہ گیا۔

اور اب، پیاری سوفی، میں خوش تو بے حد ہوں لیکن ایک بڑی مشکل آپڑی ہے یعنی مجھے اس خط کا جواب نہیں دینا چاہیے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ مجھے یہ بات نہیں کرنی چاہیے۔ اُدھر انھوں نے جواب مانگا ہے۔ اگر میں نے جواب نہ دیا تو پھر وہ اسی طرح اداس رہیں گے۔ وہ بچارے بھی عجیب مصیبت میں پڑ گئے ہیں! بولو، تم کیا مشورہ دیتی ہو؟ لیکن میری طرح تم بھی تو ایسی باتوں سے ناواقف ہو۔ جی چاہتا ہے اس کا ذکر مادام دمرتیٔ سے کروں، انھیں مجھ سے بڑا پیار ہے۔ دل تو یہی چاہتا

☆ے۔ جس خط میں اس شام کا ذکر تھا وہ نہیں مل سکا۔ غالباً یہ وہ شام تھی جس کا حوالہ مادام دمرتیٔ کے رقعے میں ہے اور سے سل ووالاں کے اس سے پہلے والے خط میں بھی جس کا ذکر ہے۔

ہے کہ اُنھیں تسلی دوں لیکن دوسری طرف میں کوئی غلط بات بھی نہیں کرنا چاہتی۔ ہم سے کہا تو یہ جاتا ہے کہ لوگوں سے مہربانی کے ساتھ پیش آؤ لیکن جب مرد کا معاملہ آ پڑے تو ہمیں اپنے دل کا کہنا ماننے کی اجازت نہیں! یہ بڑا ظلم ہے۔ عورتوں کی طرح مرد بھی تو ہمارے ہمسائے ہیں۔ بتاؤ میں کچھ غلط کہہ رہی ہوں؟ بلکہ مرد تو کچھ اس سے زیادہ ہی ہوتے ہیں جیسے ہماری مائیں ہوتی ہیں ویسے ہی باپ ہوتے ہیں، جیسے بہنیں ہوتی ہیں ویسے ہی بھائی ہوتے ہیں۔ اور پھر اوپر سے شوہر ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ ڈر بھی لگتا ہے کہ اگر میں نے کوئی نامناسب حرکت کی تو میرے بارے میں خود موسیو داں سنی کی رائے اچھی نہیں رہے گی! اس سے تو یہی بہتر ہے کہ وہ اداس ہی رہیں، پھر ابھی تو میرے پاس بہت وقت ہے کیوں کہ اُنھوں نے کل ہی تو خط لکھا ہے، آج جواب دینا ضروری نہیں، پھر شام کو مادام دمرتئی سے ملاقات ہوگی۔ اگر ہمت پڑی تو اُنھیں ساری بات سنا دوں گی۔ اگر میں اُن کے کہنے پر چلی تو مجھے اپنے آپ کو لعنت ملامت نہیں کرنی پڑے گی۔ شاید مادام دمرتئی یہ مشورہ دیں کہ چھوٹا موٹا خط لکھنے میں کوئی ہرج نہیں تا کہ وہ اتنے اداس نہ رہیں! ہائے، میں تمھیں کیا بتاؤں کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے!؟

اچھا، پیاری سہیلی، خدا حافظ۔ لکھنا کہ تمھاری کیا رائے ہے۔

۱۹ر اگست ۱۷ء

خط نمبر ۱۷

از شوالیے داں سنی بنام سے سیل وولانژ

مادموازیل! گستاخی معاف، میں ایک عجب سرشاری اور مجبوری کے عالم میں یہ خط لکھ رہا ہوں لیکن میری ایک التجا ہے، میری عرض داشت ذرا غور سے سنیے گا۔ میں بڑی دیدہ دلیری سے کام لے کر آپ کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کر رہا ہوں، اس لیے آپ سے معافی کا خواست گار ہوں۔ اگر مجھے صرف اپنا جواز پیش کرنا ہوتا تو معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیوں کہ میں تو بس اتنی بات کہہ رہا ہوں کہ آپ کے ہاتھوں جو کچھ ہوا ہے وہ آپ کے سامنے پیش کر دوں اور میں ایسی بات ہی کون سی کہوں گا جو میری نظروں نے، میری سراسیمگی نے، میری حرکات و سکنات نے بلکہ میری خاموشی نے پہلے ہی آپ سے نہیں کہہ دی؟ جس جذبے کو خود آپ نے بیدار کیا ہے، آپ اُس پر ناراض کیوں ہوں؟ آپ کی ذات ہی اس کا سرچشمہ ہے اور یہ آپ ہی کی خدمت میں پیش کیے جانے کے لائق ہے۔ یہ جذبہ میری روح کی طرح آتشیں سہی لیکن آپ کی روح کی طرح مصفا و منزہ بھی ہے۔ آپ کے دل فریب خدوخال، آپ کے دل نشیں کمالات، آپ کا سحر انگیز حسن اور آپ کی دل ربا معصومیت جو آپ کی دوسری صفات میں چار چاند لگا دیتی ہے، کیا ان سب چیزوں کو پسند کرنا کوئی جرم ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ لیکن

آدمی نے کوئی جرم نہ کیا ہو تو بھی رنج والم کا شکار ہو سکتا ہے۔ اگر آپ نے میری عرض نیاز کو قبول نہ کیا تو میری زندگی مسلسل عذاب بن کے رہ جائے گی۔ میں آج پہلی دفعہ اپنا دل کسی کو پیش کر رہا ہوں۔ اگر آپ میرے سامنے نہ آتیں تو خیر میں خوش تو کیا رہتا مگر میرے اطمینان میں خلل نہ پڑتا۔ لیکن آپ کو دیکھنا تھا کہ دل سے چین رخصت ہو گیا، معلوم نہیں اب میرا کیا حشر ہوگا؟ اس کے باوجود آپ کو تعجب ہو رہا ہے کہ میں افسردہ کیوں ہوں۔ آپ مجھ سے اس کا سبب پوچھتی ہیں۔ بعض دفعہ تو مجھے ایسا لگا کہ میری حالت دیکھ کر آپ کو دکھ ہو رہا ہے۔ آہ، آپ اپنی زبان سے بس ایک لفظ کہہ دیجیے، آپ کے طفیل مجھے دنیا کی ساری خوشیاں حاصل ہو جائیں گی لیکن بولنے سے پہلے یہ بھی یاد رکھیے کہ آپ کا ایک لفظ مجھے جلا بھی سکتا ہے اور مار بھی سکتا ہے۔ میری قسمت کا فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے۔ میری ابدی راحت یا ابدی کلفت دونوں کا انحصار آپ کے اوپر ہے۔ میں اتنی بڑی امانت آپ کے سوا اور کس کے سپرد کر سکتا ہوں؟

آخر میں ایک دفعہ پھر معافی کا خواست گار ہوں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ میری بات غور سے سنیے گا، اب اس سے بھی بڑی جسارت کرتا ہوں۔ آپ سے التجا ہے کہ میرے خط کا جواب ضرور دیں۔ اگر آپ نے میری درخواست منظور نہ کی تو میں سمجھوں گا کہ آپ برا مان گئیں اور میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میرا احترام بھی میری محبت سے کسی طرح کم نہیں۔

ہاں، ایک بات اور یاد آئی۔ اگر آپ جواب دینا چاہیں تو جس طرح یہ خط میں نے آپ تک پہنچایا ہے وہی ذریعہ آپ بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ یہ طریقہ آسان بھی ہے اور محفوظ بھی۔

از۔۔۔۱۹؍ اگست ۱۷ء

خط نمبر ۱۸

از سے سیل دولانژ بنام سوفی کارنے

ارے، سوفی! تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ میں جو کچھ کرنا چاہ رہی ہوں تم نے اُس کے خلاف پہلے ہی فتویٰ صادر کر دیا! میری الجھنیں ویسے ہی کیا کم تھیں، اب تم نے اور بڑھا دیں۔ تم کہتی ہو کہ بات صاف ہے، مجھے جواب نہیں دینا چاہیے۔ تمھارے لیے تو بس کہہ دینا آسان ہے، پھر تم ساری بات پوری طرح سمجھ بھی نہیں رہی ہو۔ تم یہاں تو ہو نہیں جو کچھ دیکھ سکو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم میری جگہ ہوتیں تو تم بھی وہی کرتیں جو میں کر رہی ہوں۔ ہاں، ویسے یہ اصول تو ٹھیک ہے کہ جواب نہیں دینا چاہیے۔ میرے کل والے خط سے تمھیں معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ میں بھی جواب نہیں دینا چاہتی تھی لیکن میں سمجھتی ہوں کہ جو مسئلہ اس وقت میرے سامنے ہے، وہ آج تک کسی کے سامنے نہیں آیا ہوگا۔

پھر یہ کیسی مجبوری ہے کہ مجھے خود ہی فیصلہ کرنا ہے! کل شام مادام دمرتئی سے ملاقات کی اُمید

تھی لیکن وہ آئیں ہی نہیں۔ کچھ ایسا پیچ آن پڑا ہے کہ ہر بات میرے خلاف جا رہی ہے۔ مادام دمرتیئی کی وجہ سے ہی میری اُن سے ملاقات ہوئی۔ ہمیشہ اُنھیں کے ساتھ میں اُن سے ملی ہوں اور اُن سے باتیں کی ہیں۔ خیر، اس کی تو مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں ہے، لیکن مشکل کے وقت وہ مجھے چھوڑ کے چل دیں۔ ہائے، میری حالت بڑی قابلِ رحم ہے!

اچھا، اب آگے سنو۔ حسبِ معمول وہ کل بھی آئے تھے۔ میں اتنی بوکھلا گئی تھی کہ اُن کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ وہ مجھ سے بات تو کر نہیں سکے کیوں کہ اماں بیٹھی تھیں۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا تھا کہ جب وہ دیکھیں گے میں نے انھیں خط نہیں لکھا تو اُنھیں سخت افسوس ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف دیکھوں۔ ذرا سی دیر بعد مجھ سے پوچھنے لگے کہ جا کے آپ کا ساز لے آؤں؟ میرا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ آواز گلے میں اٹک کے رہ گئی، بڑی مشکل سے ہاں نکلا۔ جب وہ واپس آئے تو میری حالت اور خراب ہوگئی۔ ڈرتے ڈرتے اُن کی طرف نظر ڈالی۔ اُنھوں نے میری طرف بالکل نہیں دیکھا لیکن واقعی ایسے لگ رہے تھے جیسے خدانخواستہ بیمار ہوں۔ اُنھیں دیکھ کر مجھے بڑا رنج ہوا۔ وہ میرے ساز کے تار ٹھیک کرنے لگے اور جب میرے پاس لے کے آئے تو بولے... "آہ! مادموازیل!" اُنھوں نے بس یہ دو لفظ کہے لیکن لہجہ کچھ ایسا تھا کہ میرے تو ہوش اُڑ گئے۔ میں ساز بجانے لگی لیکن کچھ پتا نہیں تھا کہ کر کیا رہی ہوں۔ اماں نے پوچھا کہ آج تم دونوں گاؤ گے نہیں؟ اُنھوں نے معذرت کر دی اور کہا کہ میری کچھ طبیعت خراب ہے۔ میرے پاس کوئی عذر نہ تھا، چناں چہ مجھے گانا پڑا۔ اُس وقت میرا یہ جی چاہ رہا تھا کہ کاش میرا گلا سرے سے بھوجرا ہوتا۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا گیت شروع کیا جو مجھے آتا ہی نہ تھا کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ میں بالکل گا ہی نہ سکوں گی اور اماں کے کان کھڑے ہو جائیں گے۔ خوش قسمتی سے کوئی ملاقاتی آ پہنچا۔ میں گاڑی کی آواز سنتے ہی رک گئی اور اُن سے کہا کہ میرا ساز رکھ آیئے۔ مجھے بڑا اندیشہ تھا کہ وہ بس وہیں سے چل دیں گے لیکن وہ پھر آ بیٹھے۔

جو خاتون آئی تھیں اماں تو اُن سے باتیں کرنے لگیں۔ میرا جی چاہا کہ اُن کی طرف ایک نظر دیکھوں تو سہی۔ ایک لمحے بعد کیا دیکھتی ہوں کہ اُن کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔ اُنھوں نے اس ڈر سے منھ دوسری طرف کر لیا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں بھی رو پڑوں گی۔ میں باہر چلی گئی اور فوراً پنسل سے کاغذ کے پرزے پر لکھا... "خدا کے لیے اتنا رنج نہ کیجیے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جواب ضرور دوں گی۔" اتنا تو تم بھی مانو گی کہ اس میں کوئی بُری بات نہ تھی اور پھر مجھ میں ضبط کی طاقت بھی نہ رہی تھی۔ میں نے یہ پرچہ ساز کے تاروں میں رکھ دیا جیسے اُنھوں نے اپنا خط رکھا تھا اور کمرے میں واپس آگئی۔ اب مجھے قرار سا آیا لیکن بے چینی یہ ہو رہی تھی کہ یہ خاتون جلدی سے جائیں۔ خوش قسمتی کی بات یہ ہوئی کہ وہ یوں ہی ملنے چلی آئی تھیں اور بڑی جلدی رخصت ہوگئیں۔ اُن کے جاتے ہی میں نے کہا کہ میرا تو پھر ساز بجانے کو جی چاہ رہا ہے

اور اُن سے بولی کہ ذرا آپ جا کے لے آیئے۔ اُن کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ اُنھیں سان گمان تک نہیں۔ لیکن جب وہ لوٹے تو ہائے! وہ کتنے خوش تھے۔ ساز میرے سامنے رکھنے لگے تو اس طرح کھڑے ہوئے کہ اماں نہ دیکھ سکیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا۔... اب تمھیں کیا بتاؤں کس طرح!... بات تو بس ایک لمحے کی تھی لیکن مجھے ایک عجیب ہی مزہ ملا۔ خیر، میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ چناں چہ میرا ضمیر مجھے ملامت نہیں کر رہا۔

تو، پیاری سوفی! دیکھو اب اُنھیں خط لکھے بغیر چارہ نہیں کیوں کہ میں اُن سے وعدہ کر چکی ہوں۔ پھر مجھ سے یہ نہیں برداشت ہوتا کہ وہ میری وجہ سے رنجیدہ ہوں۔ کیوں کہ یہ دیکھ کر اُن سے زیادہ دکھ تو مجھے ہوتا ہے۔ اگر کوئی عیب کی بات ہوتی تو میں کبھی ایسا نہ کرتی۔ لیکن خط لکھنے میں کیا برائی ہے، خصوصاً ایسی حالت میں کہ جب اس سے ایک آدمی کا رنج و غم دُور ہوتا ہے؟ مجھے پریشانی یہ ہے کہ میں اچھا سا خط نہیں لکھ سکتی لیکن وہ خود سمجھ جائیں گے کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ پھر مجھے یقین ہے کہ وہ تو اسی بات سے خوش ہو جائیں گے کہ میں نے خط لکھا ہے۔

اچھا، پیاری سہیلی! خدا حافظ۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ میں غلطی کر رہی ہوں تو صاف صاف کہہ دو۔ لیکن میرا تو خیال ہے کہ میں کوئی بُری بات نہیں کر رہی۔ اب اُنھیں خط لکھنے کا وقت قریب آ رہا ہے اس لیے میرا دل بُری طرح دھڑک رہا ہے۔ لیکن بہرحال خط تو لکھنا ہی ہے کیوں کہ میں وعدہ کر چکی ہوں۔ خدا حافظ۔

از... ۲۰ اگست ۷۱ء

خط نمبر ۱۹

از سے سِیل وولانژ بنام شوالیے داں سنی

کل آپ بڑے غمگین تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے اتنا رنج ہوا کہ میں نے چار و ناچار آپ سے وعدہ کر لیا کہ آپ نے جو خط میرے نام لکھا تھا اُس کا جواب ضرور دوں گی۔ کل کی طرح آج بھی میرا یہی خیال ہے کہ مجھے خط نہیں لکھنا چاہیے لیکن چوں کہ میں نے وعدہ کر لیا ہے اس لیے میں وعدہ خلافی نہیں کرنا چاہتی۔ اسی سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ میرے دل میں آپ کی کتنی جگہ ہے۔ اب آپ کو یہ بات معلوم تو ہو ہی گئی ہے، لہٰذا مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے دوبارہ خط لکھنے کا مطالبہ نہیں کریں گے اور یہ بھی امید کرتی ہوں کہ آپ کسی کو یہ نہیں بتائیں گے کہ میں نے آپ کو خط لکھا ہے کیوں کہ اس سے میرے اوپر حرف آئے گا اور ممکن ہے مجھے سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔ سب سے بڑی امید مجھے یہ ہے کہ اس خط کے لکھنے کی وجہ سے آپ میرے متعلق کوئی بُری رائے قائم نہیں کریں گے کیوں کہ مجھے اس

بات سے جتنی تکلیف ہوگی اتنی کسی اور چیز سے نہیں ہوگی۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں ایسی بات آپ کے سوا کسی اور کی خاطر کبھی نہ کرتی۔ ایک عنایت میرے اوپر بھی کیجیے، آپ اتنے غمگین نہ رہا کیجیے، جتنے آج کل ہیں۔ آپ سے مل کر جو خوشی ہوتی ہے اس سے وہ سب ختم ہو کے رہ جاتی ہے۔ دیکھیے، میں آپ سے کیسے خلوص کے ساتھ باتیں کر رہی ہوں۔ مجھے اس کے سوا اور کچھ درکار نہیں کہ ہماری دوستی ہمیشہ ہمیشہ اسی طرح قائم رہے لیکن آپ سے التجا ہے کہ آپ مجھے دوبارہ خط نہ لکھیے گا۔

آپ کی نیاز کیش
سے سیل دولانژ
از... ۲۰ راگست ۷۱ء

خط نمبر ۲۰

از مارکیز دمرتئی بنام وائی کاؤنٹ دوال موں

اچھا، شریر، تم اس ڈر سے چاپلوسی پر اتر آئے کہ میں تمھارا مذاق اڑاؤں گی؟ چلو، میں نے تمھیں معاف کیا۔ تم نے مجھے ایسی احمقانہ باتیں لکھی ہیں کہ میں اس پرہیزگاری سے بھی درگزر کرتی ہوں جس میں تمھاری مادام دتر دویل نے تمھیں آج کل مبتلا کر رکھا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ میرا شوالیے اتنی ڈھیل نہیں دے گا جتنی میں دے سکتی ہوں۔ وہ آدمی ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ اُسے ہمارے تعلقات کی تجدید پسند نہیں آئے گی اور تمھیں جو پاگل پن کی بات سوجھی ہے وہ اُسے ذرا بھی دلچسپ نہیں معلوم ہوگی۔ بہر حال تمھاری تجویز پر مجھے بڑی ہنسی آئی اور ساتھ ہی ساتھ افسوس بھی ہوا کہ اس پر اکیلے ہنسنا پڑ رہا ہے۔ اگر تم یہاں موجود ہوتے تو پتا نہیں یہ ہنسی مجھے کہاں لے جاتی لیکن مجھے غور کرنے کی مہلت مل گئی اور اب میں پوری طرح مسلح ہوں یعنی سخت گیری پر اتر آئی ہوں۔ میرا انکار دائمی نہیں ہے لیکن میں دیر لگانا چاہتی ہوں اور یہی ٹھیک بھی ہے۔ ممکن ہے میری خود پسندی بیدار ہو جائے اور مجھے اس کھیل سے ایک دفعہ دلچسپی ہوئی تو پھر کچھ پتا نہیں کہ بات کہاں جا کے رکے۔ شاید میں تمھیں پھر اپنی قید میں لے لوں اور تمھاری مادام دتر دویل کی یاد تمھارے دل سے بھلا دوں۔ فرض کرو مجھ جیسی نالائق عورت تمھیں نیکی اور پاک بازی کی طرف سے بدظن کر دے تو کیسی شرم کی بات ہوگی! اس خطرے سے بچنے کے لیے میں مندرجہ ذیل شرطیں پیش کرتی ہوں۔

جب تم اپنی اس دین دار حسینہ کو حاصل کر لو اور میرے سامنے ثبوت پیش کر سکو تو فوراً آجاؤ، میں تمھاری ہوں لیکن تم جانتے ہو کہ اہم معاملات میں صرف تحریری ثبوت ہی قبول کیے جاتے ہیں۔ اس صورت میں ایک طرف تو میں صرف ایک سہارا نہیں رہوں گی بلکہ انعام بن جاؤں گی اور یہی بات مجھے

زیادہ پسند ہے۔ دوسری طرف تمھاری کامیابی بے وفائی اور بدعہدی کا ذریعہ بنے گی، چناں چہ اس میں اور بھی مزہ ملے گا۔ جتنی جلدی ہو سکے آؤ اور اپنے ساتھ اپنی ظفرمندی کا ثبوت بھی لیتے آؤ... جیسے پرانے زمانے کے دلاور اپنی فتوحات کی نشانیاں لا کر محبوبہ کے قدموں پر رکھ دیا کرتے تھے۔ میں سچ کہتی ہوں، مجھے یہ بات معلوم کرنے کی بڑی بے چینی ہے کہ ایسے واقعے کے بعد ایک پرہیزگار عورت خط میں کیا لکھے گی اور اپنے اوپر سے سارے پردے اٹھا دینے کے بعد اپنے الفاظ پر کون سا پردہ ڈالے گی۔ اب یہ تم دیکھو کہ میں اپنی قیمت کہیں بہت بڑھا چڑھا کے تو نہیں بتا رہی ہوں۔ لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ ایک پائی کم نہیں ہوگی۔ میرے پیارے وائی کاؤنٹ! تمھیں اس بات سے تکلیف تو ضرور ہو رہی ہے لیکن اُس وقت تک کے لیے مجھے اجازت دو کہ اپنے شوالیے کی وفادار رہوں اور اُس کا دل خوش کر کر کے اپنا بھی دل بہلاتی رہوں۔

اس کے باوجود اگر میں اتنی اخلاق پرست نہ ہوتی تو اس وقت شوالیے کو ایک خطرناک رقیب سے سابقہ ہوتا۔ میرا مطلب ننھی سے سیل وولانژ سے ہے۔ میں اس بچی پر دل و جان سے فدا ہوں۔ مجھے تو اچھا خاصا عشق ہوگیا ہے۔ اگر میں دھوکا نہیں کھا رہی تو وہ ایک دن بڑی فیشن ایبل عورت نکلے گی۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ اس کا ننھا سا دل کس طرح نشوونما پا رہا ہے اور یہ تماشا بھی بڑا ہی پُرلطف ہے۔ وہ داں سنی کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے لیکن ابھی اسے خود بھی خبر نہیں، داں سنی بھی اُس پر فریفتہ ہے لیکن لڑکا ہی جو ٹھیرا، ابھی شرماتا ہے اور دل کی بات کھل کے نہیں کہہ سکتا۔ دونوں کے دونوں میرے گرویدہ ہیں۔ خصوصاً یہ بچی تو مجھے اپنا راز بتانے کے لیے بے قرار ہے۔ خاص طور سے پچھلے دو چار دن سے تو میں دیکھ رہی ہوں کہ اُس کا دم سا گھٹ رہا ہے۔ اگر میں تھوڑی سی مدد بھی کرتی تو یہ اُس بچاری کی بہت بڑی خدمت ہوتی لیکن میں یہ بات نہیں بھولتی کہ وہ ابھی بالکل بچی ہے اور میں یہ نہیں چاہتی کہ میرے اوپر حرف آئے۔ داں سنی نے مجھ سے ذرا صاف صاف باتیں کی ہیں لیکن میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اس کی بات نہیں سنوں گی۔ رہی وہ لڑکی تو میرا اکثر جی للچاتا ہے کہ اسے اپنا مرید بنا لوں۔ جی چاہتا ہے کہ ژرکور کی اتنی خدمت تو کر ہی دوں۔ اُس نے مجھے کافی مہلت دے رکھی ہے کیوں کہ وہ اکتوبر تک کورسیکا میں رہے گا۔ میں سوچتی ہوں کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاؤں اور ہم ایک سیدھی سادی اسکول کی لڑکی کی بجائے ایک پکی پکائی عورت اُسے پیش کریں۔ اس شخص کی خود اعتمادی اور دیدہ دلیری بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ ایک عورت کو اُس سے بجا طور پر شکایت ہے اور اُس نے ابھی تک اپنا انتقام بھی نہیں لیا لیکن وہ مزے سے ٹانگیں پھیلا کے سوتا ہے! اگر کہیں یہ لڑکی اس وقت یہاں ہوتی تو خدا جانے میں اُس سے کیا کیا کہتی!

اچھا، وائی کاؤنٹ! خدا حافظ۔ میں تمھاری کامیابی کی دعائیں مانگ رہی ہوں۔ لیکن خدا کے

بلیے کچھ آگے تو بڑھو۔ یاد رکھو اگر تم نے اس عورت کو حاصل نہ کیا تو دوسری عورتیں تمھیں قبول کر لینے پر شرمائیں گی۔

از... ۳۱ر اگست ۱۷اء۔ رات کے چار بجے

خط نمبر ۲۱

از وائی کاؤنٹ دوال موں بنام مارکیز دمرتی

میری دل نواز حسینہ! لیجیے آخر میں ایک قدم آگے بڑھ ہی گیا اور اچھا خاصا فاصلہ طے کر لیا۔ ابھی میں منزلِ مقصود تک تو نہیں پہنچا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ میں ٹھیک راستے پر جا رہا ہوں اور اب یہ ڈر نہیں رہا کہ میں بھٹک گیا۔ آخر میں نے اظہار محبت کر ہی دیا۔ ویسے تو وہ منھ میں گھونگنیاں بھرے بیٹھی رہی لیکن مجھے بڑا ہی غیر مبہم اور انتہائی خوش آئند جواب مل گیا۔ مگر یہ تو آگے کی بات ہے، پہلے یہ سن لیجیے کہ شروعات کیسے ہوئی!؟

آپ کو یاد ہوگا کہ میری نگرانی کے لیے ایک آدمی میرے پیچھے لگا دیا گیا تھا۔ خیر، میں نے سوچا کہ اس ذلیل حرکت سے بھی کچھ ایسا فائدہ اٹھاؤں کہ لوگوں میں واہ واہ ہو جائے اور یہی میں نے کیا۔ میں نے ملازم کو حکم دیا کہ آس پاس میں کوئی ایسا بدنصیب آدمی ڈھونڈو جسے مدد کی ضرورت ہو۔ اس میں کوئی ایسی مشکل نہیں پیش آئی۔ کل تیسرے پہر اُس نے مجھے آ کے بتایا کہ ایک پورا خاندان ایسا ہے جو اپنا ٹیکس ادا نہیں کر سکا اور آج صبح اُن لوگوں کے گھر کا سامان قرق ہونے والا ہے۔ میں نے اچھی طرح پتا چلا لیا کہ اس خاندان میں کوئی لڑکی یا عورت ایسی نہیں جس کی عمر یا شکل صورت کی وجہ سے میری کارروائی پر شبہ ہو سکے۔ مجھے اس کا یقین ہو گیا تو میں نے رات کو کھانے کے وقت اعلان کر دیا کہ صبح میں شکار کو جا رہا ہوں۔ یہاں مجھے اپنی مادام دتر وویل کے ساتھ انصاف سے کام لینا چاہیے۔ اُس نے جو حکم دیا تھا اب اُس پر افسوس تو ضرور ہو رہا تھا، لیکن اپنے تجسس پر بھی قابو نہ تھا۔ بہرحال میرے ارادے کی مخالفت کرنے کی طاقت اُس میں نہیں تھی۔ کہنے لگی کہ گرمی بہت ہوگی، کہیں آپ کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ شکار ہاتھ نہیں آئے گا، مفت کی تھکن ہوگی۔ اس گفتگو کے دوران میں شاید اُس کی آنکھیں اتنا کچھ کہہ گئیں جتنا وہ چاہتی بھی نہ تھی اور مجھے پتا چل گیا کہ اس کا منشا یہ ہے کہ میں اُس کی بُری دلیلوں سے بھی قائل ہو جاؤں۔ آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ میں نے احتیاط سے کام لیا اور اُس کی بات نہیں سن کے دی۔ پھر اُس نے شکار اور شکاریوں کے خلاف ایک چھوٹی سی تقریر جھاڑ دی اور اُس کا نورانی چہرہ ساری شام مکدر رہا لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ لمحے بھر کے لیے تو مجھے ڈر لگا کہ اب یہ اپنے احکام منسوخ کر دے گی اور اس کے مزاج کی لطافت سے مجھے خواہ مخواہ نقصان پہنچے گا لیکن میں نے عورتوں کے تجسس کو نظرانداز ہی

کر دیا تھا اسی لیے میرا خیال غلط نکلا۔ اُسی رات میرے ملازم نے آ کے میری تشفی کر دی اور میں اطمینان سے جا سویا۔

صبح ہوئی تو میں اٹھ کے چل دیا۔ ابھی کوٹھی سے پچاس گز کے فاصلے پر بھی نہ پہنچا ہوں گا کہ دیکھا جاسوس پیچھے آ رہا ہے۔ میں میدان میں چلنے لگا جیسے شکار کھیل رہا ہوں اور اُس گاؤں کی طرف پڑ لیا جہاں میں جانا چاہتا تھا۔ راستے میں میری دل لگی کا کوئی سامان تھا تو یہ کہ اس آدمی کو خوب دوڑاؤں جو میرے پیچھے آ رہا ہے۔ وہ سڑک سے تو ہٹ نہیں سکتا تھا اس لیے بچارے کو تگنا فاصلہ طے کرنا پڑتا اور پوری رفتار سے۔ میں نے اُس سے اتنی ورزش کرائی کہ مجھے بھی پسینا آ گیا اور میں ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ اب ذرا اُس کی دیدہ دلیری دیکھیے۔ مجھ سے بیس گز کے فاصلے پر ایک جھاڑی میں گھس کے بیٹھ گیا۔ ایک دفعہ کو تو یہ جی چاہا کہ اسی پہ نشانہ آزماؤں۔ ویسے تو میری بندوق میں بس مٹی کے چھرے تھے لیکن اُسے بھی پتا چل جاتا کہ تجسس میں کیا خطرات ہیں۔ اُس کی قسمت اچھی تھی، مجھے یاد آ گیا کہ یہ آدمی تو میرے لیے بہت مفید اور میری تجاویز کے لیے اشد ضروری ہے۔ اس خیال نے اُس کی جان بچالی۔

میں گاؤں پہنچا تو دیکھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ بات کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ معاملہ ہے۔ میں نے قرق امین کو پاس بلایا اور اپنی رحم دلی سے مجبور ہو کے نہایت فیاضی کے ساتھ چھپّن لیور ادا کر دیے جن کی وجہ سے پانچ آدمی خانماں برباد ہوئے جا رہے تھے۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ اس سیدھی سادی سی بات پر تحسین و آفریں کے کیسے ڈونگرے برسے ہیں اور لوگوں نے مجھے کتنی دعائیں دی ہیں! اس خاندان کے بزرگ کا چہرہ ایک منٹ پہلے ناامیدی کی وجہ سے وحشت زدہ اور مسخ ہو رہا تھا لیکن اب تو احسان مندی کے مارے اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور شکل پہ ایک نور سا آ گیا۔ میں یہ تماشا دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک نوجوان کسان دو بچوں کا ہاتھ پکڑے اور ایک عورت کو ساتھ لیے میری طرف لپکا اور اُن سے بولا، ''یہ رحمت کے فرشتے ہیں۔ ان کے پیر چھوؤ۔'' ذرا کی ذرا میں سارا خاندان میرے قدموں پر آ جھکا۔ یہاں مجھے اپنی کم زوری کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں نے ایک اضطراری لیکن خوش آئند قسم کی لذت محسوس کی۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ بھلائی کرنے میں بھی کیسا لطف ملتا ہے۔ میرا تو یہ خیال ہو چلا ہے کہ جن لوگوں کو ہم نیک کہتے ہیں وہ اتنے نیک نہیں ہوتے جتنا بتلاتے ہیں۔ بہرحال کچھ بھی ہو، میں نے انصاف کی بات یہی سمجھی کہ مجھے ان بچاروں سے لطف حاصل ہوا ہے، انھیں اس کی قیمت دینی چاہیے۔ میں دس اشرفیاں لے کے آیا تھا، وہ میں نے انھیں دے دیں۔ یہ لوگ پھر شکریہ ادا کرنے لگے لیکن اب اس میں وہ اثر انگیزی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اصلی اور زبردست اثر تو حاجت مندی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اب تو ایک غیر ضروری تحفہ ملنے پر تعجب اور احسان مندی کا سیدھا سادا اظہار ہو رہا تھا۔

تو مطلب یہ کہ ان لوگوں کی لمبی چوڑی دعاؤں کے درمیان میں بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے ڈرامے کے آخری سین میں ہیرو۔ ہاں، یہ بھی سن لیجیے کہ اس جمگھٹ میں وہ وفادار جاسوس سب سے آگے کھڑا تھا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح ان لوگوں سے پیچھا چھڑایا اور گھر واپس آ گیا۔ فی الجملہ اس اختراع پر میں اپنے آپ کو مبارک باد کے لائق سمجھتا ہوں۔ میں نے زحمت تو بڑی اٹھائی ہے لیکن یہ عورت اس کی مستحق ہے۔ اسی تکلیف کی بہ دولت میں ایک دن اُس پر اپنا حق جما سکوں گا۔ میں نے تو گویا اُس کی قیمت پہلے ہی سے ادا کر دی ہے۔ چناں چہ مجھے حق ہوگا کہ جس طرح چاہوں اُسے کام میں لاؤں۔ اب میرا ضمیر بھی مجھے ملامت نہیں کرے گا۔

یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ ہر بات سے فائدہ اٹھانے کی خاطر میں نے ان نیک لوگوں سے کہا کہ میری مقصد برآری کے لیے خدا سے دعا کریں۔ آپ دیکھیں گی کہ اُن کی دعائیں خدا نے تھوڑی بہت تو سن بھی لیں ..... مگر ملازم نے آکے بتایا ہے کہ کھانا لگ گیا۔ اگر میں نے یہ خط کھانے کے بعد پورا کیا تو ڈاک میں جانے سے رہ جائے گا۔ چناں چہ باقی باتیں اگلے خط میں لکھوں گا۔ مجھے افسوس یہ ہے کہ باقی باتیں ہی سب سے مزے دار تھیں۔ اچھا، حسینۂ دل نواز! خدا حافظ۔ مجھے جلدی ہے کہ اُسے جا کے دیکھوں۔ آپ کی وجہ سے ایک لمحہ ضائع ہو گیا۔

از.....۲۰ر اگست ۱۷۔۔ء

خط نمبر ۲۲

از مادام دتروویل بنام مادام دوولانژ

مادام! مجھے یقین ہے کہ آپ کو موسیو دوال موں کے ایک کام کا حال سن کر انتہائی خوشی ہوگی کیوں کہ میرے خیال میں یہ اُن تمام خصائل کے بالکل برعکس ہے جو لوگوں نے آپ سے بیان کیے ہیں۔ کسی شخص کے بارے میں بدظنی سے بڑی تکلیف پہنچتی ہے، پھر جن لوگوں میں ایسی خوبیاں موجود ہوں کہ نیکی میں بھی دل کشی پیدا ہو جائے، اگر اُن میں عیب ہی عیب نظر آئیں تو انتہائی افسوس ہوتا ہے! خصوصاً آپ تو بڑی نرم دل ہیں، کسی کی خامیوں سے چشم پوشی کر کے آپ کو بڑی مسرت ہوتی ہے۔ آپ نے کسی کے بارے میں سخت رائے قائم کر لی ہو اور آپ کو اپنی رائے تبدیل کرنے کا موقع دیا جائے تو یہ تو آپ کی ایک خدمت ہوگی۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ موسیو دوال موں پر ضرور نوازش فرمائیں گی اور انھیں آپ سے یہ امید رکھنے کا حق بھی پہنچتا ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گی کہ یہ نوازش نہیں بلکہ انصاف ہوگا۔ اب سنیے کہ میں ایسا کیوں سمجھتی ہوں؟

آج صبح وہ کچھ اس طرح سیر کو نکلے جس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ آس پاس میں کوئی معاملہ چل

رہا ہوگا۔ آپ کا بھی یہی خیال تھا۔ اب مجھے اپنے اوپر شرم آرہی ہے کہ میں نے یہ خیال اتنی جلدی کیوں قبول کر لیا۔ یہ اُن کی خوش قسمتی سمجھیے بلکہ ہم سب کی خوش قسمتی سمجھیے کیوں کہ ہم کسی کے ساتھ ناانصافی کرنے سے بچے۔ میرا ایک ملازم بھی کسی کام سے اسی طرف گیا جدھر وہ گئے تھے۔[٨☆] اُن کے بارے میں میرا تجسس ہے تو بری سی بات لیکن اچھا ہی ہوا کہ میری تشفی ہوگئی۔ ملازم نے واپس آ کے سنایا کہ ایک گاؤں میں موسیو دوال موں کو ایک بدنصیب خاندان ملا جس کا سارا سامان نیلام ہو رہا تھا کیوں کہ وہ لوگ اپنا ٹیکس نہیں ادا کر سکے تھے۔ موسیو دوال موں نے فوراً اُن کا قرض ادا کر دیا اور ساتھ ہی اُن غریبوں کو اوپر سے ایک اچھی خاصی رقم بھی دی۔ یہ نیک کام میرے ملازم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے بتایا لوگ آپس میں ذکر کر رہے تھے کہ کل ایک خدمت گار گاؤں میں یہ پوچھتا پھر رہا تھا کہ یہاں کوئی حاجت مند تو نہیں؟ خدمت گار کا جو حلیہ لوگوں نے بتایا اُس کے لحاظ سے میرے ملازم کا خیال ہے کہ یہ موسیو دوال موں کا نوکر ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو پھر یہ نہیں ہوسکتا کہ انھیں یوں ہی اتفاقیہ طور سے کسی پر رحم آ گیا ہو۔ اُن لوگوں کے ساتھ اُنھوں نے پہلے سے سوچ سمجھ کے یہ بھلائی کی ہے۔ یہ تو اُن کی فیاضی اور خداترسی ہے۔ انسان میں اس سے بڑی خوبی اور کیا ہوسکتی ہے؟ خیر، چاہے یہ اتفاقیہ بات ہو چاہے سوچی سمجھی ہوئی، بہرحال ہے نیکی کا کام اور تعریف کے لائق۔ میری آنکھوں میں تو قصہ سن کے ہی آنسو آ گئے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ میں ایک بات اور سنا دوں۔ خود تو انھوں نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔ میں نے یہ قصہ چھیڑا تو پہلے تو بالکل مکر گئے پھر جب قبولا بھی تو اس طرح جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اُن کی اس منکسر مزاجی نے تو اس نیکی میں چار چاند لگا دیے۔

اچھا، میری محترم دوست! اب بتائیے کہ موسیو دوال موں کیا واقعی عیش پرست اور اخلاق باختہ ہیں؟ اگر وہ ایسے ہی ہیں اور ساتھ ساتھ اس طرح کے کام بھی کرتے ہیں تو پھر نیک لوگوں کے لیے کیا باقی رہ گیا؟ خداترسی اور رحم دلی سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ تو بڑی مقدس چیز ہے۔ کیا بدکار لوگ بھی اس میں نیک لوگوں کے شریک ہوسکتے ہیں؟ کیا خدا اس کی اجازت دے گا کہ نیک اور پرہیزگار لوگوں کو ایک بدکار آدمی کے ہاتھ سے مدد ملے اور وہ اس غیبی امداد پر خدا کا شکر بجا لائیں؟ کیا اُسے یہ بات اچھی لگے گی کہ ایسے پاک طینت لوگ ایک فاسق و فاجر کو دعائیں دیں؟ ہرگز نہیں۔ میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ وہ ایک عرصے تک معائب میں گرفتار تو رہا لیکن ہمیشہ ایسا نہیں رہ سکتا۔ یہ بات تو میرے تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ جو آدمی نیک کام کرے وہ نیکی کا دشمن ہو۔ آدمی کو اپنے ملاقاتیوں سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے اُس کی ایک زندہ مثال شاید موسیو دوال موں ہیں۔ مجھے تو یہی بات درست معلوم ہوتی ہے، اسی لیے میں نے اتنی بحث کی۔ امید ہے کہ اُن کے بارے میں آپ کو جتنی غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہو جائیں گی۔ آپ کی اور میری پُرخلوص دوستی تو عمر بھر قائم رہنے والی چیز ہے لیکن اس بحث و تمحیص کے بعد تو اس کی قدر میری

☆٨۔ کیا مادام دتروویل کو یہ بتانے کی اہمیت نہیں پڑ رہی کہ ملازم خود اسی کے حکم سے گیا تھا؟

نظروں میں اور بھی بڑھ گئی ہے۔

آپ کی نیاز کیش

ہاں، ایک بات اور یاد آگئی۔ اس وقت مادام دروز مونڈ اور میں اس ایمان دار لیکن بدنصیب خاندان سے ملنے جا رہے ہیں۔ موسیو دوال موں تو انھیں بہت کچھ دے چکے ہیں، ہم سے بھی جو کچھ بن پڑے گا اُن کے لیے کریں گے۔ ہم موسیو دوال موں کو بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔ ہماری بہ دولت یہ لوگ اپنے محسن کو دوبارہ دیکھ سکیں گے اور اس سے انھیں بے انتہا خوشی ہوگی۔ موسیو دوال موں نے ہمارے لیے چھوڑا ہی کیا ہے، اب تو ہم بس اتنا ہی کر سکتے ہیں۔

از... ۲۱راگست ۱۷

خط نمبر ۲۳

از وائی کاؤنٹ دوال موں بنام مارکیز دمرتئی

میں پچھلے خط میں یہاں تک پہنچا تھا کہ گھر واپس آگیا۔ اب آگے قصہ سنیے۔

میں نے جلدی جلدی ہاتھ منھ دھو کر بال بنائے اور دیوان خانے میں چلا گیا۔ میری حسینہ بیٹھی کچھ کاڑھ رہی تھی اور پادری میری بڑھی خالہ کو اخبار پڑھ کے سنا رہا تھا۔ میں کاڑھنے کے چوکھٹے کے پاس جا بیٹھا۔ اُس کی نظروں میں معمول سے زیادہ ملائمت تھی بلکہ وہ تو مجھے پیار کرتی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں تاڑ گیا کہ خادم اپنی مہم کا قصہ سنا چکا ہے۔ میری محبوبہ دل نواز نے میرا راز اتنی مشکل سے تو معلوم کیا تھا اور وہ بھی چھپے چوری، اب وہ زیادہ ضبط نہ کر سکی۔ ایک نہایت مقطع پادری صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے بلکہ اچھا خاصا وعظ کہہ رہے تھے۔ اُس نے اُن کا بھی لحاظ نہ کیا اور بیچ میں بول اٹھی... "مجھے بھی آپ کو ایک خبر سنانی ہے۔" پھر اُس نے فوراً میرا کارنامہ یوں حرف بہ حرف سنایا کہ اُس کے مخبر کی ذہانت پر داد دینے کو جی چاہنے لگا۔ آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ اس موقعے پر میں نے کیسے انکسار سے کام لیا ہوگا۔ چاہے عورت ابھی اپنی محبت سے بے خبر ہو لیکن جب وہ اپنے محبوب کی تعریف کر رہی ہو تو بھلا اُس کی زبان کون بند کر سکتا ہے؟ میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اسے بولنے دوں۔ بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی ولی کی شان میں منقبت پڑھ رہی ہو۔ اُس کا چہرہ دمک اٹھا تھا، حرکات و سکنات میں ایک بے تکلفی آگئی تھی اور خصوصاً آواز کے اُتار چڑھاؤ سے تو اُس کے سارے دلی جذبات بے نقاب ہوئے جا رہے تھے۔ اس دوران میں میری نظر انھیں چیزوں پر تھی اور مجھے اپنی محبت کے بارآور ہونے کی اُمید بندھ چلی تھی۔ اُس کی بات پوری طرح ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ مادام دروزمونڈ بول اٹھیں... "یہاں آؤ بیٹے! میں تمھیں گلے لگا لوں۔" مجھے فوراً ہی یوں محسوس ہوا کہ اگر اب کی دفعہ میں اس حسین واعظ کو گلے لگا

لوں تو یہ مجھے نہیں روک سکتی۔ بہرحال اُس نے بچ نکلنے کی اپنی سی کوشش ضرور کی لیکن وہ میرے بازوؤں میں آ ہی گئی۔ مدافعت کی طاقت تو الگ رہی اُس میں تو سیدھے کھڑے رہنے کی سکت بھی نہ تھی۔ میں اس عورت کو جتنا دیکھتا ہوں وہ مجھے اُتنی ہی اچھی لگتی ہے۔ وہ جلدی سے اپنے چوکھٹے کے پاس جا بیٹھی اور دوسروں کو یہی معلوم ہوا کہ پھر کاڑھنے میں لگ گئی لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا لرزتا ہوا ہاتھ اسے کام نہیں کرنے دے رہا۔

کھانے کے بعد خواتین کا جی چاہا کہ اُن بدنصیب لوگوں سے ملنے جائیں جن کی میں نے اپنی خداترسی میں مدد کی تھی، میں بھی اُن کے ساتھ گیا۔ شکرگزاری اور تحسین و آفریں کے اس دوسرے منظر کا بیان ضروری نہیں، آپ کو خواہ مخواہ کوفت ہوگی۔ میرے دل میں تو ایک اور ہی یاد چٹکیاں لے رہی ہے۔ چناں چہ کوٹھی کی طرف واپسی کا حال سنیے۔ راستے میں میری حسینہ معمول سے زیادہ کھوئی کھوئی سی لگ رہی تھی اور اُس نے منھ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ میں بھی اس فکر میں تھا کہ اُس کے دل پر آج کے واقعے سے جو اثر پڑا ہے اُس سے فائدہ اٹھانے کا کوئی طریقہ نکالوں، چناں چہ میں بھی خاموش رہا۔ بس مادام دروزموند بولتی رہیں اور میں ہوں ہاں کرتا رہا۔ وہ ہماری خاموشی سے بیزار ہوگئی ہوں گی۔ میری چال بھی یہی تھی اور میں اس میں کامیاب رہا۔ چناں چہ ہم گاڑی سے اُترے تو وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئیں اور میری حسینہ کو اور مجھے دیوان خانے میں اکیلا چھوڑ گئیں جہاں ہلکی سی روشنی ہو رہی تھی... یعنی وہ ہلکا ہلکا اندھیرا جہاں کم ہمت سے کم ہمت عشق میں بھی جرأتِ رندانہ آ جاتی ہے۔

مجھے یہ زحمت ہی نہیں اٹھانی پڑی کہ گفتگو کا رخ اُدھر پھیروں جس طرف میں اسے چلانا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی مہارت سے بھی اتنا فیض نہ پہنچتا جتنا اس دل نواز حسینہ کی گرم جوشی سے پہنچا۔ وہ بڑی ملائم نظروں سے میری طرف تکتے ہوئے بولی، ”جس آدمی کو خدا نے نیک کاموں کی ایسی توفیق دی ہو وہ بُری باتوں میں کس طرح پھنس جاتا ہے؟“ میں نے جواب دیا، ”نہ تو میں اس تعریف کا مستحق ہوں نہ اس تنقیص کا۔ تعجب ہے کہ آپ اتنی ذہانت کے باوجود مجھے نہ سمجھ سکیں۔ اگر میں نے اپنے راز آپ سے کہہ دیے تو ممکن ہے کہ میں آپ کی نظروں میں گر جاؤں لیکن آپ جیسی قابلِ اعتماد ہستی سے میں کوئی بات نہیں چھپا سکتا۔ اگر آپ میرے افعال و اعمال کی تہہ تک پہنچنا چاہتی ہیں تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے ہم جلیسوں کا رنگ بڑی جلدی اختیار کر لیتا ہوں۔ میں بدقماش لوگوں میں پھنس گیا تھا لہٰذا میں نے بھی اُن کے سارے عیبوں کی نقل اتارنی شروع کر دی بلکہ شاید مجھے تو اس بات پر بھی فخر ہوا کہ میں اُن سے آگے بڑھ گیا۔ یہاں نیکی اور پاک بازی کا نمونہ میرے سامنے آیا تو اسی طرح وہ مجھے بھا گیا۔ آپ کی برابری تو خیر میں کیا کروں گا لیکن کم سے کم میں نے آپ کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش تو ضرور کی ہے۔ آج آپ جس بات کی وجہ سے میری تعریف کر رہی ہیں اگر آپ کو اس کے اصل مقصد کا پتا چل جائے تو شاید آپ کی نظروں میں اُس کی ذرا بھی وقعت نہ رہے گی!“ (دیکھا آپ نے، میری دل نواز

دوست، میں حقیقت کے کتنے قریب آ گیا تھا۔) پھر میں بولا، ''میں نے ان بدنصیب لوگوں کی مدد تو ضرور کی ہے لیکن ان پر میرا ذرا بھی احسان نہیں ہے۔ جس چیز کو آپ ایک نیک کام سمجھ رہی ہیں میں تو اُس کے ذریعے آپ کو خوش کرنے کی فکر میں تھا۔ اب مجھے کہنا ہی پڑ رہا ہے تو پوری بات سن لیجیے۔ میری حیثیت تو صرف اُس دیوی کے ایک معمولی آلۂ کار کی تھی جس کا میں پجاری ہوں (یہاں اُس نے بیچ میں بولنا چاہا لیکن میں نے اُسے موقع ہی نہ دیا)۔ یہ بھی میری کم زوری ہے کہ اس وقت یہ راز میری زبان سے نکل گیا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ آپ کو اس کا پتا نہ چلنے دوں گا۔ میں اپنی مسرت اسی بات میں سمجھتا تھا کہ آپ کی نیکی اور آپ کے حسن کو ایسا مصفا و منزہ خراجِ عقیدت پیش کروں جس کی آپ کو کبھی خبر تک نہ ہونے پائے لیکن سادہ دلی کا ایسا بے مثال نمونہ میرے سامنے موجود ہو تو پھر میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھ سکتا۔ بہرحال میں نے جو یہ بات آپ سے چھپائی تو اس میں کوئی مجرمانہ ارادہ پوشیدہ نہیں تھا اور میرا ضمیر مجھے اس پر ملامت نہیں کرتا۔ یہ نہ سمجھیے گا کہ میں دل میں کوئی غیر مستحسن امید لیے بیٹھا ہوں اور آپ کی بے حرمتی پر آمادہ ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے کتنی اذیت اٹھانی پڑے گی لیکن یہ درد و غم بھی مجھے عزیز ہوگا۔ اس سے مجھے پتا چلے گا کہ میری محبت کہاں تک جا پہنچی ہے۔ میں اپنے مصائب آپ کے قدموں پر لا رکھوں گا، اپنی بپتا آپ کے دل کو سناؤں گا۔ وہیں سے مجھے اتنی طاقت ملے گی کہ پھر سے دُکھ جھیل سکوں۔ دنیا میں مجھے کہیں ہمدردی اور رفاقت ملے گی تو وہیں۔ میری تسلّی کے لیے اتنی بات ہی کافی ہوگی کہ آپ کو مجھ پر ترس تو آیا۔ مجھے آپ سے دیوانہ وار محبت ہے۔ میری خبر لیجیے، میرے اوپر رحم کھائیے، میری مدد کیجیے!'' میں اُس کے قدموں پر جھک گیا اور اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیے لیکن اُس نے ایک دم سے ہاتھ چھڑا لیے اور آنکھوں پر رکھ لیے۔ اُس کے چہرے سے ایک عجیب حسرت و یاس ٹپک رہی تھی۔ وہ آہ بھر کے بولی... ''میں کتنی بدنصیب عورت ہوں!'' اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ خوش قسمتی کی بات یہ ہوئی کہ میں نے اپنے جذبات میں اتنا تلاطم پیدا کر لیا تھا کہ میں بھی رو رہا تھا۔ میں نے اُس کے ہاتھ پھر پکڑ لیے اور انھیں آنسوؤں سے نہلا دیا۔ یہ احتیاطی تدبیر نہایت ضروری تھی کیوں کہ وہ اپنے غم میں ایسی ڈوبی ہوئی تھی کہ اگر میں اُسے مطلع کرنے کا یہ طریقہ اختیار نہ کرتا تو اُسے میرا غم نظر ہی نہ آتا۔ اس کے علاوہ مجھے اُس کے حسین چہرے کو، جسے آنسوؤں نے اور بھی دل کش بنا دیا تھا اطمینان کے ساتھ گھورنے کا موقع بھی مل گیا۔ اُسے دیکھتے دیکھتے مجھ میں گرمی آ گئی اور ایسا بے اختیار ہوا کہ جی چاہا اس لمحے سے فائدہ اٹھا لوں۔

انسان بھی کتنا کم زور واقع ہوا ہے! حالات بھی کیسی عظیم قوت رکھتے ہیں! میں نے جتنے منصوبے گانٹھے تھے وہ سب ایک دم سے بھول بیٹھا اور اب خطرہ یہ تھا کہ مجھے کامرانی تو وقت سے پہلے حاصل ہو جائے مگر میں ایک طویل کش مکش کے لطف اور ایک اذیت ناک شکست کی ساری تفصیلات سے محروم رہ جاؤں۔ میں اُن خواہشات سے مغلوب ہو کر رہ گیا تھا جو صرف کسی نوجوان کے لیے ہی مناسب

ہیں۔ میں مادام دتر وویل کے فاتح کی یہ گت بنانے والا تھا کہ اُسے اپنی محنت کے صلے میں اس کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہو کہ چلو ایک عورت اور ہتھے چڑھی! میں تو یہ چاہتا ہوں کہ وہ خود ہتھیار ڈالے مگر کش مکش کے بعد! اُس میں مدافعت کی طاقت ہو مگر اتنی نہیں کہ غالب آجائے۔ اُسے اپنی کم زوری کا پورا پورا احساس ہو اور وہ شکست ماننے پر مجبور ہو جائے۔ اناڑیوں کا شکار یہ ہوتا ہے کہ جہاں ہرن چھپا بیٹھا ہے وہاں چپکے چپکے پہنچے اور اُسے مار لیا۔ سچا شکاری ہرن کا پیچھا کر کے اُسے گراتا ہے۔ کہیے، یہ تجویز بڑے زور کی ہے یا نہیں؟ لیکن اگر ایک حادثہ میری احتیاط پسندی کی مدد کو نہ آ پہنچتا تو شاید میں اس وقت افسوس کر رہا ہوتا کہ میں نے اپنی تجویز پر عمل کیوں نہ کیا۔

ہمیں ایک شور سا سنائی دیا۔ کوئی دیوان خانے کی طرف آ رہا تھا۔ مادام دتر وویل خوف زدہ ہو کر ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک شمع دان لے کر کمرے سے چلی گئی۔ میں بھی اُسے نہ روک سکا لیکن آنے والا ایک معمولی ملازم تھا۔ میں اس طرف سے مطمئن ہوتے ہی مادام دتر وویل کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ میں دو چار قدم ہی گیا ہوں گا کہ یا تو وہ مجھے پہچان گئی یا خوف کے مبہم احساس کی وجہ سے ایسا ہوا، بہر حال مجھے پتا چلا کہ اُس نے اپنی چال تیز کر دی اور جلدی سے اپنے کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ میں دروازے پر پہنچا، مگر اندر سے تالہ لگ چکا تھا۔ میں نے احتیاط سے کام لیا اور دروازہ نہیں کھٹکھٹایا کیوں کہ اس طرح اُسے نہایت آسان قسم کی مدافعت کا موقع مل جاتا۔ مجھے یہ مفید اور سیدھی سادی بات سوجھی کہ تالے کے روزن میں سے جھانکوں۔ میں نے دیکھا کہ یہ حسین عورت گھٹنوں کے بل جھکی زار و قطار رو رہی ہے اور نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ دعا مانگ رہی ہے۔ آخر وہ کس دیوتا کے سامنے گڑگڑا رہی تھی؟ ایسا کون سا دیوتا ہے جس میں محبت کے مقابلے کی طاقت ہو؟ اب اُس کا کسی اور سے مدد مانگنا بالکل بے کار ہے۔ اُس کی قسمت میرے ہاتھ میں ہے۔

یہ سوچ کر کہ آج کافی کام ہو گیا، میں بھی اپنے کمرے میں چلا آیا اور آپ کو خط لکھنا شروع کر دیا۔ امید تھی کہ اُس سے کھانے کے وقت ملاقات ہوگی لیکن اُس نے کہلوا دیا کہ میری طبیعت خراب ہے اور میں آرام کر رہی ہوں۔ مادام دروز موند نے اُس کے کمرے میں جانا چاہا مگر وہ تو ایک بہانے باز ہے۔ اُس نے یہ عذر پیش کر دیا کہ میرے سر میں سخت درد ہے اور مجھ میں اس وقت کسی سے ملنے کی سکت نہیں ہے۔ آپ خود سمجھ سکتی ہیں کے کھانے کے بعد میں زیادہ دیر نہیں رکا اور میرے سر میں درد ہو گیا۔ اپنے کمرے میں آکر میں نے ایک لمبا چوڑا خط لکھا اور اُس کے نا ملائم رویّے کی سخت شکایت کی، پھر میں یہ سوچتا ہوا سونے چل دیا کہ خط صبح بھجوا دوں گا۔ مجھے ٹھیک طرح نیند نہیں آئی، اس کا اندازہ تو آپ کو اس خط کی تاریخ ہی سے ہو جائے گا۔ خیر، میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا شکایت نامہ دوبارہ پڑھا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ میں نے خط لکھنے میں پوری احتیاط نہیں برتی۔ میں نے محبت سے زیادہ جوش و خروش اور افسردگی سے زیادہ بدمزگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ خط مجھے دوبارہ لکھنا چاہیے لیکن طبیعت کو تھوڑا سا قرار

آجائے تو لکھوں۔

لیجیے، صبح ہونے لگی۔ امید ہے کہ اس وقت کی تازہ تازہ ہوا میں مجھے نیند آ جائے گی۔ اب میں پھر سونے جا رہا ہوں۔ یہ عورت میرے دل و دماغ پر کتنی ہی حاوی کیوں نہ ہوجائے میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس میں اتنا منہمک نہ ہوں گا کہ آپ کا خیال تک نہ آئے۔ اچھا، میری حسینہ دل نواز خدا حافظ۔

از... ۳۱ر اگست ۱۷۷۱ء۔ چار بجے صبح

خط نمبر ۲۴

از وائی کاؤنٹ دوال موں بنام مادام دتر وویل

مادام! خدا کے لیے مجھ پر رحم کھائیے۔ میری روح میں تلاطم برپا ہے، مجھ پر تھوڑی سی نوازش کیجیے۔ مجھے اس ہیجان سے نجات دلائیے۔ کم سے کم اتنا تو بتا دیجیے کہ ابھی امید رکھوں یا بالکل مایوس ہوجاؤں۔ میرے ایک طرف خوشیاں ہیں، دوسری طرف رنج۔ اور میں دونوں کے درمیان کھڑا ہوں۔ اس سے بڑا عذاب کون سا ہوگا کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں جانا کدھر ہے؟ آخر میں نے آپ سے دل کی بات کیوں کہہ دی؟ میں آپ کے حسن سے اتنا مرعوب کیوں ہوگیا کہ اپنا راز خود فاش کر دیا؟ جب میں اپنی خاموش محبت پر قانع تھا تو کم سے کم مجھے چاہت کے مزے تو میسر تھے۔ اس پاکیزہ جذبے پر ابھی تک آپ کے غم کا سایہ نہیں پڑا تھا اور میری خوشی کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ لیکن جب سے میں نے آپ کے آنسو بہتے دیکھے ہیں اور آپ کا وہ دردناک جملہ سنا ہے کہ ''میں بھی کتنی بدنصیب عورت ہوں!'' وہی محبت جو پہلے میری مسرتوں کا سرچشمہ تھی اب حسرت و یاس کا باعث بن گئی ہے۔ آپ کے یہ الفاظ مدتوں میرے دل میں گونجتے رہیں گے۔ شاید یہ بھی قسمت کی خوبی ہے کہ اس لطیف ترین جذبے نے آپ کے اندر کوئی ردِّعمل پیدا بھی کیا تو خوف کا لیکن آپ کو اندیشہ کیا ہے؟ خیر اس بات کا ڈر تو آپ کو ہو ہی نہیں سکتا کہ کہیں آپ بھی محبت میں گرفتار نہ ہوگئی ہوں۔ میں نے آپ کو بالکل غلط سمجھا۔ آپ کا دل محبت کے لیے بنا ہی نہیں۔ میرے دل کی آپ کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں لیکن بس میرا ہی دل حسّاس واقع ہوا ہے۔ آپ کے دل میں تو رحم کا بھی گزر نہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو جس بدنصیب نے اپنا دُکھ درد آپ کے سامنے صاف صاف کہہ ڈالا، آپ اُس کی تسلی کے لیے ایک آدھ لفظ کہنے سے انکار نہ کرتیں۔ جس آدمی کو آپ کی طرف دیکھتے رہنے کے سوا اور کسی بات میں خوشی نہیں ملتی آپ اُس سے یوں نظریں نہ چراتیں۔ پھر یہ نہ ہوتا کہ آپ اپنی علالت کی خبر سنا کر اُس کی بے چینی سے لطف لیں اور اُسے مزاج پرسی کی اجازت بھی نہ دیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ محسوس کرتیں کہ یہ رات آپ کے لیے تو آرام و استراحت کے بارہ گھنٹوں کے مترادف ہوگی مگر اُس کے لیے اذیت کی ایک پوری صدی کے برابر ہوگی۔

ذرا بتایئے تو سہی، میں اس سختی اور سنگ دلی کا مستحق کیسے ٹھہرا ہوں؟ چلیے، آپ ہی انصاف کیجیے۔ میں اس سے بھی نہیں گھبراتا۔ میرا قصور اتنا ہی تو ہے کہ میں بے اختیار ایک جذبے سے مغلوب ہوگیا۔ یہ آپ کے حسن کا فیضان تھا، اس میں کوئی بات پاک بازی کے خلاف بھی نہ تھی اور میں نے ادب کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اگر میں نے معصومیت کے ساتھ اپنی محبت کا اقرار کرلیا تو کسی اُمید کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے اوپر اعتماد کے باعث۔ خود آپ کے رویّے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ مجھ پر اعتبار کرتی ہیں اور میں نے بھی چنیں چناں کیے بغیر آپ کا یقین کرلیا۔ کیا اب آپ مجھ سے پھر جائیں گی؟ نہیں، مجھے تو یقین نہیں آتا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ میں ایک عیب آپ سے منسوب کررہا ہوں اور میرے دل کو یہ خیال تک گوارا نہیں کہ آپ کے اندر کوئی عیب ہوسکتا ہے۔ میں اپنے سارے گلے شکوے منسوخ کیے دیتا ہوں۔ یوں لکھنے کو میں نے ایسی باتیں لکھ دیں مگر میرے دل میں تو ان کا گزر تک نہیں ہوسکتا۔ آہ! میں تو آپ کو ہر طرح سے مکمل سمجھنا چاہتا ہوں۔ میری زندگی میں اس کے سوا اور کوئی خوشی باقی نہیں رہی۔ میرے ساتھ فیاضی برتیے، میری مدد کیجیے اور مجھے ثابت کردکھایئے کہ آپ واقعی مکمل ہیں۔ مجھ سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا اور مجھ سے زیادہ آپ کی مدد کسے درکار ہوگی؟ آپ نے تو مجھے ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا کردیا ہے۔ مجھے اس طرح نہ چھوڑیے۔ میرے ہوش وحواس تو آپ نے چرا لیے، اب آپ کی فہم و فراست ہی سے میری دست گیری ممکن ہے۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو مجھے راہِ راست پر لایئے۔ میری ہدایت فرمایئے۔ آپ کا کام تو جبھی پورا ہوگا۔

میں آپ کو دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ آپ میری محبت کا گلا نہیں گھونٹ سکتیں، لیکن مجھے یہ ضرور سکھا سکتی ہیں کہ اس پر قابو کیسے پاؤں؟ ایک ایک قدم پر میری رہنمائی کیجیے۔ مجھے بتایئے کون سی بات زبان سے نکالوں، کون سی نہ نکالوں۔ یوں اور کچھ نہ ہوگا تو کم سے کم میں آپ کی ناراضی کے عذاب سے تو بچ ہی جاؤں گا۔ میرے سر پر مایوسی کی گھٹائیں منڈلا رہی ہیں۔ خدا کے لیے انھیں دور کیجیے۔ بس اتنا کہہ دیجیے کہ میں نے تجھے معاف کیا اور مجھے تیرے اوپر رحم آرہا ہے۔ مجھے اپنے عفو کا یقین دلا دیجیے۔ جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ تو آپ مجھے کبھی نہیں دیں گی، لیکن میں تو وہ مانگ رہا ہوں جس کی مجھے ضرورت ہے۔ کیا آپ انکار کردیں گی؟

اچھا، خدا حافظ۔ میں نے اپنے جذبات آپ کے قدموں پر لا ڈالے ہیں، ازراہِ نوازش انھیں قبول فرمایئے۔ میں نے یہ جرأت تو ضرور کی ہے لیکن اس سے میرے احترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔

از... ۲۰ راگست ۱۷ء

خط نمبر ۲۵

از وائی کاؤنٹ دوال موں بنام مارکیز دمرتئی

لیجیے، آج کا خبرنامہ حاضر ہے۔

گیارہ بجے میں مادام درروز موند کے کمرے میں پہنچا اور اُن کی حفاظت میں اس جھوٹ موٹ کی بیمار کو دیکھنے گیا جو ابھی تک بستر پہ پڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے تھکن ٹپک رہی تھی۔ غالباً وہ بھی میری طرح سو نہیں سکی۔ مادام درروز موند دوسری طرف دیکھ رہی تھیں کہ میں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا خط اسے دینا چاہا۔ اُس نے لینے سے انکار کیا مگر میں نے خط بستر پہ ہی پڑا رہنے دیا اور اپنی بڈھی خالہ کی آرام کرسی کی طرف کھسک لیا کیوں کہ وہ اپنے پیارے بچے کو اپنے پاس بٹھانا چاہتی تھیں۔ اب تو اُسے بدنامی کے ڈر سے خط چھپانا ہی پڑا۔ بچاری بیمار نے کچھ رُکتے ہوئے کہا کہ شاید مجھے بخار ہوگیا ہے۔ مادام درروز موند نے مجھے حکم دیا کہ اُٹھ کے ان کی نبض دیکھو اور میری طبّی معلومات کی بڑی تعریف کی۔ چناں چہ میری حسینہ کو دوہری مایوسی ہوئی۔ ایک تو یہ کہ اپنا بازو مجھے دینا پڑا، دوسرے یہ محسوس ہوا کہ اب جھوٹ کھل جائے گا۔ میں نے اُس کا ہاتھ لے کر اپنے ہاتھ میں دبا لیا اور دوسرا ہاتھ اُس کے ٹھنڈے ٹھنڈے گداز بازو پر پھیرنے لگا۔ اُس شریر نے جواب میں ذرا بھی تو گرمی نہیں دکھائی۔ میں نے چڑ کر اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور کہا کہ اس وقت تو کسی قسم کے ہیجان کا شائبہ تک نہیں ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اُس کی بھنویں تن گئی ہوں گی مگر اُسے سزا دینے کی غرض سے میں نے اُس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ لحظے بھر بعد وہ بولی کہ اب میں بستر سے اٹھنا چاہتی ہوں۔ چناں چہ ہم اُس کے پاس سے چلے آئے۔ وہ کھانے کے وقت آئی تو، مگر بے لطفی ہی رہی۔ اُس نے اعلان کر دیا کہ آج میں ٹہلنے نہیں جاؤں گی۔ اس کا مطلب مجھے یہ جتانا تھا کہ وہ مجھے بات کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتی۔ مجھے محسوس ہوا کہ آہ بھرنے اور مغموم نظروں سے دیکھنے کا وقت یہی ہے۔ اُسے بھی اس کی توقع تھی کیوں کہ دن بھر میں اب پہلی دفعہ میں اُس سے نظریں ملانے میں کامیاب ہوا۔ وہ شرمیلی تو ضرور ہے لیکن دوسری عورتوں کی طرح اُسے بھی چال بازیاں آتی ہیں۔ میں نے موقع ڈھونڈ کر اُس سے پوچھا کہ مہربانی فرما کر یہ تو بتا دیجیے کہ میری قسمت میں کیا لکھا ہے؟ اُس کا جواب سن کر مجھے ذرا تعجب ہوا۔ وہ بولی، ''جی ہاں، میں آپ کو خط لکھ چکی ہوں۔'' اب مجھے بے تابی ہوئی کہ خط کسی طرح جلدی ملے لیکن یا تو یہ پھر اُس کی مکاری تھی یا ناکارکردگی یا کم ہمتی۔ بہرحال اُس نے وہ خط مجھے آج رات سونے کے لیے جانے سے پہلے دیا ہے۔ میں آپ کو اُس کا خط بھی بھیج رہا ہوں اور اپنے خط کا مسودہ بھی۔ آپ انھیں پڑھیے اور خود فیصلہ کر لیجیے۔ ایک بات غور سے دیکھیے گا۔ اُس نے کتنا کھلا جھوٹ بولا ہے کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر بعد میں کہیں میں نے اُس سے بے وفائی کی تو پھر وہ شکایت کرے گی حالاں کہ وہ پہلے ہی سے بے کھٹکے میرے ساتھ بے وفائی کر رہی ہے! میری دل نواز

حسینہ! سچی بات تو یہ ہے کہ ہوشیار سے ہوشیار مرد مخلص ترین عورت سے بھی بازی نہیں لے جاسکتا، زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ عورت کو اپنے سے آگے نہ بڑھنے دے لیکن یہ جاننے کے باوجود بھی ایسا بننا پڑے گا جیسے ان مہمل باتوں پر یقین آ گیا ہو۔ اپنی حسرت و یاس کا تماشا دکھانا پڑے گا کیوں کہ میری محبوبہ کو سنگ دل بننے کا کھیل پسند ہے۔ ایسی کمینگی دیکھ کر آدمی انتقام لیے بغیر کیسے رہ سکتا ہے! خیر، تھوڑے سے صبر کی ضرورت ہے... اچھا، خدا حافظ۔ ابھی مجھے بہت کچھ لکھنا ہے۔

ہاں، خوب یاد آیا۔ اس بے رحم کا خط مجھے واپس کر دیجیے گا۔ ممکن ہے کہ بعد میں وہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اہمیت دینے لگے۔ چناں چہ مجھے تیار رہنا چاہیے۔

میں نے اُس لڑکی وولانژ کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ خیر، موقع ملتے ہی اُس کے متعلق بھی باتیں کریں گے۔

از شادو، ۲۲ر اگست ۷۱ء

خط نمبر ۲۶

از مادام دترو ویل بنام وائی کاؤنٹ دوال موں

سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کو کبھی خط نہ لکھتی لیکن کل شام مجھ سے کچھ ایسی حماقت سرزد ہوئی کہ اب مجھے اس کی تشریح کرنی ہی پڑے گی۔ ہاں، مجھے اقرار ہے کہ میں رو پڑی تھی۔ شاید میری زبان سے وہ الفاظ بھی نکل گئے تھے جو آپ نے نہایت احتیاط کے ساتھ نقل فرمائے ہیں۔ آپ نے میرے آنسو بھی دیکھ لیے اور میرے الفاظ بھی سن لیے، چناں چہ مجھے آپ کو پوری بات بتانی ہی پڑے گی۔

مجھے اس کی عادت نہیں کہ مجھے دیکھ کر لوگوں کے دل میں نیک اور پاکیزہ جذبات کے علاوہ کسی اور قسم کے احساسات پیدا ہوں، نہ میں نے کبھی ایسی باتیں سنی ہیں جن سے شرم آئے۔ چناں چہ مجھے اپنے اوپر اعتماد ہے اور گستاخی معاف، یہ اعتماد کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ لہٰذا بننا بنانا مجھے نہیں آتا اور نہ اپنے حقیقی احساسات کو دبانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ آپ کا وہ عجیب و غریب رویّہ دیکھ کر میں بالکل بوکھلا گئی۔ اس قسم کا واقعہ میرے ساتھ کبھی پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔ چناں چہ میں کچھ ڈر بھی گئی۔ پھر مجھے اس خیال ہی سے گھن آئی کہ آپ مجھے اُن عورتوں میں شامل سمجھ رہے ہیں جنھیں آپ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انھیں کی طرح مجھ سے بھی ٹھٹھول کر رہے ہیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے میرے آنسو نکل آئے اور شاید میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ میں بڑی بدنصیب ہوں (اور یہ بات ہے بھی ٹھیک)۔ آپ کو یہ الفاظ بڑے سخت معلوم ہوئے لیکن اگر میرے آنسوؤں اور لفظوں کا مطلب کچھ اور ہوتا، اگر وہ جذبات جن سے میرے دل کو ٹھیس پہنچنی ہی چاہیے مجھے بُرے نہ لگتے اور مجھے یہ ڈر ہوتا کہ میں بھی ان جذبات میں شریک ہوں تو پھر جو الفاظ میرے منھ سے نکلے وہ تو دراصل نہایت پُھس پُھسے ہوتے۔

نہیں، جناب! میرے دل میں اس قسم کا ذرا بھی خوف نہیں ہے۔ اگر کہیں ایسی بات ہوتی تو

میں آپ سے ہزاروں میل دور چلی جاتی اور کسی ریگستان میں بیٹھ کر اپنا سر پیٹتی کہ قسمت نے مجھے آپ سے کیوں ملایا۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ سے محبت نہیں کرتی اور نہ کبھی کروں گی۔ اس کے باوجود شاید اچھا تو یہی ہوتا کہ میں اپنے دوستوں کے مشورے پر عمل کرتی اور آپ کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دیتی۔

مجھ سے بس ایک ہی غلطی ہوئی ہے۔ میں سمجھی تھی کہ آپ ایک شریف اور پاک باز عورت کا احترام کریں گے، جو بس اتنا چاہتی تھی کہ آپ کے ساتھ انصاف سے کام لے اور آپ کو بھی شریف ثابت کر دکھائے۔ وہ تو آپ کی طرف داری کر رہی تھی اور آپ نے اپنی مجرمانہ خواہشات سے اُس کی بے عزتی کی۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ نہیں، جناب! آپ مجھے نہیں جانتے۔ اگر آپ مجھے واقعی جانتے تو یہ نہ سمجھ بیٹھتے کہ اپنی بے راہ روی کو حق بہ جانب ثابت کر سکتے ہیں۔ آپ نے میرے سامنے ایسی باتیں کہہ ڈالیں جو مجھے نہیں سننی چاہئیں تھیں، پھر آپ کو میرے نام ایسا خط لکھنے کا حق کہاں سے پہنچ گیا جو مجھے پڑھنا بھی نہیں چاہیے تھا؟ اوپر سے آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ میری رہنمائی کرو، مجھے بتاؤ کون سی بات کہنی چاہیے کون سی نہیں! بس، جناب! خاموش رہیے اور سب کچھ بھول جائیے۔ میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گی اور آپ کو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ پھر آپ کو مجھ سے معافی کی امید رکھنے کا حق پہنچے گا اور یہ آپ کے اوپر منحصر ہوگا کہ ساتھ ساتھ مجھے اپنا احسان مند بھی بنالیں... مگر نہیں، جس شخص نے میرا احترام نہیں کیا میں اُس سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ جس آدمی نے میری سادہ دلی اور صاف گوئی سے ناجائز طور پر فائدہ اُٹھایا میں اُس پر ذرا بھی اعتماد کا اظہار نہیں کروں گی۔

آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں آپ سے ڈرنے لگوں بلکہ نفرت کرنے لگوں۔ میں ایسی بات نہیں چاہتی تھی۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ آپ کو بس اپنی سب سے محترم سہیلی کا بھتیجا سمجھوں۔ لوگ تو آپ پر نہ جانے کیا کیا الزام لگا رہے تھے، میں نے ہی دوستی میں آ کے رائے عامہ سے اختلاف کیا لیکن آپ نے سب کچھ ختم کر کے رکھ دیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ جو کچھ بگاڑ چکے ہیں اُسے پھر سے درست کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کریں گے۔

جناب! صاف صاف سن لیجیے۔ آپ کے جذبات نے مجھے سخت رنج پہنچایا ہے اور ان کے اظہار سے آپ نے میری بے عزتی کی ہے۔ مجھے آپ سے یہ امید رکھنے بلکہ مطالبہ کرنے کا حق پہنچتا ہے کہ اس معاملے میں آپ بالکل خاموش رہیں۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو ان جذبات میں شریک ہونا درکنار، میں مجبور ہو جاؤں گی کہ آپ کی شکل تک نہ دیکھوں۔ میں وہ خط واپس کر رہی ہوں جو آپ نے مجھے لکھا تھا۔ امید ہے کہ آپ بھی ازراہِ نوازش یہ خط مجھے واپس کر دیں گے۔ اوّل تو اس قسم کا واقعہ پیش ہی نہیں آنا چاہیے تھا۔ بہرحال اب میں چاہتی ہوں کہ اس کا نشان تک باقی نہ رہے ورنہ مجھے بڑی تکلیف ہوگی۔

نیاز کیش

از... ۳۱ر اگست ۷۰ء

☆☆☆

محمد حسن عسکری / مظفر علی سیّد

کبھی اے حقیقتِ منتظَر

محمد حسن عسکری کی یہ کم یاب تحریر جو ۱۹۵۶ء کی یادگار ہے، اسی سال انگریزی زبان میں شائع ہونے والے آئرستانی ادیب سیموئل بیکٹ کے کھیل Waiting For Godot پر ایک تبصرہ ہے جو پاکستان ٹائمز میں طبع ہوا تھا۔

اب تو خیر، بیکٹ کا شمار دنیا کے بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے اور نوبل انعام پانے کے بعد تو نہ صرف ان کے عصری اندازِ تمثیل کو، جسے پہلے پہل ایک شعوری قسم کی تجریدی مہملیت اور فلسفیانہ مضحکیت کا نمونہ کہا جاتا تھا، جدید دور کا ایک اہم تخلیقی کمال قرار دیا جا چکا ہے بلکہ ان کے نہایت سست رو قسم کے ناولوں تک کو سراہا جانے لگا ہے مگر "گوڈو" کی اشاعت کے زمانے میں (اور سال بھر پہلے اس کی پیش کش کے موقعے پر) کم ہی کسی برطانوی یا امریکی نقاد نے اسے ایک عجوبے سے زیادہ اہمیت دی تھی۔

البتہ فرانس میں جہاں جیمز جوئس کا یہ جانشین خود اختیاری جلاوطنی کی زندگی بسر کرتا تھا، صورتِ حال بے حد مختلف تھی۔ انگریزی زبان میں دست یاب ہونے سے چار ایک برس پہلے جب یہی کھیل فرانسیسی زبان میں اسٹیج کیا گیا اور شائع ہوا تو فرانس کے نقادوں کے درمیان اس کے معنوی محاسن اور صوری خصوصیات پر زوردار بحث ہوئی تھی۔ ۱۹۵۶ء میں ہمارے ایک لکھنے والے کا اس عہد آفریں ڈرامے کی اہمیت پر اصرار ایک ایسا تنقیدی افتخار ہے جو دنیا میں کم لوگوں کو حاصل ہوا ہوگا۔

"گوڈو" کے لفظ کی بہت سی تعبیریں ہو چکی ہیں جن میں سے چند ایک کا تذکرہ خود عسکری صاحب نے کر رکھا ہے۔ اکثر نقادوں نے اسے "گوڈ" یا حقیقتِ مطلقہ کا ایک بے تکلف یا رکی لقب سمجھا ہے۔ راقم کی نظر میں اس کھیل کے بنیادی کردار، بہ قولِ اقبال، اس آرزو میں جیے جاتے ہیں:

کبھی اے حقیقتِ منتظَر، نظر آ لباسِ مجاز میں

چناں چہ اس تبصرے کا ترجمہ کرتے ہوئے عنوان کو اسی مصرعے سے مستعار لیا گیا ہے۔ چند ایک نکات کی صراحت یوں ہے:

(ا) عسکری صاحب نے کرداروں کے وہی نام استعمال کیے ہیں جو وہ آپس میں برتتے ہیں۔ بیت فہرست میں البتہ "گوگو" کا رسمی نام ایسترا گون اور "دیدی" کا ولادیمیر درج ہے۔ دونوں قسم کے نام معنویت کے حامل سمجھے گئے ہیں۔

(ب) تبصرے کا مطبوعہ متن استعمال کرنے کی بجائے عسکری صاحب کے مسودے کو سامنے رکھا گیا ہے جو ان کے برادرِ عزیز جناب محمد حسن مثنّی کی عنایت سے دست یاب ہوا۔

(ج) توضیح طلب مقامات پر نمبر لگا کر ترجمے کے آخر میں اشارات کے تحت تفصیل درج کی گئی ہے۔ (م ع س)

پیرس سے ایک تازہ وارد آمد! (حتیٰ کہ اصلاً فرانسیسی زبان کی تحریر، آئرستانی ادیب سیموئل بیکٹ کے قلم سے، جو کبھی جیمز جوئس کا سیکرٹری رہ چکا ہے)۔ اس کھیل نے لندن میں ایک تہلکہ مچا کے رکھ دیا ہے۔ تاہم لندن والے جس قسم کے کھیل دیکھنے کے عادی ہیں ان کے سامنے تو یہ سرے سے کھیل ہی نہیں ہوگا۔ یہاں کسی مفصّل منظر سازی کی زحمت ہی نہیں کی گئی، اسٹیج تقریباً خالی تھا۔ "گاؤں کی ایک سڑک، ایک پیڑ، شام۔" دوسرے لفظوں میں لامکاں اور ہر مکاں، لازماں اور ہر زماں۔ صرف دو بڑے کردار، دربہ در خاک بہ سر قسم کے آوارہ گرد، گوگو اور دیدی جن کے مابین کم ہی کوئی فرق نظر آتا ہے۔ دو عدد ذیلی کردار... مضحکہ خیز پوزو اور ایک فروتر نمونۂ انسانیت لکی۔ جہاں تک ڈرامائی عمل کا تعلق ہے تو "کچھ بھی واقع نہیں ہوتا، کوئی آتا ہے نہ کوئی جاتا ہے"،[☆۱] صرف ایک مشخص قسم کی حرکت... بے خانماں کرداروں کا انتظار، گوڈو کے لیے جو ایک اساطیری شخصیت ہے اور جو کبھی نمودار نہیں ہو پاتا، وعدے وعید کے باوجود۔ شخصیاتِ تمثیل ایسے حرکت کرتی ہے ہیں جیسے بھنگ کی ترنگ میں ہوں، ایسے بولتی ہیں جیسے کوئی گھسا ہوا گراموفون ریکارڈ۔ جو کچھ بھی وہ کہتے ہیں یا کرتے ہیں، کسی مقصد و مفہوم کا حامل دکھائی نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ ان کی انسانیت بھی خون کے سفید جسے کی طرح پتلی پڑ چکی ہے۔ وہ ٹائپ بھی نہیں بلکہ آر کی ٹائپ لگتے ہیں ایک نہ ایک قدیم اور دائمی شبیہ کے پیکر، ہر چیز... کردار، عمل، حرکت اور کلام... اپنی عنصری سطح تک محدود ہو چکی ہے اور محض اپنی سادگی کے بل پر ایک خوف ناک کابوسی خصوصیت اختیار کر لیتی ہے، بے حد عجیب و غریب اور اس کے باوجود جادوئی اور ہیبت ناک۔

لندن حیرت میں غرق ہو گیا خصوصاً اس لیے کہ وہاں ایسی ڈرامائی تکنیک اَن مل بے جوڑ لگتی تھی۔ پیرس میں البتہ اس کے بے جوڑ پن کو بہت کم محسوس کیا گیا، کیوں کہ پچھلے پچاس برسوں میں ژاری کے کھیل "شاہ اُوبو"[☆۲] کے وقت سے لے کر وہاں کے لوگ اس تکنیک سے آشنا ہو چکے تھے۔ چناں چہ

☆۱۔ "کچھ بھی واقع نہیں ہوتا، کوئی آتا ہے نہ جاتا ہے۔" یہ الفاظ اس کھیل کے بارے میں اس حد تک ضرور درست ہیں کہ پوزو، لکی اور پیغام رساں چھوکرے کے سوا کوئی آتا جاتا نہیں اور جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے، جسمانی عمل کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ اصل میں یہ الفاظ خود کھیل کے دوران، گوگو نے، اپنی اور دیدی کی روزمرہ زندگی کا عذاب بیان کرنے کے لیے استعمال کیے ہیں۔

☆۲۔ آلفرید ژاری (۱۸۱۳۔۱۹۰۷ء) فرانس میں نئے ڈرامے کا پیش رو جس نے ۱۸۹۶ء میں اپنا "تسخریہ" (فارس) "شاہ اُوبو" کے نام سے پیش کر کے پیرس کی ڈرامائی دنیا میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ اس کھیل کا مرکزی کردار اُوبو جو کہ "بورژوائی حرص، بزدلی اور ظلم و ستم کا ایک مضحک خاکہ" ہے، قدیم دلاورانہ ڈرامے کی آزاد پیروڈی کرتا کرتا پولینڈ کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ اس کی زبان نہایت رعب دار متروکات سے پُر ہے اور اس کی شخصیت اس کے مضحکہ خیز جسم کی طرح ایک بڑے سائز کی کٹھ پتلی سے مشابہ ہے۔ اس کھیل کا آغاز ایک طالب علمانہ مذاق کے طور پر ہوا تھا، مگر تکمیل اور پیش کش کے بعد اس کے اثرات دور دور تک پہنچے۔ چناں چہ شاعر اپولونیئر، مافوق الواقعیت کی تحریک اور زمانۂ حال کے مضحک نگار (absurdists)... سب اس سے متاثر کیے جاتے ہیں۔

لندن نے اسے محض پتّے بازی قرار دے کر اپنا ردِّعمل ظاہر کیا۔ چند ایک لوگ جو باخبر تھے کہ کیا چیز کیا ہے انھوں نے ''دھرپنچ'' کے مزاج میں سے جھانکتے ہوئے وجودیاتی فلسفے کی پرتیں دریافت کر لیں اور دراز مُو حلقے نے اس کو ''خالی پن'' اور تخلیقی کرب کی تازہ ترین توضیح کے طور پر قبول کر لیا۔ مگر ہم بیسویں صدی کا نصف طے کر چکے ہیں اور ستم رسیدہ جدید آدمی ایک روح کی تلاش میں ہے۔ لہٰذا ہمارے آس پاس کوئی تو ہو جو ہمیں آبِ مقدس کے ایک آدھ چھینٹے سے زندگی بخشے۔ چناں چہ اس کھیل کو بھی اصطباغ کے چشمے پر اپنی باری ملی اور اب تو اس کی خامیوں میں ایک آدھ گُھٹنا ہوا سر بھی دکھائی دینے لگا ہے۔

امریکی ردِّعمل تو اور بھی دلچسپ ثابت ہوا ہے۔ امریکیوں کے لیے یہ امر بجے اور معصوم تحیر کا باعث ہے کہ جب کسی شخص کو چار ٹھیکرے ماہانہ کی آسان قسطوں پر دُھلائی کی مشین مل سکتی ہے تو پھر وہ اُکتاہٹ یا خالی پن کیوں محسوس کرتا ہے؟ ذہنی طور پر، مابعد جنگ کے امریکی، ایسی کتابوں کو قبول کر سکتے ہیں مگر محسوسات کی سطح پر ان سے برگشتہ ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف ان کا عقیدہ ہے کہ یورپ کے طویل قامت بڑے میاں آہستہ آہستہ بوسیدہ ہوتے چلے جا رہے ہیں اور اگر کوئی ایسا شخص ہو جو ان بڑے میاں کے منھ پر ساری بوسیدگی دے مارے تو خوب تماشا رہے۔ ان کے لیے ''گوڈو'' واضح طور پر ایک بے مصرف آدمی کا کیس تھا جو اپنے ہی گند میں لت پت ہو۔ ان کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا، انھوں نے کہا۔

مگر کچھ بھی ہو، آخر یہ ''گوڈو'' کا چکر ہے کیا چیز؟ چوں کہ میں اس کتاب کی بے اندازہ تعریف کرنے کو ہوں اس لیے یہ بات صاف کہہ دینی چاہیے کہ اس طرز کی تحریر میں خود کبھی لکھنا پسند نہ کرتا۔ تاہم ضروری انکسار کے ساتھ، میں اس دعوے کا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں کہ ایلیٹ کے ڈراموں اور ایذرا پاؤنڈ کے کینٹوز کو چھوڑ کر، ۱۹۴۰ء سے اب تک انگریزی بولنے والے ملکوں میں تخلیق کیے گئے ادبی کارناموں میں سب سے زیادہ کھرا، سنجیدہ، پُرمعنی اور تکمیل یافتہ شہ کار یہی ہے۔ اگرچہ یہ ''طویل آخرِ ہفتہ''☆۳ کے مشاہیر کے کمال کو نہیں پہنچتا (میں اس کھیل کو انگریزی زبان کی تحریر کے طور پر لے رہا ہوں اس لیے کہ مصنف نے فرانسیسی زبان کو اپنانے سے پہلے انگریزی سے ہی آغاز کیا اور اب فرانسیسی تخلیقات کو بھی انگریزی میں منتقل کرنے میں مصروف ہے)۔ اس کھیل کی معنویت کسی لحاظ سے بھی ایک انوکھے موضوع کے انکشاف یا انسان اور انسانی زندگی کے سلسلے میں کسی نئی بصیرت کی دریافت میں مضمر نہیں۔ ''کھوکھلے پن کا ادراک'' تو یورپی ادب کے ایک خاصے بڑے حصے کا طرۂ امتیاز ہے خصوصاً جب سے

☆۳۔ ''طویل آخرِ ہفتہ'' سے مراد دنیا کی دو بڑی جنگوں کا درمیانی وقفہ ہے یعنی ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک کا وقفہ۔ اس دور میں ایلیٹ اور پاؤنڈ کے علاوہ لارنس، جوئس، ورجینیا وولف اور دوسرے اہم ادیبوں کے کارنامے وجود میں آئے۔ اصل میں ''طویل آخرِ ہفتہ'' ایک کتاب کا نام تھا جو شاعر رابرٹ گریوز نے ایک ماہرِ عمرانیات کے ساتھ مل کر لکھی تھی اور جس کا موضوع مذکورہ دور کی زندگی اور فن کا تہذیبی جائزہ تھا۔ تب سے یہ اس دور کے لیے ایک اصطلاحی نام بن چکی ہے۔

لافورگ[☆۴] نے (اپنی ایک نظم میں) یہ مصرعے لکھے تھے:

جو بیتے کل کو آتے کل سے گڈمڈ کرتا رہتا تھا
اور روح سے جس کو کچھ نہیں لینا دینا تھا

تاہم اس موضوع کا اتنا ہی مکمل اظہار نامہ ''گوڈو'' میں ملتا ہے جتنا کہیں اور۔ بے خانماں لوگ اپنی اُکتاہٹ، تنہائی اور خالی پن میں جیتے ہیں یا جیے جا رہے ہیں اور اس طورِ حیات میں کبھی کبھار تشدد یا کرب کی چند ایک جھلکیاں اس کی یکسانیت کو قدرے کم کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی چیز یقینی نہیں حتیٰ کہ حافظہ بھی مر چکا ہے۔ کوئی مقصد و مفہوم ان کے پیشِ نظر نہیں بلکہ وہ تو پیش پا اُفتادہ مقصود بھی حاصل نہیں کر پاتے... گوگو اپنے جوتے ہی اُتار نہیں سکتا۔ عملاً وہ بیچ کاری کی حالت میں گرفتار ہیں اور محض اس لیے کچھ نہ کچھ کرتے ہیں ''تاکہ ہمیں یہ گمان ہو کہ ہم وجود رکھتے ہیں''،[☆۵] مثلاً ان کا آپس میں ٹوپیاں بدلنا۔ اس بیچ پن کی وحشت کو چھوڑ کر، انسانی تعلقات کا جہنم بھی موجود ہے اور آگہی کا عذاب بھی۔ دونوں اپنی اپنی مسرت کو ایک دوسرے سے جدا ہو کر تلاش کرتے ہیں مگر یہی دریافت کرتے ہیں کہ وہ باہم زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں اور بات زندگی بسر کرنے پر بھی ختم نہیں ہوتی۔ وہ دیکھے بغیر بھی نہیں رہ سکتے، بولے بغیر بھی جی نہیں سکتے۔ وہ اپنی صورتِ حال کی آگہی کا شعلہ چٹکیوں میں مسل نہیں سکتے۔ انھوں نے ایک موہوم سی امید پال رکھی ہے کہ جب گوڈو (گوڈ یعنی خدا، نجات دہندہ، ایک اشراقی مکاشفہ، کوئی نیا طرزِ حیات یا جس چیز کی بھی وہ نمائندگی کرتا ہے)[☆۶] کا ورود ہوگا تو انھیں اپنی حالت سے رہائی نصیب ہوگی۔ گوڈو ہے کہ آہی نہیں چکتا۔

تھک ہار کر وہ اپنے اس بے حاصل انتظار کو ختم کر دینا چاہتے ہیں مگر اس سے گریز بھی ممکن نظر نہیں آتا... وہ انتظار پر مجبور ہیں۔ چناں چہ یہ دائرہ ہر طرف سے بند ہے، کہیں سے کہیں کو نہیں جاتا، ایک ایسی حرکت ہے جو بہ یک وقت فالج بھی ہے۔

یہ بصیرت کوئی نئی یا منفرد نہیں، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، جو چیز نئی ہے وہ ایک نثری اسلوب

☆۴۔ ژول لافورگ (۱۸۶۰ء-۱۸۸۳ء) فرانس کا جواں مرگ شاعر جس نے اپنے پیش رو کوربیئر کے تمسخر آمیز کلبی لہجے کے ساتھ بول چال کا آہنگ اور اپنا جنونی انداز ملا کر، آزاد نظم کا نیا آمیزہ تیار کیا جو بعد میں پاؤنڈ اور ایلیٹ تک کے لیے مشعلِ راہ بنا۔ ''گوڈو'' کے کردار بھی اسی کی طرح ''بیتے کل اور آتے کل میں گڈمڈ کرتے'' نظر آتے ہیں۔ انھیں اکثر معلوم نہیں ہوتا کہ آج ہفتے کا کون سا دن ہے۔

☆۵۔ گوگو کا مکالمہ: ''ہمیں کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے، مل ہی جاتا ہے نا دیدی، بس یہ گمان دینے کو کہ ہم بھی وجود رکھتے ہیں۔''

☆۶۔ ''گوڈو'' کے بارے میں جو کبھی اسٹیج پر نمودار نہیں ہوتا مگر اس کے بارے میں گفتگو ہوتی رہتی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر روز اس کا انتظار ہوتا ہے اور ہر روز اس کی آمد اگلے روز پر ملتوی ہوتی رہتی ہے۔ انتظار کرنے والے اُکتا کر چلے جانا چاہتے ہیں مگر جا نہیں سکتے۔ وہ خود کچھ بھی نہیں کرتا۔ سفید ریش ہے۔ وعدہ شکنی کی سزا دیتا ہے۔ آئے گا تو نجات دلائے گا اور اس کا پیغام رساں چھوکرا دوسرے دن آتا ہے تو یہ نہیں جانتا کہ پہلے دن وہ آیا تھا یا اس کا بھائی۔ یہ خصوصیات، اقبال کی ''حقیقتِ منتظر'' سے کسی حد تک مشابہ ہیں۔

یا ڈرامائی طرزِ کلام کی ایجاد ہے جو اپنی بے کیفی اور کھوکھلے پن میں کسی گونگے، بہرے عقب افتادہ انسان☆۷ کے ہاتھ پاؤں چلانے سے بہتر نہیں اور اپنے کھوکھلے پن کے ذریعے ہی یہ طرزِ کلام ایک قسم کی ظرافت بلکہ المیہ دہشت تک پیدا کر لیتا ہے۔ مکالے کا آہنگ کچھ اس طرح ہے جیسے کسی ٹک ٹک کرتی مشین کی گونج، شعور و احساس سے بیگانہ... اور ڈرامائی تکنیک اس قدر آسان اور بے تکلف لگتی ہے کہ صورتِ حال کا مجموعہ، خود بہ خود تولید اور توسیع حاصل کرتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے، جیسے کہ کائناتی بے معنویت کو اپنا آپ نمایاں کرنے کے لیے کسی قسم کی ذہنی امداد کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ بیکٹ، شاہ اُوبو کے خالق سے کئی ایک مراحل آگے جا چکا ہے اور ان سے عہدہ برآ بھی ہو چکا ہے۔ اس نے ادب میں ایک نئے تزلزل کا اضافہ کیا ہے اور یہی اس کا برجستہ کمال ہے۔

جہاں تک بصیرت کی اپنی کیفیت کا تعلق ہے تو یہ اچھی یا بُری ہو سکتی ہے، جیسے بھی آپ کو پسند ہو۔ یہاں تک کہ میں خود چاہوں گا کہ چیزوں پر ذرا دل کش سا رنگ و روغن دکھائی دے مگر ادب میں تو صرف ایک گناہِ کبیرہ ہوتا ہے... اپنی بصیرت کو کسی دوسرے کے محاورے میں پیش کرنا اور سیموئیل بیکٹ سے یہ گناہ سرزد نہیں ہوا۔

اس کے اندازِ نظر میں جتنی بھی استواری ہو یہ ایک ذاتی انداز ہے جس میں اصالت بھی پوری طرح موجود ہے، جس کو کسی اور کی خاطر ''چاہے وہ تھوکنے والا ہو یا تھوکا جانے والا''☆۸ مسخ نہیں کیا گیا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ (دوسری) جنگ کے بعد کی دنیا میں اس ''مریضانہ اصالت'' کو برقرار رکھنا مشکل سے مشکل تر اور خطرناک سے خطرناک تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ''بڑے بیوپار کی تنظیم'' نے ادبی تفتیش کے لیے اپنا ایک الگ شعبہ قائم کر رکھا ہے جس کا فریضہ ہے، ادب میں ہیچ کارہ لوگوں پر نظر رکھنا جو عوام میں ہر قسم کے مجہول خیالات پھیلاتے رہتے ہیں اور جو ہر طرف یہ کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ ہمیں ریفریجریٹر اور نائلن کی جرابیں اکتاہٹ اور کھوکھلے پن سے محفوظ نہیں کر سکتیں۔ ایک ایسی دنیا میں جو آگہی سے اتنی خوف زدہ ہے کہ وہ مجھے لڑھک لڑھک کر ناچنے کی اجازت تو دے دیتی ہے یا سر کے بل کھڑا ہونے کی یا کچھ بھی کرنے کی تاوقتے کہ میں چیزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گریز کرتا رہوں۔ ایک ایسی دنیا میں اکیلے بیکٹ کی بصیرت، چاہے وہ کتنی ہی بے حواس کیوں نہ ہو چکی ہے، میرے لیے ہر مقدس چیز سے زیادہ مقدس ہے۔ ممکن ہے یہ نفیِ حیات کی تعلیم ہو مگر جب تک ہم زندگی کی بعض شکلوں کی نفی نہ کر سکیں تو ہم اثباتِ حیات تک کیسے پہنچ سکیں گے؟ جب تک مٹی مر نہ جائے گندم کیسے اپجے

☆۷۔ عقب افتادہ انسان یعنی جن کی ذہنی عمر ۷ اور ۱۲ برس کے درمیان رہتی ہے جیسے ہمارے یہاں دولے شاہ کے چوہے۔

☆۸۔ ''تھوکنے والے اور تھوکے جانے والے'' غالباً دستوئیفسکی کی اصطلاح ہے، حقیر بنانے اور بننے والوں کے لیے۔ یوں کھیل میں ایک جگہ گوگو، لکی پر تھوکتا ہے کیوں کہ اس نے اس کی پنڈلی پر ٹھوکر لگائی تھی مگر یہ اصطلاح پوزو اور لکی کے درمیان پائے جانے والے رشتے کو بیان کرنے کے لیے مناسب تر ہے۔

گی؟[☆۹] اپنے آپ کو ہر قسم کے وا ہے اور فریب نظر سے خالی کیے بغیر ہم کسی حقیقی امید کی تخلیق نہیں کر سکتے اور کسی ''خالی پن'' سے ہی ایک نئی کائنات نمودار ہوگی۔

اس سے بڑھ کر میں تو کہوں گا کہ اگر آپ کو صد رنگ پھول[☆۱۰] ہی اگانے ہیں تو کنول کے اتنے پودوں میں ایک ناگ پھنی بھی کیوں نہ ہو؟

اور کیا یہ ''گوڈو کے منتظر'' بالآخر کوئی ایسا ہی ناگ پھنی کا پودا ہے؟ خانہ خرابوں کی زندگی کھوکھلی سہی مگر وہ ایک شادابی کا انتظار بھی تو کر رہے ہیں۔ وہ جو بھی کریں، کوئی مفہوم نہیں رکھتا مگر ان کو ایک معنویت کی تلاش ہے اور ایک جواز کی۔ پوزو اپنی آنکھیں کھو بیٹھتا ہے مگر اب وہ مستقبل میں دیکھ سکتا ہے۔[☆۱۱] انسانیت قابیل سہی مگر یہ ہابیل بھی تو ہے۔[☆۱۲] اندھا پوزو بے کار نہیں چیختا۔ دیدی خود میں یہ کہنے کی اہلیت دریافت کرتا ہے، ''یہ بچاؤ، بچاؤ کی چیخیں... ان کا خطاب ساری انسانیت سے تھا... مگر اس خاص جگہ پر، وقت کے اس خاص لمحے میں، ہم ہی جملہ انسانیت ہیں، چاہے یہ بات ہمیں پسند ہو یا ناپسند۔'' عہد مندی کا فلسفہ![☆۱۳] وہ مصیبت زدہ ہیں، نجات کے منتظر ہیں مگر کیا وہ خود اعتمادی سے محروم ہیں؟ یہ دیکھیے پھر دیدی کو، ''میرا خیال ہے کہ میں آخرکار اپنے ہی دھوئیں تلے سے اٹھوں گا۔''[☆۱۴] اور ان کی ساخت میں کم سے کم ایک مستحکم پہلو ضرور ہے... وہ چلتے رہنے کی قوت رکھتے ہیں، ''ہم کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔'' اور کوئی حتمی مفہوم بھی یہاں غیر موجود نہیں، ''ہاں اس لمبے چوڑے گڑبڑ گھٹالے میں، صرف ایک بات روشن ہے... یہ کہ ہم گوڈو کی آمد کے منتظر ہیں۔'' چناں چہ ظاہری موت تو محض نئے جنم کا بیج ہے اور حتیٰ کہ بزدلانہ، کھوکھلا وجود بھی ایک باہمت عمل سے عاری نہیں، ''ہم نے اپنا عہد نبھایا ہے اور یہی بس

☆۹۔ ضرب المثل کا لفظی ترجمہ۔ اس کے مماثل مولانا روم کا مشہور شعر ہے:

ہر بنائے کہنہ کآ باداں کنند
اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

☆۱۰۔ ''صد رنگ پھولوں کو کھلنے دو''... ماؤزے تنگ کی ایک تقریر کا نقطۂ آغاز، جو ہر طرح کی تخلیقی آزادی کا اعلان نامہ تھی مگر جس پر عمل نہ ہو سکا۔

☆۱۱۔ پوزو اندھا ہونے کے بعد جب دوبارہ اسٹیج پر آتا ہے تو کہتا ہے کہ اب میری آنکھیں مستقبل میں دیکھ سکتی ہیں۔ ڈرامے کی فضا میں یہ ایک کھوکھلا دعویٰ ہی معلوم ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک خوش گمانی۔

☆۱۲۔ حضرت آدم کے بیٹے ہابیل کو قابیل نے قتل کیا تھا، تب سے ان دونوں کے نام خیر و شر کی مثال کے طور پر لیے جاتے ہیں۔ اگر چہ اس کھیل میں یہ دونوں نام کبھی ایک شخص کے لیے استعمال ہوتے ہیں کبھی دوسرے کے لیے۔ مراد یہ ہے کہ ہر آدمی میں، ہابیل اور قابیل دونوں کی خاصیتیں ہوتی ہیں۔

☆۱۳۔ جو بھی، جہاں اور جس وقت موجود ہے، وہی جملہ انسانیت کا نمائندہ ہے یعنی معاشرے کا ہر فرد معاشرے کی بقا کے لیے ذمہ دار ہے۔ انسانی عہد مندی کا یہ تصور، وجودیاتی فلسفے کا ایک لازمی حصہ ہے۔

☆۱۴۔ ''اپنے ہی دھوئیں تلے سے اٹھنے'' کا مفہوم ہے، خود اپنی صلاحیتوں، ارادوں اور ایمان کے زور سے بلند ہونا۔ کسی دربدر خاک بسر آدمی کا یہ کہنا انتہائی خود اعتمادی کی دلیل ہے۔

ہے۔ ہم اولیا تو نہیں ہیں مگر ہم نے اپنا عہد پورا کیا ہے۔'' اُکتاہٹ، کھوکھلے پن اور انتشار میں سے ایک نئی بامعنی زندگی تخلیق کرنے کی خواہش، مایوسیوں کے باوجود چلتے رہنے کی ہمت اور عہد نبھانے کا ایمان... یہ وہ آخری دلیری ہے جو ہابیل اور قابیل، گوگو اور دیدی پر مشتمل انسانیت کے ذریعے وجود میں آتی ہے اور سیموئیل بیکٹ نے اس کی گواہی دی ہے۔ گھوم کر دیکھیے تو یہی ناگ پھنی کنول کے روپ میں ڈھلتی نظر آئے گی۔

ناگ پھنی ہو یا کنول، میرا دل و دماغ یہ طے کر چکا ہے... جب کبھی زر اندوزی کے مراحل میں کوئی مجھ سے روحِ تخلیق کا مشاہدہ کرنے کو کہے گا تو میرا جواب یہی ہوگا:

''گوڈو'' کو پھر سے پڑھیے!

☆☆☆

شفیع عقیل

محمد حسن عسکری صاحب سے ایک گفتگو☆

آپ مئی ۱۹۲۱ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بلند شہر کے مسلم ہائی اسکول میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انٹر میرٹھ کالج سے کیا اور بی اے کے لیے الٰہ آباد چلے گئے۔ وہیں سے ۴۲ء میں ایم اے کیا۔ ایم اے کرنے کے بعد اینگلو عربک کالج دہلی میں انگریزی کے پروفیسر ہوگئے۔ وہاں سے چلے تو میرٹھ آگئے اور میرٹھ کالج میں پڑھانا شروع کیا۔ ۴۷ء میں جب فسادات ہوئے تو آپ لاہور چلے آئے اور وہاں تصنیف و تالیف کا کام کرنے لگے۔ ۵۰ء میں "ماہِ نو" کی ادارت کے لیے کراچی بلایا گیا اور آپ کراچی آگئے۔ پانچ مہینے "ماہِ نو" میں رہے اور پھر ادارت چھوڑ کر اسلامیہ کالج میں پڑھانا شروع کر دیا اور اب تک پڑھا رہے ہیں۔ اس دوران میں "ساقی" کی ادارت بھی سنبھالی اور منٹو کے ساتھ مل کر سہ ماہی "اردو ادب" بھی نکالا جو بعد میں بند ہوگیا۔ اب تک دو افسانوں کے مجموعے "جزیرے" اور "قیامت ہم رکاب آئے" دو تراجم "مادام بوواری" اور "آخری سلام" ایک مضامین کا مجموعہ "انسان اور آدمی" شائع ہو چکے ہیں۔ ایک ناول "سرخ و سیاہ" زیرِ طباعت ہے۔ اس کے علاوہ اب تک آپ نے "میرا بہترین افسانہ" اور "میری بہترین نظم" دو کتابیں ترتیب دی ہیں۔ "طلسمِ ہوش رُبا" کا ایک انتخاب بھی شائع کیا ہے جس پر حکومت کی طرف سے مقدمہ بھی چلا ہے۔ (ش ع)

سوال: آپ میں ادبی تحریک کا سبب کون سے واقعات تھے؟

عسکری: صاحب اس کی وجہ کیا بتائی جا سکتی ہے؟ مجھے شروع سے ادب سے لگاؤ تھا۔ پہلے رجحان فلاسفی کی طرف تھا بعد میں، میں نے لٹریچر پڑھنا شروع کر دیا اور کوئی وجہ نہیں ہے۔

سوال: پھر بھی کوئی وجہ تو ہوگی...؟ کوئی ایسا واقعہ جو اس سلسلے میں محرک ثابت ہوا ہو...؟

عسکری: نہیں صاحب! میں اس کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتا البتہ آپ چاہیں تو یہ لکھ سکتے ہیں کہ ۴۹ء میں

☆۔ یہ انٹرویو ۱۹۵۳ء میں کیا گیا تھا جو ہفت روزہ "چٹان" میں شائع ہوا تھا۔ عسکری صاحب نے پوری زندگی میں دو ڈھائی انٹرویو دیے ہیں۔ اس انٹرویو کی یہاں اشاعت "فقد مکرر" کے خیال سے کی گئی ہے۔

''نیا ادب'' نکلا تھا۔ اس کا پہلا نمبر نکلنے کے فوراً بعد ہی میں نے اپنا پہلا افسانہ ''کالج سے گھر تک'' لکھا تھا۔ اور بس!

سوال: آپ اردو کے کس ادیب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں اور اس کے اسباب کیا ہیں؟

عسکری: صاحب یہ بتانا بھی بہت مشکل ہے ویسے میں نے پڑھا سب کو ہے۔ میں خاص طور پر کسی ایک ادیب سے متاثر نہیں ہوں، جس کا ذکر کروں۔

سوال: ادب میں آپ کا ہیرو کون ہے؟

عسکری: صاحب یہ بھی مشکل سوال ہے۔ میں نے کبھی کسی کو ہیرو ویرو سمجھ کر نہیں پڑھا۔ ویسے لکھنے کو آپ فلوبیر اور جیمز جائس کا نام لکھ لیجیے، لیکن اس میں بھی یہ مشکل ہے کہ میں کسی ایک کا نام نہیں لے سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے جتنا ناول نگاروں کو پڑھا ہے اتنا ہی شاعروں کو بھی پڑھا ہے۔

سوال: کیا آپ نے اپنے ابتدائی مضامین پر کسی سے اصلاح بھی لی؟

عسکری: نہیں صاحب!

سوال: اس کی کیا وجہ تھی کہ آپ نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی؟

عسکری: ہاں یہی سمجھ لیجیے کہ ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

سوال: آپ کی زندگی میں ایسا کون سا واقعہ پیش آیا جس نے آپ کی تحریر پر اثر ڈالا ہو؟

عسکری: نہیں صاحب! ایسا کوئی واقعہ میری زندگی میں پیش نہیں آیا۔

سوال: آپ نے تنقید نگاری کن وجوہ کی بنا پر شروع کی؟

عسکری: صاحب یہ بھی بہت مشکل سوال ہے۔ میرے خیال میں تنقید اور تخلیق ایک ساتھ چلنی چاہیے۔ نئے ادب کے زوال کا باعث یہ بھی ہوا کہ اس میں تنقیدی صلاحیت نہیں تھی۔ میں جب لکھتا ہوں تو یہ بھی چاہتا ہوں کہ میری تنقید، تخلیق کے لیے تیاری کا کام دے۔

سوال: آپ کے خیال میں اردو میں کامیاب تنقید نگار کون ہے اور کیوں؟

عسکری: صاحب میں اس دور میں فراق کو کامیاب تنقید نگار سمجھتا ہوں۔ ان کی سب سے پہلی خوبی تو یہی ہے کہ وہ ادب کو ادب سمجھ کر پڑھتے ہیں اور دوسرے لوگ محض ان حالات کا ذکر کرتے ہیں جن میں ادب پیدا ہوا۔ بس اور کیا لکھیں گے؟

سوال: آپ کے نزدیک ایک کامیاب تنقید نگار میں کن کن چیزوں کا ہونا ضروری ہے؟

عسکری: صاحب سب سے پہلی چیز تو یہ کہ وہ جمالیاتی جذبے کو اور جذبوں سے الگ کر کے دیکھ سکے۔ نمبر دو، بات یہ ہے کہ ایک آدمی کے کام کو اسی قسم کے دوسرے کام سے الگ کر سکے اور یہ کہ اس میں امتیازات کو سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ بس!

سوال: آپ کے خیال میں آپ کا بہترین مضمون یا افسانہ کون سا ہے اور وہ افسانہ یا مضمون کن حالات میں لکھا گیا؟

عسکری: صاحب یہ کہنا بالکل غلط ہوتا ہے کہ کسی ادیب کا فلاں افسانہ یا فلاں مضمون سب سے اچھا ہے۔ کسی ادیب کی تحریروں کو بہ حیثیت مجموعی دیکھنا چاہیے۔

سوال: کیا آپ ملک کی موجودہ ادبی حالت سے مطمئن ہیں؟ اور اگر نہیں تو اس کی بہتری کے لیے آپ کے پاس کیا تدابیر ہیں؟

عسکری: نہیں صاحب، میں مطمئن نہیں... اس کی بہتری کے لیے صرف ایک ہی جملہ لکھ لیجیے کہ ادیب اپنے آپ کو ادیب سمجھنا چھوڑ دیں۔ لوگوں میں یہ ایک عادت سی پڑ گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ادیب سمجھنے لگتے ہیں۔ اس سے ان میں لکھنے کی قوت جاتی رہتی ہے۔ ادیبوں کو چاہیے وہ لکھنے کی کوشش کریں۔

سوال: آپ کے خیال میں ہمارا نظریۂ ادب کیا ہونا چاہیے؟

عسکری: صاحب! یہ سوال اس قسم کا ہے کہ اس کا جواب چند لفظوں میں نہیں دیا جا سکتا۔ پھر بھی یہ لکھ لیجیے کہ محض نظریہ اچھا ہو یا برا، اس سے کام نہیں چلتا۔ اصل چیز تو تخلیق ہے۔ بُرے نظریے کے تحت بھی اچھی تخلیق ممکن ہے۔ بشرطے کہ لکھنے والے میں صلاحیت ہو۔

سوال: کیا آپ کے خیال میں ادب کو سیاست سے الگ رہنا چاہیے؟

عسکری: ادب کو "سیاست بازی" سے ضرور الگ رہنا چاہیے، لیکن جن معنوں میں یونانی لوگ سیاست کا لفظ استعمال کرتے تھے یعنی اجتماعی زندگی، اس سے ادب الگ نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ اجتماعی زندگی کے بغیر ادب کا تصور ہی ناممکن ہے۔

سوال: اردو کے قدیم شعرا میں سے آپ کسے زیادہ پسند کرتے ہیں اور اس کی وجہ کیا ہے؟

عسکری: صاحب مجھے میر پسند ہیں۔ ان کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ اُنھوں نے عام سے عام الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی پیدا کیے جو اردو کا کوئی دوسرا شاعر پیدا نہیں کر سکا۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے زندگی کے انتہائی متضاد تجربوں کو ملا کر وحدت پیدا کرنا چاہی۔

سوال: موجودہ اردو شاعروں میں آپ کسے کامیاب سمجھتے ہیں؟

عسکری: فراق کو۔

سوال: موجودہ افسانہ نگاروں میں آپ کسے کامیاب افسانہ نگار سمجھتے ہیں؟

عسکری: منٹو کو۔

سوال: منٹو میں ایسی کون سی خوبی ہے جو دوسرے افسانہ نگاروں میں نہیں؟

عسکری: یہ مت پوچھیے۔ اس کے لیے ایک مضمون چاہیے اور وہ میں کئی بار لکھ چکا ہوں۔

سوال: آپ کے خیال میں کیا اردو میں اب تک کوئی کامیاب ناول لکھا گیا ہے یا نہیں؟

عسکری: عصمت چغتائی کے ناول ''ٹیڑھی لکیر'' کے پہلے سو صفحات کامیاب کہے جاسکتے ہیں۔

سوال: ڈرامے کے متعلق آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

عسکری: ہمارے ہاں ڈراما سرے سے ہے ہی نہیں۔

سوال: کیا آپ کے خیال میں ترقی پسند مصنّفین کی تحریک نے کوئی اچھا ادیب پیدا کیا ہے؟

عسکری: عصمت چغتائی ہے، لیکن اس سلسلے میں، میں الٹا آپ سے سوال کروں گا کہ عصمت کو ترقی پسند مصنّفین کی تحریک نے پیدا کیا ہے یا وہ خود پیدا ہوئی ہیں؟

سوال: ترقی پسند ناقدوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

عسکری: ترقی پسند مصنّفین کے ناقدین عموماً ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ کون سا ادب کن حالات میں پیدا ہوا، لیکن ادب کا ماحول سے کیا رشتہ ہے؟ وہ یہ نہیں بتاتے۔ دوسری بات وہ یہ نہیں بتاتے کہ جو ادیب ایک ہی سے معاشی حالات میں پیدا ہوئے، ان کا ادب الگ الگ کیوں ہے؟ مثلاً سوداؔ اور میرؔ ایک ہی زمانے میں پیدا ہوئے، لیکن ان کی شاعری کیوں مختلف ہے؟

سوال: کیا آپ ادب کی موجودہ رفتار سے مطمئن ہیں؟

عسکری: نہیں صاحب، رفتار تو ہے ہی نہیں، لوگ جیسا اب سے پانچ چھ سال پہلے لکھ رہے تھے وہی خیالات اور جذبات دوہرائے چلے جارہے ہیں۔

سوال: رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

عسکری: صاحب! اس ناول کی جتنی تعریف کی گئی ہے وہ اتنا اچھا نہیں ہے۔

سوال: ادھر چار پانچ سال میں تنقید کی کئی ایک کتابیں آئی ہیں۔ آپ کے خیال میں ان میں کوئی اچھی

تنقید کی کتاب بھی ہے؟

عسکری: صاحب! میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ پچھلے پندرہ سال میں اردو کی تنقید میں صرف تین کتابیں آئی ہیں۔ فراق کی ''اندازے'' اور ''اردو کی عشقیہ شاعری'' اور کلیم الدین احمد کی ''فنِ داستان گوئی۔''

سوال: فیض کی شاعری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

عسکری: ۳۶ء کے بعد نظم صرف ایک ہی آدمی نے کہی ہے اور وہ ''فیض'' ہے، لیکن ان کا مجموعہ ''دستِ صبا'' واقعی کم زور ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں فنّی اعتبار سے کون سا افسانہ نگار اچھا ہے؟

عسکری: میرے خیال میں تو صاحب، بیدی اچھا ہے۔ کرشن چندر کا درحقیقت شاید ہی کوئی افسانہ زندہ رہے۔ کیوں کہ ان کے ہاں انسانی کردار کا احساس بہت کم ہے۔ اس کے برعکس بیدی کے افسانوں میں زندگی سے واقفیت اور احساس ہے۔ بیدی میں اگر کوئی خامی ہے تو وہ صرف یہ کہ اُن کے بیان اور زبان میں الجھاؤ ہے۔ اگر مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو ۳۷ء کے بعد صرف چار افسانہ نگار پیدا ہوئے ہیں، منٹو، عصمت، بیدی اور غلام عباس۔

سوال: آپ کے خیال میں فسادات پر کس نے کامیاب افسانے لکھے ہیں؟

عسکری: میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اگر فسادات پر کامیاب افسانے ہیں تو وہ منٹو کے ہیں۔ ''سیاہ حاشیے'' اس کی بڑی اچھی مثال ہے۔

سوال: کیا آپ نے منٹو کا افسانہ ''محمودہ'' پڑھا ہے؟

عسکری: نہیں ''محمودہ'' میری نظر سے نہیں گزرا، لیکن منٹو میں یہ بات ہے کہ وہ اچھا لکھنے لگیں تو پانچ پانچ، چھ چھ، اچھے افسانے لکھ جائیں اور اگر بُرے افسانے لکھنے پر آئیں تو اسی رفتار سے لکھ جائیں۔

سوال: کیا آپ کی رائے میں عصمت کا افسانہ ''لحاف'' اور منٹو کا ''بُو'' فحش ہیں؟

عسکری: نہیں صاحب! میرے نزدیک یہ دونوں افسانے فحش نہیں ہیں۔

سوال: کیا اردو میں افسانے کی تکنیک کے متعلق کوئی اچھی کتاب ہے؟

عسکری: میرا خیال ہے صاحب کہ اردو میں کوئی ایسی کتاب نہیں۔ ایک کتاب سروری نے لکھی ہے مگر وہ بچوں کے لیے ہے۔ وقار عظیم ہیں ان کی تحریر میں ویسے الجھاؤ ہے... لے دے کے ممتاز شیریں کا ہی ایک مضمون ''تکنیک کا تنوع'' ہے۔

سوال: آج کل بہت سے لوگ صوبائی زبانوں کے ادب کو اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ آپ کے نزدیک یہ جذبہ کہاں تک درست ہے؟

عسکری: یہ تو پہلے سے ہونا چاہیے تھا کہ اردو مقامی ادب کو جذب کرے۔ پاکستان کے سارے مسائل کی جڑ یہ ہے کہ ابھی ہمارے اندر ایک قوم ہونے کا احساس نہیں پیدا ہوا۔ یہ احساس صرف تہذیبی سرگرمیوں کی مدد سے پیدا ہوسکتا تھا۔ وہ اس طرح کہ اردو کی وسیع تر روایت میں مقامی ادبوں کی روایت بھی جذب ہوتی رہے، لیکن اس سلسلے میں ہم نے ذہنی کاہلی کا ثبوت دیا۔ دوسری طرف حکومت نے بالکل غفلت برتی۔ یوں تو حکومت مختلف قسم کے وفود باہر بھیجنے کے لیے ہزاروں اور لاکھوں روپیہ خرچ کرتی ہے، لیکن اس کو یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ پاکستان کے ادیبوں کو مختلف علاقوں میں چار چار چھ چھ مہینے گزارنے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ وہاں کی زندگی سے واقف ہوسکیں۔ بہرصورت مقامی زبانوں سے ترجمے کرنے کی کوشش مستحسن ہے، لیکن اس کی نوعیت معمولاتی نہیں ہونی چاہیے۔ ان مقامی زبانوں کو تخلیقی طور پر اردو پر اثرانداز ہونا چاہیے بلکہ یہ سلسلہ یہاں تک بڑھنا چاہیے کہ اردو مقامی زبانوں کے الفاظ اور محاورات بھی اخذ کرے۔

سوال: آپ کے خیال میں معاشی بدحالی کے دور میں اچھے ادب کا پیدا ہونا ممکن ہے؟

عسکری: معاشی خوش حالی اور معاشی بدحالی کا براہ راست ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ صاحب ادب کی تخلیق صرف اسی وقت ہوتی ہے جب صرف ادیبوں کو ہی نہیں بلکہ عام لوگوں کو بھی اپنی زندگی سے تخلیقی دلچسپی ہو۔ اگر ادب کی تخلیق بند ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں جینے کی خواہش کم ہوگئی ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں اردو میں آج تک کوئی اچھا ''رپورتاژ'' لکھا گیا ہے یا نہیں؟

عسکری: صاحب اردو میں شاہد احمد دہلوی کا رپورتاژ ''دلّی کی بپتا'' اچھا ہے۔

سوال: کیا اس وقت کسی نئی ادبی تحریک کے پیدا ہونے کے امکانات ہیں یا نہیں؟

عسکری: کوئی ادبی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک کہ ادب اور ادیب کی معاشرے میں جگہ مقرر نہ ہو۔ اردو ادیبوں کی جو معاشرے میں جگہ تھی، وہ پچھلے پانچ سال کے عرصے میں جاتی رہی۔ اب پاکستان کا معاشرہ ادب اور ادیب کی کوئی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتا اور مستقبل کا پتا نہیں، اس کے متعلق کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا۔

سوال: مجتبیٰ حسین صاحب کا مضمون ''چوں ذوقِ نغمہ کم یابی'' جس میں انھوں نے ترقی پسند ادب کا جائزہ لیا ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

عسکری: مجتبیٰ صاحب نے اپنے مضمون کے شروع میں اعلان کیا تھا کہ وہ ترقی پسندوں کی خرابیاں بتائیں گے، لیکن جب انھوں نے انفرادی طور پر بحث کی ہے تو ان کی خوبیاں بتائی ہیں۔ اگر ترقی پسند واقعی اتنا اچھا لکھ رہے ہیں تو پھر انھیں شکایت کس بات کی ہے؟ بہرصورت مجتبیٰ صاحب کا مضمون پڑھنے سے مجھے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ انھوں نے ممتاز حسین صاحب کے جو اقتباسات نقل کیے ہیں انھیں دیکھنے کے بعد ممتاز صاحب کی تحریریں پڑھنے کو جی چاہنے لگا ہے۔

سوال: ترقی پسند ناقدین کے متعلق آپ ذرا وضاحت سے کچھ کہہ دیں تو زیادہ بہتر ہے۔ مجھے صرف آپ کی رائے چاہیے؟

عسکری: تقریباً اب سے دس سال پہلے سجاد ظہیر صاحب، کیفی اعظمی کی بے انتہا تعریف کرتے تھے اور اگر کوئی ان پر اعتراض کرتا تھا تو اسے تقریباً انجمن ترقی پسند مصنفین سے نکالنے کی فکر میں لگ جاتے تھے، لیکن اب انھوں نے جو جیل سے خط لکھے ہیں تو ان میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس زمانے میں اُن کے پاس پڑھنے اور سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ چھوٹے موٹے ترقی پسند نقادوں کو تو چھوڑیے احتشام حسین کا یہی حال ہے۔
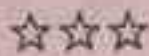
انتظار حسین

تھوڑا ذکر عسکری صاحب کا

عسکری صاحب سے میری پہلی باقاعدہ ملاقات ایک ٹال میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو لکڑیاں چرنے کی آواز کانوں میں آ رہی ہے۔ باہر احاطے میں لکڑیاں چیری جا رہی تھیں، میں اندر بیٹھا عسکری صاحب کو کرشن چندر کا قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

باقاعدہ ملاقات میں نے یہ سوچ کر کہا کہ اس سے پہلے جو ملاقات تھی وہ بہت بے قاعدہ تھی۔ بہت دیر تک تو میں اسی شک میں رہا کہ جس شخص سے میں مل رہا ہوں وہ محمد حسن عسکری ہے بھی یا نہیں۔ ہوا یوں کہ میرٹھ میں ایک آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام ہوا۔ کتنے نامی گرامی شاعر اس میں آئے ہوئے تھے۔ مگر میری دلچسپی اس مشاعرے میں فراقؔ صاحب کے واسطے سے تھی۔ سو دوڑا ہوا وہاں گیا۔ مگر مشاعرے کی پچھلی صفوں میں بس کھڑے ہونے کی جگہ مل سکی۔ اتنی دور سے انھیں دیکھ کر دل کو تسکین نہیں ہوئی۔ مشاعرے سے مایوس واپس آیا۔ مگر پھر ایک عجیب خیال آیا، یہ کہ اگر فراقؔ صاحب کو ہم اپنے کالج میں جتن کر کے لے آئیں تو قریب سے دیکھنے اور باتیں کرنے کی خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ لیکن کیسے لے کے آئیں، تقاریب کا اہتمام تو اردو سوسائٹی کیا کرتی تھی جس سے میرا ابھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ ایسے میں مجھے اپنے ایک پرانے کلاس فیلو کا دھیان آیا۔ فرسٹ ییکنڈ ایئر کے وقت سے ایک ہی کلاس فیلو سے میری یاد اللہ چلی آتی تھی، شفیق احمد سے جو اس وقت انگریزی میں ایم اے کر رہے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ اردو سوسائٹی والوں سے ان کی خوب یاد اللہ ہے۔ میں صبح ہی صبح ان کے پاس گیا اور اپنی اس خواہش کا ذکر کیا۔ فراقؔ کی شاعری سے انھیں بھی دلچسپی چلی آتی تھی۔ بس قارورہ مل گیا۔ چھوڑیے کہ اس دن ہم دونوں نے کتنی بھاگ دوڑ کی، کس طرح اردو سوسائٹی کو اس فوری تقریب کے لیے آمادہ کیا، کس طرح فراقؔ صاحب کی خدمت میں حاضری دے کر نئے ادب پر لیکچر کی درخواست کی، کس طرح انھوں نے ہمارا امتحان لیا کہ ہم نئے ادب کے معاملے میں کتنے پانی میں ہیں۔ بس یہ سن لیجیے کہ جب ہم نے فراقؔ صاحب کو قائل کر لیا اور جب ہم انھیں لے کر آ رہے تھے تو ان کے ہمراہ تانگے میں ایک صاحب اور بھی

بیٹھ لیے۔ بر میں نیلی گرم اچکن، ٹانگوں میں انگا تنگی موری والا پائجامہ۔ ہم نے ان صاحب پر کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ شخصیت میں کوئی کشش نظر آتی تو سوچتے کہ موصوف کیا بیچتے ہیں۔ مگر جب فراق صاحب نے تقریر کرتے کرتے نئے افسانے کا ذکر کیا اور ان موصوف کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ جو یہاں محمد حسن عسکری بیٹھے ہیں تو ایک دم سے ہم سب دوست چونکے۔ برابر میں بیٹھے ہوئے اس شخص کو ایک تعجب اور شک کے ساتھ سر سے پیر تک دیکھا۔ پھر آپس میں نظروں نظروں میں تبادلۂ خیال کیا۔ آخر میں نے پوچھ ہی لیا، ''آپ محمد حسن عسکری ہیں؟''

''جی۔''

پھر بھی اطمینان نہیں ہوا۔ سعید بور نے یعنی سلیم احمد کے گروپ کا وہ نوجوان جسے ہم سعید بور کہتے تھے، میری طرف دیکھا۔ تامل کیا۔ پھر وضاحت کی خاطر سوال کیا، ''حرامجادی والے عسکری!؟''

وہی مختصر جواب ''جی۔'' اور پھر چپ۔

عسکری صاحب سے یہ تعارف تو ہبڑ دبڑ میں ہوا تھا۔ ہم فراق صاحب کی مدارات میں مصروف تھے، بیچ میں آ گئے عسکری صاحب۔ ان سے مفصل ملاقات آگے چل کر ہوئی۔ ویسے وہ ملاقات بھی بالکل غیر متوقع طور پر ہوئی۔ خیر نگر بازار کے موڑ پر ایک ٹال تھی۔ یہ سعید بور کے والد کی ٹال تھی۔ کالج کی چھٹیاں تھیں، سو سعید بور نے یہاں باقاعدہ بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے سائیکل پر گزرتے گزرتے سوچا کہ چلو سعید بور کو بھی جھانکتے چلیں۔ اندر قدم رکھا تو دیکھا کہ عسکری صاحب بیٹھے ہیں۔ مگر کس خوشی میں! یہ سعید بور نے بالا بالا عسکری صاحب سے کیسے رابطہ قائم کر لیا!؟ اصل میں سعید بور عسکری صاحب کے بھائی محمد حسن مثنیٰ کا کلاس فیلو تھا۔ بس اسی واسطے سے اس نے عسکری صاحب سے ملاقات کی اور اپنی ٹال کی شان دکھانے کے لیے یہاں لے آیا۔ بیچ میں ٹپک پڑا میں تو صورت یہ تھی کہ باہر احاطے میں لکڑیاں چیری جا رہی تھیں، اندر میں کرشن چندر کے افسانوں پر تقریر کر رہا تھا۔ اور عسکری صاحب خاموش سن رہے تھے۔

آخر میں بولے، ''ڈپٹی نذیر احمد کے ناول تو آپ نے پڑھے ہوں گے!''

''جی پڑھے ہیں۔''

''جیسے ان کے یہاں زندہ کردار آتے ہیں مثلاً ظاہر دار بیگ، ایسا کوئی کردار کرشن چندر کے یہاں نظر آیا؟ اس طرح کا کوئی چلتا پھرتا کردار آپ کو یاد ہو تو بتائیے۔''

میں سٹپٹا گیا۔

اٹھتے ہوئے میں نے کہا، ''آپ اپنے گھر کا پتا بتائیے، میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔''

''نہیں میں خود آؤں گا۔ آپ اپنے گھر کا پتا مجھے سمجھائیے۔''

میں نے گھر کا پتا سمجھایا۔ دوسرے ہی دن، دن ڈھلے آن موجود ہوئے اور پھر آتے ہی چلے

گئے۔ روز طے شدہ وقت پر سہ پہر کو آنا، تھوڑی دیر بیٹھنا پھر تقاضا کرنا، ''اٹھو، ٹہلنے چلتے ہیں۔''

بس ایک سہ پہر ناغہ ہوئی۔ مگر اس ناغے کی اطلاع دینے وہ خود آئے۔ وقتِ مقررہ پر آئے، چار منٹ بیٹھے۔ پھر کہا کہ آج ملاقات نہیں ہو سکتی، میں بس بتانے آیا ہوں، چل رہا ہوں۔ اصل میں صبح میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ تدفین تو ہو گئی ہے مگر تعزیت کرنے والے آ رہے ہیں۔ اس لیے مجھے گھر پر رہنا چاہیے۔''

سو بس کھڑے کھڑے آئے اور واپس ہو لیے۔

والدِ گرامی کا بیٹے کے متعلق ایک ہی ردِعمل عسکری صاحب کی زبانی مجھ تک پہنچ سکا۔ اصل میں عسکری صاحب میرٹھ میں ان دنوں بے روزگاری کے دن گزار رہے تھے۔ دن بھر پلنگ پہ لیٹے کتاب پڑھتے رہتے۔ شام کو ٹہلتے ٹہلتے میری طرف آ جاتے۔ خاندان کے ایک بزرگ نے یہ نقشہ دیکھا تو عسکری صاحب کے والد سے بولے، ''بھائی، یہ تمھارا بیٹا دن بھر پڑا چارپائی کے بان توڑتا رہتا ہے، آخر زندگی ایسے کیسے گزرے گی؟ اسے کسی ہلے سے لگنا چاہیے۔''

والد صاحب نے افسردہ لہجے میں کہا، ''اصل میں اس لڑکے کو لکھنے لکھانے کی لت پڑ گئی ہے۔ اسی اُدھیڑ بُن میں پڑا رہتا ہے۔''

اس بزرگ کو فوراً یاد آیا کہ ان کے محلے سے ایک پندرہ روزہ پرچہ ''چینچل'' نکلتا ہے جس میں لطیفے، چٹکلے، ایکٹرسوں کے اسکینڈل، پہلوانوں کے دنگل کی خبریں اور ایسا بہت سا چٹ پٹا مال پیش کیا جاتا ہے۔ کہنے لگے، ''اچھا صاحب زادے کو یہ شوق ہے، کوئی بات نہیں ''چینچل'' کا ایڈیٹر ہمارا برخوردار ہے۔ میں اس سے کہہ دوں گا۔ صاحب زادے اپنا مضمون وہاں بھیج دیا کریں۔''

والد صاحب نے بیٹے تک یہ پیغام پہنچایا۔ بیٹے نے بہت سعادت مندی سے جواب دیا، ''جی، بہت اچھا۔''

عسکری صاحب نے پہلے مجھ کوڑھ مغز کو ایلیٹ کی شاعری پڑھا ڈالنے پر کمر باندھی۔ پھر کہا، ''تم فرنچ سیکھ لو۔''

میں نے کہا، ''سکھا دو۔''

سو فرنچ سکھانی شروع کر دی۔ کرشن چندر کی مسلسل مدح سن کر ٹامس مان کی ٹرائی لوجی پڑھنے کو دی، ''اسے پڑھو پھر تمھیں پتا چلے گا کہ افسانہ اور ناول کیا ہوتا ہے؟''

مگر یہ سلسلہ میرٹھ تک چلا، لاہور میں آ کر اس کی تجدید نہیں ہوئی۔ عسکری صاحب کو جلد ہی پتا چل گیا کہ ان تلوں میں بس اتنا ہی تیل ہے کہ بس افسانے میں کیلا کاٹی کر لیا کرے۔ ادھر یہ شوق وافر تھا کہ اپنے علم کے چراغ سے دوسرے چراغ روشن کیے جائیں۔ آگے چل کر انھوں نے سلیم احمد پر ریاض کیا۔ کس گرم جوشی سے اپنے علم سے اس کے سینے کو منور کرنے کی کوشش کی۔ ادھر اس عزیز نے بھی

مرشد کا سارا علم اپنے اندر اتار لینے کی بہت سعی جمیل کی۔ پھر کیا ہوا۔ مگر یہ تو میں بہت آگے نکل گیا۔ میں ذکر یہ کر رہا تھا کہ عسکری صاحب کا طور یہ ٹھہرا تھا کہ روز دن ڈھلے آتے، پہلے فرنچ کا سبق پڑھاتے، پھر ہم ٹہلنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ شروع میں تو بس سڑکوں سڑکوں بھٹکتے پھرتے تھے۔ پھر پڑاؤ کرنے کے لیے ایک ٹھکانا میسر آگیا، ہمارے استاد پروفیسر کرار حسین کی بیٹھک۔ کیا خوب جگہ تھی۔ خاکسار تحریک سے جو نوجوان بغاوت کرتا وہ اچھرا، لاہور سے بستر بوریا باندھتا اور یہاں آکر ڈیرے ڈال دیتا۔ ادھر شہر کا ہر رنگ کا معزز چل کر یہاں آتا اور کرار صاحب کی گفتگو سے سیراب ہو کر جاتا۔ ہم جیسے طالب علموں کا بھی پھیرا لگتا رہتا۔ اب عسکری صاحب نے یہاں باقاعدگی سے روز شام کو آنا شروع کر دیا تھا۔

شروع میں میرا گمان یہ تھا کہ عسکری صاحب خالص ادب کے آدمی ہیں۔ مگر وہ تو ساتھ میں مسلم لیگی بھی نکلے۔ اور ایسے ویسے مسلم لیگی، بس مت پوچھو۔ کرار صاحب کے یہاں ابھی تک صرف خاکساری نقطۂ نظر سے یا رد خاکساری نقطۂ نظر سے ملت اسلامیہ کے حالات کے تجزیے ہوتے تھے۔ اب یہاں مسلم لیگ کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔

اعلان پاکستان کے بعد کے دنوں میں جب قریب و دور سے فسادات کی خبریں آرہی تھیں اور ہر مسلمان سراسیمہ نظر آتا تھا، عسکری صاحب کو دور کی سوجھی۔ تجویز پیش کی کہ میرٹھ میں ایک ہند اسلامی کلچرل کانفرنس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ پاکستان بننے کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے سیاسی جدوجہد کا باب بند ہوگیا۔ اب کلچرل سطح پر جدوجہد کر کے اپنے آپ کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔

کرار صاحب نے اس تجویز پر صاد کیا اور وہ جو انھوں نے خاکسار تحریک سے ٹوٹ کر اپنی اسلامی انقلابی تحریک شروع کر رکھی تھی اس کی طرف سے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ لیجیے منصوبہ بندیاں شروع ہوگئیں اور ایک روز عسکری صاحب نے جھرجھری لی اور دلّی جاکر ان مسلمان رہنماؤں سے، جو لوک سبھا کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے وہاں آئے ہوئے تھے، ملنے کی ٹھانی۔ میں ان کے ہم رکاب تھا۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ اس بہانے مولانا حسرت موہانی کو دیکھنے، ان کی باتیں سننے کا موقع ملے گا۔ مگر وہ تو ابھی دلّی پہنچے ہی نہیں تھے۔ یوپی کے کئی رہنماؤں سے عسکری صاحب ملے۔ جس سے اس منصوبے کی بات کی اس نے عسکری صاحب کو حیرت سے دیکھا۔ تامل کیا، پھر سمجھایا کہ حالات بہت خراب ہیں۔ ایسے منصوبوں کے لیے وقت سازگار نہیں۔

عسکری صاحب ان رہنماؤں کو برا بھلا کہتے واپس آئے۔ لیکن شاید وہ رہنما ہی صحیح تھے۔ دیکھتے دیکھتے آسمان نے ایسا رنگ بدلا کہ سارا نقشہ ہی ابتر ہوگیا۔ دلّی میں وہ تباہی آئی کہ مسلمانوں کے محلے اجڑنے لگے۔ پرانے قلعے میں کیمپ لگنے لگے۔ میرٹھ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اسپیشل ٹرینیں چلنے لگیں:

کوئی آگے گیا باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

ہند اسلامی کلچرل کانفرنس کے منصوبے پہ اوس پڑ گئی۔ لوگوں کو جانوں کی پڑی ہوئی تھی۔ کہاں

کی رباعی کہاں کی غزل اور کیسا ہند اسلامی کلچر۔ مگر خیر:

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے وہ یہاں آ کے دم ہوئے

پاکستان میں آ کر عسکری صاحب نے اس قبیل کے ارمان خوب پورے کیے۔ لاہور پہنچ کر وہ صرف چند مہینے چپ بیٹھے۔ پھر ایسے رواں ہوئے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ خاموشی کے وہ چند مہینے بھی ایک طرح کی مجبوری تھے۔ کرتے کیا، کیسے قلم اٹھاتے۔ شہر میں ترقی پسند کوس لمن الملکی بجا رہے تھے۔ لاہور سے کراچی تک ان کا طوطی بول رہا تھا۔ ویسے بھی پورے برصغیر میں یہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ جو ترقی پسند نہیں بھی تھے وہ کسی نہ کسی طور ان سے اثر قبول کر رہے تھے۔ اگر کوئی مخالف بھی تھا تو اس کی مجال تھی کہ ان کے مقابلے میں چوں کر جائے۔

ہاں اس شہر میں ادب کا ایک کھونٹا اور بھی تھا۔ حلقۂ ارباب ذوق۔ اتوار کی اتوار وائی ایم سی اے کے بورڈ روم میں اس کی نشست بجتی۔ مگر اس کا رنگ انجمن کی نشست سے کتنا مختلف ہوتا۔ انجمن کے جلسے میں ہر پھر کر وہی بحث کہ ادب اور زندگی میں کیا رشتہ ہے؟ جلسے کے ختم ہوتے ہوتے دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جاتا۔ دوٹوک فیصلہ کہ ادب زندگی ہے اور زندگی ادب ہے۔ اور خود زندگی کیا ہے؟ سماجی معاملات اور اپنے وقت کے سیاسی مسائل۔ جو ادیب ان سے آنکھ چراتا ہے وہ زندگی سے بھاگتا ہے۔ پس وہ فراری ادیب ہے۔ ادھر حلقے میں جو سوال اٹھتے وہ طے ہونے ہی میں نہ آتے۔ نظم پڑھی جاتی تو سوال اٹھ کھڑا ہوتا کہ شاعری کیا ہوتی ہے؟ ڈراما پڑھا جاتا تو پوچھا جاتا کہ ڈراما ہوتا کیا ہے؟ اصغر بٹ یہاں ڈرامے کے ایکسپرٹ کے طور پر بیٹھے نظر آتے۔ فوراً بتانا شروع کر دیتے کہ ڈراما کیا ہوتا ہے۔ کبھی یہ بحث شروع ہو جاتی کہ غزل کی تعریف کیا ہے؟ جتنی بحث ہوتی اتنا مسئلہ الجھتا جاتا۔ جلسہ ختم ہو جاتا اور مسئلہ جوں کا توں رہتا۔

اشخاص کا معاملہ یہ تھا کہ کوئی بحث میں رواں مگر قلم کا کوتاہ، کسی کا قلم چلتا ہے مگر بحث میں زبان لڑکھڑاتی ہے۔ انجم رومانی والا حال کہ شعر تُھکا ہوا کہتے تھے، مگر فقرہ جب منھ سے نکلا، نکلتے ہی ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا۔ یوسف ظفر اور شیر محمد اختر جب برابر برابر بیٹھتے تو شتر گربہ کی صورت پیدا ہو جاتی۔ یوسف ظفر آدمی مختصر، پستہ قد، شیر محمد اختر لمبے تڑنگے، چوڑے چکلے، پنجاب کے روایتی قد و قامت کی سچی مثال۔ اک ذرا ہکلاتے تھے پھر بھی بحث میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ فرائڈ کے متوالے تھے۔ کسی بھی مسئلے پر بحث ہوتی فرائڈ کو درمیان میں لے آتے اور تان اس پر توڑتے کہ ''س۔ س۔ سب۔ س۔ س۔ سیکس ہے۔''

شیر محمد اختر نے ان دنوں بیڈن روڈ پر ایک دوست کے ساتھ مل کر کتابوں کی ایک ایسی دکان کھولی تھی جہاں صرف نفسیات کی کتابیں دستیاب تھیں۔ اس دوست کا نام بھی اتفاق سے اختر تھا۔ دکان کا

نام رکھا گیا، اختر اور اختر۔ حفیظ ہوشیار پوری کو ایسا موقع خدا دے۔ ہجو اور قطعہ تاریخ لکھنے کے لیے بہانہ ڈھونڈتے تھے۔ دکان کو دیکھا اور فوراً رواں ہو گئے۔ ہجو کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے:

ہے ان کا نام اختر اور اختر
یہ دو پاجی کتابیں بیچتے ہیں

تو یہ تھا ان دنوں حلقہ اربابِ ذوق کا رنگ۔ یار لوگ سمجھتے ہیں حلقے کی انجمن ترقی پسند مصنفین سے نظریاتی جنگ تھی۔ بعض ترقی پسند بھی یہی کہتے سنے گئے ہیں۔ بالکل غلط۔ حلقہ تو نظریاتی جنگ کا قائل ہی نہیں تھا۔ ترقی پسندوں کے خلاف ان دنوں جو ادیب صف آرا ہوئے ان کا حلقے سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ سوچیے کہ عسکری صاحب کا حلقے سے کوئی رشتہ تھا۔ اور دوسرا جو ان کے خلاف میدان میں اُترا وہ خود تحریک سے بچھڑ کر اب آمادۂ بغاوت بنا۔ ''نظام'' میں جب عسکری صاحب کے مضمون پر بحث چلی تو مجھے بھی یہی گمان تھا کہ حلقے کے ادیب ان کے موقف کی حمایت میں لکھیں گے۔ یہی سوچ کر میں نے ان سے رجوع کیا تھا۔ بات یہ تھی کہ جو مکتوب جو مضمون موصول ہوتا وہ عبداللہ ملک کے موقف کی حمایت کرتا نظر آتا۔ میں نے یہ سوچ کر حلقے والوں سے رجوع کیا کہ یہ ترقی پسند تحریک سے الگ ایک مکتبہ فکر ہے۔ ان سے ترقی پسندوں کے موقف سے ہٹ کر بات کرنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

اس وقت حلقے کی نمایاں شخصیتیں تو یہی تھیں، قیوم نظر، یوسف ظفر، مختار صدیقی۔ میں نے سب سے پہلے قیوم نظر سے رجوع کیا۔ میں نے ان سے بڑے ادب سے گزارش کے بعد انھیں گھیر لیا:

''عسکری صاحب کے مضمون پر جو بحث چل رہی ہے وہ آپ کی نظر سے گزری؟''

''ہاں بالکل گزری۔''

''پھر آپ اس کے سلسلے میں کوئی رائے ظاہر کرنا، کچھ لکھنا پسند کریں گے؟''

قیوم نظر نے ایک اونچا قہقہہ لگایا ''چھڈو جی۔ کوئی کام کی بات کرو۔''

پھر میں نے یوسف ظفر سے رجوع کیا۔ جواب میں مسکرائے۔ ''برادر! یہ ادیب کا کام نہیں ہے۔''

جب میں نے مختار صدیقی سے یہ گزارش کی تو انھوں نے پہلے سر سے پیر تک مجھے غور سے دیکھا پھر بولے، ''یہ تم کس دھندے میں پڑ گئے ہو؟''

اس مختصر جواب پر انھوں نے بس نہیں کی۔ انھوں نے مجھے ساتھ لیا۔ مال روڈ کے ایک ریستوران میں، جو بلیو ریستوران کے نام سے نیا نیا کھلا تھا، جا کر چائے کا آرڈر دیا اور مجھے سمجھانا شروع کیا کہ ادیب کا منصب کیا ہے اور ادب کس قسم کا خلوص اور یکسوئی مانگتا ہے۔

مختار صدیقی کی اس شفقت کی ایک وجہ تھی۔ ابھی پچھلے مہینے میں نے حلقے میں اپنا افسانہ سنایا تھا۔ یہ گویا حلقے میں میری مہورت تھی۔ مختار صدیقی اس جلسے کی صدارت کر رہے تھے اور اس افسانے پر

سب سے بڑھ کر انھوں نے ہی مجھے داد دی تھی تو اب مجھے وہ ایک ہونہار افسانہ نگار سمجھتے تھے اور ایک مشفق کی حیثیت سے انھوں نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ اس نوخیز افسانہ نگار کو جو گم راہی کے رستے پر چل پڑا ہے، ادب کی سیدھی راہ دکھائی جائے۔

تو ذکر یہ تھا کہ عسکری صاحب پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگانے کے لیے تُلے بیٹھے تھے۔ مگر انھیں کوئی ہم نوانہیں مل رہا تھا۔ ایسے میں ڈاکٹر تاثیر نمودار ہوئے۔ قاعدے سے تو اس ادبی محفل کے بعد جو ابھی پچھلے دنوں گورنمنٹ کالج میں ہوئی تھی، عسکری صاحب کی تاثیر صاحب سے ٹھن جانی چاہیے تھی۔ بخاری صاحب جو ان دنوں کالج کے پرنسپل تھے، صدارت کر رہے تھے۔ عسکری صاحب نے مقالہ پڑھا، ''مارکسیت اور ادبی منصوبہ بندی۔'' اس محفل میں تاثیر صاحب بھی تھے۔ بخاری صاحب نے مقالے کے بعد تاثیر صاحب کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ان نظروں نے تاثیر صاحب کے لیے چچی کا کام کیا۔ پھڑکے اور دم کے دم میں زقندیں بھرنے لگے۔ مارکسیت کے جو خصوصی مطالعے کیے گئے تھے اس کا انھوں نے پورا دفتر کھول دیا۔ ایک ایک کتاب کا نام لیتے اور پوچھتے عسکری صاحب، یہ کتاب تو آپ کی نظر سے گزری ہوگی اور عسکری صاحب سادگی سے جواب دیتے کہ نہیں۔

عسکری صاحب کے یہاں ''جی'' کا استعمال تو پہلے بھی دیکھا تھا، آگے چل کر بھی بہت دیکھا مگر اس سادگی سے ''نہیں'' کا استعمال میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ ''جی'' کے استعمال کی صورت یہ تھی کہ کوئی بحث کا دھنی انٹلکچوئل آکر عسکری صاحب سے بھڑ جاتا تو عسکری صاحب بحث سے بچنے کا راستہ یہ نکالتے کہ کسی بات پر اختلاف ہی نہیں کر رہے۔ اختلاف کریں تو بحث چلے۔ مگر یہاں ہر بات ہر بیان پہ کہنا کہ جی۔ جی ہاں۔ مگر انھوں نے تاثیر صاحب کے ہر سوال کا جواب ''نہیں'' سے دیا۔ فلاں کتاب پڑھی ہے؟ نہیں۔ اور فلاں کتاب تو پڑھی ہوگی! نہیں۔

تاثیر صاحب دیر تک یہی سمجھتے رہے کہ انھوں نے عسکری صاحب کو پچھاڑ لیا ہے۔ مگر جب آخر تک ہر سوال کا جواب ایک مختصر سے نہیں میں آیا تو پھر شاید دل میں سوچا ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

تو قاعدے سے تو اس محفل کے بعد ہی بیلوں کی لڑائی شروع ہو جانی چاہیے تھے۔ مگر قدرت کو شاید یہی منظور تھا کہ پہلے گاڑھی چھنے، پھر لڑائی ٹھنے۔ تاثیر صاحب ترقی پسند تحریک سے بدکے ہوئے تھے۔ ان کے یہاں پاکستانیت زور مار رہی تھی۔ اسی زور میں وہ ابھی پچھلے دنوں ہونے والی ترقی پسند کانفرنس میں اپنے اختلاف کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ عسکری صاحب کا اس تحریک سے پہلے ہی بیر چلا آرہا تھا۔ پاکستان کے قیام نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ عسکری صاحب کے لیے اب سے پہلے ادب مقدم تھا، باقی ہر چیز ثانوی تھی۔ اب ان کے لیے پاکستان مقدم ٹھہرا، باقی ہر چیز ثانوی۔ سو وہ ادب کو پاکستان کے تابع دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا تقسیم کے بارے میں اپنا ردعمل تھا۔ بس ان حالات میں عسکری تاثیر اتحاد وجود میں آیا:

یہ اتحاد مبارک ہو مومنوں کے لیے

مگر ترقی پسندوں کے لیے یہ اتحاد کوئی نیک شگن نہیں تھا۔ دو تو چون کے بھی برے ہوتے ہیں۔ اور یہ دو تو اپنی اپنی جگہ ادب میں بڑی حیثیت رکھتے تھے۔ سو یہ اتحاد ترقی پسندوں پر بھاری پڑا۔ مگر یہ اتحاد لمبا نہیں کھنچا۔ اصل میں تھوڑے ہی دنوں میں ایک اور اتحاد نے اس اتحاد کا رستہ کاٹ دیا۔ منٹو صاحب تاثیر صاحب کی بلیک لسٹ میں تھے۔ ان کا کوئی دوست منٹو سے پینگیں بڑھائے، یہ بات انھیں کیسے بھا سکتی تھی۔ عسکری صاحب نے بھانپ لیا اور بس بدک گئے اور ایسے بدکے کہ اپنی زندگی کا سب سے تیز مضمون انھوں نے شاید تاثیر صاحب ہی کے خلاف لکھا۔

تو اب عسکری صاحب نے ایک نئے گھر کا رستہ دیکھ لیا تھا۔ تاثیر صاحب سے یاری کٹ۔ اب روز شام کو وہ لکشمی مینشن کی طرف جاتے نظر آتے جہاں منٹو صاحب رہتے تھے۔

عسکری منٹو دوستی بہت بارآور ثابت ہوئی۔ عسکری صاحب کو جس شے کی اس وقت تلاش تھی وہ اوّلاً منٹو صاحب ہی کے یہاں سے انھیں دستیاب ہوئی۔ اصل میں وہ پاکستانی ادب کی ضرورت کا اعلان تو کر بیٹھے تھے مگر انھیں کوئی ایسا نمونہ دستیاب نہیں ہو رہا تھا جسے وہ اعتماد کے ساتھ پاکستانی ادب کے طور پر پیش کر سکیں۔ ''کھول دو'' نے ان کی اس ضرورت کو پورا کیا۔ ادھر کراچی میں ممتاز شیریں نے پاکستانی ادب کے دو نمونے دریافت کیے۔ قدرت اللہ شہاب کی طویل مختصر کہانی ''یا خدا'' اور محمود ہاشمی کے رپورتاژوں کا مجموعہ ''کشمیر اداس ہے''۔ عسکری صاحب اور ممتاز شیریں کو اوّل اوّل انھیں تین نمونوں پر گزارا کرنا پڑا۔

ترقی پسندوں کو ''کھول دو'' کی حد تک منٹو صاحب سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ یہ افسانہ ان کے لیے قابلِ قبول تھا۔ جب حکومت کو اس پر اعتراض ہوا تو اور زیادہ قابلِ قبول ہو گیا۔ تین ترقی پسند رسالوں، ''سویرا''، ''ادبِ لطیف'' اور ''نقوش'' پر بہ یک وقت سرکاری عتاب آیا تھا۔ ان میں ''نقوش'' کی بڑی خطا یہ تھی کہ اس میں ''کھول دو'' شائع ہوا تھا۔ سرکاری کارروائی کے خلاف ترقی پسند ادیبوں کو تو احتجاج کرنا ہی تھا۔ عسکری صاحب بھی اس احتجاج میں پیش پیش تھے۔ عسکری صاحب ترقی پسند ادب پر اعتراض کرنا اپنا حق سمجھتے تھے، سرکار کو یہ حق دینے کے روادار نہیں تھے۔

''کھول دو'' سے ''سیاہ حاشیے'' تک آتے آتے ادبی سیاست بدل چکی تھی۔ اب ترقی پسند منٹو صاحب سے فرنٹ تھے۔ منٹو صاحب نے ایک ستم تو یہ کیا کہ ''سیاہ حاشیے'' میں ترقی پسند تحریک کی منظور کردہ انسان دوستی سے تجاوز کر کے وہ اندازِ نظر اپنایا جسے ترقی پسند غیر انسانی اور سفاکی کا رویہ بتاتے تھے۔ اوپر سے یہ قہر ڈھایا کہ اس مجموعے کا دیباچہ عسکری صاحب سے لکھوایا۔ سو اس کتاب پر بہت لے دے ہوئی۔ سب سے کڑی تنقید احمد ندیم قاسمی نے کی پھر جوش میں آ کر انھوں منٹو کے نام ایک کھلی چٹھی لکھی۔

کھلی چٹھی کے جواب میں کوئی کھلی چٹھی تو نہیں آئی، مگر جب منٹو صاحب ''یزید'' کا اختتامیہ

لکھنے بیٹھے تو انھوں نے لگے ہاتھوں اس چٹھی کا بھی مختصر جواب لکھ ڈالا۔ ''سیاہ حاشیے'' کا ذکر کرتے ہوئے ترقی پسندوں کے ردِ عمل کا ذکر کیا اور کہا: ''میرے ایک عزیز دوست نے تو یہاں تک کہا کہ میں نے لاشوں کی جیبوں میں سے سگریٹ کے ٹکڑے، انگوٹھیاں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں نکال نکال کر جمع کی ہیں۔ اس عزیز نے میرے نام ایک کھلی چٹھی بھی شائع کی جو وہ بڑی آسانی سے مجھے خود دے سکتے تھے... مجھے غصہ تھا، اس کا نہیں کہ مجھے الف نے کیوں غلط سمجھا۔ مجھے غصہ تھا اس بات کا کہ الف نے محض فیشن کے طور پر ایک سقیم و عقیم تحریک کی انگلی پکڑ کر بیرونی سیاست کے مصنوعی ابرو کے اشارے پر میری نیت پر شک کیا اور مجھے اس کسوٹی پر پرکھا جس پر صرف ''سرخی'' ہی سونا تھی۔''

یہ بحث گرم تھی کہ ایک نئے رسالے کی دھوم پڑی۔ اس وقت دنیائے ادب میں لاہور کے تین رسالوں کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ''سویرا'' اور ''ادبِ لطیف'' تو پہلے سے جاری تھے، ''نقوش'' نیا نیا نکلا تھا۔ تینوں ترقی پسند ادب کے ترجمان تھے اور انقلاب کی ڈونڈی پیٹ رہے تھے۔ رہے ''ہمایوں'' اور ''ادبی دنیا'' سو ان کا وہی رنگ تھا جو حلقے کا کہ ناکاہو سے دوستی ناکاہو سے بیر۔ نہ کسی نظریے کی حمایت نہ مخالفت۔ عہد میں برپا ہنگاموں سے بے تعلق، خاموشی سے خالص ادب کی راہ پر رواں دواں۔ مگر اب مکتبۂ جدید نے ایک نئے ادبی رسالے کا ڈول ڈالا، نام تھا ''اردو ادب''۔ ایڈیٹر تھے منٹو اور عسکری۔ مطلب یہ تھا کہ ترقی پسند یہ نہ سمجھیں کہ ان کا نام پوچھنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ ویسے تو بس دو ہی پرچے نکلے۔ مگر کس دھوم سے نکلے اور اگلے پچھلے کتنے حساب چکائے گئے۔ پھر عسکری صاحب کے ''اسلامی ادب'' کا شگوفہ بھی تو یہیں سے پھوٹا تھا۔

تو خیر اب منٹو صاحب ترقی پسند تحریک کے معتوب تھے۔ مگر اسی ہنگام انھیں دو کام کے نقاد میسر آگئے، عسکری اور ممتاز شیریں۔ نقادوں کی ایسی جوڑی بھلا اور کس افسانہ نگار، کس شاعر کو میسر آئی تھی۔ اور ممتاز شیریں تو پھر رفتہ رفتہ منٹو کے افسانے ہی کی ہو رہیں۔ اصل میں ان دونوں نقادوں کی فکر میں ہم آہنگی تھی، مگر مزاج مختلف تھا۔ ممتاز شیریں کے مزاج میں استقلال تھا، سو ان کی پسند لمبی چلتی تھی اور منٹو صاحب کو پسند کرنے کے بعد تو انھوں نے جیسے طے کر لیا ہو کہ یک در گیر و محکم گیر۔ سو پھر ان کی تنقید منٹو کے افسانے ہی کے لیے وقف ہو گئی۔

عسکری صاحب کی طبیعت سیمابی تھی۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ذہن ابھی یہاں اور ابھی زقند بھر کے وہاں۔ سو نقاد بے اعتبار سے تھے۔ جانے کب کس لکھنے والے پہ ریجھ جائیں اور کب اس سے آنکھ پھیر لیں۔ کرشن چندر کے لیے کس طرح آسمان سے ستارے توڑ کر لائے اور پھر کس طرح اس سے فرنٹ ہوئے۔ ناصر کاظمی پر کس طرح فدا ہوئے اور پھر کیسا نئی نسل کی بات کرنے پر اس سے بدکے۔ خیر ناصر کاظمی پر اس وقت تو انھیں ریجھنا ہی تھا۔ اصل میں اس وقت انھیں ایک سچے پاکستانی شاعر کی اشد ضرورت تھی۔ ویسے تو انھیں اپنے زمانے کی شاعری کے سارے تقاضے فراق کی غزل سے پورے

ہوتے نظر آتے تھے۔ سو اول میر، دوم فراق۔ آگے تمت بالخیر۔ مگر اب درمیان میں پاکستان کی بات آپڑی تھی۔ افسانے میں تو منٹو صاحب مل گئے۔ شاعری میں کیا کیا جائے:

مؤذن مرحبا بروقت بولا

ناصر کی غزل کیسے صحیح وقت پہ نمودار ہوئی۔ کیا خوب شاعر دستیاب ہوا۔ میر کا ماننے والا، فراق کا چاہنے والا۔ غزل کھری، ترقی پسندی کی آلائش سے پاک، فسادات اور ہجرت کا بیان مگر داغ داغ اجالے کے رنگ سے نہیں بلکہ ایک تخلیقی تجربے کی کیفیت کے ساتھ۔ یہ غزل اس وقت عسکری صاحب کی ساری خواہشات کو قومی و نیز ادبی، پوری کرتی نظر آرہی تھی۔ سو انھوں نے اسے فوراً ہی لپک لیا۔ باقی آگے چل کر ناصر نئی نسل کا قصہ نہ چھیڑتا تو بھی عسکری صاحب کو اس سے منھ موڑنا ہی تھا۔ ذہنی رویہ اور اس کے ساتھ پسند بدلتی جو چلی جارہی تھی۔ تھوڑے دن سلیم سے بھی اپنی پسند کی نئی شاعری کرا کے دیکھ لی۔ مگر آخر میں روایت کے ایسے قائل ہوئے کہ انھوں نے اس واسطے سے صبر سہارن پوری کو ٹٹول کر نکالا اور تنقید کی دنیا میں مولانا اشرف علی تھانوی کو ایک بڑے نقاد کے طور پر دریافت کیا۔ کون فلوبیر، کون جوئس اور کون پاؤنڈ! یہ جس کھیت کی مولیاں تھیں اب عسکری صاحب اس کھیت ہی سے بدک چکے تھے۔

عسکری صاحب ریجھتے بھی جلدی تھے اور بدکتے بھی جلدی تھے۔ ان کے ریجھنے اور بدکنے کی منطق کبھی تو سمجھ میں آتی تھی اور کبھی بالکل سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ویسے بدکتے زیادہ تھے۔ عجب عجب ان کے طور تھے۔ پیدل چلنے کے بہت قائل تھے اور جب لاہور کی مال روڈ پر آپ پیدل چل رہے ہوں اور زمانہ وہ ہو جب مال روڈ پر یار اہلے گہلے پھرا کرتے تھے تو پھر کسی نہ کسی شناسا سے تو آپ کی مڈبھیڑ ہوگی۔ عسکری صاحب کس پھرتی سے اس سے پیچھا چھڑاتے تھے۔ وہ بڑے ذوق و شوق سے عسکری صاحب سے استفسارات کر رہا ہے اور عسکری صاحب جی جی کہتے چلے جارہے ہیں۔ آگیا چوراہا۔ عسکری صاحب ٹھٹکے، ''آپ کو کدھر جانا ہے؟'' اس شریف آدمی نے یہ سوچ کر کہ عسکری صاحب مال روڈ پر سیدھے ہی جائیں گے، کہا، ''مال ہی پر جارہا ہوں۔''

''اچھا پھر مجھے تو ادھر بیڈن روڈ پر جانا ہے۔'' جلدی سے ہاتھ ملایا اور مال سے بیڈن کی طرف مڑ گئے۔ ادھر وہ غریب حیران کہ یہ کیا ہوا۔

چائے خانے میں یا کسی دوست کے ڈرائنگ روم میں ڈھائی تین دوستوں کے بیچ بیٹھے چہک رہے ہیں۔ بس ڈھائی تین دوست ہوں ایسے جن سے پوری اپنائیت ہو، ان میں بیٹھ کر تو خوب چہکتے تھے۔ آن نازل ہوا کوئی اجنبی یعنی ان دوستوں میں سے کسی کا دوست مگر عسکری صاحب کے لیے اجنبی۔ بس چپ لگ گئی۔ اب ہم انھیں ٹھوک رہے ہیں اور وہ ہاں ہوں سے آگے ہی نہیں بڑھ رہے۔ ویسے دوستوں میں بھی کسی بھی وقت کسی سے فرنٹ ہو سکتے تھے۔ ایسوں سے بھی فرنٹ ہوتے دیکھا جنھیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ مزاج کے خلاف طور اطوار دیکھے اور بس بدک گئے۔ یا دیکھا کہ شاگرد عزیز کے

لچھن اب اور ہیں۔ بس منہ پھیر لیا۔ ایک وقت میں کچھ حرکتیں تو میری بھی ناپسندیدہ ٹھہری تھیں اور ٹھہرنی ہی تھیں۔ میں نے تو نئی نسل کے بھڑے میں ان کے خلاف ایک دو مضمون بھی کھینچ ڈالے تھے۔ مگر ردِ عمل ظاہر ہوا بھی تو طنز، تعریض اور تضحیک کی شکل میں۔ ہاں غصے کا خط ایک دفعہ موصول ہوا تھا۔ میں کراچی گیا۔ ٹی وی پر افتخار عارف سے ملاقات ہوئی۔ ان دنوں کراچی اسٹیشن نے مشہور کہانیوں کو ڈرامائی شکل میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ فرمائش پر میں نے افتخار عارف سے وعدہ کیا کہ عسکری صاحب کی کسی کہانی کو ڈرامائی شکل میں منتقل کر کے پیش کروں گا۔

یہ وعدہ کر کے میں لاہور آ گیا۔ عسکری صاحب تک یہ خبر پہنچی۔ اور اب زمانہ وہ تھا کہ عسکری صاحب نے ریڈیو سے بھی قطع تعلق کر لیا تھا اور ٹی وی سے قطع تعلق کا کیا سوال، اس سے تو شروع دن سے تعلق رکھا ہی نہیں تھا۔ تو اچانک مجھے ان کا ایک خط موصول ہوا۔ نہایت روکھا خط۔ نہ دعا سلام، نہ کچھ خیر عافیت نہ کوئی گپ شپ۔ صرف چند سطریں کہ میں نے سنا ہے تم میری کسی کہانی کو ٹی وی کے لیے ڈرامے میں ڈھال رہے ہو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو سمجھ لو کہ میں تمھارے خلاف عدالتی کارروائی کروں گا۔

میں خط کو پی گیا۔ پھر مہینوں بعد ملاقات ہوئی تو نہ میں نے اس خط کا حوالہ دیا نہ انھوں نے ایسا کوئی ذکر کیا اور انھیں ذکر کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ مقصد تو پورا ہو گیا۔ میں نے پھر کان پکڑے اور ان کی کہانی کو ہاتھ نہیں لگایا۔

لو میں اپنے آپ کو خواہ مخواہ بیچ میں لے آیا۔ ذکر تو یہ تھا کہ عسکری صاحب کو آشنا سے اجنبی بنتے دیر نہیں لگتی تھی۔ ہم عصروں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا۔ کرشن چندر کی مثال سامنے ہے جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ اپنے اردو کے لکھنے والوں کو چھوڑیے، مغرب کے کیسے کیسے جید لکھنے والے کے ساتھ انھوں نے یہی سلوک کیا۔ کہاں اٹھتے بیٹھتے اس کا کلمہ پڑھا جا رہا ہے، کہاں ایسے فرنٹ ہوئے کہ نام سننے کے روادار نہیں۔ آخر کے تئیں مغرب کی پوری ادبی اور فکری روایت اسی سلوک کی مستحق ٹھہری۔ ارے دوسروں کی جانے دو، خود اپنی تحریروں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اپنی کیسی کیسی تحریر اس رنگ سے متروک ہوئی کہ جیسے وہ ان کے قلم سے نکلی ہی نہیں تھی۔ زاہد ڈار ایک مرتبہ ملا تو کہا، ''عسکری صاحب! آپ نے تو ایک وقت میں پاکستان کے ادیبوں کو یہ نصیحت بھی کی تھی کہ پاکستان کے عوام نے جو نہر کھودی ہے وہ ایسا واقعہ ہے کہ ادیبوں کو اس پر افسانے اور نظمیں لکھنی چاہئیں۔''

عسکری صاحب نے اَن جان بن کر پوچھا، ''میں نے یہ کہاں لکھا تھا؟''

زاہد ڈار بولا، ''مجھے ایک کباڑیے کے یہاں سے ''ساقی'' کا پرچہ ملا تھا۔ اس میں آپ کا ایک مضمون تھا جس میں یہ بات لکھی گئی تھی۔''

بولے، ''پھر اُس کباڑیے ہی نے وہ مضمون لکھا ہوگا۔''

ویسے سرقہ کے الزام کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس زمانے کی اپنی ازم سزم تحریروں کے بارے میں

پوچھنے پر میں بھی یہی جواب دیتا۔

اور ہاں ابتدائی برسوں میں کوئی یہ قیاس کر سکتا تھا کہ عسکری صاحب باقی سب ادیبوں کو کنڈم کر کے انھیں معتوب و مقہور ادیبوں کو رعایتی نمبر دے کر پاس کرتے چلے جائیں گے اور بات اس طرح شروع کیا کریں گے کہ ترقی پسندوں نے ادب میں کم از کم اتنا تو کیا تھا کہ......... اور صرف اتنا ہی نہیں ہوگا کہ سیّد سبطِ حسن سے شیر و شکر ہو جائیں گے بلکہ سوویت روس بھی اب اتنا معتبر ٹھہرے گا کہ ہنگری میں اس کی فوجی کارروائی بھی انھیں جائز نظر آئے گی۔ تو عسکری صاحب کو بدلتے دیر نہیں لگتی تھی۔ گھڑی میں ان ہیں گھڑی میں بن ہیں۔ مگر یہ کہ کسی دنیاوی مصلحت کے تحت وہ کبھی نہیں بدلے۔ بس دل و دماغ میں بگولے اٹھتے رہتے تھے۔

☆☆☆

محمد حسن مثنیٰ[۱]

ایک خط... ایک تعارف ☆

محترم مشفق خواجہ صاحب، السلام علیکم!

آپ سے انتہائی شرمندگی ہے کہ چھوٹے سے کام میں اتنی دیر لگ گئی۔ ہمارے عزیزوں میں سے ایک صاحب خاندان کے شجرے کے کچھ حصے نقل کر کے ہندوستان سے ساتھ لے آئے تھے، اس میں تاریخِ پیدائش بھی شامل تھی۔ عسکری بھائی کی تاریخِ پیدائش یوں تو یاد تھی مگر شک دُور کرنے کے لیے اُن صاحب سے ملاقات میں کافی دیر ہوگئی، وہ پنڈی سے باہر گئے ہوئے تھے۔ پھر میں نے ۲۵/اپریل کو آپ کو خط لکھنا شروع کیا، اُسی دن تین صفحے اسی قسم اور سائز کے کاغذ پر لکھے تھے کہ باقی خط پورا کرنے سے پہلے allergy کی وجہ سے آنکھیں کافی خراب ہوگئیں، علاج بھی چلتا رہا اور دفتر کا کام بھی، اس لیے نہ خط پورا ہوا اور نہ آنکھیں پوری طرح درست ہوئیں۔ اب مظفر صاحب کا فون آیا ہے تو بالکل مختصر حالات لکھے دیتا ہوں۔ تفصیلاً بھی کسی وقت یہ کام بُرے بھلے انداز میں کرنا ہے۔ کراچی کے معاملات میں خانہ پُری آپ کو بھی کرنا پڑے گی، اس لیے کہ پنڈی اسلام آباد میں تو ۵۰ء کے ماہ و نو کا فائل بھی نہیں ہے۔

۱۔ محمد حسن عسکری: تاریخِ پیدائش: ۵/نومبر ۱۹۱۹ء (۱۱/صفر ۱۳۳۸ھ)، مقامِ پیدائش: قصبہ سراوہ، ضلع میرٹھ، اس قصبے کی ایک مشہور شخصیت بابائے اردو مولوی عبدالحق بھی تھے۔ یہ بھی دُور کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ عسکری کا تاریخی نام محمد اظہار الحق تھا مگر یہ نام بالکل استعمال نہیں کیا گیا۔ بھائی بہنوں کو بھی اُن کے انتقال کے بعد پتا چلا، عسکری بھائی نے دو ایک قریبی دوستوں یا شاگردوں سے ذکر کیا ہوگا، انتقال کے بعد ایک آدھ تحریر میں لوگوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ قصبہ سراوہ، ہاپوڑ سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

☆۔ مشفق خواجہ صاحب نے اپنے ایک خط میں محمد حسن مثنیٰ صاحب سے عسکری صاحب کی شخصی زندگی کے کوائف ریکارڈ پر محفوظ کرنے کے لیے کہا تھا۔ محمد حسن مثنیٰ صاحب کا یہ خط اسی فرمائش کی تکمیل ہے۔

۲۔ خاندان: عسکری کے دادا مولوی حسام الدین قصبے کی مشہور شخصیت تھے۔ پرتاب گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے ۱۹۰۸ء میں ریٹائر ہوئے تھے، ۱۹۲۶ء میں انتقال ہوا۔ دادا کے چار بیٹے تھے، جن میں سے تیسرے بیٹے محمد معین الحق، عسکری کے والد تھے۔ دادا نے عسکری کی بسم اللہ بڑی دھوم دھام سے کرائی تھی۔ میرٹھ سے کوئی بڑے مولوی صاحب بلوائے گئے تھے۔ مولوی حسام الدین حدیث کے عالم تھے، چار پانچ کتابچے اسی موضوع پر شائع ہوئے تھے، دو کے نام یاد ہیں: ''شمائل محمدیہ'' اور ''مائدۂ محمدیہ''۔ ہر کتابچے پر درج تھا کہ کسی بیٹے کی فرمائش پر لکھا گیا۔ ہمارے والد محمد معین الحق نے بلند شہر میں کورٹ آف وارڈز میں کوئی کلرک کی ملازمت کر رکھی تھی۔ وہاں سے تیرہ میل کے فاصلے پر چھوٹی سی ہندو ریاست شکارپور (ضلع بلند شہر) تھی، ریاست کے والی چودھری رگھوراج سنگھ سے والد کی ملاقات ہوئی تو وہ انھیں اپنی ریاست میں اکاؤنٹینٹ کی حیثیت سے لے گئے اور اُن کی ساری عمر وہیں گزری۔ شکارپور جانے کا سال اندازاً ۱۹۲۸ء یا ۲۹ء ہے۔ عسکری اور دوسرے عزیز اقارب سراوے سے تعلیم کی خاطر جلد ہی نکل گئے اور پھر آبائی گھر سے تعلق تقریباً ختم ہوگیا۔ عسکری بھائی شاید ۳۰ء یا ۳۱ء میں کسی شادی میں شرکت کی غرض سے سراوہ گئے ہوں گے، اُس کے بعد جہاں تک مجھے یاد ہے وہ وہاں نہیں گئے۔ ۱۹۴۲ء میں ایم اے کرنے تک رہنے کی جگہ شکارپور کو ہی سمجھنا چاہیے اس لیے کہ تعلیم کی غرض سے بلند شہر پھر میرٹھ اور پھر الٰہ آباد گئے لیکن دسمبر اور گرمیوں کی تعطیل میں ماں باپ اور بھائی بہنوں کے پاس شکارپور ہی آتے تھے۔ ۳۵ء یا ۳۶ء تک ریاست کے حالات اچھے رہے تو ملازموں کے حالات بھی اچھے رہے، اس کے بعد سے ریاست اور ہمارے والد کے مالی حالات تنگی ترشی کے رہے۔

۳۔ تعلیم: سراوہ کے پرائمری اسکول میں تھوڑا بہت پڑھنے کے بعد شکارپور کے مسلمان پرائمری اسکول میں داخلہ لیا۔ یہ وہی چٹائی والے اسکولوں کی طرح کا اسکول تھا۔ سراوے میں تعلیم کی ابتدا قرآن شریف اور اردو سے ہی ہوئی تھی۔ شکارپور میں ایک ہی انگریزی اسکول تھا، D.A.English School، تیسری جماعت سے آٹھویں تک۔ عسکری بھائی پانچویں جماعت سے اس انگریزی ہندو اسکول میں چلے آئے۔ پانچویں جماعت سے ہی فارسی بھی شروع ہو جاتی تھی۔ یہاں مولوی مبارک حسین اردو اور فارسی پڑھاتے تھے (معاف کیجیے گا، میں یہ بتا دوں کہ عسکری بھائی مجھ سے چھ سال بڑے تھے، مجھے بھی تعلیم کے لیے وہی راستے اختیار کرنا پڑے جو بڑے بھائی نے کیے تھے مگر صرف انٹرمیڈیٹ تک ... درس گاہوں میں اکثر استاد مجھے بھی وہی ملتے رہے جو عسکری بھائی کو پڑھا چکے تھے)۔

آٹھویں جماعت کے بعد مسلم ہائی اسکول، بلند شہر میں داخلہ لے لیا، یہ ۱۹۳۴ء کی بات ہے۔ پہلے مختصراً امتحانات کا سال اور شہر بتا دوں۔

میٹرک	:	مسلم ہائی اسکول، بلند شہر سے	۱۹۳۶ء
انٹرمیڈیٹ	:	میرٹھ کالج، میرٹھ سے	۱۹۳۸ء

بی اے : الٰہ آباد یونی ورسٹی سے ۱۹۴۰ء

ایم اے : (انگریزی) الٰہ آباد یونی ورسٹی سے ۱۹۴۲ء

بلند شہر اور میرٹھ میں ہوسٹل میں نہیں رہے بلکہ مکان کرائے پر لے کر رہے۔ میرٹھ کالج میں صرف دو سال پڑھا، کرار حسین صاحب وہاں پڑھاتے تھے مگر اتفاق سے ایسے سیکشن میں رہے کہ اُن سے پڑھنے کا موقع نہ ملا مگر اُنھیں عمر بھر استاد سمجھا۔ الٰہ آباد میں پھوپھی زاد بھائی نعیم الرحمٰن کے یہاں رہے جو الٰہ آباد یونی ورسٹی میں شعبۂ عربی کے استاد تھے۔ فارسی بھی عمدہ جانتے تھے، اس وقت الٰہ آباد میں نعیم الرحمٰن صاحب کے والد (یعنی ہمارے پھوپھا) منشی خلیل الرحمٰن بھی موجود تھے (عذرا اور اخبار الاندلس والے خلیل الرحمٰن)۔ نعیم الرحمٰن صاحب کی ایک عربی قواعد پاکستان میں شائع ہوئی ہے اور دکن کی پہیلیاں بھی جمع کر کے شائع کرائی تھیں۔

عسکری چھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے (اُن سے پہلے دو بھائیوں کا بہت چھوٹی عمر میں انتقال ہو چکا تھا)۔ ہائی اسکول اور انٹر کے زمانے میں اور تھوڑا سا بعد تک، سوشلزم اور کمیونزم کا جوش رہا۔ خدا کے وجود سے انکار بلکہ اس انکار سے پورا لطف لیتے رہے۔ انٹر کے ہم جماعتوں میں ایک منیب الرحمٰن تھے، دوسرے سراوہ ہی کے مشیر احمد۔ یہ مشیر صاحب ہندوستان کی وزارتِ اطلاعات کے لیے فلمیں بنانے کے سلسلے میں خاصے مشہور ہوئے اور کئی بڑے انعام ملے۔

۱۹۴۲ء میں ایم اے کرنے کے بعد ملازمت کی تلاش میں رہے۔ کسی کالج ہی میں جانا چاہتے تھے۔ ''ساقی'' سے تعلق پیدا ہو چکا تھا۔ ۴۳ء یا ۴۴ء میں (جنگ کا زمانہ تھا) دہلی میں ہی محکمۂ فوجی اطلاعات میں تھوڑے عرصے کام کیا پھر دہلی ہی میں ریڈیو میں script writer کے طور پر کام کرتے رہے۔ کسی معمولی بات پر ناراض ہو کر وہاں سے ۴۵ء یا ۴۶ء میں استعفیٰ دے دیا۔ ہندوستان میں کالج میں پڑھانے کا صرف دو دفعہ موقع ملا۔ عربک کالج دہلی کے انگریزی کے استاد امجد علی صاحب (جو ریٹائر ہو کر آج کل کراچی ہی میں ہیں) نے لمبی چھٹی لی، شاید کئی مہینے، اُن کی جگہ پڑھاتے رہے۔ یہ بھی اندازاً ۴۶ء کی بات ہے پھر میرٹھ کالج میں کرار حسین صاحب نے چند مہینے کی چھٹی لی تو یہ عرصہ وہاں پڑھاتے رہے۔ ۴۶ء اور ۴۷ء میں مکتبۂ جدید سے تعلق پیدا ہو گیا تھا اور اُن کے لیے ترجموں کا کام کر رہے تھے۔ یہ بہت کم لوگوں کو اندازہ ہوگا کہ ''آخری سلام''، ''مادام بوواری'' اور ''سرخ و سیاہ'' بڑی حد تک روزی کمانے کے لیے ترجمہ کی گئیں۔ مکتبۂ جدید کی یہ تو شرافت تھی کہ جتنے صفحے ترجمہ ہو جائیں اتنے پیسے وہ فوراً دے دیتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں اکتوبر کے مہینے میں عسکری بھائی کے پاکستان چلے آنے کی خاصی بڑی وجہ یہی تھی کہ ترجمے پر گزارا تھا۔ وہ اکیلے پاکستان چلے آئے۔ ہمارے والد کا اُس وقت تک انتقال ہو چکا تھا اور ہم سب میرٹھ میں تھے۔ ہم سب لوگ نومبر ۴۷ء میں پاکستان آ گئے۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں عسکری بھائی کراچی چلے گئے، چند ماہ ''ماہِ نو'' کی ایڈیٹری کے بعد اسلامیہ کالج میں پہنچ گئے۔ کراچی کے حالات آپ

زیادہ جانتے ہوں گے۔ مجھے تو یہاں ''ماؤنو'' کے فائل بھی نہیں ملے۔ کراچی اسلامیہ کالج میں جانے کا مہینہ بھی پنڈی اور اسلام آباد میں بیٹھ کر پتا نہیں چل سکتا (یہاں بیٹھ کر بہت کم باتیں معلوم ہو سکتی ہیں)۔

جو کام کی بات اس خط میں ملے وہ لے لیجیے، یہ باتیں بھی میں نے تو گھسیاریوں کے انداز میں لکھ دی ہیں، آپ ''سخن در سخن'' کا رنگ دے دیجیے گا۔

یہ اچھا ہوا کہ خط دفتر میں بیٹھے بیٹھے پورا ہو گیا۔ آپ سے اور مظفر صاحب سے شرمندگی میں تھوڑی سی کمی ہو جائے گی۔ یہ باتیں مہینہ بھر پہلے بھی لکھی جا سکتی تھیں۔

مخلص
محمد حسن مثنیٰ

پس نوشت: ترجموں کا تھوڑا سا ذکر آیا، ایک آدھ بات اور سہی۔ ۴۷ء میں لاہور آئے تو اُس وقت مکتبہ جدید والے عسکری بھائی کو ڈیڑھ روپیہ فی صفحہ ترجمے کا دیتے تھے۔ خاندان کے ہم چھ لوگ تھے، مکان کا کرایہ دینا نہیں ہوتا تھا، ڈیڑھ سو دو سو روپے میں گزارا ہو سکتا تھا اور اُس وقت بھی وہ بس گزارے سے آگے جانے کی زیادہ فکر نہیں کرتے تھے۔ ریڈیو پر ''پاکستان ہمارا ہے'' (یا ''ہمارا پاکستان'') کے ایک پروگرام کے (اسی) ۸۰ روپے مل جاتے تھے، کوشش وہ یہ کرتے تھے کہ دس یا بارہ دن کام کر کے مہینہ بھر گزارا کرنے کے پیسوں کا انتظام ہو جائے تو باقی دن پڑھنے، ٹہلنے اور گپ بازی کے لیے مل جائیں۔

☆☆☆

ضمیر علی بدایونی

محمد حسن عسکری: ایک تاثر ایک سوال

عسکری صاحب کو پہلی بار میں نے ۱۹۶۰ء میں اسلامیہ کالج کراچی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں دیکھا۔ وہ اس وقت اکیلے تھے اور مطالعے میں مصروف تھے۔ میں نے ان سے کچھ دیر بیٹھنے کی اجازت چاہی اور انھیں بتلایا کہ میں نے بی اے میں انگریزی اختیاری مضمون لیا ہے۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ صرف ایک سوال کیا کہ انگریزی ادب کیوں پڑھنا چاہتے ہو؟

میں نے کہا کہ ادب اور فلسفے سے مجھے لگاؤ ہے، یہ دونوں مضامین میری دلچسپی کا مرکز رہے ہیں۔ آپ کا نام سن کر میں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا ہے۔ آپ چوں کہ انگریزی ادب پڑھاتے ہیں، اس لیے انگریزی ادب کا انتخاب کیا ہے۔ ان کے چہرے کے تاثرات میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی جس سے مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ لیکن انھوں نے میرا نام پوچھا اور کلاس میں پابندی سے آنے کی اہمیت پر زور دیا، اس کے بعد وہ خاموش ہوگئے۔ میں نے ان سے اجازت لی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ ان کی شخصیت میں ایک کشش تھی۔ ان کا انداز اور رویہ دونوں متاثر کن تھے۔

ابھی کلاس کے شروع ہونے میں چند دن باقی تھے۔ میں دوسرے دن بھی کالج گیا، ضروری formalities مکمل کیں، لیکن عسکری صاحب سے ملنے نہیں گیا۔ عسکری صاحب برِصغیر کی مشہور و معروف ادبی شخصیت تھے، reserved سے آدمی تھے، کم گو اور کم آمیز تھے، بہ قدرِ ضرورت گفتگو کرتے تھے۔ پہلی ملاقات کا مجھ پر یہی تاثر ہوا۔ پروفیسر ممتاز حسین بھی اسی کالج میں اردو کے پروفیسر اور معروف نقاد تھے۔ اسلامیہ کالج میں ان دو معروف شخصیتوں کی موجودگی سے تعلیمی ماحول سنجیدہ اور باوقار ہوگیا تھا۔ لیکن میں نے ان دونوں شخصیتوں کو کبھی یک جا نہیں دیکھا۔

چند دنوں بعد کلاسوں کا آغاز ہوا۔ عسکری صاحب لیکچر نہیں دیتے تھے بلکہ گفتگو کی فضا پیدا کر دیتے تھے۔ ابتدائی کلمات کے بعد وہ شیکسپیئر کے ڈرامے کے مختلف حصے طالب علموں سے پڑھواتے تھے۔ ہر ریڈنگ کے بعد وہ مختلف طرح کے سوالات کرتے تھے اور طالب علموں کے جوابات سے کم ہی مطمئن

ہوتے تھے۔ وہ ہمیشہ کوئی اضافہ ضرور کرتے تھے۔ تصحیح بھی کرتے تھے اور سیاق و سباق پر روشنی بھی ڈالتے تھے۔ نوٹس بھی لکھوایا کرتے تھے۔ لیکن ان کی پوری کوشش یہ ہوتی تھی کہ طالب علم passive سامع نہ ہوں بلکہ active participation کے ذریعے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کریں۔ وہ درس و تدریس میں یک طرفہ (oneway) ٹریفک کے قائل نہ تھے۔ طالب علموں کی جسمانی موجودگی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ ذہنی طور پر alert رہنے پر مجبور کر دیتے تھے اور آہستہ آہستہ طالب علموں سے گفتگو کرتے۔ان کی بات چیت واضح اور بغیر کسی الجھاؤ کے ہوتی تھی۔ انھیں غصے کی حالت میں کم ہی دیکھا گیا۔ البتہ کبھی کبھی ہلکی سی خفگی اور جھنجلاہٹ ان کے چہرے کے تاثرات میں شامل ہو جاتی تھی۔ عسکری صاحب کے برخلاف فلسفے کے پروفیسر لیکچر دینے پر اکتفا کرتے تھے۔ وہ کسی کیفیت میں گم ہو کر صرف انگریزی میں لیکچر دیا کرتے تھے۔ اگر کبھی کسی نے سوال کر دیا تو جواب دے دیا، لیکن سچ پوچھیے تو وہ سوال و جواب سے بے نیاز تھے۔ قابل پروفیسر تھے لیکن افہام و تفہیم سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ آپ کو سمجھنا ہے تو سمجھ لیجیے، وہ ایک دریائے رواں کی طرح بہتے رہتے تھے۔

عسکری صاحب کا انداز تدریس طالب علموں کی استعداد کے مطابق ہوتا تھا۔ وہ اپنے طالب علموں کی ذہنی سطح کا اندازہ کر لیتے تھے اور پھر اسی frequency پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ طالب علموں کو ان میں دلچسپی بھی ہوتی تھی اور مکالمات کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہتا تھا۔ کانٹ کے بارے میں پڑھا تھا کہ وہ طالب علموں کو تین حصوں میں تقسیم کرتا تھا، ادنیٰ، اوسط اور غیر معمولی۔ اس کا کہنا تھا کہ معمولی طالب علم کو پڑھانے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا، غیر معمولی یا جینئس کو تدریسی عمل سے گزرنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی وہ خود رہبری پر قادر ہوتا ہے۔ البتہ اوسط درجے کے طالب علم کو تدریس اور رہبری کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کو اگر مناسب استاد مل جائے تو اس کی استعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ عسکری صاحب فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ وہ کانٹ کی طرح صرف اوسط درجے کے طالب علموں پر توجہ صرف نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا فیض عام تھا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ کچھ ذہین طالب علموں کو قریب آنے کا موقع دیتے تھے۔ اور ایسے طالب علموں کے لیے ان کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ تقریباً چار یا پانچ مہینے میں کالج جاتا رہا۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ عسکری صاحب کل کلاس نہیں لیں گے۔ میں حیدرآباد سندھ چلا گیا۔ دو تین دن کے بعد میں کالج پہنچا تو عسکری صاحب نے غیر حاضری کی وجہ پوچھی، میں نے وجہ بتلائی تو مطمئن نہیں ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے غفور دادا سے ملنے حیدرآباد جانا پڑا۔ اُن دنوں ان کی طبیعت خراب تھی۔ مجھے واپسی میں کافی تاخیر ہوگئی۔ جب کالج گیا تو عسکری صاحب خوش نظر نہیں آئے۔ میرے اس رویے سے وہ مطمئن نہیں تھے۔ میرا جواب سن کر وہ خاموش ہوگئے۔ جب غفور دادا کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو مجھے بار بار حیدرآباد جانا پڑا۔ واپسی میں مجھے شرمندگی اور جواب دہی کا سامنا کرنا پڑتا۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ مجھے کچھ دنوں کے لیے کراچی

چھوڑنا پڑا اور میں اپنی تعلیم کا سلسلہ کراچی میں جاری نہ رکھ سکا۔ اور میں نے حیدرآباد کے سٹی کالج میں داخلہ لے لیا جہاں مرزا عابد عباس پرنسپل تھے اور فلسفے کے پروفیسر، لیکن وہ کلاسوں میں کم آتے تھے۔ کچھ دنوں بعد میں کراچی گیا۔ ارادہ تھا کہ عسکری صاحب کو اپنے حالات سے آگاہ کروں گا۔ ایک دن میں صدر میں تھامس اینڈ تھامس میں کوئی کتاب خریدنے گیا۔ عسکری صاحب بھی اتفاق سے وہاں آگئے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور اچانک غائب ہونے کی وجہ پوچھی۔ میں نے جب انھیں وجہ بتلائی تو انھوں نے صرف اتنا کہا کہ مل کر تو جاتے، شاید تمھارے مسئلے کا کوئی حل نکل آتا۔ میں کچھ دیر عسکری صاحب کے ساتھ معذرت خواہانہ انداز میں کھڑا رہا۔ اس کے بعد میں نے اجازت چاہی تو کہنے لگے، کسی دن کالج آجاؤ۔ میں وعدہ کر کے باہر نکل گیا۔ عسکری صاحب نے میری غیر حاضری اور اچانک غائب ہونے کو پسند نہیں کیا لیکن وہ مجھے زیادہ شرمندہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کے مزاج میں ایک رواقی بلندی اور sublime indifference تھی اور وہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو ایک دانش ورانہ بے نیازی سے دیکھا کرتے تھے۔ ان کی قربت بھی کسی فاصلے سے کم نہیں تھی۔ چار یا پانچ ماہ کے تعلیمی و تدریسی سلسلے میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملی۔ لوگ ان سے ملنے آتے تھے، لیکن وہ بہت کم لوگوں سے ملنا پسند کرتے تھے۔ چائے وہ سب کو پلاتے تھے، لیکن گفتگو کم کرتے تھے۔ اور بعض اوقات تو نام بھی پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے تھے۔ ایک دن ڈاکٹر احسن فاروقی ان سے ملنے آئے۔ عسکری صاحب نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا، چائے پلائی لیکن گفتگو نہ کرنے کے برابر کی۔ ڈاکٹر صاحب کچھ دیر تو بیٹھے رہے اور پھر بور ہو کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد عسکری صاحب نے ان پر کوئی comment بھی نہیں کیا۔ عسکری صاحب کا یہ عمومی رویہ تھا لیکن وہ مردم بیزار نہیں تھے۔ جن لوگوں کے ساتھ ان کی بے تکلفی تھی ان سے گھنٹوں گفتگو کرتے تھے۔ لیکن ان کے حلقۂ احباب میں صرف ادیب و دانش ور ہی نہیں تھے، ایسے لوگ بھی تھے جو نہ تو ادیب تھے اور نہ ہی دانش ور بلکہ ادبی پرچوں کے مدیر، فوٹوگرافر، ریڈیو، ٹی وی اور اخبار سے وابستہ افراد، کتب فروش، سرکاری ملازمین وغیرہ۔

عسکری صاحب کی تحریروں میں فرانسیسی ادب کے حوالے جا بہ جا ملتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو عسکری صاحب کو فرانسیسی ادیبوں اور دانش وروں سے اس حد تک دلچسپی تھی کہ بیکٹ، جوئس اور والٹیر، بینجمن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اور وہ سب سے زیادہ فرانسیسی علامت پسندوں کے قائل تھے۔ ہیڈیگر کے ادبی اور جمالیاتی افکار اور تصور شاعری کو انھوں نے میلارمے کی ایک نظم میں دریافت کیا تھا۔ کسی فرانسیسی نقاد نے بھی اس نوعیت کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کا مضمون ''ستارہ یا بادبان'' فکر انگیز ہے لیکن ہیڈیگر کی فکر کے دریائے تند و تیز کو میلارمے کی نظم کے کوزے میں بند کرنے کی کوشش ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تخلیقی عمل پُراسرار ہے۔ لیکن میلارمے کی نظم کے گرد انھوں نے جو تعبیری جال بُنا ہے میلارمے کے فرانسیسی مستند نقاد اور شارحین فاؤلی سے لے کر دریدا تک میلارمے کی شاعرانہ فکر کو دوسرے رنگ میں

دیکھتے ہیں۔ اب اس مضمون کی بنیاد خیالی یا تصوراتی ہے یا کسی فلسفیانہ صداقت کا اظہار ہے؟ بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عسکری صاحب کا یہ مضمون انھیں مابعد جدید نقطۂ نظر سے قریب کر دیتا ہے اور ان کی فکری صلاحیتوں کا نقطۂ عروج اسی مضمون میں کہیں موجود ہے۔ صرف اسے دریافت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مضمون کا تفصیلی مطالعہ تو بعد میں پیش کیا جائے گا لیکن اتنا ضرور اعتراف کرنا پڑے گا کہ میلارمے، ہولڈرلن اور ہیڈیگر کے مشترکہ وژن کے بعض پہلوؤں کو پیش کرنے کی پہلی کوشش اسی مضمون میں کی گئی، جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اردو کے تنقیدی ادب میں اس نوعیت کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے بجنوری نے غالب پر اپنے مقالے میں کچھ ایسے ہی نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن عسکری صاحب کا مضمون زیادہ تخلیقی، جمالیاتی اور فلسفیانہ قدر و قیمت کا حامل ہے۔ عسکری کے اسٹائل کی طنزیہ اور تند و تیز لہریں، اُن کی دانش ورانہ شوخیاں اس مضمون کی sublime فضا میں جذب ہوگئی ہیں۔ کلیم الدین احمد نے عسکری کے تنقیدی شعور کا بڑا جارحانہ جائزہ لیا ہے، لیکن وہ اس مضمون کی ایک سطر بھی لکھنے کی استعداد نہیں رکھتے تھے۔ ایلیٹ نے شیکسپیئر کے بارے میں لکھا ہے کہ پلوٹارک کی ایک کتاب پڑھ کر اس نے تاریخ کے بارے میں اتنا علم اور آگہی حاصل کرلی تھی کہ لوگ پوری برٹش میوزیم لائبریری پڑھ کر بھی حاصل نہیں کرسکتے۔ عسکری نہ تو شیکسپیئر تھے اور نہ ہی ایلیٹ، لیکن ان کی بعض صلاحیتیں غیر معمولی نوعیت کی تھیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے تھے، اس میں اضافہ ضرور کرتے تھے۔ اور اپنی معنویت سے اس موضوع کو نئی وسعتوں سے آشنا کر دیتے تھے۔

عسکری صاحب کے نقطۂ نظر میں تبدیلی آرہی تھی۔ ایک دن میں کلفٹن پُل کے قریب الائنس فرانسیس گیا جہاں ایک خاتون فرانسیسی زبان سکھاتی تھی۔ اس فرانسیسی مرکزِ ثقافت میں ایک چھوٹی سی لائبریری بھی تھی جس میں فرانسیسی ادب اور ثقافت پر کتابیں تھیں۔ انگریزی کتابیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اس دن لائبریری میں ایک صاحب کوئی کتاب تلاش کر رہے تھے۔ میں جب قریب گیا تو وہ عسکری صاحب تھے۔ میں نے سلام کیا تو مجھے دیکھ کر تھوڑے سے حیران ضرور ہوئے کہنے لگے، ''یہاں کس لیے آتے ہو؟'' میں نے کہا، ''میں یہاں آتا رہتا ہوں۔ کبھی کبھار یہاں کوئی اچھی کتاب مل جاتی ہے۔'' کہنے لگے، ''انگریزی میں یہاں کتابیں بہت کم ہیں۔'' میں نے کہا، ''ایک کتاب پال والیری کی The Art of Poetry اور سارتر کی What is Literature میں نے اسی لائبریری میں دیکھی تھیں۔ یہ لوگ کتاب issue نہیں کرتے اس لیے یہیں بیٹھ کر پڑھنا پڑتی ہیں۔''

عسکری صاحب کو وہاں سب لوگ جانتے تھے۔ عسکری صاحب نے دو کتابیں لیں، وہ لائبریری کے ممبر تھے۔ کتابیں تصوّف کے موضوع پر تھیں۔ میں عسکری صاحب کے ساتھ باہر نکل آیا۔ کہنے لگے، ''اسلامی تصوّف پر فرانسیسی زبان میں کئی اہم کتابیں ہیں۔ مجھے صرف لوئی میسی نوں کا نام معلوم

تھا۔ ابوالکلام آزاد نے اس سے اپنی ملاقات کا احوال رقم کیا تھا اور علامہ اقبال نے بھی اس کا حوالہ دیا تھا۔ منصور حلاج پر اس کا کام کئی جلدوں پر مشتمل تھا۔" پورے راستے عسکری صاحب فرانسیسی زبان میں اسلامی تصوف پر گفتگو کرتے رہے۔ ایک خالی ٹیکسی نظر آئی، عسکری صاحب اس میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے وہی جملہ دوہرایا، "کسی دن کالج آجاؤ۔" میں عسکری صاحب کو رخصت کرنے کے بعد واپس لائبریری پہنچا اور فرانسیسی رسائل پر ایک نظر دوڑائی۔ وہاں سارتر کا مشہور رسالہ "عہد جدید" نظر آیا۔ لیکن زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم، پورا رسالہ فرانسیسی زبان میں تھا۔ اور ہماری دسترس سے باہر تھا۔ بیدل نے گل حسن یار کے بارے میں کہا تھا:

عکس افتادہ در آئینۂ ہوش
گل تواں دید ولے چیدن نیست

عسکری صاحب آہستہ آہستہ روحانی اقدار یا اقدار کی روحانیت کی طرف جا رہے تھے۔ بودلیئر، فرائیڈ اور لارنس کا تصور انسان ان کی تشنگی کا مداوا نہ تھا بلکہ ان کی روح میں ایک تصادم (conflict) پیدا ہوگیا۔ ابنِ عربی اور رینے گینوں کی طرف ان کا سفر بے معنی نہیں تھا۔ اسی تصادم کا شکار سلیم احمد بھی ہوئے۔ "نئی نظم اور پورا آدمی" جس تصور انسان کو پیش کر رہا تھا اس نے سلیم احمد کے ذہن میں ایک تضاد، ایک آویزش، ایک ٹکراؤ اور ایک تصادم پیدا کر دیا تھا جو آخر وقت تک ان کا تعاقب کرتا رہا۔ سلیم احمد معمولی ذہن کے آدمی نہ تھے، لیکن عسکری صاحب نے جو conflict ان کے ذہن میں پیدا کر دی تھی اس کا احوال ایک نسائی شعور (Feminist Consciousness) کی علم بردار کیتھرین مینسفیلڈ سے سنیے۔ لارنس کی تحریروں کے بارے میں یہ خاتون افسانہ نگار لکھتی ہے:

> Lawrence denies his humanity. He denies the power of imagination. He denies life. I mean human life. His hero and heroine are non-human, they are animals on the prowl. They do not feel, they scarcely speak there is not one memorable word. They submit to the physical response and for the rest go veiled blind, faceless mindless. This is the doctrine of mindlessness.

آپ نے دیکھا کیتھرین مینسفیلڈ نے کس حقارت اور نفرت کا اظہار کیا ہے۔ وہ لارنس کی تحریروں کو انسانیت کے لیے ایک خطرہ قرار دیتی ہے۔ اس کے نزدیک لارنس انسانیت کی توہین کا مرتکب ہوا ہے، انسانیت ہی نہیں بلکہ پوری زندگی کی توہین کی ہے۔

عسکری صاحب نے اس صورتِ حال کو فوراً محسوس کیا اور وہ اپنی روایتی اقدار کی تلاش میں بہت دُور نکل گئے۔ ثقافتی علامتوں کا زوال دراصل زوال کی علامت تھی۔ عسکری صاحب کا مضمون "بارے آموں کا کچھ بیاں ہوجائے"، "ابنِ عربی اور کیر کے گور" اور روایت کے موضوع پر مختلف فکر انگیز

مضامین عسکری صاحب کی ذہنی مسافرت کا یہ نیا سلسلہ تھا جس کے ذریعے وہ اپنی ثقافت کی روح کو تلاش کر رہے تھے۔ ''وقت کی راگنی'' میں انھوں نے اس روح کی کچھ جھلکیاں دیکھیں بھی اور دکھائیں بھی۔ لارنس اور دوسرے لکھنے والوں کا نشہ اُتر چکا تھا۔ اب وہ جمالیات، اخلاقیات سے گزر کر مذہبی صداقت کی طرف مسلسل بڑھ رہے تھے۔ ان کے نقطۂ نظر میں تبدیلی آچکی تھی۔ قرآن شریف کے فرانسیسی ترجمے کے مترجم کے نام اپنے آخری خط میں عسکری صاحب نے اپنی ادبی شخصیت کو ماضی قرار دیا ہے اور رولاں بارت سے لے کر فوکو تک کے افکار پر ایک مخصوص نقطۂ نظر سے تنقید کی ہے۔ وہ ساختیاتی نقطۂ نظر سے قرآن کی تفسیر کے حق میں نہیں تھے۔ لیکن Richard Netton یہ کام پہلے ہی کر چکا تھا۔ عسکری صاحب نے رینے گینوں کے تصور روایت کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور اس کا اطلاق اپنے ادب و ثقافت پر کیا۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ عسکری صاحب کا سلسلۂ حیات منقطع ہوگیا۔ عسکری صاحب کا مشن نامکمل رہ گیا۔ عسکری صاحب نے اردو ادب کی تنقیدی فضا میں روایت کی بحث کچھ اس انداز سے چھیڑی کہ وہ اب تک ختم نہیں ہوئی، کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ لیکن فکری اعتبار سے عسکری صاحب نے یہ بحث جہاں چھوڑی تھی اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکی۔ سلیم احمد، مظفر علی سیّد، جمال پانی پتی، سراج منیر، سہیل عمر، احمد جاوید اور قیصر عالم نے عسکری صاحب کے سلسلے کو جاری رکھنے کی کوشش کی لیکن عسکری جس عالمانہ بصیرت اور گہرائی سے روایت اور ثقافت کی جڑوں کو تلاش کر رہے تھے، وہ اب مفقود ہے۔ سلیم احمد کا مضمون ''نئی نظم اور پورا آدمی'' بلاشبہ اردو کے تنقیدی ادب میں ایک اضافہ ہے لیکن عسکری کی نظروں میں جو نظامِ اقدار تھا، جو منصوبہ تھا وہ تشنۂ تکمیل رہ گیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عسکری صاحب کے ثقافتی اور فکری مشن کو مکمل نہ سہی لیکن اس تسلسل کو باقی رکھنے کی کوشش کریں جو عسکری کے تصور روایت کی تہ میں کارفرما تھا۔ عسکری صاحب نے جس مکتبِ فکر کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی وہ تغیر گریز اور تسلسل پسند تھا۔ یہی عسکری کا world view تھا جسے ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ افسوس یہ ہے کہ عسکری صاحب کا انتقال ایک ایسے وقت پر ہوا جب ان کی شخصیت اور فکر ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی۔ وہ اپنے world view کو آخری شکل نہ دے سکے۔ ان کی تحریریں گو مکمل ہیں لیکن finality تک نہ پہنچ سکیں۔

عسکری کے ادبی اور ثقافتی نقطۂ نظر کی اہمیت وقت کے ساتھ بڑھتی جائے گی لیکن مشکل یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کے ہنگاموں میں عسکری کی روایت کو کس طرح آگے بڑھائیں؟ میرا یہ سوال صرف عسکری کے عقیدت مندوں سے نہیں ہے بلکہ ان سب ثقافتی نقادوں سے ہے جو ثقافتی اقدار کو زوال پذیر ہونے سے بچانا چاہتے ہیں۔ انتظار حسین تو علامتوں کا زوال لکھ چکے ہیں، اب دوسروں کو بھی اس سمت میں قدم اٹھانا چاہیے اور اپنی ثقافت کے تحفظ کے لیے اس کی تفہیم کے سلسلے کو آگے بڑھانا چاہیے۔ عسکری صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا۔

☆☆☆

ثناء الحق صدیقی

پروفیسر اظہار الحق المعروف بہ حسن عسکری

پروفیسر حسن عسکری صاحب سے میں پہلی مرتبہ ۱۹۶۶ء میں متعارف ہوا تھا۔ تعارف کا ذریعہ میری تالیف ''میر وسوداؔ کا دور'' بنی۔ میرے ایک کرم فرما رئیس عالم صاحب نے، جنھوں نے مجھے اور کئی اہلِ علم حضرات سے متعارف کرایا، اس کتاب کا ایک نسخہ لے جا کر ہدیۂ عسکری صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ مرحوم نے خود کا اس کا مطالعہ کیا اور محترم ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کو جو غالباً اس زمانے میں انگلستان سے واپس آتے ہوئے ان کے پاس ٹھہرے تھے، یہ کتاب دکھائی۔ رئیس عالم صاحب کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ دونوں نے اس تالیف کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب تو لاہور چلے گئے اور میری آج تک اُن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ حسن عسکری صاحب کو ایک دن رئیس عالم صاحب میرے غریب خانے، واقع ناظم آباد، پر لے آئے۔ مجھے یقیناً ان کی تشریف آوری سے خوشی ہوئی لیکن زیادہ خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ اتنے علم وفضل کے باوجود جب تک وہ بیٹھے رہے اپنی فضیلت کا قطعاً کوئی اظہار نہیں کیا بلکہ اس قدر خاک ساری اور فروتنی ظاہر کی جو میں نے کسی معمولی درجے کے انسان میں بھی نہیں دیکھی۔ اور باتیں کرتے رہے لیکن اپنی علمی کاوشوں، اپنی تصنیفات اور اپنے کمالات کا قطعاً اظہار نہیں ہونے دیا۔ البتہ ''میر وسوداؔ کا دور'' کے بارے میں اتنا کہا کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے اس کو بہت پسند کیا۔ میں نے دریافت کیا کہ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا، ''مجھے بھی پسند ہے۔''

ایک نوجوان ساتھ تھے۔ میں نے اُن کے بارے میں پوچھا تو عسکری صاحب کی بجائے رئیس عالم صاحب نے بتایا کہ یہ عسکری صاحب کے خاص شاگرد ہیں اور ان کی مدد سے مذہب اور شریعتِ اسلامیہ سے متعلق اصطلاحات کے انگریزی مترادفات جمع کر رہے ہیں اور ابھی تک چودہ پندرہ سو اصطلاحات کی فہرست مرتب کر چکے ہیں۔

خود عسکری صاحب کے بارے میں رئیس عالم نے بتایا کہ'' آج کل دیوانِ داغؔ کا نہایت

گہری نظر سے مطالعہ کر رہے ہیں، ساتھ ہی مثنوی گلزارِ نسیم پر کام کر رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ گل بکاؤلی کا قصہ کلیتاً طبع زاد نہیں ہے بلکہ اس میں حقیقت کا بھی بڑا عنصر شامل ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ کوہستانِ ہمالیہ کے دامن میں کہیں پیش آیا تھا اور جھیل سیف الملوک سے اس قصے کا گہرا تعلق ہے۔ چناں چہ پروفیسر صاحب وقتاً فوقتاً صوبہ سرحد، ریاست سوات، ریاست دیر، کشمیر، چترال وغیرہ کے لوگوں کو بلا کر اُن سے وہاں کی لوک کہانیاں سنتے ہیں اور اُن کے خاص خاص نکات اپنی ڈائری میں درج کرتے جاتے ہیں۔

تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھ کر عسکری صاحب چلے گئے لیکن پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھ سے پوری طرح بے تکلف ہوگئے۔ اُس کے بعد وہ کئی مرتبہ میرے گھر آئے اور میں اُن کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ میں صحیح طور پر نہ یہ بتا سکتا ہوں کہ کتنی بار وہ میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور نہ کہہ سکتا ہوں کہ کتنی مرتبہ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا، لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ میری حاضریوں کی تعداد زیادہ رہی۔

عسکری صاحب کی دو تین مرتبہ کی آمد تو میرے حافظے میں ہے۔ ایک دفعہ وہ اپنے بھانجے عمیم اختر کے ساتھ آئے۔ چوں کہ عمیم اختر میٹرک میں میرے شاگرد رہ چکے تھے، اُن کی وجہ سے عسکری صاحب مجھ سے اور بھی خصوصیت برتنے لگے۔ دو مرتبہ پی ایچ ڈی کے ایک اسکالر کو، جن کا نام ظفر تھا، لے کر آئے اور کہنے لگے کہ ''یہ صاحب ''سرسیّد'' پر ریسرچ کر رہے ہیں اور مجھ سے اس سلسلے میں مدد چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ سرسیّد کے بارے میں میری معلومات نہایت ناقص ہیں۔ اس سلسلے میں ثناء الحق صاحب آپ کی زیادہ مدد کر سکیں گے۔ چناں چہ میں ان کو آپ کے پاس لے آیا ہوں۔'' یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے بارے میں عسکری صاحب نے بے حد حسنِ ظن قائم کر لیا تھا۔ چناں چہ کئی مرتبہ اُنھوں نے کہا کہ ''فلاں موضوع پر فلاں صاحب نے مجھ سے مدد لینی چاہی لیکن میں نے اُن سے کہہ دیا کہ اِس سلسلے میں تو ثناء الحق صاحب ہی آپ کی مدد کر سکتے ہیں یا فلاں صاحب نے مجھ سے فلاں موضوع پر مضمون لکھنے کے لیے کہا مگر میں نے کہہ دیا کہ یہ مضمون تو ثناء الحق صاحب ہی لکھ سکیں گے۔''

میں اُن کی یہ باتیں سن کر شرمندہ ہوتا اور اپنی بے مائگی اور ہیچ مدانی کا تصور کر کے اُن کے ان ارشادات کو اُن کی اعلیٰ ظرفی اور کریم النفسی پر محمول کرتا۔

بہرحال میں نے ''سرسیّد'' سے متعلق جو مواد میرے پاس تھا، پیش کر دیا بعد میں معلوم ہوا کہ اُن صاحب نے عسکری صاحب کی مدد سے پی ایچ ڈی کر لیا۔

میں عسکری صاحب کی قیام گاہ پر جتنی مرتبہ گیا، رئیس عالم میرے ساتھ گئے۔ ایک دفعہ کراچی یونی ورسٹی کے شعبۂ تاریخِ اسلام کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد بھی ساتھ تھے۔

عسکری صاحب کا قیام اپنی بہن کے ساتھ پی ای سی ایچ سوسائٹی میں تیسری منزل پر تھا۔ وہاں پہنچنے کے لیے سیدھا زینہ ہے، لہٰذا اُن کے مکان کا دروازہ نیچے ہی سے دکھائی دے جاتا تھا۔ ہم بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر جب اوپر پہنچتے تو دروازہ بند ملتا۔ ہم گھنٹی بجاتے اور دروازہ خود پروفیسر صاحب کھولتے۔ نہایت خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کرتے۔ اُن کا مسکراتا ہوا چہرہ آج بھی میرے حافظے کے پردے پر مرتسم ہے اور یہ یادیں ایسی تازہ ہیں کہ اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ پروفیسر عسکری صاحب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔

بہرحال بڑی محبت سے مصافحہ کرتے اور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے کمرے میں لے جاتے۔ یہ کمرہ بہت مختصر تھا لیکن نہایت صاف ستھرا رہتا تھا اور تمام چیزیں بڑے سلیقے سے رکھی رہتی تھیں۔ سامنے کی دیوار سے لگا ہوا ایک تخت بچھا تھا۔ اُس کے سامنے ایک میز اور دونوں طرف کرسیاں اور صوفے پڑے ہوئے تھے۔ تخت کے ایک طرف دیوار میں ایک الماری بنی ہوئی ہے اُس میں نہایت سلیقے سے کتابیں لگی رہتی تھیں۔ دوسرے بہت سے ادیبوں اور مصنفوں کی طرح میں نے عسکری صاحب کی کتابوں کو منتشر حالت میں یا تخت اور میز پر بکھرا ہوا نہیں دیکھا۔ اس سے عسکری صاحب کی لطافتِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔

بہرحال عسکری صاحب کمرے میں پہنچنے کے بعد ہمیں کرسیوں یا صوفوں پر بٹھاتے اور خود نہایت بے تکلفی سے تخت پر بیٹھ جاتے اور سگریٹ کے کش لگانے شروع کر دیتے، ساتھ ہی گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتا۔ موضوعِ گفتگو یا تو دینی مسائل ہوتے یا ادبی۔ عسکری صاحب کی گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دین کے معاملے میں تختی کے قائل نہیں تھے۔ غالباً اُن کے نزدیک ''لا اکراہ فی الدین'' کا مفہوم یہ تھا کہ جس نے کلمہ پڑھ لیا وہ مسلمان ہوگیا، اس کے بعد وہ شعار اسلام پر عمل پیرا نہیں ہوتا تو اس پر تختی نہیں کرنی چاہیے۔ اب اُس کا تعلق اللہ سے ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ شریعتِ اسلامیہ سے زیادہ مسلکِ صوفیہ کے قائل تھے اِس لیے کہ اس میں اُنھیں وہ آزادی دکھائی دیتی تھی جو وہ 'لا اکراہ فی الدین' کی روشنی میں ہر فرد کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ تصوّف کے ساتھ ساتھ وہ توحیدِ وجودی کے نظریے کو بھی پسند کرتے تھے۔ چناں چہ اس موضوع پر اُنھوں نے بہت سی کتابیں پڑھی تھیں اور اُس وقت بھی اُن کا مطالعہ جاری تھا۔ مجھ سے بھی ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ کے وہ پرچے لے کر پڑھے تھے جن میں بعض صوفیہ کے باطنی تجربات بیان کیے گئے تھے۔

عسکری صاحب کو تاریخ کے مضمون سے ایک طرح کی چڑ تھی۔ بعض اوقات تو وہ تاریخ اور مؤرخین کا بے حد مذاق اڑاتے تھے۔ اس چڑ کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ ممکن ہے مؤرخین کی بعض غلط بیانیوں اور مبالغہ آرائیوں نے ان کو اس مضمون ہی سے بدظن کر دیا ہو۔ دوسرے چوں کہ وہ بنیادی طور پر ادیب تھے اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ تاریخ کی یبوست اُن کو ادبیت کے منافی محسوس ہوتی ہو اور وہ

افسانوی باتوں کو تاریخی حقائق پر ترجیح دینے لگے ہوں۔

دورانِ گفتگو یہ بھی پتا چلا کہ عسکری صاحب محمود احمد عباسی، مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے اراکین سے خوش نہیں تھے۔ چناں چہ کبھی کبھی کوئی لفظ یا فقرہ محمود احمد عباسی کے خلاف کہہ جاتے تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ کربلا کے جو واقعات مرثیہ نگاروں نے مراثی میں بیان کر کے اثر و تاثیر کا ایک طلسم خانہ تیار کیا ہے محمود احمد عباسی نے اُن پر تاریخی شواہد کے تیر چلا کر اُس کو منہدم کرنے کی کوشش کی ہے۔

جماعتِ اسلامی سے عسکری صاحب شاید اس لیے ناراض تھے کہ اُن کے نزدیک یہ جماعت اپنی سیاسی مہمات کو مذہب کے سہارے سر کرنا چاہتی ہے، خود کو مسلمان باور کرانا چاہتی ہے اور مخالف کو گم راہ اور بے دین۔ چناں چہ ایک دن ذرا زیادہ جوش میں تھے یاد پڑتا ہے کہ چند روز لاہور میں قیام کر کے واپس آئے تھے، اتفاق سے ہم میں سے کسی نے پوچھ لیا کہ "آج کل لاہور میں سیاسی فضا کیسی چل رہی ہے؟" کہنے لگے، "کیا چل رہی ہے؟ جماعتِ اسلامی والے یہ پروپیگنڈا کیے چلے جا رہے ہیں کہ صرف ہم مسلمان ہیں اور جتنے ہمارے مخالف ہیں وہ گم راہ اور کافر ہیں۔ خاص طور پر وہ پیپلز پارٹی والوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور اُن کو سوشلسٹ اور کافر کہتے ہیں۔ ہم نے بھی اُن کے جواب میں کہا کہ اچھا ہم کافر سہی مگر یاد رکھو کہ تم لوگوں کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔"

آخری مرتبہ جب ہم اُن سے ملنے گئے، ہمیں اصرار کر کے معمول سے زیادہ بٹھایا۔ اُس دن مولانا اشرف علی صاحب اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی بڑی تعریف کی۔ ضمناً قاضی محمد اعلیٰ تھانوی مؤلف کشاف اصطلاحات الفنون کا ذکر آگیا۔ مجھ سے پوچھنے لگے، "ثناء الحق صاحب! آپ قاضی محمد اعلیٰ تھانوی کے بارے میں کتنا کچھ لکھ سکتے ہیں؟" میں نے کہا کہ "قاضی صاحب کے حالات سے عام طور پر تذکرے خالی ہیں لہٰذا کشاف اصطلاحات الفنون اور مولانا شیخ محمد تھانوی کی بعض تحریروں کی مدد سے ڈیڑھ دو صفحے سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ کہنے لگے کہ "اچھا تو آپ مجھے ڈیڑھ دو صفحے ہی لکھ کر دے دیں۔" میں نے وعدہ کر لیا لیکن وہ میرا وعدہ پورا ہونے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

عسکری صاحب عموماً سنجیدہ رہتے تھے لیکن کبھی کبھی مذاق بھی کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں اپنی والدہ کے تایازاد بھائی یعنی اپنے ماموں ڈاکٹر محمد مسعود کی وفات کی اطلاع پا کر پی ای سی ایچ ایس گیا جہاں اُن کا انتقال اُن کے بڑے بیٹے محمد صغیر کے مکان پر ہوا تھا۔ تدفین سے پہلے ہی عصر کی نماز کا وقت آگیا۔ میں اور کئی آدمیوں کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے مسجد الفلاح گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر جب میں واپس ہونے لگا اس وقت میری گردن جھکی ہوئی تھی۔ دو چار ہی قدم چلا تھا کہ ایک صاحب میرے سامنے آگئے۔ میں نے گردن اٹھائے بغیر اُن سے بچ کر نکلنا چاہا مگر اُن صاحب نے پھر میرا راستہ روکا۔ دو تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ آخر میں یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ کون صاحب ہیں، گردن اٹھا کر

دیکھا تو پروفیسر حسن عسکری صاحب میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ موٹے سے لٹھے کا پاجامہ اور کُرتا پہنے ہوئے، کتھئی رنگ کا سوئٹر، سر پر دوپلّی ٹوپی اور ہاتھ میں تسبیح۔ میں نے سلام کیا۔ پوچھنے لگے، ''حضرت آج کہاں آ نکلے؟'' میں نے جب ماموں کے انتقال کی خبر سنائی تو ایک دم سنجیدہ ہوکر اظہار افسوس کرنے لگے۔ غرض میں نے عسکری صاحب کو نہایت دل کش سیرت کا انسان پایا۔ اللّٰہ تعالیٰ اُن کی تُربت کو نور سے بھر دے۔
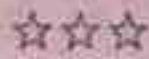
☆☆☆

مظفر علی سیّد

عسکری کا ناتمام ترجمہ☆

ترجمے کا فن جناب محمد حسن عسکری کے متنوع کمالات کا ایک اہم حصہ ہے۔ ان کے متعدد تراجم کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور چند ایک رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریری زندگی میں کئی ایک ادبی، علمی اور دینی موضوعات پر لکھی ہوئی تصانیف، مقالات اور اقتباسات کو ایک سے دوسری زبان میں منتقل کیا تھا۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے اردو میں اور اردو فارسی سے انگریزی اور فرانسیسی میں۔ تاہم اس میدان میں ان کا خصوصی کمال فرانسیسی ادب کے چند ایک عمدہ ترین ناولوں کا اردو ترجمہ ہے اور ان میں عالمی ادب کے ایسے کارنامے بھی شامل ہیں جنھیں کوئی دوسرا لکھنے والا ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈرتا۔ چناں چہ آج اردو زبان کا عام قاری، فرانسیسی ادب کے اہم ترین ناول نگاروں میں سے بالزاک، استاں دال، فلوبیئر کے شہ کاروں سے آشنائی کے لیے زیادہ تر انھیں کا ممنونِ احسان ہے اور ان کے علاوہ چند ایک برطانوی اور امریکی مصنفوں کے سلسلے میں بھی۔

ان ترجموں کی ادبی اہمیت اور فنِ ترجمہ میں عسکری کے منہاج و معیار پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ لے دے کر چند ایک تبصرے ہیں جو اخباروں اور رسالوں کی فائلوں میں دب کر رہ گئے یا نشر ہو کر ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ البتہ خود عسکری نے جو ایک مقالہ ادبی ترجمے کے مسائل پر لکھا تھا (بہ عنوان ''گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے'' مشمولہ ''ستارہ یا بادبان'') اس میں انھوں نے اپنے تراجم پر بے مثال خود انتقادی سے کام لیا تھا۔ یہ مقالہ جو کتاب میں شامل ہونے سے کئی برس پہلے ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء کے دوران ''ماہِ نو'' میں شائع ہوا تھا، اُس وقت تک کیے گئے ترجموں سے بحث کرتا ہے۔ اس سے تھوڑی دیر پہلے اُن کے قلم سے استاں دال کے ناول ''سرخ و سیاہ'' کا اردو ترجمہ مکتبۂ جدید لاہور سے دو جلدوں میں شائع ہو چکا تھا۔ عسکری اس کا یوں تذکرہ کرتے ہیں:

> پچھلے سال میں نے استاں دال کے ناول ''سرخ و سیاہ'' کا ترجمہ کیا۔ اس ناول نے مجھے رُلا رُلا دیا... میرے سامنے یہ سوال تھا کہ اردو سے غداری کروں یا

☆۔ یہ ترجمہ ماقبل صفحات میں بہ عنوان ''مخدوش رابطے'' دیا گیا ہے۔

استاں دال سے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اپنے پبلشر کے مفاد کا احترام کرتے ہوئے استاں دال سے غداری کی۔

پھر استاں دال کے اسلوب کی خصوصیات اور ان کو رائج الوقت اردو زبان میں منتقل کرنے کی مشکلات سے بحث کی ہے اور اس سلسلے میں اردو زبان کی ایک ایسی بنیادی کمی کی جانب اشارہ کیا ہے جو اس ''غداری'' کا باعث بنی۔ اس کے فوراً بعد ایک نئے ترجمے کا ذکر کیا ہے:

> آج کل میں، شودرلو دلاکلو (Chodrelos De Laclos) کا ناول ترجمہ کر رہا ہوں۔ اس میں ایک نئی مصیبت ہے۔ مصنف کا لب ولہجہ اردو میں کیسے پیدا کروں؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔

پھر اس خیال سے کہ سرشار اور سجاد حسین کے دور میں اردو نثر کا جو احوال تھا اور جس کی وجہ سے سرشار نے سروانتے (Cervantes) کے شہ کار ''دون کیہوتے'' (Don Quijote) کو ''خدائی فوج دار'' کی شکل میں آزاد ترجمہ کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا تھا، شاید وہاں سے کچھ رہنمائی مل سکے، انھوں نے یہ نتیجہ نکالا:

> پھکڑپن کا نمونہ تو مجھے سرشار یا سجاد حسین کے یہاں مل سکتا ہے۔ لیکن اٹھارویں صدی کے فرانسیسی استہزا میں جو رکھ رکھاؤ اور نفاست تھی، وہ کہاں سے لاؤں؟ لیکن اس ناول کے بارے میں اتنی بات ضرور کہوں گا استاں دال کا ترجمہ، سرشار مجھ سے اچھا نہیں کر سکتے تھے لیکن اس ناول کو ترجمہ کر کے وہ کچھ نہ کچھ ضرور بنا سکتے تھے اور میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو نثر میں جو بات کل تھی آج وہ بھی نہیں رہی۔

اس انکسار سے قطع نظر کہ سرشار، اٹھارویں صدی کے فرانسیسی زبان میں لکھے ہوئے ایک ادبی شہ کار کو عسکری کی نسبت ''کچھ نہ کچھ ضرور بنا سکتے ہیں'' (اور اب اگر کوئی اعتراض کرے کہ استاں دال کے سلسلے میں تو عسکری نے خود کو بہتر بنا کر پیش کیا ہے تو معترض کے لیے لازم ہے کہ سرشار اور عسکری کے علاوہ استاں دال سے بھی گہری آشنائی رکھتا ہو اور بلاوجہ مرعوبیت کا شکار بھی نہ ہو) یہاں اس امر کا اعتراف موجود ہے کہ ''نئی مصیبت'' پر قابو نہیں پایا جا سکا اور ادبی ترجمے کا یہ چیلنج معطل کر دیا گیا۔

یاد پڑتا ہے کہ اس مقالے کی اشاعت سے کچھ دیر پہلے، انھوں نے راقم السطور سے دلاکلو کے ناول کا ترجمہ شروع کرنے کا ذکر کیا تھا اور میں نے اپنی جگہ یہ سمجھ لیا تھا کہ چلو ایک اور کمال کا فرانسیسی ناول اردو زبان میں آیا ہی سمجھو۔ جب یہ مضمون شائع ہوا اور پڑھا تو پھر بھی اس ارادے کے معلق یا فسخ ہونے پر توجہ نہ کی بلکہ جب کتاب میں شامل ہوا تب بھی اس نکتے پر نظر نہ پڑی۔ چناں چہ بہت دیر تک اس ناول کا اردو ترجمہ شائع ہونے کا انتظار رہا۔ اُن کی وفات سے چند سال پہلے جب تجدید ملاقات کا موقع ملا تو کئی بار جی چاہا کہ پوچھوں، مگر اُس وقت وہ ادبیات کی سرحد پار کر کے حکمت و

عرفاں کی وادیوں میں سرگرداں ہو چکے تھے اور ایسی کوئی بات سنتے بھی تھے تو ''چھوڑیے صاحب'' کہہ کر موضوع بدل دیا کرتے تھے۔

چناں چہ ربع صدی کے بعد جب وہ مرحوم ہو چکے تھے تو میں نے ان کے برادر خورد اور اپنے عزیز دوست محمد حسن مثنیٰ سے ''باقیاتِ عسکری'' کے بارے میں استفسار کیا۔ اُنھوں نے بتایا کہ ایک نامکمل اور بے عنوان چیز اُنھوں نے ایک کاپی میں لکھی ہوئی دیکھی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خطوط کی شکل میں کسی ناول کا ایک حصہ ہے، پھر تو اشتیاق میں اضافہ ہوا کہ دلاکلو کا ناول مکتوباتی (epistolary) تکنیک ہی میں لکھا گیا تھا۔ بہرحال جب مثنیٰ صاحب کی عنایت سے یہ ''کاپی'' موصول ہوئی تو پتا چلا کہ واقعی عسکری صاحب نے ادبی تاریخ کے ایک نہایت اہم ناول کا ترجمہ تقریباً ایک تہائی تک پہنچ کر ترک کر دیا تھا۔ وجہ جو بھی ہو مگر آج اس ناتمام مسودے کو دیکھنے کے بعد فوری ردِّعمل ایک حسرت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ کاش کہ اُنھوں نے اسے مکمل کرنے کے بعد ہی ترکِ ادب یا ترکِ دنیا کا مسلک اختیار کیا ہوتا! اور ہوسکتا ہے کہ وہ یہ کام مکمل کر لیتے تو ان کی سوانحِ حیات کے ساتھ ساتھ ہمارے دور کی ادبی تاریخ بھی خاصی مختلف ہو جاتی!

خیر اب ''جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا'' کی تال پر سینہ زنی سے کیا حاصل؟ نقدِ ادب کے لیے یہی بہتر ہے کہ جو کچھ ہوا اسے جاننے اور سمجھنے کی کوشش ہو۔ دریغا اور واحسرتا قسم کے فجائیوں کی جگہ ''کیوں'' اور ''کیسے'' کی طرح کے استفہامیے استعمال کیے جائیں اس لیے کہ جہاں سے رشتہ منقطع ہوا تھا اسے پھر وہیں سے جوڑا جاسکے۔

اوّل تو یہی جاننا لازم ہے کہ دلاکلو کون تھا اور اس کا یہ ناول کیا اہمیت رکھتا ہے؟ پھر یہ کہ عسکری اس طرف کیوں راغب ہوئے؟ انھیں اس کا ترجمہ کرتے ہوئے درحقیقت کیا مشکل پیش آئی؟ اور اس کا کوئی حل ممکن تھا تو اس کی دریافت میں کون سی رکاوٹ پیدا ہوئی؟ ممکن ہے کہ ان میں سے کئی ایک سوالوں کا کوئی حتمی جواب نہ مل سکے، تاہم ان پر سوچ بچار ضروری ہے تاکہ میرؔ کے الفاظ میں ''جی کے رکن'' کا کچھ تو اندازہ ہو۔

فرشوڈرلو دِلاکلو (۱۷۴۱ء–۱۸۰۳ء) انقلابِ فرانس سے پہلے فرانس کی شہنشاہی فوج میں توپ خانے کا ایک افسر تھا۔ اس کی زندگی کا بڑا حصہ چھاؤنیوں میں گزرا تھا اور اگرچہ اس کا تعلق ایک شائستہ خاندان سے تھا، تاہم وہ شہنشاہی دور کے مراعات یافتہ طبقے سے تعلق نہیں رکھتا اور اس لیے بریگیڈیئر کے درجے تک پہنچنے کے بعد جب اسے آگے بڑھنے کے تمام راستے مسدود نظر آئے تو اس نے فوج کی ملازمت ترک کر دی۔ اس کے بعد وہ ایک باغی گروہ سے منسلک ہوگیا اور انقلابی سرگرمیوں کے الزام میں کچھ دیر گرفتار بھی رہا۔ انقلاب کے فوراً بعد دہشت گردی شروع ہوئی تو اسے جان بچانی مشکل ہوگئی، تاہم اس وقت نپولین کے بڑھتے ہوئے گروہ سے اس کا ربط قائم ہوا تو اس نے دوبارہ فوجی ملازمت قبول کر لی۔ جب نپولین نے اٹلی میں فتوحات کا آغاز کیا تو اسے فوجی کمان کا ایک منصب ملا،

جس میں ایک یونٹ کی تنظیم شامل تھی لیکن میدانِ جنگ میں کوئی عملی کارروائی انجام دینے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

وہ ایک لائق و فائق اسٹاف افسر ضرور تھا اور پڑھنے لکھنے کا ذوق رکھنے کے علاوہ اسے اپنے آس پاس کی اجتماعی زندگی سے بھی خاصی آگہی حاصل تھی لیکن اس نے اپنی ساری زندگی میں بس ایک ہی ناول لکھا۔ اس کی دیگر تحریری کاوشوں میں چند ایک نظمیں اور اوپیرا کے لیے لکھے ہوئے تھوڑے سے گیت ہیں یا پھر ذاتی قسم کے خطوط، سیاسی موضوعات پر چند ایک پمفلٹ اور فنِ حرب کے بارے میں ایک آدھ غیر رسمی مقالہ جو پیشہ ورانہ تصورات کے بارے میں بھی اُس کے مضطرب ذہن کی ترجمانی کرتا ہے۔

یقیناً وہ ایک انقلابی دل و دماغ کا مالک تھا لیکن اس کا ناول اپنے دور کے طبقۂ خواص کو اپنا موضوع بناتا ہے جس کے باہمی رشتے محبت کے ایک مسخ شدہ تصور پر قائم ہیں۔ ناول کی کہانی انقلابِ فرانس سے پہلے لوئی پانزدہم کے دورِ حکومت میں (جو تاریخ میں اپنی ظاہری شائستگی اور فسادِ باطن کے لیے مشہور ہے) ایک زن شکار امیرزادے اور ایک مرد افگن قسم کی عورت کے گرد گھومتی ہے۔ یہ دونوں باہم مربوط رہ چکے ہیں مگر اب اپنے معاشرے کے دو رُخے پن سے بیزار ہو کر دوسروں سے انتقام لینے کی سازش میں مصروف ہیں۔ اُن کی خطرناک سرگرمیوں سے اُن کے آشناؤں کو نہایت گہرے زخم پہنچتے ہیں مگر وہ خود بھی ایک دوسرے سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اٹھارویں صدی کے اس ناول میں خطوط کے ذریعے شخصیت کے نہاں خانوں میں اترا گیا ہے اور ساتھ ہی، بڑی [illegible] کے ساتھ، اونچے طبقے کی ایک ایسی اجتماعی تصویر بھی کھینچی گئی ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کی اصلاح شاید کسی بہت بڑے معاشرتی طوفان کی صورت ہی میں ہو تو ہو۔

یہ دونوں مرکزی کردار (اور ان کے ساتھ مکاتبت یا ارتباط رکھنے والے چند ایک دوسرے لوگ) اپنے تاریخی ماحول کا، مختلف زاویوں سے لیا ہوا عکس پیش کرتے ہیں۔ اور ناول نگار، جس نے کہانی براہِ راست کہنے کی بجائے کرداروں کے خطوط سے مرتب کی ہے، بہ ظاہر اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا لیکن مختلف خطوط کے الگ الگ لہجوں میں، ہجو ملیح کی ایک زیریں لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کہانی کی بنت نہایت باریک اور پیچیدہ ہے اور مکتوب نگار کرداروں کے عمیق نفسیاتی تجزیے خود ان کے الفاظ میں پیش ہوتے ہیں۔

ترجمے کے لیے ایک ایسا ناول یقیناً بہت مشکل کام ہے، انگریزی ہی میں اس کے کم سے کم چار ترجمے ہو چکے ہیں جن میں دو انگریزی کے ممتاز شعرا کے کیے ہوئے ہیں۔ اگرچہ دلاکلو کے اسلوب میں شعریت کی گنجائش بہت کم ہے، کم سے کم وہ اتھلی قسم کی شعریت جو رومانی اور جذباتی ناولوں کی اوپری سطح پر نظر آتی ہے (اور نیچے کچھ بھی نہیں ہوتا)۔

اپنے دور کی عکاسی اور اس پر زیرِلب قسم کی تنقید، اس کی خواہشات اور رویّوں کا انجام (جو تخیل کی روشنی سے محروم نہیں) اور سب سے زیادہ اپنے کرداروں کے خیالات و افکار جو زیادہ تر

''معقولیت پسندی'' اور ''روشن خیالی'' کی فلسفیانہ تحریک سے متاثر ہیں۔ ان خیالات کا اطلاق بہ قول ایک فرانسیسی ناقد کے شیطانی خود پسندی کی خاطر بالآخر تباہ کن نتائج پیدا کرتا ہے۔

دلاکلو کا واحد ناول انقلاب فرانس سے پہلے کا سب سے زیادہ ہنگامہ خیز ناول تھا اور لوگوں نے اس کا بنیادی پیغام... یعنی یہ ہے تمھارا طبقۂ حاکمہ... پڑھنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ یہ بات البتہ درست نہیں کہ ناول کے ہیرو نما ولن کو خود مصنف کی شبیہ سمجھ لیا جائے۔ فوجی ہائی کمانڈ نے اس ناول کو خطرناک سمجھا (اور ہمارے دور کے ممتاز ڈراما نگار ژاں ژیرادو کے خیال میں تو اب تک اس ناول سے خطرے کی بُو آتی ہے) اور دلاکلو کی ملازمت پر اس خفگی کا خاصا اثر پڑا، حتیٰ کہ اسے خود ہی ریٹائرمنٹ مانگنی پڑی۔

لیکن جب وہ فوجی ملازمت چھوڑ کر انقلاب کے لیے کام کرنے والوں کی صف میں شامل ہوا تو اس کے خلوص پر مکمل بھروسا کسی نے نہیں کیا۔ حالاں کہ اس کے دوستوں میں انقلابی تحریک کے زعیم بھی شامل تھے۔ وجہ شاید یہ تھی کہ اُسے اپنا ناول لکھنے کے پندرہ سولہ سال بعد تک اپنے کرداروں سے مشابہ سمجھا جاتا رہا۔ حالاں کہ وہ سب اس کی اجتماعی تنقید کا ہدف تھے۔

یوں تو مصنف کے معاصرین سے لے کر اب تک تقریباً ہر بڑے ادیب، مؤرخ اور نقاد نے اس ناول کی خاصی تعریف کر رکھی ہے لیکن خاص طور پر انیسویں صدی کے بے نظیر شاعر بودلیئر نے جو اس ناول پر ''اشارات'' لکھے ہیں اور بیسویں صدی میں آندرے ژید، ژیرادو، موریاک اور شوارے نے جو کچھ اس پر کہا ہے اس کی روشنی میں تو استاں دال کے بعد دنیا کے کسی ادیب کا شاید ہی کوئی ناول اس رتبے کو پہنچتا ہو۔ بودلیئر نے اسے ایک ''تاریخی دستاویز'' کہا ہے:

> ایک ایسی کتاب الاخلاق جو کسی بھی ارفع تحریر کے بلند تر اور کسی بھی گہری تصنیف سے عمیق تر ہے۔

ناقد شوارے کے خیال میں، ''اس ناول کے سامنے دوسروں کے ناول طفلانہ معلوم ہوتے ہیں۔''

تو گویا ہمارے محمد حسن عسکری نے استاں دال کے بعد دنیا کے دوسرے عظیم ترین ناول سے پنجہ آزمائی شروع کی (ناتمام ترجمے کا مسودہ شروع ہونے سے پہلے ۱۹۵۳ء کی ایک تاریخ لکھی گئی ہے جو شاید آغاز کا دن ہو) لیکن اُنھوں نے قصے کے جس مرحلے تک پہنچ کر یہ کام ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا اس سے شک پڑتا ہے کہ شاید یہ صرف اسلوب کی مشکلات کی بنا پر نہ ہو۔ اس وقت اس ناول کے مرکزی کرداروں نے (جو ایک سے زیادہ شکار پھانسنے میں مصروف ہیں اور شریک جرم ہونے کے باوجود باہمی رقابت میں الجھے ہوئے ہیں) ایک مذہبی قسم کی نیک نفس اور مضبوط ارادے کی عورت پر توجہ مرکوز کر رکھی ہے اور اس کا نقطۂ ضعیف دریافت کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ جلد ہی مادام دا تورویل کے اعصاب ان لوگوں کی مخاصمت اور تعاقب کے سامنے جواب دینے والے ہیں اور میرا اندازہ ہے کہ ناول کا یہ سب سے زیادہ تباہ کن اور خطرناک حصہ آنے سے پہلے عسکری صاحب مرحوم نے خود اپنی بڑھتی ہوئی نیک نفسی

اور قوت ارادی کے سامنے اس خطرے (اور اس سے پیدا شدہ المیے) سے پہلو بچا لیا ہے۔ یقیناً یہ سب لاشعوری طور پر ہوا ہوگا اور جس ''مشکل'' کو انھوں نے یہ کام ترک کرنے کا باعث بنایا ہے وہ اپنی جگہ کتنا بھی معقول کیوں نہ ہو، عسکری ایسے فن کار مترجم کے لیے ایک ''عقلی توجیہہ'' (rationalisation) سے زیادہ نہیں۔

اس کا ایک ہلکا سا اشارہ مادام داتوروِیل کے نام میں ایک بہ ظاہر معمولی سی تبدیلی سے بھی ہوسکتا ہے۔ عسکری صاحب نے اسے ہر جگہ ''توروِیل'' کی بجائے ''تروِیل'' لکھا ہے یعنی Tourver مصدر (بہ معنی گھومنا، بدل جانا) کی بجائے Trouver مصدر (یعنی پالینا، دریافت کرنا) سے مشتق بنا دیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں خود اس کی طرف سے کوئی تبدیلی پسند نہیں۔

موریاک نے مادام داتوروِیل کو مذہبی اخلاقیات کا حامل بتایا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ وہ اٹھارویں صدی کے عام مذہبی خیالات کے مطابق خیرات ہی کو خیر سمجھتی ہے اور یہ نہیں سوچ سکتی کہ کوئی خیرات کرنے والا (یا والی بھی) کس طرح ابلیس کا پیکر ہوسکتا ہے؟ آندرے ژید تک نے جو عام طور پر خیر و شر اور خدا و شیطان کے تصورات سے بیگانہ رہنا پسند کرتا ہے، والموں اور اس کی شریکِ جرم مادام دامرتی کی حرکات میں شیطان کو بروئے کار دیکھا ہے۔

خیر جو بھی ہو، عسکری کا یہ ناتمام ترجمہ ناتمامی کے باوجود ایک بہت بڑے اور نہایت گہرے ناول سے نبرد آزما ہونے کی ایک دلیرانہ کوشش ہے جو افسوس کہ جاری نہ رہ سکی۔ تاہم اگر کوئی اور صاحبِ عزم لکھنے والا ہمت کرے تو ممکن ہے عسکری صاحب کا یہ ادھورا کام مکمل ہونے کے بعد زیادہ ہاتھوں میں پہنچ سکے۔ اس بعید امکان کے پورا ہونے سے پہلے بھی اس ترجمے کے بعض پہلو ایسے ہیں جن پر توجہ ضروری ہے:

مثلاً یہ کہ ترجمہ کرنے سے پہلے آپ نے کتنے بڑے فن پارے پر توجہ کا فیصلہ کیا ہے؟ پھر یہ کہ آپ کو اس فن پارے کی خصوصیات کا کہاں تک اندازہ ہے؟ اور آخر میں آپ ان خصوصیات کو اردو زبان میں منتقل کرتے ہوئے اپنی زبان اور ادبی رجحانات کی کتنی توسیع چاہتے ہیں؟

میرے نزدیک ان سب سوالوں کے جواب عسکری کے حق میں جاتے ہیں سوا فسخِ ارادہ کے۔ اگرچہ شاید ان کے لیے یہ بھی عرفان کا لازمہ تھا۔ عرفت ربی بفسخ العزائم۔

آخر میں ایک بات، عسکری صاحب نے اپنے مسودے پر کوئی عنوان نہیں دیا تھا۔ آسانی کی خاطر اسے ''مخدوش رابطے'' کہا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

جمال پانی پتی

محمد حسن عسکری: نفی سے اثبات تک

بات ہے تو پرانی، مگر دلچسپ ہے۔ اس لیے سن لیجیے۔ محمد حسن عسکری کے تنقیدی مجموعے ''ستارہ یا بادبان'' پر سجاد باقر رضوی کا ایک تبصرہ ''فنون'' کے کسی شمارے میں چھپا تھا۔ اس تبصرے میں کچھ ذکر مظفر علی سیّد کا بھی آیا تو سجاد باقر رضوی نے انکشاف فرمایا کہ:

> مظفر علی سیّد صاحب نے عسکری سے تھوڑی سی فرانسیسی پڑھ ڈالی۔ اس کے بعد یہ دعویٰ کرتے پھرے کہ میں عسکری صاحب کا شاگرد ہوں۔ عسکری صاحب کو خبر لگی تو وہ اس حقیقت سے انکاری ہوئے۔ اب جب سیّد صاحب سے کچھ نہ بن پڑا تو انھوں نے یہ نعرہ لگایا کہ عسکری صاحب کو فرانسیسی آتی ہی نہیں۔ جیسے کو تیسا۔ عسکری صاحب، سیّد صاحب کی شاگردی سے منکر ہوئے، سیّد صاحب عسکری صاحب کی فرانسیسی دانی سے۔

یہ روایت اگر صحیح ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ بے شک مظفر علی سیّد صاحب کے پاس عسکری صاحب کی فرانسیسی دانی سے انکار کی ایک معقول وجہ ضرور موجود تھی۔ سو انھوں نے ہاتھ کے ہاتھ ان سے اپنا حساب برابر کرلیا۔ لیکن ہمارے مرحوم دوست اور ترقی پسند نقاد شہزاد منظر کے پاس تو ایسی کوئی وجہ بھی موجود نہیں تھی۔ مگر ترقی پسندوں کی پرانی روایت کے مطابق انھوں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھانا ضروری سمجھا اور انتہائی سادگی کے ساتھ یہ یقین کر لینے کے بعد کہ عسکری صاحب کو فرانسیسی نہیں آتی، انھوں نے بہ زعمِ خویش تحقیقِ دقیق سے کام لے کر عسکری صاحب کے کسی ہم نام کو حیدر آباد دکن کے آثار سے کھود کر نکالا اور فرانس کے رسائل میں چھپنے والے عسکری صاحب کے فرانسیسی مضامین کو اُن کے کھاتے میں ڈال دیا۔ مظفر علی سیّد نے عسکری صاحب کی فرانسیسی دانی کے بارے میں جو کچھ کہا، ڈنکے کی چوٹ پر ان کی زندگی میں کہا جب کہ شہزاد منظر نے ان کی زندگی میں نہیں، ان کی موت کے بعد یہ بے پر کی اُڑائی۔ اب یوں تو اس بے پرکی کا نوٹس لینے کی کم از کم ہمارے نزدیک ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر ''جرش قلم''

والے شمیم احمد تو ایسے ہی مواقع کی تاک میں رہتے تھے۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک ہی وار میں بے چارے شہزاد منظر کا کام تمام کر دیا۔

غرض اس قصے کی یاددہانی سے یہ ہے کہ عسکری صاحب پر ہونے والے اعتراضات، خواہ وہ ہوں جو ان کی زندگی میں ہوئے یا وہ جواب ان کی موت کے بعد ہو رہے ہیں، زیادہ تر بس اسی قبیل کے ہیں۔ ان کا مصرف سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ آپ جس طرح لطائف وظرائف سے لطف اندوز ہوتے ہیں اسی طرح ان سے بھی ہنسنے ہنسانے کا کام لے سکیں۔ اسی قسم کا ایک اور دلچسپ قصہ یہ ہے کہ ایک صاحب نے عسکری صاحب کی کتاب ''جھلکیاں'' پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ عسکری صاحب ایک گوشہ نشین آدمی تھے۔ انھیں ان کی زندگی میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن اب ان کی موت کے بعد کچھ لوگ انھیں دریافت کر رہے ہیں۔ اب جس شخص کو ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۲ء سے لے کر عسکری صاحب کی وفات تک ادب اور ادبی ہنگامہ آرائیوں کی تاریخ کا ذرا بھی علم ہے، کم از کم وہ تو عسکری صاحب کے بارے میں ایسی غلط بیانی کا کبھی مرتکب نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ عسکری صاحب تو ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی ابتدائی تحریروں ہی سے نمایاں اور ممتاز ہوجاتے ہیں۔ وہ ابتدا ہی سے صفِ اوّل کے ادیب، نقاد اور افسانہ نگار سمجھے گئے۔ پھر ترقی پسندوں سے ان کے مچلکوں نے انھیں اور شہرت دی بلکہ خود ترقی پسندوں نے بھی اپنے رسالوں کے دروازے ان پر بند کر کے اور اپنے جلسوں میں ان کے خلاف قراردادیں پاس کر کر کے اس شہرت میں مزید اضافہ کیا۔ اس کے بعد پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کی بحثیں چھیڑ کر عسکری صاحب نے ہماری ادبی زندگی میں ایک اور تنازع کھڑا کر دیا۔ حتیٰ کہ ایک زمانہ وہ بھی آیا جب عسکری صاحب کے ایک ایک فقرے پر ادبی بحثیں ہونے لگیں۔ عسکری صاحب نے کہا، ادب میں انحطاط ہے تو ادبی انحطاط بحث کا موضوع بن گیا۔ عسکری صاحب نے کہا، ادب میں جمود ہے تو ادبی جمود بحث کا موضوع بن گیا۔ غرض ایک ایسے ہنگامہ پرور شخص کے بارے میں جو اپنی ابتدائی تحریروں سے لے کر مرتے دم تک ادب اور ادیبوں کا ایک مسئلہ بنا رہا، یہ کہنا کہ اسے کوئی نہیں جانتا، بجائے خود ایک بہت بڑا لطیفہ ہے۔

اس انداز کی گپ شپ کے بعد انجم صاحب نے اپنے تبصرے میں عسکری صاحب کے ایک تضاد کی نشان دہی بھی کی۔ انھوں نے کہا کہ ''جھلکیاں'' میں ان کا جو تصورِ روایت تھا وہ ''جدیدیت'' تک آتے آتے کچھ اور ہوگیا۔ عسکری صاحب کے تصورِ روایت میں اس تبدیلی کو انھوں نے ان کا تضاد قرار دیا۔ اس اعتراض سے ظاہر ہے کہ صاحبِ موصوف کو تبدیلی اور تضاد کا فرق بھی نہیں معلوم۔ تضاد اسے کہتے ہیں کہ جب ایک ہی نقطۂ نظر کے اندر دو ایسی باتیں جمع ہوجائیں جو ایک دوسرے کی تردید کرتی ہوں۔ تبدیلی اسے کہتے ہیں جب پورا نقطۂ نظر ہی بدل جائے اور آدمی ایک نقطۂ نظر کو چھوڑ کر دوسرا نقطۂ نظر اختیار کرلے، مثلاً علامہ اقبال ایک زمانے میں قوم پرستی کے قائل تھے۔ انھوں نے ''نیا شوالہ'' اور

''ترانۂ ہندی'' اسی نقطۂ نظر کی روشنی میں لکھا۔ مگر اس کے بعد جب ان کا نقطۂ نظر بدلا تو وہ قوم پرستی کے خلاف ہوگئے۔ اب اس کے بعد جو کچھ انھوں نے لکھا وہ ان کے سابقہ نقطۂ نظر کے بالکل برعکس تھا۔ علامہ کے نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی ان کا تضاد نہیں۔ تضاد اس وقت ہوتا جب وہ قوم پرستی کی باتیں بھی کرتے رہتے اور ساتھ ہی اس کے برعکس موقف کا اظہار بھی کرتے۔ چناں چہ عسکری صاحب کی کتاب ''جھلکیاں'' کے بعد ان کی کتاب ''جدیدیت'' بھی ان کے تصورِ روایت کے حوالے سے ان کے کسی تضاد کی نشان دہی نہیں کرتی بلکہ ان کے تصورِ روایت میں ایک بنیادی تبدیلی کو ظاہر کرتی ہے۔ ''جھلکیاں'' انھوں نے اس وقت لکھی جب وہ خود بھی مغرب کی راہ پر چل رہے تھے اور دوسروں کو بھی اسی طرف چلنے کی دعوت دے رہے تھے۔ ''جدیدیت'' انھوں نے اس وقت لکھی جب وہ اپنے ذہن وفکر میں ایک انقلابی تبدیلی کے بعد مغرب کے سارے بنیادی تصورات کی تنقید کرنے لگے تھے۔ ''جھلکیاں'' میں انھوں نے روایت کا وہی تصور پیش کیا جو مغرب میں سمجھا جاتا ہے۔ ''جدیدیت'' میں انھوں نے روایت کے اس تصور کو بیان کیا جسے مغرب بھول چکا ہے۔

اس کے باوجود بعض لوگ ابھی تک یہی کہتے ہیں کہ عسکری صاحب کا تصورِ روایت بھی وہی ہے جو ایلیٹ کا (یعنی مغرب کا) ہے... بلکہ ایک صاحب نے تو اپنے ایک انٹرویو میں صاف لفظوں میں کہا کہ محمد حسن عسکری اور ایلیٹ کا تصورِ روایت ایک ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ایلیٹ کا تصورِ روایت حرکی ہے اور عسکری صاحب کا منجمد۔ اس بیان سے صرف ایک بات کا پتا چلتا ہے، یہ کہ یہ صاحب نہ تو ایلیٹ ہی کی بات کو سمجھتے ہیں نہ عسکری کی بات کو، ورنہ انھیں کم سے کم اتنی بات تو ضرور معلوم ہوتی کہ عسکری صاحب کا تصورِ روایت، ایلیٹ کا تصورِ روایت نہیں، رینے گینوں کا تصورِ روایت ہے۔ اور ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پھر ان جیسے لوگوں کے ساتھ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ جو بات وہ کہتے ہیں اسے خود بھی نہیں سمجھتے۔ حالاں کہ اگر انھیں خود اپنے ہی کہے پر غور کرنے کی توفیق میسر ہوتی تو انھیں معلوم ہوسکتا تھا کہ جو بات وہ کہہ رہے ہیں اس میں بجائے خود ایک تضاد موجود ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایلیٹ کا تصورِ روایت حرکی ہے اور عسکری کا منجمد۔ اب اگر ان دونوں میں حرکت اور جمود کا فرق ہے تو دونوں ایک کیسے ہوسکتے ہیں؟ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ پتھر اور گھوڑا دونوں ایک ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ گھوڑا حرکت کرتا ہے اور پتھر حرکت نہیں کرتا۔ شاید ایسے ہی سخن فہموں سے چڑ کر سلیم احمد نے ایک جگہ کہا تھا کہ:

> قاعدہ یہ ہے کہ ادب کے بارے میں اگر کوئی ایسا آدمی جس نے اس کی تفہیم کا ثبوت پیش کیا ہو، مناسب علم و ادراک رکھتا ہو اور سنجیدگی سے سوچتا ہو، اس کی بات سے خواہ اختلاف کیا جائے، مگر غور سے سننے اور سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں سمجھنے کی تو کیا، سننے کی بھی توفیق نہیں ہوتی... عسکری نے اپنے

''ساتت رنگ'' کے مضامین میں بعض ایسی نئی، اچھوتی اور حیرت میں ڈال دینے والی باتیں کہیں کہ اردو ادب اور اردو ادیب اگر زندہ ہوتے تو تہلکہ مچ جاتا۔ مگر میں نے عام طور پر وہ حال دیکھا ہے جو چھپکلی کا ہوتا ہے یعنی جسم تو مردہ ہے، بس دُم ہل رہی ہے اور وہ بھی پورے جسم سے کٹ کر۔ اردو ادیبوں کی کٹی ہوئی دُم ان کی بے تاب زبان ہے جو دماغ سے الگ ہوکر اُچھل کود کرتی رہتی ہے۔

(سلیم احمد کی کتاب ''نئی شاعری، نامقبول شاعری''، صفحہ ۴۴۔۴۵)

اردو ادیبوں کے بارے میں سلیم احمد کی اس رائے سے اگر وہ لوگ اتفاق نہ کریں تو کوئی تعجب نہیں جن کے نزدیک عسکری صاحب کی حیثیت اردو ادب میں نت نئے شوشے چھوڑنے والے اور نت نئے رنگ بدلنے والے ایک فقرے باز سے زیادہ کی نہیں۔ لیکن جن لوگوں کے نزدیک عسکری صاحب کی شخصیت اردو ادب کی دنیا کے اندھیروں میں روشنی کے سفر کا استعارہ تھی، وہ تو سلیم احمد کی رائے سے سو فی صد اتفاق ہی کریں گے۔

یوں کہنے کو تو عسکری صاحب اردو ادب کے نقاد تھے۔ لیکن ادب سے ان کی دلچسپی نہ تو محض جمالیاتی اور فنی پہلوؤں تک محدود تھی اور نہ ہی ان کے تنقیدی سفر کی معنویت صرف و محض ادبی تھی۔ وہ ادبی مسائل و موضوعات پر لکھتے ہوئے جس وسیع تر عالمی تناظر کو پیشِ نظر رکھتے تھے اور انھیں جس طرح پوری زندگی کے حوالے سے دیکھتے تھے، وہ ہمیں خود زندگی کے بارے میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ترقی پسندوں نے جو اپنے آپ کو ادب برائے زندگی کا ٹھیکے دار سمجھتے تھے، انھیں ادب برائے ادب کے خانے میں بند کرنا چاہا۔ لیکن ان کی تحریروں کو کسی تعصب کے بغیر غور سے پڑھنے والے بہ خوبی جانتے ہیں کہ زندگی جیسی کچھ ان کے ہاں نظر آتی ہے، اس کی مثال ہمارے بڑے بڑے ترقی پسندوں کے ہاں بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ ان کی بعد کی تحریریں تو رہیں الگ، ''جھلکیاں'' جیسی اوّلین تحریروں میں بھی اپنے گرد و پیش کے ماحول اور زندگی کا جیسا احساس ملتا ہے ویسا ان کے کسی اور ہم عصر نقاد کے ہاں نہیں ملتا۔ پھر ان پر فرانس کے زوال پسندوں اور جمال پرستوں سے متاثر ہونے کا اعتراض بھی کیا گیا۔ عین اسی وقت وہ ہمیں راں بو جیسے فن کاروں کے حوالے سے یہ بتا رہے تھے کہ اخلاقیات اور مذہب یا ایک متوازن اور ہمہ گیر نظامِ حیات کی اجازت کے بغیر حسن کو گھٹنوں پر بٹھانے کا انجام کس قدر ہول ناک ہوسکتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا رہے تھے کہ جمال پرستوں، ہیئت پرستوں اور فن برائے فن والوں کی تمام تر کاوشیں پرانی کائنات کو ریزہ ریزہ کر کے ایک ایسی نئی کائنات تخلیق کرنے سے عبارت ہیں جو پہلے سے زیادہ حسین، ہم آہنگ، متوازن اور بامعنی ہو۔ چناں چہ ادب کے اخلاقی رول پر اصرار کے ساتھ ساتھ زندگی کی نئی معنویت اور اقدار کے ایک نئے نظام کی تلاش بھی ان کے ہاں اسی وقت سے

شروع ہوجاتی ہے۔ علاوہ ازیں ان کے ہاں ایک مرکزی روایت کا تصور بھی ابتدا ہی سے موجود تھا جو بعد کے زمانے میں اور گہرا ہوتا چلا گیا اور وہ شاعری، مصوری، موسیقی اور فنِ تعمیر جیسے تمام تہذیبی مظاہر کو اس مرکزی روایت کے حوالے سے تہذیبی سیاق و سباق کے ساتھ وسیع تر عالمی تناظر میں دیکھنے لگے۔ ان کے اس اندازِ تنقید نے اردو کی ادبی تنقید کے آفاق کو جس ہمہ گیر وسعت اور گہرائی سے ہم کنار کیا، اس کی مثال کم از کم اردو ادب کی دنیا میں تو نایاب ہی ہے۔

عسکری صاحب پر ایک دلچسپ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ زیادہ دن تک ایک رائے پر قائم نہیں رہتے۔ اور عسکری صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ اعتراض درست ہے بلکہ انھوں نے تو اردو ادیبوں سے شرمائے بغیر اس بات کا اعلان کھل کر کیا ہے کہ ''نئے تجربات کا تقاضا ہو تو میں اپنی رائے بڑی بے شرمی کے ساتھ بدل لیتا ہوں۔'' تو چلیے یہ اعتراض درست ہی سہی، لیکن کیا زندگی بھر ایک ہی رائے پر قائم رہنا ادب یا زندگی میں کوئی بہت قابلِ قدر بات ہے؟ اور کیا زندگی کے ٹھوس تجربات ہمیں اکثر اوقات اپنی رائیں بدلنے پر مجبور نہیں کر دیتے؟ پھر ادب بھی تو زندگی ہی کی طرح مسلسل تجربات سے عبارت ہے۔ شاید اسی لیے عسکری صاحب نے زندگی کے بارے میں سوچنے سمجھنے کا آلہ بھی اپنے ادبی تجربات ہی کو بنا رکھا تھا۔ انھوں نے کہا ہے کہ:

> ادب ایک مسلسل تجربہ ہے، کوئی قانونِ تعزیرات نہیں جو ہر بات میں ناطق فیصلے صادر کیے جائیں۔ یہاں تو ایک مستقل تفتیش ہی سب کچھ ہے۔
>
> (''ستارہ یا بادبان''، صفحہ ۳۵)

اب اگر اس تفتیش کے نتائج آدمی سے اپنی رائے بدلنے کا تقاضا کریں تو اس سے گریز کرنا کیا معنی رکھتا ہے، ہمیں یہ بھی تو سوچنا چاہیے۔ زندگی اور ادب دونوں ہی میں ٹھوس تجربات سے آنکھیں بند کرنے کے نتائج کبھی خوش گوار نہیں ہوتے۔ نئے تجربات کے تقاضوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ''زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد'' کے مصداق بنے رہنے پر اصرار کرنا، ممکن ہے ان لوگوں کے نزدیک کوئی بہت اچھی بات ہو جو ادب میں تجربے کی بجائے نظریے ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ لیکن عسکری صاحب کا کہنا تو یہ ہے کہ:

> ژید جیسے لوگوں نے مجھے سکھایا ہی یہ ہے کہ اپنا ملک چھوڑ دو، اپنا خاندان چھوڑ دو، اپنا کمرہ چھوڑ دو اور کچھ نہ بن پڑے تو خیالات ہی چھوڑ دو۔ اگر آدمی میں زیادہ کی ہمت نہ ہو تو ایسی بھی کیا معذوری کہ رائے بھی بدلی نہ جاسکے۔ اس کے علاوہ یہ ایسی بے مصرف چیز بھی نہیں۔ اگر آدمی پوری ذمہ داری کے ساتھ ایک ہی خیال کو نبھائے چلا جائے تو انسانیت کسی اڑیل بیل کی طرح ایک ہی جگہ ٹھہری رہ جائے۔
>
> (''ادب کا مستقبل''، مطبوعہ ''نیا دور''، کراچی، شمارہ ۷۵۔۷۶)

عسکری صاحب نے ایک جگہ لکھا تھا کہ ''میں صرف اپنے اعصاب کے ذریعے حقیقت تک پہنچنے کی لڑکھڑاتی ہوئی کوشش کر سکتا ہوں۔'' اس پر یہ اعتراض ہوا کہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے اعصاب کا سہارا کافی نہیں۔ اس لیے کہ ناقد محض اعصاب اور حسّیات پر بھروسا کر کے زیادہ دُور تک نہیں جا سکتا۔ اعصاب پر بھروسا کرنے ہی کی وجہ سے ان کے ادبی موقف میں ٹھہراؤ اور استقلال پیدا نہیں ہو سکا۔ وہ ایک عشرے میں جو ادبی موقف اختیار کرتے تھے وہ دوسرے عشرے تک بدل جاتا تھا۔ اس بات کو بعض لوگوں نے ان کی تلوّن مزاجی پر محمول کیا ہے اور بعض نے انتشارِ ذہنی پر۔ اچھا، اگر اعصاب کے سہارے زیادہ دُور نہیں جا سکتے تو کیا عقل کا سہارا یقینی طور پر اتنا قابلِ اعتماد ہے جو ہمیں زیادہ دُور تک لے جا سکے؟ عسکری صاحب اپنے ادبی موقف کو اعصاب کے سہارے کم از کم ایک عشرے تک تو کھینچ ہی لیتے تھے۔ عقل کے فیصلے تو آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل۔ اور پھر یہاں مثال کے طور پر ایک بات یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اگر حقیقت کا مفہوم صرف و محض جدلیاتی مادّیت اور طبقاتی کش مکش جیسی کسی معاشی، سیاسی یا سماجی حقیقت تک محدود ہو تب تو بات ہی دوسری ہے۔ ایسی حقیقت تک پہنچنے کے لیے تو اپنے آپ کو مارکسی نظریے جیسے کسی ایک نظریے کے کھونٹے سے باندھ لینا ہی کافی ہے۔ پھر اس میں یہ فائدہ الگ ہے کہ اس کے بعد آپ کا ادبی موقف بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے طے ہو جاتا ہے۔ اسے بار بار بدلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی... لیکن:

> فن کار تو اپنی حقیقت کا ادراک صرف عقل یا تحلیلی صلاحیت کے ذریعے سے ہی نہیں کرتا، اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے وہ اپنے پورے اعصابی نظام سے کام لیتا ہے۔ ترقی پسند فن کار سے جس قسم کے تجزیے اور جس قسم کی محدود سیاسی اور معاشیاتی حقیقت کے ادراک کا مطالبہ کرتے ہیں وہ تو صرف دماغ کا کام ہے۔ اور دماغ فن کار کا کُل شعور نہیں ہے بلکہ اس کے شعور کا چھوٹا سا حصہ ہے۔ جو حقیقت، جو احساسات اور مدرکات جسم کی رگ رگ سے ہوتے ہوئے آتے ہیں، انھیں آپ کس کھتے میں جھونکیں گے... یہاں یہ نہ بھولیے گا کہ فن کار کے لیے تو خیالات بھی حسیاتی حقیقت ہو سکتے ہیں۔
>
> (''جھلکیاں''، حصہ اوّل، صفحہ ۱۸۷۔۱۸۸)

رہی تلوّن مزاجی کی بات، تو یہ چیز عسکری صاحب کے مزاج کی نہیں، خود مغربی تہذیب و ادب کے مزاج ہی کی ایک خصوصیت ہے۔ مغرب کا کوئی نظریہ، کوئی فلسفہ اور کوئی علمی یا ادبی رجحان ایسا نہیں جس کی تردید چند دن بعد خود مغرب ہی نہ کر دیتا ہو۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مغرب سے کتنے ہی نظریات اور فلسفے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے دفترِ پارینہ بھی بن گئے۔ مغرب میں آ[illegible] انسان پرستی کا دور دورہ ہے تو کل فطرت پرستی اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ فطرت پرستی، فرد پرستی، عقل[illegible] پرستی اور جذبات

پرستی سے لے کر جنس پرستی تک مغرب اپنے لیے ایک کے بعد ایک خدا تراشتا ہے۔ کچھ دنوں تک اسے پوجتا ہے اور پھر بالآخر کسی اکتائے ہوئے بچے کی طرح اسے بے کار کھلونا سمجھ کر توڑ پھینکتا ہے۔ ایسے نت نئے نظریات اور فلسفے جس زور شور سے آندھی طوفان کی طرح آتے ہیں، اسی زور شور سے گزر بھی جاتے ہیں۔ کم و بیش یہی حال ادبی اور تنقیدی نظریات کا ہے جو ایک دوسرے سے اس قدر مختلف اور متضاد ہیں کہ ان سے رہنمائی حاصل کرنے والے قاری کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ ان میں سے کسے صحیح سمجھے اور کسے غلط۔ بھانت بھانت کے ان نظریات کے درمیان سر کھپانے کا نتیجہ انتشار ذہنی کے سوا کچھ اور نہیں نکلتا۔ عسکری صاحب اگر باہم متخالف و متضاد نظریات کے اس جنگل سے اپنا ذہنی توازن برقرار رکھتے ہوئے صحیح سلامت باہر نکل آئے تو اسے ان کی ذہنی سلامت روی اور فکری استقامت ہی کا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔

عسکری صاحب اپنے سفر کی ابتدا میں چلے تو ترقی پسندوں کے ساتھ ہی تھے مگر ان سے اختلاف کے بعد اپنی راہ اُن سے الگ کر لینے کے باوجود وہ جدیدیوں سے بھی پوری طرح متفق نہ ہو سکے۔ ترقی پسندوں پر اگر انھیں یہ اعتراض تھا کہ وہ تجربے پر نظریے کو فوقیت دے کر ادب کو سیاسی اور معاشی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں تو ہمارے ہاں کے جدیدیوں سے بھی وہ اس لیے اتفاق نہ کر سکے کہ ان کے نزدیک یہ لوگ انحراف و انکار کی ذہنیت ہی کو جدیدیت کے مترادف سمجھتے ہوئے انحراف و انکار یا نفی کے روتے ہی میں بند ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور یوں اثبات و اقرار کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر انکار و انحراف کی اس ذہنیت کو منطقی طور پر نشوونما پانے دیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ معاشرے کے مکمل انتشار اور نراج کی صورت میں برآمد ہوگا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی نفیِ محض یا انکارِ محض پر قائم نہیں رہ سکتی۔ نفی کے بعد اثبات اور انکار کے بعد اقرار، زندگی کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ چناں چہ جس وقت ترقی پسند انھیں فراری، رجعت پسند اور زوال پسند قرار دے کر جمال پرستوں اور فن برائے فن والوں کے ریوڑ میں ہانکنے کی کوشش کر رہے تھے، اس وقت عسکری صاحب ہمیں بتا رہے تھے کہ مغرب کے جدید فن کار کی جمال پرستی اور فن پرستی یہ ہے کہ وہ ہر چیز کی نفی کرتے کرتے اپنی روحانی جدوجہد کی انتہا پر پہنچ کر پھر سے اثبات کی طرف مائل ہو گیا ہے۔ ''ہیئت اور نیرنگِ نظر'' میں وہ یہ تو پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ آرٹ بہ نفسہٖ زندگی کی جستجو ہے، ایک نئے توازن اور نئے آہنگ کی تلاش ہے۔ اس کے بعد ''فن برائے فن'' میں انھوں نے بتایا کہ جدید فن کار ہر قسم کی آسانیوں، ترغیبوں اور مفادات سے بے نیاز ہو کر انسانی زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور پروست اور جوئس تک آتے آتے اس نے انسانی زندگی کے بعض لازمی اداروں کا اثبات شروع کر دیا ہے۔

یہ تو صحیح ہے کہ عسکری صاحب کا ذہنی اور تخلیقی سفر کوئی سیدھی لکیر کا سفر نہیں، لیکن جمال پرستوں سے لے کر فرائیڈ اور رانبو تک اور آندرے ژید سے لے کر رینے گینوں اور ابنِ عربی تک وہ اپنے سفر

میں جن جن مراحل سے گزرے اور مرحلہ بہ مرحلہ جن بنیادی سوالات سے دوچار رہے ان کو نظر میں رکھا جائے تو یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ نفی سے اثبات کی طرف ان کے سفر کی ایک واضح جہت ہے جو انھیں کشاں کشاں مختلف مراحل سے گزار کر اپنی منزلِ مقصود تک لیے جا رہی ہے۔ لیکن ان کا بنیادی حوالہ ادب تھا جو بہ قول ان کے، ان کی جبلت یا قوتِ ارادی بن چکا تھا اور جسے انھوں نے اپنی تخلیقی واردات کے سفر میں سوچنے اور محسوس کرنے کا آلہ بنا رکھا تھا۔ انھوں نے نفی سے اثبات کی طرف اپنے ذہنی اور روحانی سفر کی تمام منزلیں از ابتدا تا انتہا اپنے ادبی تجربات یا قوت ارادی ہی کے ذریعے طے کیں۔

عسکری صاحب نے اپنے پہلے تنقیدی مجموعے کا نام ''انسان اور آدمی'' رکھا اور اس کے پیش لفظ میں لکھا کہ ''یہی نام میں اپنے افسانوں کے مجموعے کا بھی رکھ سکتا تھا۔ کیوں کہ جو کچھ میں نے اس عنوان والے مضمون میں کہا ہے وہ اس سے کئی سال پہلے اپنے افسانے 'گھٹلیوں کے دام' میں بھی کہہ چکا ہوں۔ میری جذباتی اور ذہنی زندگی کا محور بس یہی ہے۔'' ''انسان اور آدمی'' کے مسئلے کو سلیم احمد نے بھی عسکری صاحب کا مرکزی مسئلہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے زندگی، انسان، تہذیب اور اپنے زمانے کے بارے میں جو کچھ سوچا ہے اس کی مرکزی روح اس مضمون میں بند ہے۔

مغربی تہذیب کی انسان پرستی کا ایک شاخسانہ یہ بھی ہے کہ انیسویں صدی کے مغربی ادب میں مجرد انسان کے تصور کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگئی۔ اور لوگ گوشت پوست کے زندہ انسان کو بھول کر مجرد انسان کی پرستش کرنے لگے۔ مجرد انسان کے اس تصور کو جسے عسکری صاحب رُوسو سے منسوب کرتے ہیں، انیسویں صدی کے مغربی ادب نے اس زور شور سے پھیلایا کہ وہ ہمارے زمانے کا ایک بنیادی عقیدہ بن گیا اور اس کے اثرات فلسفے، ادب اور آرٹ سے لے کر سیاسیات تک ہر جگہ پھیل گئے۔ پہلے اس عقیدے کو روس میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی اور روس کے زیر اثر یہ عقیدہ ہمارے ہاں کے ترقی پسند ادب میں مقبول ہوا۔ پھر بالآخر اس کے اثرات پوری دنیا میں پھیل گئے بلکہ عسکری صاحب کے بہ قول بعد میں امریکا والوں نے تو انسان پرستی میں روس کو بھی منزلوں پیچھے چھوڑ دیا۔ عسکری صاحب کا کہنا ہے کہ عہدِ جدید نے زندہ انسان کو اس مجرد انسان کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا اور اس کے تمام سیاسی، معاشی اور معاشرتی تصورات اس قربانی کا جواز پیش کرنے لگے۔ انسان اور آدمی کا یہی وہ فرق ہے جسے عسکری صاحب نے ایک طرف ہمارے ہاں کے ترقی پسندوں سے اور دوسری طرف مغرب کے انسان پرستانہ رجحانات سے لڑنے کے لیے استعمال کیا۔ یہ تھا وہ مسئلہ جسے اس کے پورے تاریخی پس منظر کے ساتھ ذہن میں رکھا جائے تو مجرد انسان پرستی کے خلاف عسکری صاحب نے جس ردِ عمل کا اظہار کیا، اس کے وسیع مضمرات کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

عسکری صاحب نے ''انسان اور آدمی'' ۴۸ء میں لکھا تھا۔ آٹھ سال بعد ۵۶ء میں ''آدمی اور انسان'' لکھا۔ ''انسان اور آدمی'' میں انھوں نے کہا تھا کہ موجودہ زمانے میں اگر ''انسان'' کو رد کر کے

''آدمی'' کو قبول نہ کیا گیا تو انسانیت کا مستقبل صدیوں تک مبہم رہے گا۔ ''آدمی اور انسان'' میں انھوں نے اس خیال کو الٹ کر دوسرے رخ سے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''آج ہم انسانی زندگی کے سب سے بنیادی مسئلے سے دوچار ہیں۔ ہم 'آدمی' کو رد کیے بغیر اس کے اندر سے 'انسان' اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں۔ اس سوال کے جواب پر نسلِ انسانی کے مستقبل کا دارومدار ہے۔'' یہ دونوں مضامین عسکری صاحب کے ذہنی اور روحانی سفر کے دو مختلف مرحلوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس سفر کے پہلے مرحلے میں وہ انسان کے مجرد تصور کی نفی کرکے انسان سے آدمی کی طرف آتے ہیں اور دوسرے مرحلے میں آدمی سے انسان کے ایک ایسے تصور کی طرف جس میں آدمی کو رد نہ کیا گیا ہو۔ ''ہیئت اور نیرنگِ نظر'' اور ''فن برائے فن'' والے مضامین میں ان کے سفر کا رخ نفی سے اثبات کی طرف تھا۔ ''انسان اور آدمی'' میں بھی ان کے سفر کا رخ اسی جانب یعنی نفی سے اثبات کی طرف ہے۔ نفی وہ رُوسو کے حوالے سے انسان کے مطلق اور مجرد تصور کی کرتے ہیں اور اثبات زندگی کے ٹھوس تجربات کے حوالے سے گوشت پوست کے جیتے جاگتے آدمی کا۔ اس کے بعد آگے چل کر اس سلسلے کے دوسرے مضامین میں وہ اثبات کی کچھ اور منزلیں طے کرتے ہیں۔ ''آدمی اور انسان'' میں وہ مغربی ادب کے مطالعے کے دوران اپنے تجربے میں آنے والے ہر تصورِ انسان سے غیر مطمئن نظر آنے کے ساتھ ساتھ آدمی کی نفی کیے بغیر ایک نئے تصورِ انسان کی تلاش کے مسئلے سے الجھے ہوئے تھے۔ یہاں تک اُن کے سفر کا تعلق مغرب سے تھا۔ آگے اُن کے سفر کا رخ مشرق کی طرف ہوجاتا ہے۔ مگر اس سے پہلے ان کے سفر میں ایک اہم موڑ آتا ہے۔

عسکری صاحب نے ''آدمی اور انسان'' ۵۶ء میں لکھا تھا۔ تین سال بعد ۵۹ء میں ان کا مضمون محسن کاکوروی پر آیا۔ یہی وہ مضمون ہے جو ان کے ذہنی اور روحانی سفر میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے مضمون ''آدمی اور انسان'' میں وہ ''آدمی'' سے گزر کر ''انسان'' تک پہنچ گئے تھے مگر انسان کا تعلق کسی ماورائی طاقت (یا خدا) سے جوڑنے میں پس و پیش کا اظہار کر رہے تھے۔ عسکری صاحب کے ذہنی اور روحانی سفر میں محسن کاکوروی والے مضمون کی اہمیت یہی ہے کہ اس مضمون میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے حوالے سے جس نئے تصورِ انسان سے دوچار ہوئے، اس کی ماورائی جہت نے انھیں ایک ہی جست میں انسان سے خدا تک پہنچا دیا۔ اور اسی کے ذریعے انھیں اپنے اس سوال کا جواب بھی مل گیا جس سے وہ اپنے مضمون ''آدمی اور انسان'' میں الجھے ہوئے تھے۔ یہ تصورِ انسان عسکری صاحب کو اس قدر پسند آیا کہ وہ بار بار اس کا تقابل ان تصورات سے کرنے لگتے ہیں جو ہمارے ہاں مغرب پرستی، عقل پرستی اور خود پرستی کے دور میں عام ہوئے۔

سلیم احمد نے عسکری صاحب کے اس سفر کی تدریجی منزلوں کا بیان اپنی کتاب ''محمد حسن عسکری، آدمی یا انسان'' میں بڑی وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔ میں نے یہاں اس کا لبِ لباب اختصار

کے ساتھ پیش کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ کس طرح اپنے سفر کے مختلف مراحل میں نفی سے اثبات کی طرف بڑھتے ہیں۔ سلیم احمد نے لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے کہ عسکری صاحب کے مضمون ''انسان اور آدمی'' میں اسلام کا ذکر طرزِ احساس کی کسی تبدیلی کے بغیر ہوا تھا۔ محسن کاکوروی والے مضمون تک آتے آتے ان کے احساس میں وہ تبدیلی پیدا ہوئی جس کے لیے ادبی تجربے کی شرط ضروری تھی۔ بہ الفاظِ دیگر انھیں محسن کاکوروی کے ہاں وہ تصورِ انسان اپنے ادبی تجربے کی روشنی میں مل گیا جس کی تلاش میں وہ ''پھسلیوں کے دام'' سے لے کر ''انسان اور آدمی'' تک اور ''انسان اور آدمی'' سے لے کر ''آدمی اور انسان'' تک منزل منزل بھٹکتے پھرے۔

آدمی اور انسان کے جس فرق کو عسکری صاحب نے ایک طرف ترقی پسندوں سے لڑنے کے لیے اور دوسری طرف اپنے زمانے کے مغربی ادب اور تہذیب کے انسان پرست رجحان کے خلاف اپنا ردِّعمل ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا، اس میں کہیں کہیں کچھ الجھاوے بھی ہیں جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سلیم احمد نے ان پر بعض بہت بنیادی اعتراضات کیے ہیں۔ لیکن یہاں ہمیں ان سے قطعِ نظر کرتے ہوئے کہنا صرف یہ ہے کہ عسکری صاحب کے ذہنی اور روحانی سفر میں محسن کاکوروی والے مضمون کی ایک اور اہمیت یہ بھی ہے کہ اس مضمون میں پیرویِ مغربی کا ذکر پہلی بار مخالفت کے جس انداز میں ہوا ہے وہ بھی مغرب کے حوالے سے نفی سے اثبات کی طرف بڑھنے کا ایک اشاریہ ہے۔ نفی مغربی تصورِ روایت کی اور اثبات مشرقی مابعدالطبیعیاتی تصورِ روایت کا جو انھوں نے آگے چل کر رینے گینوں کے زیرِاثر آنے کے بعد کیا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ عسکری صاحب نے اپنے تخلیقی شعور کو جن بڑے بڑے سوالات کی تفتیش کے لیے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے زندگی بھر وقف کیے رکھا، ان میں ایک بنیادی سوال پیرویِ مغربی کا بھی تھا۔ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے انھوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ لگا دیا لیکن جب وہ ایک طویل سفر کے بعد مغرب کی تہ میں ڈوب کر ابھرے تو ان کے ہاتھ خالی تھے۔ یہیں سے ان کے سفر کا رُخ رینے گینوں اور ابنِ عربی جیسے لوگوں کی رہنمائی میں مشرق کی طرف ہوگیا۔ یا بہ قولِ سلیم احمد یوں کہیے کہ وہ گھوم پھر کر واپس وہیں آگئے جہاں سے چلے تھے۔ جو لوگ ان کی تخلیقی واردات کی نوعیت اور سفر کی سمت و جہت کو سمجھے بغیر ان پر رنگ بدلنے کا الزام لگاتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ اگر ان کی آخری منزل کا سراغ پہلے ہی سے خود ان کی اپنی روح کے اندر موجود نہ ہوتا تو اس تک پہنچنا ان کے لیے کسی طرح ممکن نہ تھا۔ سلیم احمد نے اپنی کتاب میں ان کے پورے سفر کی مختلف منزلوں کا جائزہ ان کے بنیادی سوالات کی روشنی میں بڑی بصیرت کے ساتھ لیتے ہوئے ان کے دائرۂ سفر کو مکمل کرکے دکھانے کے ساتھ ساتھ اس کی معنویت کے منتشر اجزا کو بھی ایک ہی رشتے میں پرو کر دکھا دیا ہے۔ ان کے تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ عسکری صاحب جس چیز کی تلاش میں پورے مغرب کی خاک چھان رہے تھے، وہ بالآخر انھیں ملی تو مغرب کی بجائے مشرق ہی میں محسن کاکوروی کے ہاں آکر ملی۔ عسکری صاحب اس سے

پہلے انسان کی تلاش کسی ماورائی تصور کے بغیر صرف و محض انسانی سطح پر کر رہے تھے۔ محسن کاکوروی کے ہاں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں جس نئے تصورِ انسان سے دوچار ہوئے وہ اپنی ماورائی جہت کے ساتھ مغربی ادبیات اور فلسفہ و فکر کے تصورِ انسان کی طرح ادھورا اور یک رُخا نہیں بلکہ انسانِ کامل تھا۔ یہی تصورِ انسان انھیں بعد میں روایتی اسلام کی طرف لے گیا جو ان کی زندگی اور فکر میں ایک بڑے انقلاب کا باعث بنا۔

ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ عسکری صاحب کا ذہنی اور روحانی سفر اپنے نقطۂ آغاز میں نفی سے شروع ہو کر اثبات کی طرف بڑھتا ہوا ایک تسلسل کے ساتھ اپنے ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اور بالآخر اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں ان کے متجسس ذہن اور بے قرار روح کو اپنے سوال کا حتمی جواب مل جاتا ہے۔ چناں چہ عسکری صاحب کو سمجھنے کے لیے ان کے ذہنی اور روحانی سفر کے اس تسلسل کو سمجھنا بہت ضروری ہے جو ''گھٹلیوں کے دام'' اور ''انسان اور آدمی'' سے لے کر ''آدمی اور انسان'' تک اور وہاں سے لے کر ان کے سفر کی اس آخری منزل تک بغیر رُکے جاری رہتا ہے جہاں پہنچ کر ان کے ہاں اس مرکزی روایت کا شعور پوری طرح واضح اور روشن ہو جاتا ہے جس کے نشانات ان کے ہاں ان کے سفر کی ابتدائی منزل میں قدرے دُھندلے اور غیر واضح تھے۔ اور جس کا رشتہ ہمارے ادب اور تہذیبی زندگی کے دوسرے مظاہر سے کوئی سو سوا سو برس پہلے ٹوٹ چکا تھا۔ عسکری صاحب کے اس سفر میں ایک موڑ ایسا تو ضرور آتا ہے جہاں سے ان کے سفر کا رخ مغرب کی بجائے مشرق کی طرف ہو جاتا ہے۔ لیکن رُخ کے بدلنے سے نہ تو ان کے سفر ہی میں کوئی رخنہ پڑتا ہے اور نہ ہی اس کی نوعیت اور معنویت تبدیل ہوتی ہے۔ وہ مغرب کا راستہ چھوڑ کر مشرق کے راستے پر تو ضرور آ جاتے ہیں مگر جس حقیقت کی تلاش میں وہ مغرب کی خاک چھان رہے تھے اس کی تلاش مشرق میں بھی جاری رہتی ہے تا آں کہ وہ مشرق کی قدیم ترین روح میں ڈوب کر اس مابعدالطبیعیاتی تصورِ حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں جو ہماری تہذیبی زندگی کا اصل سرچشمہ بھی ہے اور ہماری ادبی روایت کا مرکزی حوالہ بھی۔ شاید وہ اردو ادب کو دوبارہ اس تصورِ حقیقت کی روشنی میں لانے کے لیے ہمارے ادبی افق پر ایک روشن ستارے کی طرح ابھرے تھے۔ حاصلِ کلام یہ کہ سفر بھی وہی، مسافر بھی وہی اور منزلِ مقصود بھی وہی۔ تو پھر صرف ایک رخ کے بدل جانے سے یہ کیسے لازم آیا کہ ایک مسافر کے دو ٹکڑے کر کے اسے دو حصوں میں بانٹ دیا جائے یا ایک مسافر کے دو مسافر بنا لیے جائیں۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں سے ایک کام عسکری صاحب کے قدرشناس اور ذہین ترین شاگرد سلیم احمد نے اور دوسرا اُن کے نہایت عزیز اور قریبی دوست ڈاکٹر آفتاب احمد نے انجام دیا۔ سلیم احمد نے ان کے فکری سفر کو دو ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے ایک دور کو اس عسکری سے منسوب کیا جو اپنی نصف زندگی میں پیرویِ مغربی کے سب سے بڑے مبلّغ کی حیثیت سے جانا گیا اور دوسرے دور کو اس عسکری سے جو مغرب کو رد کر کے مشرق کی قدیم ترین روح میں اُتر گیا۔ یہ بات بنیادی

طور پر کچھ ایسی غلط نہ سہی مگر غیر محتاط اندازِ بیاں کی وجہ سے عسکری صاحب کو غلط طور پر سمجھنے کی بنیاد ہمیں سے پڑ گئی۔ یوں بھی عسکری صاحب کے سفر کی مختلف منزلوں کو ایک ہی رشتے میں پرو کر دیکھنے اور شروع سے لے کر آخر تک ان کے دائرۂ سفر کو مکمل کر کے دکھانے کے بعد سلیم احمد جیسے آدمی کا انھیں یوں ٹکڑوں میں بانٹ کر دیکھنا گویا آپ اپنی تردید کرنے کے برابر تھا۔ ادھر ڈاکٹر آفتاب احمد نے اپنی کتاب "محمد حسن عسکری، ایک مطالعہ" میں کمال یہ کیا کہ ایک عسکری کے دو عسکری بنا ڈالے بلکہ ایک عسکری کے اندر سے دوسرے عسکری کو جنم لیتے ہوئے بھی دکھایا۔ ڈاکٹر صاحب نے محمد حسن عسکری کی جذباتی زندگی میں ناکامی کے ایک صدمے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ:

> وہ اس صدمے سے ابھی پوری طرح سنبھلے نہ تھے کہ... مارشل لا نے ان کا سب سے بڑا اثاثہ یعنی ان کا قلم چھین لیا۔ اور یوں وہ اپنی شخصیت کے سب سے قوی تقاضے کی تسکین یعنی اظہار سے محروم ہو گئے... (اور) جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، وہ ایک قسم کے مراقبے میں چلے گئے۔ اور آخرکار ان کی درماندگیِ شوق انھیں اسلام کی دینی اور متصوفانہ فکر کی راہ پر لے آئی جس میں اظہار پر کوئی پابندی اور قدغن نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ ڈیڑھ دو برس کے مراقبے کے بعد جب عسکری ایک نئے ماہنامے "ساتھ رنگ" کے صفحات پر طلوع ہوئے تو وہ ایک دوسرے عسکری تھے۔
>
> ("محمد حسن عسکری، ایک مطالعہ"، صفحہ ۵۳)

ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ "اب یہ سوال کہ دوسرے عسکری کو جنم دینے میں کون سے عوامل کارفرما تھے، ایک گونہ اہمیت تو رکھتا ہے مگر اس کا کوئی حتمی جواب مہیا کرنا آسان نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے ایک عسکری کے بطن سے دوسرے عسکری کی پیدائش کے مفروضے کی بنیاد اظہار پر مارشل لا کی پابندیوں کے سبب اختیار کردہ ڈیڑھ دو سال کے مراقبے پر رکھی ہے۔ ان کے بہ قول ڈیڑھ دو سال کے اس مراقبے کے بعد دوسرا عسکری اسلام کی دینی اور متصوفانہ فکر کے ساتھ "ساتھ رنگ" کے صفحات پر طلوع ہوا۔ یہ بات اگر صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عسکری صاحب نے اکتوبر ۵۸ء سے لے کر کم و بیش اکتوبر ۶۰ء تک اپنے قلم کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو اگر عسکری صاحب کے مضامین کی تاریخوں کا ذرا بھی صحیح علم ہوتا تو وہ ایسی بات ہرگز نہ لکھتے۔ اس لیے کہ ۵۸ء میں ان کا "رومال کی زنجیر" جیسا معرکہ آرا طویل مضمون آیا تھا۔ ۵۹ء میں ان کے کم از کم دو مضامین "حکایتِ نَے" اور "محسن کاکوروی" کے عنوان کے ساتھ آئے۔ پھر اگلے سال بھی وہ اکتوبر ۶۰ء سے پہلے پہلے اپنے "ساتھ رنگ" والے کئی مضامین قلم بند کر چکے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ ان مضامین سے تو ڈیڑھ دو سال کے مراقبے کی کھلی تردید ہو رہی ہے۔ جب کہ آگے چل کر چھ سال کا طویل مراقبہ ان کے مضمون "روایت

کیا ہے" (۶۳ء) اور "اردو کی ادبی روایت کیا ہے" (۶۸ء) کے درمیان ہے۔ پھر اس کے بعد کوئی آٹھ سال کا اس سے بھی طویل مراقبہ "مغرب میں مسلمانوں کے تبلیغی وفود" (۶۹ء) اور "وقت کی راگنی" (۷۷ء) کے درمیان ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب اتنے طول طویل مراقبوں کی کیا توجیہ فرمائیں گے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ اب ان کے اظہار پر کوئی پابندی یا قدغن بھی نہیں۔ پھر چھ چھ آٹھ آٹھ سال کے ان طول طویل وقفوں کے دوران انھیں اپنی شخصیت کے سب سے قوی تقاضے کی تسکین سے کس نے محروم رکھا؟ ڈاکٹر صاحب نے اگر اس سوال پر بھی غور فرمایا ہوتا تو وہ ایک عسکری کے دو عسکری نہ بناتے۔ اور اگر بنانا ایسا ہی ضروری تھا تو کم از کم تین چار عسکری ضرور بناتے تاکہ مراقبوں کا حساب بھی ٹھیک بیٹھ سکتا۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب ایک طرف تو عسکری صاحب کے اسلام کی دینی اور متصوفانہ فکر کی طرف آنے کی توجیہ مارشل لا کے تحت اظہار پر لگنے والی پابندیوں سے کرتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

> ان کے دل میں اشیا کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی بے اندازہ طلب تھی۔ چناں چہ وہ لکھنوی شاعری کا مطالعہ کرتے کرتے مسلمانوں کی تہذیب میں حواسِ خمسہ کی دنیا اور تمثیلات کا جائزہ لینے لگے اور اس سلسلے میں پہلے قرآن سے رجوع کیا پھر اس کی تفسیر کے لیے ابنِ عربی اور "فصوص الحکم" تک پہنچے... علم اور ذہنی زندگی سے اس قسم کا لگاؤ اور انہماک میں نے اپنے جاننے والوں میں بہت کم دیکھا ہے۔
>
> ("محمد حسن عسکری، ایک مطالعہ"، صفحہ ۴۱)

اب اگر لکھنوی شاعری کا مطالعہ ہی عسکری صاحب کو قرآن، ابنِ عربی اور "فصوص الحکم" جیسی تصوف کی کتابوں تک لے جانے کے لیے کافی تھا تو اسلام کی دینی اور متصوفانہ فکر تک پہنچنے کے لیے اظہار پر مارشل لائی پابندیوں والی توجیہ کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے شاید اس بات پر بھی غور نہیں فرمایا۔

بہرحال مقصود ان باتوں سے یہ ہے کہ جب سلیم احمد اور ڈاکٹر آفتاب احمد جیسے عسکری شناسوں سے بھی ان کو سمجھنے میں اس قسم کی لغزشیں سرزد ہوں تو پھر ہم جیسے دوسرے کم فہم تو انھیں جتنا بھی غلط سمجھیں کم ہے۔ اس قسم کی غلط فہمیوں کی ایک مثال یہ ہے کہ بعض لوگ عسکری صاحب کے حوالے سے ردِّ مغرب کی بات اس طرح کرتے ہیں جیسے ایک دن بیٹھے بٹھائے اچانک انھیں الہام ہوا تو انھوں نے مغرب کی بساط لپیٹ کر ایک طرف رکھ دی اور مشرق کا مصلّٰے بچھا کر بیٹھ گئے۔ جب کہ مغرب سے مشرق کی طرف ان کی واپسی اچانک نہیں بلکہ طویل غور وفکر اور تفکر وتدبر کا نتیجہ تھی۔ وہ مغربیت کی راہ کے ایک

تیز رو مسافر تو ضرور تھے مگر اس سفر میں وہ اپنے سوالات کا تعاقب کرتے کرتے اور اپنے عہد کے بعض رجحانات سے لڑتے لڑتے مغرب کی روح میں اتر گئے۔ اور اتنے گہرے اترے کہ مغربی تہذیب کی ساری حقیقت کھل کر ان کے سامنے آگئی اور کیوں نہ آتی جب کہ وہ مغرب کے بارے میں بنیادی نتائج پر پہلے ہی ۱۹۴۳ء میں اس وقت پہنچ چکے تھے جب ''جزیرے'' کا اختتامیہ لکھتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

> ہم نے مغربی شعور کو بغیر ناقدانہ نظر ڈالے کلیتاً قبول کر لیا ہے بلکہ اپنے آپ کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے اور مغربی شعور بھی وہ جو انحطاط پذیر ہے۔ یہ یقیناً روحانی بے چارگی کے مترادف ہے... جب ہم نے مغربی شعور کو قبول کیا تو واقعی ہم نے ایک قدم آگے بڑھایا تھا۔ مگر اب یہ شعور خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ رہا ہے۔ خود مغرب ایک نئے شعور کے لیے مضطرب ہے۔ مغربی ادب کی حالت دیکھتے ہوئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ اگر یہ نیا شعور کوئی فراہم کر سکتا ہے تو چین یا ہندوستان۔

اس سے ظاہر ہے کہ رینے گینوں کے زیر اثر آنے کے بعد عسکری صاحب نے مغرب کے بارے میں جس ردعمل کا اظہار کیا، وہ کسی بھی طرح ان کے اس اولین تاثر سے مختلف نہیں تھا۔ پھر اپنے سفر کے درمیانی مراحل میں بھی وہ مغربی تہذیب کی عقلیت پرستی، افادیت پرستی، فطرت پرستی، اس کی لادینیت، آزاد خیالی اور انسان پرستانہ تصورات پر مختلف حوالوں سے تنقید کرتے رہے۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد مغرب خدا اور مذہب کے تصورات کو خیر باد کہہ کر تشکیک اور لادینیت کی جس راہ پر چلا اس کے نقصانات جدید فن کاروں کے ردعمل میں دکھاتے رہے، مثلاً ایک جگہ لکھا کہ:

> مارلو کا شیطان تک اعتراف کرتا ہے کہ خدا سے چھٹ جانا دوزخ کے عذابوں سے بھی شدید تر عذاب ہے۔
>
> (''انسان اور آدمی''، صفحہ ۶۷-۶۸)

ایک اور جگہ ژولیاں باندا کی کتاب ''عالموں کی غداری'' کے حوالے سے بتایا کہ اس کے نزدیک متوازن سماجی نظام کے لیے چند قطعی غیر مادّی اقدار کا غیر مشروط طور پر ماننا ضروری ہے۔ پھر نشاۃ ثانیہ کے بعد سے جس طرح غیر مادّی اقدار ختم ہوئیں اور طبیعتوں پر مادّیت غالب آتی چلی گئی اس کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ:

> اس مادّیت نے بڑے خوب صورت نقاب اوڑھے... عقلیت پرستی بنی، فطرت پرستی بنی، ترقی پسندی بنی، آمریت بنی، جمہوریت بنی، افادیت اور اضافیت کا قالب اختیار کیا، اکتسابیت اور تجرباتیت کا روپ دھارا۔ اس مادّیت کی بنیاد پر جو سیاست تعمیر ہوئی وہ تو ہونا ہی چاہیے تھی، نورٌ علیٰ نور۔ غضب یہ ہوا کہ ادیبوں

> اور مفکروں نے بھی غیر مادّی اقدار کی دُھن چھوڑ کر اسی مادّیت کے آگے سر جھکا دیا۔ محض تجرباتی اور اضافی فلسفے اور سیاست کو ادیبوں کا تخیل مل جائے تو پھر انسانیت کی تباہی کے لیے کسی اور سامان کی ضرورت نہیں۔
>
> ("جھلکیاں"، مارچ ۳۹ء)

حتیٰ کہ "پیروی مغربی کا انجام" میں انھوں نے صاف کہہ دیا کہ "مغرب کی پیروی کرنا بالکل کوونڈا یا حمامِ بادگرد کی خبر لانے کے برابر ہے۔" غرض یہ کہ "جھلکیاں" سے لے کر "انسان اور آدمی" تک اور "انسان اور آدمی" سے لے کر "ستارہ یا بادبان" تک ان کی ہر کتاب میں مغرب کے بارے میں ان کا جو ردِعمل ملتا ہے وہ ان کے اسی اوّلین تاثر کی بازگشت ہے جس کا اظہار "جزیرے" کے اختتامیہ میں ہوا ہے۔ اس کے بعد اپنے سفر کے آخری مراحل میں وہ مشرق و مغرب کے جس بنیادی فرق پر زور دیتے رہے اور مشرق کے تہذیبی تصورات سے مغرب کے تہذیبی تصورات کا موازنہ کرکے جس طرح مشرق کی تہذیبی برتری کو ثابت کرتے رہے، یہ ساری باتیں بھی وہ "جزیرے" کے اختتامیہ میں اجمالاً پہلے ہی بیان کر چکے تھے۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ ان کی پوری آگاہی انھیں رینے گینوں کے زیرِاثر آنے کے بعد اور انھی کے ذریعے حاصل ہوئی۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بہ قولِ سلیم احمد اگر عسکری صاحب کے ابتدائی سفر کو پیشِ نظر رکھا جائے تو رینے گینوں کی دریافت بھی عسکری صاحب کی خود آگہی ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے رینے گینوں میں جو کچھ دریافت کیا اس کا بیج خود ان کے اندر پہلے سے موجود تھا۔

عسکری صاحب کے بارے میں ایک بڑی غلط فہمی یہ بھی ہے کہ وہ مغرب کو رد کرنا چاہتے ہیں۔ افسوس کہ یہ غلط فہمی بھی سلیم احمد ہی کی پھیلائی ہوئی ہے جسے عسکری پر ان کی کتاب کے دیباچہ نگار نظیر صدیقی نے یہ کہہ کر مستحکم کر دیا کہ:

> ہماری قوم میں اقبال کے بعد عسکری دوسرے شخص ہیں جنھوں نے مغرب سے حد درجہ مستفید ہونے کے باوجود مغرب کو رد کر دیا... اس اعلان میں مغرب سے پرہیز کی تلقین بھی پوشیدہ ہے۔

اچھا، اگر یہ بات درست ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا مغرب کو رد کرنے کا مطلب مغرب سے بے خبر رہنا ہے؟ کیوں کہ مغرب کو رد کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مغرب سے واقف ہوئے بغیر، اسے جانے بوجھے بغیر رد کر دیا جائے۔ سرسیّد کے زمانے میں جب پیرویِ مغربی کی تحریک شروع ہوئی تو بالعموم یہی رویّہ عام مسلمانوں کا اور بالخصوص ان علمائے کرام کا تھا جو مغرب کی کسی بھی چیز کو قبول کرنا نہیں چاہتے تھے یعنی اسے بغیر جانے بوجھے رد کرتے تھے۔ اس صورت میں مغرب کو رد کرنے کا مطلب تھا مغرب سے بے خبر رہتے ہوئے بے تعلقی کا رویّہ اختیار کرنا۔ اب عسکری صاحب کے حوالے سے مغرب کو رد

کرنے کی بات ایک حد تک اس اعتبار سے تو درست ہوسکتی ہے کہ محسن کاکوروی کے ہاں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی صورت میں ایک نئے تصورِ انسان سے دوچار ہونے کے بعد انھوں نے مغرب کی اس ذہنیت کو مسترد کر دیا جو انسانی مسائل کا حل صرف و محض انسانی سطح پر ہی ڈھونڈنا چاہتی ہے۔ جو بھانت بھانت کے باہم متخالف اور متضاد تنقیدی اور فکری نظریات کے پریشان کن سلسلے کے حوالے سے اپنے فکری انتشار کو دور کرنے کے لیے کسی مرکزی، آفاقی اور مابعدالطبیعیاتی روایت سے وابستہ ہوکر اپنے افکار و نظریات میں وحدت پیدا کرنے سے گریزاں ہے۔ لیکن نظیر صدیقی جیسے لوگوں کی طرح عسکری صاحب کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ مغرب کو رد کرکے ہمیں مغرب سے بے خبر رہنے یا مغرب سے پرہیز کرنے کی تلقین کرتے ہیں، کسی طرح بھی درست نہیں۔ اس لیے کہ عسکری صاحب کے ہاں مغرب کو رد کرنے کا مطلب مغرب سے بے خبر رہنا یا بے تعلق ہوجانا نہیں بلکہ اس کا مطلب ہے مغرب کو اپنے اندر جذب کرکے اس سے اوپر اٹھنا یا آگے جانا۔ یہ کم و بیش وہی بات ہے جو عسکری صاحب نے اپنے مضمون "اردو ادب میں مشرق و مغرب کی آویزش" کے آخر میں لارنس کے حوالے سے کہی تھی۔ اس مضمون میں عسکری صاحب کے سامنے جو تین بنیادی سوال زیرِ غور تھے، یہ ہیں:

(۱) موجودہ صورتِ حال کی روشنی میں کیا ہمارے لیے مشرق کو قائم رکھنا اور مشرقی ادب پیدا کرنا ممکن ہے؟

(۲) کیا ہمارے لیے پوری طرح مغربی بن جانا اور مغرب جیسا ادب پیدا کرنا ممکن ہے؟

(۳) اگر یہ دونوں باتیں ممکن نہیں تو کیا ادب (اور زندگی دونوں) میں مشرق اور مغرب کے امتزاج کی کوئی صورت ممکن ہے؟

عسکری صاحب نے ان تینوں سوالوں کا جواب نفی میں دیتے ہوئے مشرق، مغرب اور امتزاج کے تینوں راستے بند کر دینے کے بعد آخر میں مضمون کا اختتام اس بات پر کیا تھا کہ:

> چلیے، تیسرا راستہ بھی بند ہوگیا۔ مشرق کے لیے ایک چوتھی چیز لارنس نے تجویز کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ مشرق کے لیے نئی زندگی حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے، یہ کہ مشرق پہلے مغرب کو اپنے اندر جذب کرے اور پھر اپنا راستہ خود ڈھونڈے۔

مگر سلیم احمد نے عسکری صاحب پر اپنی کتاب کے نویں باب میں اس مضمون کے بارے میں کہنے کی ساری باتیں کہنے کے باوجود اسی بات کو نظرانداز کر دیا جو مسئلۂ زیرِ بحث کا حاصل تھی۔ اور نتیجہ ساری بات کا یہ نکالا کہ عسکری صاحب ہماری عافیت کے قلعے پر حملہ کرکے ہمیں نہتا چھوڑ دیتے ہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ:

یا اللہ! پھر کیا کریں؟

سلیم احمد کہتے ہیں کہ میں نے عسکری صاحب سے یہ سوال ان کی زندگی ہی میں پوچھا تھا، زبانی بھی اور تحریری بھی۔ تحریری کا تو جواب نہیں ملا۔ زبانی کے جواب میں فرمایا، ''نماز پڑھو۔'' اب سلیم احمد، عسکری صاحب کے ایسے ناخلف شاگرد تو نہیں تھے کہ ان کے حکم کی تعمیل نہ کرتے۔ لہٰذا گمان غالب یہی ہے کہ اس مسئلے میں ان کا شرحِ صدر اپنے استادِ محترم کی تعمیلِ ارشاد کے بعد ہی ہوا ہوگا۔ چناں چہ بعد میں انھوں نے اپنے خیال کی تصحیح کرتے ہوئے ایک اخباری کالم میں لکھا کہ:

> محمد حسن عسکری کے بارے میں یہ غلط فہمی ہے کہ وہ مغرب کو کلیۃً رد کرنا چاہتے ہیں۔ دراصل اس جملے میں جو چیز غلط ہے وہ رد کرنے کا تصور ہے۔ رد کرنے کے معنی یہ نہیں کہ مغرب کو چھوڑ کر مشرق کی طرف لوٹا جائے یا حال کو چھوڑ کر ماضی کی کسی صورتِ حال کی طرف پلٹا جائے۔ عسکری صاحب کے یہاں رد کرنے کا مطلب ہے مغرب کو اپنے اندر جذب کر کے مغرب سے اوپر اٹھنا۔ یہ کسی ماضی کے مشرق کو دوہرانے کا مسئلہ نہیں بلکہ مغرب کو اپنے اندر جذب کر کے مشرق کی تخلیقِ نو کا مسئلہ ہے۔ عسکری صاحب ہم سے یہ نہیں کہتے کہ ہم مغرب کو چھوڑ کر مشرق کی طرف لوٹیں یا حال کو چھوڑ کر ماضی کی طرف پلٹیں۔ ان کا کہنا صرف یہ ہے کہ ہم اپنے ماضی و حال کا صحیح شعور پیدا کر کے ایک نئے مستقبل کی تعمیر کریں۔ وہ مستقبل جو مرگ آمادہ مغرب سے آگے جا کر ہی ہمیں مل سکتا ہے۔ عسکری صاحب اس نتیجے پر اس لیے پہنچے کہ وہ مغرب کو اپنے اندر جذب کر چکے تھے اور مغرب کو اپنے اندر جذب کر کے مغرب سے آگے جانا چاہتے تھے۔ میرے نزدیک اس طریقِ کار کا بہترین نمونہ وہ خود تھے۔ انھوں نے مغرب کی جو تنقید کی اور مشرق میں انھیں جو معنویت نظر آئی وہ مغرب سے ان کی واقفیت کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ عسکری صاحب مغرب سے آگے گئے تو مغرب میں ڈوب کر۔ یوں بھی مغرب سے بے خبر رہنا اوّل تو آج ہمارے لیے ممکن ہی نہیں کیوں کہ مغرب بہرحال ہمارے اندر داخل ہو چکا ہے۔ چناں چہ مغرب کو سمجھنا ہے تو ہمیں مغرب کے اندر غوطہ مارنا ہی پڑے گا۔ اس کے بغیر نہ تو ہم محمد حسن عسکری کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی موجودہ صورتِ حال کو۔
>
> (سلیم احمد کے ایک کالم کی تلخیص)

یوں تو عسکری صاحب کے تمام ہی مضامین ایسے ہیں جو اردو تنقید میں ''چیزے دگر'' کا درجہ رکھتے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ وہ مضامین جو انھوں نے رینے گینوں کے زیر اثر آنے کے بعد لکھے،

انھیں تو اردو تنقید کا معجزہ ہی سمجھنا چاہیے۔ صرف ادبی نقطۂ نظر سے نہیں، مذہبی، تہذیبی، اخلاقی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے بھی۔ اوّل تو ان کا یہ کارنامہ ہی کچھ کم اہم نہیں کہ انھوں نے مغرب کے مروّجہ تصورِ روایت کی تصحیح کر کے ہمیں روایت کے صحیح تصور سے آشنا کیا اور بتایا کہ ہر ادب کی بنیاد حقیقت کے ایک خاص تصور پر ہوتی ہے اور تمام اسالیبِ بیان اسی بنیادی تصور سے نکلتے ہیں۔ اس تصور سے الگ ہونے کے بعد ان میں جان باقی نہیں رہتی۔ پھر مشرق و مغرب کے ادب کے فرق پر بھی انھوں نے اسی زاویے سے روشنی ڈالی اور اس ضمن میں ایسی ایسی بصیرت افروز باتیں کیں کہ اگر اردو کے ادیب صرف انھی باتوں کو سمجھ لیتے تو ہمارے ادب کے دن پھر جاتے، مثلاً اگر کوئی پوچھے کہ کیا ہمارا شعر و ادب کچھ ایسی خصوصیات کا حامل ہے جنھیں پڑھ کر وہ لوگ بھی جو ہمارے کلچر سے واقف نہ ہوں، یہ اندازہ لگا سکیں کہ ہمارا کلچر کیا ہے، اس کے بنیادی تصورات اور خدوخال کیا ہیں اور کس قسم کے ہیں تو شاید ہمارے پاس اس کا کوئی واضح جواب نہ ہو۔ مگر عسکری صاحب نے رسم الخط پر اپنے بے مثال مضمون میں بتایا کہ شعر و ادب تو شعر و ادب، ہمارے تو حرفِ عطف میں بھی ہماری بنیادی مابعد الطبیعیات چھپی ہوئی ہے۔ لیکن ایسی باتوں سے نہ تو ہمارے ادیبوں کو کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی وہ ان پر غور کرنا ضروری سمجھتے ہیں، ورنہ عسکری صاحب کے صرف اسی ایک مضمون میں اتنی حیرت انگیز اور جوہری باتیں موجود ہیں کہ ان پر تفصیلی کام کر کے کتابوں کی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، مثلاً ان کا یہ خیال کیا کچھ کم اہمیت کا حامل ہے کہ ہمارا رسم الخط طوافِ کعبہ کی علامت ہے۔

دراصل عسکری صاحب کا المیہ یہ ہے کہ انھیں نقاد بھی ملے تو ان گنوں کے جو اُن کی سیدھی بات بھی ٹھیک سے نہیں سمجھ پاتے۔ کہو آم کی تو سنتے ہیں املی کی۔ ایسے ہی ایک نقاد ہمارے مرحوم دوست شہزاد منظر بھی ہیں جو خیر سے عسکری صاحب پر ایک کتاب کے مصنف بھی ہیں۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۹۹۰ء میں لکھی تھی اور دیباچہ لکھوایا تھا نظیر صدیقی سے۔ بدقسمتی سے کتاب تو لاہور کا ایک بے رحم ناشر ایسا دبا کر بیٹھا کہ آج تک چھپ کر نہ آ سکی مگر نظیر صدیقی نے اپنی محنت کو رائگاں نہ جانے دیا اور سات سال کے طویل اور صبر آزما انتظار کی زحمت کھینچنے کے بعد بالآخر اپنا دیباچہ کتاب کے بغیر ہی چھپوا کر دم لیا۔ ہاں تو ذکر تھا شہزاد منظر کا۔ عسکری صاحب نے روایتی نقطۂ نظر سے کسی ادب پارے کی قدر و قیمت کو جانچنے کا ایک تنقیدی معیار شاہ وہاج الدین کے ہاں سے پیش کیا تھا۔ شہزاد منظر اس تنقیدی معیار کو تخلیق کا نسخہ سمجھ بیٹھے اور دُہائی دینے لگے کہ عسکری صاحب اپنے مضمون ''روایت کیا ہے'' (مشمولہ ''وقت کی راگنی'') میں، ''شاہ وہاج الدین کے ادبی نظریے کی بنیاد پر ادب تخلیق کرنے کی تلقین کرتے ہیں'' (''اردو تنقید کے پچاس سال'' از شہزاد منظر، ص ۱۷۱) بلکہ یہاں تک کہتے ہیں کہ، ''شاہ وہاج الدین کے نسخے پر عمل کیا گیا تو دنیا کا عظیم ترین ادب تخلیق ہو سکتا ہے'' (''عسکری کا تصورِ روایت اور ادب'' از شہزاد منظر، مطبوعہ مکالمہ ۲ کراچی)۔ چوں کہ شہزاد منظر نے اس مضمون کی نشان دہی بھی ساتھ ہی کر دی ہے جس میں

عسکری صاحب نے یہ بات کہی ہے اس لیے جس کا جی چاہے یہ مضمون پڑھ کر دیکھ لے اور شہزاد منظر کی سوجھ بوجھ کا حال معلوم کر لے جو عسکری صاحب پر الزام تراشی کے جوش میں یہ بھی یاد نہ رکھ سکے کہ ان کے نزدیک غیر روایتی معاشرے میں روایتی ادب کی تخلیق ہی ممکن نہیں۔

اسی طرح عسکری صاحب نے ایک جگہ کہا تھا کہ مغربی ادب کو سمجھنے کے لیے بھی مولانا اشرف علی تھانوی کی کتابوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ یہ بات بہت سے حضرات کو گراں گزرے گی۔ سو ان کا خیال درست ہی نکلا۔ بہر حال اس بات پر لوگ چیں بر جبیں تو بہت ہوئے بلکہ بعض نے تو اس بات کو مضحکہ خیز ہی قرار دے دیا۔ مگر کسی نے یہ سمجھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ عسکری صاحب نے اپنے دعوے کی تائید میں جو مثال ازمنۂ وسطیٰ کی شاعری سے پیش کی ہے اس کا تعلق تصوف کے اس مسئلے سے ہے کہ عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی میں کیسے تبدیل کیا جائے؟ اب چوں کہ عسکری صاحب یہ وضاحت بھی پہلے ہی کر چکے تھے کہ جن کتابوں کی مدد سے مغرب کے روایتی فکر و ادب کو سمجھا جا سکتا تھا وہ آج کل مغرب میں نایاب ہیں۔ اس لیے ایسے مسائل کے حل کے لیے مولانا اشرف علی تھانوی کی کتابوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ یہ ایک صاف اور سیدھی سی بات تھی مگر اسے مضحکہ خیز قرار دینے والوں کو نہ تو یہ ثابت کرنے کی توفیق ہو سکی کہ مسئلۂ مذکورہ کا حل مولانا اشرف علی تھانوی کی کتابوں میں نہیں مل سکتا۔ اور نہ یہ بتانے کی کہ اگر ملتا ہے تو پھر ان کے پاس عسکری صاحب کی بات کو مضحکہ خیز قرار دینے کی وجہ کیا ہے؟

عسکری صاحب کے بارے میں ایک بات ان کے معترضین کی جانب سے بار بار یہ بھی کہی گئی ہے کہ وہ اردو کے ادیب اور نقاد تھے مگر آخر میں مذہب اور دینیات کے ہو کر رہ گئے۔ اور کہنے والوں کا انداز کچھ ایسا ہوتا ہے کہ جیسے اس سے پہلے عسکری صاحب کا مذہب سے کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ اب اوّل تو یہ بات اس شخص کے بارے میں کہی گئی ہے جس نے ایک زمانے میں اسلامی ادب کی بحث اٹھا کر پاکستان سے لے کر ہندوستان تک پوری ادبی دنیا میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی۔ دوسرے اسی بات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عسکری صاحب کے ان معترضین کو تو اتنی بھی خبر نہیں کہ ان کی تحریروں میں ''سات رنگ'' والے مضامین سے پہلے اس بات کی وافر شہادت موجود ہے کہ مذہب سے ان کی وابستگی شروع ہی سے کوئی ایسی ویسی نہیں بلکہ بنیادی نوعیت کی حامل رہی ہے۔ ان کے مضامین میں ''فن برائے فن''، ''انسان اور آدمی''، ''ہمارا ادبی شعور اور مسلمان''، ''اسلامی فنِ تعمیر کی روح''، ''محسن کاکوروی'' اور ''رواؤ'' جیسے مضامین کے علاوہ ''ساقی'' کی بعض ''جھلکیاں'' بھی اسی نوع کی تحریروں میں شامل ہیں، مثلاً اپنے مضمون ''انسان اور آدمی'' کے آخر میں انھوں نے اسلام کے تصور انسان کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

اسلامی کردار کی تخلیق بیسویں صدی کی انسانی تہذیب میں ایک انقلابی واقعہ

ہوگا۔ یہ بات ہمارے لیے ایک اور لحاظ سے بھی اہم ہے۔ دوسری قومیں شاید اپنا تصور حیات چھوڑ کر بھی بُری بھلی طرح زندہ رہ سکتی ہیں۔ لیکن ہمارا تصورِحیات اتنا واضح، معین اور غیر مبہم ہے کہ مسلمان صرف اپنے تصورحیات پر عمل کرکے ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کے بغیر مسلمان کی زندگی ناممکن ہے۔ ہماری قومی زندگی کی نشوونما اسی تصورحیات سے وابستہ ہے۔ اور ہمارے ادب میں بھی صرف اسی طریقے سے جان آسکتی ہے ورنہ یہ اسی طرح بے اثری اور ناتوانی کی خلاؤں میں ٹاک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔

(''انسان اور آدمی''، صفحہ ۵۴)

اسی طرح اپنے مضمون 'فن برائے فن'' میں لکھا کہ:

ادب میں عالم گیر تشکیک کے عمل کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اپنی تفتیش کا آغاز نشاۃِ ثانیہ کے دور سے کرنا پڑے گا جب مختلف اثرات کے ماتحت کلیسا بلکہ مذہب سے بے اطمینانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ مذہب کی حقانیت یا ضرورت آپ کے نزدیک مسلّم ہو یا نہ ہو، ایک بات ماننی پڑتی ہے کہ عام آدمی کو مذہب دو چار بڑے اذیت ناک مسائل سے محفوظ رکھتا ہے، مثلاً ایک سوال ہے کائنات میں شر کے وجود کا، دوسرا سوال ہے انفرادی بقا کا اور تیسرا معاملہ ہے عالمِ موجودات میں انسان کی حیثیت کا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ مذہب ان مسئلوں کو دو اور دو چار کی طرح حل کردیتا ہے یا مذہب پر ایمان لانے کے بعد آدمی کو اس قسم کی کوئی تشویش ہوتی ہی نہیں۔ لیکن اتنی بات ہے کہ مذہب میں آپ کو لازمی طور سے دو چار باتوں پر اگر مگر کیے بغیر ایمان لانا پڑتا ہے اور ان بنیادی مفروضات کو مان لینے کے بعد ایک ایسا منطقی نظام مرتب ہوجاتا ہے جو ایک عام آدمی کے روحانی مسائل کو تشفی بخش طریقے سے حل کردیتا ہے۔ لیکن ان بنیادی مفروضات کو ترک کردیا جائے تو یہ مسائل ایسی خوف ناک شکل اختیار کرلیتے ہیں کہ ابھی تک انسانی دماغ انھیں حل نہیں کرسکا۔ اور حل سوچا ہے تو یہ کہ ایسی باتوں سے کنّی کاٹ کے نکل جاؤ۔

(''انسان اور آدمی''، صفحہ ۶۷)

لیکن ادب کو روحانی واردات کے طور پر پڑھنے والے محمد حسن عسکری کنّی کاٹنے والوں میں نہیں تھے۔ انھوں نے اس حوالے سے اپنے سوالات کو معطل کرنے کی بجائے ان کی تفتیش کو بھی اپنی روح کی مہم کا حصہ بنالیا اور معرفت کے بحرِ ناپیدا کنار میں غوطہ زن ہوکر اپنے روحانی سفر کی اس آخری منزل تک جا

پہنچے جہاں ان کا مذہب بھی ان کے عمیق ترین روحانی مطالبات سے پیدا ہو کر ان کے شعورِ حقیقت کی معراج بن گیا۔

عسکری صاحب کے بارے میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اردو ادب کے نقاد تھے مگر آخر میں مذہب کے اسیر ہو کر رہ گئے یا تصوف کی بھول بھلیاں میں کھو گئے تو اس کا ایک مطلب کہنے والوں کے نزدیک یہ بھی ہوتا ہے کہ مذہب اور تصوف پر لکھنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اردو کے نقاد کی حیثیت سے ختم ہو گئے۔ یہ بات کھل کر تو بے شک نہیں کہی جاتی مگر زیرِ لب مفہوم یہی ہوتا ہے۔ اب ہمارا کہنا اس سلسلے میں یہ ہے کہ نقاد کا کام اگر صرف و محض ادب کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کی تحسین تک محدود سمجھا جائے تب تو بات ہی دوسری ہے۔ اس لیے کہ اس مفہوم کے اعتبار سے تو شاید انھیں پہلے بھی اردو کا نقاد کہنا مشکل ہی ہوگا، ورنہ مذہب اور تصوف سے اپنے تمام تر شغف کے باوجود ادب اور ادبی مسائل سے ان کی دلچسپی کم نہیں ہوئی بلکہ اب تو وہ ان مسائل کو مشرق و مغرب کے تہذیبی حوالوں کے ساتھ اور زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھنے لگے۔ اس کے باوجود ان کے دورِ آخر کے مضامین کے حوالے سے سمجھا بالعموم یہی جاتا ہے کہ ان میں چوں کہ ادب کی بجائے تصوف وغیرہ کے مسائل سے بحث کی گئی ہے، اس لیے ادب کے نقطۂ نظر سے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ لیکن یہ بات کس قدر غلط ہے اس کا اندازہ تو اسی ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''وقت کی راگنی'' میں شامل ان کے دورِ آخر کے کم از کم چھ مضامین تو ایسے ہیں جن کے عنوانات ہی ان کے ادبی ہونے کی گواہی دے رہے ہیں، مثلاً (۱) مشرق و مغرب کی آویزش (اردو ادب میں) (۲) ادب میں صفات کا استعمال (۳) مغربی ادب کی آخری منزل (۴) روایت کیا ہے (۵) اردو کی ادبی روایت کیا ہے... اور (۶) اردو ادب کی روایت: چند تصریحات۔ رہے بقیہ مضامین تو چاہے وہ براہِ راست کسی ادبی مسئلے سے تعلق نہ رکھتے ہوں مگر بالواسطہ طور پر یہ بھی زیادہ تر کسی ایسے ہی مسئلے سے بحث کرتے ہیں جو ہمارے زمانے کے ادب اور زندگی کے حوالے سے بنیادی اہمیت کا حامل ضرور ہے، مثلاً ''جدید عورت کی پرنائی'' میں تو ساری بات ہی شیکسپیئر کے ڈرامے ''میکبتھ'' کے حوالے سے کی گئی ہے۔ لارنس نے کہا تھا کہ سولھویں صدی کے آخر سے عورت اپنی جھلاہٹ میں قاتل بن گئی ہے۔ عسکری صاحب نے شیکسپیئر کے اس ڈرامے کے حوالے سے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ شیکسپیئر نے لیڈی میکبتھ کے کردار کی صورت میں عورت کی اس تبدیلی کو کس حد تک سمجھا ہے اور اس میں آج کل کی جدید ترین عورت کا عکس کس حد تک موجود ہے؟ اسی طرح ''بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے'' میں موضوعِ بحث رسم الخط کا مسئلہ ہے۔ اس مضمون میں عسکری صاحب نے رسم الخط کے مابعد الطبیعیاتی قرینے کو چینی، ہندو اور اسلامی روایتوں کے نقطۂ نظر سے بڑی گہرائی میں جا کر دیکھتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے رسم الخط کا اسلام اور اسلامی تہذیب سے کیا تعلق ہے اور یہ رسم الخط ہمارے بنیادی عقائد، نظامِ حیات اور طرزِ احساس کی کہاں تک نمائندگی کرتا ہے؟

اس مضمون ہی کی طرح ''ابن عربی اور کیر کے گور'' بھی عسکری صاحب کا ایک شاہکار مضمون ہے۔ اس میں بہ ظاہر تو ایسا لگتا ہے جیسے ابن عربی اور کیر کے گور کو آپس میں بھڑا کر مشرق و مغرب کی ہار جیت کا فیصلہ کرنا مقصود ہے، لیکن مضمون کو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ قصہ کچھ اور ہی ہے۔ اس لیے کہ مضمون کی ابتدا ہی ہمارے زمانے کے دو بہت مشہور اور مقبولِ عام خیالات سے ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ مشرق اور مغرب کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ دوسرا یہ کہ ساری انسانیت ہمیشہ سے ایک ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہے گی۔ عسکری صاحب اس مضمون میں ان خیالات کی صداقت کو پرکھ کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے پہلے تو ژید کی کتاب ''زمینی غذا'' کے حوالے سے بات کر کے یہ معلوم کرلیا کہ ژید جو اپنے آپ کو بیکن اور ڈیکارٹ کا مقلد بتاتا ہے، وہ مشرق اور مغرب کے درمیان ایک خاص فرق قائم کرتا ہے۔ اس کے بعد سوال یہ تھا کہ مغرب کے وہ لوگ جو بیکن اور ڈیکارٹ سے شروع ہونے والے رجحانات کے مخالف ہیں یا وہ لوگ جو روحانیت یا مذہب کے قائل ہیں، کیا یہ لوگ مشرق کے کچھ قریب آجاتے ہیں؟ بہ الفاظ دیگر سوال یہ تھا کہ کیا مشرق اور مغرب کی روحانیت ایک ہی چیز ہے؟ یہ تھا وہ سوال جس کا جواب عسکری صاحب نے ابن عربی کی ''فصوص الحکم'' اور کیر کے گور کی ''خوف اور لرزہ'' کے تقابلی مطالعے کے ذریعے ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

اردو کا ایک ایسا نقاد جو بہ قولِ سلیم احمد مضمون نہیں لکھتا، الفاظ کو چمکا کر آئینہ بناتا ہے۔ ایسا آئینہ جس میں اس کا خیال مکمل وضاحت اور صفائی کے ساتھ اس طرح چمک اٹھتا ہے کہ ابہام کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، اس کے ایک ایک مضمون کے اصل موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے مجھے خود بھی شرم آرہی ہے، لیکن جب لوگ ہی بات کو سمجھتے ہوں نہ بات کے مقصد کو اور اُلٹے سیدھے اعتراضات کے ذریعے اصل مسئلے ہی کو الجھا کر رکھ دیں تو اس کے سوا اور چارۂ کار بھی کیا ہے کہ پہلے الجھی ہوئی ڈور کا سرا پکڑ کر اسے سلجھانے کی کوشش کی جائے، بات کے معنی و مقصد پر گفتگو بعد میں ہوتی رہے گی۔

عسکری صاحب کے دوسرے مضامین کی طرح ان کے مضمون ''وقت کی راگنی'' کے حوالے سے بھی لوگوں نے طرح طرح کی موشگافیاں کی ہیں۔ کوئی اس مضمون میں موسیقی کی غلطیاں تلاش کرتا ہے کوئی تصوف کی۔ وہ غلطیاں تو خیر ہوں گی۔ اس لیے کہ عسکری صاحب نے فنِ موسیقی یا علمِ تصوف پر عبور رکھنے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ ان کے سامنے تو اصل سوال اس مضمون میں یہ تھا کہ مسلمانوں نے جنوبی ایشیا کی موسیقی میں کیا ترمیم یا اضافہ کیا؟ محض ہندوؤں کی شاگردی ہی کافی سمجھی یا اپنی طرف سے بھی کوئی نئی ایجاد کی؟ اب یہ اعتراف تو وہ مضمون کی تمہید میں پہلے ہی کر کے چلے ہیں کہ:

> اس سوال کا جواب دینے کے لیے تاریخ کا علم اور موسیقی کا علم درکار ہے جو مجھے میسر نہیں۔ میرا کام پڑھنا ہے اور اتفاق پڑ جائے تو لکھنا۔ لہٰذا میرا تعلق الفاظ

> سے ہے۔ اور چیزوں پر الفاظ کے اعتبار سے غور کرنے کی عادت مجھے پڑ گئی ہے۔ موسیقی کو سمجھنے کی کوشش کروں گا تو وہ بھی الفاظ ہی کے ذریعے ممکن ہوگی۔
> ("وقت کی راگنی"، صفحہ ۱۵۸)

پھر مضمون کے آخر میں بھی صاف صاف شرمائے بغیر کہہ دیا کہ:

> جتنی معلومات مجھے فراہم ہوئیں وہ سب ابتدائی باتیں ہیں۔ مگر میں اسلامی علوم کا مبتدی بھی نہیں۔ اپنی طرف سے میں نے پوری احتیاط برتی ہے کہ کتابوں سے جو کچھ نقل کروں، پہلے تھوڑا بہت سمجھ لوں اور درست نقل کروں۔ جو باتیں ٹھیک نقل ہوئیں وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوئیں۔ جو غلطیاں ہوئیں، وہ میری طرف سے ہیں۔ جو حضرات اس مضمون پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیں، وہ کسی مستند عالم سے تصدیق کرلیں تو بہتر ہوگا۔
> ("وقت کی راگنی"، صفحہ ۱۹۶)

چناں چہ اس مضمون میں انھوں نے اپنے سوال کا جواب لفظ "خیال" کے معانی کے کم از کم چھ مختلف درجوں سے بحث کر کے دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں پہلے درجے کا تعلق حواسِ ظاہری سے، دوسرے کا حواسِ باطنی سے، تیسرے کا سامعین سے اور چوتھے کا فنِ بلاغت سے ہے۔ مضمون کا آدھے سے زیادہ حصہ ابھی پہلے چار درجوں کی بحث میں تمام ہوجاتا ہے، اس کے بعد کہیں جاکر پانچویں درجے میں اس لفظ کے معنی پر تصوف کے اعتبار سے بحث کا نمبر آتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی اس مضمون میں بیسیوں مسائل تو منطق اور فلسفے وغیرہ ہی کے بیچ بیچ میں آجاتے ہیں۔ پھر انھی کے ضمن میں بعض ادبی مسائل کے بارے میں بھی بہت معنی خیز باتیں آجاتی ہیں، مثلاً "وہم" کے اصطلاحی معنی کا بیان اور اس اعتبار سے فنون میں اس کی مرکزی اہمیت کے حوالے سے یہ بتانا کہ "وہم" کا فعل ہے ہی کچھ ایسا کہ اس کے بغیر موسیقی ہو یا شعر یا مصوری یا کوئی اور فن، حتیٰ کہ جس چیز کو مغربی تنقید اور جمالیات میں تخلیقی عمل کہا جاتا ہے، وہ بھی وجود میں نہیں آسکتا۔ پھر اس حوالے سے میرؔ اور غالبؔ کے دو شعروں کی انتہائی حیرت انگیز اور باکمال تشریح بھی درمیان میں آتی ہے اور ایک دلچسپ اشارہ حواسِ ظاہری کے بیان میں یہ بھی ملتا ہے کہ راں بو کو تو حواس کو ایک دوسرے میں تبدیل کرنے کے لیے انتشار حواس کی ارادی کوشش کرنی پڑی لیکن بیدلؔ کے ہاں یہ چیز بلاارادہ ہی اتنی فراوانی سے ملتی ہے کہ لوگ حیرت زدہ ہوجاتے ہیں کہ مغربی شاعری پڑھے بغیر ہی وہ ایسا کام کس طرح کر گئے؟ پھر کہیں اس بات پر گفتگو ہے کہ Ontological Criticism یعنی وجودی تنقید سے کیا مراد ہے اور کہیں اس بات پر کہ فن پارے میں عمومی معنویت کہاں سے آتی ہے؟ غرض یہ کہ بات چاہے تصوف کی ہو یا منطق اور فلسفے کی، شعر و ادب کے مسائل بھی بیچ بیچ میں جابہ جا در آتے ہیں۔ اب عسکری صاحب کے معترضین سے کوئی

پوچھے کہ آخر یہ کیسی بھول بھلیاں ہے جس میں داخل ہونے کے بعد بھی گھوم پھر کر ان کا ذہن واپس انھی مسائل پر آجاتا ہے جن سے چھٹکارا پانے کے لیے انھوں نے مذہب اور تصوف کی پناہ لی تھی۔ آخر کوئی تو بات ہے کہ مضمون تصوف کا ہو تو بھی ادب کی بات بیچ میں آئے بغیر نہیں رہتی اور مسئلہ ادب کا ہو تو بھی بات تصوف کے بغیر آگے نہیں بڑھتی۔ عسکری صاحب کے معترضین کے سامنے تو یہ مسئلہ شاید کبھی آتا ہی نہیں۔ اور اگر آتا ہے تو وہ اس پر غور کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن یہ عقدہ بھی خود عسکری صاحب ہی نے اپنے ایک مضمون میں حل کر دیا ہے، مضمون ہے ''ادب میں صفات کا استعمال''۔ لکھتے ہیں کہ اس مضمون میں دو چار جگہ تصوف کی اصطلاحیں اور صوفیہ کے اقوال دکھائی دیں گے۔ ممکن ہے اس سے آپ کو خیال گزرے کہ یہاں تو چھوچھکا شروع ہو گیا۔ لیکن اگر مجھے تصوف کی حمایت ہی کرنی ہو تو بھی اس حرکت سے باز رکھنے کے لیے مجھے اہلِ تصوف ہی کا ایک قصہ یاد ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک شخص حضرت جنید بغدادی سے اسمِ اعظم سیکھنا چاہتا تھا۔ آپ نے اسے کپڑے میں بندھا ہوا ایک پیالہ اس غرض سے دیا کہ وہ اسے لے جا کر دریا کے پار بیٹھے ہوئے ایک فقیر کو پہنچا دے۔ وہ شخص پیالہ لے کر چلا تو اندر کوئی چیز ہلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ کپڑا کھول کر دیکھا تو چوہیا نکلی اور بھاگ کر گھاس میں غائب ہو گئی۔ اب یہ شخص شرمندہ شرمندہ پیالہ پھر سے کپڑے میں لپیٹ کر دریا کے پار پہنچا۔ فقیر نے دیکھتے ہی کہا، کہو بھئی چوہیا بھاگ گئی۔ اسمِ اعظم سیکھنے چلے تھے اور ذرا سی چوہیا کی حفاظت نہ ہو سکی۔ یہ قصہ سنا کر عسکری صاحب نے مضمون کی تمہید ہی میں کہہ دیا کہ اس مضمون کا تعلق ادب سے ہے جسے میں اپنی چوہیا قرار دیتا ہوں اور اس کی خدمت کو تصوف کے لحاظ سے بھی سب سے بڑا فرض سمجھتا ہوں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ:

> اردو اور فارسی ادب اور اس کے مقابل مغربی ادب پڑھتے ہوئے اور پھر ادب کے متعلق لکھتے ہوئے میرے سامنے چند مسئلے آئے ہیں جو مغرب کے فلسفے، نفسیات، عمرانیات اور ادبی تنقید کے سہارے بھی حل نہ ہو سکے۔ ان مسئلوں کا تشفی بخش حل مجھے صرف تصوف کی کتابوں میں ملا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے ورنہ تصوف سے مراد نہ تو یہاں روحوں سے ملاقات ہے نہ ہم زاد کو قابو میں لانے کا نسخہ۔ اس مضمون میں تصوف کا مطلب ہے اسلام کا باطنی پہلو یا وہ معتقدات جن کی بنیاد پر اسلامی تہذیب کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔
>
> (''ادب میں صفات کا استعمال''، صفحہ ۲۱)

اس سے معلوم ہوا کہ تصوف سے ان کی دلچسپی بھی دراصل ادب کی چوہیا کی حفاظت کی غرض سے تھی۔ اور یہی چیز انھیں مرکزی روایت کے اس مابعدالطبیعیاتی تصور تک لے گئی جس کا بیان وہ تصوف کی اصطلاحوں میں کرتے ہیں۔ مرکزی روایت کے اس تصور تک پہنچنے سے پہلے اُن کے ذہنی اور روحانی سفر کا تعلق مغرب سے تھا، اس کے بعد مشرق سے ہو گیا۔ پہلے وہ مشرق کو مغرب کی آنکھ سے دیکھتے تھے،

اب مغرب کو مشرق کی آنکھ سے دیکھنے لگے۔ پہلے جوئس، پاؤنڈ، لارنس، بودلیئر، فلوبیر اور میلارمے وغیرہ ان کے ہیرو تھے، اب رینے گینوں، ابن عربی، مجدد صاحب، مولانا اشرف علی تھانوی اور شاہ وہاج الدین وغیرہ نے ان کی جگہ لے لی۔ پہلے ان کا کہنا تھا کہ میں نے اردو ادب کے بارے میں اگر کوئی کام کی بات کی ہے تو صرف اس لیے کہ میں نے مغرب کے لوگوں سے چند امتیازات سیکھے ہیں، لیکن اب وہ مغربی ادب کو سمجھنے کے لیے بھی مولانا اشرف علی تھانوی کی کتابوں کو ضروری قرار دینے لگے۔ پہلے وہ جن معیاراتِ تنقید سے ادب کو دیکھتے تھے وہ مغربی ادب اور فکر سے مستعار تھے، اب مشرق کے روایتی معیاراتِ تنقید سے ادب کا جائزہ لینے لگے۔ یہی وہ بنیادی تبدیلی ہے جو ان کے اندر رینے گینوں کے زیرِاثر آنے کے بعد پیدا ہوئی اور جسے ان کے معترضین ادب کے حق میں نیک فال تصور نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک مولانا اشرف علی تھانوی اور شاہ وہاج الدین کی تحریروں سے ادبی تنقید کے اصول و معیار اخذ کرنا عسکری صاحب کے ذہن و فکر کے زوال کی علامت ہے بلکہ بعض لوگ تو ان اصولوں ہی کو مضحکہ خیز قرار دیتے ہیں۔ ان اصولوں میں خرابی کیا ہے یا یہ اصول و معیارات مضحکہ خیز کس بنا پر ہیں؟ یہ تو کوئی بھی نہیں بتاتا اور نہ بتا سکتا ہے۔ البتہ ان کی مضحکہ خیزی کی طرف ان کے اطلاقی نتائج کے اعتبار سے یہ کہہ کر اشارہ ضرور کیا جاتا ہے کہ لیجیے عسکری صاحب نے ذوقؔ کو غالبؔ سے بڑھا دیا یا داغؔ کو تصوف کا شاعر قرار دے دیا۔

لیکن ذوقؔ اور غالبؔ کا معاملہ تو یہ ہے کہ ذوقؔ اور غالبؔ کے دور تک ہمارے روایتی معاشرے کا نظام بھی زندہ و سالم تھا اور شاعری کی وہ روایت بھی جو روایتی معاشرے کے اس نظام نے پیدا کی تھی۔ اس لیے ذوقؔ جو روایتی طرزِ احساس کا شاعر تھا، اس زمانے کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ جب کہ غالبؔ کے ہاں اس وقت قدیم روایت ٹوٹ کر بکھر رہی تھی اور نئے زمانے کا رنگ و آہنگ اس کی شاعری کے آئینے میں جھلک رہا تھا۔ ذوقؔ کا طرزِ احساس روایتی معاشرے کے نظام سے ہم آہنگ تھا۔ غالبؔ کا طرزِ احساس اس نظام کو توڑ کر اپنے لیے جدید شعور و احساس اور فکر و ادراک کا ایک نیا دائرہ بنا رہا تھا۔ ذوقؔ اور غالبؔ طرزِ احساس کے اعتبار سے دو مختلف دائروں کے شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک روایتی معاشرے کا نظام برقرار رہا، ذوقؔ کو غالبؔ سے بڑا شاعر سمجھا گیا۔ لیکن جیسے ہی نئی دنیا کا شعور روایتی معاشرے کے پرانے نظام کو توڑ کر اس کی جگہ لینے کے لیے آگے بڑھا، غالب کی شاعری کا سورج بھی نصف النہار پر آ کر چمکنے لگا۔ اس وقت سے لے کر آج تک ہماری روایت، ہمارا معاشرتی ماحول اور ہمارا طرزِ احساس اس حد تک بدل چکا ہے کہ اب غالبؔ کی شاعری کے آگے ذوقؔ کی شاعری ہمیں ذرا بھی پسند نہیں آتی۔ لیکن اگر کسی کو روایتی معیارِ نقد و نظر کے اعتبار سے ذوقؔ کی شاعری غالبؔ کی شاعری کے مقابلے میں بہتر نظر آئے تو خواہ ہم اس سے اتفاق نہ کریں لیکن اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ روایتی معیاروں کے اطلاق کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ

عسکری صاحب نے شعر و ادب کی تنقید کے جو روایتی اصول و معیارات شاہ وہاج الدین یا مولانا اشرف علی تھانوی کے ہاں سے اخذ کیے، ان میں کوئی خرابی نہیں۔ ساری خرابی اس بات میں ہے کہ ذوق کے زمانے سے لے کر آج تک ہمارا طرزِ احساس اور مذاقِ سخن اس حد تک بدل چکا ہے کہ اب ہمارے لیے غالب کے مقابلے میں ذوق کو پسند کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں رہا، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اگر کوئی شخص روایتی اصولِ نقد کے اعتبار سے ذوق کو غالب سے بہتر سمجھے یا داغ کے اس شعر:

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

کو تصوف کا شعر بتائے تو ہم اس شخص کی تنقیدی بصیرت کو زوال آمادہ اور روایتی معیاراتِ نقد و نظر کو مضحکہ خیز قرار دینے لگیں۔ اس لیے کہ داغ کے اس شعر میں بھی وہ معنوی جہت ضرور موجود ہے جو کسی روایتی معیارِ نقد و نظر رکھنے والے آدمی کی نظر میں اس شعر کو ظہور و خفا کے مسئلے سے وابستہ کر کے تصوف کا شعر بنا سکتی ہے۔ داغ کے اس شعر میں یہ معنوی جہت خواہ شعوری طور پر نہ آئی ہو مگر غیر شعوری طور پر اسے ہماری تہذیب کی اس قدیم روایت کا فیض ضرور پہنچا تھا جس کی بنا پر یہ شعر بہ یک وقت عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کی دونوں جہتوں کا آئینہ دار بن گیا۔

ہم نے کہا ہے کہ رینے گینوں سے متاثر ہونے کے بعد عسکری صاحب کے ذہن و فکر میں جو انقلابی تبدیلی واقع ہوئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے وہ ادب کی تنقید کے معیارات مغربی ادب اور فکر و فلسفہ سے اخذ کرتے تھے اب مشرق کے روایتی معیاراتِ تنقید سے ادب کا جائزہ لینے لگے۔ یہ تبدیلی اچھی تھی یا بُری، ہم اسے ادب کے حق میں نیک فال سمجھیں یا بد فال، فی الحال اس بحث کو چھوڑیے اور یہ دیکھیے کہ یہاں یہ بات بالکل واضح ہے کہ روایتی معیارِ تنقید کی رو سے ذوق کی برتری غالب پر ثابت ہوتی ہے اور ہم خواہ اس بات کو مانیں یا نہ مانیں، اسے پسند کریں یا نہ کریں مگر نہ تو اس معیار کو مضحکہ خیز قرار دینے کا کوئی جواز ہمارے پاس موجود ہے اور نہ ہی ہم اس نتیجے کے خلاف احتجاج کرنے کا کوئی حق رکھتے ہیں جو ذوق اور غالب کی شاعری پر اس معیار کے اطلاق سے برآمد ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عسکری صاحب کی تنقیدی زندگی کے اس دور کی ایک مثال لیجیے، جب وہ ادب کو جانچنے اور پرکھنے کے معیارات مغرب سے لے رہے تھے۔ ژونگ نے میاں بیوی کے تعلقات کے حوالے سے ایک فریق کو container اور دوسرے کو contained قرار دیا تھا۔ عسکری صاحب نے اسے معیار بنا کر قاری اور مصنف کے حوالے سے میر اور فراق پر چسپاں کر دیا اور فراق کو میر کا container قرار دیتے ہوئے نتیجہ یہ نکالا کہ فراق کے بعض مطالبات میر سے بھی پورے نہیں ہوتے۔ مگر اس نتیجے میں میر صاحب پر فراق کی برتری کا جو پہلو نکلتا ہے وہ اس قدر مضحکہ خیز ہے کہ اسے محسوس کر کے خود عسکری صاحب کو بھی یہ کہنا پڑا کہ ''میں یہ دعویٰ نہیں کر رہا ہوں کہ فراق، میر سے بڑے شاعر ہیں۔''

اب ایک مثال اور دیکھ لیجیے۔ عسکری صاحب اپنے مضمون ''میر اور نئی غزل'' میں لکھتے ہیں کہ اگر شاعری کے لیے جدیدیت کوئی لازمی صفت ہے تو ہم غالب اور میر کے درمیان اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے جب تک ہم یورپ کی جدیدیت کے انداز رفتار سے واقف نہ ہوں۔ یورپ کی جدیدیت کا اصلِ اصول عسکری صاحب کے بہ قول مروّجہ اقدار سے انحراف ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مذہب، اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات اور اس کے بعد مروّجہ علوم سمیت تک کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی اقدار کی نفی کی جائے۔ لیکن اس کے لیے آپ کے پاس کسی معیار کا ہونا ضروری ہے۔ یہ معیار ہے ذاتی پسند یا انفرادیت۔ عسکری صاحب کہتے ہیں کہ خارج کی ہر چیز کو رد کر دینے کے بعد جدیدیت کا انحراف یا نفی کا یہ عمل فن کار کی شخصیت پر آ کر رک جاتا ہے۔ یہ جدیدیت کی پہلی منزل ہے اور غالب دراصل جدیدیت کی اسی پہلی منزل کا شاعر ہے۔ لیکن جدیدیت کی اگلی منزل میں فن کار کو اپنی شخصیت کی بھی نفی کرنی پڑتی ہے جس کے بعد آگے راستہ بند ہو جاتا ہے۔ عسکری صاحب کا کہنا ہے کہ فن کار نے اپنے آپ تک کو مٹا دینے کے بعد سمجھا تھا کہ ہر چیز ختم ہو گئی مگر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ابھی دوسرے لوگ باقی ہیں۔ اب سوال پیدا ہوا کہ فن کار اور دوسرے لوگوں کے درمیان کیا رشتہ ہو؟ اس سوال کے جواب میں جدید ترین فن کاروں نے دریافت کیا کہ ایک چیز ہے ''حیاتِ محض'' جو فن کار اور عام انسانوں میں مشترک ہے۔ لہٰذا ''حیاتِ محض'' کے اثبات کی بنیاد پر فن کار کا اشتراک عام انسانوں سے پیدا ہو سکتا ہے۔ عسکری صاحب کے بہ قول جدید ترین جدیدیت اثبات کی اسی اگلی منزل کا نام ہے۔ انھوں نے جدید ترین جدیدیت کا یہ معیار مارسل پروست اور جوئس کے ناولوں سے اخذ کیا اور اسے میر کی غزل پر منطبق کر کے جدیدیت کی تازہ ترین منزل سے تعبیر کر دیا اور بتایا کہ میر کی روحانی کش مکش کا ماحصل یہی ہے کہ اعلیٰ ترین زندگی کو عام ترین زندگی سے ہم آہنگ بنایا جائے۔ ان کے نزدیک میر جدید ترین جدیدیت کے اسی اثبات کا شاعر ہے اور انھی معنوں میں غالب سے زیادہ جدید ہے۔

اب ذرا غور فرمائیے۔ پروست اور جوئس تو نفی کے سارے مراحل طے کر کے اثبات کی منزل تک پہنچے۔ میر نفی کے اس عمل سے گزرے بغیر ہی (جس میں مذہبی، تہذیبی اور اخلاقی اقدار تک کی نفی کا عمل شامل ہے) جدیدیت کے مثبت عمل کے نمائندہ کس بنا پر سمجھے گئے؟ اوّل تو یہی بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ دوسرے میر کو غالب سے زیادہ جدید قرار دینا اور کہنا کہ غالب جدیدیت کے منفی عمل کی پہلی منزل سے آگے نہ جا سکا جب کہ میر اس سے آگے جا کر جدیدیت کے مثبت عمل کا نمائندہ بن گیا۔ یہ بات پہلی سے بھی زیادہ ناقابلِ فہم بلکہ ناقابلِ تصور ہے۔ تیسرے روایتی معیاروں کی رُو سے تو غالب پہلے ہی ذوق سے کم تر درجے کا شاعر تھا، اب جدید معیار کی رُو سے بھی میر سے کم تر قرار پایا۔ گویا غالب بے چارہ تو دونوں ہی طرف سے پٹ گیا۔ یہ ہے وہ مضحکہ خیز نتیجہ جو پروست اور جوئس کے ناولوں سے اخذ کردہ معیار کو میر اور غالب کی غزل پر منطبق کرنے سے برآمد ہوا۔ اب اس نتیجے کی مضحکہ خیزی

میں تو کسی شک و شبہے کی گنجائش ہی نہیں۔ مگر مغربی ادبیات اور فکر و فلسفے سے اخذ کردہ اس قسم کے معیارات غزل جیسی مشرقی اصنافِ سخن کو پرکھنے کی کوئی قابلِ اعتماد کسوٹی بن سکتے ہیں یا نہیں، ہمیں اس پر بھی تو غور کرنا چاہیے۔ محض عسکری صاحب ہی کے حوالے سے نہیں بلکہ حالی اور کلیم الدین احمد سے لے کر آج تک کے تمام اردو نقادوں کے حوالے سے۔ اس لیے کہ کلیم الدین احمد اور محمد حسن عسکری جیسے صفِ اوّل کے نقاد بھی جن کی تنقیدی بصیرت اور مغربی ادبیات سے گہری شناسائی ہر قسم کے شک و شبہے سے بالاتر ہے، جب ان معیارات کی بہ دولت غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن اور میر کو غالب سے زیادہ جدید قرار دینے لگیں تو پھر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے مشرقی ادب کی تنقید کے لیے یہ معیارات کس حد تک قابلِ اعتماد قرار دیے جاسکتے ہیں؟

عسکری صاحب ایک مدت تک مشرقی ادب کو مغرب کے تنقیدی معیارات کی رُو سے دیکھتے رہنے کے بعد بالآخر ایک دن اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ جہاں تک ہماری روایتی شاعری کا تعلق ہے، مغرب کا بلند سے بلند ادبی معیار ہمارے لیے مفیدِ مطلب نہیں ہوسکتا۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ اس میں سارا قصور ان معیارات ہی کا نہیں، کچھ کرشمہ خود ان کے اپنے ذوقِ نظر کا بھی ضرور شامل تھا۔ اس لیے کہ کہیں کہیں تو انھوں نے بھی ادب کے آئینے میں خود اپنا ہی عکس دیکھا ہے۔ کم از کم میر کے سلسلے میں تو یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے ان کے اشعار کو ایک خاص زاویے سے پڑھا ہے اور کوشش کی ہے کہ ان کے کلام کو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر اس معیار کے قریب لایا جائے جو انھوں نے مغربی فکشن سے اخذ کرکے اپنے ذہن میں قائم کرلیا تھا۔ اور کچھ ایسی ہی بات ان کے بارے میں فراق کی نسبت سے بھی کہی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے ''اور گون کی لہروں'' کا ایک معیار رائج کی نفسیات سے اخذ کرکے فراق کے کلام کو بھی کم و بیش اسی طرح اس معیار کے قریب لانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے مبالغے کے ساتھ اہمیت دینا ضروری سمجھا۔ رہی غالب سے ان کی بیزاری، تو یہ بھی شاید ان کے کسی نفسیاتی کمپلیکس ہی کا مظہر تھی، ورنہ غالب کے مصرعے:

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

کے حوالے سے ان کا یہ کہنا کہ ''عمر اور تجربہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ غالب کی قسم کی ذہنیت سے میرا خوف بھی بڑھتا جارہا ہے۔'' یا یہ کہنا کہ ''غالب کو دو چیزوں نے مارا، ایک تو اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے الگ رکھنے کی خواہش، دوسرے فلسفہ بگھارنے کا شوق۔'' یہ تنقید نہیں، تنقید کے نام پر خود اپنے ہی تعصبات کا اظہار ہے۔ اس قسم کے تعصبات یقیناً ان کی تنقید کے چہرے پر ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆☆☆

احمد علی سیّد

عسکری کا تصورِ روایت اور رنگِ ثبات

انسان ہر آن بدلتا ہے۔ اُس کی جسمانی حالت بھی بدلتی ہے اور نفسی کیفیت بھی۔ انسان جس دنیا میں رہتا ہے وہ بھی ہر آن بدلتی ہے۔ انفس و آفاق میں ہر طرف حرکت و تبدیلی کا دور دورہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حرکت و تبدیلی کی اس وسیع جولاں گاہ میں کہیں رنگِ ثبات بھی ہے یا نہیں؟ اس سوال کو فلسفے میں بھی اُٹھایا گیا ہے اور ادب میں بھی۔ فلسفے کے مباحث میں الجھنا اور الجھانا فلسفیوں کا کام ہے، ہم ادب کے طالب علم ہیں اس لیے ادب کے حوالے سے اس سوال کا جواب تلاش کریں گے۔ ادب میں جب ہم یہ سوال اٹھاتے ہیں تو بات روایت تک پہنچتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ روایت میں رنگِ ثبات ہوتا ہے۔ یہی بات ہماری ہمت افزائی کرتی ہے۔ مگر روایت ہے کیا؟ اس سوال پر عسکری صاحب نے خصوصی توجہ کی ہے۔ آیئے اُن سے اس سوال کا جواب دریافت کرتے ہیں۔

عسکری صاحب نے لکھا ہے کہ مشرق و مغرب میں روایت کے تصورات جدا جدا ہیں۔ مغرب میں ایلیٹ سے لے کر ایم سی بریڈ برک تک بڑے نقادوں نے روایت پر بڑی بحثیں کی ہیں۔ مگر ان بڑی بحثوں سے صرف یہ چھوٹی سی بات برآمد ہوتی ہے کہ مغرب روایت کو ایک ایسی عادت قرار دیتا ہے جو کچھ عرصے سے کسی معاشرے میں رائج ہو یعنی مغرب میں روایت کے معنی ہیں عادت، خواہ وہ معاشرتی عادت ہو، تہذیبی ہو یا ادبی۔۔ اس کے علاوہ مغرب روایت کے کسی اعلیٰ مفہوم سے قطعاً ناآشنا ہے۔ اس کے برعکس مشرق میں روایت کا ایک وسیع اور مستند تصور موجود ہے جس کو بہ الفاظ دیگر روایت کا مابعدالطبیعیاتی تصور کہا جاسکتا ہے۔ مشرق کے تمام جید لوگ اس تصور کی نسل در نسل تصدیق کرتے آئے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغرب و مشرق میں روایت کے تصورات کیوں جدا جدا ہیں؟ مشرق والے اگر بہ قولِ عسکری روایت کا ایک وسیع اور گہرا تصور رکھتے ہیں تو مغرب والے کیوں اس وسیع اور گہرے تصور سے محروم ہیں؟ کیا مغرب والوں کو گہرائی میں اترنا نہیں آتا؟ یہ بات یقیناً تصریح طلب ہے اور ہم عسکری صاحب سے اس کی تصریح چاہتے ہیں۔

عسکری صاحب کہتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ مشرق و مغرب کا تصورِ حقیقت الگ الگ ہے۔ مغرب والے دورِ جدید میں حقیقت کو صرف مادّی اور مرئی دنیا تک محدود قرار دیتے ہیں۔ اس کو وہ سائنسی حقیقت کا نام دیتے ہیں۔ اس سے اوپر کوئی حقیقت ہے؟ اس بات سے مغرب والوں کو کوئی شغف نہیں۔ اُن کے لیے سائنس ہی کافی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بالفرض اس دنیا سے اوپر کوئی حقیقت ہو بھی تو اُس کی تصدیق کے معتبر ذرائع ہمارے پاس نہیں۔ اس لیے اُس اوپر والی حقیقت کو نظرانداز ہی کر دینا چاہیے۔ اس کے برعکس مشرق کا موقف یہ ہے کہ بنیادی حقیقت ایک ہے۔ وہ عالم و ماورائے عالم پر محیط ہے۔ کچھ بھی اُس سے باہر نہیں۔ یہ حقیقت مرتبۂ ذات میں وراء الورا ہے۔ جملہ تعینات سے بھی ماورا ہے۔ ظہور کے دائرے سے بھی اوپر ہے۔ مگر صفات میں یہ ظہور کرتی ہے۔ حقیقت کے مرتبۂ ذات کو اسلامی اصطلاح میں لاہوت کہا جاتا ہے۔ مرتبۂ صفات میں ظہور کے اعتبار سے کئی درجے ہو جاتے ہیں۔ عسکری صاحب نے لکھا ہے کہ ''ظہور کا پہلا درجہ وہ ہے جس میں کوئی ہیئت و شکل نہیں ہوتی، لیکن ہم تعینات کے قریب آنے لگتے ہیں، یہ عالمِ جبروت ہوا۔ اس کے بعد ہیئت کا نمبر آتا ہے۔ یہاں بھی دو درجے بنتے ہیں۔ پہلے تو ظہورِ لطیف ہوتا ہے یعنی عالمِ ملکوت، پھر ظہورِ کثیف ہوتا ہے، یعنی عالمِ ناسوت۔

اب دیکھیے کہ مغرب حقیقت کا مادّی اور محدود تصور رکھتا ہے۔ اس لیے وہ مادّی اور محدود چیزوں سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ وہ روایت کو مکانی و زمانی صورتِ حال میں ایک عادت ہی سمجھے گا۔ لیکن مشرق کی رسائی حقیقت کے ایسے بسیط تصور تک ہے جس کے اندر ہی سب کچھ ہے۔ مرتبۂ ذات میں وہ ابدی الخفا ہے اور مرتبۂ صفات میں ازلی الظہور ہے۔ یہ حقیقت کا اتنا وسیع تصور ہے کہ وسیع کا لفظ بھی اُس کے لیے بہت کم ہے۔ اس تصور سے وابستگی کی بنا پر مشرق کا تصورِ روایت بھی وسیع ہے اور اُس میں وہ منفرد خصوصیات آگئی ہیں جو کہ اس وابستگی کی بنا پر آنا چاہییں۔ وابستگی بڑی چیز ہے اور سب سے بڑی حقیقت سے وابستگی سب سے بڑی چیز۔

یہ روایت کا مابعدالطبیعیاتی تصور ہے، کیوں کہ اس کا تعلق مابعدالطبیعیات سے ہے۔ یہاں مابعدالطبیعیات سے مراد وہ نظریے نہیں جو مغربی فلسفیوں کے ذہن کی اختراع ہوتے ہیں۔ مغرب میں مختلف فلسفیوں کی مختلف قیاس آرائیاں مابعدالطبیعیات کہلاتی ہیں مثلاً ارسطو کی مابعدالطبیعیات یا برگساں کی مابعدالطبیعیات۔ مگر مشرق میں مابعدالطبیعیات کے دو مختلف نظریے نہیں ہوسکتے (التوحید واحد)۔ مشرق کا تصورِ حقیقت ایک ہے۔ اس کی مابعدالطبیعیات بھی ایک ہی ہے۔ اس مابعدالطبیعیات کی روایت بھی ایک ہی ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی آئی ہے بلکہ شک و شبے کو دُور کرنے کے لیے ہم کہتے ہیں کہ یہ واحد مابعدالطبیعیات ہی روایت ہے جو کہ بزرگوں سے ہم تک پہنچی ہے۔ یہ روایت مقدس صحیفوں اور آسمانی کتابوں سے نکلی ہے۔ جن کا سرچشمہ وحی و الہام ہے اور وحی و الہام کو مشرق میں معتبر ترین ذریعۂ علم تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس واحد بنیادی روایت کے اظہار میں مشرق کی بڑی تہذیبوں کے درمیان اگرچہ ثانوی

نوعیت کے اختلافات رونما ہوتے ہیں مگر بنیادی اختلاف کوئی نہیں ہے۔ اس لیے روایت ایک ہی ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو باہم مربوط کرتی ہے۔ تہذیب، تمدن، علوم وفنون اور ادب سب اس ایک مرکزی اور بنیادی روایت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ہمارا روایتی ادب خواہ نثری داستانوں کی شکل میں ہو یا شاعری کی صورت میں، سب کا سب اس مرکزی روایت سے وابستہ تھا۔ البتہ یہ فرق ضرور تھا کہ بعض شعرا حقیقت کے اعلیٰ درجے تک پہنچتے تھے اور بعض نیچے کے درجات میں ہی رہ جاتے تھے۔ روایت کے اعتبار سے میر دردؔ اور میر سوزؔ دونوں مانے ہوئے شاعر ہیں۔ مگر میر دردؔ کی رسائی وہاں تک تھی کہ ''اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے۔'' اور میر سوزؔ ہاتھاپائی میں ہی ہانپتے رہتے تھے۔ ایک شاعر سرحدِ وجود سے بھی آگے نکل جانے کی تڑپ رکھتا تھا اور دوسرا عالمِ ناسوت ہی میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا تھا۔ بہرحال تھے دونوں روایتی۔ تو بات یہاں تک پہنچی کہ مشرق کی بنیادی اور مرکزی روایت مابعدالطبیعیاتی ہے۔ یہ ایک ہی روایت ہے جو انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں کو مربوط کرتی ہے۔

مغرب میں معاشرتی روایت، سیاسی روایت، ثقافتی روایت اور ادبی روایت سب جدا جدا ہوتی ہیں۔ ان کا آپس میں مربوط ہونا ضروری نہیں۔ ایک شخص کا سیاست میں رویّہ کچھ اور ہوسکتا ہے اور ادب میں کچھ اور، کسی قسم کی ہم آہنگی اس کی زندگی میں نہیں ہوتی۔ اب تو آپ کو ایسے لوگ بھی مل جائیں گے جو چرچ بھی پابندی سے جاتے ہیں اور بلو فلم بھی پابندی سے دیکھتے ہیں بلکہ جدید آدمی کا المیہ ہی یہی ہے کہ اُس کی زندگی میں ہم آہنگی نہیں ہے۔ وہ اپنی جگہ معاشرتی روایت، معاشی روایت اور تہذیبی روایت کا حامل ہوتا ہے مگر اُس کی زندگی کے تمام شعبے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ ہم آہنگی کے فقدان کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ بھی اُس کا تصورِ حقیقت ہے۔ وہ انسان جو حقیقت کا مادّی تصور رکھتا ہے، چیزوں کو الگ الگ دیکھ کر اُن کو الگ الگ ہی سمجھتا ہے۔ مادّے میں تعدد و تقسیم ہے اور جدید آدمی بھی زندگی میں تعدد اور تقسیم ہی دیکھتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی کو بھی الگ الگ خانوں میں بانٹ لیتا ہے۔ لیکن ایک روایتی آدمی کا رویّہ ایسا نہیں ہوتا۔ اُس کی زندگی میں ربط و ہم آہنگی ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ چیزیں جو بہ ظاہر مختلف اور متضاد نظر آتی ہیں، ایک ہی حقیقت کے تحت ہیں۔ ایک حقیقت کا وسیع اور جامع تصورِ زندگی کی ساری سرگرمیوں کو مربوط اور ہم آہنگ بنا دیتا ہے۔ اس طرح مشرق میں زندگی کے مختلف شعبوں کی الگ الگ اور ایک دوسرے سے بے تعلق روایات نہیں ہوتیں بلکہ ادبی، ثقافتی، معاشرتی اور سیاسی روایات ایک مرکزی روایت کے تحت ہوتی ہیں جو کہ ان سب کو مربوط و ہم آہنگ بناتی ہے اور خسرو و رومی جیسے لوگ پیدا کرتی ہے جو زندگی کی گوناگوں سرگرمیوں میں کمالات دکھانے کے باوجود اپنی ذات میں اکائی تھے۔

مغرب میں روایتیں بنتی ہیں اور بدل جاتی ہیں۔ وقت کی رفتار جتنی تیز ہوتی ہے روایتیں بھی اتنی ہی تیزی سے بنتی اور بدلتی ہیں۔ یہ روایتیں بھی پھولوں کی طرح ہیں جو صبح کھلتے ہیں اور شام کو پرانے لگتے ہیں۔ آج کل یورپ میں یہ حال ہے کہ ۶۰ء کے لکھنے والوں کو ۷۰ء کے لکھنے والے پرانا سمجھتے ہیں

اور ۷۰ء میں جنھوں نے لکھنا شروع کیا تھا اُن کو ۸۰ء کے لکھنے والے پرانا قرار دیتے ہیں۔ گویا روایت اب فیشن کا دوسرا نام ہے۔ بہرحال عسکری صاحب نے جس زمانے میں لکھنا شروع کیا تھا اُس وقت روایت میں حرکت و تبدیلی کی شرح اتنی نہیں بڑھی تھی۔ پھر بھی آپ اُن کے مضمون ''اردو ادب کی روایت کیا ہے'' سے ایک دلچسپ اقتباس ضرور دیکھ لیجیے۔ عسکری صاحب لکھتے ہیں:

> ایم سی بریڈ برگ انگریزی ادب کی ایک مشہور عالم اور نقاد ہیں۔ وہ ایک جگہ کہتی ہیں، سولھویں صدی کے آخر میں فلاں شاعر نے ایک روایت شروع کی جس کی پیروی بیس سال تک ہوئی، فلاں شاعر نے دوسری روایت کی طرح ڈالی جس کی تقلید صرف پانچ چھ سال ہوئی، فلاں شاعر نے ایک اور روایت نکالی جس کی پیروی کسی نے بھی نہیں کی۔
>
> (''وقت کی راگنی''، صفحہ ۱۱۴)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مغرب میں روایت سرے سے کوئی مستقل چیز ہے ہی نہیں۔ حد یہ ہے کہ وہ دیرپا بھی نہیں۔ ایک شاعر کسی ایک روایت کا آغاز کرتا ہے، دوسرا کسی دوسری روایت کی طرح ڈالتا ہے اور تیسرا کہیں سے تیسری روایت نکال لاتا ہے۔ ایک روایت کچھ عرصے چلتی ہے، پھر دوسری اُس کی جگہ لے لیتی ہے اور پھر تیسری، یوں ہی یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کوئی روایت اتنی ٹُھس ہوتی ہے کہ بالکل نہیں چلتی۔ مگر مغرب میں کہلاتی وہ بھی روایت ہی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ مغرب میں روایت اتنی تیزی سے بدلتی کیوں ہے؟ وہ مستقل نہ سہی کچھ دیرپا ہی ہوتی۔ عسکری صاحب اس بات کی وجہ بتاتے ہوئے صراحت کرتے ہیں کہ مغرب انسان سے اوپر کسی ہستی کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہاں انسان ہی ہر چیز کا خالق و مالک بن بیٹھا ہے اور مغرب کا انسان اپنی پوری ہستی کو حرکت و تبدیلی کے گرداب میں مبتلا پاتا ہے۔ اُس کا بنیادی احساس ہی یہی ہے کہ ہر شے ستم کش سفر ہے۔ مسافر بھی سفری ہے اور مسافر کا راستہ بھی سفری ہے بلکہ مسافر، راستہ اور منزل سب کچھ سفر ہی سفر ہے۔ اس لیے روایت بھی ایک سفر ہے، عادت کا سفر... ایک روایت اپنا سفر پورا کرتی ہے تو دوسری روایت اُس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اس طرح حرکت و تبدیلی کا سفر زمان و مکاں کی صورتِ حال میں جاری رہتا ہے یعنی بات پھر وہی تصورِ حقیقت کی ہوئی۔ مغرب نے صرف مادّی دنیا کو حقیقت سمجھا ہے اور مادّی دنیا ہمہ وقت حرکت و تبدیلی کے سفر میں ہے۔ اس طرح مغرب کے نزدیک حقیقت بھی سفر میں ہے۔ اس حقیقت سے برآمد ہونے والی روایت بھی سفر میں ہوتی ہے اور بدلتی رہتی ہے۔ لیکن مشرق میں روایت اپنے جوہر میں ماورائی ہے اور حقیقتِ ازلی و ابدی سے وابستگی رکھتی ہے، اس لیے مستقل ہے۔ وہ بدلنے والے حالات میں ایک نہ بدلنے والی شے ہے۔ وہ جوں کی توں موجود رہتی ہے۔ موت اُس کے وجود کے مرکز تک رسائی نہیں پاتی کیوں کہ ''لایموت'' سے اُس کا تعلق ہے۔ اُس میں کوئی کمی بیشی بھی ممکن نہیں یعنی جس

طرح مغرب میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ روایت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ پھلتی پھولتی ہے، امر واقعہ اس طرح نہیں ہے۔ پھلنے پھولنے یعنی اضافے کو قبول کرنے والی شے تو حرکت و تبدیلی کے سفر میں ہوتی ہے۔ روایت جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا، حرکت و تبدیلی کے دائرۂ کار سے ماورا ہے۔ جس طرح حقیقتِ ازلی و ابدی قائم و دائم ہے اسی طرح اس کی روایت بھی جوں کی توں قائم و دائم ہے۔ نہ وہ نباتات کی طرح پھلتی پھولتی ہے اور نہ نباتات ہی کی طرح خس و خاشاک بنتی ہے۔ حرکت و تبدیلی کی دنیا جس طرح حقیقتِ ازلی و ابدی کی جلوہ گاہ ہے اُسی طرح وہ اُس کی روایت کی بھی جلوہ گاہ ہے بلکہ روایت کا مطلب ہی حقیقت کا عالمِ ماسوا میں ظہور ہے جس کا سلسلہ نسل در نسل جاری ہے۔ یہ ضرور ہے کہ حقیقتِ ابدی الخفا کی طرح اُس کی روایت بھی مادّی معاشرے میں پردۂ خفا میں چلی جاتی ہے مگر وہیں سے پھر ظہور کرتی ہے جیسا کہ مغرب کے مادّی معاشرے میں اب پھر روایت کے ظہور کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ دورِ خفا میں روایت فنا نہیں ہوتی بلکہ بیش تر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک مخصوص اور محدود حلقے کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتی۔ روایت کے پردۂ خفا میں جانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ بیش تر لوگوں کے یہاں شعوری سطح پر رونما نہیں ہوتی۔ لیکن ایک محدود گروہ کے شعور میں جلوہ گر ضرور ہوتی ہے۔ روایت کو پورا گرہن کبھی نہیں لگتا اور نہ کبھی وہ فنا ہوتی ہے۔ حقیقتِ ازلی و ابدی سدا قائم ہے اور عالمِ ظاہر میں اس کی روایت بھی سدا قائم رہتی ہے۔

عسکری صاحب نے لکھا ہے کہ بنیادی روایت زبانی ہوتی ہے۔ یہ ایک ثقہ اور عادل راوی سے دوسرے ثقہ و عادل راوی تک منتقل ہوتی ہے اور دوسرے سے تیسرے تک۔ یوں اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس طرح یہ سدا زندہ حافظے میں موجود رہتی ہے۔ جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے اور روشنی کا ایک سلسلہ بن جاتا ہے اسی طرح روایت جاری رہتی ہے۔ تحریری روایت بنیادی نہیں ہو سکتی تحریری روایت کا ماخذ تحریری مواد ہوتا ہے جو فاسد بھی ہو سکتا ہے اور اُس کی تنقیح میں غلطی کا امکان بھی ہوتا ہے۔ دورِ جدید کی تحریریں اس بات کا کافی ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ اس کے برعکس زبانی روایت راوی کے عدل و ثقاہت کے ساتھ مشروط ہوتی ہے۔ اس میں شخصی نقطۂ نظر اور شخصی زاویۂ فکر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ راوی وہ کہتا ہے جو اسلاف سے سلسلہ وار سنتا ہے۔ اگر راوی میں شخصی نقطۂ نظر کا احتمال بھی پیدا ہو جائے تو وہ مستند نہیں رہتا۔ اُس کی جرح و تعدیل کے اصول روایت میں موجود ہیں۔ دراصل روایت شخصی نوعیت کی نہیں ہوتی بلکہ آفاقی ہوتی ہے۔ اُس میں شخصی نوعیت کے کسی عنصر کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ آسمانی کتابیں جو روایت کا سرچشمہ ہیں، اوّلاً مقدس ہستیوں سے زبانی سنی گئی تھیں، بعد میں ضبطِ تحریر میں آئی ہیں۔ اس لیے زبانی روایت کو بنیادی مانا گیا ہے۔ مغرب کا معاملہ قطعاً مختلف ہے۔ وہاں تحریری ثبوت کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے اور زبانی روایت کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔ یہ تحریری ثبوت اکثر Jesus The Myth Theory جیسی تحقیقات منظرِ عام پر لاتا ہے۔ یہ حقیقی واقعات و شخصیات کو اسطوری اور اسطوری

واقعات و شخصیات کو حقیقی بنا کر پیش کر سکتا ہے۔ دورِ جدید میں تحریری ثبوت نے اس قسم کے بہت سے کرشمے دکھائے ہیں۔ اس لیے تحریری ثبوت روایت کے سلسلے میں کوئی بنیادی اہمیت نہیں رکھتا۔ بنیادی روایت زبانی ہی ہوتی ہے۔

عسکری صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ روایت کی تشریح و توضیح روایت کے مستند نمائندے ہی کر سکتے ہیں۔ ان کو روایت کے علم میں پورا رسوخ ہوتا ہے۔ یہ روحانی فضیلت بھی رکھتے ہیں اور علمی فضیلت بھی۔ ہر کس و ناکس کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ روایت کی تشریح و توضیح کرے۔ لوگ اکثر خود سر ہوتے ہیں اور خودنمائی چاہتے ہیں۔ وہ شخصی عنصر کو آفاقی روایت میں ملاتے ہیں۔ روایت میں علم اور عالم دونوں کا معتبر ہونا ضروری ہے اور معتبر ہونے کا معیار یہ ہے کہ نہ روایت میں شخصی عنصر کی آمیزش کی جائے اور نہ شخصی پسند و ناپسند کو روایت کی تشریح و توضیح میں بروئے کار لایا جائے۔ اس طرح روایت کی تشریح و توضیح کا حق صرف روایت کے مستند نمائندوں کو حاصل ہوتا ہے۔

یہاں تک عسکری صاحب کے تصورِ روایت پر ہم نے جو کچھ عرض کیا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ مغرب میں روایت عادت کے ہم معنی ہے۔ لیکن مشرق میں روایت کا ایک مستند اور مابعدالطبیعیاتی تصور موجود ہے۔ مشرق میں بنیادی روایت ایک ہی ہے اور ذیلی روایتیں اس بنیادی روایت سے مربوط ہوتی ہیں۔ لیکن مغرب میں معاشرتی، تہذیبی اور ادبی روایتیں جدا جدا ہوتی ہیں جن میں کوئی ربط نہیں ہوتا۔ مغرب کا تصورِ حقیقت کچھ اور ہے مشرق کا تصورِ حقیقت کچھ اور۔ تصورِ حقیقت کے فرق سے مشرق و مغرب میں روایت کے تصور میں بھی فرق پیدا ہوا ہے۔ مشرق میں روایت آفاقی ہوتی ہے۔ مغرب میں شخصی روایت ہوتی ہے۔ بنیادی روایت زبانی ہوتی ہے مگر مغرب تحریری روایت کو مانتا ہے۔ اس خلاصے میں ہمارے لیے نہایت اہم بات یہ ہے کہ مشرق میں روایت نہیں بدلتی بلکہ وہ جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روایت میں رنگِ ثبات ہے۔ ہم نے ابتدا میں رنگِ ثبات کا سوال اُٹھایا تھا اور عسکری صاحب نے ہم کو یہ جواب دیا کہ یہ رنگِ ثبات مشرق کی روایت میں موجود ہے۔ یہ روایت حقیقتِ ازلی و ابدی سے وابستہ ہے اور ہم کو بھی حقیقتِ ازلی و ابدی سے وابستہ کر دیتی ہے۔ اب دیکھیے کہ اس لم یزل و لایزال حقیقت سے وابستگی میں قلب و نظر کی آسودگی کے لیے سب کچھ ہے۔ اس میں رنگِ ثبات ہے۔ مکان اور لامکانیت کا بہ یک وقت احساس ہے اور زمان و لازمانیت کی بہ یک وقت آگاہی۔ یہ عظیم تصورِ حقیقت انسان میں ایک خاص طرزِ احساس پیدا کرتا ہے جو ماورا سے بھی متعلق ہوتا ہے اور ماسوا سے بھی۔ یہ طرزِ احساس زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری ہوتا ہے۔ ادب میں یہ طرزِ احساس انسان کو جہاں رومی و جامی اور خسرو و سعدی کی محفل میں لے جاتا ہے، وہاں داغ و امیر کی شاعری سے بھی اُس کو بیگانہ نہیں کرتا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ طرزِ احساس ہر قسم کی شاعری اور نثر کی تفہیم کے لیے انسان کو ایک ذہنی معیار فراہم کرتا ہے۔ کوئی بھی شاعر ہو یا ادیب، ایک روایت شناس آدمی اُس

کے بارے میں یہ جان لیتا ہے کہ وہ حقیقت کے کس درجے سے بول رہا ہے اور حقیقت کے کسی درجے سے نہیں بول رہا ہے تو کہاں ٹانک ٹوئیاں مار رہا ہے؟ جہاں وہ ٹانک ٹوئیاں مارتا ہے وہ مقام بھی حقیقت کے کسی نہ کسی درجے کے اندر ہی ہوتا ہے، بس اس بات کا شعور اُس کو نہیں ہوتا لیکن روایت شناس قاری کو ضرور ہوتا ہے۔ اس طرح صرف ادب کی اقلیم کی اس بات سے بہ خوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ کتنا پائدار ادبی معیار انسان کو اس تصورِ حقیقت سے مل جاتا ہے۔ انسان کسی دور کے ادب سے قطعاً بیگانہ نہیں ہوتا بلکہ درجاتِ حقیقت کے اعتبار سے اُس کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ یہی رنگِ ثبات ہے جو ادبی نقطۂ نظر میں اپنا اظہار کرتا ہے۔ اب ذرا یہ ملاحظہ فرمایئے کہ مغرب میں طرزِ احساس بدلتا رہتا ہے۔ کیوں کہ مغرب حقیقت کو صرف حرکت و تبدیلی کی اقلیم میں محدود کرتا ہے اور یہ امر مسلّم ہے کہ تصورِ حقیقت سے ہی طرزِ احساس پیدا ہوتا ہے۔ مغرب میں حقیقت حرکت و تبدیلی کے سفر میں ہے، اس لیے وہاں کا طرزِ احساس بدلتا رہتا ہے۔ کلاسیکی شاعری سے رومانی شاعروں کو لگاؤ نہیں اور رومانی شاعری سے جدید شاعروں کو کوئی لگاؤ نہیں۔ سب اپنی اپنی کہتے ہیں اور سب الگ الگ طرزِ احساس رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارے روایتی طرزِ احساس میں اس نوعیت کی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ہم خسرو کے اس رنگ سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں:

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن مورا من پیو کا دونوں ایک ہی رنگ

میر کے اس شعر میں بھی سر دُھنتے ہیں:

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

غالب کے اس شعر کو بھی سمجھتے ہیں:

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

اور جدید شاعر کے اس مسئلے کو بھی سمجھتے ہیں:

مری آنکھیں کہیں ہیں دل کہیں ہے
مجھے یوں راستہ ملتا نہیں ہے

اب ادب کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ روایتی طرزِ احساس میں ایک رنگِ ثبات ہے۔ کیوں کہ روایتی طرزِ احساس ایک ابدی حقیقت سے وابستہ ہے اور اس ایک حقیقت کے درجوں میں وہ ہر دور کی شاعری کا خصوصی رجحان دیکھتا ہے۔ لہٰذا ہماری ادبی روایت میں رنگِ ثبات ہے۔ یہ ادبی روایت ایک مرکزی روایت سے نکلی ہے۔ اس مرکزی روایت کا سرچشمہ حقیقتِ ابدی ہے۔ یوں ہماری

روایت میں رنگِ ثبات موجود ہے۔ اسی کا سراغ ہم لگانا چاہتے تھے۔ مگر ذرا ٹھہریے۔ ابھی کچھ خدشات باقی ہیں۔ ان کا بھی جائزہ لے لیجیے، ہوسکتا ہے کہ یہ خدشات اتنے قوی ہوں کہ اُن کے آگے رنگِ ثبات محض سراب دکھائی دے۔

عسکری صاحب نے جو مشرق و مغرب کی تقسیم کی ہے، وہ کہاں تک درست ہے؟ سلیم احمد نے کہا تھا کہ مغرب ہمارے گھر کے آنگن تک آ پہنچا ہے اور اب یوں معلوم ہوتا ہے کہ مغرب نے ہمارے ذہنوں میں بھی اپنی فرودگاہ قائم کرلی ہے۔ اب تو مغرب کے رنگ ہی میں دنیا رنگ گئی ہے۔ ہر طرف حرکت و تبدیلی اور افراتفری کا عالم ہے۔ اس لیے رنگِ ثبات کی بات تو چھوڑیے، یہاں تو بنیادی مقدمہ ہی غلط معلوم ہوتا ہے۔ آیئے ذرا اس مسئلے پر غور کریں۔ یہ درست ہے کہ زمانۂ قدیم میں مشرق و مغرب جغرافیائی معنی میں الگ الگ اقلیموں کے نام تھے اور ان میں روایتی تہذیبوں کے مراکز تھے۔ مشرق میں قدیم ہند، قدیم چین اور سامی ادیان کی تہذیبوں کے مراکز تھے۔ مغرب میں قدیم یونان میں آرفک مذہب کی تہذیب موجود تھی۔ اس کے بعد یورپ میں مسیحی تہذیب کے مراکز قائم ہوئے۔ ان تہذیبوں سے مشرق و مغرب کی شناخت تھی۔ دورِ جدید میں مغرب کی یلغار سے یہ سارے تہذیبی مراکز تو افراتفری کا شکار ہوگئے مگر مشرقی تہذیبیں جس تصورِ حقیقت پر قائم تھیں وہ بہ دستور باقی رہا۔ البتہ مغرب میں حقیقت کا ایک ایسا تصور ابھر آیا جو پوری حقیقت کو حرکت و تبدیلی کے دائرے میں محدود کر دیتا ہے۔ اس طرح مشرق و مغرب کا طرزِ فکر اور طرزِ احساس جدا جدا ہوگیا۔ اب ہم مشرق کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مقصد ان مظاہر و معانی کا اظہار ہوتا ہے جو کہ مشرق کے تصورِ حقیقت سے پیدا ہوئے ہیں اور مغرب سے مراد وہ مظاہر و معانی ہوتے ہیں جو مغرب کے جدید تصورِ حقیقت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہم ان دونوں لفظوں سے بنیادی طور پر دو جغرافیائی خطّے مراد نہیں لیتے۔ کیوں کہ عملی طور پر یہ صورتِ حال ہے کہ مغربی فکر اور مغربی طرزِ احساس مشرقی خطّے کو بڑی حد تک اپنے دائرۂ اثر میں لے آیا ہے اور مشرقی فکر اور مشرقی طرزِ احساس مغربی خطّے میں اپنے لیے جگہ بنا رہا ہے۔ لہٰذا عسکری صاحب نے اپنے بنیادی مقدمے میں مشرق و مغرب کی جو تقسیم کی ہے وہ درست ہے۔ اب بہ قول کپلنگ، مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، یہ دونوں کیسے مل سکتے ہیں؟ اب تو یہی صورتِ حال ہے کہ مشرق و مغرب ایک دوسرے کے حریفِ معنوی ہیں۔ مشرق میں کششِ روحانی ہے اور مغرب میں میلِ جسمانی۔ دیکھنا یہ ہے کہ کششِ روحانی غالب آتی ہے یا میلِ جسمانی اپنی ساقِ صاف کی جھلک دکھلا کر مشرق کو مغلوب کرتا ہے۔

چلیے یہ بات تو صاف ہوگئی۔ مگر روایت کی حقیقی حریف یعنی جدیدیت کی بات باقی ہے۔ روایت انسان کو ایک حقیقت کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ انسان کے شخصی تجربے اور شخصی صداقت کی بات نہیں کرتی۔ جدید آدمی کہتا ہے کہ میں صرف اس حقیقت کو مانوں گا جس کی گواہی میرے داخلی تجربے میں موجود ہو۔ اُس صداقت کو ہرگز نہ مانوں گا جس کی گواہی میرے اندر موجود نہ ہو۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

اگر میرے اندر حقیقتِ ازلی و ابدی کی قبولیت کا کوئی داعیہ موجود نہیں تو اس کو کیوں مانوں؟ آپ میرے ساتھ زبردستی تو نہیں کر سکتے۔ اگر زبردستی کریں گے تو اس کے خوش گوار نتائج ہرگز برآمد نہیں ہوں گے۔ اس لیے رنگِ ثبات کی ثانوی بات تو چھوڑیے، یہاں تو حقیقتِ ازلی و ابدی کی قبولیت ہی نہیں۔ عسکری صاحب مولانا اشرف علی تھانوی اور شاہ وہاج الدین کو ادب میں لے آئے ہیں مگر مجھے تو ایلین گنز برگ (Allen Ginsberg) اور سال بیلو (Saul Bellow) کی باتیں اچھی لگتی ہیں اور ان باتوں کی قبولیت میرے دل میں ہے۔ پھر میں اپنے ان پیارے ادیبوں کی باتیں کیوں نہیں مانوں؟ لہٰذا میں روایتی تصورِ حقیقت کا بھی انکاری اور مابعد الطبیعیاتی روایت کا بھی انکاری ہوں۔ میری شیفتگی تو صرف جدیدیت سے ہے کیوں کہ جدیدیت شخصی صداقت کی بات کرتی ہے۔ ہم سب کی اپنی اپنی سچائیاں ہیں اور ہم ان سچائیوں پر کاربند ہیں۔ یہ روایت کا چکر ہی غلط ہے۔

جدید آدمی نے اپنا موقف بڑے پُرجوش انداز میں بیان کیا ہے۔ اس موقف کا معروضی انداز سے جائزہ لیا جائے تو چند باتیں سامنے آتی ہیں اور ان باتوں پر غور کر کے ہم جدیدیت کے بنیادی مغالطے تک پہنچ سکتے ہیں۔ جدیدیت داخلی تجربے کو بنیادی اہمیت دیتی ہے اس لیے جدید آدمی کہتا ہے کہ وہی سچ ہے جس کی گواہی میرے اندر موجود ہے۔ وہ دوسری بات یہ بیان کرتا ہے کہ اگر حقیقتِ ازلی و ابدی کی قبولیت کا داعیہ میرے اندر موجود نہیں ہے تو اس کو کیوں مانوں؟ تیسری بات یہ ہے کہ وہ مولانا اشرف علی تھانوی اور شاہ وہاج الدین کے ناموں سے بھڑکتا ہے اور ان بزرگوں کے بجائے مغربی ادیبوں کے ناموں سے اُس کو بہت اُنسیت ہے۔ آیئے ان باتوں کا ایک ایک کر کے جائزہ لیں۔

جہاں تک داخلی تجربے کی بات ہے تو یہ دیکھیے کہ جدید آدمی صداقت کا معیار اپنی ذات کو قرار دے رہا ہے۔ اس کے نزدیک صرف وہی سچ ہے جس کی گواہی اس کے اندر موجود ہے۔ اس معیار کو تسلیم کر لیا جائے تو معروضی طور پر صداقت نام کی کوئی شے باقی ہی نہیں رہے گی۔ فرعون کی اپنی صداقت ہوگی اور حضرت موسیٰؑ کی اپنی صداقت، شداد کی اپنی صداقت ہوگی اور حضرت ہودؑ کی اپنی صداقت، نمرود کی اپنی صداقت ہوگی اور حضرت ابراہیمؑ کی اپنی صداقت۔ اسی طرح ہٹلر اور مسولینی کی اپنی اپنی صداقتیں عہدِ جدید کے ضمیر کی صداقت کے مقابل ہوں گی۔ اہلِ ایمان کی صداقت اپنی جگہ ہوگی اور اہلِ کفر کی صداقت اپنی جگہ۔ یہ طے کرنا مشکل ہو جائے گا کہ کس کی صداقت آخری صداقت ہے۔ بہ الفاظِ دیگر صداقت کا کام ہی تمام ہو جائے گا۔ لہٰذا پتا چلا کہ صداقت کو شخصی اور موضوعی قرار دینا دراصل صداقت کا کام تمام کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن روایت کے نقطۂ نظر سے صداقت غیر شخصی اور آفاقی ہے۔ وہ اس طرح شخصی نہیں ہو سکتی جس طرح وجودیوں کے نزدیک صداقت شخصی ہوتی ہے۔ دورِ جدید نے جس طرح

کے انتخاب، آزادی اور ذمہ داری کے اصول وضع کیے ہیں ان میں خوش فہمی اور خود فریبی کے عناصر بہت نمایاں ہیں۔ یہ من مانی کرنے کے کم زور منطقی جواز کے سوا کچھ نہیں۔ ان کا صداقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ صداقت تو آفاقی ہوتی ہے اور یہ صداقت قلب انسانی میں اس طرح اترتی ہے جس طرح آئینے میں عکس۔ اگر آئینہ ہی زنگاری ہو تو اس کا زنگ دُور کرنا چاہیے نہ کہ زنگ کو صداقت قرار دینا چاہیے۔ زنگ صاف ہوگا تو عکس رخِ صداقت آئینے میں ضرور جلوہ فرما ہوگا۔

حقیقتِ ازلی کا مسئلہ، اُس کے وجود کے مسئلے سے قطعاً مختلف ہے۔ ان دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ حقیقتِ ازلی و ابدی کا وجود ہے۔ اُس کی نشانیاں آفاق و انفس میں پھیلی ہوئی ہیں مگر جدید آدمی کہتا ہے، اس کے ذہن میں اس حقیقت کی قبولیت نہیں ہے۔ قبولیت اُس کے یہاں نہیں ہوگی مگر اس بنیاد پر اس حقیقتِ ازلی و ابدی کے وجود سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جدید آدمی جو کہ محض ایک حسّی تہذیب کا نمائندہ ہے، صرف اس عالمِ حواس کی خارجی دنیا اور صرف اس ارضی زندگی تک حقیقت کو محدود تصور کرتا ہے۔ وہ خود اپنی ہستی کے اعلیٰ امکانات سے ناواقف ہے۔ وہ حجاب میں زندہ ہے اور حجاب ہی میں زندہ رہنے پر مصر ہے۔ اس لیے حقیقتِ ازلی و ابدی کی قبولیت اُس کے اندر نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہو اور سورج اُس کو نظر نہ آئے تو اُس کا یہ مطلب نہیں کہ سورج سرے سے موجود ہی نہیں۔ سورج کو دیکھنا مقصود ہے تو آنکھوں کی پٹی کھولنا پڑے گی۔ مگر جدید آدمی آنکھوں کی پٹی کھولنا نہیں چاہتا اور کہتا ہے کہ آفتابِ حقیقت موجود نہیں ہے۔ اس سے حقیقت کے وجود پر قطعاً کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جدید آدمی ہمارے واجب الاحترام بزرگوں کے نام سے بھڑکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان بزرگوں کے کام کی قدر و قیمت کا کوئی شعور نہیں رکھتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ اگلے وقتوں کے لوگ تھے اور ان کا علم بھی اگلے وقتوں کا تھا۔ دورِ جدید کے تقاضوں سے اُس علم کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے دورِ جدید کو سمجھنے اور اُس کے مسائل کا حل تلاش کرنے میں اس علم سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ اس کے برعکس وہ دورِ جدید کے مصنفین کو مشکلاتِ حیات کا مسیحا تصور کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہی مصنفین اُس کو حقیقت سے روشناس کرائیں گے۔ جدید آدمی کی اس لاعلمی کا علاج تو علم سے ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن جدید آدمی اگر تریاق کی تلاش عراق کے بجائے امریکا یا انگلینڈ میں کرنا چاہتا ہے تو اُس کو اُس مسافر کی حکایت سنانے کے سوا ہم اور کیا کرسکتے ہیں جو کوفے سے مدینہ جانے کے لیے بار بار روانہ ہوتا تھا، مگر ہر بار راستہ بھول کر واپس کوفے ہی میں پہنچ جاتا تھا۔

دراصل جس رویّے کو ہمارے دور میں جدیدیت کہا جاتا ہے، وہ ایک انحرافی رویّہ ہے۔ یہ روایت سے روگردانی کا دوسرا نام ہے۔ یہ رویّہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا قصۂ آدم و ابلیس قدیم ہے۔ بنی آدم کی تاریخ کے ہر دور میں یہ مختلف ناموں سے رونما ہوتا رہا ہے۔ ہمارے دور میں اس کا نام جدیدیت ہے جب کہ اس میں کچھ بھی جدید نہیں۔ یہ تو سراسر انحراف ہی ہے۔ لیکن قدیم ادوار کے مقابلے میں ہمارے

دور میں یہ رویہ ہمہ گیر ہے۔ ہمارے دور میں مغرب کے اثر سے مذہب میں بھی جدیدیت آئی ہے۔ تہذیب و معاشرت میں بھی جدیدیت آئی ہے اور ادب و فنون میں بھی جدیدیت آئی ہے۔ اس ہمہ گیر جدیدیت کے مقابلے میں عسکری صاحب نے تن تنہا جنگ لڑی ہے اور پوری قوت سے روایت کی حمایت درایت سے کی ہے۔ چناں چہ عسکری صاحب کے مخالفین میں منکرینِ مذہب بھی ہیں اور وہ لوگ بھی ہیں جو جدید اسلام کے دعوے دار ہیں، تہذیب دشمن لوگ بھی ہیں اور جوشیلے انقلابی بھی ہیں، وہ لوگ بھی ہیں جو ادب کو غیر ادب بنانے پر آمادہ ہیں اور وہ لوگ بھی جو روایتی فنون کی باقیات کا ملیامیٹ کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم ان سب کو جدیدیت پسند کہیں گے کیوں کہ ان سب کا مشترک مقصد روایت سے انحراف ہے، خواہ یہ انحراف مذہبی روایت سے ہو، معاشرتی روایت سے ہو، تہذیبی روایت سے ہو یا ادبی روایت سے۔

اب ہم روایت کے مفہوم سے بھی واقف ہو چکے اور جدیدیت کے مفہوم سے بھی۔ لہٰذا ہم اُس سوال پر دوبارہ توجہ کرتے ہیں جو ہم نے اس مضمون کے شروع میں اٹھایا تھا۔ ہم نے دریافت کیا تھا، کیا حرکت و تبدیلی کی اس وسیع جولاں گاہ میں کہیں رنگِ ثبات ہے یا نہیں؟ روایت اس کا جواب اثبات میں دیتی ہے۔ اُس کا موقف یہ ہے کہ اس متغیر دنیا میں جو کچھ ہے، وہ ایک غیر متغیر حقیقت سے وابستہ ہے۔ اس حقیقت سے وابستگی کی بنا پر اس دنیا کی چیزوں میں بھی ایک رنگِ ثبات آجاتا ہے، ایک ایسا سکون جو حرکت کے مقابل تو نہیں ہوتا مگر مقدارِ حرکت کو فطری حدود میں رکھتا ہے۔ جس طرح جدید دنیا میں آپا دھاپی مچی ہوئی ہے، اس طرح کی صورتِ حال ایک روایتی معاشرے میں نہیں ہوتی۔ روایتی معاشرے میں مقدارِ حرکت فطری ہوتی ہے۔ یوں نہیں ہوتا کہ جس کو دیکھو وہ سر پر پاؤں رکھے بھاگا چلا جاتا ہے۔ جدید معاشرہ حقیقتِ ماورائی سے کٹ چکا ہے۔ اس لیے فطری کم و کیف کے توازن کو کھو بیٹھا ہے۔ اس میں مقدارِ حرکت غیر فطری ہے، جو انسان کے جسم و جاں کو بے حال کیے دیتی ہے۔ اس میں کیف و کم کا توازن قطعاً بگڑ چکا ہے۔ اس لیے رنگِ ثبات کی ہمیں تلاش ہے۔ یہ درست ہے کہ انسان ہر آن بدلتا ہے اور وہ دنیا بھی ہر آن بدلتی ہے جس میں انسان رہتا ہے مگر بدلنے کی نوعیت ایک تو فطری ہوتی ہے اور دوسری غیر فطری۔ ہم رنگِ ثبات کی جستجو اس لیے کر رہے ہیں کہ ایک غیر فطری صورتِ حال سے فطری صورتِ حال میں آجائیں۔ اس دنیا میں رنگِ ثبات اس فطری صورتِ حال کے سوا کچھ اور نہیں اور عسکری صاحب کے تصورِ روایت سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ یہ رنگِ ثبات روایت میں موجود ہے۔

☆☆☆

ادیب سہیل

''وقت کی راگنی'' کے حوالے سے چند باتیں

''خیال'' کے حوالے سے محمد حسن عسکری صاحب اپنے عالمانہ مضمون ''وقت کی راگنی'' کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> خیر جو بھی صورت حال ہو، قطعی نتائج مرتب کرنا میرا منصب نہیں۔ میرا مقصد تو صرف اتنا تھا کہ لفظ خیال کے مختلف معانی ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ جتنی معلومات مجھ سے فراہم ہوئیں، وہ سب ابتدائی باتیں ہیں۔ مگر میں اسلامی علوم کا مبتدی بھی نہیں۔ اپنی طرف سے پوری احتیاط برتی ہے کہ کتابوں سے جو کچھ نقل کروں، پہلے تھوڑا بہت سمجھ لوں اور درست نقل کروں۔ جو باتیں نقل ہوگئیں وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوئیں جو غلطیاں ہوئیں وہ میری طرف سے ہوئیں۔

عسکری صاحب کے اس اختتامیہ کو اپنے مضمون کی تمہید بنا کر مجھ کو چھتر چھاؤں کا احساس ہو رہا ہے۔ اور اس پُرخطر راستے میں چلنے میں قوت و طمانیت محسوس ہو رہی ہے۔

''وقت کی راگنی'' کو میں نے بڑے چاؤ سے پڑھنے کا آغاز کیا لیکن جلد ہی معلوم ہوگیا کہ راگ داری سے براہِ راست اس کا تعلق نہیں، البتہ لفظ خیال کے توسّط سے ایک طویل عالمانہ و فلسفیانہ بحث اس میں موجود ہے اور ہندوستانی موسیقی کی اہم صنف ''خیال'' تک بھی ضمناً اس بحث کا سلسلہ دراز ہوتا ہے۔ اردو کے مشہور ناقد محمد حسن عسکری کی یہ عالمانہ بحث ہماشما کے بس کی بات نہیں، ایک قرأت اس طویل مضمون میں کہے گئے نکات کو پلّے میں باندھنے کے لیے کافی نہیں۔ اس لحاظ سے عسکری صاحب کی ''وقت کی راگنی'' وقت کی راگنی سے کہیں زیادہ ہمہ وقت کی راگنی ہے جو جہت در جہت ہے، افق اور عمود کی مُنتہیات سے باخبری رکھتا ہے اور ختم ہونے کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس کی قرأت جاری ہے۔

ایک لحاظ سے عسکری صاحب کی ''وقت کی راگنی'' پر بے وقت کی راگنی کی تہمت بھی لگائی

جا سکتی ہے کہ اب لفظ ''خیال'' کو اس سطح پر سمجھنے والے اشخاص خال خال کے زمرے میں آتے ہیں جس سطح پر عسکری صاحب نے اس کی تفہیم کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کے قاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ دنیا بھر کے علم پر دسترس رکھتا ہو، اگر ایسا ممکن نہیں تو کچھ علم اس کے قابو میں ہو اور کچھ کی شُدبُد رکھتا ہو۔

کتاب کے کم و بیش چالیس صفحات کے اس مضمون کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان چالیس صفحات میں ان سے کئی گنا زیادہ صفحات کے مباحث بیان ہو گئے ہیں۔ کہیں ''خیال'' کے حوالے سے مجدّد الف ثانی اور ابن العربی کے متصوّفانہ نکات کی گرہیں کھولی جا رہی ہیں، کہیں عام تصوّف کا کوئی سلسلہ زیر بحث ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ''خیال'' ایک سیارہ ہے جس کے گرد ہمہ رنگ مباحث گردش میں ہیں۔

عسکری صاحب نے اس ایک لفظ خیال کے معنی، مطالب، ماخذ اور کھوج کی جستجو اور چھان بین کرتے ہوئے صفحے کے صفحے رقم کر ڈالے ہیں، ایک عنوان پر سو رنگ اور سو جہات سے روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے اور خیال یہ رہا ہے کہ اس موضوع کا کوئی ایک گوشہ بھی اَن کہا نہ رہ جائے۔ مزید برآں عسکری صاحب کی مغربی و مشرقی علوم پر غائر نظر جا بہ جا تقابلی مطالعے کے طور پر نمود کرتی رہتی ہے۔ البتہ آخری چند صفحات میں بیان میں تیز گامی نظر آتی ہے۔ اور راگ و دیا کی جان کاری نہ ہونے کی وجہ سے، جس کا عسکری صاحب نے کھلے دل سے اعتراف بھی کیا ہے، اس سے دامن بچا کے نکل جانے ہی میں عافیت جانی ہے اور اگر کچھ کہا بھی ہے تو استاد امراؤ بندو خاں کی زبانی کہلوا دیا ہے۔ استاد امراؤ بندو خاں دہلی گھرانے کے بے بدل سارنگی نواز استاد بندو خاں کے صاحب زادے اور نامور موسیقار استاد ممّن خاں کے نواسے تھے۔

یہاں سے بحث پھسل کر موسیقی کی حرمت و حلت پر آجاتی ہے، ''احیاء العلوم'' کا در کھل جاتا ہے جس کے صفحات پر حرمت و حلت کے باب میں مسالکِ صوفیہ کے موقف سے جان کاری ہوتی ہے۔ اس بارے میں عسکری صاحب صرف ناظر کا فرض ادا کرتے ہیں، راگ داری و موسیقی پر کوئی واضح لائن اختیار نہیں کرتے، اس طرح ہم ان کے موقف کو جاننے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس ضمن میں عسکری صاحب کا انداز پس و پیش والا ہے۔

جہاں تک میرے ناقص علم کا تعلق ہے، وہ یہ کہ اسلام کے ورودِ مسعود کے بعد جس مقام پر اوّل اوّل اس دین کا تجربہ ہوا، وہاں کلچرل ورثہ (cutural heritage) کے طور پر موسیقی پہلے سے اپنا مضبوط وجود رکھتی تھی۔ میرا اشارہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف ہے جن پر چار صحفِ سماوی میں سے ایک صحیفہ زبور اترا تھا۔ جن کا معجزہ ''لحنِ داؤدی'' مشہور ہے۔ اس ناتے صحائفِ سماوی میں ''الحان'' کا مقام مطعون نہیں مکرّم ہے۔

اسلام میں لحن و موسیقی اگر بنیادی فنوں کا درجہ نہیں بھی رکھتے ہوں پھر بھی قبل از اسلام کے

ثقافتی ورثے کے طور پر موسیقی کے جاری وساری طرز ورنگ کو اسے اپنانے پر مجبور ہونا پڑا ہوگا۔ یوں بھی کوئی مذہب یا کوئی نظریہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے تو وہ وہاں معلق نہیں رہ سکتا۔ وہ جہاں بھی جاتا ہے وہاں کے آب و ہوا، وہاں کے تقاضے اور وہاں کی تہذیب وثقافت کے ساتھ گھل مل کر ایک نیا رخ اختیار کرتا ہے۔ مذہب ونظریہ کی بقا وفروغ کے لیے ضروری ہے کہ وہ جہاں جائے وہاں کی اعلیٰ اقدار سے اپنا رشتہ جوڑے لیکن ادنیٰ اقدار کو بھی خاطر میں رکھے۔ اس حوالے سے کچھ اور باتیں بھی کی جاسکتی تھیں، مثلاً مولانا جعفر پھلواری کی تصنیف ''اسلام میں موسیقی'' سے یہ فقرہ نقل کیا جاسکتا تھا جس میں انھوں نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہ ملے گی جو موسیقی کی حرمت پر بحث کرتی ہو۔ بہرحال اس حوالے سے کچھ اور باتیں بھی کی جاسکتی تھیں لیکن عسکری صاحب نے یہ کہہ کر باتوں کی پیش قدمی روک دی ہے:

> لیکن موسیقی ہمارے ہاں ثانوی درجہ رکھتا ہے۔ اس میں اضافہ نہ ہوا تو نہ ہو، ثانیاً اس سوال کا جواب دینے کے لیے تاریخ کا علم... جو مجھے میسر نہیں۔

ایسی گفتگو کو میں بھی، اپنا عذر لنگ بنا کر اس بحث کو یہیں ختم کرتا ہوں۔

آگے چل کر لفظ ''خیال'' کی وساطت سے عسکری صاحب ایک اور عنوان سے اظہار خیال کرتے ہیں:

> سامع کو راگ ادنیٰ خیال سے اعلیٰ تر خیال کی طرف منتقل کرتا چلا جاتا ہے اور مطمحِ نظریہ ہوتا ہے کہ خیال کی قید سے آزادی حاصل کی جائے۔ غرض خیال گائکی کا مقصد یہ ٹھہرا کہ سننے والا ہر درجے کے خیال کو قبول کر کے اس کی گرفت سے آزاد ہو، اور اگلی سیڑھی اختیار کرے۔ اور اس طرح زینہ بہ زینہ خیال کا ارتقا ہوتا رہے...

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ عسکری صاحب ایک خیال سے دوسرے خیال کی جانب مراجعت کرنے یا منتقل ہونے کو ''خیال'' کی آزادی کا سفر کہتے ہیں یعنی وہ خیال کے اپنے قالب سے منتقل ہو کر اگلے قالب میں آنے کو ارتقا کا نام دیتے ہیں۔ خیال کے اس سفر میں بہ قولِ عسکری صاحب ایک مقام وہ بھی آتا ہے جہاں مزید مراجعت ختم ہو جائے۔ اس مقام کو عسکری صاحب نے خیال کے ارتقا کا انتہائی مقام متصور کیا ہے۔ اور شاید یہی وہ مقام ہے جہاں اعلیٰ موسیقی کو برتنے والے گُنیوں نے بھگوان تک رسائی کا وسیلہ جانا ہے۔

عسکری صاحب صوفیہ کے حوالے سے ''خیال'' کا ایک اور انداز میں جلوہ کرتے ہیں:

> صوفیہ میں یہ لفظ ایک اور طرح بھی استعمال ہوتا ہے۔ عالم مثال کو بھی خیال کہتے ہیں۔ اور یہ ایک عالمِ برزخ ہے، عالمِ اجسام اور عالمِ ارواح کے

درمیان۔ چناں چہ موسیقی یا خیال گائکی اتنا روحانی فائدہ تو پہنچا ہی سکتی ہے کہ آدمی کو عالمِ اجسام سے نکال کر عالمِ ارواح تک لے جائے۔ عالمِ مثال میں اٹک کر رہ جانے میں بہت سے خطرے ہیں لیکن بہ نفسہٖ یہ بھی ایک عظمت رکھتا ہے۔

یہاں حسن عسکری ابن عربی کے اعیانِ ثابتہ، فیثا غورث کے اعداد اور افلاطون کے اعیان کو ایک سیدھ میں کھڑے دیکھتے ہیں۔ اس موقعے پر یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ ''افلاطون کے اعیان تعلق عالمِ مثال سے ہے۔''

آگے چل کر حسن عسکری صوفیہ کے حوالے سے یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک ''خیال'' سے مراد خیالِ حق بھی ہے جو آدمی خواب میں دیکھے یا بیداری میں تصور کرے یعنی ''خیال'' کے بغیر حق تعالیٰ سبحانہٗ کو جاننا ممکن ہی نہیں۔ اس طرح عسکری صاحب نے سیدھا سادا مطلب یہ نکالا کہ خیال گائکی حق تعالیٰ کو جاننے کا ذریعہ ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر خاکم بدہن یہ خیال گزرتا ہے کہ کہیں خیال اور خدا ایک دوسرے کا نعم البدل یا ایک تو نہیں؟ جہاں تک ''خیال'' کے خدا رسی کا وسیلہ ہونے کا تعلق ہے تو وہ مذکورہ عبارت سے بھی ظاہر ہے۔

یہ بحث مجاہدے کی منزل میں داخل ہوا چاہتی ہے، اس لیے اس مبحث کا رخ موڑ کر ''خیال'' کو کسی اور آئینے میں دیکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ اور ''خیال'' کے سلسلے سے عسکری صاحب کے ایک اور خیالیے کی جانب راجع ہوتے ہیں جسے پڑھ کر ان کے علمی استعداد، استغراق و استحسان کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

عسکری صاحب نے پانچ ظاہری حواس (دیکھنے، سونگھنے، سننے، چھونے اور چکھنے) کے ساتھ پانچ باطنی حواس کا بھی ذکر کیا ہے: حسِ مشترک، خیال، وہم، حافظہ، متصرفہ...اور پھر آ[illegible] کر آخر الذکر حس کو اول الذکر حس کا جامع بتایا ہے، ساتھ ہی خیال کو حواسِ باطنی میں نمبر۲ پر شمار کیا ہے۔ اور رشتے کے اعتبار سے سب حواس کو ایک دوسرے کی صورت یا ملی جلی صورت متصور کیا ہے۔ عسکری صاحب کے قول کے مطابق ''بیدل کے کلام میں یہ مدرکات اتنی فراوانی سے ملتے ہیں کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں اور یہ سوچنے لگ جاتے ہیں کہ مغربی شاعری کو پڑھے بغیر بیدل ایسا کام کس طرح کر گزرے؟'' اس سوال کا جواب خود عسکری صاحب اپنی سلفی و ابتدائی درسی کتابوں میں دیتے ہیں (جو درسِ نظامیہ کے نصاب میں شامل تھیں)۔ یوں بھی کسی عنوان کا اختراع ایک دم سے وجود میں نہیں آجاتا اس کا اور چھور ماضی میں پیوستہ ہوتا ہے اور کئی ذہنوں سے گزرتا ہوا کسی ایک ذہن میں حتمی صورت اختیار کرتا ہے۔

عسکری صاحب نے بیدل کے حوالے سے آگے بڑھ کر فرانسیسی شاعر راں بو کے اس قول کی یاد دہانی کرائی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''شعرا بالقصد حواسِ خمسہ میں انتشار پیدا کریں تاکہ وہ ایک

دوسرے میں تبدیل ہو جائیں راں بو تو یہاں تک کہہ گزرتا ہے کہ اس عمل سے ایک نئے انسان اور ایک جنتِ ارضی کی تخلیق بھی ممکن ہو سکتی ہے۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ بیدل نے بھی اپنی مثنوی عرفان میں ''خلقِ جدید'' کی بشارت دی ہے۔ عسکری صاحب کے ایک پرستار ضمیر علی بدایونی اپنی کتاب ''جدیدیت و مابعد جدیدیت'' میں ایک جگہ بیدل کی شناخت کیر کے گور اور ہیڈیگر کے پیش رو کے طور پر کرتے ہیں۔

عسکری صاحب نے راں بو کے ارادی انتشار کی ضرورت کے فلسفے کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''ہماری درسی کتب کے مطابق حواس ایک دوسرے میں منعکس ہوتے رہتے ہیں۔ یہ طبعی عوامل کا حصہ ہیں''۔ یہاں رولاں بارت کی فکر کا یہ بنیادی نکتہ پیشِ نظر رہے کہ کائنات کی ہر شے رشتے کی محتاج ہے، رشتہ اس کا استحکام اور اس کی معنویت کی پہچان ہے۔ اشیا کے بیچ سے اگر رشتہ نکال دیا جائے تو ان کا انہدام ہو جائے گا۔ شاید اسی بات کو پنڈت برج نرائن چکبست نے ایک اور انداز سے کہا ہے:

زندگی کیا ہے! عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے، انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

آگے چل کر ''خیال'' کے ضمن میں عسکری صاحب کہتے ہیں:

...غرض اصطلاح میں خیال کے ابتدائی معنی ہیں، وہ قوت جو حواسِ ظاہری کے وسیلے سے ادراک میں آنے والی چیزوں کی صورتوں کو محفوظ رکھے اور جب وہ چیزیں سامنے سے غائب ہوں تو ان کی صورتوں کو ذہن میں لے آئے...

اس مقام پر مجھے بیدلؔ کا یہ نکتہ یاد آرہا ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

دل میں کوئی تصور پیدا نہیں ہو سکتا جس کا مشاہدہ جزواً یا کلاً خارج میں نہ کیا ہو...

یعنی خارج ہی تصوّر (خیال) کی اساس ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ خارجی مشاہدات ہی حواسِ ظاہری کے ذریعے سرمایۂ خیال بنتے ہیں یعنی خیال کے باثروت ہونے کا انحصار مشاہدات پر ہے۔

''وقت کی راگنی'' میں عسکری صاحب کی تحریر کا وتیرہ یہ رہا ہے کہ کہیں آہستہ خرام ہے، کہیں تیز روی اختیار کی ہے لیکن دو ایک مقامات پر جست سے بھی کام لیا گیا ہے۔ ایسی ہی ایک جست انھیں دھرپد اور خیال کے امکانات کے روبرو لا کھڑا کرتی ہے۔ بساط بھر موسیقی کی ان دو بڑی اصناف کے فرق پر سرسری نگاہ ڈالنے کی کوششیں کرتے ہیں اور استاد امراؤ بندو خاں کے اس قول کو دوہراتے ہیں کہ ''دھرپد پیٹ کی گائکی ہے اور خیال سینے کی گائکی ہے۔'' اور اس وسیلے سے عسکری صاحب نے کہیں دھرپد کو زمنی اور افقی کہا ہے اور خیال کو عمودی کہہ کر شناخت کی ہے اور اس کا رشتہ مابعد الطبیعیاتی حلائق سے بھی جوڑا ہے۔ خیال کے ضمن میں اپنے موقف کو صوفیہ کے ذکر سے تقویت پہنچائی ہے اور دھرپد کے مقابلے میں خیال کو مسلمانوں کی گائکی سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا بہت سا وقت لفظ خیال کی فلسفیانہ توضیح و

توجیہ میں صرف ہوگیا۔ میرے جیسا قاری اس بات کی توقع کر رہا تھا کہ عجمی و عربی موسیقی کے جس تال میل سے ہندی گائکی میں ''خیال'' صورت پذیر ہوا ہے، وہ اس پر وضاحت سے گفتگو کریں گے، جس کی وجہ سے دھرپد کے مقابلے میں خیال نے برصغیر کی گائکی میں اس طرح قدم جمایا اور اس طرح مقبول ہوا کہ پھر دھرپد کا چراغ جل نہ سکا۔ ایسا کیوں ہوا، اس کے اسباب کیا ہوسکتے ہیں؟ اس کو جاننے کے لیے ڈھاکا یونی ورسٹی کے ڈاکٹر عبدالحلیم کے انگریزی مضمون Origin And Evolution Of Kheyal in Pakistan-India کا اقتباس پیش کرتا ہوں جو ان کی کتاب ''ہسٹری آف انڈو پاک میوزک'' میں شامل ہے:

> Indian art is spiritual in content, Muslim art is Seenlar. The Muslim Mosque is not a temple where God dwells, it is assembly house for prayer, applied to the domain of music. Music as an art was cultivated by the Muslims for art's sake, as a means of joy and beauty, as an agency for the flight of the senses to diverse experiences and hence it was remarkable for its fulness and glitter, decorousness and refinement.

ڈاکٹر عبدالحلیم کی اسی کتاب میں، ان کا ایک مضمون ''موجِ موسیقی'' کے نام سے شامل ہے۔ یہ ایک فارسی مخطوطہ ہے جس کے مصنف محمد لال خاں برنی ہیں۔ یہ مخطوطہ انھیں ہردوا گنج (علی گڑھ ضلع) میں پرانے مسودوں کا کاروبار کرنے والے ایک بزرگ مولوی حضور احمد سے دستیاب ہوا تھا۔ یہ مخطوطہ ۳رجولائی ۱۷۲۹ء میں رقم ہوا۔ جو محمد شاہ بادشاہ کا دور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ کے دور ہی میں خیال گائکی کو ان کے درباری گویّے ''سدارنگ'' کے ذریعے نئی زندگی ملی۔

ڈاکٹر حکیم کے دریافت شدہ مخطوطے ''موجِ موسیقی'' سے عجمی راگوں کے ہندی گائکی پر معتدبہ اثرات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لال خاں برنی نے اپنے مخطوطے میں عجمی راگوں اور ہندی راگوں کی ایک مشابہتی فہرست دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''خیال'' عجمی موسیقی اور ہندی موسیقی کے تال میل سے صورت پذیر ہوا ہے۔ یہ فہرست نہ صرف معلوماتی ہے بلکہ دلچسپ بھی ہے۔ یہاں من و عن اس فہرست کو پیش کیا جا رہا ہے تاکہ موسیقی کے شائقین اس سے باخبر رہیں:

فارسی	ہندی
شعبۂ مخالف	رام کلی
عراق	بھیروں
دراسرار	پوربی اور مالوہ
مغلوب	بھاس

فارسی	ہندی
قندھاری فراق	مالکوس اور پوریا
نوروز	للت پنچم
نشاپور نہاوند	بلاول
زنگولا چہارگاہ	اساوری
نہاوند	سگھرائی
چہارگاہ	گوجری
حسینی	ٹوڈی جونپوری
(شعبہ) اسیراں	جیت سری
نشاپور	بڈہنس، سارنگ
نوا	بے وتی
رہاوی	دھناسری
پیدائے ازل	کھٹ
زنگولا اعجاز	جیت گوری
مبرقعہ کرشمہ	بہاگرا
پنج گاہ	نٹ نارائن
صغیر	ایمن کلیان
بیعت	کانڑا۔ درباری
گوشۂ عجم	شدھ ٹوڈی

فارسی اور ہندی راگوں کی اس فہرست کے بارے میں پروفیسر عبدالحلیم کی آرا بھی فارسی اور ہندی راگوں کے رشتے سے متعلق پچھلے صفحات میں دیے گئے معروضات و موقف کی تائید کرتی ہے:

> The above list conclusively proves that the Muslims came to India with Musical System which was not far different from its Indian counterpart. They accepted the basic rules of Indian music, but enriched it with new melodies, new instruments and new modes of singing...

یہ تو فارسی اور ہندی راگوں کے ہم آہنگ اور ہم صورت ہونے کی دلیل میں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند راگ پیش کیے گئے ہیں ورنہ ان سے بھی کہیں زیادہ راگ نکل آئیں گے جو عجمی و

ہندی راگوں کے میل ملاپ سے صورت پذیر ہوئے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی موسیقی تو ایک لق و دق صحرا ہے جو بھرت کے سنگیت رتنا کر سے شروع ہو کر، راگ درپن، ''معدن الموسیقی''، ''موجِ موسیقی''، ''معارف النغمات'' اور ''اصول النغمات'' پر آ کر رکتا ہے (موسیقی پر اردو فارسی کی کتب اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں) اور یہ ہر نوع کی موسیقی سے متعلق معلومات کے درہم پر مذکورہ کتب کے توسط سے کھلتا ہے۔

اس وقت میرے ذہن میں راگ راگنیوں کا دفتر کھل گیا ہے، اگر اسے چھوا تو بھٹک کر کہاں سے کہاں چلا جاؤں گا اور موضوع کا سرا ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔ صرف اس قدر کہہ کر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ راگ راگنیوں کی اپنی ایک آباد اور وشال دنیا ہے۔ گرنتھ کی رُو سے چھ راگ یعنی چھ پُرش ہیں، بھیروں، مالکوس، ہنڈول، دیپک، سری، میگھ۔ گرنتھ میں ایک مت کے مطابق ہر راگ کی چھ راگنیاں یا استریاں ہیں اور دوسرے مت کے حساب سے ہر راگ کی پانچ راگنیاں یا استریاں ہیں۔ پھر ان کے پُتر، پُتریاں، بھارجائیں ہیں۔ اس طرح ایک پورا کنبہ مرتب ہوتا ہے۔ ان کے اپنے مزاج، موسم، رنگ، ستارے اور اثرات ہیں۔ مصوروں نے بیش تر راگنیوں اور راگوں کی خیالی شبیہیں بھی بنا ڈالی ہیں جن کی وجہ سے موسیقی صورت میں ڈھل گئی ہے۔

جب ہم ''خیال'' کے ارتقائی سیاق و سباق پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس صنفِ موسیقی کا چلن برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ شروع ہوگیا تھا۔ اسی لیے ناقدین موسیقی ''خیال'' کی صورت پذیری میں حضرت امیر خسرو اور سلطان حسین مشرقی کی ابتدائی خدمات کو بھی یاد کرتے ہیں۔ مغل بادشاہ محمد شاہ کے دور میں صنفِ خیال بالغ ہو جاتی ہے اور درباری گویے نعمت خاں سدا رنگ کی سرپرستی میں اس صنفِ موسیقی نے ایسی چھب نکالی اور ایسی مقبول ہوئی کہ دھرپد کا چراغ ماند پڑنے لگا۔ اور آج یہ حال ہے کہ جدھر دیکھو کلاسیکی موسیقی میں خیال کا چرچا ہے، دھرپد کا بہ مشکل اک آدھ گھرانا نام لیوا رہ گیا ہے۔ خیال کے درجنوں بڑے گھرانے وجود میں آ چکے ہیں۔ ان گھرانوں کی وجہ سے گائکی کے بہت سے اسلوب اختراع کیے جا چکے ہیں جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی گھرانے کی پہچان بن چکا ہے۔ ایسا کیوں کر ہوا، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ دھرپد مزاج کے اعتبار سے static ہے، دھرو یعنی قطب ستارے سے متعلق ہے جو اچل ہے اور موضوع بھگتی ہے اور خیال کے برخلاف یہ گائکی سیدھی، سپاٹ، اور ثقہ... جب کہ خیال ایک سے ایک رنگ میں ڈھلتا ہوا، آرائشی، رنگا رنگ، دنیا بھر کے تان، توڑے، مینڈھ، مرکی، زمزموں اور پلٹوں کے زیورات سے آراستہ و مرصّع اور وقت وقت کی راگنی کا مرقّع اور جہانیاں جہاں گشت!

لیجیے خیال کی یہ بحث بے لگام ہوا چاہتی ہے۔ لہٰذا اب ان مباحث کو یہیں کسی اور موقعے کے لیے چھوڑتا ہوں۔ اور اپنی بات ان گزارشات پر ختم کرتا ہوں کہ صاحبانِ قلم کے تحریری سفر میں یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کسی تحریر کا آغاز متاثر کن ہوتا ہے وسطِ سفر تک بہ تدریج عروج قائم رہتا ہے،

تیسرے یا آخری مرحلے میں یہ تحریری سفر ڈھلان کی منزل میں آجاتا ہے اور مضمون کا پھیلاؤ سمٹنے کی جانب راجع ہونے لگتا ہے۔ اور بالآخر یہ دیکھنے میں بھی آتا ہے کہ قلم بہ عجلت اختتام پر آجاتا ہے، اور تحریر میں غیر ارادی طور پر منزل کو قریب پا کر مسافت کو جلد از جلد سمیٹنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید و باید ہی کس قلم کار کا تحریری سفر آغاز سے انجام تک یکساں طور پر برقرار رہتا ہے۔

عسکری صاحب کی ''وقت کی راگنی'' بھی اس سے نہیں بچ سکی ہے۔ ''وقت کی راگنی'' کی جس شان سے ابتدا ہوئی تھی اور جس طرح یہ پھیلتی بڑھتی رہی تھی، اس پر ہر قدم بہ زبانِ قاری کلمۂ آفریں ادا ہوتا رہا۔ لیکن ان کا یہی قلم آخر میں ایسے دبے پاؤں گزر گیا کہ جاتے ہوئے اس کی چاپ بھی سنائی نہ دے سکی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟... مگر اس راہ میں ایسا ہوتا ضرور ہے!!

☆☆☆

عبّاس رضوی

محمد حسن عسکری کے افسانے: اک مطالعہ

رواں صدی کے اختتام کے ساتھ ہی اردو افسانہ بھی اپنی عمر کے لگ بھگ سو برس مکمل کر رہا ہے۔ اس ایک صدی کے سفر میں اردو افسانے کے افق پر بہت سے روشن ستارے نمودار ہوئے اور جگمگائے جن میں سے بعض کی روشنی کو مہ و سال کی گرد بھی کم نہ کر سکی۔ ان میں سجاد حیدر یلدرم بھی ہیں اور منشی پریم چند بھی۔ منٹو، عصمت، کرشن اور بیدی بھی ہیں۔ نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری اور پروفیسر مجیب بھی۔ افسانوی ادب کے انھی روشن ستاروں میں احمد علی اور سجاد ظہیر بھی ہیں مگر اردو کے نامور افسانہ نگاروں میں ایک نام ایسا بھی ہے جسے اپنی جدّت طرازی کی بنا پر نہ صرف یہ کہ شہرتِ دوام ملی بلکہ اردو افسانے کو بھی نئی راہوں کا سراغ ملا۔ یہ تھے محمد حسن عسکری۔ اردو افسانے کا قاری یہ جان کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ عسکری صاحب کی افسانہ نگاری کا کُل عرصہ محض ساڑھے سات برس کے لگ بھگ ہے اور ان کے افسانوں کی تعداد محض گیارہ۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''جزیرے'' ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا جب کہ ان کا دوسرا اور آخری مجموعہ ''قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے'' قیامِ پاکستان سے قبل ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ عسکری صاحب کا تخلیقی سفر نہایت ست روی سے طے ہوا یعنی ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۰ء، ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۷ء میں انھوں نے صرف ایک ایک افسانہ لکھا جب کہ ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۳ء میں انھوں نے دو دو افسانے لکھے۔ ۱۹۴۲ء ان کی تخلیقی زندگی کا نقطۂ کمال ثابت ہوا جب انھوں نے تین افسانے لکھے جس میں ان کا شاہکار افسانہ ''دو تین'' بھی شامل ہے جس پر ان کے نقادوں کی توجہ کم ہی رہی کیوں کہ اس افسانے میں شعور کی رو کی بجائے ایک باقاعدہ پلاٹ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ۱۹۴۲ء ہی میں عسکری صاحب نے اپنے پہلے مجموعے کا اختتامیہ بھی تحریر کیا جس میں ان کی بے مثل تنقیدی بصیرت نو عمر اردو افسانے کے قاری کی رہنمائی کے لیے موجود ہے۔

محمد عسکری نے اپنا آخری افسانہ ''قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے'' فروری ۱۹۴۷ء میں لکھا اور اس کے بعد عسکری صاحب نے زندگی بھر کوئی افسانہ نہیں لکھا مگر ان کا شمار باقاعدہ اور شہرت یافتہ

افسانہ نگاروں میں ہوتا رہا اور آج تک ہوتا ہے۔ اگر عسکری صاحب کو جدید اردو افسانے کا معمار قرار دے دیا جائے تو یہ کچھ زیادہ غلط نہ ہوگا کیوں کہ ان سے پہلے کے افسانہ نگار، ''انگارے'' کے افسانہ نگاروں کے استثنا کے ساتھ محض ایک خاص ڈھب کے افسانے لکھ رہے تھے۔ ان افسانہ نگاروں کے بارے میں عسکری صاحب کے رویے کا اندازہ ان کے پہلے مجموعے میں شامل ان کے اختتامیے سے ہوتا ہے جس میں عسکری صاحب نے بہت سے مغربی ادبا، شعرا اور فلسفیوں کا ذکر کیا ہے جن میں فلوبیر، ورڈز ورتھ، ایلیٹ، ٹینی سن، فورسٹر، ہربرٹ اسپنسر، ڈبلیو بی کیر، لارنس، اروِنگ بیسٹ، پال ایلمر مور، ژولیس باں دا، والٹیر، موپساں، بالزاک، اناطول فرانس، استاں دال، چیخوف، گالزوردی، میتھیو آرنلڈ، مارسل پروست، جیمس جوئس، رینس، اور جی کے چیسٹرٹن وغیرہم کے نام شامل ہیں مگر عسکری صاحب اپنے اس مضمون میں اپنے پیش رو افسانہ نگاروں کا جن میں منشی پریم چند جیسا افسانہ نگار شامل ہے، نام تک نہیں لیتے۔ اپنے اس اختتامیے میں عسکری صاحب اپنے صرف دو ہم عصروں کا نام لیتے ہیں یعنی عصمت اور منٹو کا۔ ان دونوں میں سے بھی عصمت چغتائی کا نام محض بر سبیلِ تذکرہ یعنی ''لحاف'' کے حوالے سے آ گیا:

> لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسنِ معنوی یا حسنِ صوری، سب روح کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ کسی لکھنے والے میں سب سے بڑی چیز دیکھنے کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کتنی گہرائی سے بول رہا ہے لیکن نہ تو میرے دماغ کو باریکیوں اور لطافتوں کی سمجھ ہے اور نہ میری روح میں گہرائی ہے اور نہ قوت۔ ممکن ہے کہ آپ کو بھی کبھی میری آواز گہرائیوں میں سے آتی معلوم ہو۔ درست ہے مگر یہ آواز ایسی ہی ہے جیسی ''لحاف'' اوڑھ کر نکلتی ہے۔ واقعی میں اس تمام عرصے میں ''لحاف'' اوڑھے ہوئے تھا۔ خون کی گرمی اور جوش کا لحاف۔ اور پھر اوپر سے اس زمانے کی نیم گرم اور سیلی سیلی بھاپیں جو جسم اور آنکھوں پر چربی کی طرح چھا جاتی ہیں (میں لحاف کا استعارہ تو استعمال کر گیا ہوں لیکن اب مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں اسے عصمت چغتائی کے ''لحاف'' پر طنز نہ سمجھ لیا جائے۔ ایسا بالکل نہیں)۔

گویا ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے عسکری صاحب عصمت چغتائی کا ذکر بھی کرنا نہ چاہتے تھے۔ ہاں منٹو کا ذکر انھوں نے نہایت موانست سے کیا ہے بلکہ نہایت احترام کے ساتھ:

> ہاں سعادت حسن منٹو نے اکثر تنہائی کے احساس کا مطالعہ اور تجزیہ پیش کیا ہے اور میرے زیادہ تر افسانے بھی انھی محوروں پر گھومتے ہیں۔

اسی طرح مغرب کی اندھی پیروی پر بھی وہ ناخوش نظر آتے ہیں اور یہاں بھی انھوں نے کچھ نام نہایت عزت و احترام سے گنوائے ہیں:

> ہم نے مغربی شعور کو بغیر ناقدانہ نظر ڈالے کلیتاً قبول کر لیا ہے بلکہ اپنے آپ کو

اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے... اور مغربی شعور بھی وہ جو انحطاط پذیر ہو۔ یہ یقیناً روحانی بے چارگی کے مترادف ہے۔ ہم ہر قسم کے تجربے کر رہے ہیں سوائے روحانی تجربے کے... جو سب سے اہم ہے۔ ہم نے بھی زندگی کی عکاسی کی ہے، ہم نے بھی اردو ادب کی ترقی میں حصہ لیا ہے مگر سرشار، نذیر احمد، سجاد حسین بلکہ ستم ظریف اور میر باقر داستان گو تک کو ہم پر فوقیت حاصل ہے کہ وہ ہمارے بہ نسبت ہندوستانی عنصر سے زیادہ قریب تھے۔

اور یوں ایک قطعیت کے ساتھ عسکری صاحب اس اقتباسیے میں منشی پریم چند، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری، احمد علی اور سجاد ظہیر وغیرہم کا نام تک نہیں لیتے۔ ہاں دو ایسی شخصیات ضرور ہیں جن کو عسکری صاحب خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور انھیں اپنا رہنما قرار دیتے ہوئے یہاں تک کہتے ہیں کہ ان کے فیض سے احترام اور عظمت کے کھوئے احساس کو انھوں نے دوبارہ پا لیا۔ ان میں سے ایک الٰہ آباد یونی ورسٹی کے اس وقت کے انگریزی کے ریڈر ستیش چندر دیب ہیں اور دوسرے فراق گورکھ پوری۔ ان دو ناموں کے علاوہ عسکری صاحب اگر کسی کو درخور اعتنا سمجھتے ہیں تو وہ ہیں کنھیا لعل کپور۔

لیکن تخلیق اور تنقید caricature اور parody میں آکر ایک ہو جاتی ہیں۔ اوّل تو ہر لکھنے والے کو خود اپنے اوپر ہنسنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ورنہ کم از کم دوسرے تو موجود ہوں جو اس پر ہنس سکیں۔ اور کسی ادبی دور میں پیروڈی کا پیدا ہو جانا یقیناً صحت مندانہ علامت ہے۔ کیوں کہ ہر ہنسی کی بنیاد کینہ اور دشمنی نہیں ہوتی۔ لیکن اس قسم کی پیروڈی کا رجحان بھی کنھیا لعل کپور کے ایک آدھ مضمون سے باہر نہیں پایا جاتا۔ شاید ہم لوگ بہت سنجیدہ ہیں۔ اپنے آپ کو بہت سنجیدہ سمجھتے ہیں۔

روسی افسانہ نگار چیخوف کے تو وہ عاشق ہیں اور چیخوف کے لیے اپنی پسندیدگی کا برملا اظہار ہی نہیں کرتے بلکہ اپنی کچھ کہانیوں کے ماخذ کے طور پر چیخوف کی کہانیوں کے نام بھی لیتے ہیں۔ یہ بے باکی اور صاف گوئی عسکری صاحب ہی کا طرۂ امتیاز ہے:

اُن تمام افسانوں، نظموں، ناولوں اور ڈراموں میں سے جو آج تک میں نے پڑھے ہیں صرف ایک چیز کے حسن کو میں نے واقعی اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہے اور اتنے شدید طور پر کہ اس احساس کی لرزش جب چاہوں اپنے اندر پا سکتا ہوں۔ اور وہ چیخوف کا افسانہ ''اسکول مسٹریس'' ہے۔ یہ خالص موسیقی ہے اور میں اس کوشش میں رہا ہوں کہ یہی نغمگی اپنے افسانوں میں پیدا کرسکوں لیکن کہیں پھٹی ڈگڈگی سے ''نغمۂ سیارگاں'' نکلا ہے! یہاں یہ بتا دینا

بے جا نہ ہوگا کہ میرا افسانہ ''حرام جادی'' چیخوف کے اسی افسانے سے متاثر ہے۔ اگر اس میں کچھ ہے تو اس کو جمال ہم نشیں کا عکس ہی سمجھیے۔ اسی طرح ''چائے کی پیالی'' کا خیال مجھے چیخوف کے ''اسٹیپ'' سے پیدا ہوا تھا۔

عسکری صاحب کی ندرت پسند طبیعت اک ایسی ڈگر کا تقاضا کرتی تھی جس پر کسی نقش پا کا احتمال تک نہ ہو۔ اسی ندرت کی جستجو انھیں افسانے کے اس روپ تک لے گئی جس میں منشی پریم چند جیسا pre-conceived یا سوچا سمجھا پلاٹ نظر نہیں آتا بلکہ کہانی شعور کی رو کے ساتھ ساتھ چلتی محسوس ہوتی ہے۔ یہی وہ شعور کی رو ہے جسے عسکری صاحب کے حوالے سے شناخت کیا گیا۔ البتہ کہیں ضرور ایسا ہوا کہ عسکری صاحب نے شعور کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور کہانی کو اپنی فطری سمت کے تعین کی اجازت دے دی گو بعد میں انھیں اس پر تاسف بھی ہوا۔ اپنے ایک افسانے ''ایک معمولی خط'' کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں:

> اس مذکورہ افسانے کے علاوہ ''حرام جادی'' کے آدھے حصے کو پڑھ کر میں کئی دفعہ جھوم چکا ہوں۔ شاید اس کا باقی حصہ بھی اچھا ہوتا اگر میں اپنے کرداروں کے خیالوں کی رو کا پیچھا نہ کرنے لگتا بلکہ اسے اپنی مرضی کے مطابق چلاتا۔

عسکری صاحب وسیع الذہن، وسیع القلب اور وسیع النظر تخلیق کار تھے۔ وہ معاملات کو وسیع تر تناظر میں دیکھنے کا حوصلہ اور صلاحیت رکھتے تھے اور انفعالی رویّے کو بڑے ادب کی پیدائش کے لیے ایک رکاوٹ سمجھتے تھے۔ اس حوالے سے وہ اپنے سلسلے میں جنسی جذبے کی مدافعت کرنے کی کوشش اور کئی مرتبہ اس سلسلے میں ناکام ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو اعتراف عسکری صاحب جیسے دیوزاد قلم کار کے قد وقامت میں کچھ اضافہ ہی کرتا ہے:

> گندی سے گندی بات اچھے سے اچھا ادب بن سکتی ہے مگر جنسیت سے مغلوب ہوکر بڑا ادب پیدا نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ بڑے ادب کی پیدائش کے لیے ہر قسم کا نسائی اور مجہول انفعال ایک رکاوٹ ہے اور خصوصاً جنسی جذبے کے سامنے انفعال۔۔ میں نے جنسی جذبے کی مدافعت کرنے کی کوشش تو ضرور کی ہے مگر کئی دفعہ میں اس سے دب گیا ہوں اور اس پسپائی میں مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کا بھی تھوڑا سا دخل تھا مگر ''پھسلن'' کی تہ میں اس قسم کی کوئی پسپائی یا خواہش نہ تھی۔ یہ افسانہ میں نے اس زمانے میں لکھا ہے جب میں ژولا کو بہت بڑا مصنف سمجھتا تھا اور غیر مشروط حقیقت نگاری، خارجیت اور معروضیت، میرا مطمحِ نظر تھیں۔ اور نہ میں نے اسے فوراً مقبول ہوجانے کی خواہش میں لکھا تھا۔ اس قسم کی آرزو تو کجا اس وقت تو مجھے یہ پتا بھی نہ تھا کہ

میں افسانہ لکھ بھی سکتا ہوں۔ لہٰذا اپنے آپ کو اس افسانے کا مصنف کہتے ہوئے مجھے کوئی شرم نہیں آتی۔ لیکن ''چائے کی پیالی'' ضرور فحش نگاری (Pornography) کی حدود میں آ جاتا ہے۔ اس کے بعض حصے پڑھتے ہوئے مجھے خود شرم آنے لگتی ہے۔ اگر اس افسانے کی مجموعی کیفیت کا کوئی نام ہو سکتا ہے تو... ''روحانی فیل پا'' اسے پڑھ کر مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے چار آنے والے تھیٹرز کا مسخرہ ٹانڈ پر بانس پیٹ پیٹ کر اشتہار دینے کے لیے اپنے پاس کھڑی ہوئی عورت کے کپڑے اُتارنا شروع کر دے۔ ایک کے بعد دوسرا اور دونوں میں سے کوئی شرم محسوس نہ کرے بلکہ مسکراتے رہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ قمیص کے نیچے سے کپڑے کی دو گیندیں نکلیں جو ننگی عورت سے بھی زیادہ فحش چیز ہے۔

جزیرے کے اختتامیے کے بعض حصوں کے مطالعے کے دوران قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس تحریر میں بھی عسکری صاحب کو شعور کی رو کی رہنمائی اور دست گیری حاصل تھی تو خصوصاً درج بالا اقتباس میں ''جیسے چار آنے والا... فحش چیز ہے'' والا ٹکڑا۔ عسکری صاحب طبعاً بے حد شریف النفس اور ایک قسم کی جھجک میں مبتلا رہنے والے آدمی تھے جیسے کہ وہ ہمیں ڈاکٹر آفتاب احمد کے ''نیا دور'' والے خاکے میں نظر آتے ہیں مگر ان کا شرمیلا پن تو خاصے کی چیز تھی جس کی کوئی مثال موجودہ دور کے ادبا اور شعرا میں ملنا مشکل ہے۔ اُن کا قاری حیران ہے کہ وہ ''چائے کی پیالی'' کے کچھ حصوں کو فحش (Pornography) سمجھتے تھے تو Pornography کو جانے کیا سمجھتے ہوں گے؟ وہ تو کپڑے کی دو گیندوں کو ہی فحاشی کا نقطۂ اُبال سمجھتے رہے، ادھر ہمارے صاحب طرز شاعر ساقی فاروقی نے اس سے بھی بڑی فحاشی ایجاد کر لی ہے یعنی ٹینس کی دو عدد گیندیں۔ عیاذاً باللہ... ہر چند کہ یہ مسئلہ ہمارے موضوع سے براہ راست متعلق نہیں ہے مگر لگے ہاتھوں عسکری صاحب کے شرمیلے پن کا ایک واقعہ خود انھی کی زبانی سنتے جایئے۔ کیوں کہ اس سے ہمیں ان کے بعض کرداروں کی نفسیات کو سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مدد مل سکتی ہے:

میرا مطلب یہ نہیں کہ اردو شاعری میں عاشق کی ذہنیت ہمیشہ پست رہی ہے حالاں کہ اس میں بھی شک نہیں کہ بعض شاعروں کے یہاں ایسی پستی ہے کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں، مثلاً فانی کا یہ شعر جو مجھے ٹھیک طرح یاد بھی نہیں:

نالِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمع زندگانی دیکھتے جاؤ

یہ شعر میں نے پہلے پہل سات آٹھ سال کی عمر میں ایک ہم جماعت کی زبان

سے سنا تھا بلکہ اکثر سنتا رہتا تھا۔ خیر یوں تو مجھے اب بھی کیا شعور ہے مگر کم سے کم اس زمانے کی نسبت دو ایک باتیں تو زیادہ ہی جانتا ہوں لیکن اس زمانے میں مجھے یہ شعر سن کر شرم آجاتی تھی اور میری نگاہیں یوں جھک جاتی تھیں جیسے کوئی میرے سامنے ننگا ہوگیا ہو۔ گندی سے گندی گالیوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا مگر یہ شعر سن کر میں ہمیشہ یہ سوچنے لگتا تھا کہ ایسے لفظ میرے ہم جماعت کے منھ سے کس طرح نکل سکے، فانؔی کی شاعری سے میری یہ کراہت میرے دل میں اس طرح بیٹھی ہے کہ باوجود کوششوں کے میں فانؔی کا کلام نہیں پڑھ سکا۔

(''شعلۂ ساز''، محمد حسن عسکری)

اوپر نقل کیے گئے واقعے کی روشنی میں یہ اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہ ہوگا کہ عسکری صاحب خود اپنے تحریر کردہ افسانے ''چائے کی پیالی'' کے بعض حصے پڑھ کر کیا کیا نہ شرمائے ہوں گے۔ اگر غور کیا جائے تو عسکری صاحب کی افسانہ نگاری میں یہ مسئلہ کسی نہ کسی طرح موجود رہا، وہ خود بھی اپنی کہانیوں میں موجود بعض کم زوریوں کی ذمہ داری جنسیاتی رجحان پر ڈالتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی منھ زور جذبے کی وجہ سے ان کی بعض تکنیکی اور ہیئتی کوششیں ناکام رہیں مگر وہ اس خوف کا اظہار کیے بغیر بھی نہ رہ سکے کہ اس جذبے کے سرد ہوجانے کے بعد ممکن ہے وہ بہتر فن کار بن جائیں مگر پھیکے اور پھسپھسے بھی رہ جائیں:

> یہ جنسیاتی رجحان ہی ہے جس نے اکثر جگہ میرے افسانوں میں جھوٹے سُر (false notes) پیدا کر دیے ہیں اور میری تکنیکی اور ہیئتی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ شاید رگوں میں ٹھنڈک پڑنے کے بعد میں فن اور ہیئت پر زیادہ کامیاب توجہ دے سکوں گا لیکن چوں کہ میرا ادبی سرمایہ زیادہ تر جنسی قسم کا ہی ہے اس لیے یہ اندیشہ بھی ہے کہ خون کا دباؤ اور اعصاب کا تناؤ کم ہوجانے کے بعد میں اچھا فن کار تو ہوجاؤں مگر شاید پھیکا اور پھسپھسا بھی رہ جاؤں گا۔

اور پھر ہم نے دیکھا کہ پھیکے اور پھسپھسے رہ جانے سے قبل ہی عسکری صاحب افسانہ نگاری سے کنارہ کش ہوگئے مگر وہ خوب جانتے تھے کہ ان کا افسانہ اردو افسانہ نگاری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس افسانے کے حسن و قبح پر تخلیق کاروں اور نقادوں کے درمیان مکالمہ جاری رہے گا اور ان کے افسانوں کا مختلف زاویہ ہائے نگاہ کی مدد سے تجزیہ بھی کیا جاتا رہے گا بلکہ انھوں نے تو اپنے کرداروں کے ساتھ ساتھ اپنی یعنی افسانہ نگار کی تحلیلِ نفسی کی بھی پیشین گوئی کر دی تھی اور پھر یک بہ یک اپنے انکسار کو ڈھال بنا کر کھڑے ہوگئے تھے:

> میرے کرداروں کی تحلیلِ نفسی بھی کی جائے گی اور ان کے ساتھ میری بھی۔

میرے کرداروں کا نفسیاتی ٹائپ کافی سیدھا سادا ہے۔ وہی معمولی داخلیت، میلان ہم جنسی، ماحول سے بیزاری، حقیقت سے فرار اور مرکب اے ڈی پس (Compound Oedipus) تو ان کے پیچھے پیچھے آتا ہی ہے۔ میرے افسانے زیادہ تر اسکول کی لڑکیوں کے مطالعے ہیں۔ میرا روحانی قد و قامت بھی اتنا ہی سمجھیے اور اگر آپ نفسیاتی تحلیل کے شوقین ہیں تو اس میں regression اور arrested development شامل کر ہی لیں گے۔ عموماً میرا موضوعِ سخن شکست (frustration) اور زمانۂ بلوغت کے ماحول سے بے اطمینانی اور اس کے خلاف احتجاج و گریز رہا ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے مجموعے کا نام پہلے ''جھن جھن'' تجویز کیا تھا۔ میں تو کیا آج کل ساری دنیا کا ادب اسی احاطے میں محدود ہے۔ آج کل بڑی سے بڑی شاعری میں بس یہی بھن بھن ہے (مقابلے کے لیے دیکھیے ٹینی سن:

A child crying in the night
A child crying for the light
And in no other language than a cry)

اسکول کی لڑکیوں کے مطالعے اور تحلیلِ نفسی سے قاری کا ذہن فرائیڈ کے Case Histories کے مطالعے کی طرف جاتا ہے مگر عسکری صاحب نے جن دو درجن کے قریب مغربی افسانہ نگاروں، مفکروں، ناول نگاروں، فلسفیوں اور شاعروں کے نام گنوائے ہیں ان میں سگمنڈ فرائیڈ کا نام کہیں شامل نہیں ہے جو بادی النظر میں بڑی معنی خیز بات نظر آتی ہے۔

یہ تو ہوا عسکری صاحب کے پہلے افسانوی مجموعے ''جزیرے'' کے اختتامیے کا ایک اجمالی جائزہ۔ آیئے اب عسکری صاحب کے کچھ مشہور افسانوں کی فضا میں چلتے ہیں جو عسکری صاحب کے تنقیدی کمالات کی شہرت سے پہلے ہی ان کی نام آوری کا سبب بن چکے تھے ان مشہور افسانوں میں ان کے پہلے مجموعے ''جزیرے'' کے افسانے ''پھسلن''، ''حرام جادی'' اور ''چائے کی پیالی'' شامل ہیں جب کہ اسی مجموعے میں ان کا بے مثل افسانہ ''وہ تین'' خصوصی توجہ کا متقاضی ہے۔ اس کے علاوہ ایک شہرت یافتہ افسانہ ''گھٹلیوں کے دام'' بھی جو اُن کے دوسرے مجموعے ''قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے'' میں شامل ہے، اپنے گرما گرم موضوع اور بے خوف برتاؤ کی بنا پر خصوصی مطالعے کا استحقاق رکھتا ہے۔

''پھسلن''، عسکری صاحب کے ان افسانوں میں شامل ہے جن کی اشاعت پر ادبی حلقوں میں خاصی اتھل پتھل ہوئی تھی۔ ہر چند کہ عسکری صاحب اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ یہ افسانہ انھوں نے راتوں رات مقبول ہونے کی تمنا میں لکھا تھا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ اس افسانے نے سنہ چالیس کی دہائی کے آغاز میں اردو افسانے کے قاری کو بری طرح چونکا کر رکھ دیا تھا اور عسکری صاحب

فوری طور پر مقبول ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں وہ راتوں رات مشہور ضرور ہو گئے تھے۔ ''پھسلن'' کی کہانی آغازِ شباب کے ہیجانوں میں اُلجھے ہوئے نوجوان لڑکوں کی کہانی ہے جو ہندوستان کے نچلے متوسط طبقے کی معاشرتی جکڑبندیوں میں رہ کر جنسی جذبوں کے ممنوعہ راستوں پر چل نکلتے ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار نذرو ہے جو اپنے ہی ہم عمر جمیل کا گھریلو ملازم ہے۔ جمیل نویں جماعت کا طالب علم ہے جو اپنی جماعت کے نسبتاً کم عمر لڑکوں میں شامل ہے۔ اس کے دوستوں کے دو گروہ ہیں، ایک گروہ کے لڑکے اس سے عمر میں بڑے اور جسمانی طور پر اس سے زیادہ طاقت ور ہیں جن کی دراز دستیوں کے سامنے جمیل خود کو بے بس پاتا ہے اور ان سے بگاڑ کرنے کو بھی خلافِ مصلحت جانتا ہے جب کہ دوسرے گروہ میں وہ لڑکے ہیں جو نچلی جماعتوں کے طلبہ ہیں اور جمیل کے مقابلے میں علمی اور جسمانی اعتبار سے کم تر ہیں۔ اس گروہ کے لڑکے جمیل کی جراٗتِ رندانہ کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیتے ہیں اور ادب و احترام کا رویّہ رکھتے ہیں۔ سیمابی مزاجوں والے نوجوانوں کا یہ اجتماع جمیل کے لیے گویا براتِ عاشقاں پر شاخِ آہو ہے مگر اچانک ہی اس کا نیا گھریلو ملازم نذرو ان سب کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ جمیل سے عمر میں بڑے اور مضبوط جسموں والے نوجوانوں کے گروہ کے نمائندے ذاکر نے نذرو کو جس کا حلیہ ایک عام گھریلو نوکر کا حلیہ ہے، دیکھتے ہی جمیل سے سوال کیا... ''یعنی آپ کو بھی یہ شوق ہوا؟ یعنی کب سے؟ کیا ارادے ہیں آخر...؟'' ادھر دوسرے کچی عمروں اور ناپختہ ذہنوں والے نوجوان بھی آپس میں یہ سوال اٹھائے بغیر نہ رہ سکے، ''بھئی اب یہ فیصلہ کرو کہ نوکر زیادہ اچھا ہے یا مالک۔'' اور جمیل اپنے دل میں نذرو کے لیے رقیبانہ جذبات کو سر اٹھاتا محسوس کرتا ہے... نذرو ناز نخرے بھی کرتا ہے اور جمیل کی خدمت میں کوئی کسر بھی اٹھا نہیں رکھتا اور ساتھ ہی کبھی کبھی جمیل کی ٹانگیں دابتے ہوئے بعض حدیں بھی عبور کر جاتا ہے یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی چپکے سے اپنی چارپائی بھی جمیل کی چارپائی کے قریب لے آتا ہے اور سرگوشی کرتا ہے، ''آجاؤں'' اور جمیل کی دھتکار ''اے ہٹ'' پر یہ عجیب و غریب افسانہ یک لخت اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔

اس افسانے کو پڑھ کر قاری ایک بار پھر اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس افسانے کو لکھ کر ایک بہت بڑا معرکہ سر کر لینے کے باوجود عسکری صاحب کی سادگی اور معصومیت کی قسم کھانے کو جی چاہتا ہے۔ کیوں کہ اس افسانے کے کردار واقعات کی نہج اور مختلف مواقع پر ادا ہونے والے مکالموں سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ عسکری صاحب نو گرفتارانِ شباب کی جنسی بے راہ روی اور اس سے متعلق دیگر جزئیات سے کچھ زیادہ آشنا نہیں ہیں اور فراق صاحب کی رہنمائی کے باوجود ان معاملات کی گہرائی سے تقریباً ناواقف ہیں۔ اپنے موضوع کی حدّت کے باوجود یہ افسانہ ایک اندھیرے کمرے میں بھوسے کے ڈھیر میں چھپی سوئی کی تلاش سے زیادہ کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ یہ افسانہ کچے ذہنوں میں چھوٹے موٹے بھونچال کا سبب تو بن سکتا ہے مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کیوں کہ اس افسانے میں ایسا کوئی زاویہ موجود نہیں ہے جو اس جانب اشارہ کرتا ہو کہ مصنف کے پاس تجربوں اور مشاہدوں کی صورت میں کوئی first hand

information موجود ہے اور عسکری صاحب جیسے شریف النفس افسانہ نگار سے قاری کی توقعات بھی یہی کچھ ہیں جو ہم جنس پرستی کے میلانات اور ان کے عقب میں سر اٹھاتے ہوئے مرکب اے ڈی پس کو سیدھا سادا نفسیاتی ٹائپ سمجھتے ہیں۔ ذاکر کا نذرو کو دیکھتے ہی یہ جان لینا کہ وہ ایک خاص جنسی میلان کا نمائندہ ہے اور پھر جمیل سے جو لگ بھگ پندرہ برس کی عمر کا لڑکا ہے تابڑ توڑ سوال کرنا، ''یعنی آپ کو بھی یہ شوق ہے؟ یعنی کب سے؟ اور کیا ارادے ہیں آخر؟'' ایک نہایت ناقابلِ فہم صورت کی تصویر کشی کرتا ہے اور پھر گھونسا مار کر تختہ توڑ دینے والے نوجوانوں سے مل کر بہ قولِ میر صاحب نرم شانہ لونڈوں تک کبھی کا ایک ایسے گھریلو ملازم کے لیے وارفتہ ہوجانا جو نہ تو خوب صورت ہے نہ خوش بیان ہے اور جس کا حلیہ اور ذاتی اوصاف بھی بہت زیادہ قابلِ رشک نہیں ہیں اور جس کے پاس دتی میں گزارے ہوئے دنوں کی کہانیوں کے سوا کچھ اور ہے بھی نہیں، قاری کے ذہن کے لیے قابلِ قبول محسوس نہیں ہوتا۔ اس پورے افسانے میں adolescence کے ہم جنسی میلانات کی ایک لہر رواں دواں ہے جو اس افسانے کا کُل اثاثہ بھی ہے اور وجہ شہرت بھی۔

''حرام جادی'' عسکری صاحب کا وہ معرکتہ الآرا افسانہ ہے جسے وہ چیخوف کی کہانی ''اسکول مسٹریس'' سے متاثر قرار دیتے ہیں۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک ادھیڑ عمر اینگلوانڈین مڈوائف ایملی ہے جس کا شہر کے صاف ستھرے ہسپتال سے تبادلہ کر دیا گیا ہے اور وہ ایک گندے پس ماندہ قصبے میں تعینات کر دی گئی ہے۔ اس قصبے کی فضا ایملی کو بالکل پسند نہیں ہے، یہاں گلیوں میں غلاظت ہے، گرد و غبار ہے اور جگہ جگہ گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے لڑکوں کے ہاتھوں زخمی ہوجانے کا اندیشہ۔ گلیوں میں بہتی ہوئی نالیوں اور کیچڑ میں آن گرنے والی گلّی سے اکثر اس کے کپڑے داغ دار ہوجاتے ہیں۔ قصبے کے مرد اسے دیکھ کر استہزا کرتے ہیں اور اس پر ذومعنی فقرے چست کرتے ہیں جب کہ عورتیں اسے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق سمجھ کر اس سے پردہ کرتی ہیں اور اپنی لڑکیوں کو اس سے چھپاتی ہیں۔ گرمی اور غبار آلود فضا ایملی کے لیے بے حد تکلیف دہ ہے۔ اسے اپنے شہر کا ہسپتال اور صاف ستھری سڑکیں بہت یاد آتی ہیں، دو سابق شوہر اور ان کے مضبوط بازوؤں کا حصار یاد آتا ہے۔ بچپن کے دنوں کی یاد بھی اسے بہت ستاتی ہے۔ اسے یاد آتا ہے کہ اس کے پاپا اسے اسکول ٹیچر بنانا چاہتے تھے مگر ماما کی ضد کی وجہ سے اسے مڈوائف بننا پڑا۔ وہ دن بھر ڈھول میں اٹے راستوں، گندے گھروں اور غلیظ بدبودار عورتوں کے درمیان گزارتی ہے جس کے بعد رات کو کھانے کے نام پر دو لقمے حلق سے نیچے اُتارنا بھی اس کے لیے مشکل ہوجاتا ہے۔ بجلی کے پنکھے کے بغیر رات کو دیر تک کروٹیں بدلتی ہے مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دُور ہوتی ہے۔ رات کے پچھلے پہر جب ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تب اس پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس تکلیف دہ زندگی میں یہی چند لمحے سکھ کے ہوتے ہیں مگر عین اس وقت جب اس کی روح کو چند لمحوں کا سکون میسر آتا ہے، اس کی ملازمہ حسین اسے جگانا شروع کر دیتی ہے۔ کیوں کہ کسی نہ کسی کے گھر ایمر جنسی کا اعلان ہوچکا ہوتا ہے اور اسے تاکید

کے ساتھ جلدی بلایا جاتا ہے۔ قصبے کی عورتیں ہر چند کہ اس کی فنی مہارت کو قطعاً نہیں مانتیں بلکہ انھیں قصبے کی پرانی دائی پر ہی اعتماد ہے مگر اس کے باوجود جب بھی اسے بلایا جاتا ہے تو اس سے یہی کہا جاتا ہے کہ جلدی ہے۔ ایملی کا المیہ یہ ہے کہ لوگ اسے میم صاحب کہہ کر پکارتے ہیں مگر دل ہی دل میں اسے ذلیل و حقیر مخلوق سمجھتے ہیں۔ افسانے کا کلائی میکس ایسی ہی اک صبح ہے جب رات بھر کروٹیں بدلنے اور بے آرام رہنے کے بعد صبح کے وقت اسے میٹھی نیند نے آلیا ہے تو عین اسی وقت اس کے کمرے کے دروازے پر بے تابانہ دستک شروع ہوگئی ہے اور اسے بتایا گیا کہ شیخ صفدر علی کے یہاں جلدی بلایا ہے۔ ایملی نے اپنے آپ کو بہ مشکل کھینچ کھانچ کر بستر سے اُتارا۔ عجلت میں چائے کے چند گھونٹ حلق سے اُتارے، لباس تبدیل کیا اور تیز تیز چلتی ہوئی شیخ صاحب کے گھر پہنچی تو وہ ڈیوڑھی میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اسے دیکھ کر شکایتی لہجے میں بولے، ''آخاہ...میم صاحب بڑی دیر کر دی تم نے تو!'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں زنان خانے کی طرف بڑھی۔ وہاں اس نے قصبے کی پرانی دائی کو کچھ کپڑے اور لوٹے میں پانی اٹھائے صحن سے گزرتے دیکھا جو کہہ رہی تھی، ''جرا دیکھو تو... ابھی تک نا نکلی گھروے سے حرام جادی۔''

''حرام جادی'' ایک نفاست پسند اینگلو انڈین عورت کا کردار ہے جسے قسمت کی خرابی نے مڈوائف بنا دیا ہے۔ یہ پیشہ اس کے مزاج سے ذرا میل نہ کھاتا تھا مگر ایملی کو یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑا۔ دو شادیاں ہوئیں۔ دونوں ہی شوہر مختلف حالات میں چھوٹ گئے۔ شہر کا ہسپتال صاف ستھرا تھا جہاں اس کی عزت تھی، وقار تھا، اس کا حکم چلتا تھا، وہ ہسپتال بھی تبادلے کی صورت میں چھوٹ گیا۔ اب ایک گندے پس ماندہ قصبے کا کثیف ماحول تھا، گرد وغبار تھا، کیچڑ اور غلاظت تھی۔ اس کی نفاست پسند طبیعت کو میلے کچیلے لباسوں والی عورتوں سے سابقہ پڑتا تھا جن کے جسموں سے سڑاند آرہی تھی مگر وہ تن بہ تقدیر تھی کیوں کہ اس کا پیشہ ہی ایسا تھا جو اس کی طبع نازک پر بار تھا۔ وہ سب کچھ سہتی تھی مگر کہانی کے آخری منظر میں دائی کے ایک طنزیہ فقرے نے اس پر کیا قیامت توڑی ہوگی اس کا اندازہ مشکل نہیں... یہ ایک عمدہ افسانہ ہے جس کے تمام تر جزئیات کا عسکری صاحب نے پورا پورا خیال رکھا ہے، کہانی کا تاثر اتنا مضبوط کہ قاری اپنے آپ کو اس کی فضا میں سانس لیتا محسوس کرتا ہے۔ اس افسانے میں عسکری کا فن بلاشبہ اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ آیئے ان کی جادوگری کا ایک چھوٹا سا نمونہ دیکھتے چلیں:

> اسے دوپہر کو کھانا کھانے اور آرام کرنے کا وقت بھی ہزار کھینچ تان کے بعد ملتا تھا اور وہ بھی یقینی نہ تھا، کیوں کہ بچے پیدا ہونے میں موقع ومحل کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ صبح چار بجے، دوپہر کے بارہ بجے، رات کے دو بجے، ہر گھنٹا، ہر گھڑی اسے کوندا کی آواز پر لبیک کہنے کو تیار رہنا پڑتا تھا۔ اور بچے تھے کہ ایسی تیزی سے چلے آرہے تھے جیسے پہاڑی ندی میں لڑھکتے ہوئے پتھر۔

ضبطِ تولید کے چرچے دولت نگر کو شہر سے ملانے والی کچی اور گڑھوں والی سڑک کو طے نہ کر سکتے تھے اور اگر بہ فرضِ محال وہ رینگتے ہوئے وہاں تک پہنچ بھی جاتے تو یہ یقینی بات تھی کہ قصبے والے انھیں ذرا بھی قابلِ اعتنا نہ سمجھتے کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بچے خدا کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں اس میں انسان کا کیا دخل!؟ ۱۸ر سالہ لڑکے، ۵۶ر سالہ بڈھے، الھڑ لڑکیاں اور ادھیڑ عورتیں، سب کے سب حیرت انگیز تن دہی اور یک جہتی کے ساتھ سڑکوں کی نالیوں میں کھیلنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ کیے چلے جا رہے تھے، گویا وہ قومی دفاع کی خاطر کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور ہیں۔ اور پھر وہ بے چارے کرتے بھی کیا؟ وہ تو خدا کے حکم سے بے بس تھے۔ غرض کہ بچے چلے آ رہے تھے کالے بچے، پیلے بچے، پر نُچے مرغ کی طرح سرخ بچے اور کبھی کبھی گورے بچے، دُبلے پتلے ہڈیوں کا ڈھانچا یا بعض موٹے تازے بچے، مڑے ہوئے بالوں والے، چپٹی ناک والے، چھچھوندر کی طرح گلگلے، لکڑی جیسے سخت، ہر رنگ اور ہر قسم کے بچے۔

ایملی نے اپنی دادی سے سنا تھا کہ ان کے بچپن میں ایک مرتبہ پاؤ پاؤ بھر کے مینڈک برسے تھے، وہ کبھی کبھی سوچا کرتی تھی... اور اس وقت اسے بے ساختہ ہنسی بھی آ جاتی تھی کہ بچے وہی برسنے والے مینڈک ہیں۔ پاؤ پاؤ بھر کے زرد زرد مینڈک۔

''چائے کی پیالی'' عسکری صاحب کا وہ مشہور و معروف افسانہ ہے جو اپنی ہیئت اور تکنیک کی بنا پر ادبی حلقوں میں برسوں موضوعِ گفتگو بنا رہا۔ اس تکنیک کو شعور کی رو کا نام دیا گیا۔ خود حسن عسکری صاحب نے اس افسانے کی مجموعی کیفیت کو روحانی فیل پا کا نام دیا۔ ''چائے کی پیالی'' کا مرکزی کردار ایک اینگلو انڈین لڑکی ڈولی ہے جو پرانے طرز کے مشن گرلز اسکول کو چھوڑ کر اب ایلی نگر کے کرسچین گرلز انسٹی ٹیوٹ کی طالبہ بن چکی ہے اور اب چھٹیوں میں ایلی نگر سے اپنے گھر سعد آباد جانے کے لیے تانگے میں سفر کر کے لاری اڈے پہنچی تھی۔ لاری اڈے سے سعد آباد تک کا سفر لاری میں طے ہوا۔ یہ افسانہ اسی سفر کے دوران ڈولی کی ملی جلی سوچوں اور یادوں کا حساب نامہ ہے۔ لاری کی تنگ اور تکلیف دہ سیٹ پر دیر تک بیٹھے رہنے سے جسم کے سُن ہو جانے کی کیفیت، راستے کے جانے پہچانے مناظر اور پھل والے اور بسکٹ والے سے گفتگو اور پھر یہ کہ دیکھنے والے اس کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے ہوں گے؟ اس افسانے کا خونِ جولاں ہیں۔ مگر جب ڈولی کوفت کا شکار ہو کر اپنی سیٹ پر ڈھلک گئی تو یادوں کے دریچے کھل گئے۔ ننھا منا بھائی فریڈی کیسا دوڑ کر استقبال کرے گا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ جائے گا۔ رخصت

کی رات اپنی اسکول کی سہیلی برنس کے ساتھ رات ڈیڑھ بجے تک ایک ہی چار پائی پر لیٹ کر باتیں کرنا۔ ایک دوسرے کو ہم راز بنانا اور ایک دوسرے کے حساس جسمانی حصوں کے لمس میں ایک تلذذ کی کیفیت پانا۔ برنس کی بوسہ طلبی اور پھر اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں کا ڈولی کے رخسار پر رکھ دینا۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں پناہ لیے ہوئے ایک ایسے احساس میں سرشار ہو جانا گویا وہ کوئی ایسا ممنوعہ عمل کر رہی ہوں جسے کوئی دوسرا دیکھ نہ لے۔ سفر کے دوران بار بار دیکھے ہوئے مناظر کو ایک بار پھر دیکھنا اور بعض پسندیدہ مناظر کو ایک بار پھر آنکھوں میں بھر لینے کی آرزو کرنا۔ یک جائی کے لمحات کا ابدیت سے ہم کنار ہو جانا۔ پھر پرانے اسکول کے زمانے کی یادیں۔ نیلے سوٹ والے لڑکے سے گرما گرم ملاقاتوں اور نا قابلِ فراموش حلاوت سے لدے ہوئے بوسوں کی یادیں۔ سفر کے دوران تیزی سے دوڑتے بھاگتے مناظر، کتی کاتتی ہوئی عورتیں، کائی سے ڈھکے ہوئے تالاب میں بھینسوں کا تیرنا اور ایک بار پھر برنس کی آتشیں یادوں کا سب یادوں پر غالب آجانا۔ وہ اس کا بائبل میں غزل الغزلات کا باب دکھانا اور دونوں کا اسے ساتھ ساتھ پڑھنا۔ پھر اس کا تنہائی میں غزل الغزلات کے کچھ لذیذ حصوں کا پڑھنا جو اسے زبانی یاد ہو گئے تھے۔ ایک عالمِ خود رفتگی میں ڈولی کا خود اپنے سراپا کو لاری کی کھڑکی سے باہر فضا میں عریانی کی حالت میں تیرتے دیکھنا۔ اس مجسمے کے انداز میں آرام، قرار اور جمالیاتی سرشاری کا پانا۔ پھر یک بارگی ڈولی کو گھر کا خیال آتا ہے، ماما شاید جھاڑو دے رہی ہوں گی پاپا بازار سے لکڑیاں لے آئے ہوں گے، فریڈی کھیلتا پھر رہا ہوگا۔ مگر یادوں کی اس رنگا رنگی میں اس کے اندر کہیں یہ خواہش بھی موجود تھی کہ گھر ابھی دُور ہو۔ لاری قصبے کے پاس سے ہو کر نکل جائے اور یہ سفر یوں ہی جاری رہے۔ پھر اڈے کے قریب پہنچ کر لاری کا آہستہ آہستہ رینگنا اور ڈولی کا اُمید لگانا کہ شاید لاری یوں ہی رینگتی رہے گی۔ کچھ وقت اور اسی خواب کی سی کیفیت میں گزر جائے گا... پھر یکا یک اسے محسوس ہوا کہ جیسے دنیا ڈوبی جا رہی ہے۔ سب لوگ لاری سے اُتر رہے تھے۔ اس کا سامان اُتارا جا رہا تھا جس کے انتظار میں وہ سڑک کے اس پار سب سے الگ تھلگ کھڑی تھی۔ اس کا جسم بوجھل ہو گیا تھا اور یوں بوجھل پن کے ایک شدید احساس پر یہ کہانی ختم ہوتی ہے۔

اس کہانی میں کسی لگے بندھے پلاٹ کا نہ ہونا، ایک مسلسل خود کلامی کی سی کیفیت، شوریدہ سر یادیں، زنانہ ہم جنس پرستانہ جذبات کی اتھل پتھل اور اختتام پر ماحول پر چھا جانے والی اداسی اور لایعنیت اس کہانی کا حسن ہے۔ یہ کہانی اپنی ندرتِ بیاں اور اچھوتے برتاؤ کی وجہ سے ایک یادگار کہانی ہے اور رہے گی بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ یہ کہانی اردو کے افسانوی ادب کی تاریخ میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے اور چند مشہور ترین کہانیوں میں سے ہے۔ عسکری صاحب نے اس افسانے میں Lesbianism جیسے موضوع کو بڑی احتیاط اور نرم روی سے برتا مگر اس کے باوجود یہ اپنے زمانے میں صدیوں آگے کی چیز تھی۔ جیسا کہ بیان کیا گیا، اس کہانی کا بہاؤ اتنا فطری محسوس ہوتا ہے کہ قاری خود کو ایک عجیب کیفیت

میں محسوس کرتا اور یہ سلسلہ اسی وقت ٹوٹتا ہے جب دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی لاری اپنے اڈے پر ٹھہر جاتی ہے کہ بالآخراب گھر جانا ہی ہوگا اور یوں یہ خواب آگیں کیفیت ٹوٹ جاتی ہے یہ کہانی ایسی ہے کہ جب بھی اردو افسانے پر بات ہوگی اس افسانے کا ذکر ضرور کیا جائے گا۔

''گٹھلیوں کے دام'' بھی عسکری صاحب کے یادگار افسانوں میں شامل ہے۔ یہ ایک فرد کے اندر زور شور سے جاری معرکہ خیر وشر کی منھ زور کہانی ہے جس میں گھمسان کا رن پڑنے کے بعد خیر کو ایک فیصلہ کن فتح حاصل ہوتی ہے مگر شاید شر کو بھی شکست سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک ایسا شخص ہے جس کی ماچس کی ڈبیا اس کے بستر سے نیچے فرش پر گر گئی تھی جو صبح کے وقت بیدار ہونے پر اسے اپنی جگہ نہیں ملی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ صبح کی سگریٹ سے محروم رہے گا۔ سگریٹ جو اس نوجوان شخص کے خیال میں اس کا سہارا تھی، جو دنیا سے اسے کلیتاً بیزار نہ ہونے دیتی تھی۔ اس کی شفاعت تھی جو اس سے بار بار زندگی کا بڑے سے بڑا گناہ معاف کرالیتی تھی۔

یہ وہ روح پرور اور دل نواز دھوکا تھا جو اسے اتنی تقویت عطا کرتا تھا کہ وہ بستر سے نکل کر دنیا کے مقابلے میں کھڑا ہوسکے۔ اب اس کے لیے گھر سے نکلنا اور لوگوں کی نگاہوں کو برداشت کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ اس شدید بیزاری کے عالم میں اس نے زندگی کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ زندگی ناقابل تردید طور پر انسان کی دشمن ہے۔ اس عالم میں اسے زندگی کی بہت ساری دشمنیاں اور فریب کاریاں یاد آنے لگیں، آخر ایک فقرے نے اس کا بوجھ ہلکا کیا، ''بدی تیرا نام زندگی ہے۔'' اب اس نے مزید غور وفکر کیا کہ اس عالم گیر بدی سے بیزاری کے اظہار کا کیا طریقہ ہونا چاہیے۔ چناں چہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سزا کے طور پر بدی ہی کا بن کے دکھائے گا تب اس کا دھیان متوسط طبقے کی کھڑکیوں سے جھانکنے والی لڑکیوں کی طرف گیا مگر اس نے جلد ہی انھیں رد کر دیا کہ مکمل اور بھرپور بدی کے لیے زندگی کے بڑے رچے ہوئے احساس کی ضرورت ہے جو صرف نچلے طبقے ہی کو میسر ہے مگر نچلے طبقے کی عورتوں کے پاس بھی اس کے درد کی دوا نہ تھی پھر اسے یاد آیا کہ بانکوں کا شعار تو یہ ہے کہ دنیا کی ساری بدکاریاں ختم ہوجائیں تب بھی نہ تھکو... اور تب اس کا ذہن طوائفوں کی طرف گیا۔ اس کوچے کی سیر کے لیے اس نے باقاعدہ تیاری کی اور زپ والی جیکٹ زیب تن کر کے فرانسیسی شاعر راں بو کا ایک شعر گنگناتا ہوا نکلا جس میں طوائفوں کی ایک ٹولی کی آمد کا مژدۂ جاں فزا سناتے ہوئے شاعر نے کہا تھا کہ پاگل ہوجاؤ۔ تمھارے وحشت زدہ چہروں سے دل لگی میں کچھ اضافہ ہی ہوگا۔ اس کار بد کے مشن کو اپنا نصب العین قرار دے کر وہ پھرتا پھراتا بدن فروش عورتوں کے ایک کوٹھے پر جا نکلا مگر بدی کی جو تصویریں اس نے بنائی تھیں یہ بازاری لڑکیاں اس پر ذرا بھی پوری نہ اُترتی تھیں۔ اس نے سوچا یہ تو سارا متوسط طبقے کا کھیل ہے، یہ بازاری لڑکیاں بھی انھی کی گڑیاں تھیں بدی بھی کریں تو سرخی پوت کر، ریشم میں چھپا کر۔ طوائفوں سے مایوس ہوکر اسے دمڑیوں کا خیال آیا اور وہ ذلتوں کی گہرائی میں تھوڑا سا اور نیچے اُتر گیا۔

کوٹھے سے وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا، آوازیں دور تک اس کا پیچھا کرتی رہیں مگر اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ اسے عورت کب چاہیے تھی، وہ تو بدی کی تلاش میں تھا۔ بدحواسی میں وہ گھر کی طرف ہولیا مگر حواس بحال ہوتے ہی پھر اپنے مشن کی تکمیل کے لیے چل پڑا، وہ خالی ہاتھ لوٹنا نہ چاہتا تھا۔ اب اس نے دمڑیوں کا رخ کیا کہ شاید یہاں بدی اپنے مثالی روپ میں مل سکے۔ دمڑیوں کی دکانوں پر تماش بینوں اور جنسی دیوانوں کے جمگھٹے لگے ہوئے تھے اور ارزل ترین درجے کی یہ فاحشائیں ان لوگوں کو گالیوں سے نواز رہی تھیں اور بدقماشوں کے اس مجمعے میں موجود بعض دل جلوں کے ساتھ ان کا گویا فحش کلامی کا مقابلہ جاری تھا۔ ان گنوار بے ہنگم عورتوں کا حلیہ اس کے بدی کے تصور کے خاصا قریب تھا۔ شرم، گھبراہٹ اور ایسے رزیل لوگوں کے مجمعے میں دیکھے جانے کے خوف کے مختلف مراحل سے گزرتا ہوا وہ کچوری نامی بدن فروش عورت کی دکان میں اک بارگی داخل ہوگیا اور اس کا حق الخدمت معلوم کرکے فوراً ہی پیشگی ادا کر دیا مگر اسے اس بات کا دُکھ بھی ہوا تھا کہ اس فاحشہ نے حیلے بہانے سے اس سے تقریباً پچیس فی صد رقم زیادہ وصول کرلی تھی۔ اناڑی پن کے اس کھلے مظاہرے اور احمقانہ سوالوں کے بعد جب اس کی دی ہوئی رقم کی وصولی کا مرحلہ آیا تو وہ بری طرح بوکھلا گیا اور کچوری کو بدن پیش کرنے سے روک دیا۔ اس وقت وہ بری طرح سہما ہوا تھا۔ کچوری نے تھوڑی دیر اس کی احمقانہ گفتگو کو برداشت کیا اور پھر روانہ ہونے کا حکم دے دیا۔ اس موقعے پر اسے اپنی خرچ کی ہوئی رقم کے ضائع ہونے کا احساس ہوا جس کی ممکنہ حد تک تلافی کے لیے اس نے کچوری سے ایک بوسہ طلب کیا، وہ بھی ہکلاتے ہوئے۔ کچوری نے یہ بوسہ اسے بڑی فیاضی سے فوراً عطا کر دیا مگر اس کے بے پناہ اناڑی پن کی وجہ سے یہ بوسہ بھی کہیں کا کہیں پڑا اور وہ محض اتنا ہی لذت یاب ہوسکا جتنا کسی لکڑی کے تختے کو چومنے کی لذت ہوسکتی تھی۔ وہ یہاں سے بھی بری طرح بھاگا اور اپنے ساتھ ان فاحشہ عورتوں کے لیے نہایت عمدہ رائے لے آیا۔ اس کے خیال میں وہ بدن فروش عورت جس کو وہ چھو بھی نہ سکا تھا بڑی نیک اور شریف تھی۔ اور اس نے بوسہ دینے سے بھی انکار نہ کیا تھا، بدی میں سے بھی تو نیکی نکل سکتی ہے۔

اب اسے معلوم ہوا کہ اس نے انسان سے مایوس ہوکر کیسی غلطی کی تھی لیکن وہ قعرِ مذلّت میں گرنے سے بچ گیا تھا۔ انسانیت اور زندگی پر اس کا یقین ایک بار پھر زندہ ہوگیا تھا۔ وہ ایک بہتر اور شریف النفس آدمی بن کر لوٹ رہا تھا وہ اس نورانی گروہ میں شامل ہوگیا تھا جو کہتا ہے، ''برکت والی ہے زندگی!'' وہ قعرِ مذلّت میں جا گرنے سے بچ جانے پر حمد و ثنا کر رہا تھا اور شکرگزار تھا کہ وہ دائمی لعنت کا شکار ہونے سے بچ گیا ہے اور اب وہ اس بات پر بھی خوش تھا کہ وہ بقایا چونی بھی اسی بدن فروش عورت کے پاس چھوڑ آیا تھا۔

اپنے موضوع کے انوکھے پن اور برتاؤ کی ندرت (واضح رہے کہ اس افسانے کا موضوع طوائف نہیں ہے بلکہ مجسم بدی میں ڈھل جانے کے ارادے سے نکلنے والے شخص کا گناہ کی غلاظت اور

بدکاری کی ذلت میں پوری طرح آلودہ ہو کر بھی صاف بچ نکلتا ہے۔ ڈبک شیرے کے مٹکے میں ڈم نہ بھیگے!) کے اعتبار سے یہ افسانہ بھی عسکری صاحب کی بے مثل تخلیق ہے مگر اس میں کچھ ایسے مناظر بھی در آئے ہیں جو لاکھ کوشش پر بھی قاری کے حلق سے نہیں اترتے۔ کہانی کا مرکزی کردار نوجوان (جی ہاں قرائن اسے نوجوان ہی بتاتے ہیں) جب مجسّم بدی بن جانے کی ٹھان کر گھر سے نکلتا ہے تو اس کی زبان پر فرانسیسی شاعر راں بو کا شعر ہوتا ہے جسے وہ گنگناتا ہوا جا رہا ہے اسی پر بس نہیں بلکہ بازارِ حسن یا بازارِ جسم کا منظر بھی عجیب و غریب ہے جہاں لوگ اپنے کو بے تعلق اور پاک باز ثابت کرنے کے لیے تو طوائفوں کے گھروں کے سائے سے بھی بچ بچ کر چل رہے ہیں اور کہیں کہیں اوورکوٹ کا کالر الٹے ہوئے یا تھوڑی تک مفلر لپیٹے ہوئے لوگ ایک ستون کے سائے سے نکل کر دوسرے کے سائے میں جاتے نظر آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے عسکری صاحب کا عمیق مطالعہ اور فرانس اور فرانسیسی ادب کے لیے ان کی شیفتگی نے ہمیں کسی ہندوستانی بازارِ حسن کا نہیں بلکہ پگال (پیرس کا بازارِ حسن) کا منظر دکھایا ہے ورنہ کم و بیش ساٹھ برس قبل ہندوستان کے کسی شہر کے بازارِ حسن میں خواہ وہ کلکتہ یا بمبئی ہی کیوں نہ ہو، ایسے مناظر کہاں نظر آئیں گے۔ جی چاہتا ہے اس موقعے پر عسکری صاحب کے مزاج سے تھوڑی سی آشنائی کے لیے ڈاکٹر آفتاب احمد سے مدد لی جائے:

> انگلستان اور فرانس کے بارے میں ان کی معلومات کا یہ حال تھا کہ انھیں وہاں کے چیدہ چیدہ مقامات، گلیوں اور محلوں اور وہاں کے ادیبوں کے پسندیدہ ریستوران اور قہوہ خانوں کے نام تک یاد تھے۔ بات یہ ہے کہ وہ صرف ادب ہی نہیں پڑھتے تھے عام قسم کے رسالوں خصوصاً رنگین رسالوں پر بھی ایک نظر ڈال لیا کرتے تھے۔

اب شاید یہ بات زیادہ واضح ہو گئی ہو کہ زیرِ نظر افسانے کا بازارِ حسن کم و بیش عسکری صاحب کے خوابوں کے شہر پیرس کا بازارِ حسن ہو سکتا ہے۔

اس افسانے میں عسکری صاحب نے جس کمالِ فن کے ساتھ بدی کے غلیظ اور بدبودار بطن سے مہکتی ہوئی اور جگمگاتی ہوئی نیکی کو برآمد کیا ہے اور بدی کے راستوں کے مسافر کو ایک نورانی وجود میں ڈھال کر دکھا دیا ہے، وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔ یہ افسانہ بھی ان کی خلاقانہ قوت کا شاہکار ہے اور ان کی طوائف (کچوری نامی دمڑیچی) بھی ان کے مرکزی کردار کے بہ قول بہت معصوم، نیک اور اللہ میاں کی گائے ہے۔ ہر چند کہ ان کی طوائف کچوری اپنے کردار، ماحول اور جزئیات کے اعتبار سے منٹو کی سوگندھی، بیدی کی کلیانی اور کملیشور کی جگنو سے زیادہ مختلف نظر نہیں آتی مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عسکری صاحب کی کہانی کا خمیر جس بغاوت سے اٹھا ہے وہ چیزے دیگر ہے اور یہی چیزے دیگر اس کہانی کو خاصے کی چیز بنا کر قاری کو حیرتوں کے آئینہ خانے کی سیر کراتی ہے۔

اور اب کچھ گفتگو عسکری صاحب کے اس شاہکار افسانے پر جو محض اس بنا پر قارئین اور نقاد حضرات کی توجہ حاصل کرنے سے محروم رہا کہ اس میں ایک باقاعدہ پلاٹ بھی ہے اور بھرپور کہانی پن بھی۔ اور شاید اس لیے بھی کہ اس افسانے کی ملول فضا میں جنس کی کارفرمائی نہیں ملتی۔ اس افسانے میں شروع سے آخر تک ایک ایسی اداسی ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے کر اسے ملال آشنا کر دیتی ہے۔
''وہ تین'' عسکری صاحب کا ایک نسبتاً مختصر مگر جگر خراش افسانہ ہے۔ جیسا کہ اس کے عنوان ''وہ تین'' سے ظاہر ہے، اس افسانے کے تین کردار ہیں۔ مسٹر کیلب اور ان کی دو بیٹیاں متھیلڈا اور نینسی۔ یہ حرماں نصیب اُجڑا ہوا خاندان ایک سرسبز و شاداب گولف گراؤنڈ کے قریب (یا اس کے احاطے کے اندر) ایک ایسے گھر کے نصف حصے میں رہتا ہے جو غالباً caretaker's cottage ہے۔ مسٹر کیلب کا ہنستا بستا گھر ایک ایسے حادثے میں برباد ہو چکا ہے جس نے ان کے اور ان کی بڑی بیٹی متھیلڈا کے اعصاب کو بُری طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے جب کہ ان کی وفاشعار بیوی اس صدمے میں اپنی جان ہار چکی ہے۔ کہانی ہمیں بتاتی ہے کہ مسٹر کیلب کو رشوت ستانی کے ایک مقدمے میں ملوث کر دیا گیا تھا جس میں وہ اپنی ملازمت سے برخواست کر دیے گئے تھے۔ بات یہیں پر ختم نہ ہوئی تھی بلکہ ان کے دشمنوں نے جو غالباً انھی کی طرح اینگلوانڈین یا کالے انگریز تھے، یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مسٹر کیلب کی بیٹیاں ان کی اولاد ہی نہ تھیں... مگر نیک دل پادری صاحب نے ان کا دفاع کیا تھا اور انھیں اس بات کا سرٹیفکیٹ دے دیا تھا کہ یہ بیٹیاں مسٹر کیلب ہی کی اولاد ہیں مگر اس کے باوجود آس پاس رہنے والے ہم مسلک لوگوں میں اس خاندان کا حقہ پانی بند تھا اور اینگلوانڈین برادری کا کوئی بھی فرد ان لوگوں سے بات تک کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ مسٹر کیلب یہ بات سوچ سوچ کر اکثر اداس رہتے تھے کہ اگر یہ جھگڑا کھڑا نہ ہوتا تو آج انھیں پوری پنشن مل رہی ہوتی اور ان کی بیوی بھی ان سے بچھڑ نہ گئی ہوتی۔ وہ یہ بھی سوچا کرتے تھے کہ اگر نیک دل پادری صاحب ان لوگوں کی مدد نہ کرتے اور سرٹیفکیٹ نہ دیتے تو یہ تھوڑی بہت پنشن بھی شاید ان کو نہ مل رہی ہوتی۔ مسٹر کیلب اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ برآمدے کی نیم تاریک سرد فضا میں لوہے کی کرسیوں پر بیٹھے رہتے تھے۔ ان کا کمرہ گرم ضرور تھا مگر وہاں انھیں اپنی آنجہانی بیوی کی یاد بہت ستاتی تھی جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر یسوع سے دعائیں مانگا کرتی تھی اور اسی نے بیٹیوں کو بھی پریشان نہ ہونے دیا تھا۔ اس زمانے میں وہ لوگ شام کے وقت بھی اندر رہا کرتے تھے۔ وہ گھر کا مرکزی وجود تھی، اس کے گرد وہ سب اس طرح بیٹھتے تھے جیسے مرغی کے گرد اس کے چوزے۔ لیکن اب مسٹر کیلب کو کمرے کے اندر شامیں برداشت نہ ہوتی تھیں، اس اذیت کے مقابلے میں انھیں برآمدے میں ٹھٹھرنا قابلِ قبول محسوس ہوتا تھا۔ ان کی اپنی صحت بھی جواب دے چکی تھی۔ بستر پر لیٹنے کے بعد بھی ان کے شانے دُکھنے لگتے تھے اور ہڈیاں ایسے گھن گھن کرتی تھیں جیسے ان میں جھینگر بول رہے ہوں۔ وہ اپنی بیوی کے لیے سوچا کرتے تھے، کیا وہ ان کی رگوں کا خون تھی؟ کیا وہ ان کی زندگی میں سانس کی طرح تھی... متھیلڈا ابھی صرف

چھبیس سال کی تھی مگر گھر کی بربادی نے اسے بھی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا، اس کی ٹانگیں ٹیڑھی ہوگئی تھیں اور چہرے کے علاوہ ٹانگوں پر بھی گہری بے رونق سیاہی کے دھبے پھیلتے جارہے تھے۔ مصیبتوں نے اس کا یہ حال کر دیا تھا کہ لوگ اسے اس کی چھوٹی بہن نینسی کی ماں سمجھتے تھے اور پھر نینسی کو ماں کے مرنے کے بعد اسی نے ماں کی طرح سنبھالا بھی تھا۔ وہ اسے لڑکوں کے ساتھ آنکھ مٹکا کرنے سے روکتی رہتی تھی اور ہر وقت کوٹ پہننے کی تاکید کیا کرتی تھی کہ کہیں اسے ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ متھیلڈا روحانی اذیتوں کے علاوہ جسمانی عوارض میں بھی مبتلا تھی۔ اس کا چہرہ اس کے بدن کی طرح روز بہ روز چوڑا اور چپٹا ہوتا جارہا تھا، اس کی ٹانگوں کے اعصاب مردہ ہوچلے تھے۔ اب شاید کوئی یقین بھی نہ کرتا کہ محض آٹھ سال پہلے وہ نینسی ہی کی طرح سرخ اور چست و چالاک تھی، کانوینٹ میں پڑھتی تھی۔ اگر یہ منحوس مقدمہ پیچھے نہ لگ گیا ہوتا تو وہ کم از کم ایم اے ضرور کرتی مگر اب تو وہ دکھوں کا مرقع تھی۔

اور ان تینوں میں تیسرا وجود نینسی کا تھا جو ایسی زندہ و سرخوش تھی کہ زندگی اس کے وجود سے چھلکتی تھی۔ وہ گولف کے شاداب میدان میں دوڑنا کھیلنا چاہتی تھی مگر بوڑھا دل شکستہ باپ اور وقت سے پہلے بوڑھی ہوجانے والی بڑی بہن اسے اپنے ساتھ برآمدے کے نیم تاریک سرد گوشے میں بٹھائے رکھتے تھے، گویا وہ اس سرد جہنم کی اسیر تھی۔ وہ شام کے نیلے آسمانوں میں اڑنے والی ابابیل ہوتی مگر اس کے پروں کو ایک جانب سے بیمار ڈیڈی اور دوسری جانب سے متھیلڈا کے روگی وجود نے دبا رکھا تھا۔ وہ اس برآمدے کی دھندلی اور بے رونق حراست سے رہائی پانے کی آرزو میں بے تابی سے ہوا پر اپنا سینہ دے دے مار رہی تھی۔ خزاں نے گولف کے میدان کو سارے پھولوں سے محروم کر دیا تھا، صرف ایک گلاب باقی تھا مگر متھیلڈا اسے یہ پھول توڑنے نہ دیتی تھی گرجا گھر کی گھنٹیوں کی آوازیں ہوا میں چمک دار فاختاؤں کی طرح قلابازیاں کھا رہی تھیں نینسی حیران ہوتی تھی اور نینسی اسے بالوں میں لگانے کی خوشی سے بھی محروم تھی کہ اس کے ڈیڈی اور بڑی بہن گرجا کیوں نہیں جاتے تھے؟ اس کا جی مچلتا تھا کہ وہ بھی گرجا گھر جائے اور یسوع مسیح کے عین قدموں میں قربان گاہ پر جا کر کھڑی ہوجائے مگر یہ ننھی منی خوب صورت روح ایک ایسی قید میں تھی جس سے رہائی کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ وہ اپنے بوڑھے باپ اور بیمار بہن کے ساتھ اس سرد نیم تاریک اور بے رنگ برآمدے میں محبوس تھی جہاں سے اسے ہلنے کی اجازت نہ تھی۔ نینسی کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس برآمدے کے خون چوسنے والے زرد اور پھیکے دھندلکے میں وہ پیلی پڑتی جائے گی اور گھلتے گھلتے خواب ہوجائے گی۔ اس کے دماغ کے سیمیں پردے پر کوئی تصویر نہ ہوگی وہ تینوں رفتہ رفتہ ہوا میں تحلیل ہوجائیں گے۔ اس برآمدے میں کچھ بھی وقوع پذیر نہ ہوگا، ان لوگوں کے سر کا ایک بال بھی نہ ہلے گا، اپنے اپنے تاریک گوشوں میں ڈیڈی اور متھیلڈا اس قیدی ابابیل کے پروں کو دبائے بیٹھے رہیں گے۔ یہاں تک کہ وہ سب مصر کی ممیوں کی راکھ کی صورتیں رہ جائیں گے... انھی یاس انگیز خیالوں میں شام ڈھل جاتی تھی، دھندلکا پھیل جاتا تھا، گولف گراؤنڈ دھوئیں میں چھپ جاتا تھا

اور وہ تینوں اسی طرح تاریک گوشے میں بیٹھے رہتے تھے۔
مگر عسکری صاحب کا جادو نگار قلم اس شدید اداسی سے ایک اُمید، ایک نشاط انگیز کیفیت کو جنم دیتے ہوئے کہانی کا اختتام ایک ایسے منظر پر کرتا ہے جہاں رات کی تاریکی سے صبح کی روشنی پھوٹتی معلوم ہوتی ہے۔ ''دھواں دھواں دھواں اور اس کے بعد رات کی اندھی پہنائیاں... لیکن کون کہہ سکتا تھا؟ شاید وہ جادو کی آواز دھندلکوں پر ہی اڑتی ہوئی آتی ہو... شاید وہ طلسمی منظر تاریکیوں کو ہی چیر کر ظاہر ہوتا ہو...''

''وہ تین'' عسکری صاحب کا شاہکار افسانہ ہے۔ اس کی بنت، اس کا برتاؤ اور اس کی انتھاہ مایوس کر دینے والی فضا قاری کو اپنی شدید گرفت میں رکھتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس سرد، نیم تاریک اور بے رنگ برآمدے میں پاتا ہے جہاں دو مایوس نیم مردہ روحوں کے درمیان ایک ننھی ابابیل پھڑپھڑا رہی ہے مگر آزادی کی کوئی سبیل نہیں پاتی۔ اس افسانے کی شاعرانہ زبان خاص طور پر داد کی مستحق ہے، کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

☆ پیپل کے پتوں میں تو ہوائیں ہر وقت آہیں بھرتی رہتی تھیں خصوصاً اس دفعہ کی آہ تو اتنی لمبی آہستہ آہستہ مدھم ہوتی ہوئی اور دل دوز تھی کہ جیسے وہ پیڑ، خود وہ زمین جس میں پیڑ لگا ہوا تھا اپنا آخری سانس لے رہی ہو۔

☆ پتوں کی آہ نے ان دونوں کو تو صرف سن ہی کر دیا تھا مگر نینسی کو ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کسی نے اس کا دل مسل ڈالا ہو۔

☆ وہ صاف دیکھ سکتی تھی کہ اس وقت گولف کے لمبے چوڑے میدان کا ایک ایک ڈھلان، ایک ایک پیڑ، کالے پالش والا ڈبا، گھاس کی ہر ہر پتی، ہر ہر پھول دھوپ میں جگمگا رہا ہوگا اور سورج کی ننھی منی ہنس مکھ کرنیں گھاس کی کومل ڈنڈیوں پر کھیل رہی ہوں گی۔

☆ جب وہ گیند مارنے کے لیے اپنا کلب اٹھاتے ہوں گے تو فضا میں ستارہ سا ناچ جاتا ہوگا۔

☆ ہواؤں میں غیر مرئی دیوں کی لوئیں پٹ بیجنوں کی طرح چمک چمک کر اڑ رہی ہوتیں۔

☆ کیا کوئی ایسی آواز بھی ہوتی ہے جس سے بدی کا طلسم باطل ہو جاتا ہو؟ کیا کوئی ایسا منظر بھی ہوتا ہے جس سے خشک جھاڑیوں پر گلاب مہکنے لگتے ہوں۔

عسکری صاحب کی اس بے مثل کہانی کا خمیر کہاں سے اٹھا، جناب مختار زمن کی زبانی سنیے:
ہم لوگ اسٹیشن روڈ پر ٹہلنے جایا کرتے تھے۔ اسی سڑک پر ایک عیسائی خاندان

بھی روز ٹہلنے آیا کرتا تھا... ایک چھوٹے قد کے بے ہنگم سے بڑے میاں خاکی نیکر پہنے ہوئے ان کی موٹی سیاہ فام بڑی بی اور کالے عینک لگائے ایک بدقوارہ سی لڑکی، جو عمر کے اس حصے میں پہنچ چکی تھی جب اس کی اداس صورت دیکھ کر معلوم ہوتا تھا... جڑ کٹ گئی نخل آرزو کی... اس کی چھینٹ کی فراک کے نیچے دو کالی سی خمیدہ ٹانگیں اسے اور بھی بے ہنگم بنائے رکھتی تھیں۔ ہم لوگ انھیں ''تھری وچز'' کہتے تھے۔ عسکری صاحب انھیں تام لوٹ بھی کہا کرتے تھے۔ لیکن ان کے ساتھ ان کی سب سے چھوٹی لڑکی بھی ہوتی تھی، اس کا رنگ کھلتا ہوا اور بدن گدرایا ہوا تھا، گول چہرہ اور معلوم ہوتا تھا کہ ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تلی کھڑی ہے۔ عسکری کو اس سے بڑی ہمدردی تھی کہتے تھے کہ ''تھری وچز'' اس کی زندگی برباد کر رہے ہیں... اور ایک افسانہ جنم لے رہا ہے... بعد میں عسکری سے اس کی بات چیت بھی ہونے لگی... افسانوں کا ذکر ہوتا تھا ادب پر بات ہوتی تھی۔

تو یہ تھا وہ مشاہدہ جسے عسکری صاحب کی خلاقانہ قوت نے ایک بے مثل کہانی میں ڈھال دیا۔ ان کی اس کہانی میں ایک اور خوبی بھی ہے، وہ یہ کہ عسکری صاحب کے دیگر افسانوں میں ان کے عیسائی کردار اردو کے محاورے ہی نہیں روزمرہ بھی بولتے نظر آتے ہیں جو افسانے کے حسن کو بڑی حد تک متاثر کرتے ہیں مگر یہ افسانہ چوں کہ مکالموں سے خالی ہے لہٰذا کہانی اپنا بھرپور تاثر قاری پر چھوڑتی ہے۔

''وہ تین'' عسکری صاحب کا ایسا خوب صورت افسانہ ہے جس کا ہر کردار اپنے تمام تر ملال میں غلطاں قاری کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ مسٹر کیلب اپنی کھڑکھڑاتی ہوئی ہڈیوں اور روح میں پیوست اپنی بیوی سے جدائی کے برفیلے غم کے ساتھ، متھیلڈا اپنی ٹیڑھی ٹانگوں اور ٹانگوں پر پھیلتے سیاہی کے بے رونق دھبّوں کے ساتھ اور پُرشباب نینسی اپنی بے قرار روح، آزادی کی جستجو، کھلی فضاؤں میں پر پھیلا کر اڑنے اور غیر مرئی لہروں کے درمیان اسیری کے گہرے ملال کے ساتھ اپنے حصے کے نصف برآمدے کے تاریک اور سرد گوشے میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ یہاں وقت رکا ہوا محسوس ہوتا ہے، گویا ابدیت کا اکھوا اسی برآمدے سے پھوٹ رہا ہو... اور پھر عسکری صاحب کی افسانہ نگاری کا جادو بقیہ نصف برآمدے کو زندگی کی مسرتوں سے معمور جگمگاتا ہوا دکھاتا ہے، جہاں نئی نئی شادی کے نشے میں سرشار مسز فلپ گرم اوورکوٹ میں لپٹی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھی ہے جو ہر ہر آہٹ پر چونک اٹھتی ہے کہ شاید اس کا شوہر آگیا ہو۔ گویا یہ برآمدہ روز و شب، حسن و بدصورتی اور نشاط و الم کا تلازمہ ہے جس کا نصف غم و اندوہ، اتھاہ مایوسیوں اور بے کراں رنج و الم میں ڈوبا ہوا ہے تو بقیہ نصف محبتوں کی سرشاریوں اور جسمانی تقاضوں کی منہ زوریوں سے آگاہ نوجوان دلوں کا مسکن ہے اور محبتوں کی روشنیوں سے

جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ اس بھرپور افسانے پر عسکری صاحب کو جتنی بھی داد دی جائے شاید وہ کم ہی ہوگی۔

محمد حسن عسکری کے افسانے اردو کے افسانوی ادب کا نہایت حسین اور اہم باب ہیں۔ ان افسانوں نے نئے نئے تجربات کے در کھولے اور نئے نئے مباحث کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئے اور اردو افسانے کے سفر میں یہ افسانے نہایت اہم سنگ ہائے میل بن گئے۔ مگر دو باتیں ایسی ضرور ہیں جو قاری کو بے حد گراں گزرتی ہیں، یہاں ہم ان کا مختصراً جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کے افسانوں کے بعض کردار کہانیوں کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتے اور قاری کے ذہن میں الجھنیں پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں، مثال کے طور پر ''پھسلن'' کا مرکزی کردار نذرو ہرگز کوئی جاذب نظر شخصیت نہیں ہے۔ اس کا حلیہ اور اس کی شخصیت کا مجموعی تاثر ایک کراہت کا موجب ہے مگر افسانے میں کچی عمروں کے نوجوان اور مضبوط جسموں والے نسبتاً جہاں دیدہ نوجوان دونوں ہی اس پر ہزار جان سے فدا ہیں اور بعض تو اسے دیکھتے ہی سمجھ جاتے ہیں کہ وہ کن راستوں کا مسافر ہے۔ کہانی کی مجموعی فضا میں نوجوانوں کے درمیان ہم جنس پرستی کے واضح اشارے ملتے ہیں مگر صاف محسوس ہوتا ہے کہ پاک باز و پاک طینت افسانہ نگار ان رموز سے کچھ زیادہ آگاہی نہیں رکھتا۔ شاید اسی لیے نذرو کے کردار میں منٹو اور بیدی کے کرداروں جیسی بے باکی ہے اور نہ ہی ضمیرالدین احمد کے کرداروں جیسی رمزیت۔

عسکری صاحب کے کچھ عیسائی کردار ایسی ٹھیٹھ زبان بولتے نظر آتے ہیں کہ قاری حیران رہ جاتا ہے، کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

> اجی اب لڑکیاں ہی جو ٹھیریں... مگر ہماری گلیڈس ان باتوں سے بارہ پتھر الگ رہتی ہے جہاں کوئی لڑکی اس کی طرف بڑھی اور اس نے کہا کہ بس بھئی، اس کی دوستی نہیں پالتے، چاہے برا مانو چاہے بھلا۔ صفائی کی تو اسے لت ہے، اسکول تو اسکول گھر پر بھی اس کا یہ حال ہے کہ پیالی میں ذرا سا دھبا نظر آجائے بس پھر چائے نہیں پیے گی چھوڑ دے گی۔ اسی طرح بھائی کے ساتھ کرتی ہے۔ جن جن سے اسے بڑی محبت ہے، سب کچھ ہے لیکن ذرا مٹی میں سنا ہوگا تو ہاتھ نہیں لگانے دے گی۔ وہ باہر سے کھلتا ہوا دوڑتا ہوا آئے گا تو دور ہی سے چلائے گی، ''نا بھیا، مجھے مت چھونا، جاؤ ماما کے پاس جاؤ پہلے ذرا منھ دونھ دھلوا کے آؤ، پھر مجھ سے بات کرنا۔''
>
> (مسز جینکس۔ ''قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے'')
>
> ''تو کون ہے پوچھنے والی؟ بڑی آئی ہے بن کے میری وہ!''
>
> (بیولا۔ ''اندھیرے کے پیچھے'')
>
> ''یہاں کیوں پڑی ہے تو اندھیرے میں؟ ذرا باہر واہر نکل۔ جی نہیں گھبراتا

تیرا۔ اچھا اب میں سمجھی۔ تو کچھ کھا رہی تھی یہاں چھپ کے اندھیرے میں!
کیوں ری ندیدی... صابونی لی ہوگی تو نے آج دوپہر خوانچے والے سے... ہمیں
بتا دیتی تو کیا ہم کھا جاتے؟"

(روڈا۔ "اندھیرے کے پیچھے")

"بڑا اچھا کرتی ہیں کام! کچی پکی روٹیاں تھوپ کے رکھ دیں، یہ ہوگیا کام!"
(فتحہ..."اندھیرے کے پیچھے")

"چل ری۔ پڑ چل کے۔ ابھی مت لیٹیو۔ یہاں آ میرے پلنگ پہ آم آم
کھیلیں گے۔"

(شیلا۔ "اندھیرے کے پیچھے")

"جی اب تو چلنے دیجیے لڑکا ضد کر رہا ہے، ادھر سارا کام پڑا ہے کرنے کو۔ ان
کے آنے کا وقت بھی ہوگیا ہے، آتے ہی کھانا مانگیں گے، چل کے دیکھوں۔
جھنگو نے تو گھر کا گھر وا کر دیا ہوگا اتنی دیر میں..."

(مسز جیکسن۔ "قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے")

عسکری کے عیسائی کرداروں کے بارے میں مختار زمن کچھ روشنی ڈالتے ہیں:

عسکری کے افسانوں کے بہت سے کردار عیسائی ہیں۔ میں نے ایک دفعہ ان سے پوچھا تھا کہ تمھیں کرستانوں سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ تو کہنے لگے کہ دراصل جب میں بلند شہر میں رہتا تھا تو ہمارے پڑوس میں بہت سے عیسائی بھی رہتے تھے، ان کی عورتیں اور بچے ہمارے گھر میں آتے تھے، میں اچھی طرح جانتا ہی ان لوگوں کو تھا، وہی کردار بن گئے۔ شاید الٰہ آباد میں بھی ان کی نظر میں وہی چیز ہے۔ یوں آپ جانتے ہیں کہ ان کی نظر بڑی دُور رس تھی۔

اور یوں نہ تو عسکری صاحب نے ان کرداروں کی زبان کے بارے میں کچھ کہا نہ مختار زمن صاحب نے پوچھا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کرداروں کی زبان سے ادا کیے ٹھیٹھ زبان کے مکالمے خاصے غیر حقیقی ہیں، کیوں کہ عام مشاہدہ یہی ہے کہ عام ہندوستانی معاشرت میں رہنے والے عیسائی اور اینگلو انڈین عام ہندوستانیوں سے مختلف بود و باش کے علاوہ زبان میں بھی انگریزوں کی پیروی کرنا پسند کرتے تھے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہندوؤں کے نچلے طبقوں سے جن لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا شاید وہ یہی زبان بولتے ہوں۔

عسکری صاحب کے افسانے اردو فکشن میں ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز ہیں۔ انھوں نے نہایت جرأت سے ان موضوعات پر لکھا جن کو قدامت پرست ہندوستانی معاشرے میں ممنوع

(taboo) سمجھا جاتا تھا اور حتیٰ الوسع فحاشی (vulgarity) سے اپنے افسانوں کو بچایا۔ ان کے افسانوں کو ہندوستان کے طول و عرض میں نہایت پسند کیا گیا اور یہ پسندیدگی اس حد تک ہے کہ محض گیارہ افسانے لکھ کر ہی وہ اردو افسانے کے ستونوں میں شامل ہو چکے ہیں صرف ساڑھے سات برس کی مدت میں لکھے گئے یہ افسانے ایک طلسم کی طرح ہیں جس میں داخل ہو کر قاری واپسی کا راستہ بھول جاتا ہے۔

☆☆☆

اجمل کمال

نقاد کی خدائی

(دوسرا باب: منٹو کی غلط تعبیر)

(۱)

مئی ۱۹۴۶ء کے بعد محمد حسن عسکری نے جو سیاسی موقف اختیار کیا اور اسے ادب پر جس طرح منطبق کرنے کی کوشش کی، اس کے سلسلے میں انھیں ایسی تحریروں کی سخت ضرورت تھی جنھیں وہ اپنے نو وضع کردہ ادبی نظریے کی مثال کے طور پر پیش کرسکیں۔ منٹو کو ترقی پسندوں سے الگ قرار دینا عسکری کی اسی (ادبی؟) ضرورت کا شاخسانہ تھا، ورنہ ان کے پاکستانی ادب کے خزانے میں صرف ''یا خدا'' کا نام رہ جاتا۔

عسکری اور ان کے ہم خیال نقادوں، خصوصاً ممتاز شیریں، کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ وہ منٹو کے اندازِ فکر سے قربت رکھتے ہیں، چناں چہ ان کی تنقیدی تحریریں منٹو کی تحریروں کی معنویت کو سمجھنے میں مددگار ہوسکتی ہیں۔ میری رائے میں یہ تاثر غلط فہمی پر مبنی اور قطعاً بے بنیاد ہے۔ میں اس باب میں اپنی اسی رائے کی وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا۔

عسکری کی تحریروں میں منٹو کے لیے والہانہ پسندیدگی پاکستان بننے سے پہلے کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ جنوری ۱۹۴۶ء کی ''جھلکیاں'' میں لکھتے ہیں:

> نئے ادب کی تحریک میں میں بھی شامل رہا ہوں اور اب اس تحریک میں چند سانس اور باقی رہ گئے ہیں، وہ بھی اکھڑے اکھڑے۔ یہ سارا ہنگامہ محض بلوغت کا اُبال تھا اور زمانہ بلوغت لازوال نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ پچھلے دس سال میں اس تحریک نے جو ادب پیدا کیا ہے وہ صرف انڈر گریجویٹ ادب ہے۔ عصمت چغتائی کے مضمون ''دوزخی'' کو چھوڑ کر (ایسی ایک آدھ چیز اور ہو تو اس وقت یاد نہیں آرہی) اس ادب میں کوئی چیز ایسی ہے ہی نہیں جو سنجیدہ ذوق

رکھنے والے دماغ کو زیادہ دیر تک مصروف رکھ سکے۔ میٹھا برس لگتا ہے تو اسکول
کی لونڈیاں تک ایسا ادب پیدا کر لیتی ہیں۔

یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے کہ منٹو کے جو افسانے اس وقت تک شائع ہو چکے تھے ان میں ''نیا قانون''، ''ہتک''، ''خوشیا''، ''دھواں''، ''بو'' اور ''کالی شلوار'' شامل تھے جنھوں نے ''غیر سنجیدہ'' ذوق رکھنے والے دماغوں کو خاصی دیر تک مصروف رکھا تھا۔ اگر ۱۹۴۶ء میں عسکری کے نزدیک منٹو کا یہ سارا کام دریابُرد کر دینے کے لائق ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ دو سال بعد کس بنیاد پر انھیں اتنا اہم ادیب قرار دینے لگتے ہیں؟

اس بات پر یقین کرنے کا خاصا جواز موجود ہے کہ عسکری اور ان کی شاگردہ ممتاز شیریں کی منٹو سے وابستگی کی وجہ موقع پرستی کے سوا کچھ نہیں تھی (موصوفہ بھی منٹو پر ۱۹۴۷ء کے بعد ہی فریفتہ ہوئیں)۔ عسکری کو منٹو پر قبضہ جمانے کا موقع اس وقت ملا جب ترقی پسندوں کے اجلاس نے ایسے ادیبوں اور ادبی رسالوں کا بائیکاٹ کرنے کی احمقانہ قرارداد منظور کی جو ان کی تنگ نظر تعریف کی رُو سے غیر ترقی پسند ٹھہرے تھے۔ اس قرارداد کی مدافعت کسی بھی طرح نہیں کی جا سکتی۔ منٹو کی تحریروں کے مطالعے کی بنیاد پر میرے نزدیک منٹو کو غیر ترقی پسند قرار دینا کسی طرح ممکن نہیں ہے خواہ اسے ثابت کرنے کے لیے ترقی پسند اور عسکری مل کر ہی کیوں نہ زور لگائیں۔ اس کی تصدیق اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ آزادی کے بعد کے ابتدائی برسوں میں منٹو اور ترقی پسند آزادیِ اظہار کے جرم میں کٹہرے میں ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ منٹو کے جن افسانوں پر ''قوم'' نے سخت گیری کی وہ (بائیکاٹ کی قرارداد کے باوجود) ترقی پسند رسالوں ہی میں چھپے تھے۔

آیئے تقسیم کے بعد ترقی پسندوں اور عسکری کے سیاسی موقف کا جائزہ لیں اور پھر یہ دیکھیں کہ منٹو کا سیاسی موقف ان دونوں میں سے کس کے زیادہ نزدیک ہے۔ ترقی پسندوں کا خیال غالباً فیض کی نظم ''صبحِ آزادی'' میں سب سے زیادہ معروف طور پر بیان ہوا ہے جو ''یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر'' سے شروع اور ''چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی'' پر ختم ہوتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مئی ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی حمایت کا فیصلہ کرتے ہوئے عسکری نے پاکستان کے بارے میں کیسی ''خوش اندیشانہ'' توقعات ظاہر کی تھیں۔ اب دیکھتے ہیں کہ عسکری کی یہ توقعات پوری ہوئیں یا نہیں۔ ستمبر ۱۹۴۸ء کی ''جھلکیاں'' میں لکھتے ہیں:

> پاکستان بننے کے بعد مسلمان شاعروں نے پاکستان کا خیر مقدم جس خوب صورتی سے کیا ہے وہ بھی داد کے قابل ہے۔ ہمارے شاعروں کو گلہ ہے کہ ہم نے تو نہ جانے کیا کیا خواب دیکھے تھے اور تعبیر بالکل الٹی ہوئی۔ ابھی ہماری منزل نہیں آئی، ہمیں تو بہت دور جانا ہے! آپ کو دیکھیے اور آپ کے خوابوں کو دیکھیے!

> جیسے تاریخ کو چاہیے تھا حرکت کرنے سے پہلے آپ سے مشورہ کر لیتی کہ لو بھئی، اب میں آگے کھسکتی ہوں، بولو مزدوروں کی اُجرت میں پانچ فی صدی اضافہ کرواتے ہو یا دس فی صدی... تو جناب، اگر ہمارے شاعر حضرات کی منزل ابھی نہیں آئی تو خدا انھیں ہمت سفر دے، ہم تو ان کے خیر خواہوں میں سے ہیں۔ باقی رہی مسلمان قوم، تو اُس کی منزل تو آ گئی بلکہ اس کی منزل تو اسی دن آ گئی تھی جس دن قوم کے دل میں اپنی ہستی اور انفرادیت کو قائم رکھنے کا احساس پیدا ہوا تھا۔ قیام پاکستان اور اس کے بعد جتنی بھی باتیں ہوں وہ تو سب تفصیلات ہیں۔ قوم نے اپنے آپ کو پالیا، قوم کی منزل آ گئی۔ ہاں، ویسے اگر آپ کو چلنے ہی کا شوق ہو تو بسم اللہ، پائے مرا لنگ نیست۔

سبحان اللہ!

عسکری کا خیال ہے کہ جو لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ منزل ابھی نہیں آئی وہ قوم کی امنگوں سے بے اعتنائی کا ثبوت دے رہے ہیں اور اگر قوم ان کے ساتھ سخت گیری کرے تو بالکل حق بہ جانب ہوگی۔ لیکن اُس پروگرام کا کیا ہوا جس کی رُو سے پاکستان کو ایک عوامی اور اشتراکی ریاست بننا تھا، سرمایہ داری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا تھا اور مستقل امن و امان قائم کرنا تھا؟ ایسے احمقانہ اور گستاخانہ سوال صرف ترقی پسند کیا کرتے ہیں جو مسلمانوں کو گمراہ کر کے پاکستان سے بدظن کرنا چاہتے ہیں۔

اب ذرا ایک اور اقتباس کی طرف توجہ کیجیے:

> ۱۴ر اگست کا دن میرے سامنے بمبئی میں منایا گیا۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں آزاد ملک قرار دیے گئے تھے۔ لوگ بہت مسرور تھے، مگر قتل اور آگ کی وارداتیں باقاعدہ جاری تھیں۔ ہندوستان زندہ باد کے ساتھ ساتھ پاکستان زندہ باد کے نعرے بھی لگتے تھے۔ کانگریس کے ترنگے کے ساتھ اسلامی پرچم بھی لہراتا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور قائداعظم محمد علی جناح دونوں کے نعرے بازاروں اور سڑکوں میں گونجتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان، اور وہ لہو کس کا ہے جو ہر روز اتنی بے دردی سے بہایا جا رہا ہے۔ وہ ہڈیاں کہاں جلائی یا دفن کی جائیں گی جن پر سے مذہب کا گوشت چیلیں اور گدھ نوچ نوچ کر کھا گئے تھے۔ اب کہ ہم آزاد ہوئے ہیں، ہمارا غلام کون ہوگا؟ جب غلام تھے تو آزادی کا تصور کر سکتے تھے۔ اب آزاد ہوئے ہیں تو غلامی کا تصور کیا ہوگا؟ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم آزاد بھی ہوئے ہیں یا

نہیں؟ ہندو اور مسلمان دھڑا دھڑ مر رہے تھے، کیسے مر رہے تھے؟ کیوں مر رہے تھے؟ ان سوالوں کے مختلف جواب تھے، ہندوستانی جواب، پاکستانی جواب، انگریزی جواب۔ ہر سوال کا جواب موجود تھا، مگر اس جواب میں حقیقت تلاش کرنے کا سوال پیدا ہوتا تو اس کا کوئی جواب نہ ملتا۔

ہندوستان آزاد ہوگیا تھا۔ پاکستان عالم وجود میں آتے ہی آزاد ہوگیا تھا۔ لیکن انسان ان دونوں مملکتوں میں غلام تھا۔ تعصب کا غلام، مذہبی جنون کا غلام، بربریت کا غلام۔

یہ کون شخص ہے جس کو اتنا بھی پتا نہیں کہ مسلمان قوم کی منزل تو کب کی آگئی؟ ضرور کوئی ترقی پسند ہوگا۔

جی ہاں، یہ منٹو ہے۔ یہ اقتباس اداکار شیام کے خاکے ''مُرلی کی دھن'' سے لیا گیا ہے جسے منٹو نے ہجرت کر کے پاکستان آنے کے بعد لاہور میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ ملاحظہ کیجیے کہ عسکری اتنا واضح موقف رکھنے والے منٹو کو ترقی پسندی سے دور اور اپنی ''خوش اندیشیوں'' کے قریب بتاتے ہیں۔

مظفر علی سید کا کہنا ہے کہ منٹو کے افسانوں پر مقدمے یوں تو فحاشی کے الزام میں قائم کیے گئے لیکن اصل اعتراض منٹو کے سیاسی موقف پر تھا۔ اوپر دیے گئے اقتباس سے بھی یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ ریاست کے لیے منٹو کے سیاسی خیالات کو برداشت کرنا بہت دشوار تھا کیوں کہ اس قسم کے خیالات ''قوم'' کی امنگوں سے بے اعتنائی کا مظہر ہیں اور بہ قول عسکری ''قوم'' اگر ایسے خیالات رکھنے والوں سے سخت گیری برتتی ہے تو حق بہ جانب ہے۔ لیکن مظفر علی سید کے برخلاف، عسکری اور ممتاز شیریں کے نزدیک منٹو کے سیاسی خیالات ریاست کے لیے بالکل قابل قبول اور ترقی پسندوں کے موقف سے بالکل الگ ہیں۔

(۲)

جہاں تک ممتاز شیریں کا تعلق ہے تو ان کی تنقید کی پرواز ان کی تحریروں میں پائے جانے والے ان نادر نکتوں سے ظاہر ہے جن کی نامعلوم گہرائیوں پر ان کے مداحین اور وابستگان آج تک سر دھنتے دیکھے جاتے ہیں۔ ''منٹو کا انسان نوری ہے نہ ناری، وہ آدم خاکی ہے''۔ یہ انھوں نے منٹو کی منفرد خصوصیت دریافت کی ہے۔ گویا مثال کے طور پر عظیم بیگ چغتائی، بیدی اور غلام عباس کے کردار یا تو نوری ہوتے ہیں یا ناری۔ یہ ایسا زبردست انکشاف تھا کہ منٹو کے بارے میں شیریں کی کتاب، جسے انھوں نے اپنی زندگی میں شائع کرنا مصلحت کے خلاف جانا تھا، ان کی وفات کے بعد آصف فرخی نے مرتب کر کے ''نوری نہ ناری'' ہی کے عنوان سے شائع کی۔

ایسا ہی ایک نکتہ ''سڑک کے کنارے'' پر اُن کے مضمون سے برآمد ہوتا ہے۔ اس افسانے کا حاصل ممتاز شیریں کے الفاظ میں یہ ہے، ''ایک عورت، ایک ماں کی زخمی پھڑپھڑاتی ہوئی روح''۔ یہ بھی خاصا کارآمد نکتہ ہے۔ اس ناقدانہ پھڑپھڑاہٹ کی مدد سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''نیا قانون'' میں ایک کوچوان کی زخمی پھڑپھڑاتی ہوئی روح ملتی ہے اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں ایک پاگل کی زخمی پھڑپھڑاتی ہوئی روح۔

مزید فرماتی ہیں، ''منٹو کے افسانوں میں عورت ترغیب مجسّم ہے''۔ منٹو کے افسانوں سے یہ جوئے شیر نکالنے کے لیے فرہاد کا نہیں شیریں کا جگر چاہیے۔ ظاہر ہے سوگندھی، موذیل، سلطانہ اور مسز اسٹیلا جیکسن کو آپ ترغیب مجسّم نہیں کہیں گے تو کیا ''اپنی نگریا'' میں ہنسی خوشی رہنے والی عفیفائیں قرار دیں گے؟ شیریں کے پاس لے دے کر ''فطری انسان'' اور ''بنیادی گناہ'' جیسے معصوم (اور سیاسی طور پر بے ضرر) تصورات ہیں جن کی مدد سے وہ منٹو کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتی ہیں۔ اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا!

ممتاز شیریں تو خیر قابلِ معافی ہیں۔ ایک تو بہ قولِ عسکری ان کی تاریخ ہی ان کی شہرت سے شروع ہوئی۔ دوسری وجہ ان کی سادہ خیالی ہے کہ ان کے نزدیک اردو ادب کی معراج بس یہ تھی کہ مغربی ادب کی ایک اچھی سی نقل بن جائے (اور مغربی ادب بھی بس اتنا جتنا ''آکسفرڈ'' میں پروفیسر ''بیامبرو'' سے پڑھا تھا اور پاکستان میں عسکری اور اپنے نیک نہاد شوہر سے سن لیا تھا)۔ بے چاری یہی سوچ سوچ کر نہال ہوتی رہتی تھیں کہ منٹو اردو افسانے کے موپاساں ہیں، بیدی چیخوف ہیں، قرۃ العین حیدر ورجینیا وولف ہیں، عزیز احمد آلڈس ہکسلے ہیں، احمد علی (لاحول ولاقوۃ) کافکا ہیں، وہ خود ایملی برونٹے ہیں اور ان کا ''نیا دور'' پنگوئن نیو رائٹنگ ہے! چلیے، خوش خیالی سے کسی کا کیا بگڑتا (یا بنتا) ہے۔ عسکری کا تخلیقی مانجھا جوانی ہی میں ڈھیلا نہ پڑ گیا ہوتا تو وہ اپنی خوش خصال شاگردہ کے ہاتھوں شاید چھوٹے موٹے جوئس یا لارنس بن گئے ہوتے۔

ممتاز شیریں کے ادبی کارناموں کی جانب چند اشارے ''سوغات''، بنگلور کے ایڈیٹر محمود ایاز نے اپنے رسالے کے شمارہ ۳ کے اداریے میں کیے:

> ان کے جن چند مضامین میں زبان و بیاں کی کم زوریاں نہیں پائی جاتیں ان پر یہ گمان گزرتا ہے کہ یہ مضامین پہلے انگریزی میں لکھے گئے ہیں اور پھر کسی اچھے لکھنے والے سے ان کا اردو میں ترجمہ کرایا گیا ہے، مثلاً ''ادیب اور ذہنی آزادی'' یا ''کشمیر اداس ہے'' کے دیباچے کا وہ حصہ جو مسئلۂ کشمیر سے متعلق ہے۔ ان مضامین میں کوئی جھول نہیں ہے۔ ایسی نپی تلی نثر اور ایسی کفایتِ الفاظ کہ ہر سطر پر انگریزی کا دھوکا ہو۔ اظہار میں ایک روانی بھی ہے اور بیان کی قوت بھی۔ ان مضامین میں حوالوں سے اور دلائل کی بنیاد پر اپنے خیالات

کی تائید میں جو زوردار مقدمے قائم کیے گئے ہیں، وہ ایک ایسے تربیت یافتہ ذہن کا پتا دیتے ہیں جو ممتاز شیریں کا یقیناً نہیں تھا۔ پاکستان آنے کے بعد ممتاز شیریں میں جو تبدیلی آئی یا لائی گئی اس کا ذکر تفصیل طلب بھی ہے اور اذیت ناک بھی، اور آج ان کی موت کے بعد یہ باتیں شاید کچھ زیادہ معنی نہیں رکھتیں۔ جبر و استحصال شاید ان کا مقدر تھا اور انھوں نے اسے بہ ظاہر ہنسی خوشی اور بغیر کسی مزاحمت (؟؟) کے اس طرح قبول کرلیا جیسے یہ ان کا اپنا منتخب کردہ راستہ تھا۔ ''میگھ ملہار'' پر ''سوغات'' کے تبصرے کی تلخی اور تندی کی وجہ یہی تھی۔ کیا لکھیں کیا نہ لکھیں اور کب لکھیں، یہ باتیں لکھنے والا اپنے طور پر طے کرتا ہے اور جب یہ فیصلے کوئی اور صادر کرنے لگے یا کسی پلاننگ اور منصوبہ بندی کے تحت یہ فیصلے کرنے پڑیں تو رفتہ رفتہ تخلیق کار کی موت ہوجاتی ہے۔ جسمانی موت تو بعد میں آتی ہے۔

منٹو پر کتاب لکھتے لکھتے اچانک رک جانے کا سبب تلاش کرنے کے لیے علم غیب کی ضرورت نہیں۔ کوہِ ندا سے آنے والی آوازیں مختلف لوگوں کے لیے مختلف بلاوے لاتی ہیں، کسی کو وزارت کے تو کسی کو سفارت کے، ان بلاووں کا انتظار کرنے والوں کو ہمیشہ ''باادب'' اور ''باوضو'' رہنا پڑتا ہے، چاہے زندگی بھر بلاوا نہ آئے۔ منٹو کو عسکری کی دوستی نے ''معزز'' بنا دیا تھا لیکن منٹو معزز بنا رہنے کے لیے تھوڑے ہی پیدا ہوا تھا۔ ''ٹھنڈا گوشت'' پر مقدمے کے ساتھ صورتِ حال الگ ہوگئی۔ اب کم از کم کچھ عرصے کے لیے ''نوری نہ ناری'' کے خطرناک منصوبے کا التوا ضروری تھا! ''کفارہ'' کو وہ اپنی بہترین تخلیق سمجھتی تھیں لیکن اس کے مفہوم و معنی کے بارے میں ان کو نظرِ ثانی (second thoughts) پر مجبور ہونا پڑا۔ کیوں کہ کفارے کا عیسوی تصور غیر اسلامی تھا!! ''آگ کا دریا'' کے بارے میں ان کی رائے اچھی تھی لیکن کسی محفل میں وہ اس رائے کا اظہار نہیں کرسکتی تھیں (کم از کم ۶۱ء میں)۔ ہر آدمی کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں جنھیں کوئی دوسرا سمجھ نہیں پاتا۔

خاصے سنگین الزامات ہیں اور یہ بھی نہیں کہ ''ترقی پسندوں'' کی طرف سے آئے ہوں جو پاکستان بننے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کا اشارہ پاکر دن رات یہی رٹ لگائے رکھتے تھے کہ یہاں آزادیِ اظہار کا قحط ہے۔ آصف فرخی کو طلسم کشائی اور سرکاری ٹی وی کی منہ دکھائی کے دلچسپ مشاغل سے کچھ وقت نکال کر ان الزامات سے ممتاز شیریں کے دفاع کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔ آخر کچی عمر سے موصوفہ کے در دولت

سے وابستہ رہے ہیں، کچھ تو حق برخورداری ادا کریں۔

خواہ آپ کو ممتاز شیریں سے اور ان کی ''تخلیقات و تنقیدات'' سے کوئی دلچسپی ہو یا نہ ہو، یہ لطیفہ آپ کو ضرور محظوظ کرے گا کہ کوئی شخص ''ادب، ادیب اور ذہنی آزادی'' کے موضوع پر کسی کے جبر کے تحت مضمون لکھے۔ تاہم محمود ایاز کے اداریے کے اس اقتباس سے اس گھٹی ہوئی فضا کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے جس نے رفتہ رفتہ منٹو کی جان لے لی۔

اردو کی مایۂ ناز ادیب اور نقاد ہونے کے علاوہ ممتاز شیریں کی ایک حیثیت ''نیا دور'' کی مدیرہ کی بھی تھی۔ ان کی ادارتی ترجیحات اور محرکات کم و بیش وہی ہیں جن کا اندازہ آپ کو محمود ایاز کے اداریے سے ہوگیا ہوگا۔ اس سلسلے میں ایک نکتے کی طرف منٹو نے اپنے مجموعے ''ٹھنڈا گوشت'' کے ابتدائیے ''زحمتِ مہر درخشاں'' میں اپنے بے مثال انداز میں اشارہ کیا ہے:

> اس دوران میں کراچی سے محترمہ ممتاز شیریں کے متعدد خط آچکے تھے کہ میں ان کے ''نیا دور'' کے لیے کوئی افسانہ بھیجوں۔ میں نے اٹھا کر ''ٹھنڈا گوشت'' ان کو روانہ کردیا۔ کافی دیر بعد جواب آیا کہ ہم دیر تک سوچتے رہے کہ اسے شائع کیا جائے یا نہیں۔ افسانہ بہت اچھا ہے، مجھے بہت پسند ہے لیکن ڈر ہے کہ حکومت کے احتساب کے شکار نہ ہوجائیں۔ ''ٹھنڈا گوشت'' یہاں سے بھی ٹھنڈا ہوکر واپس میرے پاس پہنچ گیا۔

حکومت کے احتساب کا یہ خوف تنہا ممتاز شیریں تک محدود نہیں۔ عافیت کوشی کی یہ روایت شاہد احمد دہلوی (مدیر ''ساقی'') سے ان تک پہنچی ہے۔ شاہد احمد کی نازک مزاجی اور ٹکا سا جواب دے ڈالنے کی عادت اردو ادب کی ضمنیات کا حصہ بن چکی ہے (اس صنم تراشی میں خود انھوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے)۔ شاہد احمد کی شاہکار کتاب ''گنجینۂ گوہر'' میں شامل منٹو کے خاکے کے یہ دو اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

> میں منٹو ہوں، سعادت حسن۔ آپ نے ''ہمایوں'' کا روسی ادب نمبر دیکھا ہوگا۔ اب میں ''ساقی'' کا فرانسیسی ادب نمبر نکالنا چاہتا ہوں۔
>
> پہلی ہی ملاقات میں اُس کی یہ ضرورت سے بڑھی ہوئی بے تکلفی طبیعت کو کچھ ناگوار گزری۔ میں نے اُس کا پانی اُتارنے کے لیے پوچھا، ''آپ کو فرانسیسی آتی ہے؟''
>
> بولا ''نہیں!''
>
> میں نے کہا، ''تو پھر آپ کیا کرسکیں گے؟''
>
> منٹو نے کہا، ''انگریزی سے ترجمہ کرکے میں آپ کا یہ خاص نمبر ایڈٹ

کروں گا۔"

میں نے کہا، "اپنا پرچہ تو میں خود ہی ایڈٹ کرتا ہوں۔ پھر "ساقی" کے چار خاص نمبر مقرر ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی نمبر فی الحال شائع نہیں ہوسکتا۔"

منٹو نے دال گلتی نہ دیکھی تو فوراً اس موضوع ہی کو ٹال گیا۔

دلی آنے کے بعد منٹو کی افسانہ نگاری کا دور جدید شروع ہوا۔ انھوں نے طبع زاد افسانے ایک اچھوتے انداز میں لکھنے شروع کیے۔ "ساقی" کے لیے ہر مہینے ایک افسانہ بغیر مانگے مل جاتا۔ "دھواں" اسی ریلے میں لکھا گیا اور اس کی اشاعت پر دلی کے پریس ایڈوائزر نے مجھے اپنے دفتر بلوایا۔ وہ پڑھا لکھا اور بھلا آدمی تھا۔ انگریزی ادبیات میں میرا ہم جماعت بھی رہ چکا تھا۔ بولا، "بھائی! ذرا احتیاط رکھو۔ زمانہ برا ہے۔" بات آئی گئی ہوگئی۔ میں نے منٹو سے اس کا ذکر کیا۔ حسب عادت بہت بگڑا مگر "ساقی" کے باب میں کچھ احتیاط برتنے لگا۔

آپ نے دیکھا، "اپنا پرچہ تو میں خود ہی ایڈٹ کرتا ہوں" کی ہیکڑی اور اپنے مخاطب کا "پانی اُتارنے" کی للک پریس ایڈوائزروں کے سامنے کس طرح پانی بن کر بہہ جاتی ہے اور بات کیسے آئی گئی ہوجاتی ہے۔ منٹو کو یہ بات بھانپنے میں زیادہ دیر نہیں لگی ہوگی کہ شاہد احمد اپنا پرچہ خود ہی ایڈٹ کرتے ہیں اور پریس ایڈوائزروں کے سوا کسی کی مجال نہیں کہ ان کے ادارتی فیصلوں میں دخل دے سکے۔

پریس ایڈوائزروں اور ان کی ہدایات کو مشعلِ راہ بنانے والوں کے ہاتھوں منٹو کو آگے چل کر اور بہت کچھ بھگتنا تھا، اور انھیں خوب اندازہ تھا کہ آزادیِ اظہار کی اس لڑائی میں کون پریس ایڈوائزروں کے ساتھ ہے اور کون منٹو کے۔ افسوس، شاہد احمد نے دلّی کے اس بھلے مانس پریس ایڈوائزر کا نام نہیں لیا ورنہ وہ بھی اردو ادب کی تاریخ میں اسی طرح محفوظ ہوجاتا جیسے لاہور کے پریس ایڈوائزر چودھری محمد حسین کا نام منٹو کی کتاب "لذتِ سنگ" کے دو ایڈیشنوں کے انتسابوں کے باعث امر ہوگیا۔ چودھری صاحب پھر بھی اس لحاظ سے کم معتبر تھے کہ انھیں پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت منٹو پر مقدمے چلانے کی سفارش کرنے کے ساتھ ساتھ خود کو منٹو کا مربّی مشہور کرنے کا شوق نہ تھا۔ منٹو کا پالا تو کہیں زیادہ شوقین لوگوں سے پڑا تھا جن کا نقشِ قدم جناب شیخ کی طرح یوں بھی ہوتا ہے اور ووں بھی، مثلاً عسکری، جو منٹو کے سرپرست بھی ہیں اور ساتھ ساتھ پبلک سیفٹی ایکٹ کی حمایت بھی اس شد و مد سے کرتے ہیں کہ "جنگ" اور "نوائے وقت" کے درباری کالم نگار تک شرما جائیں۔ اور پھر تربیت یافتہ ذہن رکھنے والوں کے لکھے ہوئے مضامین اپنے نام سے شائع کرانے والی ممتاز شیریں اور اپنا رسالہ خود ایڈٹ کرنے والے شاہد احمد

ہیں جو منٹو کے غیر محتاط افسانوں کو شائع کرنے سے تا عمر محترز رہے کہ زمانہ برا ہے، لیکن اس سلسلے میں بائیکاٹ کا اعلان کرنے کی حماقت سے گریز کیا تاکہ بعد میں، سازگار زمانہ آنے پر، منٹو کی شخصیت اور فن پر مضامین لکھ کر شہرت بھی حاصل کی جا سکے۔

چودھری محمد حسین کے ان جانشینوں نے جہاں کہیں موقع پایا، منٹو کو اپنے کسی نہ کسی مقصد کے لیے استعمال کرنے کی دلاورانہ کوشش کی۔ یہ سلسلہ عسکری کے ہاتھوں منٹو کی تحریروں کی غلط تعبیر سے شروع ہوا اور اس کی چند برس پہلے کی ایک مثال وہ ہے جب منٹو کو ''معزز بنانے'' یا ان کی تحریروں کا دف مارنے کی کوشش کے سلسلے میں سنسر شپ کی قینچی کی مدد سے ''نیا قانون'' کا ایک نیا روپ تیار کیا گیا تاکہ اسے قوم کے نونہالوں کی تعلیم کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ ''نیا قانون'' کے اس اصلاح یافتہ روپ سے لطف اور عبرت حاصل کرنے کا موقع آپ کو اگلے باب میں ملے گا، فی الحال کہانی کو آغاز سے شروع کرتے ہوئے یہ ملاحظہ کیجیے کہ عسکری کے ہاتھوں منٹو کا کیا حشر ہوا۔

(۳)

''فسادات اور ہمارا ادب'' میں عسکری نے اپنی بنائی ہوئی تعریف کے لحاظ سے منٹو کو پاکستانی ادب کی ایک روشن مثال قرار دیا تھا۔ منٹو نے ان کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی کیوں کہ وہ یہ معقول رائے رکھتے تھے کہ اردو ادب کا بھلا اس میں ہے کہ نقاد جو کچھ کہیں اس کا الٹ کیا جائے۔ بزعم خود منٹو کا مربی بن جانے کے بعد عسکری نے ان سے وقتاً فوقتاً جو توقعات وابستہ کیں انھیں آپ عسکری کی سادہ لوحی بھی سمجھ سکتے ہیں اور منٹو کی حسِ مزاح کا کرشمہ بھی۔ دیکھیے منٹو نے عسکری کو اپنے بارے میں کیسی خوش اندیشیوں میں مبتلا کیے رکھا:

> ...پچھلے سال منٹو صاحب نے متعدد کوششیں کیں کہ ترقی پسندی کے مروجہ تصور کو بدلا جائے اور ادیب اسلام کو اپنے تصورِ حیات کی اساس بنائیں اور اسلامی اصولوں کی بنیاد پر سماجی اور معاشی انصاف کا مطالبہ کریں۔ منٹو صاحب ادیبوں سے گھنٹوں اس بات پر جھگڑتے رہے ہیں کہ ہمارے لیے خالی انسانیت پرستی کافی نہیں ہے، ہمیں انسان کا وہ تصور قبول کرنا ہوگا جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ منٹو صاحب نعروں سے ایسا ڈرتے ہیں کہ اب ان کے ذہن میں خالی نعروں سے مطمئن ہو جانے کی صلاحیت بہت کم رہ گئی ہے۔ چناں چہ میں اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ان کی گرم جوشی لفظوں تک محدود نہیں تھی۔ اس زمانے میں خلافتِ راشدہ کا تصور اس طرح ان کے دماغ پر مسلط تھا کہ وہ چاہتے تھے بس آج ہی پاکستان خلافتِ راشدہ کا نمونہ بن جائے اور سارے

صاحب اقتدار لوگ حضرت عمرؓ کی تقلید کرنے لگیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ پاکستان محض رہنماؤں کی دانش مندی کے طفیل نہیں ملا ہے بلکہ پوری قوم کی متحدہ قوت اور عوام کے جذبۂ ایثار کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ لہٰذا انھوں نے چند ایسے افسانے بھی سوچے تھے جن میں یہ دکھایا گیا تھا کہ ہمارے عوام میں اپنی مدد آپ کرنے کی صلاحیت اور تخلیقی اہلیت کتنی زبردست ہے۔ مگر اتفاق سے انھی دنوں منٹو صاحب اپنی فلم میں مصروف ہوگئے اور وہ افسانے لکھے نہیں۔ (''جھلکیاں'' جون ۱۹۴۹ء)

...ہمارے نظام زندگی میں شہادت کے تصور کو بڑی اہمیت حاصل ہے بلکہ منٹو صاحب تو کہا کرتے ہیں کہ میں شہادت کے تصور ہی کی وجہ سے اسلام پر ایمان لایا ہوں۔ (''جھلکیاں'' دسمبر ۱۹۴۹ء)

...آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ منٹو صاحب ایک ایسا ادبی تجربہ کرنا چاہتے ہیں جس کی توقع عام پڑھنے والوں کو اُن سے ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ ایک ایسا افسانہ لکھنا چاہتے ہیں جو شروع سے آخر تک لفظوں کا کھیل ہو۔ ان کا خیال ہے کہ ضلع جگت، رعایت لفظی وغیرہ قسم کی چیزیں جو پہلے ہمارے ادب میں رائج تھیں، اب انھیں پھر سے رواج دینا چاہیے اور ان سے نئے نئے کام لینے چاہئیں (یہاں یہ تصریح ضروری ہے کہ منٹو صاحب کے ذہن میں یہ خیال جوئس کی کتاب پڑھ کر پیدا نہیں ہوا)۔ چناں چہ منٹو صاحب اکثر افسوس کرتے ہیں کہ لغت سے میری واقفیت اتنی محدود کیوں ہے، ورنہ میں ایک ایک لفظ کو الٹ پلٹ کر کئی کئی معنوں میں استعمال کیا کرتا۔ منٹو صاحب کے اس رجحان کا اظہار ابھی تک صرف اِدھر اُدھر فقروں میں ہوا ہے، پورے پیمانے پر نہیں ہوا...

ان باتوں کے علاوہ منٹو صاحب ایک تجربہ یہ کرنا چاہتے تھے کہ چند افسانے ایسے لکھیں جن کا صریح مقصد تعمیری ہو اور جن میں قوم کی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا گیا ہو بلکہ ایک دفعہ تو اُن کا ارادہ ہوا تھا کہ اقبال کے مشورے پر عمل کریں اور صحابۂ کرامؓ کی زندگی سے واقعات لے کر ان کی مدد سے افسانے لکھیں، لیکن سال بھر سے انھوں نے کچھ لکھا ہی نہیں ہے۔ (''جھلکیاں''، جنوری ۱۹۵۰ء)

کہیے، اس منٹو کی شکل آپ کی پہچان میں آتی ہے؟ نہیں آتی تو آپ ''یاروں کو تجھ سے منٹو کیا خوش گمانیاں ہیں!'' کہہ کر قہقہہ لگا سکتے ہیں یا اگر عسکریت بہت زور مارے تو ''تیرے منھ پر جھوٹ بولوں تو کیا دے گا'' قسم کا فقرہ چست کر سکتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ عسکری کی جوانی چائے کی پیالی میں ڈبکیاں

کھانے میں بیت گئی، کبھی مے خانے کے قریب سے گزر ہوا ہوتا تو اندازہ بھی ہوتا کہ رندان خانہ خراب واعظ کو کیسا بناتے ہیں۔

بہر حال، جون ۱۹۴۹ء کی ''جھلکیاں'' میں عسکری مزید لکھتے ہیں:

> ابھی تک منٹو صاحب ایسا ادب تو پیش نہیں کر سکے جو کھلم کھلا پاکستانی ہو۔ غالباً ان جیسے فن کار کے لیے مناسب بھی نہیں ہے کہ وہ نعروں کو پھیلا پھیلا کر افسانے بنائیں۔ میری مراد اس سے یہ ہے کہ ہمارے بیش تر ادیب نعروں کے بغیر چونکتے ہی نہیں، اس لیے ادب میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہونے سے پہلے شاید تھوڑی سی نعرہ بازی لازمی ہے۔
>
> بہرحال منٹو صاحب نے ابھی تک افسانوں میں نعرے لگانے سے گریز کیا ہے۔

عسکری کے اس اعتراف کو منٹو کے لیے خراج تحسین سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے عسکری کے تجویز کردہ نسخے کے مطابق لکھنے کو فراڈ جانا اور اس میں شریک ہونے سے گریز کیا۔ عسکری کا مرغ دست آموز بننے کے بجائے انھوں نے اپنے تخلیقی ضمیر کی پیروی کی اور ''موتری''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''یزید''، ''دو قومیں''، ''شہید ساز''، ''ٹیٹوال کا کتا''، ''آخری سلیوٹ''، ''۱۹۱۹ کی ایک بات''، ''موذیل''، ''بابو گوپی ناتھ'' اور ''نطفہ'' جیسے افسانے لکھے۔ یوں تو عسکری اور ممتاز شیریں پر منٹو کے وقیع ترین نقاد ہونے تک کا بہتان لگا دیا جاتا ہے لیکن ان میں سے کسی کے ہاں منٹو کے ان افسانوں کے سیاسی معنی دریافت کرنے کی ادنیٰ سی کوشش کا بھی سراغ نہیں ملتا۔

عسکری کا کہنا ہے کہ جنوری ۱۹۴۹ء سے دسمبر ۱۹۴۹ء تک کے عرصے میں منٹو نے کچھ لکھا ہی نہیں تھا۔ اس بارے میں میرے پاس کافی معلومات نہیں ہیں۔ البتہ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو اپنے مجموعے ''یزید'' کے افتتاحیے ''جیب کفن'' میں منٹو نے لکھا تھا:

> بٹوارے کے بعد اب تک میں یہ کتابیں ترتیب وار آپ کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں۔ ان سے آپ بہ طریق احسن میری دماغی کیفیات کا جائزہ لے سکتے ہیں: (۱) تلخ، ترش اور شیریں (۲) لذت سنگ (۳) سیاہ حاشیے (۴) خالی بوتلیں خالی ڈبے (۵) ٹھنڈا گوشت (۶) نمرود کی خدائی (۷) بادشاہت کا خاتمہ۔

اگر ''بٹوارے'' کے بعد منٹو کو ان باتوں کا شوق ہوا ہوتا جو عسکری نے بیان کی ہیں تو یہ گمان کرنا غیر معقول بات نہیں کہ ان آٹھ کتابوں میں سے کسی میں کہیں تو اس شوق کی جھلک دکھائی دے جاتی۔ منٹو کے بارے میں عسکری کی جو تحریریں ملتی ہیں ان میں افسانوں کے متن سے گریز کی

دانستہ کوشش دکھائی دیتی ہے۔ عسکری کو معلوم تھا کہ ''یزید''، ''ٹیٹوال کا کتا''، ''موذیل''، ''آخری سلیوٹ'' اور دوسرے افسانوں سے جو معنی برآمد ہوتے ہیں وہ ان کی برانڈ کا ادب پیدا کرنے میں کسی طرح معاون ثابت نہیں ہوں گے۔ مگر خود انھیں کے الفاظ میں، ''رہا وہ ادب جو پیدا ہو چکا ہے تو اس سے نبٹنے کے لیے پیشہ ور نقاد موجود ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے ادب کی ایسی تشریح کرتے ہیں کہ شکل پہچانے میں نہیں آتی۔''

(۴)

منٹو کی تحریروں کی ایسی تشریح عسکری کے ہاں ۱۹۴۷ء کے بعد جا بجا ملتی ہے، لیکن ان کی سب سے بڑی فتح یہ تھی کہ انھیں منٹو کی کتاب ''سیاہ حاشیے'' کا دیباچہ بہ عنوان ''حاشیہ آرائی'' لکھنے کا موقع ملا۔ اس دیباچے کی طرف آنے سے پہلے منٹو کے مجموعے ''چغد'' کے دیباچے پر ایک نظر ڈال لینا شاید مفید ثابت ہو۔ منٹو نے اپنی اس تحریر میں ترقی پسندوں کی جانب سے انھیں غیر ترقی پسند قرار دیے جانے کے احمقانہ اقدام پر اپنی کوفت کا اظہار کیا۔ منٹو کو اپنے غیر ترقی پسند ٹھہرائے جانے پر بجا طور پر غصہ تھا۔ ''سیاہ حاشیے'' کو منٹو کے بہ قول ''نام نہاد'' ترقی پسندوں نے صرف اس وجہ سے پڑھے بغیر مسترد کر دیا کہ اس پر عسکری نے دیباچہ لکھا تھا، جب کہ ''ٹھنڈا گوشت'' اور ''کھول دو'' کو نہ صرف ترقی پسندوں کی تحسین حاصل ہوئی تھی بلکہ یہ افسانے خود انھیں نے شائع بھی کیے تھے۔ منٹو نے اپنا دیباچہ اس جملے پر ختم کیا ہے:

> آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ ''ترقی پسندی'' سے مجھے کوئی کد نہیں لیکن نام نہاد ترقی پسندوں کی الٹی سیدھی زقندیں بہت کھلتی ہیں۔

''سیاہ حاشیے'' اپنی ہیئت کے اعتبار سے منٹو کی تمام کتابوں سے مختلف کتاب ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے طنزیہ پاروں پر مشتمل ہے جن میں منٹو نے کرداروں کو اس طرح تفصیل سے بیان نہیں کیا جس طرح وہ اپنے افسانوں میں کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''گورمکھ سنگھ کی وصیت'' کے عنوان سے انھوں نے جو افسانہ لکھا، اسے اگر تفصیلات غائب کر کے ایک صفحے یا اس سے کم میں لکھا جاتا تو وہ آسانی سے ''سیاہ حاشیے'' کا ایک حصہ بن سکتا تھا۔ طنزیہ پاروں کا یہ مجموعہ اپنی ساخت کے اعتبار سے منٹو کے افسانوں سے الگ سہی لیکن نفسِ مضمون کے لحاظ سے ان سے دور نہیں ہے۔

میری رائے میں ''سیاہ حاشیے'' کی معنویت تک پہنچنے کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ اس کتاب کو الگ الگ تحریروں کے مجموعے کے طور پر نہیں بلکہ بہت سے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائے ہوئے ایک مونتاژ کی صورت میں دیکھا جائے۔ مجھے علم نہیں کہ منٹو کے کسی نقاد نے یہ طریقِ کار اختیار کر کے منٹو کے اس ہیئتی تجربے کی معنویت دریافت کرنے کی تفصیلی کوشش کی ہے یا نہیں۔

بہر کیف، آیئے اس مسئلے کو فی الحال یہیں چھوڑ کر عسکری کے دیباچے کا جائزہ لیں۔ دیباچے

کا پہلا فقرہ یہ ہے: ''پچھلے دس سال میں نئے ادب کی تحریک نے اردو افسانوی ادب میں گراں قدر اضافے کیے ہیں...'' اسے پڑھیے اور دو برس پہلے کے اُس فقرے کو یاد کیجیے جس میں عسکری نے نئے ادب کی ''پچھلے دس سال'' کی تمام پیداوار کو ــــ ''دوزخی'' اور ''ایک آدھ اور تحریر'' کے سوا (''جو اس وقت یاد نہیں آ رہی'' تھی) ــــ دریا بُرد کرنے کے لائق قرار دیا تھا اور اس گراں قدر رائے کا اظہار کیا تھا کہ ''میٹھا برس لگتا ہے تو اسکول کی لونڈیاں تک ایسا ادب پیدا کر لیتی ہیں۔'' ان دونوں گراں قدر رایوں کا درمیانی راستہ کہاں سے ہو کر گزرتا ہے، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد پہلے پیراگراف کے تمام جملے اور اگلے دو پیراگراف فسادات کے ادب کا موضوع نہ بن سکنے کے بارے میں عسکری کی انھیں تعمیمات کی ''حاشیہ آرائی'' پر مشتمل ہیں جن کا دل کش مظاہرہ ہم ''فسادات اور ہمارا ادب'' میں دیکھ چکے ہیں۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ اس بار بھی وہ کسی ادیب یا اس کے کسی گراں قدر یا بے قدر افسانے کے نام پر ٹھٹکے بغیر مندرجہ ذیل نتیجوں تک براہِ راست پہنچ جاتے ہیں:

(۱) ''اکثر و بیش تر'' افسانوں کی محرک تخلیق کی اندرونی لگن نہیں تھی بلکہ خارجی حالات اور واقعات تھے۔ چوں کہ نئے ادب کو دریا بُرد کرتے ہوئے عسکری نے منٹو کی کسی تحریر کو بچانے کی کوئی خاص بے تابی نہیں دکھائی تھی اس لیے ہم فرض کر سکتے ہیں کہ ''نیا قانون''، ''ہتک''، ''خوشیا''، ''دھواں''، ''بو'' اور ''کالی شلوار'' ــــ سب کے سب یا ''اکثر و بیش تر'' ــــ اسی الزام کے سزاوار ٹھہریں گے۔

(۲) ''ہمارے افسانہ نگاروں'' کی نشو و نما خارجی دنیا میں ہونے والی باتوں پر منحصر ہے (اس بار عسکری نے ''اکثر و بیش تر'' کا تکلف بھی نہیں کیا)۔ عسکری کے خیال میں جب یہ نشو و نما رک جاتی ہے تو ''ہمارے افسانہ نگار'' اپنے آپ کو یہ سوچ کر تسلی دے لیتے ہیں کہ خارجی دنیا میں کوئی ایسی بات ہو ہی نہیں رہی جس کے بارے میں لکھا جائے۔ خارجی دنیا میں ہونے والی وہ کون سی باتیں ہیں جن کے نہ ہونے سے ہمارے افسانہ نگاروں کی نشو و نما رک جاتی ہے؟ عسکری کے اگلے فقرے میں اس کا جواب دیا گیا ہے:

> چھ سات سال ہوئے میں نے اردو کے ایک افسانہ نگار کو جنھوں نے مفلسی، غلامی اور کشمیر کے متعلق افسانے لکھ لکھ کر خاصی مقبولیت حاصل کر لی تھی، یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ اگر جاپانی ہندوستان پر حملہ کر دیں اور ملک میں کچھ گڑبڑ ہو تو ادب پہ بہار آئے۔

عسکری نے نام نہیں لیا لیکن اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے یہ بات کرشن چندر سے منسوب کی ہوگی جن کو وہ اپنے ۱۹۴۱ء کے (یعنی آٹھ نو سال پہلے کے) مضمون ''کرشن چندر، اردو ادب میں ایک نئی آواز'' میں یہ کہہ کر داد دے چکے تھے کہ ''اس نے کسی مخصوص تحریک یا نقطۂ نظر کو اپنے اوپر غالب نہیں ہونے دیا،

نہ تو پرولتاریت کو، نہ جنس کو، نہ رومانیت کو۔ محض ترقی پسندی کو بھی نہیں۔''

خیر، کرشن چندر کو جہنم رسید ہونے دیجیے، یہ دیکھیے کہ وہ کون سے خارجی واقعات ہیں جن کے ختم ہوجانے سے ہمارے افسانہ نگاروں کی نشو و نما رک گئی۔ ''مفلسی، غلامی اور کشمیر''۔ پاکستان اور ہندوستان کو لوگ بلاوجہ اب تک غریب ملکوں میں شمار کرتے ہیں، عسکری کی ''حاشیہ آرائی'' تو یہ بتاتی ہے کہ مفلسی ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی ختم ہوچکی تھی۔ جاپانیوں کے حملے کا خطرہ امریکا اور اس کے اتحادیوں کی مہربانی سے ۱۹۴۶ء میں ٹل چکا تھا، اور ہندوستان اس وقت تک غالباً انگریزوں کا غلام تھا۔ غلامی ۱۹۴۷ء میں عسکری کے خیال سے ضرور ختم ہوگئی، مگر منٹو اور بعض دوسرے ترقی پسند افسانہ نگار اور شاعر ہندوستان اور پاکستان کو ۱۹۴۷ء کے بعد بھی غلام کہتے رہے اس لیے یہ موضوع ان کے ہاتھ سے تو نہیں گیا۔ ۳۱ردسمبر ۱۹۴۷ء کو شروع ہونے والی پہلی پاک و ہند جنگ کے نتیجے میں کشمیر دو حصوں میں ضرور تقسیم ہوگیا لیکن افسانہ نگار کشمیر کی تصویر کے جن پہلوؤں پر افسانے لکھ لکھ کر مقبولیت حاصل کرتے تھے وہ تو غالباً بدستور ان کی دسترس میں رہے۔ اس تصویر کے جو نئے پہلو سامنے آئے ان پر اوروں کو تو چھوڑیے، خود منٹو نے ''ٹیٹوال کا کتا'' اور ''جاؤ حنیف جاؤ'' نامی افسانے لکھے۔

(۳) بہرحال، اس قیمتی نتیجے تک پہنچ کر کہ ''مفلسی، غلامی اور کشمیر'' کے موضوعات ختم ہوگئے اور افسانہ نگار اپنی نشو و نما کے دوبارہ جاری ہونے کے لیے اطمینان سے بیٹھ کر خارجی واقعات کا انتظار کرنے لگے، عسکری اطلاع دیتے ہیں کہ قحط پڑجانے سے افسانہ نگاروں کی نشو و نما پھر چل پڑی اور انھوں نے قحط پر افسانے لکھ لکھ کر شہرت بٹورنی شروع کردی۔ عسکری نے یہ بات صاف صاف تو نہیں کہی لیکن غالباً فسادات کی طرح قحط بھی ادب کا موضوع نہیں بن سکتا ہوگا۔ یہاں میں آپ کو ایک بار پھر کرشن چندر کے بارے میں عسکری کے مضمون کی یاد دلاؤں گا جس میں انھوں نے کرشن چندر کی حقیقت نگاری کی مدح کی ہے:

> کرشن چندر کے نزدیک حقیقت نگاری کے صرف ایک معنی ہیں، زندگی کی حقیقت کو جیسا کچھ اس نے سمجھا ہے اس کو بیان کردینا۔ یہاں بھی وہ اردو افسانوں کی عام روش سے بالکل الگ ہے... تقریباً ہمیشہ کرشن چندر کا موضوع سماج ہوتا ہے مگر اس کا مقصد اعداد و شمار جمع کرنا نہیں ہے... میں نے بار بار کہا ہے کہ کرشن چندر کے یہاں آپ کو وہ چیزیں نہیں مل سکتیں جو آپ دوسروں میں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ نہ اس کے یہاں پلاٹ کی خوبیاں ہیں، نہ کردار نگاری کی، نہ نفسیاتی تجزیے کی اور نہ حسین لفاظی ہے۔ اس کے یہاں ایک چیز ہے جو ان سب سے بلند ہے، زندگی۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی ایسی وسیع اور بسیط اور مبہم چیز ہے جو کسی کے ہاتھ نہیں آتی۔ آرٹسٹ کی معراج، جیسا کہ

ہنری جیمس نے کہاں ہے، بس یہ ہے کہ...

عسکری کی کچی عمر کی اس تحریر سے مزید اقتباسات پیش کر کے میں ان کے عقیدت مندوں کو خفیف اور آپ کو بیزار نہیں کرنا چاہتا۔ دیکھنے کی بات، جیسا کہ فلاں شخص نے کہا ہے، بس یہ ہے کہ میٹھا برس لگنے سے پہلے بھی عسکری کا طنطنہ وہی ہے گویا کل ہی رات عرفان حاصل ہوا ہو۔

(۴) چلیے، قحط بھی ختم ہوا۔ اب فسادات کی باری ہے جس کے بارے میں عسکری فرانسیسیوں کی کمک منگا کر ثابت کر ہی چکے ہیں کہ وہ ادب کا موضوع نہیں بن سکتے۔ شکر کا مقام ہے کہ اپنے اس بیان پر وہ اب تک قائم ہیں، یعنی کم سے کم دیباچے کے تیسرے پیراگراف تک۔

> اور جب ۴۷ء کے فسادات ہوئے تو گویا اللہ میاں نے چھپّر پھاڑ کے دیا۔ جی چاہے تو المیہ افسانہ لکھیے ورنہ طنزیہ مضمون ہو سکتا ہے۔ انسان کی درندگی پر دانت پیسیے، سامراج کی چالاکیوں کا پردہ چاک کیجیے۔ ان باتوں سے جی بھر جائے تو کچھ عورتوں کی بے حرمتی کے ذکر سے گرمی پیدا کیجیے۔ موقعے موقعے سے یہ دکھاتے چلیے کہ اس بہیمیت کے ساتھ ساتھ رحم دلی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ پھر بھولا سا منھ بنا کر تعجب کیجیے کہ ہندو مسلمانوں کی عقل کو کیا ہو گیا۔ کل تک تو بھائی بھائی تھے، آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں ہو گئے؟

یہاں بھی عسکری نے کوئی نام نہیں لیا لیکن فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانوں کے نفسِ مضمون کے بارے میں کچھ اشارے ضرور کیے ہیں۔ آیئے ان اشاروں کی مدد سے کچھ افسانوں کو پہچاننے کی کوشش کریں۔ بیدی اور منٹو کا ''جی چاہا'' تو انھوں نے ''لاجونتی'' اور ''کھول دو'' لکھ دیے جو اگر المیہ افسانے نہیں ہیں تو پھر میں نہیں جانتا کہ المیہ افسانے کیا ہوتے ہیں۔ طنزیہ مضامین کا ذکر تو آگے آئے گا لیکن ''موتری'' کے عنوان سے ایک طنزیہ افسانہ لکھنے کا موقع منٹو کو خوب ملا۔ انسانوں کی درندگی پر دانت پیستے ہوئے بھی منٹو کو ''مُرلی کی دھن'' کے اُس اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے جو اوپر درج کیا گیا ہے۔ سامراج کی چالاکیاں بھی آپ ضرور دیکھنا چاہیں گے۔ دیکھیے:

> برطانوی سامراج کی حکمتِ عملی نے وہ شاطرانہ چال چلی کہ ٹھنڈے سے ٹھنڈے دماغوں کو بھی سوچنے کا موقع نہ ملا۔ ہندوستان کو اس چابک دست جراح نے پتھر کی سرد سلوں پر لٹا کر چیرا پھاڑا۔ ایک سنگین سکون و اطمینان کے ساتھ اس کے حصے بخرے کیے اور یہ جا وہ جا۔ اور وہ جن کے تدبّر، وہ جن کی دقیقہ رسی، وہ جن کی شاہین نگاہی کی سارے عالم میں دھوم تھی، آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

یہ بھی منٹو ہے، مضمون کا عنوان ہے ''محبوس عورتیں''۔ اگر آپ چاہیں تو موقعے موقعے سے یہ بھی دیکھیے

چلیے کہ اس بہیمیت کے ساتھ ساتھ رحم دلی کے نمونے بھی ملتے ہیں:

فسادات زوروں پر تھے۔ ایک دن میں اور اشوک بمبے ٹاکیز سے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں اس کے گھر دیر تک بیٹھے رہے۔ شام کو اس نے کہا، ''چلو میں تمھیں چھوڑ آؤں۔'' شورٹ کٹ کی خاطر وہ موٹر کو ایک خالص اسلامی محلے میں لے گیا۔ سامنے سے ایک برات آ رہی تھی۔ جب میں نے بینڈ کی آواز سنی تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک دم اشوک کا ہاتھ پکڑ کر میں چلایا، ''دادا منی یہ تم کدھر آ گئے؟'' اشوک میرا مطلب سمجھ گیا۔ مسکرا کر اس نے کہا، ''کوئی فکر نہ کرو۔''

میں کیوں کر فکر نہ کرتا؟ موٹر ایسے اسلامی محلے میں تھی جہاں کسی ہندو کا گزر ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اشوک کو کون نہیں پہچانتا تھا، کون نہیں جانتا تھا کہ وہ ہندو ہے؟ ایک بہت بڑا ہندو جس کا قتل معرکہ خیز ہوتا۔ مجھے عربی زبان میں کوئی دعا یاد نہیں تھی۔ قرآن کی کوئی موزوں و مناسب آیت بھی نہیں آتی تھی۔ دل ہی دل میں میں اپنے اوپر لعنتیں بھیج رہا تھا اور دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی زبان میں بے جوڑ سی دعا مانگ رہا تھا کہ اے خدا مجھے سرخ رو رکھیو، ایسا نہ ہو کوئی مسلمان اشوک کو مار دے اور میں ساری عمر اس کا خون اپنی گردن پر محسوس کرتا رہوں۔ یہ گردن قوم کی نہیں، میری اپنی گردن تھی مگر یہ ایسی ذلیل حرکت کے لیے دوسری قوم کے سامنے ندامت سے جھکنا نہیں چاہتی تھی۔

جب موٹر برات کے جلوس کے پاس پہنچی تو لوگوں نے چلانا شروع کر دیا، ''اشوک کمار... اشوک کمار''، میں بالکل یخ ہو گیا۔ اشوک اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے خاموش تھا۔ میں خوف و ہراس کی یخ بستگی سے نکل کر ہجوم سے یہ کہنے والا تھا کہ دیکھو، ہوش کرو۔ میں مسلمان ہوں۔ یہ مجھے میرے گھر چھوڑنے جا رہا ہے، کہ دو نوجوانوں نے آگے بڑھ کر بڑے آرام سے کہا، ''اشوک بھائی، آگے راستہ نہیں ملے گا۔ ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ۔''

عورتوں کی بے حرمتی کے ذکر سے گرمی پیدا کرنے کے الزام کا سامنا بھی منٹو نے چودھری محمد حسین کی عنایت سے ''ٹھنڈا گوشت'' کے سلسلے میں عدالتوں میں کیا۔ اشفاق احمد نے ''گڈریا'' میں ''بھولا سا منھ بنا کر تعجب کرنے'' کی کوشش کی کہ آخر یہ لوگ داؤجی کو کیوں مار ڈالنا چاہتے ہیں؟ ایسی ہی ایک کوشش کی مثال ہمیں ایک اور جگہ بھی ملتی ہے:

عرصہ ہوا جب تقسیم پر ہندو مسلمانوں میں خوں ریز جنگ جاری تھی اور طرفین

کے ہزاروں آدمی روزانہ مرتے تھے، شیام اور میں راول پنڈی سے بھاگے ہوئے ایک سکھ خاندان کے پاس بیٹھے تھے۔ اس کے افراد اپنے تازہ زخموں کی روداد سنا رہے تھے جو بہت ہی دردناک تھی۔ شیام متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ہلچل جو اس کے دل و دماغ میں مچ رہی تھی اس کو بھی میں بہ خوبی سمجھتا تھا۔ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو میں نے شیام سے کہا، ''میں مسلمان ہوں۔ کیا تمھارا جی نہیں چاہتا کہ مجھے قتل کردو؟''

شیام نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا، ''اس وقت نہیں... لیکن اُس وقت جب کہ میں مسلمانوں کے ڈھائے ہوئے مظالم کی داستان سن رہا تھا، میں تمھیں قتل کر سکتا تھا۔''

شیام کے منھ سے یہ سن کر میرے دل کو زبردست دھکا لگا۔ اس وقت شاید میں بھی اسے قتل کر سکتا، مگر بعد میں جب میں نے سوچا کہ اُس وقت اور اس وقت میں زمین آسمان کا فرق ہے کیا؟ تو ان تمام فسادات کا نفسیاتی پس منظر میری سمجھ میں آگیا جس میں روزانہ سیکڑوں بے گناہ ہندو اور مسلمان موت کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے۔

اس وقت نہیں... اُس وقت ہاں... کیوں؟ آپ سوچیے تو آپ کو اس کیوں کے پیچھے انسان کی فطرت میں اس سوال کا صحیح جواب مل جائے گا۔

(''مُرلی کی دُھن'' از سعادت حسن منٹو)

ظاہر ہے یہ تمام تحریریں ادب کی تعریف سے خارج ہیں۔

(۵) اس کے بعد عسکری کہتے ہیں:

بس خطرہ یہ رہ جاتا ہے کہ کہیں آپ کے اوپر جانب داری کا الزام نہ آجائے، تو وہ بھی ایسی مشکل بات نہیں۔ شروع میں اگر پانچ ہندو مارے گئے ہیں تو افسانہ ختم ہوتے ہوتے پانچ مسلمانوں کا حساب پورا ہو جانا چاہیے۔

یہ وہی بات ہے جو عسکری نے ''فسادات اور ہمارا ادب'' میں کہی ہے۔ ممکن ہے ان کے ذہن میں ''حقیقت نگار'' اور ''زندگی کے شیدائی'' کرشن چندر کا افسانہ ''پشاور ایکسپریس'' ہو۔ ایک بار میرا جی چاہا کہ عسکری کے اس خیال کی شماریاتی تصدیق کی جائے، لیکن لاشیں گننا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو عسکری کے لفظوں میں ''فی الحقیقت سنگ دل'' ہو۔ بہرکیف، ممتاز شیریں نے یہ گنتی کی اور نہایت مسرت سے اطلاع دی کہ اس افسانے میں ''ترازو بہت احتیاط سے پکڑی گئی ہے لیکن اس کے باوجود ایک پلڑا ذرا جھک گیا ہے اور غلط پلڑا''! انھوں نے کانگریس کی ''صحیح رپورٹ'' کا حوالہ دے کر

ثابت کیا کہ نواکھالی میں (مسلمانوں کے ہاتھوں) مارے جانے والوں کی تعداد ''دو سو سے کچھ کم'' تھی۔ لاشوں کی یہ ''سنگ دلانہ'' گنتی کسی تبصرے کی محتاج نہیں۔

ممتاز شیریں ''پشاور ایکسپریس'' کا احتیاط سے جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچتی ہیں:

یہ ترازو ایک تاریخی حقیقت کو جھٹلاتی ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں فسادات کی شدت اور مظلومین اور مقتولین کی تعداد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ادیب کو تو تچی تلی بات کہنی چاہیے اور چاہے کتنی ہی احتیاط برتی جائے دونوں پلڑے برابر رکھنا پھر بھی مشکل ہے۔ چناں چہ ''پشاور ایکسپریس'' میں دونوں طرف اعداد کی گنتی برابر ہونے اور جمع تفریق سے پورا پورا حساب چکا دیے جانے کے باوجود ایک پلڑا پھر بھی بھاری نظر آتا ہے کیوں کہ ریل گاڑی کے پاکستان کی سرحد پار کرنے کے بعد مظالم کا بیان پھیکا پڑ گیا ہے۔

ایک ناقص افسانے کے سلسلے میں کرشن چندر پر لگائے جانے والے الزامات سے ان کی مدافعت کرنے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ میرے پاس اعداد و شمار ہیں جن کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ ''فسادات کی شدت اور مظلومین اور مقتولین کی تعداد'' کس طرف زیادہ تھی اور کس طرف کم۔ تاہم، عسکری کے ایک اور پیرو انتظار حسین کے شاہ کار مضمون ''فسادات کے افسانوں کا پراپیگنڈائی پہلو'' (مشمولہ ''ظلمتِ نیم روز'' از ممتاز شیریں، مرتبہ آصف فرخی) سے پتا چلتا ہے کہ ان کے نزدیک کرشن چندر نے دراصل ''مسلمان عورت کے کردار پر حملہ'' کیا ہے اور ہندو دیو مالا اور خصوصاً مہابھارت کے کرداروں کی مدد سے یہ دکھانا چاہا ہے کہ ہندو مردوں اور عورتوں کے مقابلے میں مسلمان مردوں اور عورتوں کا کردار بہت پست ہے۔ ہندو دیو مالا اور مہابھارت کے سلسلے میں تو، کم سے کم اردو کے ادیبوں کی حد تک، انتظار حسین کو حرفِ آخر کہنے کا حق حاصل ہو چکا ہے، چناں چہ اس سلسلے میں بحث کرنا بے کار ہے۔ البتہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس قسم کا ایک اعتراض منٹو کے افسانے ''ٹھنڈا گوشت'' پر اسلامی حمیت سے انتظار حسین کی طرح سرشار چودھری محمد حسین نے کیا تھا، ''اس کہانی کی تعلیم یہ ہے کہ ہم مسلمان اتنے بے غیرت ہیں کہ سکھوں نے ہماری مردہ لڑکی تک نہیں چھوڑی...''

انتظار حسین کہتے ہیں، ''میں تو کرشن چندر کے ہر نئے افسانے کو راشٹریہ سیوک سنگھ کا ادبی بلیٹن سمجھ کر پڑھتا ہوں۔''

اس قابلِ قدر جذبے پر منٹو نے یوں تبصرہ کیا ہے:

رات پھر اوٹ پٹانگ خواب دیکھتا رہا۔ شیام سے کئی بار لڑائی ہوئی۔ صبح دودھ والا آیا تو میں کھوکھلے غصے میں اس سے کہہ رہا تھا، ''تم بالکل بدل گئے ہو... اُلّو کے پٹھے، ذلیل... تم ہندو ہو۔''

نیند کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ میرے منھ سے ایک بہت بڑی گالی نکل گئی ہے۔ لیکن جب میں نے خود کو اچھی طرح ٹٹولا تو میرا منھ نہیں تھا، سیاست کا بھونپو تھا جس سے یہ گالی نکلی تھی۔ ("مرلی کی دھن")

بہرحال، عسکری نے یہ خیال کہیں ظاہر نہیں کیا کہ اردو کے (ہندو؟) افسانہ نگار راشٹریہ سیوک سنگھ کی دی ہوئی لائن کی پیروی میں لکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تمام ترقی پسند افسانہ نگار غالباً کمیونسٹ پارٹی سے ہدایات حاصل کرتے ہیں اور:

> پہلا دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم سچ بولیں گے۔ مگر ساتھ ہی انھیں یہ فکر بھی ہوتی ہے کہ نہ ہندو ناراض ہوں نہ مسلمان۔ غیر جانب داری کے معنی یہ لیے جاتے ہیں کہ ایک جماعت کو دوسری جماعت سے زیادہ قصوروار نہ ٹھہرایا جائے۔ یہ ادب ظلم، سنگ دلی اور بہیمیت کو مطعون کرنا چاہتا ہے مگر ظلم کو ظلم کہنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

میرے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ فسادات کے موضوع پر افسانے لکھنے والوں کو غیر جانب داری کا مجرم ٹھہرایا جا رہا ہے یا جانب داری کا۔ بہرحال یہ نتیجہ شاید نکالا جا سکتا ہے کہ عسکری اور ہم نوا سمجھتے ہیں کہ فسادات میں مسلمان زیادہ مارے گئے ہیں اس لیے ان افسانہ نگاروں کو چاہیے کہ اس بات پر زور دے کر یعنی غیر جانب داری چھوڑ کر، ظلم کو ظلم کہنا سیکھیں۔

عسکری یا ان کے کسی شاگرد یا شاگردہ نے فسادات کے موضوع پر منٹو کی متعدد تحریروں اور خصوصاً "سیاہ حاشیے" میں بکھری ہوئی لاشوں کا شمار کر کے یہ تصفیہ کرنے کی زحمت نہیں کی کہ ان "مظلومین اور مقتولین" میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے یا ہندوؤں اور سکھوں کی، اور یہ کہ منٹو ظلم کو ظلم کہنے میں کامیاب رہے ہیں یا نہیں؟

(۶) اس کے بعد عسکری ایک تازہ کلیہ پیش کرتے ہیں:

> دراصل ادب کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کون ظلم کر رہا ہے، کون نہیں کر رہا، ظلم ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا؟ ادب تو دیکھتا ہے کہ ظلم کرتے ہوئے اور ظلم سہتے ہوئے انسانوں کا خارجی اور داخلی رویّہ کیا ہوتا ہے؟

عسکری کے موقف کے ان تغیرات (یا، منٹو کے الفاظ میں، "الٹی سیدھی زقندوں") سے کوئی مطلب اخذ کرنا دشوار ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ فسادات کے موضوع پر لکھنے والے کون سے ادیب ظلم کرتے اور سہتے ہوئے انسانوں کا خارجی اور داخلی رویّہ پیش کرتے ہیں اور کون سے اسی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں کہ "کون ظلم کر رہا ہے، کون نہیں کر رہا، ظلم ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا"، ظلم کی شدت اور مظلوموں کی تعداد اس طرف زیادہ ہے یا اُس طرف۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہے کہ ترازو کرشن چندر،

بیدی اور منٹو کے ہاتھ میں ہے یا ممتاز شیریں اور انتظار حسین کے۔

(۷) عسکری کا اگلا نکتہ یہ ہے کہ فسادات پر لکھنے والے افسانہ نگاروں نے ظلم سے نفرت دلانے کے لیے ''اکثر'' یہ طریقۂ کار استعمال کیا ہے کہ ظلم ہوتا ہوا دکھا کر پڑھنے والوں کے دلوں میں دہشت پیدا کی جائے۔ مگر غیر معمولی ظلم آج کل بے انتہا معمولی چیز بن گئے ہیں، اس لیے اس ذکر سے پڑھنے والوں کا تجسس تک بیدار نہیں ہوتا۔ ''فسادات والے افسانے ادب نہیں تھے تو نہ ہوتے مگر وہ تو اپنا سماجی مقصد بھی ٹھیک طرح ادا نہیں کر سکتے، کیوں کہ جو باتیں یہ افسانے پیش کرتے ہیں وہ تو اب خبریں بھی نہیں رہیں۔''

میرا اندازہ ہے کہ انسانوں کے دو گروہوں کے درمیان فسادات جیسی کسی بھی بھیانک صورتِ حال کو موضوع بنا کر لکھنے والوں کو یہ مسئلہ ضرور پیش آتا ہوگا کہ وہ اپنی آواز میں یہ اثر کیوں کر پیدا کریں کہ ان کی آواز ان واقعات کے الم ناک شور وشغب سے اوپر اُٹھ کر سنائی دے سکے۔ غالباً یہ ایک فنی مسئلہ ہے اور ہر لکھنے والا اپنی صلاحیت اور فنی ترجیحات کے مطابق اس مسئلے کا حل نکالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فسادات کے موضوع پر جو تحریریں سامنے آئیں وہ اپنی اثر انگیزی اور کامیابی کے اعتبار سے یکساں نہیں ہیں۔ ادب کو پُر اثر اور کامیاب بنانا اگر سماجی مقصد ہے تو ادبی مقصد بھی یقیناً ہے، اور میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ عسکری ان دونوں میں کس طرح امتیاز کرتے ہیں، کیوں کہ انھوں نے اپنے فیصلے کی کوئی دلیل دینا ضروری نہیں سمجھا۔

(۸) دس صفحوں کی ''حاشیہ آرائی'' میں سے چار صفحے، فسادات کے موضوع پر کسی ایک بھی تحریر یا اس کے لکھنے والے پر براہِ راست تبصرہ کیے بغیر، اس قسم کی بے بنیاد فتوے بازی میں صرف کر دینے کے بعد عسکری آخرکار اس کتاب کے حرماں نصیب مصنف یعنی منٹو کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

> منٹو نے بھی فسادات کے متعلق کچھ لکھا ہے، یعنی یہ لطیفے یا چھوٹے چھوٹے افسانے جمع کیے ہیں۔

ہمیں عسکری کے اس قیمتی فقرے کی قدر کرنی چاہیے کیوں کہ منٹو کی پوری کتاب یا اس کے اجزا کی ہیئت کے بارے میں یہ واحد فقرہ ہے جو دیباچے میں ملتا ہے۔ تاہم، مجھے اس بات میں شک ہے کہ اس فقرے میں پنہاں بصیرت منٹو کے اس فن کارانہ فیصلے کی وجوہ سمجھنے کے لیے کافی ہوگی جس کے باعث یہ کتاب ان کی گزشتہ کتابوں سے ہیئت کے اعتبار سے بہت نمایاں طور پر مختلف ہے۔ اس نکتے پر عسکری سے زیادہ ذہانت تو ممتاز مفتی کے اس تبصرے میں جھلکتی ہے جسے خود منٹو نے ''سیاہ حاشیے'' پر چار دوسرے تبصروں کے ساتھ اپنے رسالے ''اردو ادب'' میں شائع کیا (اس رسالے کی ادارت میں عسکری بھی منٹو کے ساتھ شامل تھے)۔ مفتی کے تبصرے میں ہمیں ''سیاہ حاشیے'' کی مخصوص ہیئت کے بارے میں

یہ غیر متوقع فقرے ملتے ہیں:

> کئی اصحاب کا خیال ہے کہ یہ جھلکیاں مختصر افسانے ہیں۔ مجھے اس خیال سے قطعاً اتفاق نہیں، کیوں کہ یہ تحریریں اکثر و بیش تر انفرادی طور پر کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ تمام جھلکیاں مل کر ایک مختصر افسانہ پیش کرتی ہیں۔ ایک تراشے ہوئے ہشت پہلو ہیرے کی طرح!

میں نہیں کہتا کہ یہ کوئی ایسی گہری بات تھی جس تک عسکری کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ''فن برائے فن'' والے مضمون میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ عسکری اگر چاہیں تو لکھنے والے کے متن کی طرف متوجہ ہو کر اس میں سے کیا کچھ برآمد کرنے کی قدرت رکھتے ہیں (اتفاق کی بات ہے کہ ان کا یہ مضمون بھی ''اردو ادب'' کے اسی شمارے میں شائع ہوا)۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس ''حاشیہ آرائی'' میں انھیں منٹو کی کتاب سے نہیں بلکہ اس کے موضوع سے سروکار ہے اور وہ اسی موضوع کے بارے میں اپنی تعمیمات پیش کرنے کی بے صبری میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اگلا فقرہ منٹو کی تحریر کے نہیں بلکہ اس کے موضوع کے بارے میں ہے۔ کہتے ہیں:

> دراصل میں نے بڑا غلط فقرہ استعمال کیا ہے۔ یہ فسادات کے متعلق نہیں ہیں بلکہ انسانوں کے بارے میں۔

اگر اس امتیاز سے عسکری کی مراد یہ ہے کہ منٹو کے ''سیاہ حاشیے'' اپنی اثرانگیزی میں دوسرے ادیبوں کی تحریروں سے زیادہ کامیاب ہیں تو اس بات کی کسی طرح وضاحت نہیں ہوتی۔ ورنہ یہ خصوصیت صرف منٹو کی تحریروں میں نہیں بلکہ ان واقعات کے پس منظر میں لکھے جانے والے تمام عمدہ افسانوں میں پائی جاتی ہے، مثلاً ''لاجونتی'' اور ''گڈریا'' بھی فسادات اور ان سے دوچار ہونے والے انسانوں دونوں کے بارے میں ہیں۔ فسادات سے متعلق تمام کامیاب تحریروں کے بارے میں یہی بات کہی جا سکتی ہے مگر شاید اس سے عسکری کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔

(۹) اس کے بعد عسکری اس بات پر توجہ دیتے ہیں کہ منٹو کی سابقہ تحریروں کے تناظر میں اس نئی کتاب کی معنویت کا تعین کیا جائے۔ لیکن ان کی مجبوری یہ ہے کہ دو برس پہلے تمام نئے ادب کو دریا برد کرتے ہوئے انھوں نے منٹو کی کسی تحریر کو سنبھال کر نہیں رکھا تھا، اس لیے وہ ان غرقاب تحریروں کے بارے میں فقط عمومی قیاس آرائی ہی کر سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> منٹو کے افسانوں میں آپ انسانوں کو مختلف شکلوں میں دیکھتے رہے ہیں، انسان بہ حیثیت طوائف کے، انسان بہ حیثیت تماش بین کے۔

اس بصیرت کی گہرائی کی داد نہیں دی جا سکتی۔ یہ بات بالکل ممتاز شیریں کے اس انکشاف کی ٹکر کی ہے کہ ''منٹو کے افسانوں میں عورت ترغیب مجسم ہے'' (آخر شاگرد بھی استاد کو ایک آدھ پینترا سکھا

ہی سکتا ہے)۔ عسکری طوالت کے خوف سے شاید انسانوں کی اور قسموں کی طرف اشارہ نہیں کر سکے جو منٹو کے افسانوں میں ملتی ہیں، مثلاً انسان بہ طور کوچوان، انسان بہ طور رانیں کھجلاتا ہوا نوخیز لونڈا جو بلوغت کے بھتنے کے اثر سے بدحواس ہو کر روزنوں سے جھانکتا پھرتا ہے، انسان بہ طور سات منزلہ عمارت کے نیچے کھڑے ہو کر گالی دینے والا نعرہ باز، وغیرہ۔ کچھ اور نہ بھی ہو تو عسکری کو اس ''مقبول ترین تصور'' کا پیش رو سمجھا جا سکتا ہے کہ منٹو کے افسانے طوائفوں اور تماش بینوں کے بارے میں ہوتے ہیں۔ اور اس بات سے تو مرحوم مظفر علی سید بھی اتفاق کر لیتے کہ یہ منٹو کے افسانوں کا ''صحیح ترین تصور'' نہیں ہے۔

خیر، تو منٹو کی سابقہ تحریروں کا اس بے مثال بصیرت کے ساتھ تصفیہ کر کے عسکری ''سیاہ حاشیے'' پر آتے ہیں:

> ان افسانوں میں آپ انسان ہی دیکھیں گے۔ فرق یہ ہے کہ یہاں انسان کو ظالم یا مظلوم کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

اگر ''سیاہ حاشیے'' فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے ادب یا غیر ادب کے عسکری کے ایجاد کردہ تصور پر پوری اترتی ہے تو انھیں کہنا چاہیے تھا کہ اس کتاب میں ہندوؤں اور سکھوں کو ظالم اور مسلمانوں کو مظلوم کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، تبھی وہ ''سیاہ حاشیے'' اور فسادات کے موضوع پر لکھے گئے دوسرے ادیبوں کے افسانوں میں امتیاز کی نشان دہی کر سکتے تھے۔ پتا نہیں انھوں نے یہ بات کیوں نہیں کہی۔

(۱۰) آگے چل کر فرماتے ہیں:

> اور فسادات کے مخصوص حالات میں سماجی مقصد کا تو منٹو نے جھگڑا ہی نہیں پالا۔ اگر تلقین سے آدمی سدھر جایا کرتے تو مسٹر گاندھی کی جان ہی کیوں جاتی۔ منٹو کو افسانوں کے اثرات کے بارے میں نہ زیادہ غلط فہمیاں ہیں نہ انھوں نے ایسی ذمہ داری اپنے سر لی ہے جو ادب پوری کر ہی نہیں سکتا۔

یہ اقتباس ''سیاہ حاشیے'' لکھتے وقت منٹو کے منشا سے بحث کرتا ہے۔ کسی تحریر کے متن کی معنویت کو سمجھنے کے لیے، شمس الرحمٰن فاروقی نے ''شعر شور انگیز'' میں ہمیں بڑی تفصیل سے بتایا ہے، مصنف کے منشا کا پتا لگانا ضروری نہیں ہے۔ عسکری کا نکتہ میرے خیال میں یہ ہے کہ منٹو کا منشا فسادات کے موضوع پر لکھنے والے کسی دوسرے ادیب کے منشا سے مختلف ہے۔ اگر ان کی بات کو، جو بے دلیل ہے، درست مان بھی لیا جائے تو ان کے نکالے ہوئے اس نتیجے سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ کوئی ادیب اگر اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس کے افسانوں کے اثر سے فسادات بند ہو جائیں گے (یا ''تلوار کا وار قلم پر روکا جا سکے گا'') تو اس کے افسانوں کی ادبی کامیابی کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔

یہاں گاندھی کے نام سے پہلے ''مسٹر'' کے لفظ کا استعمال قابلِ غور ہے۔ اگرچہ عسکری نے اس کے بعد، بہ قول چراغ حسن حسرت، بریکٹ میں یہ نہیں بتایا کہ یہ طنز ہے، لیکن غالباً یہ طنز ہی ہے۔

(اس طنز سے وہ ''مسٹر'' ابوالکلام آزاد کو بھی کئی بار خاک میں ملا چکے ہیں)۔ ایک اور طنز منٹو نے کیا ہے کہ ''سیاہ حاشیے'' کے پہلے ہی جز کو، جو گاندھی کی موت پر امرتسر، گوالیار اور بمبئی میں شیرینی کی تقسیم کی خبر پر مشتمل ہے، ''ساعتِ شیریں'' کا عنوان دیا ہے۔

(۱۱) منٹو کے منشا کے بارے میں فتویٰ جاری کرنے کے بعد عسکری ''سیاہ حاشیے'' کی تشریح کے اصل کام کی طرف آتے ہیں:

> سچ پوچھیے تو منٹو نے ظلم پر بھی کوئی خاص زور نہیں دیا۔ انھوں نے چند واقعات تو ضرور ہوتے دکھائے ہیں مگر یہ کہیں نہیں ظاہر ہونے دیا کہ یہ واقعات یا افعال بنفسہٖ اچھے ہیں یا برے۔ نہ انھوں نے ظالموں پر لعنت بھیجی ہے نہ مظلوموں پر آنسو بہائے ہیں۔ انھوں نے تو یہ تک فیصلہ نہیں کیا کہ ظالم لوگ برے ہیں یا مظلوم اچھے ہیں۔

ابھی پچھلے صفحے پر عسکری کہہ چکے ہیں کہ منٹو کے سوا دوسرے افسانہ نگار ظلم کو ظلم کہنے کی طاقت نہیں رکھتے اور یہ ان کی بہت بڑی خامی ہے۔ اب وہ کہہ رہے ہیں کہ ''سچ پوچھیے تو'' منٹو نے ظلم پر بھی ''کوئی خاص'' زور نہیں دیا، اور ان کے خیال میں یہ منٹو کی خوبی ہے۔ یہ پوچھنا تو حسبِ معمول بے سود ہوگا کہ ظلم پر ''کوئی خاص'' زور دینے یا نہ دینے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ منٹو نے اس کتاب میں کہیں ''ظالموں پر لعنت'' یا ''مظلوموں کے لیے دعائے مغفرت'' کی قسم کے نعرے نہیں لگائے، لیکن انھوں نے اپنی کتاب کا نام ''سیاہ حاشیے'' رکھا ہے جو اس بات کی جانب بہت واضح اشارہ ہے کہ وہ فسادات میں ہونے والے ''چند واقعات یا افعال'' کو بنفسہٖ اچھا سمجھتے ہیں یا برا۔

(۱۲) اس کے فوراً بعد عسکری کہتے ہیں:

> برِاعظم ہندوستان کے یہ فسادات ایسی پیچیدہ چیز ہیں، اور صدیوں کی تاریخ سے، صدیوں آگے کے مستقبل سے، اس بری طرح الجھے ہوئے ہیں کہ ان کے متعلق یوں آسانی سے اچھے بُرے کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔ کم سے کم ایک معقول ادیب کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ایسے ہوش اڑا دینے والے واقعات کے متعلق سیاسی لوگوں کی سطح پر اتر کر فیصلے کرنے لگے۔

اس اقتباس کو بہت غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ منٹو کے ادبی طریقِ کار پر تبصرہ کرتے کرتے انھوں نے اچانک فسادات کے ''اچھا یا بُرا'' ہونے کے فیصلے کی بابت اپنا ذاتی خیال پیش کر دیا ہے۔ عسکری کے اس خیال کی رُو سے فسادات ''اچھے'' بھی ہو سکتے ہیں اور ''برے'' بھی اور اس بات کا فیصلہ کرنا کہ فسادات کس قسم کے ہیں، کسی ''معقول'' ادیب کی سطح سے فروتر ہے۔ انسان کے تخیل کی کوئی پرواز فسادات کے ''اچھا'' ہونے کا امکان بھی تسلیم کر سکتی ہے، اس خیال کی غیر انسانی ''سنگ دلی'' سے

فی الحال قطع نظر کیجیے۔ اس وقت میں صرف اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں، حالاں کہ یہ اتنی سامنے کی بات ہے کہ عام حالات میں اس پر زور دینے کی ضرورت ہونی ہی نہیں چاہیے، کہ فسادات کو موضوع بنانے والے ہر ''معقول'' ادیب کی طرح منٹو کی کسی تحریر میں اس قسم کا کوئی ابہام نہیں ملتا کہ فسادات ''اچھے'' ہوتے ہیں یا ''بُرے''۔ اس کے برعکس منٹو نے تو فسادات کے واقعات کو ''صدیوں کی تاریخ'' میں الجھانے اور ''سیاسی لوگوں کی سطح پر اتر آنے'' والوں پر یوں تبصرہ کیا ہے:

> ہندو اور مسلمان دھڑا دھڑ مر رہے تھے۔ کیسے مر رہے تھے؟ کیوں مر رہے تھے؟ ان سوالوں کے مختلف جواب تھے، ہندوستانی جواب، پاکستانی جواب، انگریزی جواب۔ ہر سوال کا جواب موجود تھا، مگر اس جواب میں حقیقت تلاش کرنے کا سوال پیدا ہوتا تو اس کا کوئی جواب نہ ملتا۔ کوئی کہتا، اسے غدر کے کھنڈروں میں تلاش کرو۔ کوئی کہتا، نہیں یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ملے گا۔ کوئی اور پیچھے ہٹ کر اسے مغلیہ خاندان کی تاریخ میں ٹٹولنے کے لیے کہتا۔ سب پیچھے ہی پیچھے ہٹتے جاتے تھے اور قاتل اور سفاک برابر آگے بڑھتے جارہے تھے اور لہو اور لوہے کی ایسی تاریخ لکھ رہے تھے، جس کا جواب تاریخِ عالم میں کہیں بھی نہیں ملتا تھا۔

منٹو کا ذکر کرتے کرتے عسکری نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ فسادات ''صدیوں پرانی تاریخ میں الجھے ہوئے ہیں'' اور ''معقول'' ادیبوں کا یہ کام نہیں کہ وہ فسادات کو ''اچھا'' یا ''برا'' کہیں، اور اس کے فوراً بعد دوبارہ منٹو کا تذکرہ شروع کیا۔

(۱۳) کہتے ہیں:

> منٹو نے وہی کیا ہے جو ایک ایمان دار (سیاسی معنوں میں ایمان دار نہیں بلکہ ادیب کی حیثیت سے ایمان دار) اور حقیقی ادیب کو ان حالات میں اور ایسے واقعات کے اتنے تھوڑے عرصے بعد لکھتے ہوئے کرنا چاہیے۔

اس جملے میں صرف یہ بات قابلِ تبصرہ ہے کہ عسکری نے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادیب کی حیثیت سے ایمان دار ہونا اور سیاسی طور پر ایمان دار ہونا دو مختلف باتیں ہیں اور ان کے درمیان تضاد کا تعلق ہونا بھی خارج از امکان نہیں ہے۔ یہ تقریباً وہی منقسم شخصیت والا نظریہ ہے جو عسکری نے ''فسادات اور ہمارا ادب'' میں پیش کیا تھا۔ منٹو کا بہرحال اس عجیب الخلقت اور ریاکارانہ نظریے سے ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات اگر منٹو کی تحریروں سے اوپر دیے گئے اقتباسات سے پوری طرح واضح نہیں ہوسکی ہے تو آگے آنے والے اقتباسات سے ہوجائے گی۔

(۱۴) اس کے بعد عسکری کہتے ہیں:

انھوں نے نیک و بد کے سوال ہی کو خارج از بحث قرار دے دیا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر نہ سیاسی ہے نہ عمرانی نہ اخلاقی بلکہ ادبی اور تخلیقی۔

منٹو کے لیے فسادات میں حصہ لینے والوں کے ''نیک'' یا ''بد'' اور ''اچھے'' یا ''بُرے'' ہونے کے سوال واقعی خارج از بحث ہیں۔ فسادات کے — صرف اور محض، بنفسہٖ اور ''غیر بنفسہٖ'' — بُرا ہونے میں منٹو کو ہرگز کوئی شبہ نہیں ہے۔ منٹو کے لیے اصل اذیت ناک بات وہی ہے جو فسادات کے موضوع پر لکھنے والے دوسرے ''حقیقی'' اور ''ایمان دار'' ادیبوں کی اذیت کا سبب ہے یعنی یہ کہ عام لوگ، جو عام حالات میں قتل و خون کا مشغلہ اختیار نہیں کرتے، آخر اس طرح کے ''برے'' افعال پر کیوں کر آمادہ ہو گئے؟ اس اذیت ناک سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے منٹو کا نقطۂ نظر یقیناً ادبی اور تخلیقی ہے، اس میں کسی کو کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اس سوال کے ''سیاسی'' جواب منٹو کو مطمئن نہیں کرتے کیوں کہ یہ جواب انھیں ''پاکستانی''، ''ہندوستانی'' یا ''انگریزی'' نقطۂ نظر تک محدود، اور اس سبب سے غیر ایمان دارانہ، معلوم ہوتے ہیں۔ ''عمرانی'' اور ''اخلاقی'' نقطہ ہائے نظر سے پتا نہیں عسکری کی مراد کیا ہے؟ اگر اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ منٹو کی تحریروں سے مختلف عمرانی یا اخلاقی سوالوں کی بابت ان کے مخصوص نقطۂ نظر کا سراغ نہیں مل سکتا تو یہ خیالِ خام ہے یا پھر منٹو کی غلط تعبیر کی دانستہ کوشش، اور اس کی تردید کچھ آگے چل کر عسکری کے اس بیان سے ہو جاتی ہے:

چوں کہ منٹو کے افسانے سچی ادبی تخلیقات ہیں اس لیے یہ افسانے ہمیں اخلاقی طور پر بھی چونکاتے ہیں حالاں کہ منٹو کا بنیادی مقصد یہ نہیں تھا۔

منٹو کے بنیادی اور ضمنی مقاصد کے بارے میں تو خیر عسکری کو علمِ غیب حاصل ہی ہے، لیکن بہرحال ان کے اس اعتراف سے یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ ''سیاہ حاشیے'' میں (اور میرے نزدیک فسادات اور دیگر موضوعات پر اپنی ہر تحریر میں) منٹو نے ایک واضح اخلاقی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے جو ان کی تحریریں پڑھ کر چونکنے والوں کے اخلاقی نقطۂ نظر سے مختلف ہے۔ بر سبیلِ تذکرہ، منٹو نے رائج الوقت اخلاقی تصورات کو صرف ''سیاہ حاشیے''، ''کھول دو'' اور ''ٹھنڈا گوشت'' میں نہیں بلکہ ''ہتک''، ''خوشیا'' اور ''کالی شلوار'' میں بھی چیلنج کیا ہے۔ یہاں میں جان بوجھ کر ''ہتک''، ''خوشیا'' اور ''کالی شلوار'' کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ یہ کہانیاں عسکری کی ''حاشیہ آرائی'' سے پہلے لکھی اور چھاپی جا چکی تھیں اور منٹو کی معروف تحریروں میں اُس وقت بھی شامل تھیں۔

بہرحال، یہاں عسکری کا یہی خیال ہے کہ منٹو نے ''نیک و بد'' کے سوال ہی کو خارج از بحث قرار دے دیا ہے اور ان کا نقطۂ نظر اخلاقی نہیں ہے۔ جون ۱۹۴۹ء کی ''جھلکیاں'' میں انھوں نے ایک اور

بصیرت افروز انکشاف کیا:

پاکستان بننے کے بعد ان کی افسانہ نگاری میں شدید تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ ممکن ہے ان تبدیلیوں کے محرکات ایک سے زیادہ اور گوناگوں ہوں، مگر میرے خیال میں پاکستان کے وجود میں آنے کا اثر بھی ان کی طبیعت پر بہت گہرا پڑا ہے۔ مثلاً ایک تو ان کی اخلاقی حس بڑی شدید ہوگئی ہے اور وہ سطح پر رہ کر نہیں بلکہ زندگی کی گہرائیوں میں پہنچ کر نیک و بد کے متعلق واضح فیصلے کرنے لگے ہیں۔ اس کی ایک شہادت ہم نے ''کھول دو'' میں دیکھی ہے، دوسری طرف ''سیاہ حاشیے'' میں انھوں نے ظالم اور مظلوم کی سطحی اصطلاحات سے گزر کر دونوں کی شخصیت کا اندر سے جائزہ لیا ہے اور ان کے خارجی افعال کو بالکل نئے پس منظر میں پیش کیا ہے۔

آپ ہی بتایئے کہ ان ''الٹی سیدھی زقندوں'' سے کیا مطلب اخذ کیا جائے؟

(۱۵) عسکری کا اگلا نکتہ منٹو کی فنی تدابیر سے تعلق رکھتا ہے:

منٹو نے تو صرف یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ ظالم یا مظلوم کی شخصیت کے مختلف تقاضوں سے ظالمانہ فعل کا کیا تعلق ہے؟ ظلم کرنے کی خواہش کے علاوہ ظالم کے اندر اور کون کون سے میلانات کار فرما ہیں، انسانی دماغ میں ظلم کتنی جگہ گھیرتا ہے، زندگی کی دوسری دلچسپیاں باقی رہتی ہیں یا نہیں؟ منٹو نے نہ تو رحم کے جذبات بھڑکائے ہیں نہ غصے کے نہ نفرت کے، وہ تو آپ کو صرف انسانی دماغ، انسانی کردار اور شخصیت پر ادبی اور تخلیقی انداز سے غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر وہ کوئی جذبہ پیدا کرنے کی فکر میں ہیں تو صرف وہی جذبہ جو ایک فن کار کو جائز طور پر پیدا کرنا چاہیے... یعنی زندگی کے متعلق بے پایاں تحیر اور استعجاب۔ فسادات کے متعلق جتنا بھی لکھا گیا ہے اس میں اگر کوئی چیز انسانی دستاویز کہلانے کی مستحق ہے تو یہ افسانے ہیں۔

اپنے کرداروں سے فن کارانہ علاحدگی اور معروضی اندازِ نظر کی خصوصیات منٹو کی دوسری تحریروں کی طرح ''سیاہ حاشیے'' میں بھی ملتی ہیں۔ یہ ایک باشعور فن کار کی اختیار کردہ تکنیکی دوری ہے تاکہ پڑھنے والے کرداروں اور واقعات کو لکھنے والے کے جذبات کی آمیزش کے بغیر معروضی طور پر دیکھ سکیں۔ یہ منٹو کا فنی طریقِ کار ہے جسے عسکری ان کی اخلاقی بے نیازی کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ''نیا قانون''، ''ہتک''، ''کالی شلوار'' اور ''بابو گوپی ناتھ'' میں بھی منٹو نے کرداروں اور واقعات کو اسی محتاط فنی علاحدگی کے ساتھ بیان کیا ہے لیکن پڑھنے والے کو یہ محسوس کرنے میں دقت نہیں ہوتی کہ منٹو ان

کرداروں کی بابت ایک واضح اخلاقی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اپنے اس نقطۂ نظر کو صاف صاف لفظوں میں بیان کرنے کی ضرورت منٹو کو کم ہی پیش آتی ہے، لیکن کیا اس بارے میں کسی طرح کے ابہام کی کوئی گنجائش ہے کہ منٹو نے منگو کوچوان، سوگندھی، سلطانہ اور بابو گوپی ناتھ کو کوڑا کرکٹ سمجھنے والے اخلاقی نقطۂ نظر کو باقاعدہ چیلنج کیا ہے؟

ان افسانوں کی طرح ''سیاہ حاشیے'' کے پاروں میں بھی منٹو نے اپنی فنی علاحدگی قائم رکھی ہے بلکہ طنز کے استعمال سے اپنی معروضیت کو مزید مستحکم کیا ہے، لیکن عسکری منٹو کے اس فنی طریق کار کی تشریح یوں کرنا چاہتے ہیں گویا منٹو کو اس سے غرض نہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اچھا ہے یا برا۔ اگر منٹو نے ''رحم، غصے یا نفرت کے جذبات بھڑکانے'' سے گریز کیا ہے تو اس لیے کہ وہ راشد الخیری اور آغا حشر سے بلند تر فن کار ہیں۔ ان طنزیہ پاروں کے مجموعے کو ''سیاہ حاشیے'' کا بلیغ نام دینے کے بعد اس قسم کی جذباتیت کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔

عسکری نے ایک نیا حکم نافذ کردیا ہے کہ فن کار کے لیے زندگی کے متعلق بے پایاں تحیّر اور استعجاب کے سوا کوئی جذبہ پیدا کرنا ناجائز (حرام؟) ہے۔ کیا اس نومولود خیال تک محدود رہ کر مثلاً شیکسپیئر، فلوبیر، چیخوف اور راں بو کی تحسین کی جاسکتی ہے؟ اور کیا اس سے ان فن کاروں کے فنی امتیازات خاک میں نہیں مل جاتے؟ اور کیا تحیّر اور استعجاب کے علاوہ ''شدید اخلاقی ردّعمل پیدا کرنا'' ناجائز ہوگیا؟ عسکری جو نظریہ گھڑتے ہیں انھیں اس کے صرف فوری افادی پہلو سے غرض ہوتی ہے، اور یہاں غرض یہ ہے کہ لکھنے والے فسادات کے واقعات کو صرف تحیّر اور استعجاب سے آنکھیں ٹل ٹل کر دیکھتے رہیں اور یہ بات منھ سے نہ نکالیں کہ ہندو، سکھ اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ وحشیانہ برتاؤ کر رہے ہیں اور نہ اس انسانی المیے کے اسباب جاننے کی کوشش کریں۔ ''سیاہ حاشیے'' میں منٹو کا سب سے نمایاں ہتھیار ان کا طنز ہے اور یہ طنز صرف تحیّر اور استعجاب نہیں بلکہ گہرا اضطراب اور شدید اخلاقی ردّعمل بھی پیدا کرتا ہے۔

(۱۶) اس کے بعد عسکری کی حاشیہ آرائی آخر تک ان کے اسی اچھوتے خیال کی الٹ پھیر پر مبنی ہے۔ منٹو نے عام انسانوں کے روزمرہ افعال کو فسادات کے وحشیانہ افعال کے پہلو بہ پہلو رکھ کر انسانی فطرت کے بارے میں سوال اٹھائے ہیں۔ عسکری ان سوالوں کا سامنا کرنے سے بچتے ہوئے صرف اس عمیق فلسفے تک پہنچنا چاہتے ہیں کہ ''بھئی انسان کا کچھ ٹھیک نہیں، اچھا بھی ہوسکتا ہے اور برا بھی'' کیوں کہ اس قسم کے عرفان سے عسکری کی ''امید بندھتی'' ہے۔

اس فلسفے تک پہنچنے سے پہلے عسکری نے منٹو کی تکنیک کی ایک خصوصیت بڑی خوبی سے اس فقرے میں بیان کی ہے، ''دہشت تو اس خیال سے ہوتی ہے کہ جن لوگوں میں صفائی اور گندگی کی تمیز باقی ہے وہ بھی قتل کرسکتے ہیں۔'' مگر اس سے وہ یہ رجائی نتیجہ زبردستی اخذ کرتے ہیں کہ چلو، قتل و غارت کر رہے ہیں تو کیا ہوا، یہی غنیمت ہے کہ صفائی اور گندگی کی تمیز تو اب تک باقی ہے، یعنی یہ لوگ بھٹک کر

بہت دور نہیں گئے۔ اگر اسی کو عسکری رجائیت کا نام دیتے ہیں تو یہ ان کی اپنی ایجاد ہے، منٹو سے اس کا کوئی تعلق "سیاہ حاشیے" اور ان کی دوسری تحریروں کے متن سے تو اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح منٹو نے اس سے پہلے کی تحریروں میں واضح طور پر کہا تھا کہ ہماری مروّج، روزمرہ کی اخلاقیات سوگندھی، خوشیا اور بابو گوپی ناتھ کی بابت غلط فیصلوں تک پہنچتی ہے، اسی طرح "سیاہ حاشیے" میں ان کا طنز اتنے ہی واضح طور پر یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ "صفائی اور گندگی میں تمیز" کرنے والی، روزمرہ کی اخلاقیات (بہ شمولِ مذہبی اخلاقیات) انسان کو وحشیانہ افعال سے روکنے کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔ منٹو کا یہ موقف ان کی "سیاہ حاشیے" کے بعد کی تحریروں میں بھی اتنا ہی واضح ہے۔ "موذیل" کے آخری الفاظ کو ذرا یاد کیجیے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کی تحریریں، عسکری کے بہ قول، ہمیں اخلاقی طور پر چونکاتی ہیں۔

عسکری کی بات کہ "روزمرہ کی معمولی زندگی ایسی طاقت ور چیز ہے کہ انسان اگر بہت اچھا نہیں بن سکتا تو بہت بُرا بھی نہیں بن سکتا، معمولی زندگی اسے ٹھونک پیٹ کے سیدھا کر ہی لیتی ہے"، منٹو کے اخلاقی طنز کو بالکل اُلٹ کر پیش کرتی ہے۔ منٹو کے طنز کا ہدف، "سیاہ حاشیے" میں بھی اور دوسری تحریروں میں بھی، اچھے اور بُرے کی رائج الوقت خانہ بندی کی الم ناک مضحکہ خیزی ہی ہے۔ ان کا واضح اشارہ ہماری روزمرہ زندگی کے دوغلے اخلاقی معیار یا جارج آرویل کی زبان میں doublethink کی طرف ہے جس کی رُو سے ہم دوسرے انسان کی جان لے لینے کے انتہائی فعل میں ملوث ہوتے ہوئے بھی خود کو "صفائی اور گندگی میں تمیز کرنے" کے قابل پا کر مطمئن رہ سکتے ہیں۔ اور اسی مسخ شدہ اخلاقیات کے بل پر اپنی اپنی عبادت گاہ سے اپنی عقیدت کو قائم رکھتے ہوئے دوسرے کی عبادت گاہ میں سور یا گائے کا گوشت فروخت کرسکتے ہیں۔

(۱۷) اپنی معکوس منطق اور غلط تعبیر کے سہارے عسکری اپنے اُس حتمی فیصلے تک پہنچتے ہیں جسے آج بھی منٹو کی کتابوں کی پشت پر بڑی سادہ لوحی (یا حیلہ سازی) کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے:

> منٹو نہ تو کسی کو شرم دلاتا ہے نہ کسی کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے۔ وہ تو بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انسانوں سے یہ کہتا ہے کہ تم اگر چاہو بھی تو بھٹک کے بہت دور نہیں جاسکتے۔ اس اعتبار سے منٹو کو انسانی فطرت پر کہیں زیادہ بھروسا نظر آتا ہے۔

اگر لاکھوں عام آدمیوں کا ایک دوسرے کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جانا بھٹک کر بہت دور جانا نہیں ہے تو پھر واقعی آدمی بھٹک کر کہاں جاسکتا ہے۔ عسکری کی یہ بات ان کی اُس نصیحت کا بدلا ہوا روپ ہے کہ پاکستانی ادیبوں کو چاہیے کہ اس نازک موقعے پر قوم کی ڈھارس بندھائیں۔ بہرحال، یہ رائے عسکری کی ہے، منٹو کی نہیں۔ منٹو کا زہرخند ایسا کوئی دلاسا نہیں دیتا کہ شاباش میرے بچو، اپنے ظلم وستم کے افعال میں لگے رہو، تم بھٹک کر بہت دُور نہیں جاسکتے۔ منٹو کو انسانی فطرت پر یقیناً بھروسا ہے لیکن یہ انسانی فطرت

ایشر سنگھ کی انسانیت ہے جو ایک لڑکی کی لاش کی بے حرمتی کی قیمت اپنی نامردی کی صورت میں ادا کرتا ہے۔ انسانی فطرت کی بابت منٹو کے تصور کو ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''موذیل'' اور دوسری تحریروں میں بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ انسانی فطرت اور مروّج اخلاقیات دو مختلف چیزیں ہیں اور منٹو کا فیصلہ واضح ہے کہ یہ دونوں متضاد ہیں۔

> خود کو حیوانوں سے کچھ اونچا رکھنے کے لیے انسان نے قتل و غارت گری کے لیے بھی کچھ آداب و قواعد بنا رکھے ہیں۔ لیکن جس قتل و غارت گری کا ہم ذکر کرتے ہیں، ان آداب و قواعد سے بے نیاز تھی بلکہ یوں کہیے کہ حیوانیت سے بھی یکسر مبرا تھی جس کی تصویر یہ قتل و غارت گر خود بھی نہ کھینچ سکے۔
>
> اس وقت ہماری نظروں کے سامنے خون کی سوکھی ہوئی پپڑیاں، کٹے ہوئے اعضا، جھلسے ہوئے چہرے، روندھے ہوئے گلے، ٹھٹھری ہوئی جانیں، لٹے ہوئے مکان، جلے ہوئے کھیت، ملبے کے ڈھیر اور بھرے ہوئے ہسپتال ہیں۔
>
> ہم آزاد ہیں۔ ہندوستان آزاد ہے، پاکستان آزاد ہے، اور ہم گرسنگی اور برہنگی، بے سروسامانی و بے حالی کی ویران سڑکوں پر چل پھر رہے ہیں۔

روزمرہ کی یا رائج الوقت اخلاقیات کی بابت منٹو کے اس تخلیقی فیصلے کی مزید تصدیق ''گورمکھ سنگھ کی وصیت'' سے بھی ہوتی ہے۔

اس طرح دیکھا جائے تو ''چغد'' کے دیباچے میں منٹو کی یہ شکایت بلاوجہ نہیں تھی کہ ''نام نہاد'' ترقی پسندوں نے ''سیاہ حاشیے'' کو غور سے پڑھنے کی زحمت نہیں کی اور محض اس بنا پر اپنا فیصلہ صادر کر دیا کہ اس کتاب پر عسکری نے دیباچہ لکھا تھا۔ عسکری کے مقلدین نے بھی اس سے کچھ زیادہ بصیرت کا ثبوت نہیں دیا اس لیے کہ ان کی جانب سے ''سیاہ حاشیے'' کی تحسین دراصل عسکری کی ''حاشیہ آرائی'' کی مدح سے آگے نہیں گئی۔

(۵)

ایک پڑھنے والے کی حیثیت سے میری رائے میں ''سیاہ حاشیے'' سے کوئی معنی اخذ کرنے کے لیے اس کتاب کی ہیئت یا ساخت پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ یہ چھوٹے چھوٹے پارے مل کر ایک مکمل صورت بناتے ہیں جو میرے نزدیک منٹو کے افسانوں سے نہیں بلکہ ان کے طنزیہ مضامین سے مماثل ہے۔ منٹو نے اس ہیئت کو اپنی چند اور تحریروں میں بھی اختیار کیا ہے۔ ان تحریروں میں سے تین — ''پردے کی باتیں''، ''پٹاخے'' اور ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' — منٹو کی متفرق ''نیم افسانوی'' تحریروں کے مجموعے ''تلخ، ترش اور شیریں'' میں شامل ہیں۔ ''دیکھ کبیرا رویا'' کے عنوان سے ایک تحریر ''نمرود کی خدائی'' میں ملتی ہے۔ منٹو کی اسی انداز کی ایک اور تحریر ''باتیں'' اس لحاظ سے بھی قابلِ غور ہے کہ یہ ان کے

مجموعے ''منٹو کے مضامین'' (۱۹۴۲ء) میں بھی شامل تھی اور ''اوپر نیچے اور درمیان'' (۱۹۵۴ء) میں دوبارہ شامل کی گئی۔ اس کی ممکنہ وجہ کا اندازہ اسے پڑھ کر کیا جاسکتا ہے۔ ہیئتی طور پر مماثلت رکھنے کے علاوہ یہ تحریر موضوع کے اعتبار سے بھی ''سیاہ حاشیے'' کے قریب ہے۔ ''باتیں'' کا موضوع بھی فسادات ہیں لیکن تقسیم کے دنوں کے نہیں بلکہ اس سے کئی برس پہلے کے فسادات (''اپنی اپنی ڈفلی''، ''کرچیں اور کرچیاں''، ''یومِ استقلال'')۔

ان مخصوص تحریروں میں منٹو نے اپنے افسانوں کے برعکس چند کرداروں اور ان کے ساتھ پیش آنے والے چند واقعات کو ایک مربوط پلاٹ کی پابندی کرتے ہوئے بیان نہیں کیا ہے۔ ان میں سے ہر تحریر چھوٹے چھوٹے چٹکلوں (anecdotes) پر مشتمل ہے۔ ''پٹاخے'' میں ''سیاہ حاشیے'' کی طرح ہر پارے کو ایک الگ عنوان دیا گیا ہے، ''باتیں'' اور ''پردے کی باتیں'' میں یہ پارے عنوان کے بغیر ہیں لیکن ہر پارے کو الگ الگ رکھا گیا ہے۔ ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' صبح کے وقت سیر کو نکلنے والے ایک شخص کے مشاہدات پر مشتمل ہے جنھیں کہیں تبصرے کے بغیر اور کہیں نہایت دھیمے تبصرے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ''دیکھ کبیرا رویا'' میں ہر چٹکلا کبیر کے تبصرے، یعنی اس کے رونے پر ختم ہوتا ہے سوائے آخری ٹکڑے کے جس کا اختتام کبیر کے ہنسنے پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی نقاد ''سیاہ حاشیے'' کو منٹو کی ان تحریروں کے ساتھ رکھ کر سمجھنے کی کوشش کرے تو شاید پڑھنے والوں کو اس اہم کتاب کی معنویت تک پہنچنے کے لیے ایک آدھ نیا نکتہ دستیاب ہو جائے۔

جہاں تک فسادات کی بابت منٹو کے ''ادبی، تخلیقی، سیاسی، عمرانی اور اخلاقی'' نقطۂ نظر کا تعلق ہے، میری رائے میں ''سیاہ حاشیے'' کو فسادات کے موضوع پر منٹو کی دوسری تحریروں سے الگ رکھ کر دیکھنا نامناسب اور غیر محتاط رویّہ ہے۔ فسادات کا براہِ راست ذکر منٹو کے کئی معروف اور کئی کم معروف افسانوں میں آتا ہے۔ ان کی فہرست بنانے کی کوشش کی جائے تو وہ کچھ یوں ہوگی: ''ٹھنڈا گوشت''، ''گورمکھ سنگھ کی وصیت''، ''کھول دو''، ''سہائے''، ''موتری''، ''ڈارلنگ''، ''عزت کے لیے''، ''شریفن''، ''ہرنام کور''، ''وہ لڑکی''، ''ایک پھسپھسی کہانی'' اور ''موذیل''۔ شخصی خاکوں پر مشتمل کتاب ''گنجے فرشتے'' کی کم سے کم دو تحریروں ''مُرلی کی دھن'' اور ''اشوک'' میں فسادات کا ذکر آتا ہے۔ ان کے علاوہ کئی مضامین میں منٹو نے غیر طنزیہ انداز میں فسادات اور اس کے متعلقہ پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے، ''محبوس عورتیں''، ''قتل و خون کی سرخیاں'' ایسے مضامین کی مثالیں ہیں۔

منٹو کے کچھ افسانے ایسے بھی ہیں جو براہِ راست فسادات سے متعلق نہیں لیکن ان کا موضوع کسی نہ کسی اعتبار سے برصغیر کی تقسیم (منٹو کے بہ قول ''بٹوارا'') ہے۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''دو قومیں''، ''یزید''، ''ٹیٹوال کا کتا''، ''شہید ساز'' ان افسانوں کی مثالیں ہیں (آخرالذکر دو کہانیوں سے منٹو کا شہادت کا تصور بھی واضح ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ بہ قول عسکری ایمان لائے تھے)۔

اگر ان تمام تحریروں کو پڑھ کر ان سے فسادات کی بابت منٹو کا نقطہ نظر مرتب کیا جائے تو وہ میرے خیال میں عسکری کے بیان کردہ نقطہ نظر سے بہت مختلف ہوگا۔

اور صرف فسادات پر موقوف نہیں، ۱۹۴۷ء سے منٹو کی وفات تک قومی زندگی کے ہر اہم معاملے پر منٹو کا موقف عسکری اور ان کے ہم خیالوں کے موقف سے بنیادی طور پر مختلف رہا کیوں کہ یہ دونوں ادب، زندگی اور سیاست کے بارے میں دو متضاد رویّوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان اہم برسوں میں، جنھوں نے قوم کے طور پر ہماری اجتماعی سمت اور مستقبل کے معاشرے کے خدوخال متعین کیے، ان دونوں رویّوں کی کش مکش متواتر جاری رہی۔ اس کش مکش کو فن کار اور نقاد کی کش مکش کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے، اور اس تلخ حقیقت کو پہچانا جاسکتا ہے کہ اس میں فتح نقاد کی ہوئی اور منٹو کو آزادیِ اظہار کے دشمن معاشرے کے ہاتھوں دکھ اٹھانا اور الم ناک موت کا منھ دیکھنا پڑا۔

☆☆☆